DUE DATE

Cl. No. ________ *Acc. No.* ________

Late Fine Ordinary books **25 Paise** per day. Text Book **Re. 1/-** per day. Over Night book **Re. 1/-** per day

سعید



مقام۔ کوچہ چیلاں دہلی

ایڈیٹر:۔ سعید بریلوی

1 K. Naimullah ... Mohalla ... Panipat, Karnal

نمبر ۱ جلد ۲

جنوری سنہ ۱۹۳۲ء

باتصویر ماہوار رسالہ

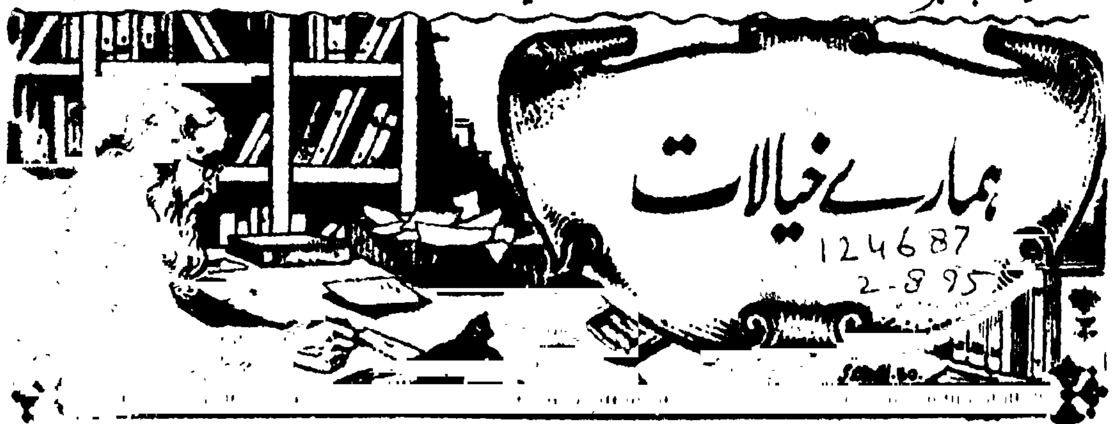
سہیلی

دہلی

ایڈیٹر
ڈاکٹر سعید احمد سعید
بریلوی

قیمت
سالانہ — تین روپئے
ششماہی — ایک روپیہ ۱۲ آنے
فی پرچہ — چار آنے

فہرست مضامین



صحیح اور غلط تنقید

اپنے ہاتھ کا کیا ہوا کام اور اپنی دماغی کاوشوں کا نتیجہ کبھی کسی کو برا نہیں معلوم ہوا کرتا، یہی نہیں بلکہ فی الحقیقت اس سے ہمیں دلی محبت ہوتی ہے اور اگر کوئی دوسرا اسے برا بتائے، تو ہمیں ناگوار گذرا کرتا ہے۔ ایک بڑھئی، ایک لوہار یا ایک معمار جب کوئی چیز یا عمارت تیار کرتا ہے تو اس کا ہر پہلو نہایت غور سے دیکھنے کے باوجود اسے اس میں کوئی کجی یا خرابی نظر نہیں آتی اور وہ فی الحقیقت یہی یقین رکھتا ہے کہ اس سے بہتر یہ چیز کوئی اور نہیں بنا سکتا، دوسروں کی بنائی ہوئی چیزوں میں اسے بیس نقص نظر آتے ہیں اور وہ ہر خفیف سی کجی اور ہر ناقابل لحاظ عدم تناسب کو دیکھ کر اس پر ہنس دیتا ہے لیکن خود اپنی صنعت اگر اسکی اپنی نگاہ کسی بے ڈولی یا بھدے پن پر رکتی بھی ہے تو فوراً اسکا دماغ اس قصور کے لئے کوئی عذر فوراً گھڑ لیتا ہے اور اسکے بعد وہ نقص یا عیب عیب ہی نہیں رہتا۔

ایک شاعر اور ایک ادیب کی بھی بعینہ یہی حالت ہوتی ہے۔ شعر میں دس طرح کے عیوب ہیں۔ ان میں سے بعض پر اسکی نگاہ ہی نہیں پڑتی، اور بعض فروگذاشتیں اگر کھٹکتی بھی ہیں تو دماغ فوراً عذر لنگ پیش کر دیتا ہے اور دو چار مرتبہ مشاعروں یا اور اسی قسم کی اور صحبتوں میں سنا دینے اور سامعین کی جانب سے اسپر کوئی اعتراض نہ ہونے کے بعد تو پھر کبھی یہ خیال تک نہیں آتا کہ شعر میں کوئی نقص کبھی تھا بھی۔ ہر عیب ایک حسن میں تبدیل ہو جاتا ہے اور ہر غلطی ایک خوبی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

اپنی مصنوعات سے اس قسم کی کورانہ محبت اس لحاظ سے تو یقیناً قابل تعریف و تحسین ہے کہ وہ بہر حال محبت ہے نفرت نہیں ہے اور محبت تقریباً ہر حالت میں نفرت سے بہتر چیز ہے، لیکن اگر خود اس صنعت کی ترقی اور صانع کی شہرت کا خیال پیش نظر ہو تو اس قسم کی محبت کو ہر گز ہر گز لائق ستائش نہیں قرار دیا جا سکتا۔ سب سے پہلی ریل گاڑی، سب سے پہلا ہوائی جہاز، سب سے پہلی موٹر کار، اور سب سے پہلا گراموفون بھی جس وقت بنے تھے تو اپنے موجدوں کو وہ اتنی قدر عزیز تھے اور بہر صورت اس درجہ مکمل نظر آتے تھے کہ ان میں مزید ترقی و اصلاح کی گنجائش نہ تھی، لیکن کیا وہ حقیقت میں بھی ایسے مکمل اور ناقابل اصلاح تھے؟ نہیں اور یقیناً نہیں، کیونکہ آج انہی سب چیزوں کی ترقی یافتہ شکلیں ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں اور یہ واقعہ ہے کہ اگر اب انکے وہ ابتدائی خاکے ہماری نظر کے سامنے آجائیں تو ہم سے ہنسی ضبط نہ ہو سکے گی، حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں کسی شے کا بھی تکمیل کو پہنچ جانا محالات سے ہے اور ہر چیز کے بہتر سے بہتر نمونے میں بھی ترقی و اصلاح کی اسی قدر گنجائش باقی رہتی ہے کہ جتنی اسکے ابتدائی خاکے میں تھی، یہ دوسری بات ہے کہ ہم اسکی موجودہ صورت و حیثیت پر قناعت کر لیں

اور اس طرح تمام ترقیاں محدود اور اصلاح کی راہیں مسدود ہو جائیں۔

دنیا میں آج ہمیں جس قدر ترقی، تہذیب اور اصلاح نظر آرہی ہے وہ اس وجہ سے نہیں ہے کہ صناعوں کو خود ہی یہ شوق ہوتا ہے کہ اپنی بنائی ہوئی چیزوں کو توڑ پھوڑ کر روز نت نئے طریقوں سے بنایا کریں، بلکہ فی الحقیقت اس وجہ سے ہے کہ جب کبھی کسی کی بنائی ہوئی چیز میں دوسروں نے عیب نکالے تو مجبور ہو کر صانع نے ان عیوب کو دور کرنے کی کوشش کی۔ دوسروں کی نکتہ چینی اور دوسروں کی عیب جوئی خواہ ہمیں کتنی ہی بری کیوں نہ معلوم ہو لیکن دراصل وہ ہمیشہ ہماری صنعتوں کے لئے مفید اور بذریعہ ترقی ثابت ہوا کرتی ہے۔ یہ نکتہ چینی ذاتی خصومتوں کی بنا پر بھی کی جا سکتی ہے اور اس صورت میں وہ یقیناً بہت ہی بری معلوم ہوتی ہے اور ہونی چاہئے، لیکن اگر کوئی شخص جس سے ہمارے کسی قسم کے بھی تعلقات نہ ہوں از روئے انصاف جو باتیں ہماری صنعت میں اچھی یا بری معلوم ہوتی ہیں صاف صاف ہمیں بتا دیتا ہے تو وہ ہم پر اسکا ایک احسان ہے اور اس صورت میں اسکا نام نکتہ چینی نہیں بلکہ تنقید ہو جاتا ہے۔ صحیح اور بروقت تنقید سے صنعت کو جلد جلد ترقی کی بہت سی منزلیں طے کرا دیا کرتی ہے، اور اگر یہ کہا جائے کہ ترقی کی روح رواں تنقید ہی ہے تو اسمیں ذرا سا بھی مبالغہ نہ ہوگا۔

ہندوستان کا ہر شاعر اور مصنف اگر اپنے متعلق اس غلط فہمی میں مبتلا ہو کر وہ بہترین شاعر اور کامل ترین ادیب ہے تو خارج ہو کہ اسی خبط کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے؟ اور اگر اپنے کلام اور اپنی تصنیف کے متعلق سننا گوارا نہیں کرتا کہ ان میں کیا کیا خرابیاں ہیں تو اسکے معنی صرف یہی ہیں کہ وہ پہلی ریل اور پہلے گرامو فون ہی پر قناعت کرنے کے لئے طیار ہے اور نہیں چاہتا کہ اسکا کلام یا اسکی تحریر اور زیادہ ترقی کر جائے۔ ہونا تو یہ چاہئے کہ اگر کوئی شخص محض دشمنی اور تعصب ہی کی راہ سے ہماری تصنیفات میں نقائص نکالتا ہے تو اس سے بھی ہم ناخوش نہ ہوں اور اسکی نکتہ چینی سے بھی تا حد امکان فائدہ اٹھائیں، لیکن بدقسمتی سے عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ ادھر کسی شخص نے بالکل منصفانہ طریقہ پر محض خدمت ادب کی خاطر ہماری کسی غزل، ہماری کسی نظم یا ہماری کسی تصنیف پر اعتراض کیا اور ادھر ہماری تیوری میں بل پڑ گیا۔ اور آئندہ سارا زور قلم یا تو اس بات کو ثابت کرنے پر صرف کر دیا کہ نقاد کے ایک دوست کے بھائی کے کلام پر ایک مرتبہ ہم نے اعتراض کیا تھا اسکا یہ انتقام لیا گیا ہے، یا پھر کھلم کھلا صاحب تنقید کو گالیاں دینی شروع کر دیں اور یہ سمجھ لیا کہ اگر صاحب تنقید کی ذات میں ہم نے کچھ عیب نکال دیئے یا اسکے خاندان کو کسی طرح ادنیٰ درجہ کا خاندان ثابت کر دیا تو ہماری تحریر کی تمام غلطیاں درست ہو جائینگی۔ ہمیں کسی طرح اور کسی صورت میں یہ گوارا ہی نہیں ہوتا کہ کوئی شخص ہماری تصنیف کے متعلق یہ کہے کہ اسمیں فلاں فلاں خامیاں رہ گئی ہیں، اگر کوئی علم و ادب کا مخلص خدمت گزار اتنی ہمت کرتا ہے تو ہم لوگوں سے خدا واسطے کی دشمنی ہو جاتی ہے اور اپنی اصلاح کی بجائے ہم دل و جان سے اسکی تخریب کے درپے ہو جاتے ہیں۔ ایسے باہمت شیدائیان ادب کی تعداد بہت کم ہے کہ جو نہ گالیوں کی پروا کریں اور نہ پتھروں کی، اور بلا تکلف ہر نئی تصنیف کے متعلق اپنی جو رائے ہو اسکا علی الاعلان اظہار کر دیں۔ یہی وجہ ہے کہ گو آئے دن نئی نئی کتابیں تصنیف ہوتی رہتی ہیں اور روزمرہ اخباروں اور رسالوں میں صدہا نئی نئی نظمیں اور ہزارہا تازہ مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں پھر بھی کسی کو اسکا خیال تک نہیں آتا کہ ہنگامی تصانیف نہ سہی مستقل تصانیف پر تو تنقید لکھدے۔ خیال کیسے آئے، اور کیسے آئے جبکہ وہ بے سبب دشمنی مول لینی اور سر بازار یا سر اخبار گالیاں کھانی ہوں تو کوئی ایسا کرے۔

شعرا اور مصنفین کے اس احمقانہ برتاؤ کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اردو زبان کا گلشن ادب اب کوڑے کرکٹ سے پٹ گیا ہے۔ ہر کیاری میں پھولوں سے کہیں زیادہ خشک تنکے پڑے سڑ رہے ہیں اور ہر تختے میں پودوں اور درختوں سے کہیں زیادہ خودرو گھاس کھڑی ہو گئی ہے۔ اچھی، قابل قدر اور مفید تصانیف جو پہلے سے موجود تھیں وہ بھی ان ادبی چیتھڑوں کے ڈھیر میں دب کر رہ گئی ہیں کہ نہیں ع

برعکس ہندوستان میں زندگی کا فور یہ کہ مطالعہ کتابیں اور ذخیرہ ہائے علم و ادب کہا جاتا ہے، ہر شخص سستی جلد بندی کی تمنا کا شکار نظر آتا ہے اور دس بیس بکواس یا سستے مضامین کی یا کسی نظم کا چھپا یا پرانا سفر یا سند ہوا کہیں نہ کہیں سے فراہم کرتا ہے اور پبلشر کے سپرد کر دیتا ہے یہاں مشین کا سیاہی آلودہ رولر برقی طاقت سے کاغذ پر گھوم گھوم کر چند گھنٹوں میں اس پر تصنیف تازہ کی مہر ثبت کر دیتا ہے اور یہی نادیدنی [illegible] ناشر کی ادبی غلاظت ایک اچھی خاصی صاف ستھری کتاب کی صورت اختیار کر کے کتب فروشوں کی دوکان کی زینت بن جاتی ہے۔ اشتہارات اور پوسٹر ملک کے طول و عرض میں اس ادبی شاہکار کا اعلان کرتے ہیں اخبار اور رسالے ان شاہکاروں پر تبصرے اور تنقیدیں لکھتے ہیں اور عوام ان اشتہاروں اور تنقیدوں کو پڑھ پڑھ کر اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈالتے ہیں اور اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی لٹا کر بدلے میں ادبی غلاظت میں لتھڑے ہوئے کاغذ کے چند ورق خرید لینے کے بعد اس سوچ میں پڑ جاتے ہیں کہ شاید درحقیقت ہم ہی کم علم اور بد مذاق ہیں کہ ہمیں یہ ادبی [illegible] نظر نہیں معلوم ہوتا یا یہ کہ اردو زبان میں ادب عالیہ نام ہی ان مزخرفات کا ہے کہ جن سے یہ کتاب بھری پڑی ہے۔

اکثر بیشتر نئی کتابیں جب اسی نوع کی لوگوں کی نظر سے گذرتی ہیں اور وہ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ عام طور پر ہر رسالہ کے ایڈیٹر نے ان کتابوں کو "اردو ادب اردو میں ایک بیش بہا اضافہ" "دور حاضرہ کی بہترین تصنیف" "ایک اعلیٰ درجہ کی مفید کتاب، زبان اردو کے لئے مایۂ صد فخر تالیف" وغیرہ ناموں سے یاد کیا ہے تو انہیں اعتراف عجز پر مجبور ہونا پڑتا ہے، اور وہ یہ سمجھ کر کہ اتنے بہت سے قابل اور سمجھدار لوگ غلطی نہیں کر سکتے اپنی بدذوقی کا اقرار کرتے ہیں۔ اور پھر اس کوشش میں لگ جاتے ہیں کہ جلد سے جلد ان "مایۂ ناز ادب" کتابوں کی مدد سے اپنے "بگڑے ہوئے" مذاق کو درست کر لیں،

اشتہاروں کی بھرمار اور جھوٹی تنقیدوں کی کثرت نے ذلیل ترین تصانیف کو مقبول عام بنا کر اب عوام کے مذاق کو بالکل بگاڑ دیا ہے اور بدنصیبی سے کچھ ایسی حالت پیدا کر دی ہے کہ جیسے ایک مدت دراز تک تیل کا پکوان کھاتے کھاتے کسی شخص کا ذائقہ اسی کا عادی ہو جائے اور پھر گھی میں پکا ہوا کھانا اسے کسی طرح نہ بھائے۔ دوسری طرف صحیح اور منصفانہ تنقید کے فقدان کی بدولت اردو علم و ادب کی دنیا میں ایک جمود سا طاری ہو کر رہ گیا ہے، جس وقت تک بدشکل، بے ڈول، اور انگھڑت بیل گاڑیوں سے لوگ مطمئن ہو جاتے ہیں اس وقت تک کوئی صناع فن اور لینڈو کیوں بنائے اور جب تک بھدے اشعار، نکمے مضامین اور ذلیل ناکارہ کتابوں سے عوام کی تسلی ہو جاتی ہے اور ادبی پرچوں کے ایڈیٹر انہیں قابل التفات چیزوں کی تعریفیں لکھ مارتے ہیں اور کوئی اعتراض نہیں کرتے اس وقت تک کسی شاعر یا ادیب کو کیا غرض پڑی ہے کہ مفت اپنا سر کھپائے اور کوئی عمدہ یا کارآمد چیز عوام کے سامنے لائے۔

اردو کی ترقی اور زبان و ادب کی خدمت کا راگ آج ہر طرف الاپا جا رہا ہے بہت سی انجمنیں صرف اسی مقصد اور اسی غرض کے لئے قائم ہو چکی ہیں بیشمار پرچے اسی خدمت گذاری کے لئے مختلف گوشہ ہائے ملک سے نکل رہے ہیں اور ہر ادیب اور شاعر کی زبان پر یہی دعوے ہے کہ وہ رات دن ترقی زبان اور خدمت علم و ادب میں مصروف و منہمک رہتا ہے، لیکن اسقدر کوشش و سعی کے باوجود بدقسمتی سے نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ زبان ترقی کرنے کی بجائے روبہ تنزل ہے اور ادب کے خزانے جھوٹے موتیوں اور جواہرات سے پُر ہیں اور اور یہ تمام خرابیاں صرف اسلئے رونما ہوئی ہیں کہ ہمیں منصفانہ اور بے لاگ تنقیدیں کرنے، اور اس قسم کی تنقیدوں کو تیوری میں بل ڈالے بغیر کشادہ دل سے سننے کی عادت نہیں رہی ہے اور جس وقت تک یہ خرابی موجود ہے اس وقت تک نہ بزم ہائے ادب کی کوشش کسی کام آ سکتی ہے۔ اور نہ ادبستان (اکیڈمی) کے جلسے۔ صحیح ادبی ذوق صرف اسی صورت میں پیدا ہو سکتا ہے اور ادیبوں اور شاعروں کو ترقی و اصلاح کا خیال اسی وقت آ سکتا ہے کہ جب قدم قدم پر انہیں ٹوکا جائے۔ اور جو چیز بھی وہ پیش کریں اسکے عیب اور اسکی خوبیاں ایک ایک کر کے گنا دی جائیں۔ خود ساختہ "علاماؤں" اور "شاعران اعظم" کی اچھی طرح قلعی کھول دی جائے اور ان کے "ادبی شاہکاروں" کی صحیح قدر و قیمت سے عوام کو آگاہ کر دیا جائے ہمارے ادبستان اپنے مقدور بھر بہت کوشش کر رہے ہیں اور انکے ذریعہ سے ہر سال چند حقیقتاً مفید اور اچھی کتابوں کا یا دس بیس گراں بہا اور پراز معلومات مضامین کا ادب اردو میں اضافہ ہوتا رہتا ہے، لیکن دشواری یہ ہے کہ اس دور بد مذاقی میں ان کی شائع کی ہوئی تصانیف کا پڑھنے والا میسر نہیں آتا، اور ان چند جلدوں کے علاوہ کہ جو ملک کے معدودے چند سلیم المذاق اصحاب خرید کر لیں باقی تمام مجلدات ادبستان کے

کتب خانوں میں پڑی سڑتی ہیں، "ادبستان بھی اچھے اور ادبستان کی کتابیں بھی اچھی" لیکن ضرورت اس امر بات کی ہے کہ ان کتابوں کے لیے بازار اور ان تصانیف کے لیے خریدار کہیں سے مہیا کئے جائیں تجارت پیشہ مصنفوں اور مولفوں نے اپنی اشتہار بازی اور غلط تنقید نگاری کے ذریعہ اپنی کتابوں کے لئے بازار پیدا کیا ہے اور اپنے ہر مضمون نگار کو علامہ اور "فصیح الملک" اور "بلیغ الملک" اور خدا جانے کیا کیا ملک کے خطاب دے دے کر ان کے لغو اور بے معنی اور بسا اوقات مخرب اخلاق اور مخرب زبان ہذیانات کے قدردان فراہم کئے ہیں۔ اب اگر ہمیں یہ منظور ہے کہ ملک میں صحیح مذاق پیدا ہو اور لوگ اچھی کتابوں اور اچھے مضامین کی قدر کرنے لگیں تو اسکے لیئے یہ ضروری ہے کہ ہر ادبستان کی طرف سے ایک منتخب کمیٹی صرف اسی کام پر مقرر ہو کہ ہر تازہ تصنیف کی صحیح قدر و قیمت اور ہر نوزائیدہ علامہ اور شاعر اعظم کی استعداد و قابلیت سے اہل ملک کو آگاہ کر دیا جائے۔ اسکے علاوہ ہر اخبار اور ہر رسالے کا بھی کہ جسے خدمت زبان اور ادب کا دعوے ہے یہ فرض ہونا چاہیئے کہ جب اسکے دفتر میں تبصرہ اور تنقید کے لیئے کتابیں آئیں تو کتاب کو پڑھے بغیر اسکے متعلق یہ لکھ دینے کے بجائے کہ

"فلاں صاحب کی فکر بلیغ کا نتیجہ ہے کتابت و طباعت بہت اچھی ہے کاغذ زیادہ اچھا نہیں معلوم ہوتا، اتنی ضخامت ہے، ہمارے خیال میں لائق مصنف مستحق داد اور قابل مبارکباد ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ یہ کتاب ادب اردو میں ایک قابل قدر اضافہ ہے قیمت بھی بظاہر کچھ زیادہ نہیں معلوم ہوتی کہیں کہیں کتابت کی غلطیاں رہ گئی ہیں جو امید ہے کہ آئندہ ایڈیشن میں دور ہو جائینگی۔ کتاب خود مصنف سے ذیل کے پتہ پر ملسکتی ہے"

یا تو خود اسے پڑھنے کی تکلیف گوارا کیجائے، یا اسے کسی دوسرے سخن فہم و سخن شناس ادیب کے سپرد کر دیا جائے کہ وہ اسے پڑھکر رو رعایت کے بغیر کامل آزادی اور نہایت صفائی کے ساتھ اپنی رائے لکھدے کہ کتاب کے جو حصے قابل مدح و ستائش ہوں اُن کی خوبیاں اور جو حصے نقائص سے پر ہوں اُن کے عیوب بیان کر کے عوام کو اسکے حسن و قبح سے پورے طور پر آگاہ کر دے۔

یہ بالکل ممکن ہے کہ تنقید نگار کی رائے صحیح نہ ہو اور ایسی صورت میں یہ اندیشہ پیدا ہو سکتا ہے کہ ایک اچھی اور قابل قدر چیز کی شہرت کو ایک ماہر فن کی غلط فیصلہ سے نقصان پہنچا لیکن یہ اندیشہ بھی بیجا اور فضول ثابت ہوتا ہے، جب اس حقیقت کو پیش نظر رکھا جائے کہ کتاب کے متعلق دس بیس سو پچاس مختلف ادیبوں اور فاضلوں کی رائیں مختلف پرچوں میں شائع ہونگی اور یہ ناممکن ہے کہ یہ سب کے سب ایک ہی قسم کی غلطی کریں۔ اسکے علاوہ ہر غلط تنقید کے متعلق ایک مفید علمی بحث شروع کیجا سکتی ہے اور اس قسم کے مضامین سے بجائے خود ملک کے عوام اور ملک کے ادیب مستفید ہو سکتے ہیں۔

ملک کے شعرا اور مصنفین اگر اس نکتہ کو سمجھ جائیں تو بہت بہتر ہے کہ جائز اور بے لاگ تنقید ہی ان کے کلام اور انکی تحریرات کو عیوب سے پاک کر سکتی ہے، اور نکتہ چینیوں کا خوف ہی انہیں آیندہ بے راہ روی سے باز رکھ سکتا ہے اسلیئے خود اپنے ذاتی مفاد کے نظر سے بھی اور علم و ادب کی ترقی کے لحاظ کہ جو ان میں سے ہر ایک کا مقصد ہے یہ ضروری ہے کہ وہ نکتہ چینی اور تنقید پر برافروختہ ہونے کے بجائے خوش ہوں، اور ناراض ہونے کے بجائے ٹھنڈے دل سے غور کریں تاکہ آیندہ اس قسم کی غلطیوں سے اپنا دامن پاک رکھ سکیں تنقید نگار کے جن اعتراضات سے انہیں اتفاق نہ ہو (غالباً اکثر اعتراضات ایسے ہی ہونگے) تو نقاد کو گالیاں دینے کے بجائے بہت زیادہ مفید اور نتیجہ خیز یہ کام کر سکتے ہیں کہ خوشدلی کیساتھ ان اعتراضات کی جواب لکھیں اور بالآخر ایک یا ایک سے زیادہ مستند اور مشہور ادیبوں سے متنازعہ فیہ امور کا فیصلہ کرلیا جائے۔

"سعید" نے انتظامات کئے ہیں کہ اس قسم کی تنقیدات کا سلسلہ اسمیں شروع کر دیا جائے۔ اسلیئے جو صاحبان تصانیف اپنی کتابیں ریویو کی غرض سے "سعید" کے دفتر میں ارسال فرمائیں وہ اول تو یہ سمجھ کر بھیجیں کہ ان کی کتابوں پر تقریظ نہیں تنقید لکھی جائیگی۔ اور دوسرے اس بات کا خیال رکھیں کہ ہر تصنیف کی کم از کم دو جلدیں ارسال فرمائیں تاکہ اُن میں سے ایک جلد تنقید نگار کی خدمت میں پیش کی جا سکے۔



بی ہمسائی

(از سعید احمد)

فہمیدہ۔ اچھو روز سیریں ہوا کرتی ہیں جب دیکھو جب غائب پہلے تو اتنا ہوتا بھی تھا کہ کہیں جاتی تھیں تو کہہ کر جاتی تھیں کہ آپا میں فلاں جگہ وہاں جا رہی ہوں، مگر اب تو ہمیں خبر تک نہیں ہوتی اور آپ اوپر ہی اوپر اُڑ جاتی ہیں۔ کل دن بھر کہاں رہیں؟

حمیدہ۔ بھئی آپا آپ کو تو خواہ مخواہ کی شکایتیں کرنی بہت آتی ہیں، سچ کہتی ہوں کبھی آپ کو خبر کیے بغیر گھر سے قدم بھی باہر نہیں نکالتی۔

فہمیدہ۔ کل بھی تو مجھ سے کہہ کر گئی تھیں؟

حمیدہ۔ اے ہے اللہ۔ آپ بات تو پوری کرنے دیتی نہیں ہیں، کل تو میرے جانے کا کہیں سان گمان تک نہ تھا، ایکا ایکی خالہ جان کا کہنا آگیا کہ جیسی بیٹھی ہو ویسی ہی چلی آؤ۔ شاکرہ کا جی اچھا نہیں ہے اور وہ تمہیں یاد کر رہی ہے۔

فہمیدہ۔ شاکرہ کون ہے؟

حمیدہ۔ اور لیجیے! آپ شاکرہ کو بھول گئیں۔ میری خالہ کی بہن ہی اُس دن یہاں آئی بھی تھی۔

فہمیدہ۔ اے ہے وہ خوبصورت سی نازک نازک لڑکی! وہ تو مجھے بہت ہی اچھی معلوم ہوتی تھی۔ توبہ، توبہ! اسری بھی کیسی بری گھڑی ہے! ہاں تو اُنھیں کیا ہوا؟ کیا بیمار تھیں۔

حمیدہ (ہنس کر) بیمار و یمار کچھ نہیں تھیں۔ اللہ رکھے کل اُن کے لڑکا پیدا ہوا ہے۔ خالہ جان کہتی تھیں کہ ساری رات تڑپتے گذری تھی، اور جب میں پہنچی۔ تو میں نے بھی یہی دیکھا کہ تکلیف کی وجہ سے بالکل نیلی پڑ پڑ جاتی تھیں۔ خدا خدا کر کے کوئی دو بجے جا کے جب لڑکا ہوا تو سب کی جان میں جان آئی۔ نہیں تو دشمنوں کی جان کے لینے دینے پڑ گئے تھے۔

فہمیدہ۔ اسقدر دقت ہوئی تھی؟ تب تو کسی ڈاکٹرنی کو بلایا ہوگا۔؟

حمیدہ۔ آپ کو تو معلوم ہے کہ ہمارا سارا کنبہ پرانے رواجوں اور دستوروں کا پابند ہے۔ بھلا خالہ کیسے گوارا کر سکتی تھیں کہ ان کی اکلوتی بیٹی کے بچہ پیدا ہو اور اُسمیں کسی ڈاکٹرنی کا ہاتھ لگے۔ ان کی ہمیشہ کی لگی بندھی انّا من دائی ہے۔ وہی اب بھی بلائی گئی تھی، اور لوگ نے سمجھایا کہ بچی کو اسقدر تکلیف ہو رہی ہے کسی ڈاکٹرنی کو بلا لو تو شاید وہ کچھ دوا وغیرہ ایسی دیدے کہ جس سے بچہ آسانی سے پیدا ہو جائے۔ لیکن اُنہوں نے ایک نہ سنی اور برابر یہی کہتی رہیں کہ بھئی جب اللہ کا حکم ہوگا تو بچہ اپنے آپ ہو جائیگا۔ میں کسی ایم ٹیم کو نہیں بلاتی۔ میرے گھر میں بھی آج تک ایسا نہیں ہوا ہے کہ ان کاموں کے لیے میم آئی ہو۔ انّا من بڈھی ہوشیار

دائی ہے گھر میں جتنے بچے ہیں سب ماشاء اللہ اسی کے ہاتھ کے ہیں مجھے اسپر پورا اطمینان ہے۔

فہمیدہ۔ ایک دن اور ایک رات بچی کا اسطرح تڑپنا آخر انہوں نے کیسے گوارا کر لیا؟

حمیدہ۔ گوارا کیا خاک کیا۔ شاکرہ کی ہر چیخ کیساتھ پٹ پٹ آنکھ سے آنسو گرنے لگتے تھے اور سجدہ میں گرگر دعائیں مانگنے لگتی تھیں لیکن پھر بھی اسے پسند نہ کیا کہ میم کو بلالیں۔

فہمیدہ۔ اپنی اپنی سمجھ ہے بہن، ہمیں بھلا اب کوئی کیا کہہ سکتا ہے لیکن ہو کہ امامن سچ مچ ایسی ہی ہوشیار دائی ہو کہ جیسا وہ اُسے سمجھتی ہیں۔

حمیدہ۔ اسے ہے آپا بس ہی نہ پوچھئے امامن کی ہوشیاری کی داستانیں اگر میں آپ کو سناؤں تو ہنستے ہنستے آپ کے پیٹ میں بل پڑ جائیں گے۔

فہمیدہ۔ (مسکرا کر) تب تو ضرور سناؤ۔

حمیدہ۔ سب سے پہلے تو میں آپ کو اسکا حلیہ بتا دوں کوئی ساٹھ برس کی عمر، کالی بھجنگ۔ اسپر چٹے چٹے بالوں کی لٹیں لٹکتی ہوئی اور کچھ میل کچیل کیوجہ سے سخت ہو کر سیدھی کھڑی ہوئی۔ کپڑے اسقدر میلے اور غلیظ کہ دیکھکر جی متلائے۔ میں نے خالہ جان سے کہا بھی کہ امامن کے کپڑے بہت میلے ہیں تو انہوں نے مجھے کو جھڑک دیا کہ "میلے کاموں کے لیے کیا وہ صاف کپڑے پہن کر آتی" میں آپ سے اس قسم کی بہت سی باتیں سن چکی ہوں، مجھ سے نہ رہا گیا میں نے پھر کہہ دیا کہ دائیوں کے میلے ہاتھوں اور میلے کپڑوں سے زچہ کے بدن میں زہر اثر کر جاتا ہے۔ بس میرا اتنا کہنا تھا کہ اللہ دے اور بندہ لے۔ خالہ جان، امامن، شبراتن، اور میری دوسری خالہ سب کی سب پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑ گئیں، "وہ بڑی آئی ہے ڈاکٹرنی بچے کل کی چھوکری ہمارے سامنے باتیں بناتی ہے۔ ہم نے کیا یہ بال دھوپ میں سفید کیئے ہیں؟ بھلا غضب خدا کا! لوگو کہیں دنیا زمانہ میں بھی یہ باتیں سنی ہیں کہ دائی کے ہاتھوں سے زچہ کے بدن میں زہر چڑھ جائے؟ اور پھر کپڑوں سے اور زچہ سے کیا تعلق؟ دائی کے کپڑے میلے ہیں تو زچہ کا اس سے کیا بگڑ سکتا ہے؟ بیچاری غریب آدمی ہے ہر دفعہ سفید جوڑا خراب کرتی پھرے اسے تو دن میں دس بارہ جوڑے چاہئیں۔ میلے کاموں کے لیے دنیا زمانہ میلے ہی کپڑے پہنا کرتا ہے۔ امامن کسی برات میں شریک ہونے تو نہیں آئی ہے جو اسکے کپڑوں کو کیا دیکھنا"

اب میں بے انتہا شرمندہ کھڑی تھی کہ یا اللہ یہ کیا مصیبت آگئی اور کیوں میں اپنی زبان سے اتنی سی بات نکال کے گنہگار بنگئی۔ اتنے میں شاکرہ کی چیخ کی آواز نکلی اور خالہ جان جھٹ سجدے میں گر پڑیں اور اسطرح بات آئی گئی ہوئی ورنہ خدا جانے کب تک میرا پیچھا نہ چھوٹتا۔

امامن پان بہت کھاتی ہیں ایک طرف کا گال حد سے زیادہ پھولا ہوا اور نیچے کو لٹکا ہوا تھا، بالکل ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ مسوڑھے میں کوئی بڑا بھاری پھوڑا نکل آیا ہے۔ خالہ جان برابر رو رہی تھیں، ہم سب بیچین تھے مگر امامن ہر دس منٹ کے بعد خوب بہت سی چھالیا کا پان منہ میں رکھے چلی جا رہی تھیں، اور ہر پانچ منٹ کے بعد زچہ کی چارپائی کی پٹی سے منہ جھکا کر اچھی خاصی کوئی ایک چھٹانک پیک فرش پر تھوک دیتی مجھے گھن آ رہی تھی اور بہت ہی برا معلوم ہو رہا تھا۔ مگر اب اتنی ہمت لاتی کہ پھر کچھ کہکر ہزاروں صلواتیں سنتی، وہ پان بیکیں تھوکتی رہیں اور میں خون کے سے گھونٹ پیتی رہی۔

اتفاق سے میری نظر پڑ گئی تو میں نے دیکھا کہ امامن کے ناخن بھی بہت بڑھے ہوئے تھے تھے، اور میل بھر جانیکی وجہ سے سامنے کیطرف بالکل کالے ہو رہے تھے، اب تو آپا مجھ سے نہ رہا گیا اور یہ سوچکر کہ خدانخواستہ

خدانخواستہ اگر ان ناخنوں کا ذرا سا بھی میل کہیں شکارہ کے زخم میں چلا گیا تو دشمنوں کی جان کے لالے پڑ جائیں گے اور بے چارہ بچہ کا کہ بی اماں تم نے اپنے ناخن کاٹ لیے ہوتے تو اچھا تھا۔ کیونکہ ان ناخنوں کا زہر تو زچہ کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔

ابھی میں پورے طور سے کہنے بھی نہ پائی تھی کہ بی اماں نے بڑی تیز آواز نکالی اور خوب چیخ کر دیں کہ لڑکی تجھے ہولا گیا ہے ذرا ہوش کی باتیں کر۔ انہی ہاتھوں سے تو تو بھی پیدا ہوئی تھی۔ خدا جھوٹ نہ بلائے تو ہزار ہا بچے انہی ہاتھوں اور انہیں ناخنوں سے پیدا کر دیئے۔ زچہ تو نگوڑی درد سے بلبلا رہی ہے اور میں بیٹھو گی اپنے ناخن کاٹنے اور سر دھونے اور نہانے۔ پھر بھلا میرے آنے کا فائدہ کیا۔ شکارہ سے تو مجھے جب ہو اسکا کام تو خیر میں کر ہی دوں گی مگر اب سے میں تو بہ کرتی ہوں جو کبھی اس گھر میں قدم رکھوں۔

اس دھمکی کا خالہ جان پر وہی اثر ہوا جو بی اماں چاہتی تھیں وہ مجھ پر ناراض ہونے لگیں اور میں اپنا سا منہ لیکر چپ ہو گئی۔

فہمیدہ۔ توبہ توبہ! خدا بچائے ایسے جاہلوں سے۔ میں تمہاری جگہ تو جاہے خالہ جان برا مانتیں یا بھی جان، میں تو اسی وقت بی اماں کو دھکے دیکر گھر سے نکال دیتی۔ غضب خدا کا ایسی بی کو اپنے ہاتھوں کی صفائی تک کا خیال نہ ہو وہ بھلا اس قابل ہے کہ اسے زچہ کے پاس بھی کھڑا رہنے دیا جائے اور پھر جب اسکے اپنے کپڑے اور ہاتھ اسقدر میلے تھے تو اور سامان تو اس سے بھی زیادہ گندہ اور غلیظ ہو گا۔

فہمیدہ۔ اے ہے آپا اب میں کیا بتاؤں کہ سامان کیسا تھا۔ ایک ٹوٹے ہوئے گھڑے کا ٹھیکرا، دس پانچ پھٹے پرانے چیتھڑے، ایک انگیٹھی اور ایک مٹی کے تیل کا چراغ، بس یہی کل سامان تھا۔ جس کمرے میں زچہ کو رکھا گیا تھا وہ ایک چھوٹی سی کوٹھری تھی جسمیں نہ روشن دان تھے نہ ہوا آنے اور بی اماں کے حکم سے ہوا کو روکنے کے لیے اتنی احتیاط اور بھی کر لی گئی تھی کہ دروازے پر خوب موٹی چادر کا پردہ ڈال دیا گیا تھا۔ اب اس ذرا سی کوٹھری میں کہ جسمیں ایک آدمی کے لائق بھی ہوا نہ تھی چار پانچ عورتیں بیٹھی تھیں اور ایک انگیٹھی سلگ رہی تھی، میرا تو جب دم گھٹنے لگتا تھا تو میں اُٹھکر بھاگتی تھی اور تھوڑی دیر تک باہر کی ہوا میں سانس لیکر پھر اندر چلی جاتی تھی، زچہ کو اس کوٹھری میں رکھنے سے پہلے یہ بھی نہیں کیا گیا تھا کہ اسمیں جھاڑو ہی دیدی جاتی اور اچھی طرح صاف کر دیا جاتا۔ چاروں طرف دیواروں میں جالے لٹک رہے تھے ہر چیز پر سیروں خاک جمی ہوئی تھی اور کونوں میں گھر کی ٹوٹی پھوٹی اور میلی کچیلی چیزوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے، مجھے تو حیرت یہ تھی کہ یوں تو وہ سب بیویاں بہت صاف ستھری رہنے والی اور اچھے گھرانوں کی تھیں لیکن ان باتوں کیطرف کسی کا دھیان ہی نہیں جاتا تھا۔ میں آپ سے زچہ خانہ کی صفائی کے متعلق بہت کچھ سن چکی تھی اسلیئے برابر یہی خیال لگا ہوا تھا کہ وہی تشنج کی بیماری جسکا نام خدا جانے آپ نے کیا بتایا تھا کہیں شکارہ کو نہ ہو جائے۔

فہمیدہ (مسکراکر) ٹے ٹینس یا کزاز بتایا ہوگا۔ ۱

حمیدہ۔ جی ہاں ٹے ٹینس۔

فہمیدہ۔ اللہ نہ کرے بہن جو کسی کو وہ بیماری ہو وہ بڑی خطرناک اور مہلک ہوتی ہے مشکل سے ہی کوئی اس سے بچتا ہے۔ ہندوستان میں ہر سال صدہا زچائیں اور بچے اسی بیماری سے ضائع ہوا کرتے ہیں اور تماشا یہ کہ ہم اسے آسیب کا خلل سمجھکر بالکل مطمئن ہو جاتے ہیں۔

حمیدہ۔ اسکے بعد آپا جب بچہ پیدا ہو چکا تو اسکا نال کاٹنے میں تو بی اماں نے اپنا کمال کمال ظاہر کر دیا کسی پھوہڑ عورت کا ترکاری کاٹنے کا چاقو بھی اتنا میلا نہیں ہوتا جیسا بی اماں کا وہ نشتر تھا۔ میلا، غلیظ اور جانے کب کا زنگ کھایا ہوا چاقو جب انھوں نے اپنے میلے چیتھڑوں جیب میں سے نکالا تو میری روح فنا ہو گئی۔ آپا! جب تک میں انہیں روکوں روکوں انہوں نے اسی سے نال کاٹ کوٹ الگ بھی کر دیا۔

فہمیدہ۔ توبہ توبہ! اللہ ان جاہل دائیوں سے بچائے!

حمیدہ۔ اچھا آپا اب پھر کسی وقت اور سب باتیں آپکو سناؤں گی



گھر کی اِصلاح

(از جناب فخرالدین احمد صاحب)

ہر چیز کا ایک دور ہوتا ہے اسکے بعد وہ تقریباً فنا ہو جاتی ہے، یہی دور اُس چیز کے فیشن کے مترادف خیال کیا جاتا ہے یہاں تک کہ فیشن متروک ہو جاتا ہے اور فیشن کے ساتھ ہی ساتھ وہ شے بالکل غائب یا تقریباً مفقود ہو جاتی ہے۔ بس یہی حالت آج قوم پر نوحہ خوانی کی ہے ہر کس و ناکس اس بیچاری کی حالت پر آنسو بہاتا نظر آتا ہے۔ جہاں چند آدمی کسی صحبت میں ایکجا جمع بیٹھے۔ اور .... ہر شخص انتہائی دلچسپی کے ساتھ قوم کی حالت پر نکتہ چینی کرکے گویا اپنی بیداری کا ثبوت دیتا ہے۔ خصوصاً وہ حضرات جن کے جسم پر کوئی دیسی کپڑا بھی ہو یا جنہیں بقیہ افرادِ قوم سے کسی اور بات میں کوئی امتیازی خصوصیت حاصل ہو۔ اب ان حضرات کی روشن ضمیری اور قومی ہمدردی پر کون شبہ کر سکتا ہے جنہوں نے حسنِ اتفاق سے کوئی کھادی کا کپڑا بنوایا یا پہنا ہو۔ یا اس بے ریشی کے دور میں چہرہ پر داڑھی رکھنے کی زحمت گوارا کر لی ہو۔

بعض موقعوں پر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ اس قسم کی گفتگو کے موقع پر خاموشی گویا بے حسی کی مترادف خیال کیجاتی ہے۔ [illegible] بات یہ ہے کہ ایسے مباحث میں حصہ نہ لینے والا نہ معلوم ہو [illegible] بلاوجہ بھی اپنے آپ کو قوم کا لیڈر اور بڑے سے بڑے [illegible] معاملہ فہم سمجھنے لگتا ہے۔ تو گویا قومی معاملات پر بحث و تنقید بھی بطور فیشن کے ہوتی ہے۔ جسکا زمانۂ عروج غالباً [illegible] انتہا دیکھئے کب ہو۔؟

یہ حالت تو عام لوگوں کی ہے لیکن ہر وہ فرد جو آج علمی سیاسی [illegible] میں حصہ لے رہا ہے اور قوم کی رہنمائی کا دعویدار ہے اُسکی آہ و بکا اور گریہ و زاری، اُس کی بے چینی اور گھبراہٹ کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔

اخبار و رسائل کیطرف توجہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ سراپا ماتم بنے ہوئے ہیں، تحریر کی ایک ایک سطر اور سطر کا ہر ایک لفظ خون کے آنسو رو رہا ہے۔ مضمون نگار حضرات نے قوم پر یہ [illegible]

گوئی کو پیشہ بنالیا ہے گویا "ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی" آج ہم پر صادق ہے۔ اخبارات اور رسائل نے تو قوم پر آنسو بہانے کے لیے مختلف طریقے تجویز کیے ہیں۔ اپنے صفحات اسکے لیے وقف کر دیے ہیں۔ بہت سے تو ایسے ہیں جنہوں نے نوحہ خوانی کو اپنا مقصد قرار دے لیا ہے، اخلاقی پستی دور کرنیکے لیے، سیاسی بیداری پیدا کرنیکے لیے، معاشرتی اصلاح کے لیے، اخبارات و رسائل حشرات الارض کیطرح نکل رہے ہیں۔ لیکن اس تمام ہنگامہ آرائی کے باوجود قوم کی وہی حالت ہے۔ وہ جہاں تھی اب بھی وہیں ہے تعجب خیز امر ہے کہ کہا جاتا ہے کہ مسلمان اقلیت میں ہیں، اُن کے پاس مال و دولت بھی نہیں تعلیم بھی نہیں جو رازِ حیات سے آگاہ ہوں اور نوائے حیات پر کان دھریں، لیکن اگر غور سے دیکھئے تو مسلمان آبادی میں نسبتاً زائد ہیں اور اُس تعلیم کے حاصل کرنے میں بھی مسلمان روزانہ بڑھ رہے جسکو روحِ حیات تصور کیا جاتا ہے۔ مالی حالت کو خراب ہے، لیکن کل کی نسبت بہت کچھ زائد خراب نہیں، پھر جب آبادی بھی بڑھتی جاتی ہے، تعلیم بھی ترقی پر ہے تو آخر یہ کیا قیامت ہے کہ کل کی نسبت آج مسلمان کا وقار کم ہے، اسکی اخلاقی حالت آج کل سے زائد بد ہے اور بدتر ہونیکا خیال ہے۔ وہ کل اگر خطرہ کے وقت متحد ہو جاتا تھا تو آج اس قیامت پر بھی وہ ایک دوسرے سے منحرف ہے۔ کل اگر مرنے کے لیے تیار رہتا تھا تو آج موت سے خائف ہے کل اگر ایک سرسید باوجود سخت مخالفت کے قوم کو ایک نقطہ پر جمع کر سکتا تھا تو آج ہزار محمد علی باوجود خطرہ کے احساس کے قوم کو ضروری سے ضروری اور اہم سے اہم مسئلہ میں متفق نہیں کر سکتے، آخر یہ کیا قہرِ الٰہی ہے کہ کل اختلاف رائے ہوتے ہوئے اتحاد ممکن تھا اور آج اتحاد کی آرزو کے بعد بھی وہ ممکن نہیں۔ آج

ہر شخص نجات کا خواہشمند ہے ہر شخص اپنی زندگی پر ملال ہے ہر شخص پر بربادی اور تباہی کا خوف ہے لیکن ان سب کے باوجود قوم کی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے۔ آخر یہ کیا ماجرا ہے؟ کیا کسی نوحہ گر نے اسپر بھی نوحہ کیا۔ اسپر بھی کسی نے مرثیہ پڑھا؟ اسکا بھی علاج سوچا؟ اگر نہیں تو پھر نوحہ گری بیکار ہے۔ اور اگر سوچا ہے تو پھر وہ کیا ہے؟

اب ضرورت اس امر کی نہیں کہ آہ و بکا سے کام لیا جائے اور گرمیٔ محفل کے سامان مہیا کیے جائیں بلکہ ضرورت اصلاح کی ہے "قوم کی اصلاح کی نہیں" قومی لیڈر کی اصلاح کی نہیں بلکہ فرد واحد کی اصلاح کی اپنی اصلاح اور اپنے متعلقین کی اصلاح کی، اگر آج آپ کو اسکا احساس ہے کہ کل قوم کے ساتھ کیا ہونیوالا ہے، اگر آج آپ قوم کی کمزوریوں سے آگاہ ہو گئے ہیں تو پھر دیر کیوں ہے۔ اپنی اصلاح کیجئے اپنے گھر کی اصلاح کیجئے قوم کی اصلاح خود بخود ہو جائیگی، اگر آپ کو یہ شکایت ہے کہ آپکے رہنما متحد و متفق نہیں ہوتے، اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آپکے رہنماؤں کو وقت کی نزاکت کا کچھ احساس نہیں تو للہ آپ خود اپنے گھر میں متحد اور متفق ہو جائیے۔ آپ اپنی روزانہ زندگی میں وقت کی نزاکت کا خیال کیا کیجئے، پھر خود ہی دیکھئے گا کہ کل جو لیڈر بھی آئیگا اُس میں وہی اوصاف ہونگے جنکی کمی آج آپ کو محسوس ہو رہی ہے۔

آپکے رہنما فرشتہ نہیں پھر وہ اپنی فطرت کو کیسے تبدیل کر سکتے ہیں؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ جسکی روزانہ زندگی کا کوئی نظام نہ ہو جسکے اعمال اور جس کی نقل و حرکت کسی قاعدہ اور قانون کی پابند نہ ہو جو اپنے چھوٹوں اور بڑوں سے روادارانہ سلوک نہ کر سکے۔ وہ عملی زندگی میں کس قاعدہ کی پابندی کریگا! وہ کب دوسروں کے ساتھ بلا مجبوری کے رواداری برتے گا؟ اور کب دوسروں

کیسا مقابل کر کام کرسکے گا؟ اسلیے افعال کہاں تک موقع اور محل کے پابند ہوں گے۔ یہی وہ خامیاں ہیں، یہی وہ کمزوریاں ہیں، یہی وہ کوتاہیاں ہیں جو آج عملی زندگی میں افراد کی ناکامیوں نامرادیوں کا باعث ہیں۔

ظاہر ہے کہ قوم کسی درخت کو کسی پرند یا چرند کو نہیں کہتے بلکہ فرد واحد ہی قوم ہے، اچھے اور برے سب ہی جگہ ہوتے ہیں۔ یہ ممکن نہیں کہ سب کے سب انسان کامل ہو جائیں، لیکن یہ ممکن ہے کہ زیادہ سے زیادہ افراد ایسے ہوں جو کامل نہیں تو بہتر قسم کے انسان ضرور ہوں۔ گویا ان کی معاشرت کسی قاعدہ اور قانون کے ماتحت ہو، ان میں اتفاق ہو، آپس میں بڑوں اور چھوٹوں سے رواداری برتیں، وہ اپنے مقاصد میں خیالی مشکلات کو نہ حائل دیں، اُن کے مقاصد بلند اور اعلی ہوں۔ اسطرح گویا خانگی زندگی میں زید و عمر کی اصلاح ہی قومی اصلاح و ترقی کے مترادف ہے۔ اتحاد کی ضرورت ایک گھر کے اور ایک خاندان کے ایک محلہ کے بچوں اور بوڑھوں عورتوں اور مردوں میں ہو نہ کہ لیڈروں میں، اور حسن انتظام کی ضرورت گھر میں ہے۔ قومی اداروں اور قومی درسگاہوں کے دفاتر میں نہیں صفائی اور پاکیزگی کی ضرورت ہر فرد کے جسم اور لباس کو ہے مسجدوں اور قومی عمارتوں کو نہیں۔ جو عادت گھر میں رہ کر ماں باپ، بہن بھائیوں میں بیٹھ کر نہ پڑ سکی۔ اس عادت کا اظہار عملی زندگی کسطرح ممکن ہے جس نے اپنا ذاتی کام پورے انہماک اور پوری کوشش اور پورے احساس ذمہ داری کیساتھ نہ کیا ہو۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ قومی زندگی میں تجاویز منظور کرانے کے علاوہ کچھ اور بھی کرسکیگا۔ عملی زندگی میں اور زمانہ کی کشمکش میں کسطرح جد و جہد سے کام لے سکیگا۔ بس جس روز ہم نے اپنے ذاتی اور اپنے گھر کی اصلاح شروع کر دی سمجھ لیجئے کہ قومی اصلاح کے لیے پہلا قدم اٹھا دیا گیا۔

زندگی کے ہر پہلو پر بحث کرنا نہ یہاں ممکن ہے اور نہ ایک مبتدی کا مطالعہ اسکا متحمل۔ ایکطرف صرف اسقدر کرنا ہے کہ آپ نے اس نازک حالت پر آنسو کا ایک قطرہ بھی بہایا ہے؟ اگر آپ کو کبھی اپنی پستی کا احساس ہوا ہے؟ اگر آپ کے ذہن میں آئندہ دنیا کا کوئی دھندلا سا نقشہ سامنے آگیا ہے؟ اگر آپنے اپنے ماضی کی کسی بڑے بوڑھے سے دلی کہانی سنکر اپنے حال پر افسوس کیا ہے؟ اگر آپنے کبھی اپنے مستقبل پر غور کیا ہے؟ اگر آپ کو دنیا میں باعزت زندگی بسر کرنیکا کبھی خیال آیا ہے؟ تو پھر یہ خاموشی کہاںتک؟ اپنی ذات سے اور اپنے گھر سے یہ بے نیازی کب تک؟ فکر فردا کیجئے۔ لذت بیدار پیدا کیجئے۔ سراپا نالہ و فغاں بن جائیے، لیکن خدا کے لئے دل کو نہ گرمائیے۔ اپنے ساتھ اپنی شعلہ افشانی سے اوروں کو نہ رلائیے بلکہ دل کے خلوت خانہ میں خود ہی روئیے اور خود ہی جلیے۔ زندگی کا ثبوت دیجئے مگر اپنے اعمال سے۔ اپنی جلوت سے نہیں بلکہ اپنی خلوت سے۔

اگر آپنے اپنی اور اپنے گھر کی اصلاح کر لی، اگر آپ نے احتساب نفس کیا، اگر آپنے اپنی خامیوں کو دور کر دیا۔ اگر وہ چیزیں جنکو آج آپ ناقابل عمل سمجھے ہوئے ہیں کل آپ نے اُن کو ممکن بنا دیا تو یقین جانیے کہ قوم کے نصیب جاگ اُٹھے اور اگر کہیں خدانخواستہ آپ اپنی زندگی پر قانع ہیں اور اپنی اصلاح سے ناامید ہیں تو پھر اس زمین کو خالی کر دیجئے۔ آپ کے لئے یہ جگہ نہیں پہاڑوں اور جنگلوں میں چلے جائیے اللہ کی یہ زمین اُسی کے لئے ہے جو راہ عمل میں گامزن ہے۔ نہ کہ اُسکے لئے کہ جو شاہراہ حیات پر چلنے والوں کی راہ میں روڑے اٹکائے۔

اب وقت انفرادی طور پر عمل کرنیکا ہے نہ کہ مضمون نگاری کا

اور تقریر بازی کا اگر اب بھی بادۂ شبانہ کی سرمستی اور لذتِ خوابِ سحر نہیں مجبور بنا دیا گئے تو گو ہم دوسروں کے لئے جگہ خالی نہ کریں لیکن دنیا ہم کو خود ہی چھوڑ دیگی ۔ عاد و ثمود کا قصہ چھوڑیئے، مصر یونان اور ہندوستان کی قدیم تہذیب کیطرف بھی توجہ نہ کیجئے موجودہ سائنس اور آرٹ کے سرچشمہ بغداد کو بھی بھلائے ہی رکھئے ۔ روس کے انقلاب کی بھی پرواہ نہ کیجئے، خود اپنی حالت دیکھئے اور اپنے بھائیوں کی حالت دیکھئے - اپنی کل سے اپنی آج کا مقابلہ کیجئے اور دیکھئے کہ اس رہرو درماندہ کیساتھ دنیا نے کیا کیا؟ ورنہ اگر یہی منزل سے بیزاری ہے تو تیار ہو جانا چاہیئے کہ کل زمانہ آپ کو خود ہی مجبور کر دیگا اور ہم اُس حالت پر خود بخود ہی آجائیں گے جس حالت پر اس قسم کی اور قومیں آپ کو نظر آرہی ہیں اور جن کو آپ بھی نظرِ حقارت سے دیکھتے ہیں -

تپش میکند زندہ تر زندگی را
تپش مید ہد بال و پر زندگی را

(نوٹ) فاضل مضمون نگار کے خیالات سے ہمیں کامل اتفاق ہے اس حقیقت سے کہ انکار ہو سکتا ہے کہ کسی قوم کے افراد ہی کے سدھرنے کا نام قوم کا سدھر جانا ہوا کرتا ہے" اور اصلاح کی ابتدا ہمیشہ گھر ہی سے شروع ہونی چاہیئے لیکن یہ سمجھ میں نہ آیا کہ لائق مضمون نگار کو یہ بات کیوں ناپسند ہے کہ ایک مست خواب قوم کو بیدار کرنیکے لئے بیدار شدہ افراد بار بار جھنجوڑتے رہیں اور اُسکے حالِ زار پر آنسو بہایا کریں آخر خود فاضل مضمون نگار کو بھی اُسی "فیشن" کی بھی تقلید کرنی پڑی ہے اور قوم کا نہ سہی قوم کے مرثیہ خوانوں کا رونا رونا پڑا ہے - جگائے بغیر کوئی کیسے جاگ لیگا؛ اور جگائے بغیر قوم کسطرح بیدار ہو جائیگی - دل کا درد ہر مضمون نویس کو اسی طرح مجبور کر دیتا ہے کہ جسطرح آپ کو مجبور ہونا پڑا - حقیقت یہ ہے کہ سوئی ہوئی قوم مردہ ہوتی ہے، اور مردوں کے نوحہ اور مرثیہ کے سوا کیا لکھا جا سکتا ہے، جو کچھ خود آپ نے تحریر فرمایا ہے یہ بھی ایک مرثیہ ہی ہے اور ہر شخص ایسی ہی کچھ لکھنے پر مجبور ہے اور جو مشورہ کہ ناصحانِ مشفق کو آپ دے رہے ہیں اسکی حیثیت بھی اُن کے کام میں روڑا اٹکانے سے زیادہ اور کچھ نہیں ہو سکتی اگر یہ یقینی ہے کہ وہ درحقیقت قوم کو بیداری کرنے میں مصروف ہیں ("سعید")

میرا خدا اور میری قوت بازو

(از سعید احمد)

بیکن کا مقولہ ہے کہ مذہب کے بعد اس دنیا میں انسان کو جرم و گناہ سے بچانے والی سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ وہ اپنی عزت خود کرتا جانتا ہو۔

جو لوگ خود ہی اپنی عزت نہیں کرتے اور جو اپنی نگاہوں میں خود ذلیل ہیں ان کی عزت کرنے کی کسی دوسرے کو کیا غرض پڑی ہے اور ایک ایسا شخص جس کی کوئی عزت نہ کرتا ہو اور جس کے لئے ذلت و تحقیر کوئی نامانوس اور عجیب چیز نہ ہو ہر ذلیل سے ذلیل کام کرنے کے لئے آمادہ ہو سکتا ہے چوری کرکے اپنا پیٹ بھر لینے یا بھیک مانگ کر بھوک کی آگ بجھا لینے کا خیال ہر مزدور تمند کے دل میں آسکتا ہے اور آیا کرتا ہے، لیکن اس قسم کی مجرمانہ اور ذلیل تدبیروں سے فائدہ صرف وہی لوگ اٹھایا کرتے ہیں جنہیں عزت نفس موجود نہ ہو اور جن کے نزدیک عزت و ذلت کا سوال کوئی معنی نہیں رکھتا ہے

"ہم کیا کر سکتے ہیں" "ہم سے ہو ہی کیا سکتا ہے" "ہمارے کیے کیا ہو سکتا ہے وہی ہوگا جو تقدیر میں لکھا ہے" یہ اور اسی قسم کے بہت سے جملے اکثر ان بے ہمت اور کاہل نوجوانوں کی زبان سے سننے میں آیا کرتے ہیں جنکی سستی اور عیش پسندی انہیں کچھ کرنے کی اجازت نہیں دیتی، اور جو اپنے احدی پن کے لئے طرح طرح کے فضول اور لایعنی بہانے ڈھونڈھتے ہیں۔ یہ تو سچ ہے کہ وہی ہوتا ہے جو تقدیر میں لکھا ہے لیکن اپنی تقدیر میں کچھ لکھانا ہمارا اپنا کام ہے ہمارے پیدا کرنے والے نے ہمیں اس دنیا میں مجبور محض بنا کر نہیں بھیجا ہے۔ ہم مجبور ہیں لیکن صرف اسی حد تک کہ چنے یا جو بو کر گیہوں نہیں پیدا کر سکتے۔ چنا اگر بویا جائے تو اس سے صرف چنے ہی کا درخت اُگنا تقدیری ہے اور اسے بدلنے کی طاقت ہم میں نہیں ہے لیکن اس بات کی ہمیں کامل آزادی حاصل ہے کہ اپنی زمین میں جب جی چاہے چنے بو دیں اور جب جی چاہے گیہوں۔

انگریزی زبان کی ایک مثل ہے کہ تم خود اپنے دوست بنجاؤ تو پھر سب تمہارے دوست بنجائیں گے" حقیقت یہ ہے کہ ہم میں سے بہت سے لوگوں کی ناکامی کا اصلی باعث یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنے دوست نہیں ہوتے اور ان کی اپنی نگاہوں میں اپنی عزت نہیں ہوتی۔ وہ ہمیشہ کچھ دبے دبے اور کھچے کھچے رہتے ہیں کسی مجمع میں جاتے ہیں تو ایسے سکڑے سکڑائے اور سہمے سہمائے کہ جیسے کہیں سے چوری کرکے آئے ہیں۔ یا اب فرشتے ان کا دل لیکر بھاگنے کا ارادہ، وہ ہر وقت اپنے دل میں کچھ ایسا محسوس کرتے ہیں کہ یہ دنیا ہم سے بہت بہتر لوگوں کے رہنے کی جگہ ہے اور قضا و قدر نے کسی اتفاقی غلطی کی بنا پر ہمیں یہاں پیدا کر دیا ہے کبھی کسی مجلس میں گفتگو کرنیکا اتفاق پڑ جائے تو اگرچہ وہ اپنی تمام عمر اپنی مادری زبان میں ہی بات چیت کرتی رہی ہیں لیکن اب انہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس مجلس میں تقریر کرنے کے لئے کسی دوسری ہی زبان کی ضرورت ہے اور انکی اپنی زبان اظہار مطلب کے لئے ناکافی ہے۔ ان کا حلق خشک ہو جاتا ہے۔ زبان پر کانٹے جم جاتے ہیں آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا ہے اور ہاتھ پاؤں کانپنے لگتے ہیں اور ان سے ایک لفظ بھی نہیں بولا جاتا۔ انہیں اگر کوئی کام کرنے کے لئے دیا جائے تو جس وقت تک امتحان اور مقابلہ کا کوئی سوال نہ ہو اس وقت تک تو وہ اسے بلا تکلف اور خاصی اچھی طرح کرتے رہیں گے، لیکن اگر انہیں یہ شک ہو جائے کہ اس کام کو دیکھا جائیگا اور دوسرے کام سے مقابلہ کیا جائیگا تو فوراً انکا دل ڈر جاتا ہے۔

اور یہ خیال غالب آجاتا ہے کہ مجھ سے یہ کام کیسے ہو گا اور یہی فی الحقیقت وہ اُن سے نہیں ہو سکتا دل کا شک اپنی قابلیت کی جانب سے بے اعتمادی اور ناکامی کا خوف اُن کے ہوش و حواس کو معطل اور اُنکے ہاتھ پیروں کو بیکار کر دیتا ہے اور وہ کام کو بگاڑ دیتے ہیں۔

تودی نے ایک موقع پر کہا ہے کہ ہماری ناکامیوں میں سے اکثر کا باعث صرف یہ چیز ہوتی ہے کہ ہمیں اپنی قابلیت پر بھروسا نہیں ہوتا ہے۔ طاقت درحقیقت جسمانی طاقت کا نام نہیں ہے بلکہ دل کی مضبوطی اور اپنی قوت بازو پر بھروسے کا نام ہے اور جن لوگوں کو اپنی قوت اور اپنی قابلیت پر بھروسا نہو وہ خواہ کیسے ہی تنومند اور لائق کیوں نہ ہوں ان سے زیادہ کمزور نالائق کوئی اور نہیں ہو سکتا۔"

اپنی قوتِ بازو اور اپنی شجاعت و جانبازی پر اگر کامل بھروسا نہ ہوتا تو غزوۂ بدر میں یہ کیسے ممکن تھا کہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم مٹھی بھر پیدل اور تقریباً غیر مسلح مسلمانوں کو لیکر ٹڈی دل کفار کے سواروں اور پیادوں کے مقابلہ میں نکل کھڑے ہوتے؟ اپنی جرأت و ہمت، اور اپنی دلیری اور سرفروشی پر بھروسا رکھنے ہی کی بدولت عرب کے نوجوان جنرل طارق نے ساحلِ ہسپانیہ پر اپنی فوجیں اتارنے کے بعد حکم دیا تھا کہ جن کشتیوں پر سوار ہو کر ہم آئے ہیں وہ جلادی جائیں تاکہ واپس جانیکا کوئی ذریعہ نہ رہے کیونکہ ہم واپس جانے کیلئے نہیں آئے ہیں یا تخت لینگے یا تختہ۔

رانا رنجیت سنگھ اپنی فوج کو لیے ہوئے جارہا تھا کہ جب اسکے راستے میں دریائے اٹک حائل ہوا تو یہ اعتماد علی النفس ہی تھا کہ جسکی بدولت اُس نے یہ کہکر دریا میں گھوڑا ڈال دیا کہ اٹک اُنہیں کو روک سکتا ہے کہ جن کے دلمیں اٹک ہو۔

ایلپس جیسے پہاڑ کی چوٹیوں پر اپنی بھاری بھاری توپوں کو چڑھا کر لیجانیکا خیال اگر آسکتا تھا تو نپولین ہی جیسے بہادر کو آسکتا تھا جسے اپنی قوت بازو پر اسقدر بھروسا تھا کہ زبان کی لغت سے "ناممکن" کے لفظ ہی کو مہمل اور بے معنی قرار دیکر خارج کر دینا چاہتا تھا۔

مصطفیٰ کمال پاشا کو خود حکومت ترکیہ باغی اور ڈاکو کا لقب دے چکی تھی یونانیوں کو ترکی پر اچھی طرح غلبہ حاصل ہو گیا تھا، اور بظاہر اس سلطنت کی محفوظ رہنے کی کوئی امید باقی نہ تھی لیکن ایسے ناموافق حالات میں بھی مصطفیٰ کمال کو جس چیز نے اُٹھ کھڑے ہونے پر آمادہ کیا وہ یہی اعتماد علی النفس تھا، انہیں یقین تھا کہ ہم یونانیوں کو اپنے ملک سے مار کر نکال دیں گے اور ایسا ہی اُنہوں نے کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں کامیابی اور فتحمندی صرف اُنہیں لوگوں کا حصہ ہے جنہیں خدا کی مدد اور اپنی قوت بازو پر کامل بھروسا ہو۔ اور جن کے دلمیں کبھی بھول کر بھی ناکامی اور شکست کا خیال نہ آئے۔

شیخی اور تعلّی کی باتیں دوسروں کی زبان سے ہمیں اکثر بری معلوم ہوا کرتی ہیں اور یہ ہے بھی صحیح کہ لاف و گزاف مارنا اور شیخی بگھارنا کوئی اچھی بات بھی نہیں ہے لیکن اگر یہ شیخی جھوٹی نہ ہو اور ایسے لوگ جو بڑھ بڑھ کر باتیں مارا کریں کچھ کام کر کے دکھائیں تو مجبور ہو کر ماننا پڑیگا کہ وہ ان لوگوں سے ضرور بہتر ہیں جو ہر وقت کسر نفسی کیا کرتے ہیں اور جنکا یہ اعتقاد کہ ہم کسی قابل نہیں ہیں۔ اور ہم سے کچھ بھی نہیں ہو سکتا، انہیں درحقیقت کچھ نہ کرنے دیتا۔ اس قسم کے سوئے ہوئے یا سو سو کر وقت گذارنے والے شیر سے ظاہر ہے کہ بھونکنے والے کتے بہت کچھ بہتر ہیں۔

ایسے لوگ بکثرت موجود ہیں جنہیں زمانہ کی ناقدر شناسی کی شکایت اور جن کا یہ خیال ہے کہ اب اس زمانہ میں اہل کمال کی کوئی قدر نہیں ہے، ان بزرگوں کا یہ خیال بالکل غلط ہے۔ اس دنیا میں ہر اور ہر زمانے میں اسی قسم کے لوگ تھے کہ جیسے آج ہیں اور ایسے کی کبھی کسی وقت میں بھی قدر نہ ہوا کرتی تھی کہ جو اپنی قدر خود کرتے نہ ہوں اور جنکی اپنی نگاہوں میں اپنی کوئی عزت نہ ہو۔ جو صاحبانِ

اپنے کو اس درجہ ذلیل کردیں کہ امیروں اور دولتمندوں کو صرف ان کی دولت کی وجہ سے اپنے سے بہتر انسان خیال کرنے لگیں، اور اہلِ دول کے آگے ہاتھ پھیلانے اور اُن کے پاس اپنی حاجتیں لیجانے میں اُنہیں کوئی عار نہ آئے۔ تو سمجھ لیجئے کہ کیا حق ہے کہ وہ زمانہ سے اس بات کی توقع رکھیں کہ زمانہ ان کی عزت و توقیر کریگا اور انہیں اپنے سے بہتر قسم کا انسان سمجھے گا۔ ہماری حالت اور ہماری قابلیت سے کوئی شخص ہم سے زیادہ واقف نہیں ہو سکتا اور اب اگر ہم خود ہی اپنی قیمت کم مقرر کریں تو ظاہر ہے کہ کوئی دوسرا اُسے کیوں بڑھانے لگا ہے۔ ہمارا ہر وقت اظہار کا قابلیت ہمارا رونا، اور لوگوں کی نگاہوں سے خود کو بچانا، بزدلانہ برتاؤ اور ہر قسم کی ذمہ داری قبول کرنے سے ہمارا گریز سب ایسی چیزیں کہ جن سے دوسرے یہ جان جاتے ہیں کہ ہم نے اپنی قیمت کیا مقرر کی ہے اور اسکے بعد لوگوں کا برتاؤ ہمارے ساتھ اسی قسم کا ہونے لگتا ہے۔

جولیس سیزر کا جہاز جب طوفان میں آگیا اور اُسکا ناخدا خوف سے تھرتھر کانپنے لگا تو سیزر نے ڈانٹ کر کہا تھا کہ ڈرتا کیوں ہے کیا تجھے معلوم نہیں کہ اس جہاز پر جولیس سیزر اور اُسکا اقبال سوار ہے؟ نہ جولیس سیزر جہاز کو طوفان سے بچا سکتا تھا نہ اُسکا اقبال لیکن ایک ایسے موقع پر کہ جب وہ بالکل موت کے منہ میں پہنچ گیا تھا اُسکے حوصلہ کی اسقدر بڑائی اور اسکی یہ ہمت افزا تقریر اس بات کا ثبوت ضرور ہے کہ اسے اپنے اوپر انتہا درجہ کا اعتماد تھا۔ اور تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جولیس سیزر نے اسی اعتماد علی النفس کی بدولت بہت ہی بڑے بڑے کام انجام دئیے ہیں۔

کبھی کوئی ایسا شخص کہ جسکی نگاہوں میں خود اپنی عزت کافی ہو ایسا کو گوارا نہیں کیا کرتا کہ اپنی بلند سطح سے نیچے اُتر کر بد اخلاقیوں کا مرتکب ہو، اور دیکھا گیا ہے کہ عام طور پر بد اخلاقیوں کا ارتکاب صرف اُنہیں لوگوں سے ہوتا ہے کہ جنکی خود اپنی نظر میں کوئی وقعت نہیں، اور جو ایک سطح بلند سے نیچے گڑھے میں گر جانا گوارا کر لیتے ہیں۔

مشہور مصنف زرا ڈو نے لکھا ہے کہ درخت کے پھولنے پھلنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ پہلے مضبوطی کیساتھ زمین میں جڑیں پکڑے اور سیدھا کھڑا ہو جائے۔ اسی طرح ایک انسان کیلئے بھی لازمی ہے کہ وہ سب سے پہلے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا۔ اپنی عزت خود کرنا اور اپنے اوپر بھروسا کرنا سیکھے اور دوسروں کی خیرات، امداد کا یا اتفاقی کامیابیوں کا انتظار کرنا چھوڑ دے جب یہ بنیاد قائم ہو گئی تو اسپر آئندہ کیلئے بہتر انسان بننے اور دنیا میں کامیاب زندگی بسر کرنے کی عمارت کھڑی کی جا سکتی ہے۔"

حقیقت بھی یہی ہے کہ دوسروں کا آسرا تکنے والے یا باپ دادا کے ترکہ سے امیر بننے کے خواب دیکھنے والے نوجوان کبھی کسی وقت میں بھی اس قابل نہیں ہوتے کہ دنیا میں کچھ کر سکیں یا اپنے زمانہ سے اپنی عزت کرا سکیں۔

ہماری اپنی زبان میں بھی ایک بہت ہی مشہور مثل ہے کہ "اپنی عزت اپنے ہاتھ ہے" اور شاید ہی کوئی اور مثل اس سے زیادہ سچی اور صحیح ہو ہمارے اپنے دل میں اگر ہماری کوئی عزت نہیں ہے اور اگر ہم اپنے آپ کو ایسے کاموں سے نہیں بچا سکتے کہ جو بے عزتی کا باعث ہوں تو دوسروں کی نظر میں معززبننے کی توقع کو حماقت کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ دولت کے متعلق یہ مشہور ہے کہ وہ ستار العیوب ہے اور آدمی خواہ کتنا ہی بد وضع اور بدکردار ہو لیکن روپیہ اسکے عیبوں کو چھپا لیا کرتا ہے یہ مشہور ضرور ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر بات جو مشہور ہو وہ سچی بھی ہو، ہمارا روپیہ ہمارے عیبوں کو چھپاتا ضرور ہے لیکن صرف ان ہی چند خود غرض بندگانِ زر کی نگاہوں سے کہ جنکی آنکھوں پر خود غرضی اور لالچ نے پردہ ڈال رکھا ہے باقی تمام دنیا کی نظر میں ہمارے عیبوں کو روزِ روشن کیطرح دیکھتی اور ہم سے نفرت کرتی ہیں۔

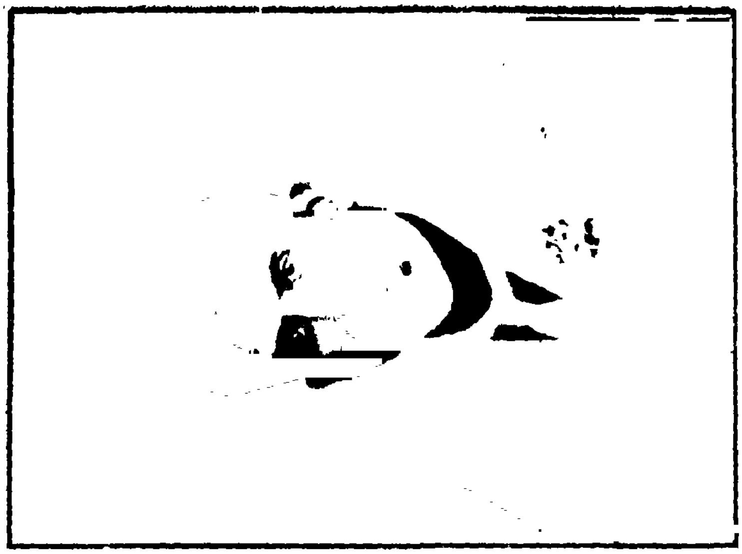
انسان اس دنیا میں خدا کا نائب ہے اور ایک قادرِ مطلق ہستی کا نائب ہونیکے باوجود وہ اپنے آپ کو مجبورِ محض بیکار، اور کچھ نہ کرنیکے قابل سمجھتا ہے تو اسکے معنی صرف یہی ہو سکتے ہیں کہ وہ اس ہستی کو بھی مجبور و معذور خیال کرتا ہے کہ جسکا نائب اور خلیفہ ہے۔ ہمارے اختیارات محدود ضرور ہیں لیکن محدود کے معنی یہ کسی طرح بھی نہیں ہو سکتے کہ ہمارے کوئی اختیار ہی نہیں۔ ایک مشہور فلسفی کا مقولہ ہے کہ وہ عجز و انکسار حکمت و دانائی کے جزو ہیں اور جس انسان میں یہ موجود ہوں اسے ہر دلعزیز بنا دیتے ہیں، لیکن اس زمانہ کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ عجز و انکسار کی

خالق انسان اعلیٰ و علی نفس کو بنا دے اور جسے اپنی قوت بازو پر کوئی بھروسہ نہ ہو حقیقت یہ ہے کہ جسے اپنے اوپر بھروسہ نہ ہو وہ انسان کہلانے کے مستحق نہیں، ادنیٰ ترین موجودہیں سے تر لوگ اکثر غلطی سے بے حسی یا بے بسی یا کم ہمتی کو عجز و انکسار خیال کر لیتے ہیں۔ عجز و انکسار کے معنی فی الحقیقت یہ ہیں کہ ہم اس اعتقاد و اس یقین کی وجہ کہ ہم میں قابلیت اور استعداد موجود ہے دوسروں کو آگے بڑھنے کا موقع دیں اور اپنی قوت بازو پر پورا پورا بھروسہ رکھتے ہوئے بھی ہمیں بڑائی کا اظہار کرنے سے بچاؤ کرنیکا خیال نہ آئے۔ اسکے حضور میں ہمیشہ ہمارا سر تسلیم خم رہتا اور اسکے بندوں کی خدمت کیلئے ہماری کمر طاعت بستہ۔

اس یقین کے بعد کہ ہمارا خدا قادر مطلق ہے اور اس علم کے باوجود کہ ہم اس دنیا میں اسکے نائب ہیں اگر ہمارے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ ہم کسی قابل نہیں ہیں ہم سے کچھ نہیں ہو سکتا تو یہ خدائے پاک کی توہین ہے اسکے یہی معنی تو ہوئے کہ خدا نے چند ناکارہ اور بیچ میرز لوگوں کو اپنا نائب اور خلیفہ بنا کر دنیا میں بھیج دیا ہے جو نہ کچھ کر سکتے ہیں اور نہ کچھ کرنا جانتے ہیں۔ اور جنہیں خود بھی یہی یقین ہے کہ وہ کسی کام کے اہل نہیں ہیں کوئی بادشاہ اگر اپنے ملک کے کسی صوبہ پر حکمرانی کی غرض سے اگر کسی ایسے ہی نااہل اور ناکارہ شخص کا انتخاب کرے تو اس بادشاہ کو کیا کہا جائیگا؟ کیا اسے دانشمند، مردم شناس اور رعایا کا ہمدرد کہا جا سکتا ہے؟ اگر نہیں تو (العیاذ باللہ) ایسے خدا کے متعلق آپ کا کیا خیال ہوگا جو نااہلوں کو اپنا نائب مقرر کر دے۔؟

اپنے خدا پر ناشناسی کا الزام لگانے سے پہلے کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ہم ذرا غائر نظر سے خود اپنی قابلیتوں کا جائزہ لے لیں۔ "ہم سے یہ کام نہیں ہو سکتا"، "ہم میں اس کام کے کرنیکی قابلیت نہیں ہے"، "ہم اس کام کو کرنے سے بالکل عاجز ہیں" کہدینے سے پہلے کیا اس میں کچھ حرج ہے اگر ہم یہ بھی دیکھ لیں کہ جو لوگ اس قسم کے کام کر رہے ہیں اور جنہوں نے اپنے آپ کو کسی کام کے کرنے کا اہل ثابت کیا ہے ان میں ہم سے کونسی بات زیادہ ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں تک انسان ہونے کا تعلق ہے۔ طارق، نپولین، واشنگٹن، مصطفیٰ کمال اور ہم سب کے سب ایک ہی جیسے انسان ہیں۔ پھر آخر ان میں کیا بات تھی کہ وہ کسی کام کو کرتے وقت جھجکتے ہی نہ تھے اور ناکامی کا اندیشہ کبھی انکے دل میں بار ہی نہ پاتا تھا؟ اور ہماری یہ حالت کیوں ہے کہ ادھر کسی کام کا خیال آیا اور ادھر ہمارا دل بیٹھنے لگا۔ ذرا کسی خطرہ کا اندیشہ پیدا ہوا اور ہمارے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے اور جہاں ذرا سی تکلیف پہونچی یا کسی نے خوف دلایا، یا دل کی کسی خواہش نے مجبور کیا اور ہم نے ہاتھ پاؤں ڈھیلے ڈال دیئے اور دوسروں کی یا خود اپنے دل کی خواہشوں کی غلامی کرنے پر آمادہ ہو گئے؟ بات صرف اتنی ہے اور فرق صرف یہ ہے کہ ان اولوالعزم اور گرانمایہ ہستیوں کو اپنے خدا پر پورا پورا بھروسہ تھا اور انکا ایمان تھا کہ اس حکیم مطلق نے اگر ہمیں اپنا نائب بنایا ہے تو کچھ سمجھ کر ہی بنایا ہے ہم مجبور محض نہیں ہیں ہم سب کچھ کر سکتے ہیں، اور ہم اسلئے نہیں پیدا کئے گئے ہیں کہ ذلت اور پستی اختیار کرکے دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلائیں یا دوسروں کی یا خود اپنی خواہشوں کے غلام بن جائیں آگ کے دریا، پانی کے سمندر، آندھیوں کے جھکڑ، اور برق و رعد کے طوفان انکی نگاہوں میں قدرت کے بنائے ہوئے چند کھیل تماشے تھے اور بڑی سے بڑی مصیبتیں اور تکلیفیں انکے لئے ایک دلچسپ تفریح کا کام دیا کرتی تھیں، انہیں یقین کامل تھا کہ ہم مغلوب نہیں غالب ہیں اور ہر قسم کی دشواریاں ہمارے رستے کے صرف چند روڑے ہیں جنہیں ہم ٹھوکر مار کر رستہ سے ہٹا سکتے ہیں، خدا اور اپنی قوت بازو پر کامل اعتماد رکھنے کی وجہ سے انکی ہمتیں بلند رہتی تھیں اور بڑے سے بڑے خطرات کے اندر گھس جانا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

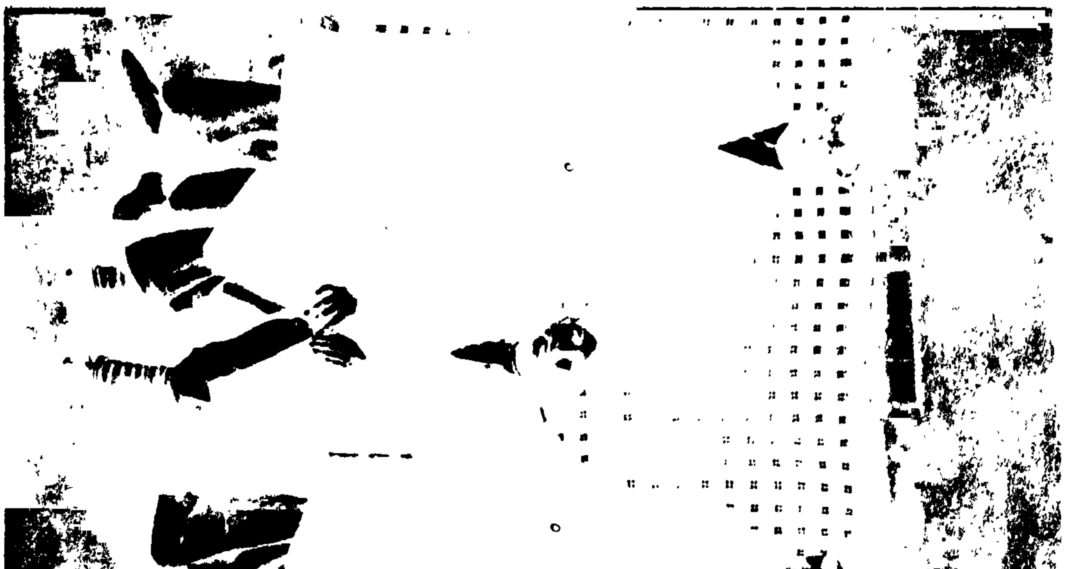
ہمیں اپنے خدا پر بھروسہ نہیں ہے۔ ہم شاید خدا کو بھی قادر مطلق نہیں سمجھتے تو پھر اپنی قوت بازو کی قدرتوں پر ہمیں کیا اعتماد ہوگا، اور اگر خدا کو قادر ہی سمجھتے بھی ہوں تب بھی اسکے متعلق یہ سوء ظن تو ہمارے دلوں میں ضرور موجود ہے کہ اس نے بے دیکھے بھالے اور بے سوچے سمجھے چاہے جن ناکارہ اور نااہل ہستی کو اپنا نائب منتخب کر لیا ہے اس خیال سے ہماری روح کانپتی ہے کہ ہم کوئی ذمہ دار ہستی ہیں اور ضرورت کیوقت ہمیں اپنی مرضی اور اپنے ارادہ سے سمجھ کر کام کرنا چاہیئے کہ ہم ایک ایسی عظیم الشان ہستی کے نائب اور نمائندے ہیں ہم سے غلطی ہو جانا بھی ممکن ہے۔ لیکن کچھ نہ کرنے سے غلطی کرنا بھی بہتر ہے کیونکہ کچھ نہ کرنیکے تو یہی معنی ہیں کہ ہمیں خدا کے انتخاب ہی پر اعتراض ہے۔





[illegible]







نابکار دولت

(از جناب سیّد مغنی الدین صاحب شمسی دہلوی)

میرے ایک دوست نے مجھے ایک عجیب و غریب واقعہ سنایا اور وہ اسطرح شروع ہوتا ہے۔

ایک روز رات گئے میں دریا کے کنارے ایک بنچ پر بیٹھا تھا اِکّا دُکّا راہگیر بھولا بھٹکا ادھر سے گذر تا تھا باقی تمام اطراف و جوانب میں سنسان کا عالم چھایا ہوا تھا۔ شہر کی چہل پہل کی آواز کی بھی کانوں تک رسائی نہیں تھی، رات اندھیری تھی نگاہ دور تک کام نہیں کرتی تھی۔ میں اس قدرتی منظر سے متاثر ہو کر اس اندھیری رات کا لطف اُٹھا رہا تھا اور دل میں یہ خیال کر رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اندھیرے میں بھی دلوں میں کیفیت بیخودی پیدا کرنیوالی قوت ودیعت کی ہے۔

ایسے مقام پر اور خصوصاً اس تنہائی کے عالم میں شام ہو یا رات کسی بنی نوع انسان کے فرد سے جو قریب بیٹھا ہو اپنی دلی کیفیت کا اظہار کرنیکو طبیعت چاہتی ہے اور اسی سلسلۂ گفتگو میں انسان اپنا دلی راز پنہاں بھی افشا کر دیتا ہے۔ اس اجنبی کے نام سے حالانکہ ہم واقف تک بھی نہیں ہوتے اسکا چہرہ اور آنکھیں تو اندھیرے میں دھندلی ہی سی نظر آتی ہیں بیساختہ یہ خیال ہوتا ہے کہ ہم اپنے ہی ہمزاد سے گفتگو کر رہے ہیں لیکن وہ ہمزاد ہماری آواز کی دراصل زندہ گونج ہوتا ہے جو خیالات کہ ہماری روح پر بارگراں گذرتے ہیں۔ اُن کا اظہار اسپر کرکے اپنے دل کی بھڑاس نکالتے ہیں۔ وہ الفاظ مثل زندہ تصویر کے ہمارے مقابل کھڑے ہوئے ہیں۔ یہاں تک کہ ہمارا سایہ بھی ان الفاظ کو خاموشی سے سنتا ہے۔ اور اپنی گوش بر آوازی کا ثبوت۔ آہ بھرنے اور ذرا سی بھی حرکت کرنے پر دیتا ہے۔

اسی فلسفہ سے میرا دماغ پر تھا کہ ایک اجنبی شخص بھی میرے پاس آکر بنچ پر بیٹھ گیا۔ روشنی کی کمی کے باعث میں اچھی طرح اُسکے کپڑے نہیں دیکھ سکا تھا ہاں اسقدر اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ بہت معمولی تھے۔ لیکن معقول تھے۔ کئی بار اُس نے میری طرف دیکھا قیاساً اُسکے چہرے سے چالیس سال کے آثار مترشح ہوتے تھے، منحنی جسم تھا گلا چھوٹی داڑھی پتلی گردن کا سرے آگے کو جھکی ہوئی اس بات کا ثبوت دیتی تھی کہ یہ شخص

سر کا بوجھ بھی سنبھالنا مشکل معلوم ہو رہا ہے۔

اس نے مجھ سے گفتگو چھیڑ دی۔ پہلے اٹک اٹک کر بولنا شروع کیا پھر ذرا جلدی آخرکار ہکلانے پر نوبت پہنچ گئی۔

"جناب من! معاف فرمائیگا میری آپ سے ایک درخواست ہے اور وہ یہ ہے کہ آپ مہربانی فرماکے چند منٹ کے لئے میری باتوں کو سن لیجئے۔ آپ اسوقت اکیلے ہیں اور مجھے ایک ایسے شخص کی ضرورت ہے جو میری کیفیت کو غور سے سنے۔ شاید آپ کے وقت کا زیادہ حصہ جنگل یا اندر دنیا کے کاروبار میں گذرتا ہے، اسی وجہ سے آپ تنہائی کا لطف اٹھانے کے لئے یہاں تشریف رکھتے ہیں لیکن میں بذات خود اکیلا ہوں تخیل کی بنا پر نہیں بلکہ اکیلا اس معنی میں کہ مجھے سب نے چھوڑ دیا۔

میں آپ کو اسکی بابت ذرا تفصیل کیساتھ بتانا چاہتا ہوں کیونکہ مجھ میں اب اس راز کے زیادہ پوشیدہ رکھنے کی قوت نہیں ہے۔ میں نہایت عاجزی سے آپکی خدمت میں درخواست کرتا ہوں۔ کہ آپ جو کچھ میں بیان کروں، ذرا غور سے سنیں۔ میں ایک ناامیدی کا شکار ہوں۔

جس حالت میں آپ مجھے دیکھ رہے ہیں میں ایک متمول شخص ہوں۔ میرے پاس کافی روپیہ ہے، لیکن میں اس روپے سے اپنا پیچھا چھڑانا چاہتا ہوں۔ نہ تو اس روپے کو میں فضول خرچیوں میں اڑانا چاہتا ہوں اور نہ اسکو نیک کاموں کے لئے وقف کرنا چاہتا ہوں، ابھی اور اسی وقت آج ہی رات کو نہیں بلکہ آپکی آنکھوں کے سامنے ہی اسے دریا میں پھینک دونگا۔ کل میں پھر اس شہر میں چلا جاؤنگا۔ اور اپنی اس چھوٹی سی آمدنی پر، جو میری اس روپے کے ملنے سے قبل تھی۔ گذارہ کرونگا۔ میری آمدنی اتنی ہے کہ میں سخت مصیبت کی حالت میں اسکی پناہ لے سکتا ہوں۔

اس سے قبل کہ میں اور عرض کروں آپ کو یہ جتلا دینا چاہتا ہوں کہ آپ مجھے پاگل نہ تصور کریں اور پورے یقین کے ساتھ میری رام کہانی سنیں، میری صدق بیانی پر کسی قسم کا شبہ نہ کریں، میرے کوٹ کی اندر کی جیب میں ایک لاکھ سے زیادہ روپیہ اسوقت نوٹوں کی شکل میں موجود ہے۔ ایک گھنٹہ کے اندر اندر یہ تمام روپیہ دریا میں ڈوبتا نظر آئیگا۔

جناب من مجھے ذرا مفصل بیان کرنیکی اجازت دیں۔ میں نے اپنی تمام عمر میں پہلی مرتبہ آج اتنا بڑا سفر کیا ہے۔ اور بیرونی دنیا کا ایک قلیل ترین حصہ دیکھا ہے میں خیال کرتا ہوں کہ اب آئندہ عمر بھر مجھے ایسے وقت اندھیرے اور سنسان کے عالم میں کسی اجنبی کیساتھ بیٹھنا نصیب نہیں ہوگا۔ اور اسطرح کبھی میری آنکھوں کے سامنے سے دریا نہیں بہتا ہوگا میں کبھی اپنی حدود سے باہر نہیں نکلونگا میں انہیں میں واپس چلا جاؤنگا جہاں میری کھیت ہے۔

میں آپ کو اپنی قسمت کی رام کہانی سناتا ہوں، سنیئے۔ میری ایک نہایت نازک اندام اور خوبصورت بیوی تھی میں اس سے بیحد محبت کرتا تھا۔ ہمارا چھوٹا سا گھر میری بیوی کی دانشمندانہ کوششوں اور کفایت شعاری کا نمونہ تھا تھوڑے سے پیسوں میں دسترخوان کو خوبصورت اور خوشگوار بنانا میری بیوی کی فطرت میں داخل تھا۔ میری روح اسکی باتوں سے تروتازہ رہتی تھی۔ ہر رنج و غم میں میری شریک و سہیم تھی سچ پوچھئے تو دنیا میں جنت اسی کا نام ہے۔

میں ایک کمپنی کا نوکر تھا۔ میری آمدنی اتنی تھی کہ میرا گذارہ ہوجاتا تھا اور بعض اوقات ایک آدھ فضول خرچی کی بھی کفیل ہو سکتی تھی، ہر ماہ کی پہلی کو مجھے میری کمیشن ملا کرتی تھی چونکہ میری بیوی گھرداری کے اصولوں میں طاق تھی اسوجہ سے میں کل آمدنی اُن کے ہاتھ میں دیدیتا تھا اور صرف چند ضروری اخراجات مثلاً ٹرام سگریٹ وغیرہ کیلئے اپنی جیب میں کچھ رکھ لیتا تھا، ایک ایک پیسے کا ہم کو خیال کرنا پڑتا تھا، لیکن ہم دونوں

تو عملاً دو قانع تھے۔ خوش و خرم زندگی بسر ہوتی تھی، کچھ عرصہ گذرنے کے بعد ہمارے ہاں ایک دختر نیک اختر تولد ہوئی اس چھوٹی سی جان نے ہماری خوشی دن دوگنی اور رات چوگنی کر دی البتہ آمدنی میں پہلی مرتبہ رخنہ پڑنا شروع ہو گیا، کیونکہ ہمارے اخراجات ایسے نپے تلے تھے کہ ان پر دوسری قسم کا بار نہیں ڈالا جا سکتا تھا۔ اور آمدنی میں کسی قسم کا اضافہ نہیں ہوا۔

میری بیوی ایک صابر اور نازک مزاج عورت تھی۔ اب ایسے تفکرات کے بادلوں نے امڈ کر اور رہی سہی روشنی کو اندھیرے میں تبدیل کرنا شروع کر دیا۔ اور وہ دن بدن لاغر ہونی شروع ہو گئی۔ ڈاکٹر نے اچھی خوراک بہت سا دودھ۔ گھی، انڈے اور تازی ترکاری کھانے کو بتائی تھی لیکن ہمیں ہر روز بھلا کب میسر آ سکتی تھی۔ ہماری بچی بھی بہت نازک پیدا ہوئی تھی۔ اور غیر معمولی طور پر پیدا ہوتے ہی اول دن سے زیادہ سوتی تھی، اکثر بخار میں مبتلا رہتی تھی۔ آخر کار اس ننھی سی جان نے تین سال تک اس دنیائے فانی میں ہمارا ساتھ دیا اور پھر رخصت ہو گئی۔ ڈاکٹر صاحب نے اسکے انتقال کے بعد ہم سے کہا کہ اگر ہم اسے کسی اچھی آب و ہوا والی جگہ پر لیجاتے تو ممکن تھا کہ وہ صحت یاب ہو جاتی پھر انہوں نے کہا کہ تم کو اپنی بیوی کا حد درجہ خیال رکھنا چاہیئے اگر ان کو کسی ایسے پہاڑی مقام پر لیجاؤ جہاں سرسبز جنگل اور ہر قسم کا آرام موجود ہو اور سب سے مقدم اچھی خوراک دو تو اُن کی صحت کی امید کیجا سکتی ہے۔

جناب من۔ میرے پاس کوئی اور آمدنی کا سلسلہ نہیں تھا۔ سب طرف سے ناامیدی ہی ناامیدی کی بھیانک شکل نظر آتی تھی۔ میں کاسۂ گدائی ہاتھ میں لیکر دوست آشناؤں کے پاس گیا اور قرض کا سوال کیا۔ جس چیز میں آمدنی کی صورت نظر آتی تھی۔ اسکی طرف دوڑتا تھا، اپنے دل میں ٹھان لی تھی کہ اپنی انمول اور پھر کبھی لوٹ کر زندگی کے لئے کسی نہ کسی طرح روپیہ پیدا کروں کیونکہ اسکی حفاظت و صیانت میرا اہم ترین فرض تھا۔ لیکن اگر میں اپنے بے تکے پن سے واقف نہ ہوتا تو روپیہ حاصل کرنے کے لئے چوری کرتا، اگر میرا دل کمزور نہ ہوتا تو میں ڈاکہ ڈالتا۔

آخر کار میری بیوی کے انتقال سے وہ ٹمٹماتی ہوئی روشنی میری زندگی کا سہارا تھی میری آنکھوں کے سامنے سے غائب ہو گئی، میرے دل پر ناامیدی چھا گئی۔ اور ایسا خبط الحواس ہو گیا کہ اپنی زندگی کا احساس بھی جاتا رہا۔ سوچتا تھا کہ میں زندہ بھی ہوں یا نہیں۔

جناب من۔ مجھ پر ایک اور بجلی گری۔ وہ میری قسمت کا میرے ساتھ ناروا سلوک تھا جو ایسا بے رحمانہ اور اُلجھا ہوا تھا کہ میری عقل اُس کے سلجھانے سے قاصر تھی،

میری بیوی کے انتقال کو ایک ہی ہفتہ گذرا تھا کہ میرے نام کچہری سے ایک سمن آیا۔ پڑھنے سے معلوم ہوا کہ مجھے ایک ورثہ ملنے والا ہے ایک ایسا واقعہ تھا کہ جو اکثر کہانیوں میں سنا جاتا ہے۔ یا اخباروں میں شاذ و نادر پڑھنے میں آتا ہے۔ میرے ایک دور کے دولتمند رشتہ دار جن سے میں واقف تک بھی نہیں تھا کسی غیر ملک میں بہت کچھ دولت چھوڑ کر بغیر وصیت نامہ کے انتقال کر گئے۔ ان کا کوئی قریبی وارث نہیں تھا۔ کچہریوں اور محکموں کی تفتیش نے عرصہ دراز کے بعد مجھ زندہ وارث کا پتہ نکالا اور بغیر کسی دقت کے مجھے ورثہ مل گیا۔

جناب من۔ اب آپ ذرا خیال فرمائیں، ذرا اس قسمت کے خطرناک کھیل پر غور کریں۔ کیا اسمیں شیطانی ہاتھ شامل حال نہیں تھا۔ یہ اسی کی ذلیل حرکت تھی جو میری بیوی کے مرنے کے آٹھ دن بعد ظہور میں آئی۔ اسی روپے کا ایک قلیل حصہ دو مہینے قبل میری بچی بیوی اور مجھ کو خوش قسمت بنا سکتا تھا

کچھ دنوں بعد جب میں اپنے ورثہ کا روپیہ بنک سے لینے گیا تو میں

سرگرم تھا اور خون کی حرکت اور جوش کی وجہ سے بخار کی سی حرارت میرے تمام جسم میں سرایت کر رہی تھی۔ اس وقت کی اندرونی کیفیت کو بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ میلے میلے روپیوں کے نوٹ میرا مذاق اڑا رہے ہیں اور منہ چڑا رہے ہیں۔ اس سے قبل میرے دل میں کبھی ان کی نفرت کا خیال بھی نہیں گذرا تھا۔ لیکن اب میرے رگ و ریشہ میں ان آدم خور کاغذ کے ٹکڑوں اور شیطان کے ملاقاتی کارڈوں کی طرف سے گہری نفرت جاگزیں ہو گئی۔

میں اپنے چھوٹے اور خالی گھر میں پہنچا اور پوری نفرت کے ساتھ نوٹوں کو میلے چہرہ بگڑے سبز رنگ گول چکر کی شکل میں رکھتا گیا۔ اب میں نے ان کو اپنا جانی دشمن تصور کر کے ان کو گھورنا شروع کیا۔ مجھے سب بدصورت ذلیل پیلے پچلپلے اور مشکوک نظر آئے اور ان میں سے تعفن اور انسانوں کی مصیبتوں کی بو آ رہی تھی۔ میں نے ان کو جمع کر کے گڈی بنائی تو مجھے یہ محسوس ہوا کہ گویا ان میں سے آنکھ بچا کر دانت پیسنے کی سی آواز آ رہی ہے اور وہ بے حیائی اور بے شرمی سے مجھ کو چیلنج دے رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ ہم ہی فتحمند ہونگے۔

جناب من چند ہفتے قبل ان کا ایک قلیل حصہ حاصل کرنے کے لئے میں عزت و آرام سب کچھ نثار کرنے کو تیار تھا۔ جیسے ڈوبتا ہوا تنکے کا سہارا ڈھونڈھتا ہے۔ اسی طرح میں ان کا سہارا ڈھونڈتا تھا۔ اب جبکہ قسمت کے ناروا اور ناجائز بچوں کے کھیل نے اتفاق سے ان کو میری گود میں پھینک دیا۔ تو مجھے انکی ضرورت نہیں رہی ...

جناب من۔ کیا میری ہی طرح آپ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ اب اس روپیہ سے میں کبھی وہ زندگی کی خوشی اور لذت نہیں اٹھا سکتا میرے قریب ہی میری بیوی کا خالی پلنگ بچھا ہوا تھا اور میری بچی کا خالی پلنگ دیوار سے لگا کھڑا تھا۔۔۔۔۔

میں ان کاغذ کے ٹکڑوں کو اپنے گھر میں رکھنا نہیں چاہتا تھا نفرت کے ساتھ میں نے نوٹوں کی گڈی کو جیب میں رکھا۔ تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ مجھ پر ہنس رہے ہیں اور اپنی فتح کی خوشی منا رہے ہیں۔ بس میرے دل میں حسد کی آگ بھڑک اٹھی اور خیال ہوا کہ ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالوں اور ایڑیوں سے رگڑ دوں ۔۔۔۔۔۔۔

صرف ایک نوٹ جس کی صورت ذرا اجلی تھی میں نے باہر رہنے دیا مجھے آج خود نہیں معلوم کہ کس غیبی طاقت نے اس وقت میری رہنمائی کی کہ میں خود بخود بازار گیا کپڑے اور ہینڈ بیگ خریدا اور ایک پہاڑی سرسبز مقام کا ٹکٹ لیا۔

مجھ میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ ان نوٹوں کی بے حیائی کے چیلنج کی سزا میں ان کو ایسے مقام پر برباد کروں جہاں میری بیوی کو صحت نصیب ہو سکتی تھی،،

وہ شخص لڑکھڑاتا ہوا کھڑا ہوا اور اپنی جیب میں سے نوٹوں کی گڈی نکالی گھاٹ کے سفید سفید کنارے اور پانی کے سیاہی مائل رنگ کی حد فاصل صاف نظر آ رہی تھی۔ وہ شخص اسی حالت میں آہستہ آہستہ پانی کے قریب جا رہا تھا۔ میں پریشان اور خائف ہو کر اس کے پیچھے بھاگا اور اس کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ کر میں نے چلا کر کہا۔ "ٹھیرو یہ سراسر پاگل پن ہے اگر یہ روپیہ آپ اپنے کام میں لانا نہیں چاہتے یا آپ اس سے فائدہ اٹھانا نہیں چاہتے تو آپ ایسے لوگوں کی جو آپ ہی کی طرح مصیبت زدہ ہیں مدد میں صرف کر سکتے ہیں۔

اس نے جھٹکے سے اپنا شانہ چھڑایا۔ اور میری نگاہ جب اس وقت کی خفیف سی چاندنی میں اس کے مصیبت زدہ اور خوفناک چہرہ پر پڑی تو صاف خبط کے آثار نظر آتے تھے

وحشیانہ لہجہ میں اس نے چلا کر کہا ہٹ جاؤ ہٹ جاؤ۔

اُس گٹھڑی کو اُس نے سر سے اوپر اُٹھاکر نہایت طاقت کے ساتھ دریا میں پھینک دیا کچھ دیر تک وہ گٹھڑی پانی کی سیاہی مائل سطح پر سفید سفید چمکتی ہوئی نظر آرہی تھی اور آہستہ آہستہ ڈوبتی رہی - کچھ دیر وہ سطح پر نظر آئی اور آخرکار بھیگ کر پانی میں بالکل ڈوب گئی

چند لمحہ تک میرا خیال ہوا کہ وہ خود بھی پانی میں اس گٹھڑی کے پیچھے کود پڑیگا - لیکن نہیں وہ نہایت شان سے کنارے سے واپس آگیا -

اس نے مضبوط آواز سے کہا کہ میں بزدل نہیں ہوں میں نے اسوقت شیطان سے لڑائی جیتی ہے کل علی الصباح میں یہاں سے واپس چلا جاؤنگا اور اپنی آیندہ زندگی اسی طرح گذارونگا جس کا کہ میں ہمیشہ سے عادی ہوں -

اس نے سر اونچا کر لیا - اور مثل سرو کے سکوت کے عالم میں کھڑا ہو گیا اسکی تیز نوکدار داڑھی اندھیرے میں ایک تیز نوکدار خنجر کی طرح پار ہوتی ہوئی نظر آرہی تھی -

اس نے پھر آہستگی سے سر جھکا کر بولنا شروع کیا اور کہا کہ جناب من میں آپ کا بہت شکرگذار ہوں - آپ نے میرا قصہ نہایت صبر و استقلال کے ساتھ سنا اور آپ میرے اس فعل کے گواہ بنینگے - آپ کا اسوقت میرے ساتھ یہاں ہونا تا عمر نہیں بھولوں گا اور نہ زمانہ مجھے یہ بھلا سکے گا -

جب وہ چلنے لگا تو میں نے اُس سے کہا !! آپ کیا پورے وثوق کے ساتھ یہ دعوے کر سکتے ہیں کہ آپ کو اپنی زندگی بھر اپنے اس فعل پر کبھی افسوس نہیں ہوگا -

اس نے درد بھری آواز سے کہا ، کبھی نہیں ! کبھی نہیں اجنابمن میں آپ سے قسم کھاکر کہتا ہوں کہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ میں نے تمام عمر میں آج یہ سب سے پہلا انصاف کا کام کیا ہے -

پانچ منٹ کے بعد اسکو درختوں کے سایہ نے میری نظروں سے چھپا لیا - میں بہت دیر تک دریا کے کنارے کھڑا رہا اور ظلمت کے عالم میں غور کرتا رہا میں نے اپنے دل سے سوال کیا کہ بتا اے دل کیا تو آج ایک بڑے کام کا گواہ بنا ہے - یا ایک پاگل انسان کے خبط کا -

کرشمۂ جہالت

(از محترمہ رفعت شروانیہ صاحبہ)

گاؤں کے لوگ شیخ نظام علی کی نہایت عزت کرتے تھے حتیٰ کہ کوئی اہم امور بغیر انکی صلاح و مشورے کے طے نہیں پاتا تھا شیخ جی بہت غریب تھے، صرف چند بگیہ زمین تھی جسکو لگان پر بسر اوقات کرتے تھے انکا اکلوتا لڑکا حسنا یا علی عرف بن بڑی منتوں مرادوں کا تھا۔ یہی سبب شیخ جی کی جہاندیدگی اور دانائی بھی اسکی کچھ اچھی تربیت نہ کرسکی، بلکہ حقیقتاً اسکی سرکشی کا زیادہ سبب اسکے والدین ہی تھے۔ وہ چھیڑ چھیڑ کر اس سے باتیں کرتے اور پھر خوش ہوتے، عمر کیسا تھ ہی اسکی خراب عادتیں بھی بڑھتی گئیں۔

ابھی بن نے اپنی عمر کے ۱۳ مدارج ہی طے کئے تھے کہ اچانک شیخ جی انتقال کر گئے، اور جو برائے نام دباؤ بن پر تھا وہ بھی دور ہو گیا۔ ماں کو تو اسنے کبھی کوئی چیز سمجھا ہی نہ تھا۔ رات دن آوارہ گرد لڑکوں کے ساتھ گلیوں کی خاک چھاننا گولیوں اور ٹھیکروں سے جوئے کی مشق کرنا اسکا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ اکثر ماں سے پیسے بھی لاکر بازی میں ہار جاتا۔

(۲)

فصل کا موقع تھا ابھی آمدنی نہ ہوئی تھی۔ بن چوبیس گھنٹہ غائب رہنے کے بعد رات کو دس بجے کے قریب گھر آیا اور دروازے سے ہی چیخ کر بولا۔ اماں کہاں ہو۔

ماں ۔ کیوں بیٹا کیا ہے۔

بن ۔ میں ایک ضروری کام سے آیا ہوں۔

ماں ۔ وہ کونسا کام ہے

بن ۔ مجھے سخت ضرورت ہے فوراً دس روپیئے دیدو۔

ماں ۔ ایسی کیا ضرورت ہے کیا کسی نے قرض مانگے ہیں؟

بن ۔ ابی تمہیں کیا چاہئے ہم کچھ کریں۔ اپنی خیر چاہتی ہو تو ابھی دیدو

ماں ۔ میرے بچے! قربان گئے دس روپے تجھسے بھی بڑھکر تھے ابھی تک کاشتکار نے ایک پائی بھی لاکر نہیں دی۔ میں کہاں سے دوں۔

بن ۔ اور وہ کل جو تمہارا باوا آیا تھا تو کیا جھک مارنے کو آیا تھا۔

ماں ۔ یا اللہ میری قسمت ۔ بن تجھے شرم نہیں آتی ۔ ایک گنوار کو میرا باپ بتاتا ہے ۔

بن ۔ ہم کچھ نہیں جانتے ۔ ہم تو یہ پوچھتے ہیں کہ وہ آیا کیوں تھا۔

ماں ۔ میں نے ہی بلایا تھا ۔ مگر وہ آئیں بائیں شائیں کرکے چلا گیا

بن ۔ ارے تیری چالاکیاں میں خوب جانتا ہوں (لات رسید کرکے) حرامزادی جب تک سیدھی بات کرو ایسی ہی رہتی ہے بیکس ماں اوندھی گر گئی اور بن نے جلدی جلدی کنجیاں کھول کر ساری گھر کی تلاشی لی اور کچھ نہ ملا تو اول فول بکتا ہوا سیدھا کاشتکار کے گھر پہنچا اور کہا کیوں بے ہم تو فاقے پر فاقہ کر رہے ہیں اور تو روپیہ ہی نہیں دیتا، ابھی حساب کر ورنہ مارتے مارتے بھرکی ڈھیلی کردونگا ۔ وہ ہاتھ جوڑنے لگا کہ میاں اسوقت تو نہیں کل سب ادا کردونگا مگر بن کہاں سننے والا تھا کہنے لگا کہ سب نہیں تو دس ہی روپیہ مجھے ابھی دے ۔ غرض روپیہ لیکر سیتا لوہار کے یہاں پہنچا جو اسکا گہرا دوست تھا اور ...

نکڑ تک اور دوست کلو کے گھر گیا اور خوب گرما گرمی سے ... ن ہونے لگیں ۔

(۳)

زمانہ بدل رہا تھا۔ مگر بنّن کے خصائل اور بداطواری میں تبدیلی نہ ہوئی۔ ماں کو ازحد فکر تھی کہ کسی طرح بنّن کا سہرا دیکھ لوں، چونکہ اسکی عادت سے واقف تھی، اسلیئے سوچتی کہ کون بیٹی دیگا۔ یوں دل میں تو سینکڑوں ارمان بھرے پڑے تھے اسکی نظر بار بار اپنی یتیم بھتیجی پر پڑتی تھی جو کہ اپنے ماموں کے یہاں پرورش پا رہی تھی۔ مگر ساتھ ہی وہ یہ بھی بخوبی جانتی تھی کہ ماموں جسنے بطور اولاد اسے پرورش کیا ہے ہرگز شادی کرنے پر آمادہ نہ ہوگا۔ کیونکہ وہ اوباش بنّن کی باتوں سے واقف تھا، بالآخر سوچتے سوچتے یہ چال چلی کہ سواری کرکے لڑکی کے ماموں کے گھر پہنچ ہی تو گئی، جو پانچ کوس دور دوسرے گاؤں میں رہتا تھا۔ اور وہاں جاکر بھتیجی کو لپٹا لیا اور بھائی کو یاد کرکے اس درد سے بین کیئے کہ سننے والوں کے کلیجے دہل گئے ماموں سے کہا کہ خدا کیواسطے اس کو دس پانچ دن کو میرے ساتھ بھیجدو برسوں اسکی صورت کو ترستی رہتی ہوں دو چار دن اپنے کلیجے سے لگاکر رکھونگی، یوں سمجھ لونگی کہ میرا کھویا ہوا بھائی مل گیا۔ جادو چل گیا اور ماموں نے یہ کہکر اجازت دیدی کہ تمہاری خوشی کے لیئے بھیجے تو دیتا ہوں مگر فلاں دن آکر ضرور لے آؤنگا

بنّن کی ماں۔ بھیا جب چاہو لے آؤ مجھے کچھ عذر تھوڑی ہے بس اتنی بات ہے کہ دو ڈھائی سال میں دیکھا ہے جی نہیں مانتا کہ پھر کچھ دنوں پاس رکھے الگ کردوں، غرض یہ دشمن جان پھوپی بیکس و یتیم معصومہ کو اپنے ہمراہ لے ہی آتی ہیں اور خفیہ مگر جلد نکاح کی تیاریاں ہونے لگیں،

انوری چہاردہ سالہ محض جاہل مگر فطرتاً عقلمند و باحیا لڑکی تھی، اسنے دیکھا کہ بڑھیا کسی اہم مگر خفیہ کارروائی میں مصروف ہے۔ مگر باوجود جستجو کے وہ تہ کو نہ پہنچ سکی تو اسنے مجبور ہوکر پوچھ ہی ڈالا کہ پھوپی صبح سے تمہارا نکوا نہیں ٹکا۔ کون گھڑی گھڑی دروازے پر بلاتا ہے

بنّن کی ماں۔۔ کوئی نہیں بیٹی وہ تمہارے پھوپا کے ایک جان پہچان ہیں ایسے ہمیشہ پوچھ گچھ کر جاتے ہیں، آج کسی کام سے آئے تھے، اسلیئے مجھے بلایا تھا،"

انوری اس جواب سے مطمئن نہ ہوئی تو بولی پھوپی کل تو خیر بڑی رات گئے ہم یہاں پہونچے تھے، مگر صبح سے اب تک بھیا گھر میں نہیں آئے؟ پھوپی جواب میں صرف تبسم زیرلب ہوئی۔ انوری مزید سوال کرنیوالی تھی کہ دفعتاً چند عورتیں گھر میں گاتی ہوئی گھسیں، پھوپی نے یہ دیکھکر کہا کہ بیٹی تم اندر اٹھ جاؤ۔ انوری ذرا متحیر تو ہوئی مگر ایسی جھینپی کہ بلا چون وچرا اندر چلی گئی۔ نصف گھنٹہ کے بعد گانا ختم ہوا۔ پھر اسطرح سلسلۂ گفتگو شروع ہوا۔

ایک عورت۔ شیخانی جی! اے خدا رکھے ہمیں دلہن تو دکھادو۔

شیخانی جی (ہنس کر) اری بہن ابھی تو پیٹ میں پانی ہو رہا ہے ہوجائے تب جانے۔ خیر آؤ میرے ساتھ، یہ باتیں انوری نے بھی سنیں، اب تو ایک منٹ کے اندر حقیقت حال اسپر آئینہ ہوگئی اب وہ سمجھی کہ یہ اسکو زندہ درگور کیا جانیوالا ہے۔ ابھی وہ زیادہ سوچنے نہ پائی تھی کہ پھوپی نے آکر کہا کہ بیٹی دوپٹہ سنبھال کر بیٹھ جاؤ بیبیاں تمہیں دیکھنے آرہی ہیں۔ انوری فوراً سنبھل گئی۔ حکم حاکم مرگ مفاجات (ہاتھ سے آنیوالیوں کو سلام کیا)

ایک۔ اے میں قربان جاؤں۔ نظر لگتی کہوں۔ شیخانی جی۔ بنّن میاں سے کچھ کم نہیں ہے۔

دوسری۔ عرش سے جوڑ اترا ہے۔

تیسری۔ بیبا ہمیں اس بات کا غم تھا کہ نہ تو بنّن میاں کی برات چڑھی اور نہ کوئی اور دھوم دھام ہوئی۔ ویسی ہی دلہن کو دیکھکر جی خوش ہوگیا

پہنچی۔ اللہ [illegible] مبارک کرے۔

عورتوں کے چلے جانے کے بعد وہ منہ ڈھانپ کر پڑ گئی۔ وہ حیران تھی۔ بیوی کی یہاں [illegible] آئی تھی۔ سوچتی تھی کہ اسے ماموں نے بیاہنے [illegible] خوب [illegible] کی عادت سے واقف تھی۔ [illegible] پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی [illegible] ساری رات [illegible] ہو گیا۔

(۴)

بچن کی [illegible] میں [illegible] گھٹنے [illegible] زیادہ بڑھ گئیں۔ ابھی بیاہ کو [illegible] دو برس [illegible] ہوئے تھے کہ بچن کی ماں نے انتقال کیا۔ اب انوری کا کوئی ہمدرد [illegible] موجود نہ تھا۔ ماموں کے نزدیک وہ [illegible] ماموں [illegible] کالعدم تھی۔ بچن [illegible] دن گھر سے غائب رہتا اور وہ مظلومہ [illegible] اپنی بدنصیبی پر [illegible] وقت کا فاقہ ہو جاتا۔ مگر وہ صبر [illegible] اف نہ کرتی [illegible]؟ لیل و نہار اسی طرح گذرتے رہے۔

(۵)

دیوالی کا زمانہ تھا۔ جوئے بازوں کے دل شگفتہ اور ہاتھ خالی تھے انہی میں ایک بچن بھی تھا۔ رات کے بارہ بج رہے ہیں۔ ستیا کے دروازے پر بدمعاشوں کا جمگھٹ لگ رہا ہے۔ بچن اور کلو میں بازیاں ہو رہی ہیں۔ کلو برابر جیت رہا ہے۔ اور بچن ہر دفعہ یہ کہکر کہ اب کی اگر ہاروں تو اصلاً نہ کھیلنا۔ بازی لگاتا ہے۔ حتیٰ کہ بچن کے کپڑے تک ہار گیا تو گھر کی چیزوں کی باری آئی۔ بدمعاش نہایت دلچسپی لے رہے ہیں۔ جیتنے پر کلو کی تعریف اور بچن پر پھبتیاں کسی جا رہی ہیں۔ بالآخر جب گھر کی چیزیں بھی کل ہار چکا تو شرمندہ ہو کر ہاتھ روک لیا۔ کئی لوگ [illegible] یک زبان ہو کر۔ بس اتنے ہی ہو۔ ارے یار کہیں مرد میدان اتنے ہی میں بیٹھتے ہیں۔ کچھ ہمت ہو تو اور کھیلو۔

کلو۔ ارے بچن تو رک کیوں گیا۔؟ ارے آج نہیں تو کل سہی۔ اور ہار کر [illegible] نہ بیٹھ میں اگر ہارتا تو چاہے دو دن یہیں بیٹھا رہتا مگر جب تک جیت نہ لیتا کبھی ہاتھ نہ روکتا۔ بچن (جوش میں آکر) آ یار اور تو کچھ ہے نہیں۔ اگر اب کی ہار گیا تو جا میری گھر والی تیرے سپرد۔ آ جلدی آ۔ میرا خون تاؤ کھا رہا ہے۔

(کئی آوازیں) واہ وا۔ اسے کہتے ہیں۔ کھلاڑی ہو تو ایسا ہو۔

کلو ہنستا ہوا آگے بڑھا۔ بدبخت بچن ہار گیا۔ اور چاروں طرف سے واہ کلو! ارے واہ بہادر! کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ اس بار بچن نہایت افسردہ خاطر تھا۔ گو اسکے پہلو میں پتھر سے زیادہ سخت اور رات سے بڑھکر تاریک دل تھا۔ تاہم اپنی اس حرکت کا اسکو شدت سے احساس ہوا۔ اور چند منٹ کو اسکی حالت دگرگوں ہو گئی۔ بچن کو .... اتنا خاموش دیکھکر کلو نے کہا کہو یار کیا ارادے ہیں۔ بیوی تو میری ہو چکی۔ کئی آوازیں۔ ارے بھائی چپ کیوں ہو گیا کسی نے تمہاری خوشامد کی تھی، جو کہا اسے کرو اور کرنے نہ کرنے سے کیا ہے تیری گھر والی پر کلو کو پورا اختیار ہے۔

بچن (مری آواز سے) نہیں بھائی میں کچھ نہیں کہتا۔ اب ہو ہی کیا سکتا ہے دینی لوگ۔ ان باتوں سے کیا ہوتا ہے۔ ارے کلو بیٹھا کیوں ہے اٹھو چلو۔ انکے گھر اپنے مال پر قبضہ کرو۔ بچن چلو یار میں خود چلتا ہوں۔ مردوں کا یہ شیوہ نہیں کہ جو کہیں اسے نہ کریں۔

رات کے دو بجے ہیں۔ بدنصیب و بیخبر انوری اپنے بدنہاد شوہر کا انتظار کرتے کرتے بلا کھانا کھائے سو گئی ہے۔

انوری یکایک جاگ اٹھی اور خود ہی اسطرح گویا ہوئی "آج کیا بات ہے۔ ابھی تک وہ نہیں آئے دو ڈھائی تو ضرور بج گئے ہونگے مولا کیسی ڈراونی رات ہے۔ ہائے قسمت تونے مجھے ایک دن بھی سکھ

نہ دیا۔ لو یہ ہے۔ میں کیا کہہ رہی ہوں مولا جسمیں تیری خوشی ہو وہ مجھے منظور ہے۔ خدا مجھے اپنے گھر چین دے۔ میرے مالک میرا دل بیٹھا جاتا ہے کہیں میری موت تو نہیں آئی ہے) درود و کلمہ پڑھنے لگتی ہے۔ (دفعتاً کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ انوری لپک کر پہونچی۔ دروازہ کھولنا چاہتی تھی، مگر خلاف معمول کئی آوازیں باہر سے آہستہ آہستہ باتیں کرنے کی آ رہی تھیں، انوری سہم گئی، اور چپ ہوکر باتیں سننے لگی۔ بنّن کہہ رہا تھا۔ ذرا مجھے اندر تو جانے دو کیا میں اسے کھا لونگا

دوسری آواز۔ کھانے والے کی کیا بات ہے مگر ہم پہلے اسے لیجائیں پھر تم اندر جاتے رہنا۔

تیسری آواز۔ یار پہلے ہی کیوں عورت کی بازی لگائی تھی، جواب گھس گھس کرتے ہو۔ انوری کے پیروں تلے کی، زمین نکل گئی، اس نے بنّن کی آواز پہچان لی، حیران تھی کہ کیا معاملہ ہے۔ بنّن نے پھر دروازہ پر ہاتھ مارا۔ انوری نے کرخت آواز سے کہا کون ہے!!! ستیا۔ ہم ہیں بھابی تمہیں لینے آئے ہیں۔ انوری۔

انوری۔ تو کون ہے کمبخت اور کون تیری بھابی کسے لینے آئے ہو۔

میں ہوں سیٹھ خاں تمہارے میاں کا دوست۔

انوری۔ تم راستہ بھول کر تو نہیں آ گئے۔ یہ گھر تو مہتاب علی بنّن کا ہے۔

ستیا۔ ہاں ہاں یہ تو ہم بھی جانتے ہیں۔ بنّن خود ہمارے پاس پڑا ہے۔ اسنے تمہیں کلو کو دے ڈالا۔

انوری۔ کمبخت پاگل ہو گیا۔ کیسا کلو۔ بک کیا رہا ہے۔

کلو۔ میری اسمیں کیا خطا ہے تمہارے میاں نے تمکو بازی میں ہرا دیا۔ ارے بنّن بولتا کیوں نہیں۔ جو چپ ہے۔

بنّن۔ انوری! اب تم کلو (آواز حلق میں پھنسنے لگی) کی ہو مجھ سے کچھ واسطہ نہیں۔

انوری۔ اچھا تمہارا کہنا میں نے سن لیا۔ یہ میری تقدیر ہے تمہاری کچھ خطا نہیں مگر یاد رکھو کہ تمہیں بھی مرنا اور خدا کو منہ دکھانا ہے بھتیا کلو! کیا اب تم ہی میرے وارث ہو؟

ستیا۔ ارے بھابی کلو کو بھتیا نہ بناؤ وہ تو اب تمہارا وہی ہے جو پہلے بنّن تھا۔

انوری (غصہ کو ضبط کرتے ہوئے) اچھا میں راضی ہوں۔ مگر اس وقت تو صبح تک مجھے چھوڑ دو اسکے بعد میں تمہاری ہوں۔ انوری ظاہر یہ باتیں کر رہی تھی مگر اسکا ہر بن مو تھرا رہا تھا اور غیرت و ندامت سے ہر بار اسکی آواز گلوگیر ہو جاتی تھی۔

ستیا۔ اجی تم کیا بک رہی ہو۔ اب ہم تمہیں ذرا سی دیر کو بھی نہیں چھوڑ سکینگے کھولو دروازہ۔ آخر تم صبح تک کرو گی کیا۔

کلو (بات کاٹ کر) ارے رہنے بھی دے کیوں پیچھے پڑ گیا ہے۔ صبح ہونمیں دیر ہی کتنی ہے ہم یہیں بیٹھے رہینگے۔ مگر بنّن کو اندر نہیں جانے دینگے۔ نااہل بنّن یہ کہکر چلدیا کہ ارے بھائی لو میں خود جاتا ہوں تم بیٹھے رہو۔ بدمعاش ہنسی اڑانے لگے۔ کلو اور ستیا وہیں بیٹھ گئے باقی سب چلے گئے۔

(۶)

طلوع آفتاب سے قبل چند پانی بھرنیوالوں نے دیکھا کہ کنوئیں میں ایک مردہ جسم تیر رہا ہے۔ پولیس کے ذریعہ نعش نکالی گئی۔ جستجو اور تلاش کے بعد معلوم ہوا کہ یہ بدکردار بنّن ہے باوجود سختی سے بازپرس کرنے کے کوئی اہل محلہ خودکشی کا سبب نہ بتا سکا۔ تو مجبوراً پولیس گھر پر پہنچی۔ دروازہ بدستور بند تھا۔ جب بہت دیر دستک دینے پر بھی کوئی جواب نہ ملا تو وہ لوگ دروازہ توڑ کر اندر گھسے جہاں ایک بھیانک خاموشی طاری تھی اور کسی متنفس کا پتہ نہ تھا۔ تلاشی لینے پر دیکھا گیا کہ ایک کوٹھری بھی اندر سے بند ہے اسکا بھی دروازہ توڑا گیا۔ توڑنے والوں کی آنکھوں میں یہ دیکھکر اندھیرا چھا گیا کہ ایک نازنین کی نعش دوپٹہ کے ذریعہ چھت کی کڑی میں لٹک رہی ہے) فقط



خرقہ پوش

(از جناب جاذب بی اے دہلوی)

صداقت لفظ بے معنی ہے جاذب اس زمانے میں
زمیں اللہ کی آباد ہیں شیطان کے بندے
کبھی میری نظر سے خرقہ پوشوں کو کوئی دیکھے
زباں پہ ہر گھڑی حمد و ثنا ہے اور دل گندے
بیانِ دوزخ و جنت میں پنہاں ہے ریاکاری
بنا رکھے ہیں واعظ نے کمانے کے یہ سب دھندے
یہاں ممبر پہ چڑھ کے واعظ اپنے غریبوں سے
لیئے جاتے ہیں ناموس حرم کے نام پر چندے
گرا کر از سر نو مسجدیں تعمیر ہوتی ہیں
مگر مرتے ہیں بھوکے سینکڑوں اللہ کے بندے
جہالت ہی کہیں کروغا ہے اور کہیں غفلت
پڑے ہیں ہر طرف گردنِ اسلام میں پھندے

پتھر سے ہیرا

(از جناب رابندر ناتھ ٹیگور)

گنگا گھاٹ پر بیٹھے بھگت سناتن رام نام جپ رہے تھے ایک غریب برہمن نے آکر پکارا — "کچھ میری بھی مدد کیجیے میں کنگال ہوں۔"

سناتن بولے اب تو میرے پاس بھیک مانگنے کا کشکول رہ گیا ہے تمہیں کیا دوں؟

برہمن نے کہا مہادیوجی نے خواب میں درشن دیکر مجھ سے کہا تھا کہ آپ سے جا کر مدد طلب کروں۔

سناتن کو خیال آیا کہ گنگا جی کے کنارے پتھروں میں ان کو ایک بیش قیمت ہیرا ملا تھا اور انہوں نے اسے وہیں بالو میں یہ سوچکر دبا دیا تھا کہ کسی مستحق کے کام آجائیگا۔"

انھوں نے برہمن کو وہ مقام بتا دیا جہاں ہیرا دفن تھا۔ برہمن کھودنے لگا ہیرے کو دیکھا وہ تصویر حیرت بن گیا بیٹھکر نہ جانے کیا سوچنے لگا۔

شام ہو گئی ——— سورج غروب ہو گیا۔ چرواہے مویشیوں کو لیکر گاؤں کی طرف چلے ——— برہمن اب بھی اپنے خیالات میں محو تھا۔

وہ اٹھا اور بھگت سناتن کے پاس آکر بولا — "سوامی اس بیش قیمت جوہر کا ایک ٹکڑا مجھے بھی خدا کے نام پر دیدیجے جسے پاکر انسان دنیا کی تمام چیزوں سے بے نیاز ہو جاتا ہے"

برہمن نے یہ کہا اور ہیرا دریا میں پھینک دیا۔ اسے اب وہ بیش قیمت چیز مل گئی تھی جسکے سامنے ہیرے کی کوئی حقیقت نہیں ہے ———

شکایت زمانہ

(از جناب جوش ملیح آبادی)

ہائے عہد میں یہ ناداری — کون اپنی کرے گا غمخواری
کسطرف جائیں کس سے بات کریں — ہر طرف ایک جمود ہے طاری
اہل افلاس غرق بغض و حسد — اہل دولت رہین غداری
اُٹھ گیا ہائے دوستی کا چلن! — مٹ گئی وائے رسم غمخواری
جسکے چہرے پہ فکر کے آثار — اسکی صورت سے سب کو بیزاری
مطمئن ہستیوں کا دنیا میں — مشغلہ ہے غریب آزاری
مایۂ صد نشاطِ روحانی — اہل دولت کی کفش برداری
قدر داں کون ہے زمانہ میں — علم و فن کی ہے سرد بازاری
اپنی تکمیل سے ہے شرمندہ — میری تخئیل کی گہر باری
بے خبر سو رہی ہے اک دنیا — منفعل ہے ہماری بیداری
مدتوں سے ادب کی دنیا پر — چھا رہا ہے مذاق بازاری
یوں گذرتے ہیں اپنے دن جیسے — رات بیمار غم پہ ہو بھاری
افترا ہر وسیلۂ توقیر — راستی وجہ ذلت و خواری
جب یہ اخلاق ہیں زمانہ کے — ہو چکی اہل دل کی غمخواری
ہم سے بندوں کی اس زمانہ میں — کیا ضرورت تھی ایزد باری (امین بجنور)



مسلمانوں کے تنزل کا راز

از جناب قاری عباس حسین صاحب سابق ایڈیٹر "قوم" و "تمدن"

یہ تو مسلمات میں سے ہے کہ دنیا کے پردے پر آج کوئی دوسری قوم اسقدر ذلیل حالت میں نہیں ہے جسقدر مسلمان ہیں۔ یہ کیوں ہوا اس سوال کا ایک ہی جواب ہے جو برابر سننے میں آتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ چونکہ مسلمانوں نے مذہب کو چھوڑ دیا اسلیئے مسلمانوں پر ادبار ہے۔ جہانتک اس جواب کے معنی کا تعلق ہے مجھے بھی اسکے صحیح تسلیم کرنے میں ذرہ سا بھی تامل نہیں، لیکن جہانتک الفاظ کا تعلق ہے میں یہ ضرور عرض کرونگا کہ یہ جواب غلط ہے جس طرح اس حقیقت سے انکار کرنا کہ مسلمان سب سے زیادہ پست حالت میں ہیں بڑے دل گردہ والے مسلمان کا کام ہے اسی طرح اس حقیقت سے بھی انکار کرنا مشکل ہے کہ آج دنیا کے پردے پر کسی دوسرے مذہب کے پیرو مسلمانوں سے زیادہ اپنے مذہب کے پابند نہیں ہیں، کون نہیں جانتا کہ ہر سال مختلف مقامات سے اسقدر مسلمان حج کو آتے ہیں جتنے کسی دوسرے مذہب کے پیرو کسی زیارت گاہ پر جمع نہیں ہوتے اور ممکن ہے کہ یہ کبھی کبھی غلط ہی ثابت ہو جائے لیکن یہ واضح رہے کہ ہندوؤں کے تیرتھ ہندوستان میں ہیں اور وہاں تک پہنچنے کی جو سہولتیں ہندوستان میں موجود ہیں وہ ایک حد تک اس دعوی کو کم کر دیتی ہیں، ایک طرف یہ سہولتیں ہیں اور دوسری طرف مسافت کی کمی، اگر بعد مسافت اور ان مشکلات کو دیکھا جائے اور اس صرف کا اندازہ کیا جائے جو دور دور کے مسلمانوں کو کعبۃ اللہ تک پہنچنے میں کرنا پڑتا ہے تو اسے تسلیم کرنا پڑیگا کہ حج کے اجتماع کا مقابلہ دنیا کی کسی قوم کے مذہبی اجتماع سے نہیں ہو سکتا۔
میں مانتا ہوں کہ پہلے کی بہ نسبت اب مسجدیں غیر آباد ہیں لیکن آج بھی دنیا کی کروڑوں مساجد میں جسقدر مسلمان نمازیں پڑھتے اور پانچوں وقت جاتے ہیں۔ میں دعوے کیساتھ کہہ سکتا ہوں کہ دوسرے مذہب کے پیرؤں کی اس سے نصف تعداد بھی بحساب اوسط آبادی اپنی عبادت گاہوں میں نہیں جاتی۔ رمضان المبارک میں جتنے مسلمان روزہ رکھتے ہیں دوسرے مذاہب کے پیرو جن کے ہاں روزہ اور برت موجود ہے ان سے آدھی تعداد میں بھی روزہ اور برت نہیں رکھتے زکوٰۃ کو لیجئے بہت ہی کم مسلمان ایسے ہیں جو صاحب زکوٰۃ ہوں اور

زکوٰۃ نہ دیتے ہوں، مذہب اسلام کی ان بنیادی باتوں کی پابندی کرنیوالے مسلمانوں کی تعداد دنیا میں کم نہیں ہے۔ پھر مجھے بتایا جائے آخر یہ کیونکر کہا جاسکتا ہے کہ مسلمان صرف اسلئے پستی کی حالت میں ہیں کہ انہوں نے مذہب کو چھوڑ دیا ہے۔ میں پھر کہتا ہوں یہ کہنا کہ مسلمانوں نے مذہب کو چھوڑ دیا بالکل غلط ہے۔ اگر مذہب صرف ظاہری طور پر نماز پڑھنے، روزہ رکھنے، زکوٰۃ دینے اور حج کرنیکا نام ہے لیکن اگر مذہب کو چھوڑنے کے فقرے کے معنی اس سے زیادہ بھی کوئی چیز ہے تو میں خود بھی اسکا قائل ہوں کہ چونکہ مسلمانوں نے اصل مذہب کو چھوڑ دیا ہے اسلئے مسلمان دنیا میں ذلیل و خوار ہیں۔

مذہب اور اصل مذہب کی باریک سی تقسیم ممکن ہے کہ بعض لوگوں کو پریشان کردے اور وہ یہ سمجھیں کہ میں کوئی نیا فتنہ پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ اور خدانخواستہ مذہب کی تضحیک کا کوئی پہلو نکالنا چاہتا ہوں۔ ایسا نہیں ہے۔ میں بھی وہی اور صرف وہی بات کہنی چاہتا ہوں جو رات دن سب کہا کرتے ہیں کہ مسلمان صرف اسی لئے ذلیل ہیں کہ انہوں نے مذہب کو چھوڑ دیا ہے لیکن مراسم مذہب کو نہیں چھوڑا ہے۔ اگر وہ مراسم مذہب کو چھوڑ دیتے تو وہ شاید مسلمان ہی نہ کہلاتے، لیکن اگر مذہب کی روح انمیں موجود ہوتی اور مذہب کا مقصد اصلی ان سے پورا ہوتا رہتا تو وہ اس سے کہیں زیادہ بہتر ہی مسلمان ہوتے جیسے آج ہیں۔

ہم نماز بھی پڑھتے ہیں روزے بھی رکھتے ہیں زکوٰۃ بھی دیتے ہیں حج بھی کرتے ہیں، لیکن کیا یہ سب باتیں ہم اس طرح کرتے ہیں جسطرح ایک مسلمان کے شایان شان ہوں۔ کون کہتا ہے کہ مسلمان اسلامی اور شرعی طریقہ سے نماز نہیں پڑھتے روزہ نہیں رکھتے، حج نہیں کرتے، زکوٰۃ نہیں دیتے، لیکن میں نہایت ادب سے عرض کرونگا کہ یہ صرف ایک لفافہ ہی لفافہ ہے اور اس کے اندر اور کچھ ہو تو ہو مگر وہ نہیں ہوتا جو ہونا چاہیئے نماز کے روحانی فائدوں سے کون انکار کرسکتا ہے، لیکن اس کے کچھ دنیاوی فائدے بھی حاصل ہو سکتے ہیں۔ مثلاً میرے خیال میں نماز کی تعلیم اوقات کی پابندی کا ایک منشا یہ بھی تھا کہ اسکے ذریعہ سے مسلمانوں کا ایک مقررہ ٹائم ٹیبل بن جائے۔ اور وہ اپنے ہر کام میں وقت کے پابند ہوجائیں لیکن کیا کوئی اپنے دل پر ہاتھ رکھکر کہہ سکتا ہے کہ نماز کے پابند مسلمانوں میں سے ۵ فیصدی بھی ایسے ہونگے جن میں نماز کی بدولت ضبط اوقات کا مادہ پیدا ہو جائے۔ صبح تڑکے سوکر اٹھنا جسم اور لباس کو پاک و صاف رکھنا، چست و چالاک رہنا، دیکھ بھال کر اور سوچ سمجھ کر آپس کے مشورے سے ایک شخص کو اپنی جماعت کا امیر یا امام مقرر کرنا اور پھر اسکی اقتدار سے سرتابی نہ کرنا یہ سب اور ان کے علاوہ اور بہت سی انسانی خوبیاں ہیں، جو نماز ہم میں پیدا کرسکتی تھی، اگر ہماری نماز نماز ہوتی، لیکن کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ صبح کی نماز پڑھنے کے بعد ہم میں سے اکثر چارپائی پر پڑکر سو جاتے ہیں اور کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ نماز کی پابندی کے باوجود ہم میں ایسے لوگوں کی کثرت ہے جنہیں میل کچیل سے کچھ زیادہ نفرت نہیں ہے۔ اور کیا اس حقیقت سے انکار کیا جاسکتا ہے کہ ہماری اکثر مسجدوں کے امام اپنی علمی قابلیت اور پرہیزگاری اور خلوص کی بنا پر منتخب نہیں ہوتے بلکہ وہ لوگ ہوتے ہیں کہ جو از خود کہیں سے آپڑتے ہیں اور جن کے لیئے محلہ کے گھروں سے ایک ایک وقت کی روٹی مقرر ہو جاتی ہے اور اگر امام صاحب کبھی ایسی غلطی کریں کہ اپنے محلہ والوں میں سے کسی سے اختلاف رائے تک کی نوبت آجائے تو فوراً ہی یہ روٹی بند بھی کردیجاتی ہے۔

اسی طرح روزہ کو لیجئے یقیناً کروڑوں مسلمان روزہ رکھتے ہیں، لیکن روزہ کی روح ضبط نفس ہے کتنے آدمی ایسے نکلیں گے

جو نصف کے قریب اصول کو مد نظر رکھتے ہیں ہم نے تو دیکھا ہے کہ نفس کو مارنے کی بجائے نفس کو موٹا کرنیکا جو انتظام رمضان المبارک میں ہوتا ہے ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ شاندار افطاریوں اور خوش سحریوں کی بدولت بلکہ اکثر مسلمان اس ماہ مبارک میں قرضدار ہو جاتے ہیں۔ اور کھانے پینے کی بے احتیاطی کی بدولت بیمار پڑ جانا تو ایک معمولی بات ہے اور پھر علاج پر روپیہ صرف ہونیکا تو ذکر ہی فضول ہے مانا۔ آپ نے روزے رکھے لیکن روزہ کی روح "نفس کو مار دیگا" آپ نے حقیقت میں خیال بھی کیا ہے؟

حج کو لاکھوں آدمی جانتے ہیں لیکن اگر میری آواز کو بالجہر اور ارخت آواز ملحدانہ یا کفریہ کہہ دیا جائے تو میں عرض کرونگا کہ دور دراز کا سفر کر کے اور احرام باندھ کر طواف حرم ہی حج کا ایک مقصد نہ تھا بلکہ اس کا بہت بڑا اور اہم مقصد یہ بھی تھا کہ تمام دنیا کے مسلمان ایک جگہ جمع ہوں ایک دوسرے کے حالات سے آگاہ ہوں اور آپس میں ایک دوسرے کا درد دکھ سنیں۔ اور ترقی اسلام کے متعلق مشورے کریں۔ صرف طواف اور صفا و مروہ کی دوڑ یا شیطان کی کنکریاں مارنے پر ہی حج ختم نہ ہو جائے، بلکہ تمام عالم کے مسلمانوں کی ایک سالانہ کانفرنس بھی ہو جائے۔ میرے خیال میں تو عیدین جمعہ اور ہر وقت کی نماز با جماعت سے بھی وہی کام مقصود تھا، جو کانفرنسوں جلسوں اور کلبوں سے دوسرے لوگ لیتے ہیں۔

اسی طرح زکوٰۃ کو لیجئے۔ مانا کہ آپ زکوٰۃ دیتے ہیں اور میں جانتا ہوں کہ مسلمان جتنا روپیہ خیراتی کاموں میں صرف کرتے ہیں بہ اوسط شاید کوئی دوسری قوم اتنا روپیہ نہیں صرف کرتی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جتنا روپیہ مسلمان زکوٰۃ کا نکالتے ہیں اگر یہ روپیہ صحیح مصرف میں لایا جائے تو مسلمانوں کا کوئی کام اٹکا بھی نہ رہے لیکن کیا زکوٰۃ کا روپیہ صحیح لوگوں کو دیا جاتا ہے۔ اور صحیح مصرف میں آتا ہے؟ اسکا جواب ایک اور صرف ایک ہے اور وہ بدقسمتی سے "نہیں" ہے

بظاہر تو میرے ان خیالات معلوم ہونے کے بعد اسکی ضرورت نہیں ہے کہ میں اس سوال کا جواب دوں کہ مسلمانوں کی تذلیل کا راز کیا ہے؟ تاہم میں عرض کئے ہی دیتا ہوں کہ **مسلمان اسلئے ذلیل ہیں کہ انھوں نے مذہب کو** نہیں بلکہ روح مذہب کو چھوڑ دیا ہے۔



تازیانۂ غیرت

(از جناب محمود اسرائیلی صاحب پروفیسر السنہ شرقیہ)

ہر رہبر ملت پر الزام دغا کیشی
اے مسلم پس ماندہ یہ تیری بداندیشی

بن جائیگا خود مرہم تو اپنی جراحت کا
دل ہی تو نکال اپنے یہ خوئے جگر ریشی

آئین خدا میں تو اصلاح کا طالب ہے
نادان نہیں ہوتی اسمیں تو کمی بیشی

دنیائے عمل میں تو آجائے تو واقف ہو
دشوار ہے خوش فہمی آساں ہے بداندیشی

تیرا نبی اکرم تو مہرِ مجسم ہو
اور تجھ میں یہ بےمہری اور تجھ میں یہ دل ریشی

صہبائے ندامت سے کر پاک اُسے زاہد
آلودہ نخوت ہے جو خرقہ درویشی

جو چاہے وہ کر لیکن اسکو نہ بھلا دل سے
دربار خدا میں بھی ہونی ہے تری پیشی

محمود میں رہرو ہوں اس جادہ عالم کا
ملتی ہے جہاں حدِ بیگانگی و خویشی

"ہاتھ نہ آئے تو خدا ہے"

از حضرت امجد حیدرآبادی

سنتا اور لنتی سنتے ہیں سب کی صدا ہے ۔۔۔ لیکن نہیں معلوم کہ وہ کون ہے کیا ہے

کیا کوئی کہے اسکی حقیقت کہ وہ کیا ہے؟ ۔۔۔ ہاتھ آئے تو بُت ہاتھ نہ آئے تو خدا ہے

ہر چند جہاں میں ہیں بہت عیش کے ساماں ۔۔۔ لیکن کوئی یہ کہدے کہ میرے لئے کیا ہے؟

دنیا کے زر و مال سے گو ہاتھ ہے خالی ۔۔۔ المنۃ للہ کہ دل درد سے بھرا ہے

ظاہر میں تو سرسبز جگر غم سے ہے پر خوں ۔۔۔ رنگِ رخِ **امجد** صفتِ برگِ حنا ہے

رباعیات

وجود ہستی

ہر نقش [illegible] پیدا [illegible] الا اللہ ہے
[illegible] آیا [illegible]
دنیا کا وجود ہے وجود ہستی
پیدائرہ شعلۂ جوالہ ہے

خود نمائی

[illegible] تمام اپنی [illegible] نمائش کیا
کیا کیا [illegible] ایک خواہش کیا
ہر ایک شگوفہ پر مٹا جاتا ہے
[illegible] میں نمائش کیا

ہمارے مضمون نگار

(از جناب مولانا عبدالہادی خاں صاحب شاہجہانپوری)

آجکل یہ کچھ فیشن سا ہوگیا ہے کہ اردو جب لکھی جائے ایسی زبان میں لکھی جائے کہ "لکھیں موسیٰ پڑھیں خدا" جسے نہ خود سمجھیں اور نہ دوسرا سمجھ سکے، اخبار اور رسالے اسی لیئے جاری ہوتے ہیں کہ وہ طبقہ بھی دماغی غذا سے محروم نہ رہے جنکو بدقسمتی سے علمی مشغلہ حاصل نہیں ہے اور جو اپنی زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرنیکے لیئے بعض ایسے ذرائع اختیار کرنے پر مجبور ہوتے ہیں جن سے نہ انکی عام معلومات میں کوئی اضافہ ہوسکتا ہے اور نہ کوئی دماغی تفریح حاصل ہوتی ہے۔ ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کی جسقدر کمی ہے وہ مضمون نگاروں اور مالکان اخبارات و رسالہ جات سے پوشیدہ نہیں ہے۔ پھر اسکی بدمذاقی کہو یا افلاس، بے توجہی سمجھو یا کچھ اور وجہ ہی ہے کہ اردو اخبارات و رسائل کا حلقہ اثر اکثر و بیشتر صرف اس طبقہ تک محدود رہتا ہے جو معمولی قابلیت اور کم واقفیت کے لوگ ہوتے ہیں، وہ لوگ جو یقیناً اہل علم شمار کیئے جانے کے اہل ہیں معدودے چند نکلیں گے جو کسی اردو اخبار یا رسالے کے خریدار ہوں کیونکہ جس قسم کے مضامین ان کی تفریح کا باعث ہوسکتے ہیں یا جن سے ان کی معلومات میں کوئی اضافہ ہوسکتا ہے اردو کے دو چار اخبارات و رسائل کے سوا کسی ایک میں بھی نہیں ہیں۔ اسلیئے اُن کو اپنی علمی پیاس بجھانے کے لیئے اردو کے علاوہ اور دوسری زبانوں کے رسائل کو ترجیح دینا پڑتی ہے اسی کے مقابل جو دو ایک بلند پایہ اردو رسائل ہیں اور جن سے صرف اہل علم استفادہ کرسکتے ہیں اُن کے خریداروں کی تعداد محدود سے چند سے زائد نہیں ہے۔ جب صورت حال یہ ہو کہ ہمارے اردو کے اخبارات و رسائل کوئی مخصوص علمی سرمایہ مہیا نہیں کرتے۔ اور اسلیئے نہیں کرتے کہ ملک میں مانگ نہیں ہے۔ بلکہ محض اسی صرف اس چیز کی ہے جو معمولی آسان اور سہل ہو تو پھر یہ کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا کہ مضامین کسی ایسی زبان میں کیوں نہیں لکھے جاتے جنکو کسی رسالہ کے خریدار سمجھ سکیں، ہمارے کسی مضمون کا خاطرخواہ فائدہ صرف اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ جو کچھ ہمنے لکھا ہے اور جو خیالات ہم نے ادا کرنے چاہے ہیں وہ ہر تھوڑے سے تھوڑا پڑھا لکھا آدمی بڑی آسانی اور روانی کے ساتھ سمجھتا چلا جائے ورنہ کسی ایسی زبان کے لکھنے سے کیا فائدہ جسکو بہت سے الفاظ ہم خود نہ سمجھتے ہوں۔ ممکن ہے کہ ایک عام آدمی ہمارے موٹے موٹے اور ثقیل لفظوں کے وزن سے مرعوب ہوکر ہماری قابلیت کا معترف ہوجائے لیکن کیا قابلیت کا یہی معیار ہے اور کیا تحسین ناشناس کی اس سند سے ہم واقعی قابل ہوجاتے ہیں۔ ہمارا اپنا خیال تو یہ ہے کہ قابلیت تو ایسی اور صرف اس چیز کا نام ہے کہ ہم اپنے خیالات دوسرے کے سامنے ایسے الفاظ اور ایسی زبان میں ادا کریں کہ خواہ سننے والا ہمارا ہم خیال ہو یا نہو اُسے یہ ضرور معلوم ہوجائے کہ ہم نے کیا کہا ہے اور خود ہمارا کیا خیال ہے۔ اور یہ صرف اسی صورت سے ممکن ہے کہ ہم اس حکیمانہ مقولہ "کلموا الناس علی قدر عقولھم" (لوگوں سے ان کی عقل کے مطابق بات کرو) کو ہر وقت پیش نظر رکھیں اور لوگوں کے سامنے ان کی

استعداد کے مطابق الفاظ استعمال کریں۔ اگر ہمکو اپنے خیالات ایسے طبقہ کے سامنے پیش کرنیکا موقعہ بھی میسر آ جائے جنکے لئے موٹے موٹے اور ثقیل الفاظ بھی کوئی ثقل نہ پیدا کریں جبکہ اس سے ہماری قابلیت پر کوئی حرف نہیں آ سکتا کیونکہ قابلیت جیسا کہ ہم نے ابھی کہا ہے اپنے خیالات کو ادا کر سکنے کا نام ہے موٹے اور چھوٹے ہلکے یا بھاری الفاظ سے اسکو کوئی واسطہ نہیں۔ مگر ان موقع در بر کتہ ملانے والے، ایسے مواقع کبھی مہیا ہو سکتے ہیں کہ ہم کو چار و نا چار ایسے الفاظ استعمال کرنے پڑ جائیں جو کسی طرح سہل کی فہرست میں داخل نہ کئے جا سکتے ہوں اور یہ صورت صرف اس موقعہ پر پیش آتی ہے جب ہم کوئی خاص ہی مسئلہ بیان کر رہے ہوں اور ایسے موقعہ پر لکھنے والا معذور ہوگا کیونکہ کوئی ایسی چیز جس سے ہم ناواقف ہوں خواہ خود کتنی ہی آسان ہو ہمارے لئے بہر حال مشکل ہوگی، لیکن وہ خیالات جن سے رات دن ہر شخص کسی نہ کسی صورت میں دو چار ہوتا ہے اور وہ باتیں جن سے ہر شخص کو واسطہ پڑتا ہے اسی زبان میں ادا کئے ہونے چاہئیں جو دن رات بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

اس نوعیت میں عام طور پر ہمارے وہ نوجوان مضمون نگار مبتلا ہیں جو حقیقتاً خود کوئی ذاتی قابلیت نہیں رکھتے بلکہ ان کی ساری قابلیت تھوڑے سے رٹے ہوئے لفظوں تک محدود رہتی ہے۔ اور چونکہ اکثر لفظ کے صحیح تلفظ اور صحیح معنی سے واقف نہیں ہوتے ہیں اسلئے اگر بولتے ہیں تو بولتے بھی غلط ہیں اور لکھتے ہیں تو غلط موقع پر استعمال بھی کر جاتے ہیں، نظم میں یہ نوعیت بہت زیادہ ہے اور نثر میں نظم کی بہ نسبت کسیقدر کم۔ گو کم اسکو بھی نہیں کہا جا سکتا۔ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ کوئی خیال بہت اچھا ہوتا ہے بندش بھی چست ہوتی ہے مگر چونکہ صحیح لفظ استعمال نہیں ہوتا اسلئے پڑھنے والے کو لطف کے بجائے بدمزگی اور دلچسپی کی بجائے نفرت ہو جاتی ہے۔ نظم میں چونکہ قافیہ اور وزن کی بھی پابندی کرنی ہوتی ہے اسلئے یہ داغ بہت جلد نمایاں ہو جاتا ہے اور نثر میں چونکہ اس قسم کی پابندی نہیں ہوتی اسلئے وہاں اسقدر نمایاں نہیں ہوتا لیکن اگر کسی سیاہ کپڑے پر سیاہی گر پڑے اور کپڑے کی سیاہی اُس داغ کو نمایاں نہ ہونے دے تو اس کپڑے کو بے داغ نہیں کہا جا سکتا، اسی طرح ایسی نثر کو کوئی کامیاب نثر نہیں کہا جا سکتا، اردو کی ایسی خدمت سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے جس سے اُس کا حلقۂ اثر دن رات کم سے کم تر ہوتا چلا جائے اور اُسکے سمجھنے والوں کی تعداد روز بروز گھٹتی چلی جائے اور اگر ہماری اردو نویسی کی یہی رفتار رہی تو وہ دن دور نہیں ہے کہ اُسکا حلقہ صرف اُن معدودے چند مضمون نگار صاحبان تک محدود رہ جائیگا جو اس قسم کے مضامین لکھا کرتے ہیں، اردو نہ مسلمانوں کی زبان ہے اور نہ ہندوؤں کی، اردو ہندو مسلمانوں کے میل جول سے بنی ہے اسلئے دونوں اُسکے یکساں برابر کے حصہ دار ہیں، اسلئے اُسے ہونا بھی ایسا ہی چاہئیے جسے دونوں یکساں سمجھ سکیں، ہندوؤں کی اردو مسلمان تو مسلمان بہت سے ہندو بھی نہ سمجھ سکتے ہونگے اور اسیطرح مسلمانوں کی اردو کو ہندو تو کیا مسلمان بھی تھوڑے ہی سمجھ سکتے ہیں اگر اردو کی خدمت اسی کو کہتے ہیں تو بخشو بی بلی چوہا لنڈورا ہی بھلا۔

برلن کے کتب خانہ میں بیٹھ کر

(از جناب سید مغنی الدین صاحب شمسی دہلوی)

میرا خط دیکھکر آپ کو شاید تعجب ہوگا کہ یہ کون کودپڑا لیکن میں اپنا فرض عین تصور کر کے یہ خط تحریر خدمت کر رہا ہوں۔

لیتا ہوں مکتب غم دل میں سبق ہنوز
لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا

میں اپنا زیادہ تر وقت برلن کے سرکاری کتب خانہ میں صرف کرتا ہوں یہ ایک نہایت عالیشان عمارت ہے۔ اندر قدم رکھتے ہی دل پر عجیب کیفیت طاری ہوتی ہے۔ تمام خیالات بیرونی دنیا سے منقطع ہوجاتے ہیں، چاروں طرف خاموشی کا عالم نظر آتا ہے، لوگ بیشک حرکت کرتے ہوئے اور ٹہلتے ہوئے نظر آتے ہیں مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب بزبان حال علم کی اور کتابوں کی ہیبت چھائی ہوئی ہے۔ سب اپنے اپنے مطالعہ میں مصروف ہیں، کوئی کھڑا ہے تو کھڑے کھڑے ہی پڑھ رہا ہے۔ کوئی بیٹھا ہوا ہے تو اسی حالت میں پڑھ رہا ہے کسی کو اگر کسی قسم کا سہارا مل گیا ہے تو اسی سے سہارا لگائے پڑھ رہا ہے مجھے بھی ایک دفعہ ایک کتاب ڈھونڈھنے کے لیئے اٹھنا پڑا۔ میں گیلری میں گیا۔ رمضان کے دن تھے اور میں روزے سے تھا وہاں ڈھونڈتے ڈھونڈھتے مجھے ایک کتاب اور مل گئی میں اس کتاب کو دیکھنے لگا۔ مجھے اس کتاب کے متواتر پڑھنے میں تقریباً چار گھنٹے لگ گئے میں کھڑا ہوا تھا لیکن مجھے اسکا احساس بالکل نہیں ہوا۔ جب اتفاق سے گھڑی نکالی تو معلوم ہوا کہ افطار کا وقت بالکل قریب ہے ایسا سماں اور ماحول انسان کو خودبخود مطالعہ کیطرف مائل کرتا ہے ہر شخص اپنے پنجوں پر چلتا ہے تاکہ ایڑی کی کھٹ پٹ دوسرے پڑھنے والوں کی توجہ اپنی طرف مبذول نہ کرے۔ یہ کتب خانہ صبح کے نو بجے سے رات کے نو بجے تک کھلا رہتا ہے۔ درمیان میں کوئی وقفہ نہیں ہوتا اور خاص ممبروں کے لیئے کوئی خاص وقت یا کوئی خاص انتظام نہیں ہوتا۔ اول تو کوئی ممبر ہی نہیں ہوتا۔ اور نہ کسی کے لیئے سوائے طالب علموں کے مفت داخلہ کی اجازت ہے۔ داخلہ کا کارڈ ہر شخص خرید سکتا ہے جسکی میعاد چھ مہینے کی ہوتی ہے اور قیمت تقریباً ایک روپیہ تیرہ آنے ہوتی ہے ایک ہفتہ کے لیئے بھی داخلہ کا کارڈ مل سکتا ہے۔ اسکی قیمت تقریباً چھ آنے ہوتی ہے، مشرقی زبانوں کی کتابوں کا علیٰحدہ کمرہ ہے جسمیں عربی فارسی عبرانی، سنسکرت، جاپانی۔ چینی۔ ترکی وغیرہ زبانوں کی کتابوں کا ذخیرہ موجود ہے۔

اس عرصہ میں جو کچھ میرے مطالعہ سے گذرا اسکا خلاصہ آپکو بھی تحریر کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن مصالحہ انگریزی میں ہاتھ لگا ہے۔ لہذا بعینہ نقل کرتا ہوں تاکہ اصلی حالت میں آپ تک پہنچ جائے

مسلمانوں کی حالت موجودہ سب پر روشن ہے۔ خاصکر یورپ میں بیٹھ کر مقابلہ کرنیکا موقعہ ملتا ہے۔ سب سے زیادہ افسوس اس بات کا ہوتا ہے کہ یورپ اسلام سے بہ نسبت ہمارے نئی روشنی کے تعلیم یافتہ حضرات اور علمائے کرام کے جن کو کہ عالم کا اصلی معنوں میں خطاب بھی موزوں نہیں ہے۔ زیادہ واقف ہے۔ آپ خیال فرمائیں گے کہ چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔ لیکن جو کچھ میں تحریر کر رہا ہوں اسکا ایک ایک لفظ میں ثابت کر سکتا ہوں، اور جن کے مستند حوالے

یہاں کتب خانہ میں موجود ہیں یہ کوئی نئی بات ظاہر نہیں کر رہا ہوں بلکہ
حوالہ واقعی اسے مطلع کیا چاہتا ہوں کہ

افسوس کہ وہ مسلمان جو علم کی شمع پر جان نثار کرنے والے
تھے اب خود اس روشنی سے محروم ہیں۔ اور نہ پروانے کی سی عادت ان
میں اب موجود ہے۔ یہ شمع جو اب یورپ میں جل رہی ہے اسے بھی پہلے
کو بھول گئے اور غلام ہو گئے۔ بال و پر کھو بیٹھے۔ مسلمانوں
کی تعداد اس وقت تقریباً ... کروڑ ہے جو ایشیا، افریقہ،
امریکہ اور آسٹریلیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ لیکن یہ کروڑوں
کی تعداد بے حقیقت، صرف ایک تماشا ہی سی ... ہے
... ... ان میں وہ قوت وہ ایکا
وہ جوش اور وہ ولولہ پیدا ہونے کی نسبت جہاں سے جوانوں میں قوت عمل
پیدا کرے۔

یہاں بھی وہ بغداد کی یونیورسٹیاں ہارون رشید اور مامون
کے کارنامے۔ اب کون دہراتا ہے اور کتنے لوگ جانتے ہیں کہ

بغداد۔ بصرہ۔ دمشق۔ اور مکہ میں مسلمانوں کی یونیورسٹیاں
قائم تھیں اور قرطبہ کی بابت ایک حوالہ ہے جسکو نقل کرتا ہوں۔
"غالباً قرطبہ دنیا کا سب سے زیادہ مہذب شہر تھا۔"
کتنے مسلمان جانتے ہیں کہ اسپین میں مسلمانوں کے دور میں مفصلہ
ذیل ایجادیں جن میں سے بعض کو ہم یورپ کی اختراع
سمجھتے ہیں موجود تھیں، جسکو میں حوالہ سے نقل کرتا ہوں۔
"نویں صدی سے لیکر گیارہویں صدی تک ہسپانیہ
مغربی تہذیب و تمدن کا خاص مرکز رہا۔ بغداد اور مشرقی مسلمانوں
نے شاہراہ علم پر دنیا کی رہنمائی کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علوم و فنون
بہت جلد ترقی کر گئے، محلات، مساجد، پبلک حمام، حوضیں

بازار سڑکوں کی لالٹینیں۔ اور اس زمانے کے کھر بنچے ہماری توجہ کو
اپنی طرف منعطف کرتے ہیں۔ موجودہ زمانے کے تعیش کے سامان مثلاً
پھول، سونا چاندی، ہاتھی دانت، سنگ مرمر، نیمو، صندل
کی لکڑی، موتی، بلور، وغیرہ بھی دوسرے ممالک سے لائے جاتے
تھے۔ نقاشی کے نمونے، جھاڑ فانوس، عطریات، فوارے، رنگین
آئینوں کی کھڑکیاں، پچی کاری کے فرش، اور گرم و سرد پانی کے
چشمے عام طور پر گھروں میں پائے جاتے تھے، ان سب چیزوں کے
علاوہ ایک خاص بات ہماری توجہ کو اپنی طرف منعطف کرتی ہے۔ اور
وہ کتب خانے، مساجد کے مدارس اور یونیورسٹیاں ہیں جنکا حال
پڑھ کر خواہ مخواہ داد دینے کو جی چاہتا ہے"
اور یہ اس زمانہ میں موجود تھیں جب کہ یورپ ان سے نا واقف تھا۔
دوسرا حوالہ علم کے شوق کا یہ ہے
"مامون الرشید نے بغداد میں ایک یونیورسٹی قائم کی، ایک کتب خانہ
کھولا اور ایک رصدگاہ تعمیر کرائی۔ محصول کی بجائے کتابیں، تصاویر
نقشہ جات تک قبول کرنے لگا۔ مختلف شعبہ ہائے علوم کے لئے پروفیسر
مقرر کئے۔ وہ طلباء کی اعانت کرتا تھا۔ اور نایاب مخطوطات اور آلات
خریدتا تھا نیز خود بھی مطالعہ کا بہت شوقین تھا اسی کے زمانہ میں بطلیموس
کے جغرافیہ اور علم نجوم کا ترجمہ المجسطی کے نام سے کیا گیا اور اسی کے زمانہ میں
ارسطو کی کتاب کٹیگریز اور پوسٹکس، اور افلاطون کی کتاب "جمہوریت"
اور ٹیمینز، اور اقلیدس کے مبادیات اور علم طب میں جالینوس کی تصنیفات
کا ترجمہ کیا گیا۔"

خلفاء عباسی کے زمانہ کی بابت منقول ہے۔
"ان کی سرپرستی میں نایاب کتابوں کی تلاش اور غیر زبان کی کتابوں
کے باقاعدہ ترجمے کا انتظام کیا گیا بمقام دارالسلطنت تابرہ
علم نجوم اور طبیعات کا مشہور مرکز بن گیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ

کہ ایک ہزار سے زیادہ طالب علم طبی کالج ہسپتال اور کیمیائی عملوں میں حاضر رہتے تھے"

کتنے مسلمانوں کو معلوم ہے کہ محمد بن موسی الخوارزمی۔ عمر خیام۔ بطانی، رازی، علی حزین۔ ابوعلی الحسین بن عبداللہ بن سینا۔ ابوالولید محمد۔ ابوالوفا وغیرہ نے علم حساب اقلیدس الجبرا۔ نجوم۔ کیمسٹری۔ فلسفہ۔ طب۔ جراحی اور جغرافیہ میں بڑے بڑے کارنامے چھوڑے ہیں۔ صرف خلیفہ حکیم دوم کی لائبریری میں چھ لاکھ کتابیں موجود تھیں، افسوس یہ ہے کہ یورپ کو یہ باتیں ہم سے زیادہ معلوم ہیں اور تاریخ طبری اور طبقات ابن سعد یورپ کی بدولت شائع ہوئیں۔ جنکی اشاعت میں ایک بھی مسلمان شامل نہ تھا۔ علامہ شبلی صاحب نے سلسلۂ آصفیہ میں بہت سے کارناموں کا ذکر کیا ہے، لیکن جو کچھ میں تحریر کر رہا ہوں وہ یورپ کی زبان کے الفاظ نقل کر رہا ہوں۔ جنکی وقعت زیادہ ہے وہ خود اپنی زبان سے تعریف کرتا ہے اور یہ ایک غیر کے الفاظ ہیں۔

"عربوں نے ریاضی اور جبر مقابلہ کے بہت سے پیچیدہ اور لاینحل مسئلوں کے معقول اور آسان حل دریافت کئے اور اسی طرح علم مساحت میں بہترین اصول اور صحیح تر اوزاروں کا اضافہ کیا قدیم یونانی علم ہندسہ کو ترقی دیکر انہوں نے علم نجوم کے بہت زیادہ صحیح اصول قایم کئے۔ ستاروں کے مشاہدہ کے لئے وہ نظر افزا دوربینوں کا استعمال کیا کرتے تھے انہیں زمین کے گول ہونیکا علم تھا، عرض البلد کے درجوں کی پیمایش انہوں نے کی، اور سورج کے محور کو بھی انہوں نے ناپا، سال کی مدت کا قریب قریب صحیح اندازہ لگایا، جغرافیہ کی تعلیم کرۂ زمین بنا کر دینی شروع کی اور بہت سے ستاروں کے نام رکھے، مغربی یورپ میں بہت سی علمی اصطلاحیں وہی موجود ہیں جو عربوں نے رائج کی تھیں اور جو عربی زبان میں ہیں۔ مثلاً الجبرا (جبر مقابلہ) ایزیمتھ (السموت) زینتھ (سمت الراس) نادر (ناظر) وغیرہ۔ خلفائے اسلام ہمیشہ کتب خانوں اور معملوں کی سرپرستی اور معاونت میں فیاضی دکھاتے رہے ہیں۔ شورہ کا تیزاب، اور ایکوا ریجیا (وہ تیزابی عرق جسمیں سونا حل ہوجاتا ہے) جابر کی دریافتیں ہیں۔ گندھک کے تیزاب کی دریافت کا سہرا رازی کے سر ہے علم طبیعات میں بھی مدتوں کے غلط یونانی مسلموں اور نظریوں کو جو نگاہ کے متعلق چلے آرہے تھے، الحزین نے صحیح کیا اور روشنی کی شعاعوں کے ساتھ انسانی آنکھوں کے تعلق کی وضاحت کی۔ علم الاثقال کشش عرذی، اور اجسام مختلفہ کے اوزان، اور قوت حرکت کے اصولوں کے متعلق بھی تجربے اور مطالعے عربوں نے برابر جاری رکھے اور مفید معلومات حاصل کیں۔

یورپ کو مسلمانوں کے ذریعہ تمدن پہنچنے کا خود اقرار ہے
عربی فلسفہ نے مغربی یورپ کی دماغی زندگی ہی یونانی حکمت کی عارضی جدائی کے زمانے میں بھی اسکی قوت اور اسکے نشو ونما کو قایم رکھا
بارہویں صدی میں ارسطو کی خاص تصانیف معہ ابوالولید محمد کی تفسیر کے لاطینی زبان میں ترجمہ کیگئیں طلیطلہ ۱۰۸۵ء میں الفنسو کے قبضہ میں آجانیکے بعد تعلیم کا ایک مشہور مرکز بنگیا۔ یہیں عربی زبان کی کتابوں کے ترجمے لاطینی زبان میں کیئے گئے۔ انہیں لوگوں کی کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ بارہویں صدی کے اختتام تک یورپ نہ صرف تعلیمات ارسطو سے ہی واقف ہوگیا، بلکہ عربی اور ہندی کے علم ریاضی والمجسطی، اقلیدس، اور عربی کے الجبرے سے بھی واقف ہوگیا۔
یورپ اپنی اسوقت کی ناقابلیت کا خود اظہار کرتا ہے۔
"پھر بھی ایسا مصالحہ باقی رہ گیا جسمیں یورپ کو پختگی حاصل نہیں ہوئی اسمیں بڑے بڑے لغات، دائرۃ المعارف لاتعداد سوانحعمریاں،

...ن ذخائر، علم طبیعیات اور علم فلسفہ کے رسائل اور صنعت اور
علم ہیئت کی تحقیقات شامل ہیں۔

ایک اور ثبوت۔

عربی تہذیب کے یورپی تعلیم پر اثر کی مثال اس واقعہ
میں مل سکتی ہے اوجہ برٹ نے جو بعد میں سلوسٹر ثانی کے نام سے
پوپ ہوا اسپین میں تعلیم حاصل کی تھی۔

اسکے علاوہ اور بھی بہت سے مشہور لوگ ہیں جنہوں نے
اسپین میں تعلیم پائی تھی۔

(۱) بیبیرڈ آف کرلوینیا۔ (۲) انیال ڈی موریلی جو پیرس یونیورسٹی
سے طلب ہو گیا۔ اور وہاں سے بہت سی کتابیں انگلستان لایا۔
(۳) مائیکل سکاٹ۔ (۴) ایک جبکا نام بغداد میں مستعطین تھا۔
(۵) اتھارڈ نے علم طبیعات اور فلسفہ کا مطالعہ ایشیا کے کوچک
مصر اور ہسپانیہ میں کیا اور موٹ پلیر کے طبی اسکول میں مدت با
دراز تک عربی نصاب جاری رہا۔

یورپ کی ہیبت ہوئی اور نکتہ چینیاں جو اس نے اسلام پر کی ہیں
وہ میں اسوقت نظر انداز کرتا ہوں۔

نئی روشنی کے تعلیم یافتہ صاحبان کو یورپ کی تقلید نے ایسا اندھا
کردیا ہے۔ کہ وہ سوائے انگریزی اور یورپین مصنفوں اور شاعروں کے
اسلام تو درکنار خود آنحضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمری
سے بھی واقف نہیں ہوتے۔ لیکن اگر پوچھا جائے کہ نپولین کے کارنامے بتاؤ
تو سب زبانی یاد نکلیں گے۔ افسوس تو یہ ہے کہ بغیر مطالعہ کئے خود یہ صاحبان
بھی معترضوں کے ہمنوا ہوکر اسلام سے منحرف ہو جاتے ہیں، اس مطالعہ
کو غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ اور نہ شوق ہوتا ہے
حالانکہ جس مذہب پر اعتقاد ہے اور جسکے پیرو ہیں اُسکے رسول کی
زندگی کے حالات کا مطالعہ کرنا اور اُن سے باخبر ہونا۔ انکا اہم ترین
فرض ہے۔ بلکہ یورپ کو محمد رسول اللہ کی زندگی کے حالات معلوم
کرنیکا زیادہ شوق ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ تقریباً ۲۴ مصنفوں نے
اسلام اور اُسکے رسول پر کتابیں لکھی ہیں۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ تعداد
ہیں۔ یہ مصنفین بڑے بڑے یورپین پروفیسر تھے۔ اب رہا علماء کی
بابت، وہ بیچارے زبان اور دیگر وجوہات سے قاصر ہیں کہ اُن کو یہ مصالحے ہاتھ لگیں
ایک دوسرے کو قصوروار ٹھیراتا ہے۔ اسلام میں روح پھر کسطرح
پھونکی جائے۔ علامہ شبلی نعمانی صاحب کی محنت اور جانفشانی
اور بھوپال کی مدد سے سیرۃ النبی ظہور میں آئی، لیکن جو کتابیں اردو
میں موجود ہیں اُنکے بھی پڑھنے والے نہیں۔ ہمارے امراء جو ہیں
وہ اسطرف بالکل رغبت ہی نہیں کرتے، حالی صاحب مرحوم نے
ان کا خوب نقشہ کھینچا ہے اور ان کی دلبستگیوں کی تفصیل اپنی
مسدس میں بیان فرمائی ہے۔

پہلے امراء کی بابت نقل کرتا ہوں۔

"امراء ہونہار مگر مفلس طلباء کی مدد اور تعلیم یافتوں کی قدر
کرتے تھے اور تحفوں سے اُنہیں نوازتے تھے، اعلیٰ تعلیم کا انتظام
بالکل مفت تھا۔ اُس زمانے کے امراء اور حکام کا یہ دستور تھا
کہ مخطوطات جمع کریں اور اپنے کتب خانوں کو پورے طور پر فائدہ
اٹھانے کے لئے علما کو پیش کردیں"

اُن کا آجکل کے امراء سے مقابلہ کرکے دیکھیں جو فضول خرچیوں
میں پیسہ برباد کرتے ہیں اور اسلام کی تباہی سے بے بہرہ ہیں۔ جب
ہم خود اپنے کو بھول گئے تو کھڑے کس بل پر ہوں۔ جب قوم کے
بڑوں کا یہ حال ہے تو چھوٹوں سے تو بازپرس کرنی ہی عبث ہے
کیونکہ مثال تو یہی قایم کرتے ہیں۔ یورپ جو کچھ ہمارے دماغ میں
بٹھا دیتا ہے بس وہ صحیح ہے۔ خود عقل سلیم کو کام میں لانا اُن کے
نزدیک گناہ عظیم ہے۔ یورپ شراب کی برائی کرتا ہے تو مان جاتے ہیں

کہ واقعی بری چیز ہے۔ لیکن اسلام جو پہلے سے منع کر چکا ہے اسکی انکی نظروں میں کوئی وقعت نہیں ہے، اسلام تیرہ سو برس پہلے حکومت جمہوری کے قانون بتا چکا ہے لیکن یورپ نے جو جمہوریت کا ڈنکا بجایا تو سب اسی رنگ میں رنگ گئے اور مسلمانوں کی بھی آنکھیں کھلیں، ذہنی، غلامی بدترین چیز ہے۔ غیر زبان کے پڑھنے اور مطالعہ کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ حصولِ علم کا ذریعہ بنائی جائے لیکن یہاں وہ صرف حصولِ معاش کا ذریعہ ہے، جس ملک اور قوم کی تعلیم کا معیار معلموں کے نوٹوں کے ذریعہ اپنے نام کیساتھ چند حروف کا اضافہ کرنا ہو تو اس ملک کا اللہ ہی مالک ہے۔ وہاں تو وہی مثل صادق آئیگی۔ اندھیر نگری چوپٹ راجہ ٹکے سیر بھاجی اور ٹکے سیر کھا جا۔ یہی عالم ہندوستان کا ہے وعظ و پند اور تقریروں میں وہ اثر نہیں رہا۔ دوسرے یہ ذرائع عوام کے لیئے استعمال ہوتے ہیں، لیکن عوام اس منزل سے بہت دور ہیں جو ان پر جادو چل سکے، سب سے مقدم اس طبقہ میں اشاعت ہونی چاہئیے جو تعلیم یافتہ ہے۔ لہذا انکے لیئے صرف ایک ذریعہ ہے اور وہ کتابیں ہیں۔

یورپ کے کتبخانوں میں اسلام پر اتنا مواد کتابوں کا موجود ہے کہ نہایت اعلی درجہ کی کتابیں لکھی جا سکتی ہیں اور ترجمے ہو سکتے ہیں مشکل یہ ہے کہ یورپ آنیوالے طلبا اس سے بیخبر ہوتے ہیں کہ یہاں کتنا بڑا ذخیرۂ کتب موجود ہے، اور جو اصحاب اس سے باخبر ہیں وہ پیٹ کی وجہ سے مجبور ہیں، نہ کوئی انکی مدد کرنیوالا۔ اگر کچھ لوگ اس اسلامی خدمت کیلئے قدم بڑہائیں تو ان کے یہ کارنامے اسلام کی عمارات کو از سرِ نو تعمیر کرنمیں بڑی مدد دیں، اللہ تعالی مسلمانوں کو یہ توفیق دے۔ آمین ثم آمین - یہ ثوابِ دارین کا سودا ہے معلوم نہیں کہ یہ سہرا کسکے سر بندھے اور کس کا نام دنیائے اسلام میں روشن ہو گا جسکو کہ عزت سے یاد کیا جائیگا۔

ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں جو لباس بی اے۔ ایم اے وغیرہ کی ڈگریوں کی تقسیم کے وقت پہنا جاتا ہے وہ مسلمانوں کی ایجاد ہے حوالہ نقل ہے

”جو لباس آجکل یورپ کی یونیورسٹیوں میں رائج ہے وہ سب سے پہلے قاضی ابو یوسف بغدادی (م ۱۹۸ھ) نے رائج کیا تھا“

اس قسم کی غلط فہمیاں دور ہو جانی چاہئیں اور مسلمانوں کو معلوم ہو جانا چاہیئے کہ وہ بھی ایک زمانہ میں تمدن کے مالک تھے، جسکو انہیں اپنی کھوئی دولت سمجھنا چاہیئے اور اسکے پھر حاصل کرنیکی کوشش کرنی چاہیئے نہ کہ یہ سمجھا جائے کہ یہ سب کچھ ہم نے یورپ سے ہی سیکھا ہے۔ زمانہ کل قوموں کا استاد ہے۔ تمدن کسی قوم کی کوئی خاص ملکیت نہیں ہے۔ بلکہ ہر ایک قوم اسے جب چاہے حاصل کر سکتی ہے لیکن لا انتہا کوشش شرط ہے۔ ہم بھول گئے، زبردستی بھلایا گیا کتب خانے تباہ ہو گئے یہ احساس انکی رگوں میں بیٹھ جانا چاہیئے پھر وہ خود بخود شوق سے پھر تمدن اور تعلیم حاصل کرنیکی کوشش کرینگے اور جلد ترقی کر سکینگے۔

یورپ اسقدر لا مذہب مشہور ہو نے پر بھی مذہب کو نہیں بھولا۔ اتوار ہی عیسائیت کا چھٹی کا دن ہے بڑا دن یعنی کرسمس حضرت عیسی کی پیدائش کا دن تمام یورپ اور امریکہ اب بھی بڑی خوشی سے مناتا ہے۔ مذہب سے کوئی قوم اور کوئی شخص آزاد نہیں ہو سکتا عیسائیت کی تبلیغ اسوقت پہلے سے زیادہ بڑھ چڑھ کر ہے پوپ نے پھر اپنی شان اختیار کر لی ہے۔ اور عیسائیوں کا خود مختار بادشاہ مانا جاتا ہے۔ گرجا ویسے ہی قایم ہیں۔ لیکن مسلمان بے علمی، ناداری بیوقوفی کی حالت میں مذہب سے کنارہ کرتے چلے جا رہے ہیں۔ اللہ تعالی انکو سیدھا راستہ دکھائے۔ آمین ثم آمین اھدنا الصراط المستقیم ہم پنجوقتہ نماز میں دعا کرتے ہیں لیکن غور نہیں کرتے۔ آنکھوں پر پردہ ہے۔ اب باتوں کا وقت نہیں ہے بلکہ کام کا وقت ہے خدا تعالی سے دعا ہے کہ وہ ہمیں توفیق دے آمین ثم آمین۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ۵ ع ۶ سورہ عنکبوت

"تو ہے اور میں ہوں"

(از حضرت آزاد انصاری)

کسی کی جستجو ہے اور میں ہوں
تلاشِ چار سُو ہے اور میں ہوں

خوشا قسمت کہ تو ہے اور میں ہوں
بہارِ رنگ و بُو ہے اور میں ہوں

تمہارے آرزو مندوں میں ہو کر
عذابِ آرزو ہے اور میں ہوں

جنونِ چارہ جوئی بڑھ چلا ہے
خیالِ چارہ جو ہے اور میں ہوں

محبت نے کہاں پہنچا دیا ہے
مقامِ رشکِ تو ہے اور میں ہوں

تری محفل میں پرسش تک نہیں ہے
یہ میری آبرو ہے اور میں ہوں

کبھی دن رات رنگیں صحبتیں تھیں
اب آنکھوں میں لہو ہے اور میں ہوں

نقد و تبصرہ

"احقاقِ حق" مولوی محمد ادریس خانصاحب نجیب آبادی کی لکھی ہوئی ایک مختصر سی کتاب کا نام ہے جو گاندھی جی کی خودنوشت سوانح عمری "تلاش حق" پر بالفاظ مصنف بطور تنقید لکھی گئی ہے۔

اس کتاب میں گاندھی جی کے کارناموں کا خلاصہ درج ہے اور اُن کی بعض خوبیوں مثلاً "ہستی باری تعالیٰ پر کامل یقین"، "راست گفتاری" اور "بزرگوں کی تکریم" وغیرہ کو قابل تقلید بتایا گیا ہے ساتھ ہی اُن کے بعض خیالات پر نکتہ چینی بھی کی گئی ہے۔ اس ضمن میں اُنکی "ہندو مذہب کے ساتھ گرویدگی"، "ضعیف الاعتقادی" اور "تجرد و برہمچاریہ" قابل ذکر ہیں۔

مؤخر الذکر امور پر بحث کرتے ہوئے مصنف مذکور زیادہ تر اپنے معتقدات کے دائرہ میں رہے ہیں اُنہوں نے اس حقیقت کو فراموش کردیا ہے کہ کوئی شے ہماری اپنی نظر میں خواہ کسی قدر مستحسن کیوں نہ ہو اور دوسرے مذہبوں کو خواہ ہم کتنا ہی ضعیف کیوں خیال نہ خیال کریں، لیکن ہمارا یہ طرز عمل ان اصحاب کی دلکشی کا باعث نہیں ہوسکتا جن کے عقاید ہم سے مختلف ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان مباحث پر قلم اُٹھانے کے لیئے نہایت حزم و احتیاط کے ساتھ انتہائی بلند نظری اور وسیع النظری کی ضرورت ہے۔ آج کل مذہبی اختلافات کا جو اس قدر طوفان برپا ہے اُسکی اصل وجہ یہی ہے کہ ہم دوسرے مذہب والوں کے معتقدات اور دوسرے مذاہب کی تعلیمات کو بھی اپنے معتقدات ہی کے معیار پر پرکھنا چاہتے ہیں۔ اسطرح ہماری رائے یکطرفہ اور محدود ہو جاتی ہے۔ ہم صحیح نتائج اخذ کرنیمیں ناکام رہتے ہیں، ہم خود تعصب میں پھنس جاتے ہیں اور ہمارے دلائل و براہین غیر مذہب والوں کے دل پر مطلقاً اثر نہیں کرتے۔ بالکل یہی حال مصنف کی تحریر کا ہے۔

آپ نے آخر میں گاندھی جی کے نظریہ عدم تشدد کو قابل اعتراض قرار دیا ہے اور اسکی خامیاں دکھانیکی کوشش کی ہے اس ضمن میں اگرچہ مصنف کی کوشش لایق داد ہے، لیکن اسکو اچھی طرح سمجھنے کے لیئے محض "تلاش حق" کا مطالعہ کافی نہیں ہے بلکہ مختلف مذاہب کی تعلیم، موجودہ دنیا سے سیاست کا رجحان، ایشیا پر یورپ کے اقتدار کی نوعیت بالخصوص ہندوستانی سیاست اور اہل ہند کی بے بسی پر بھی نظر غائر ڈالنے کی ضرورت ہے۔

مذہبی نقطۂ نظر سے گاندھی جی کا یہ نظریہ کوئی نئی چیز نہیں ہے بلکہ حضرت عیسیٰ کی تعلیم رحم کی عملی تشریح ہے، اسلام کی تعلیم بھی اسکے منافی نہیں البتہ اسلام نے فطرت انسانی کی بعض گہرائیوں کا اندازہ کرنیکے بعد انتقام اور عفو کا نظریہ پیش کرکے اسکو زیادہ قابل عمل اور زیادہ مطابق فطرت بنادیا ہے، بہر حال اس زمانہ میں جب کہ مادیات کا دور دورہ ہے اس روحانی عمل کو قبول نہ کرنا کچھ حیرت انگیز نہیں ہے اسکو سمجھنے کے لیئے بصارت سے زیادہ بصیرت کو ضرورت ہے۔ ہمیں اس کی اہمیت تسلیم کرنے اور اسکے متعلق آخری رائے قایم کرنے کے لیئے چندے اور انتظار کرنا چاہیئے۔

مجھے سب سے زیادہ تعجب اُس اندیشے پر ہے جو مصنف نے آغاز کتاب میں ظاہر کیا ہے۔ کہ گاندھی جی کی ذات سے ایک نئے مذہب کے اجرا کا امکان ہے اور ایسا ہوا تو یہ بات اسلام اور

اور دیگر مذاہب کے لئے خطرہ سے خالی نہیں۔ اول تو یہ اندیشہ ہی مضحکہ انگیز ہے۔ سوائی زادی کی خاطر ایک خاص طریق کار اور ایک مخصوص طرز عمل اختیار کرنے میں اور ایک اور نیا مذہب ایجاد کرنے میں آخر کونسا باہمی ربط و تعلق ہو سکتا ہے اور اگر بالفرض ایسا ہو بھی تو اس سے اسلام کو کیونکر اندیشہ ہو سکتا ہے۔ گاندھی جی کی جن خوبیوں کو مصنف نے سراہا ہے مذہب اسلام آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے ان سبکی تعلیم دے چکا ہے۔ جن امور کو لائق مصنف نے قابل اعتراض سمجھا ہے وہ بھی نئے نہیں ہیں بلکہ ہندوستان ہی میں تقریباً نو سو برس سے پیشتر مسلمانوں کے پیش نظر رہا اور جب اسوقت تک ان کے علی الرغم اسلام کی تعلیم بجنسہ قایم ہے بلکہ پوشیدہ طور پر مخالف ذہنیتوں پر قبضہ جما رہی ہے تو کیونکر ہو سکتا ہے کہ وہ اسکی متحمل نہ ہو سکیگی۔ خدا جانے ہم نے اسلام کو ریت کا گھروندا کیوں فرض کر لیا ہے کہ ایک اشارے سے منہدم ہو جائیگا۔ جس مشعل حق و صداقت کو دنیا کی بڑی سے بڑی فوجی، مالی اور اثر و اقتدار کی تیز و تند آندھیاں بھی گل نہ کر سکیں کیا وہ ان خیالی اور وہمی پھونکوں سے بجھائی جا سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ ہم نام کے مسلمان ننگ اسلام مٹ جائیں، مگر یہ ناممکن ہے کہ فطرت اللہ صداقت و راستی، اور حق و نیکی دنیا سے فنا ہو سکے۔ اگر اسکے سوا اسلام کا کوئی اور مفہوم ہے تو بیشک وہ اسلام فنا ہو سکتا ہے اور اُسکا فنا ہونا ہی بہتر ہے۔

اسکے علاوہ کتاب زیر تبصرہ میں کوئی عبارت ایسی موجود نہیں ہے جو اس اندیشہ کی مؤید ہو برخلاف اسکے گاندھی جی کی تحریروں کے اقتباسات سے مصنف کے دعوی کی سراسر تردید اور تغلیط ہوتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اس اندیشہ کے اظہار سے مذہب اور ملت کی کونسی خدمت ہو سکتی ہے۔ اور اگر فی الحقیقت کہیں کوئی خطرہ موجود ہی ہے تو وہ اس کتاب کے پڑھ لینے سے کسطرح دور ہو جائیگا۔

اس اندیشے کی بجائے اگر لائق مصنف اپنی تحریر کو گاندھی جی کی سادگی، جذبۂ خدمت، ایثار و قربانی، بے غرضی، وغیرہ خوبیوں پر محدود رکھتے اور اس بات کو ظاہر کیا جاتا کہ انہوں نے اپنا تن من دھن، قوم و ملک پر نچھاور کر رکھا ہے تو شاید عملی زندگی کی یہ ظاہر مثال ملک کے نوجوانوں میں عملی روح پھونک دینے کا باعث ہوتی اور شاید چند مخلص اور بے لوث نوجوان خادمان ملک و قوم کا اضافہ قوم کی بھلائی کا باعث ہوتا اور جاہ طلب، خودغرض اور جو فروش گندم نما رہنماؤں کے جس جال میں اپنی لاعلمی کیوجہ سے ہم پھنسے ہوئے ہیں اُس سے چھٹکارا حاصل ہو سکتا۔

کتاب کی لکھائی چھپائی اچھی ہے اور مکتبۂ عبرت نجیب آباد سے چھ آنے کے ٹکٹ بھیجکر اسکی ایک جلد منگائی جا سکتی ہے۔

محمد شفیع الدین

منتخبات کلام ہندی

اسوقت ملک کی آب و ہوا فرقہ وارانہ اختلافات کی وجہ سے جس قدر مسموم ہے وہ واقف کار اصحاب سے پوشیدہ نہیں۔ اب تک محض مذہبی معتقدات ہی کبھی کبھی باعث برہمی ہوا کرتے تھے۔ مگر اب سیاسی نزاعات نے بھی ایک مستقل صورت اختیار کر لی ہے اسی صورت میں مسئلۂ زبان بھی ہے، خدا نہ کرے کہ یہ مذہبی اور سیاسی کشمکش افق ہندوستان پر محیط ہو کر امن و امان کو برباد کرنیکا سبب بنے۔ مطلع تاریک ہے اور بعض خودغرض اہل ملک اسکو تاریک تر بنانے کے درپے ہیں۔ اس حالت میں باہمی رواداری اور صلح و آشتی کی ایک صدا بھی غنیمت معلوم ہوتی ہے میں کتاب منتخبات ہندی کلام کو اسی قسم کی ایک صدا سے تعبیر کرتا ہوں۔ جو ڈاکٹر جعفر حسن صاحب پی ایچ ڈی

استاد معاشیات و عمرانیات کلیہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کی زبانِ قلم سے نکلی ہے۔

یہ کتاب ایک تمہید اور ہندی کے اخلاقی، فلسفیانہ، اور عاشقانہ عنوانات کے تحت تقریباً ایک سو ہندی دوہوں اور اُنکی تشریح پر مشتمل ہے، کتابت طباعت، ترتیب عنوانات و مضامین قابلِ داد ہیں۔ ہندی کلام کیا کہنا۔ واقعی لاجواب ہے جس سے ہندی زبان کی عام خصوصیات یعنی، شیرینی سادگی، ترجمانی جذبات اور اثر سب کا اندازہ ہو سکتا ہے، اگر مجرد یہ کلام ہی شائع کیا جاتا تب بھی اس قابل تھا کہ ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کی تشریح سونے پر سہاگہ ہے اور اُسکی وجہ سے اسکی قیمت دوچند ہی نہیں بلکہ چار چند ہوگئی ہے۔

آجکل اس قسم کے کلام سے عام طور پر محض شاعرانہ حیثیت سے بحث کیجاتی ہے مگر یہ طریقہ کچھ اسقدر فرسودہ ہوگیا ہے کہ جب تک واقعی قابل مصنف اپنی کافی لیاقت صرف نہ کرے کچھ لطف نہیں آتا ڈاکٹر صاحب نے جدت یہی کی ہے کہ اسپر معاشیات اور عمرانی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی ہے۔ ان مضامین میں آپ کی دقت نظر سے کون انکار کر سکتا ہے۔ اور اس لئے اس خصوصیت نے اس کتاب کو اور بھی ممتاز بنا دیا ہے۔ آپ نے اس ضمن میں جو کچھ لکھا ہے، اُسمیں سے بیشتر قابلِ داد ہے۔ تاہم ہر شاعرانہ خیال کو محض معاشیات و عمرانیات کی کسوٹی پر پرکھنا اور وجدانیات کا خیال نہ رکھنا شاعری اور جذبات پر ظلم ہے۔ یہ امر باعث اطمینان ہے کہ معاشیات و عمرانیات کی خشکی کا اثر کتاب کے بیشتر حصے پر نہیں ہے۔ اور اسلئے کتاب کی عام دلچسپی میں اس سے کچھ فرق نہیں آیا ہے۔

اسکے علاوہ ایک خاص خامی مجھے یہ بھی نظر آتی ہے کہ بعض دوہوں کا مفہوم بیان کرنے میں کچھ غلطی ہوگئی ہے۔ امید ہے آیندہ اشاعت میں اس خامی کو رفع کرنے کی کوشش کیجائیگی۔ میں اس قسم کے صرف تین چار مثالوں پر اکتفا کرونگا۔

(۱) مثلاً صفحہ ۱۳ پر بارہویں دوہے کا مطلب صاف نہیں ہے

سبھو جگ میں یوں رہے، جیوں جیھا مکھ مانھ
گھیو گھنا بھکشن کرے، تو بھی چکنی نا نھ

پہلی غلطی تو یہ ہوئی کہ آپ نے گھنے کے معنی بجائے "زیادہ" کے "گاڑھا" قرار دئیے ہیں۔ شاید اسی سبب سے اس دوہے کا مطلب سمجھنے میں بھی دقت ہوئی ہو۔

ملاحظہ ہو:- معنی:- اے سبھو (شاعر کا تخلص) دنیا میں آ کر جیسے زبان منہ میں گذر کرتی ہے۔ گاڑھا گھی کھاتی رہتی ہے مگر پھر بھی چکنی نہیں ہوتی (پاک و صاف رہتی ہے)

اسکا مطلب بیان فرماتے ہوئے آپ صفحہ ۱۴ پر لکھتے ہیں کہ "اگرچہ زبان گاڑھا گھی کھایا کرتی ہے مگر پھر بھی چکنی نہیں ہوتی پاک و صاف ہی رہتی ہے۔ اسی طرح انسانوں کو چاہئیے کہ اگر بالفرض بُری صحبت میں بیٹھنے کا اتفاق ہو اور ذلیلوں سے واسطہ پڑے پھر بھی خود ذلیلوں کیطرح بچیں اور چکنے نہ بن جائیں"۔ اسکے بعد آپ فرماتے ہیں کہ "تمثیل اگرچہ بالکل نئی ہے مگر ساتھ ہی بہت اچھی بھی نہیں اعتراض یہ ہے کہ گھی تو فی نفسہ بہت مفید ہے صحت بخش اور مقوی غذا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ بات بُری صحبت یا معاشرت میں نہیں پائی جاتی"۔

میں پوچھتا ہوں کہ آخر اس شعر کا مذکورہ مطلب قرار ہی کیوں دیا جائے۔ مطلب بالکل صاف اور واضح یہ ہے زبان خواہ کتنا ہی گھی کھائے چکنی نہیں ہوتی اسیطرح انسانوں کو چاہیئے کہ زبان سے سبق سیکھیں اور دنیوی تعلقات میں منہمک رہ کر بھی اُس سے الگ رہیں۔ مال و دولت پر بھی یہ شعر منطبق ہو سکتا ہے۔ یعنی اگر خدا

خدا تعالیٰ نے تمہیں دولت مند بنایا ہے تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے اس لئے اسی کے دھیان میں ہر وقت نہ پھنسے رہو۔ اس شعر کا اگر یہ مطلب صحیح ہے تو بیچارے شاعرہ پر اعتراض کرنا کہاں تک مناسب ہے۔

صفحہ ۵۹ کے مندرجہ ذیل دوہے کے مطلب کو غیر ضروری طول دینے کی کوئی مناسب وجہ سمجھ میں نہیں آتی اور اسکا ابتدائی حصہ نہ صرف غیر ضروری بلکہ غیر متعلق بھی معلوم ہوتا ہے۔ مطلب صرف اتنا ہے کہ پاؤں چونکہ نیچے ہیں اسلئے ان کو چوما جاتا ہے اسی عام رسم کو پیش نظر رکھ کر شاعرہ نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ عاجزی اور انکسار ہی درحقیقت بزرگی کی علامتیں ہیں۔

سیس، کان، مُکھ، ناسکا، اونچے اونچے ناؤ
سہجو نیچے کارنے سب کوئی پوجے پاؤ

صفحہ ۶۰ پر اس دوہے کا مطلب بھی صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

چلنا ہے رہنا نہیں، چلنا بسوے بیس
سہجو تنک سہاگ پر کیوں گندھوا سیس

اس دوہے کا مطلب بیان کرنے میں لائق مصنف نے تنک سہاگ کے معنی نئی سہاگن قرار دیئے ہیں حالانکہ میری رائے میں چند روزہ یا عارضی ہونے چاہئیں۔

معنی ظاہر ہیں کہ جب اس دنیا سے کوچ کرنا ضروری ہے اور اس سے کسی طرح مفر نہیں تو اس عارضی سہاگ پر آرائش سر کی کیا ضرورت ہے۔ شاعرہ کی خواہش بس اسی قدر ہے کہ عارضی زندگی کا خیال دماغ انسانی میں تازہ رہے، اور موت کا خیال اسے ناکردنی امور سے باز رکھے، نیز یہ کہ آرائش دنیوی اسے نمائش پر آمادہ نہ کر سکے اور اسمیں عجب و غرور پیدا نہ ہونے پائے۔ اس سے یہ مطلب سمجھنا کہ شاعرہ دنیا کو ہیچ سمجھنے کی تلقین کرتی ہے اور اسکو مورد الزام گردانا صحیح نہیں ہے موت ایک حقیقت ہے اس سے انکار ہو ہی نہیں سکتا۔ باوجود اس اندیشے کے لوگ اس عارضی زندگی کو خوشگوار بنانے کے لئے ہر قسم کے ظلم و ستم روا رکھتے ہیں، غریبوں اور محتاجوں کو ستاتے ہیں اور مزدوروں اور مفلسوں پر ظلم کرتے ہیں یتیموں کا مال اور اوقاف کی دولت شیر مادر کی طرح ہضم کر جاتے ہیں اپنے ہی جیسے انسانوں کی زندگی کو تلخ کر دینے میں انہیں لطف آتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ اس دوہے سے یہ مراد ہو سکتی ہے کہ ظاہری آرائش اور نمائش کچھ ضروری نہیں ہے۔ پھر ناحق کیوں اس عارضی زندگی کو خوشگوار بنانے کے لئے بندگان خدا کا صبر سمیٹا جائے۔ اور ان کی دولت ان کے وقت اور انکی قوت کی کیوں اس بیکار شوق پر بھینٹ چڑھائی جائے۔

صفحہ [illegible] کے اکیسویں دوہے کا بھی یہی حال ہے:۔

فرزیں شاہ نہ ہو سکے گت ٹیڑھی تاثیر
رحمن سیدھی چال سے پیادہ ہوت وزیر

اس دوہے کی تشریح کرتے ہوئے قابل مصنف تحریر فرماتے ہیں:۔
"ترقی کی راہیں اکثر و بیشتر انہیں لوگوں کے لئے کھلی نظر آتی ہیں جو موقع شناس اور مصلحت بیں ہوں اور ہر حال میں استفادہ کرنے کی فکر میں لگے ہوں۔ وہ لوگ ترقی نہیں کرتے جو صرف ٹیڑھی چالیں چلتے ہوں اور وہ بھی لازمی طور پر اس بلندی تک نہیں پہنچتے جو سیدھے راستے پر گامزن ہیں۔"

آگے چلکر آپ فرماتے ہیں "عام مشاہدہ تو یہ ہے کہ دنیوی ترقی تو وہی کر رہے ہیں جو زیادہ تر ٹیڑھے راستے چلتے یا کم از کم جو اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے حسب موقع سیدھا، ترچھا، اونچا، نیچا راستہ اختیار کرتے ہوں نہ صرف یہ بلکہ ان کی منفعت اسی میں ہوتی ہے تو وہ انہیں راستہ اختیار کرتے ہیں۔ دنیوی تختہ زندگی پر پیادے اور فرزین کی چالیں، وہی نہیں ہوتی ہیں اور نہ ان کے نتائج وہی ہوتے ہیں۔ لہذا ہم

یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ مثال گو دلفریب ہے لیکن صحیح نہیں۔

قابل مصنف نے جو کچھ تحریر کیا ہے وہ دنیوی اعتبار سے خواہ کسی قدر صحیح کیوں نہ ہو اس دور پر اس کا اثر کچھ نہیں پڑتا۔ مصلح اخلاق کا فرض ہر حالت میں یہ ہے کہ ابنائے جنس کو راستی اور نیکی کی جانب مائل کرے خواہ اس راستے میں کسی قدر خطرات کا مقابلہ کیوں نہ کرنا پڑے۔ اسی طرح اس کا بھی یہ فرض ہے کہ جھوٹ اور بدی سے روکے خواہ اس راستے پر چلنا کسی قدر منافع اور فوائد کا باعث کیوں نہ ہو۔ پروفیسر صاحب کو غور کرنا چاہئے کہ باوجود لاتعداد انبیا اور بزرگانِ دین کی اخلاقی تعلیم کے آجکل اخلاقی قوانین کو پس پشت ڈالنے سے احتراز نہیں کیا جاتا۔ اور خواہ کیسی ہی بداخلاقی سے اکتسابِ دولت و شہرت کیوں نہ ہو، انسان بلا پس و پیش کر گزرتا ہے۔ ان حالات میں اگر صاحب موصوف کا نظریہ تسلیم کر لیا جائے تب تو اخلاق اور بداخلاقی کا امتیاز ہی دنیا سے اٹھ جائے اور بہر حال استفادہ اور محض استفادہ پیش نظر رہے۔ اس کا جو اثر انسانی سوسائٹی پر پڑیگا۔ اس کا تخیل ہی رونگٹے کھڑے کر دینے کے لیئے کافی ہے۔ اس دوہے کا مطلب صرف اسی قدر ہے کہ بساط شطرنج پر پیادہ سیدھی چال چلکر وزیر ہو جاتا ہے اور فرزیں ٹیڑھی چال چلنے کی وجہ سے بادشاہ نہیں ہو سکتا اسی طرح راستی اور سچائی دیانت اور نیکی کے راستے پر چلکر انسان اگر کامیاب نہ ہو تب بھی کامیابی کی حد تک پہنچ جاتا ہے، اور ٹیڑھے راستے یعنی جھوٹ بے ایمانی اور بدی کی راہ چلنے والا کسی قسم کی کامیابی حاصل نہیں کرتا۔ شاعر کا مقصد یہ ہے کہ کسی صورت میں راستی اور سچائی کا راستہ نہ چھوڑو۔ رہی یہ بات کہ کوئی شخص آڑے ترچھے طریقے سے کچھ کامیابی حاصل کر بھی لے تو یہ کامیابی خود اس کی اپنی نظر میں کامیابی نہیں ہوتی اور وہ اطمینانِ قلب میسر نہیں آسکتا جو صرف جائز طریقے ہی سے کامیابی حاصل کرنے سے حاصل ہو سکتا ہے۔

میں اپنے تبصرہ کو طول دینا نہیں چاہتا۔ تاہم پروفیسر صاحب کی توجہ بعض ہندی دوہوں کی غلط کتابت اور اردو تشریح کی بعض لسانی غلطیوں کی طرف منعطف کرانا چاہتا ہوں، توقع ہے کہ آئندہ اشاعت کے موقعہ پر اس کتاب پر ذرا غور کیا جا کر نظر ثانی کی جائیگی تاکہ یہ کتاب بہمہ وجوہ مفید ہو سکے۔ جو لوگ اپنی زبان اردو کے ذریعہ ہندی کلام سے لطف اٹھانا چاہتے ہیں، وہ اس کتاب کا ضرور مطالعہ کریں، نیز ان اعلیٰ خیالات کی وجہ سے جو پروفیسر صاحب نے ان ہندی دوہوں میں ظاہر کئے ہیں میرے خیال میں یہ کتاب اس قابل ہے کہ ہر تعلیم یافتہ شخص کا کتب خانہ اس سے رونق پائے۔ اس کتاب کا کاغذ بہت اچھا ہے ٹائٹل پیج بھی نہایت خوبصورت ہے۔ اسلئے ڈھائی روپیہ قیمت کسی طرح زیادہ نہیں یہ کتاب حیدرآباد بکڈپو چادر گھاٹ حیدرآباد دکن سے دستیاب ہو سکتی ہے۔ (محمد شفیع الدین نیر)

سالنامہ رسالہ "ساقی" دہلی

رسالہ "ساقی" کو نکلتے ہوئے ایک عرصہ ہو گیا ہے جس کے لیئے وثوق کیساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے دنیائے صحافت میں اپنے لیئے ایک مستقل جگہ بنالی ہے۔ وہ فیلر صاحب کی اونچی دوکان پر بھی کہ جہاں ہر قسم کے نمکین و بے نمک پکوان قرینے سے سجے سجائے رکھے ہوتے ہیں "ساقی" کو شرف باریابی حاصل ہو گیا ہے اور اب اسٹیشنوں کی دوکانوں پر دور ہی سے ساقی کے ٹائیٹل پیج کی قطب صاحب کی لاٹ گردن مینا کیطرح بلند نظر آجاتی ہے۔

مضامین کے جمع کرنے میں "ساقی" نے کافی دقتِ نظر سے کام لیا ہے اور یہ دیکھکر ایک گونہ مسرت ہوتی ہے کہ بلند حوصلہ اور حسن و خوبی کے قدر شناس ایڈیٹر نے پرانے متعصبانہ، دستور کو توڑ کر ایک اچھا مضمون پیش کرنے میں اس بات کی ذرا سی بھی پرواہ نہیں کی کہ "غیر مطبوعہ یا تازہ ہے یا اس سے پہلے کہیں چھپ چکا ہے۔ آخر مضامین کوئی کھانا تو نہیں ہوتے کہ ایک مرتبہ لوگوں کے سامنے آکر جھوٹے ہو جائیں اور پھر انھیں ہاتھ لگانا یا ان کی طرف دیکھنا تک روا نہ ہو۔ ہم اپنے

کے سامنے بہتر سے بہتر چیزیں رکھی جاتی ہیں اور اگر کسی غیر مطبوعہ مضمون کی بجائے کوئی مطبوعہ مضمون ہے تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ دنیا سے حق اشاعت کیوں نمایاں کرے۔

ترتیب مضامین سے تعجیل کا اظہار ہوتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لائق ایڈیٹر کو کسی سبب سے اتنا موقع نہ مل سکا کہ پہلے سے ان تمام گوہر ہائے آبدار کو ایک ترتیب کے ساتھ منسلک کر لینے کے بعد ان کی کتابت شروع کرا دی جاتی - پھر بھی کون نہیں جانتا کہ گوہر اگر در خلاب وانہ جان نفیس است ۔ بے ترتیبی خود بھی حسن کی ایک شان ہوتی ہے۔

دور موجودہ کے ادیبوں میں مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی بہت ہی نمایاں اور ممتاز حیثیت رکھتے ہیں اور آج ادب اردو کو ان دونوں ہستیوں پر فخر ہے ۔ "ساقی" کے سالگرہ نمبر میں ان دونوں حضرات کے مضامین موجود ہیں اور اگر غیر مطبوعہ ہونا ہی کوئی خوبی ہے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ دونوں مضمون گلہائے نورس ہیں - بے حد لطیف اور بہت ہی رنگین

یک دو - سہ اور چہار رنگی تصویروں سے رسالہ جگمگ جگمگ کر رہا ہے اور یہ واقعہ ہے کہ ان تصاویر پر بالخصوص انہیں اتنے رنگوں میں چھپوانے پر بہت کافی روپیہ صرف ہوا ہو گا، لیکن ہمیں افسوس ہے کہ جس کسی فرم یا جس کسی مصور سے "ساقی" نے یہ تصاویر خریدی ہیں اسنے کچھ دھوکا کیا ہے کیونکہ ان میں سے ایک تصویر تو ایک کمپنی کے کیلنڈر کی زینت ہے ، اور ایک شب برات کی آتشبازی کے بعض بکسوں پر چھپی ہوئی ہے جسکے یہی معنے ہو سکتے ہیں کہ مصور نے اپنی فروخت شدہ تصویریں دوبارہ ساقی کے ہاتھ فروخت کی ہیں۔ تصویروں کی مانگ بھی اب مصور رسالوں کی وجہ سے اسقدر بڑھ گئی ہے کہ ملک کے آرٹسٹ اتنے بہت سے "نقش نگار" مہینے کے مہینے پیدا ابھی نہیں کر سکتے اور اسکا لازمی نتیجہ یہی نکلنا چاہیئے جو نکل رہا ہے - ہمارے خیال میں "ساقی" کو قانونی چارہ جوئی کرنی چاہیئے ۔ ورنہ اس قسم کے لوگوں کی ہمتیں اور بھی بڑھتی ہی جائیں گی -

بحیثیت مجموعی سالنامہ بہت اچھا، بہت نظر فریب اور بہت کچھ قابل قبول ہے - ڈھائی سو کے قریب صفحات ہیں اور قیمت صرف ایک روپیہ ہے۔ مینجر صاحب رسالہ "ساقی" کھاری باولی دہلی سے مل سکتا ہے -

سالنامہ رسالہ "نیرنگ" دہلی

نیرنگ کو رامپور سے دہلی آئے ہوئے ابھی بہت کچھ زیادہ زمانہ نہیں گذرا ہے - لیکن اس مختصر مدت میں ہم دیکھتے ہیں کہ دلی کی خشک آب و ہوا ، اور اس گہوارۂ ادب کی غیر ادبی فضا اس نئے پودے کو کچھ ایسی راس آئی ہے کہ اسنے حیرت انگیز ترقی کر لی ہے - رامپور سے جب وہ نکلتا تھا تو بس ایسے ہی نکلتا تھا کہ جیسے اور سب رسالے نکلا کرتے ہیں، اسکی رامپوری وضع قطع اسکی رامپوری شکل و صورت اور اسکی ادبی پوری حالت و حیثیت اب بھی ہمارے پیش نظر ہے۔ اور اسی کی بنا پر ہمیں یہ کہنا پڑتا ہے کہ خدا چشم زخم سے محفوظ رکھے اسنے بہت غیر معمولی ترقی کی ہے - اسکا نام نیرنگ ضرور ہے لیکن یہ ملک کے رنگین پرچوں میں داخل نہیں ہے ، اور اسکے مضامین اکثر و بیشتر بہت ٹھوس اور بلند پایہ ہیں بچوں کو سالگرہ کے طور پر وہی یا اسی قسم کے کھلونے، مٹھائیاں اور کپڑے وغیرہ ہوا کرتے ہیں جنہیں اس سے پہلے بھی بچہ استعمال کرتا رہا ہے ، لیکن چونکہ یہ نئے نئے ہوتے ہیں اور ایک خوشی کی تقریب میں میسر آتے ہیں اسلئے انکی خوشی بھی بہت ہوتی ہے اور قدر بھی زیادہ کیجاتی ہے - نیرنگ کو سالگرہ کی خوشی میں اسکے مضمون نگاروں نے تحفہ ہائے مضامین بھیجے ہیں ۔ نیرنگ ہمیشہ اچھے اور قابل قدر ہی مضامین شائع کیا کرتا ہے، اسلئے یہ ظاہر ہے کہ یہ تحفے بھی اسی قسم کے ہونگے اسلئے وہ زیادہ تر

البتہ ایڈیٹر صاحب کیطرف سے اس موقعہ پر جو لباس اسے ملا ہے وہ یقیناً بہت ہی بیش قیمت اور ملک کے موجودہ رسالوں میں سب سے الگ اور ممتاز ہے۔ پورا سالگرہ نمبر آرٹ پیپر پر چھپا ہے اور یہ آرٹ پیپر بھی ہلکے گلابی رنگ کا ہے جس نے پرچہ کی دلفریبی کے ساتھ نظر فریبی کی شان پیدا کر دی ہے۔

تصویروں کا انتخاب قابل داد ہے، اور ہم جناب عشرت رحمانی صاحب کو سچے دل سے اس انتخاب پر مبارکباد دیتے ہیں، اور اس مخصوصیت نے بھی ایک خدمت پیدا کر دی ہے کہ کوئی تصویر خواہ مخواہ ٹھونسی نہیں گئی ہے بلکہ ہر تصویر کے متعلق ایک نظم یا مضمون موجود ہے حصہ نظم بھی بہت ہی دلکش ہے اور ملک کے بہترین شعرا کے کلام مزین ہے۔ اور حصہ نظم اگر فی الحقیقت اسقدر اچھا نہ بھی ہوتا تب بھی مجھے اسکی تعریف ہی کرنی پڑتی کیونکہ اسمیں میری اپنی بھی ایک نظم موجود ہے اور سچ کہدوں کہ مجھے تو وہی سب نظموں سے زیادہ اچھی معلوم ہے خواہ کسی اور کو میری اس رائے سے اتفاق ہو یا نہ ہو۔

"نیرنگ" دہلی کا یہ سالنامہ بہر صورت ایڈیٹر "نیرنگ" کی ایک کامیاب کوشش ہے، اور مذاق سلیم کا ایک دلچسپ نمونہ، اگرچہ یہ ضرور ہے کہ جس چیز کو یہ آنکھیں ڈھونڈھتی ہیں اور جس چیز پر ادب اردو و صحافت ناز کر سکے وہ ابھی دور ہے۔ ہم سب اسی کی تلاش میں بادیہ پیمائی کر رہے ہیں۔ اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کون صحیح راستہ پر گامزن ہے۔

اس سالنامے کی قیمت اسکی خوبیوں کو دیکھتے ہوئے بہت ہی کم یعنی صرف
اور منیجر رسالہ "نیرنگ" محلہ مچھلی والاں دہلی سے ملسکتا ہے

نیرنگ فطرت

پنڈت اندرجیت شرما ایک بہت ہی خوشگو اور بلند خیال نوجوان ہیں اور تھوڑے ہی سے عرصہ میں اُنہوں نے شعرائے اردو کی صف میں ایک ممتاز جگہ حاصل کر لی ہے "سعید" بھی اُن کے افکار عالیہ سے اکثر مزین ہوتا رہتا ہے، اور ملک کے تقریباً تمام مقتدر رسالوں میں بھی انکا کلام برابر شائع ہوتا رہتا ہے، انکی بہت سی اخلاقی، ادبی، اور قومی نظموں کا مجموعہ اردو بک ڈپو ماچھرہ ضلع میرٹھ نے نیرنگ فطرت کے نام سے شائع کیا ہے۔

میں پنڈت صاحب کے کلام مختلف رسالوں میں بکثرت پڑھتا رہا ہوں، لیکن اس مجموعہ میں بہت سی ایسی نظمیں ہیں جو میرے لیے بھی نئی تھیں اور جنہیں میں نے کافی مزے لے لیکے پڑھا۔ اسمیں شک نہیں کہ کہیں کہیں ایسا ہوا ہے کہ تماشا گاہ فطرت کے مطالعہ میں محو اور اپنے خیالات کے اظہار میں دنیا و مافیہا سے بے پروا ہو کر شاعر نے دستور اور قاعدے کی پابندی ضروری نہیں سمجھی ہے، لیکن اس قسم کی ناقابل لحاظ فروگذاشتیں بھی خال خال ہی کہیں نظر آتی ہیں، ورنہ بالعموم صحت زبان اور پابندی قواعد کا بھی کافی طور پر خیال رکھا گیا ہے۔ اردو زبان نے اپنے شعرا پر بہت سی غیر ضروری اور غیر معمولی پابندیاں عائد کر دی ہیں۔ دوسری زبانوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ شاعر کو اپنے خیالات کے اظہار کے لئے اس سے بہت زیادہ آزاد چھوڑا گیا ہے۔ وہ اپنے قافیے کی ضرورت سے الفاظ کا تلفظ بدل سکتا ہے، وزن صحیح رکھنے کے لئے لفظوں کے درمیان سے حروف علت حذف کر سکتا ہے اور تمام ہم آواز حروف کو بلا تکلف ایک دوسرے کے قافیے کے طور پر استعمال کر سکتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ بعض زبانیں تو قافیے کی قید کو بھی ایک لغو اور فضول چیز خیال کر کے بے لگام کر دینے کو زیادہ پسند کرتی ہیں۔ انہی بے راہ روی اور اس درجہ آزادی کہ جس کا نتیجہ آوارگی نکلے یقیناً مستحسن نہیں ہے، لیکن ایسی پابندی بھی کس کام کی کہ بات بات پر زبان کاٹی جائے۔

خیر یہ تو ایک علیحدہ بحث ہے۔ نیرنگ فطرت میں فطرت کی بہت سی نیرنگیوں کی حقیقت ایک شاعر کے نقطۂ نگاہ سے ظاہر کی گئی ہے اور خوبی یہ ہے کہ پہلوی یا پراکرتی اردو میں نہیں، بلکہ اپنی سیدھی سادھی اردو میں کہ جو ہم آپ رات دن بولا کرتے ہیں، کئی ایک نظمیں بہت ہی بہت بلند پایہ ہیں اور بہت سے خیالات اسقدر لطیف ہیں کہ روح وجد کرنے لگتی ہے۔ پنڈت اندرجیت صاحب قدرت سے ایک شاعر کا دل لیکر آئے ہیں، اور جب کہ انکی ابتدا نیرنگ فطرت سے ہوئی تو کون کہہ سکتا ہے کہ انتہا کیا ہوگی۔

بعض نظمیں تصاویر سے متعلق ہیں اور وہ تصاویر بھی شامل کتاب کر دیگئی ہیں۔ ایک سو بہتر ۱۷۲ صفحہ کی کتاب ہے کاغذ اچھا ہے کتابت و طباعت ہمارے خیال میں اس سے بہتر ہونی چاہیئے تھی، مجلد کتاب کی قیمت ۱۲؍ ہے جسے ہرگز زائد نہیں کہا جا سکتا منیجر اردو بک ڈپو۔ ماچھرہ ضلع میرٹھ سے مل سکتی ہے۔

انقلاب دھلی یہ ان پاکیزہ نظموں کا مجموعہ ہے کہ جو دہلی کی تباہی اور بربادی پر لکھی گئی تھیں، غالب وظفر، مجروح، وسودا، حالی، وداغ۔ آرزو وشیفتہ، ظہیر وطالب، سالک ورضوان، اور کامل محسن جیسے شعراء بلند خیال کی اُن آنسوؤں سے کہ جو انہوں نے دلی کی بربادیوں پر بہائے تھے ایک کٹورا بھر کر رکھدیا ہے اور اسی کٹورے کا رسمی نام انقلاب دہلی ہے۔

جناب خواجہ حسن نظامی صاحب نے اس کتاب کے متعلق تحریر فرمایا ہے کہ:-

"یہ کتاب تاریخ بھی ہے۔ مرثیہ بھی اور نوحہ بھی ہے نظم و نثر کا ایک عمدہ گلدستہ بھی ہے اور آیندہ نسلوں کے لیئے انکی تہذیب کی تصویر بھی ہے جو کچھ مٹ گئی اور باقی مٹ رہی ہے"

ہمیں اس رائے کے حرف حرف سے اتفاق ہے اور اسکے بعد اسکے متعلق کچھ اور لکھنا تحصیل حاصل ہے۔ سرورق پر ظفر، غالب مجروح، داغ، حالی اور سودا کی مصغر تصویریں ہیں اور بیچ میں لال قلعہ کی سرخ رنگ سے چھپی ہوئی تصویر ہے اور یہ سب چیزیں ملکر دیکھنے والے کو ایک ہی نگاہ میں خدا جانے کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہیں۔ لکھائی اور چھپائی کے لیئے یوں بھی نظامی پریس بدایوں کافی شہرت رکھتا ہے اور یہ کتاب تو خاص طور سے عمدہ چھاپی گئی ہے۔ ایک سو بیس صفحہ کی کتاب ہے اور قیمت ۸؍

نظامی پریس بدایوں کے منیجر صاحب سے مل سکتی ہے۔

کچھ کتابیں
آپ — بچوں کے — لیے

نہ شب برات کی آتشبازی کام آتی ہے نہ عید بقرعید کے کھلونے اور مٹھائیاں۔ یہ ضروری ہے کہ ان چیزوں سے بچوں کو خوشی بہت کافی محسوس ہوتی ہے۔ آپ انھیں ایسی چیزیں کیوں نہ دیجیے جن سے وہ خوش بھی ہوں اور جو انکے کام بھی آئیں یہ کتابیں منگا کر دیکھیے یہ یقیناً ایسی ہی چیزیں ثابت ہونگی۔

- شگونکی کہانیاں — قیمت ۱۴ر
- تاریخ ہند کی کہانیاں — قیمت ۱۴ر
- چار یار — ۱۲ر
- لڑکیونکی انشا — قیمت ۱۲
- دنیا کے بسنے والے — قیمت ۔ر
- ہمارے نبی — قیمت ۶ر
- نانی عشو — قیمت ۱ر
- مراۃ العروس — قیمت عہ
- سرکار کا دربار — قیمت ۸ر
- منتخب الحکایات — قیمت ۸ر
- ہمارے رسول
- نبیوں کے قصے — قیمت ۶ر
- بنات النعش — قیمت ۱۲ر
- اقبال دلہن — قیمت ۱۲ر

منیجر رسالہ سعید دہلی

جلد ۲ نمبر ۲

فروری سنہ ۱۹۳۲ء

باتصویر ماہوار رسالہ

سعید

دھلی

ایڈیٹر
ڈاکٹر سعید احمد سعید
بریلوی

قیمت
سالانہ - تین روپیہ
ششماھی - ایکروپیہ بارہ آنہ
فی پرچہ - چار آنے

فہرست مضامین

ہمارے خیالات

اخذ ما صفا

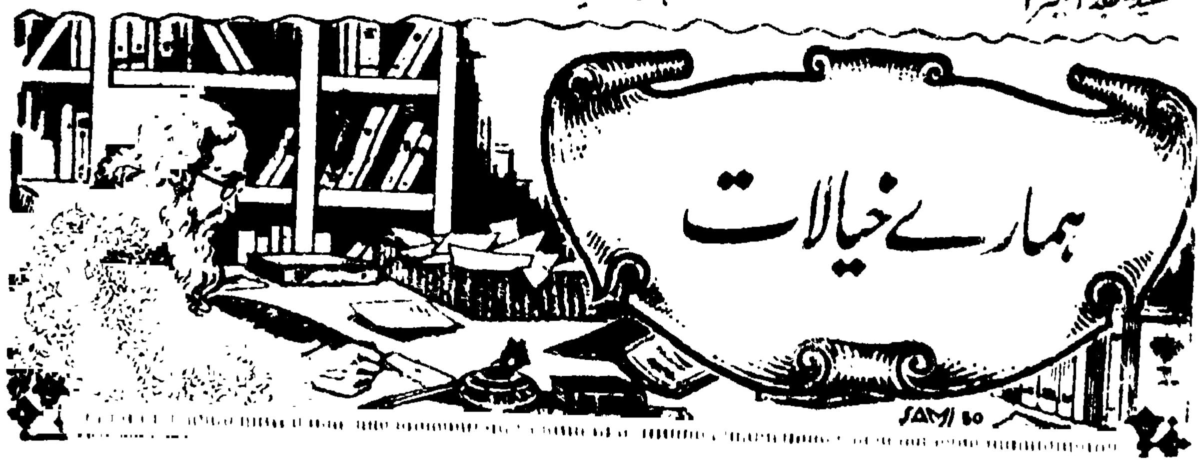
راز حیات

علم و ادب

افسانہ

عورتوں کے چار صفحے

مذہب و اخلاق



"سعید" کی بے عنوانیاں

جن ارادوں اور آرزوؤں کیساتھ سعید نکالا گیا تھا بدقسمتی سے وہ اب تک پوری نہ ہوسکیں ہر آیندہ نمبر کے متعلق یہی امید لگائی جاتی رہی کہ وہ وقت پر شائع ہو سکیگا، لیکن اتفاقات نے ہر مرتبہ ہمیں مجبور کر دیا اور ہر شائع شدہ نمبر میں ہمیں یا معذوریوں کا اظہار اور اپنی کوتاہیوں کا اعتراف ہی کرتے بن پڑی۔

وہ کوتاہیاں یا معذوریاں کیا تھیں؟ اسکا جواب صرف اس ایک جملہ میں دیا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی علالت انکا پیچھا نہیں چھوڑتی۔

دسمبر کا پرچہ شائع ہوتے وقت ڈاکٹر صاحب کی صحت بہت کچھ روبہ ترقی تھی، اور ہر شخص کو یقین ہو چلا تھا کہ بہت کچھ تکلیف اٹھانے کے بعد بالآخر خدا نے انہیں صحت دیدی اور اسی کیساتھ یہ امیدیں بھی لگ لی گئی تھیں کہ جنوری میں نہیں تو فروری میں سعید کی اشاعت ضرور اپنے وقت پر آ جائیگی، لیکن واقعات نے ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ اور اس مرتبہ ڈاکٹر صاحب پر مرض کا حملہ اسقدر شدید ہوا کہ خود ان کے معالجوں کو بھی انکی زندگی کیطرف سے مایوسی ہوگئی۔

کچھ عرصہ تک ایسی ہی حالت میں زندگی گذارنے یا یہ کہیئے کہ موت کا آسرا تکنے کے بعد طبیعت نے دفع مرض کی پھر ایک مرتبہ کوشش کی اور آہستہ آہستہ مرض پر طبیعت کا غلبہ ہونے لگا۔ امید کی جھلک پھر پیدا ہو گئی۔ ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو پھر تیل ملگیا، اور ڈاکٹر صاحب ایک مرتبہ پھر کروٹ لیکر اٹھ بیٹھے، لیکن اس مرتبہ جس صورت اور جس حالت سے وہ اٹھے وہ نادیدنی اور ناگفتنی تھی۔

آج انکے مرض کے ازالہ کو ایک مہینے سے کچھ زیادہ ہو چکا، لیکن ابھی تک اتنی توانائی بھی نہیں آئی ہے کہ بلا تکلف چل پھر سکیں، اور دماغی کام کیطرف متوجہ ہونیکی اجازت انکے معالج ابھی خدا جانے کتنے دنوں تک نہ دیں مجبور ہو کر اب یہ کیا جا رہا ہے کہ جنوری اور فروری کا مشترک پرچہ اسوقت شائع کیا جا رہا ہے اور کوشش جاری ہے کہ جلد سے جلد مارچ کا پرچہ بھی شائع کر دیا جائے تاکہ اپریل میں جب ڈاکٹر صاحب پرچہ کو خود مرتب کریں تو وہ قریب قریب صحیح وقت پر نکل سکے۔ اسطرح مشترک نمبر نکالنے میں اسبات کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ خریداروں کا نقصان نہ ہو اور صرف ایک پرچہ کا نام ڈبل نمبر رکھ دینے کی بجائے فی الحقیقت دو الگ الگ پرچوں کو ملا کر ایک کیا گیا ہے۔ چونکہ اس قسم کے مشترک نمبر میں خریداروں کا کچھ زیادہ نقصان نہیں ہے۔ اسلیئے یہ بھی ممکن ہے کہ مارچ اور اپریل کا بھی ایک مشترک نمبر نکال کر پرچے کی اشاعت کو صحیح وقت پر لے آیا جائے۔ بہرحال اب ڈاکٹر صاحب کی صحت بہت امید افزا حالت میں ہے اور اگر انہیں اسقدر سختی کے ساتھ منع نہ کر دیا گیا ہوتا تو وہ ضرور کچھ نہ کچھ اس پرچہ کے لئے لکھتے، اور ایسی صورت میں یہ امید کیجا سکتی ہے کہ انشاءاللہ تعالیٰ اپریل کا پرچہ ان کا اپنا مرتب کیا ہوا نکل سکیگا، اس نمبر میں انکے جو مضامین شامل ہیں وہ انہوں نے بیمار ہونے سے پہلے جنوری کے پرچے

کے لیئے لکھے تھے۔

"سعید" کا چندہ

"سعید" کے خریداروں میں ایسے اصحاب کی تعداد بہت کم ہے جو صرف چھ مہینے کے لیئے اسکے خریدار ہوئے ہوں، پھر بھی بہت سے ایسے خریدار ہیں ضرور، اور انکا چندہ جنوری کے پرچہ کے ساتھ شامل ہو... ساتواں نمبر ہے اور گویا انہیں بلاقیمت مل رہا ہے۔ "سعید" کو چونکہ اس حقیقت سے آگاہی ہے کہ اسکے خریدار عارضی اور ہنگامی نہیں ہیں اور انہوں نے اچھی طرح سوچ سمجھ کر ہی اسے دوسرے رسالوں پر ترجیح دی اور اسکی خریداری شروع کی ہے۔ اسلیئے اسے اطمینان ہے کہ ایک مرتبہ جو اسکا خریدار بنگیا، وہ آسانی سے اسے نہیں چھوڑ سکتا۔ "سعید" کی اشاعت کے متعلق جو بیقاعدگیاں اسوقت تک ہوتی رہیں وہ ضرور ایک بڑی حد تک صبر آزما تھیں اور یہ ممکن ہے کہ بعض اصحاب نے برافروختہ ہوکر یہ ارادہ کرلیا ہو کہ آئیندہ اسکی خریداری سے باز رہیں گے لیکن ایسے تمام اصحاب کی خدمت میں ہم صرف اسقدر عرض کرنا چاہتے ہیں کہ "سعید" کی اشاعتوں میں تاخیر اگر ہوئی ہے تو اس سبب سے نہیں ہوئی کہ وہ بے پرواہ ہے یا اسے پابندی وقت کا خیال نہیں ہے، بلکہ صرف اسلیئے ہوئی ہے کہ اسکے ایڈیٹر کی مسلسل اور شدید علالت نے اسے ایک کاروان بے سالار بنا دیا تھا، اس سے پہلے بھی شاید یہ کہا جا چکا ہے اور اب پھر مزید اطمینان کے لیئے عرض کیا جاتا ہے کہ "سعید" جاری رہنے کے لیئے نکلا ہے نہ کہ بند ہونے کے لیئے حادثات اور ناگہانی اتفاقات اس کی رفتار اشاعت میں بے قاعدگی پیدا کر دیں، اور مجبوری و معذوری اسے وقت پر نہ نکلنے دے لیکن اسکے بند ہو جانیکا جیسا کہ بعض کرم فرماؤں کو اندیشہ پیدا ہو گیا ہے بظاہر حالات کوئی امکان نہیں ہے —

جو اصحاب کہ صرف چھ مہینے کے لیئے اگست سنہ ۱۹۳۱ء سے خریدار ہوئے تھے اُن سے درخواست کیجاتی ہے کہ ازراہ کرم اپنا چندہ منی آرڈر کے ذریعہ سے فوراً ارسال فرمادیں۔ اس ضمن میں یہ عرض کردینا بھی بیجا نہ ہوگا کہ چھ مہینے کے لیئے خریدار بننے کی بہ نسبت ایک سال کے لیئے خریدار بننا بہرصورت بہت زیادہ منفعت بخش ہے۔ اور وی پی پارسل کے ذریعہ پرچہ منگانے سے منی آرڈر بھیجکر رسالہ جاری کرانے میں تین آنے کی بچت ہے۔

جن اصحاب کا چندہ ختم ہو چکا ہے اگر انہوں نے اس معروضہ پر توجہ نہ کی اور مارچ کا پرچہ شائع ہونے تک انکا چندہ وصول نہ ہوا تو مجبوراً ہمیں بھی یہی کرنا پڑیگا کہ بادل ناخواستہ مارچ کا پرچہ انکی خدمت میں وی پی کے ذریعہ بھیجیں۔

ڈاکٹر سعید احمد صاحب کا پیام

مجھے ہر قسم کے دماغی کام سے منع کر دیا گیا ہے اسلیئے مجبور ہوں کہ خود کچھ نہیں لکھ سکتا۔ باتیں کرنے کی چونکہ ممانعت نہیں ہے اسلیئے "سعید" کے صفحات کے ذریعہ سے اپنے ان تمام کرمفرماؤں کا دلی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنکی محبت اور ہمدردی سے بھرے ہوئے خطوط دوران علالت میں میری تسلی اور تسکین کا باعث ہوئے تھے۔

"سعید" وقت پر نہیں پہنچا یا بالکل صحیح اور بالکل درست ہے میں اس کے ظاہر کرتے دل سے نادم ہوں۔ اس سے پہلے بھی اطلاع دیچکا ہوں کہ "سعید" نہ تو کسی سرمایہ دار کا پرچہ ہے اور نہ تجارتی اصولوں پر نکالا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسکے ترتیب دینے والوں کی فہرست بہت ہی مختصر ہے۔ حتیٰ کہ بعض ادبی مجلات کی طرح اگر "سعید" کے "نگران" اور "رئیس التحریر" اور "مدیر مسئول" اور "خزانچی" اور "دبیر خصوصی" اور "مشیر قانونی" اور "مشیر طبی" غرضکہ پورے عملہ کے نام گنانے کی ضرورت پڑجاتی تو ہر خانے میں مجبوراً مجھے اپنا ہی نام لکھنا پڑیگا۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ میری بیماری کے زمانے میں اسکا نکلنا بہت ہی دشوار تھا اور اگر جنوری و فروری کا یہ مشترک نمبر آپ کی خدمت میں پہنچ گیا ہے تو اسے صحیح معنوں میں "ادبی معجزہ" کہا جاسکتا ہے

کسی سرمایہ دار کا پرچہ ہوتا تو ایک ایڈیٹر کے بیمار ہو جانے پر اس سے

اچھے ہو اید بزرگوار کام کرنے کے لئے مت بہت حافظہ ہوتا ہے ۔ سعید کو پورے دو ہفتے کے بعد اگر کوئی حادثہ نہ ہوا ترتیب دینے کیلئے اٹھ کھڑا ہوا تو بھی بانعمیت تھا اور انتہا بہت تر ادھلان ۔ بہر حال گزر گیا ہو کچھ گزرنا تھا اور اب پھر حضرت نے مجھے مرقومن بنا دیا ہے کہ آپکے سعید کی خدمت میں دل وجان سے مصروف ہو جاؤں ۔ لیکن یہ شدت کی اکثر ہے تو دم ہوتے ہیں میں ۔ اس سبب سے ہمیشہ نہیں ہوں ۔ دل نیں کا دل چاہتا ہے کہ کوئی کام بڑ لیا ۔ ان کھانے اور پینا ستم ہی ہے درد ہوا اور سکون ۔ یعنی چاہتا ہے کہ کسی سے دو گھڑی باتیں کرکے اپنا دل بہلاؤں اور یہ حکم سنتے ہیں کہ گانا ہی والا موات برت رکھو اور خاموش رہو ۔ اور نہ پی خواہش ہوتی زیادہ ہے کہ دل نہ کہہ دوں مراد دل بیقرار ہوتا ہے کہ کچھ پڑھوں لکھوں ۔ لیکن ان حضرت کا فرمان ہے کہ خبردار کوئی دماغی کام نہ کرنا ۔ اب اللہ ہی جانے کب ان گرانوں سے مجھے رہائی نصیب ہوگی ۔ اور کب تک سعدی صاحب کا مصرعہ کہ داروی تلخ است دفع مرض پڑھ پڑھ کر بدمزہ اور بد بودار دواؤں نے حلق سے نیچے اتارنے پڑینگے ۔ امیدیں دلائی جا رہی ہیں کہ اپریل میں مجھے آزادی ملجائیگی ۔ کہیں ہندوستان کی آزادی کی طرح کھٹائی میں نہ پڑ جائے ۔ باقاعدہ کے مطابق تو اب مجھے عرصہ دراز تک تندرست رہنا چاہیئے کیونکہ ضرورت سے بہت زیادہ بیمار رہ لیا ہوں

افق مشرق پر خونیں شفق

چین اور جاپان کی جنگ کی خبریں روزانہ اخبارات کے قارئین کرام تک پہنچا ہی دی ہونگی اس سلسلہ میں سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ پہلے تو عرصہ تک یہ خبریں آتی رہیں کہ جاپان کی استعمار پسندی اسے کسی طرح اسبات کی اجازت نہیں دیتی کہ جمعیۃ اقوام کی صلح کی کوششوں کو بار آور ہونے دے اور جنگ بند کر دے لیکن اب یہ خبر سننے میں آئی ہے کہ جاپان تو التوائے جنگ کیلئے تیار ہے مگر چین کسی طرح اس پر رضامند نہیں ہوتا ۔

جاپان ایک استعمار پسند اور سرمایہ پرست سلطنت ہے، اور جہانتک جدید ترین طرز کے آلات حرب اور دیگر مادی وسائل کا تعلق ہے اسے چین پر ضرور فوقیت حاصل ہے اس لیئے اسکا جنگ و خونریزی پر اڑے رہنا اور صلح پر راضی نہ ہونا کچھ زیادہ تعجب خیز نہ تھا ۔ لیکن چین کا التوائے جنگ سے انکار ایک نیا معمہ ہے کہ جس کا حل تلاش کرنیکے لیئے شاید حدود چین سے بھی باہر جانا پڑیگا ۔

مشرق کی آگ مغرب میں

آج دنیائے مغرب پر جنگ کو بین الاقوامی بنانے کی بیماری ہے ۔ اس میں شک بھی نہیں کہ تجارت وغیرہ کے بین الاقوامی ہو جانے سے دو مختلف قوموں کے درمیان دوستانہ تعلقات قائم ہو جانے کے نتیجے بھی اکثر خوشگوار ہی نکلتے ہیں لیکن بین الاقوامی سیاسیات کی بدولت یہ دیکھنے میں آرہا ہے کہ قوموں کی باہمی لڑائیاں بہت زیادہ خطرناک ہوگئی ہیں ۔ کسی جگہ بھی جنگ چھڑے اور کوئی سی دو قومیں آپس میں دست و گریبان ہوں ان کے بین الاقوامی تعلقات کی وجہ سے اب یہ ناممکن ہو گیا ہے کہ اس لڑائی کا اثر دنیا کے ہر ملک پر نہ پڑے، اور خوشی سے یا ناخوشی سے ہر قوم اسبات پر مجبور نہ ہو جائے کہ اس بہتی ہوئی خونی گنگا میں ہاتھ دھوئے ۔

چین اور جاپان اگرچہ مشرق بعید میں واقع ہیں اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دول مغرب سے اگر انہیں کچھ واسطہ ہے تو دور ہی کا واسطہ ہے، لیکن بین الاقوامی سیاست نے اس ظاہری فاصلہ کو کم کر دیا ہے اور یورپ کی سلطنتیں اپنے اپنے مفاد کی خاطر چین و جاپان کی باہمی آویزش میں حصہ لینے پر مجبور ہیں فرانس کے متعلق تو یہ خبر آچکی ہے کہ وہ جاپان کا ساتھ دینے کو آمادہ ہے بشرطیکہ جاپان اس لڑائی کے لئے کارتوس وغیرہ فرانس سے خریدے

روس کے متعلق اس قسم کے شکوک کیئے جا رہے ہیں کہ شاید وہ جاپان کا ساتھ دے گا۔ امریکا، جرمنی، انگلستان ابھی تک بالکل الگ تھلگ ہیں لیکن جب فرانس کے نازک بدن سپاہی حلق ہوئے ہیں کو دیر سے تو ظاہر ہے کہ اکھاڑے کے باقیماندہ پہلوان بھلا کیسے رک سکتے ہیں۔ غرض یہ کہ جہانتک آثار و قرائن کا تعلق ہے انداز کچھ ایسے ہی معلوم ہوتے ہیں اگر جمعیۃ اقوام کی صلح کی کوشش ناکام رہی تو وہ دن دور نہیں کہ مشرق سے غرب تک فتنہ و فساد کی آگ بھڑک اٹھے۔ اور یورپ کی جنگ عظیم کی طرح ہزار ہا انسانی جانیں اس غضبناک دیوی کی بھینٹ چڑھ جائیں۔

ترکی میں نماز

غریب ترکوں کیطرف سے دول یورپ کو خدا جانے کس قسم کے اندیشے لاحق ہیں، اور نہ معلوم ان کے خلاف کسقدر بغض اور کینہ دل میں بھرا پڑا ہے کہ اب بھی جبکہ وہ یورپ سے خارج البلد ہو چکے اور ایشیائے کوچک میں اپنی مختصر سی سلطنت پر قناعت کرلی، آئے دن اُن کے خلاف ریشہ دوانیاں ہوتی رہتی ہیں، اور برابر یہی کوشش جاری ہے کہ جسطرح بھی ہو انہیں بدنام کیا جائے اور دنیا کی دوسری مسلمان قوموں کے دل میں ان کی جانب سے نفرت بھر دیجائے۔ صدہا سال سے یورپ دنیا کو یہ بتلا رہا تھا کہ ترکی کا وجود یورپ کیلئے باعث ننگ ہے کیونکہ وہ ترقی اور تہذیب سے ناآشنائے محض ہیں، اور تصویروں اور تماشوں میں لال رنگ کی ترکی ٹوپی کو ظلم، وحشت، اور جہالت کی علامت کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ لیکن اب جبکہ بیوقوف ترکوں نے ان دلخراش طعنوں سے تنگ آکر اپنی قومی ٹوپی اُتار پھینکی تو اب ہر غیر ملکی سیاح کی نگاہیں قسطنطنیہ کے گوشہ گوشہ میں سرخ رنگ کی ٹوپی اور سیاہ رنگ کے پھندنے کو ڈھونڈتی پھرتی ہیں اور اُن کی یاد میں زار زار آنسو روتی ہیں۔

جسوقت تک ترکی خواتین پردہ کرتی تھیں اُسوقت تک تو ترکی کا نام عورتوں کا جیلخانہ تھا، لیکن اب جبکہ اُنہوں نے نقاب و حجاب سب دور کر دیا اور مختلف شعبہ ہائے زندگی میں ہمت کارہائے نمایاں کرکے دکھائے تو اب یہ افسوس ہے کہ ترکی میں بیچاری شرف نسوانیت کا خون ہو گیا۔

اسی طرح ابھی چند روز ہوئے یہ خبر مشہور کیگئی تھی کہ حدود ترکیہ کے اندر عربی زبان میں نماز پڑھنا جرم میں داخل کر دیا گیا ہے اور اب وہاں نماز اور تلاوت کلام مجید سب کچھ ترکی زبان میں ہوتی ہے اس خبر سے مسلمانان عالم کو وہی صدمہ پہنچا کہ جو پہونچنا چاہیئے تھا اور عام طور پر ترکوں کی اس بدعت کے خلاف نفرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اب معلوم ہوا ہے کہ اسکی اصلیت صرف اسقدر تھی کہ ترکی میں ترجمہ اور تفسیر کی مدد سے یہ کوشش کیجا رہی ہے کہ سب عامی و جاہل بھی ان الفاظ کا مطلب اچھی طرح سمجھ سکیں کہ جو وہ بحالت نماز اپنی زبان سے ادا کیا کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ معلوم ہو جانے کے بعد اب اسکے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ خدا اس تہذیب اور مہذب قوموں کے اس پروپیگنڈے سے غریب شرقیوں کو جس قدر دور رکھے اتنا ہی اچھا ہے۔

لو من تیل ورادھا کا ناچ

جمعیۃ اقوام کا یہ شاندار کارنامہ

یہ اول تو بہت عجیب تھا کہ اسنے اپنی طرف سے حکومت برطانیہ کو عراق پر اور حکومت فرانس کو ارض شام پر حکمران مقرر کیا تھا جسکے کھلے ہوئے معنے یہ تھے کہ سرزمین عراق و شام عراقیوں اور شامیوں کی ملکیت نہیں ہے بلکہ ایک پنچایتی جائداد ہے

سے جمعیۃ اقوام کا قبضہ اور تسلط رہا) اور اب یہ کارنامہ اس
نے ہی انجام دیا کہ بعض شرائط کے ماتحت ملک عراق کی آزادی
بحال کی جا رہی ہے اور اس پر سے برطانوی انتداب مٹایا جا رہا ہے
یہ خبر یقیناً ہر اس شخص کے لئے مسرت انگیز ہے اور ہونی
چاہئے کہ جسے آزادی سے محبت اور مسلمانان عراق سے
ہمدردی ہو لیکن برطانوی انتداب ہٹانے اور عراق کو کامل آزادی
دینے کی جو شرطیں جمعیۃ اقوام نے مقرر کی ہیں وہ اسقدر سخت
اور تقریباً ناقابل عمل ہیں کہ انہیں پڑھنے کے بعد بے اختیار یہ مثل
یاد آجاتی ہے کہ نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچیگی
خدا کرے کہ اہل عراق ان شرطوں کو پورا کرنے میں کامیاب
ہو جائیں -

فنون لطیفہ کی سرپرستی

اطلاعات مظہر ہیں کہ مصر میں فن موسیقی
کو ترقی دینے کے لیے ایک مؤتمر کے انعقاد کی تیاریاں ہو رہی ہیں
جس میں عربی موسیقی کے ماہرین فن شریک ہونگے اور اس
فن لطیف کی ترقی کے متعلق مختلف تجاویز پر بحث کریں گے اعلیحضرت
شاہ فواد کو اس کانفرنس سے بہت دلچسپی ہے، اور اسطرح
شاہی سرپرستی حاصل ہو جانے کے بعد کانفرنس کے ذریعہ سے
جلد ترقی کے امکانات ہیں
جہانتک ایک فن لطیف کی ترقی کا تعلق ہے ہمیں یہ معلوم
کر کے دلی مسرت ہوئی ہے کہ ایک مسلمان والی ملک کو اسکا خیال
آیا اور اس نے اس سے دلچسپی لینی شروع کر دی، لیکن
سوال یہ ہے کہ کیا مصر کے موجودہ حالات اسے اس بات
کی اجازت بھی دیتے ہیں کہ اور بہت سے زیادہ اہم اور زیادہ ضروری
کاموں کو چھوڑ کر وہ اپنی دولت، اپنی قوت فکر، اور اپنی
قوت عمل، اس قسم کے نسبتاً غیر ضروری کاموں کے لیے
وقف کر دے۔

گانا اور ناچنا خوشحالی و فراغ بالی کی باتیں ہیں اور مصر کو ابھی
ان دونوں میں سے ایک بھی حاصل نہیں ہے۔ فنون لطیفہ کی
ترقی کا خیال آنا چاہئے تو ان قوموں کو جو پیٹ بھری ہوں لیکن
مصر کے لاکھوں فرزندوں کو ابھی نان شبینہ میسر نہیں آتی ایسی
صورت حال میں مصر کی فنون لطیفہ کے متعلق یورپ کی کورانہ تقلید ایسی ہی
ہے کہ جیسے کوئی غریب ماں اپنے بیمار بچے کے لیے
دوا دارو خریدنے کی بجائے اپنے تندرست بچے کو سینما دیکھنے
کے لیے ایک روپیہ دیدے -

شاہ فواد کی فنون لطیفہ سے دلچسپی لائق صد تحسین سہی
لیکن اس قسم کے مشاغل پر قوم کا روپیہ صرف کرنے سے پہلے
یہ بھی تو دیکھ لینا چاہیے کہ قوم کے بچوں کو معمولی علوم و فنون
سکھانے کے انتظامات بھی پورے طور پر ہوگئے ہیں
یا نہیں؟



قرآن حکیم

(از جناب شوق دہلوی از مکہ معظمہ)

کچھ اسے زینتِ منزل سمجھے — اور کچھ گرمیِ محفل سمجھے

کچھ تو سمجھے ہیں اسی طب کی کتاب — اور کچھ جادوِ بابل سمجھے ہے

کچھ اسے رٹتے ہیں طوطے کیطرح — اسکا بس وہ ہی حاصل سمجھے

یہ تو آیا تھا ہدایت کے لیئے — اسکا مقصد ہی نہ غافل سمجھے

اب عمل اور کتابوں پر ہے — اسکو سب ترک کے قابل سمجھے

کاسہ لیسانِ حریفانِ حق — اسکی تعلیم کو باطل سمجھے

منطق وفلسفہ کے سودائی — درس کے اسکو نہ قابل سمجھے

عقل پر جن کی پڑے ہیں پتھر — فہم کو اسکے وہ مشکل سمجھے

ہائے اس نعمتِ عظمیٰ کی قدر — خاک بھی تو نہ یہ جاہل سمجھے

اے خدا ہم کو عطا کر وہ دل — جو اسے رہبر کامل سمجھے

اور دے شوقِ عمل بھی ایسا — کسی مشکل کو نہ مشکل سمجھے

مسلم حقوق کا اعلان！

مسلم حقوق اور حکومت ہند کے اعلان کے متعلق ہمارے خیال کی صداقت آشکارا ہوگئی ۲۲ تاریخ آئی اور گذر گئی مسلم کانفرنس کی خوش فہمی، زود اعتقادی اور سادہ لوح حضرات منہ دیکھتے رہ گئے، دنیا نے دیکھ لیا کہ مسلم حقوق کے متعلق کوئی اعلان نہ ہوا، مسلمانوں کو مطمئن کرنے کی کوشش نہیں کیگئی، مسلمان مجبور ہوے اور اُن کے سیاسی دشمنوں نے مسلم کانفرنس کی ذہب سیاست پر ایک اور قہقہہ لگایا اور سوچا کہ جب تک مسلم کانفرنس کی جہالت سیاسی باقی ہے۔ جب تک اسکی موجودہ غیر معقول سیاست باقی ہے اور جب تک اسکے ارکان کی اغراض ذاتی، اقتدار پسندیوں اور کمینیوں کی کمینتوں کے لئے شخصی مفاد کا یہ حال ہے مسلمانوں کی ہتک کی جس قدر ذلت ہو اُن کے سامنے پیش کرتے رہیں گے۔

ہمیں یہ سنکر قطعاً حیرت نہیں ہوئی کہ ۲۲ فروری کو مجلس عاملہ گول میز کانفرنس کا اجلاس ہوا وائسرائے صدر بنے، ہندو ارکان رونق محفل بنے اور مسلمان ہوئے پریشان کیطرح نہ ادہر کے تھے نہ اُدہر کے۔ مسلم ارکان نے مجلس عاملہ کے سامنے ایک بیان پیش کیا اور عرض کیا کہ جب تک ہمارے حقوق کا اعلان نہ ہوگا ہم مجلس بحث و مباحث میں کوئی حصہ نہیں لے سکتے مسلمان اگر سمجھ سکیں تو ہم یہ سمجھانے کے لیئے تیار ہیں کہ اس بیان کے اساسی موجبات میں عزت نفس اور خودداری کو قطعاً دخل نہیں ہے۔

مسلم ارکان کا بیان واضح ہے اور مطلب ظاہر۔ مقصد یہ ہے کہ ہم یہ جرأت نہیں کرسکتے کہ وائسرائے ہند کے حضور میں اسلامی مفاد کے لیئے اپنے ہی نقطۂ خیال سے کوئی جرأت انگیز اقدام کریں اور بالکل حصہ نہ لیں، حصہ لیں گے لیکن موثر حصہ نہ لیں گے، منشا یہ ہے کہ اپنے اغراض ذاتی کی لاٹھی سے دو سانپ ماریں گے — مسلمانوں کو بھی احمق بنائیں گے اور حکومت ہند کو بھی ناخوش نہیں ہونے دینگے، شاباش

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند　　(مدینہ بجنور)

ہندی ادب کے جواہر ریزے

عزت ——— اس لفظ کی حقیقت سے تو صرف ایک شریف ہی کا دل آشنا ہے، اسکے لئے ذرا سی بات بھی بہت ہوتی ہے ——— لیکن رذیل کو عزت سے کیا واسطہ شریف اپنی عزت کے لئے دنیا کی ہر چیز قربان کر دیتا ہے۔ لیکن رذیل ——— دنیا کے لئے اپنا اخلاق اپنا ایمان ——— سب کچھ قربان کر دیتا ہے۔ شریف ——— ذلت کی زندگی پر موت کو ترجیح دیتا ہے ——— لیکن رذیل کی روح عزت کی موت سے ڈرتی ہے اور اسے ذلت کی زندگی سے اطمینان نصیب ہوتا ہے۔

اے تلسی! تو دنیا کے سہارے کیوں تکتا ہے؟ صرف ذاتِ خداوندی پر تکیہ کر ———

دیکھو ——— باغ میں ایسے درخت بھی ہوتے ہیں کہ ان کی برابر نگہداشت کیجاتی ہے اور ان کو سیراب بھی کیا جاتا ہے ——— لیکن وہ پھر بھی خشک ہو جاتے ہیں ———

اسکے مقابلہ پر پہاڑوں پر جو درخت ہوتے ہیں اُن کی نہ کوئی نگہداشت کرتا ہے اور نہ اُن ہیں کوئی پانی دیتا ہے ——— لیکن ——— اسکے باوجود وہ خوب سرسبز و شاداب ہوتے ہیں اسکی وجہ صرف یہ ہے کہ پہاڑوں کے درختوں کو دنیا کے کسی مالی کا نہیں بلکہ باغبانِ قدرت کا سہارا ہوتا ہے۔　　(تلسی داس)

"ریاست" دہلی



آخر آپ کیوں خوش نہیں ہیں

(ترجمہ از جناب مولوی شفیع الدین صاحب نیّر)

ایسی بہت سی دردناک مثالیں ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں۔ جنہیں دولت مندی مسرت کا ذریعہ نہ بن سکی، ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ اگر اس دولت کی پس پشت اعلیٰ شخصیت نہ ہو تو یہ بالعموم دیرپا نہیں ہوتی لوگوں نے جہاں جہاں اس بات کی تحقیقات کی ہے انھیں عجیب دردناک منظر نظر آئے ہیں۔

بہت ایسے دولتمندوں نے جو ذمہ داری اور اعتماد کے درجہ پر فائز تھے موجودہ مالی مشکلات سے تنگ آکر خودکشی کر لی اور بعض اس بے آبروئی درذلت کے اثر سے جو انکی وجہ سے ان پر اور ان کے خاندان پر ہوا بالکل بستر علالت پر پڑ گئے اور بعض حوادث کا شکار ہوئے اور یہ سب کچھ انکی غلط کاریوں کی بدولت نہیں بلکہ رسوائی کے خوف کی وجہ سے ہوا۔

کچھ عرصہ پہلے ان لوگوں کے متعلق یہ سمجھا جاتا تھا کہ ان کے پاس مسرت اور خوشی کے لوازم موجود ہیں، ان کے قبضے میں وہ شے یعنی دولت موجود تھی جسکے حصول کے لیے دنیا اسقدر جدوجہد کرتی ہے، وہ لوگ رفیع الشان محلوں میں سکونت رکھتے تھے، ان کے گرد و پیش سامان تعیش کی بہتات تھی، باوجود ان سب باتوں کے بدنصیبی نے ان پر تسلط جمایا انکی ساری خوشی و مسرت کافور ہوگئی، یہ لوگ دولت کے نشہ میں چور اور دنیا کے کاروبار میں محو اور اپنے سرمایہ پر بیحد نازاں تھے، اور انکا خیال تھا کہ اس حالت میں کسی قسم کا تغیر ممکن نہیں، لیکن چشم زدن میں ان کی جڑیں کھوکھلی ہوگئیں، ان کی شہرت کا خاتمہ ہوگیا، اور اگرچہ وہ اپنے آپ کو دولتمند سمجھے ہوئے تھے لیکن ناگہانی طور پر انہیں اس امر کا احساس ہوا کہ وہ اب کچھ نہیں رہے ہیں، اور انکی مسرت بھی ان کی شہرت کے ساتھ ختم ہوگئی ہے۔ وہ شے جسکو مسرت کہتے ہیں عارضی نہیں ہوا کرتی، اگر ان لوگوں کے پاس کوئی حقیقی شے ہوتی تو کوئی حادثہ اسمیں کسی قسم کے تزلزل کا باعث نہ ہوتا کوئی آگ اسکو نہ بجھا سکتی، اور کوئی سمندر اسکو غرق نہ کر سکتا مسرت کوئی سطحی اور عارضی شے نہیں ہے۔ مسرت اشیا میں محدود نہیں اور نہ اسکا انحصار دولت پر ہے۔ یہ تو انسان کی سیرت اور اسکی شخصیت کا ایک جزو ہے۔ اسکا انحصار اس بات پر ہے کہ انسان زندگی کا مقابلہ صحیح طریقے سے کرے۔ جو شخص زندگی کا مقابلہ غلط طریقوں سے کرتا ہے اسکے پاس

دولت کی خواہ کسی قدر زیادہ کیوں نہ ہو وہ کبھی خوش نہیں رہ سکتا۔

اکثر لوگ جو حوادث کے گرداب میں پھنس کر رہ گئے وہ یہی سمجھے ہو غلط چیزوں پر تکیہ کرتے تھے انسانیت کی تعمیر امانت اور صداقت کی بنیادوں پر ہوتی ہے اور یہی خدائی طریقہ ہے اگر وہ اپنی سیرت کو بے ایمانی، دنائت اور فریب سے ملوث کرنے کی کوشش کرے گا تو وہ کبھی خوش نہیں رہ سکتا مسرت کی روح حقیقی دیانت، خلوص اور صداقت ہیں، جو شخص یہ بات کا خواہشمند ہے کہ خوشی اور مسرت اسکا ساتھ دے تو اسکو اپنی سیرت پاک و صاف رکھنی چاہئے اور خلوص کو کبھی چھوڑنا نہیں چاہئے۔ جس وقت وہ سیدھے راستے سے ہٹتا ہے تو اسکی مسرت بھی اس سے کنارہ کش ہو جائیگی۔

بیشتر اسقدر روح فرسا ہے کہ بنی نوع انسان مادی مفاد یعنی حصول دولت میں پھنسا رہتا ہے اور خوشی و مسرت کو محض دولت کے ذریعے حاصل کرنیکا خواہاں ہو۔ لوگوں کو اس بات کا اندازہ بہت ہی کم ہے کہ جس شے کو مسرت کہتے طالب ہیں وہ ایک روحانی اور اندرونی کیفیت کا نام ہے بیرونی نہیں ہے اور اگر انکا اپنا دل طمانیت محسوس نہیں کرتا تو چاہے وہ ساری دنیا ہی میں کیوں نہ ڈھونڈتے پھریں مسرت ان کے ہاتھ ہرگز نہ آئیگی مسرت ایک دماغی کیفیت کا نام ہے، یہ ایک بنیادی اصول ہے اور جو شخص اس اصول کے سمجھنے سے قاصر ہے وہ کبھی خوش نہیں رہ سکتا۔

دنیا میں مختلف النوع جرموں اور مصیبتوں کا سبب یہی ہے کہ انسان اس اصول کو نہیں سمجھتا کہ کوئی شخص اسوقت تک خوش رہ ہی نہیں سکتا، جب تک کہ وہ اپنی ذاتی خوبیوں میں ہم آہنگی پیدا نہ کرے۔ خدائی صفات کا جامع اور وحشت و بربریت سے مبرا نہ رہے۔ جو شخص وحشیانہ قوتوں میں ہم آہنگی پیدا کرنیکی کوشش کریگا وہ کبھی خوش نہیں رہ سکتا۔ صرف وہ نیکی جو خدائے تعالی نے اسکی طبیعت میں ودیعت کی ہے اسکو خوش رکھ سکتی ہے۔

اصلی مسرت ادنی اور قابل مذمت امور کے بدلے میں نہیں نصیب ہو سکتی، ادنی اور قابل اعتراض باتوں سے یہ کوسوں دور بھاگتی ہے مسرت اور افعال قبیحہ میں کوئی چیز مشترک ہے ہی نہیں۔ اگر اسکی بنیاد اصول پر قائم ہو تو اسکا اثر قوانین ریاضی کیطرح بالکل درست ہوتا ہے جس کا جی چاہے وہ مسئلہ ریاضی کیطرح اسکو حل کرکے دیکھ لے ریاضی ہی کیطرح بالکل درست جواب اُسے ملیگا۔ اگر وہ ان باتوں کو جن کا بیان اوپر ہو چکا ہے اختیار کرلے تو یقینی طور پر اسکو مسرت حاصل ہو جائیگی۔

مسئلہ ریاضی کا صحیح جواب حاصل کرنیکا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ قوانین ریاضی کی متابعت پورے طور پر کیجائے۔ اگر ساری دنیا بھی ان اصول کو پس پشت ڈال کر صحیح جواب حاصل کرنیکی کوشش کریگی تو وہ کبھی کامیاب نہ ہوگی۔ صحیح جواب تو فقط اسوقت حاصل ہو سکتا ہے جبکہ پوری احتیاط کیساتھ وہ قوانین ملحوظ رہیں اسی طرح اگر ساری دنیا کی اکثریت کسی اور طریقہ کو حصول مسرت کا ذریعہ سمجھتی رہے تو اسکا نتیجہ کچھ نہیں نکلیگا۔ اگر انسان اپنے دل میں اضطراب، بے چینی یا غم محسوس کرتا ہے تو اسکے معنے یہ ہیں کہ وہ اس مسئلہ کو صحیح طریقہ پر حل نہیں کر رہا ہے۔ ہم سب اس بات سے واقف ہیں کہ ہم میں ایک باطنی قوت موجود ہے، اور ایک خدائی خاموش رہبر زندگی بھر ہماری رہنمائی کرتا ہے یہ ایک اعلی اور بہتر قوت ہے جو ہماری طینت میں پوشیدہ رہتی ہے، اور یہی ہر اچھے کام میں ہماری موافقت اور ہر برے کام میں ہماری مخالفت کیا کرتی ہے۔

ہر زمانے میں بنی نوع انسان نے اس داخلی ناصح کو رشوت دیکر راضی رکھنے، عالم ہیجان میں اسکو خاموش کرنے اور بیہودہ مشاغل یعنی عالم مدہوشی و مستی میں اسکو غرق کردینے کی کوشش کی ہے، لیکن یہ کوشش ہمیشہ بیکار ثابت ہوئی ہیں، ہر زمانے میں انسان نے اسکے انتباہ سے بے اعتنائی برتی ہے اور اپنی غلط کاریوں کے متعلق اسکے دلخراش طعن و تشنیع سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن تعیش و ہیجان کی بے پناہ طاقت

بھی اس کی صدا کو خاموش نہیں کر سکی اور یہ ناصح مشفق ہر نیک و بد مشغلے میں ہمیں اپنا غیر متعصبانہ اور مخلصانہ مشورہ دیتا ہی رہا ہے۔

تلاش مسرت سے زیادہ کسی اور بات میں انسان اپنے آپ کو فریب نہیں دیتا لیکن اسکے پانے کا فقط ایک ہی طریقہ ہے اور وہ طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنے فطری اور خلقی قوانین کی پوری پوری پیروی کرے۔ ہماری تعمیر فطری قوانین یعنی صداقت اور عدل پر ہوئی ہے، اگر ہم ان کی متابعت سے پہلوتہی کرینگے تو ہم کبھی فارغ البال نہ ہوسکینگے۔ جسوقت تک ہم بدی کا ارتکاب کرتے رہیں گے دوسروں کو برباد کرکے اور انکی کمزوری سے فائدہ اٹھاکر ہر ناجائز طریقے سے دولت حاصل کرینگے۔ جسوقت تک ہماری خواہش کسی نہ کسی طرح دولتمند بنجانے کی رہیگی ہمیں کبھی حقیقی مسرت حاصل نہ ہوسکیگی، کیونکہ ہم جاہی غلط راستے پر رہے ہیں۔

ترسم نرسی بکعبہ اے اعرابی
کیں رہ کہ تو میروی بترکستان است

ہاں اسطرح ہم اپنے خلقی اوصاف میں اختلاف پیدا کردیں گے اور جس شے کے درحقیقت ہم طالب ہیں اس سے بالکل متضاد شے ہمیں حاصل ہوجائیگی۔

جس طرح بے سرے سازوں میں صحیح سر پیدا نہیں ہوسکتا اسی طرح خودغرضی پر عمل کرتے ہوئے انسان کے اوصاف طبعی میں ہم آہنگی پیدا نہیں ہوسکتی۔ خوش رہنے کے لیے ہمیں اپنی باطنی قوت اور اپنی اعلیٰ خوبیوں کو ایک مرکز پر لانا چاہئے۔ اس دائرے سے نکلکر ہمیں مسرت حاصل نہیں ہوسکتی۔

موجودہ تہذیب کے زمانہ میں اس خیال نے بیحد نقصان پہنچایا ہے کہ ہم اپنے کاروبار میں دوسروں کے ساتھ اپنے تعلقات میں یا اپنے لئے حصول مسرت میں فریب سے کام لے سکتے ہیں، اور پھر اپنی عبادت گاہوں میں جاکر اور کبھی کبھی خدا کے سامنے سر جھکاکر معافی حاصل کرسکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس خیال سے زیادہ نقصان شاید ہمیں اور کسی چیز نے نہیں پہنچایا ہے کہ جب چاہیں گے توبہ کرکے نجات حاصل کرلیں گے۔

ایک صاف ضمیر ایک پاک زندگی، اور خودغرضی، حسد، رشک اور نفرت کے جذبات سے کامل بریت کے بغیر حقیقی مسرت کبھی حاصل ہو ہی نہیں سکتی۔ ایک اور مصیبت یہ بھی ہے کہ ہم نے خود مسرت کو ایک معما بنالیا ہے، حالانکہ مسرت ہر قسم کی پیچیدگی، نمائش، اور تکلفات سے بالکل پاک ہے۔ مصنوعی اور پر از تکلف زندگی کے خلاف فطرت نے پہلے ہی قوانین بنادیے ہیں، آپ مسرت بجبر حاصل نہیں کرسکتے۔ یہ قدرتی ہونی چاہئے اور پاکبازانہ زندگی کے ذریعہ حاصل کیجانی چاہیئے۔

حقیقی مسرت اسقدر سادہ چیز ہے کہ بہت سے لوگ اسے پہچان بھی نہیں سکتے۔ اُن کا خیال ہے کہ یہ صرف بہت سی دولت کے ذریعہ یا کوئی بڑا کام کرنے سے نصیب ہوتی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ دنیا میں نہایت سادہ، نہایت پرسکون اور نہایت ہی غیر نمائشی باتوں سے حاصل ہوتی ہے۔

ہمارے سامنے ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہم اپنی زندگی کو سادگی مگر بلند خیالی سے معمور رکھیں، تاکہ ہماری زندگیوں میں کوئی عامیانہ پن اور ناخوشی دخل ہی نہ پائے۔ ذراسی مہربانی، چند خوشگوار الفاظ، اور معمولی سی امداد، تھوڑی سی خوش خلقی اور ہمت افزائی، مناسب طریقے سے کسی فرض کی ادائیگی۔ بےغرض خدمت، اپنی پسند کا کوئی کام، دوستی انس اور محبت، یہ سب معمولی باتیں ہیں۔ لیکن سچ یہ ہے کہ مسرت کے اصلی اجزا یہی ہیں۔

دنیا کے صحت افزا مقامات، اور مشہور چشموں پر ایسے دولتمند دل کی بھیڑ رہتی ہے جو اپنے طبیبوں کے مشورے سے وہاں اسلئے آئے ہیں کہ عیش کی زندگی کے اثرات سے نجات حاصل کریں۔ یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے جبراً مسرت حاصل کرنے کی کوشش کی تھی اور اب یہ اپنی سزا بھگت رہے ہیں۔

ایک دعوت کا حال سنیئے۔ یہ دعوت ایک امیر آدمی کے ہاں ہوئی تھی، دو گھنٹے تو فقط دسترخوان پر کھانا چننے ہی میں لگے۔ اب ذرا کھانوں پر بھی غور کیجیئے تیس قسم کے مرغن کھانے ایسے تھے جو ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے اور ان کے علاوہ سات مختلف قسم کی شرابیں بوتلوں اور کنستروں کی زینت تھیں۔ اب آپ ہی ذرا سوچ کر بتائیے کہ کیا کوئی شخص اس قسم کی غذاؤں کو کھا کر تندرست یا خوش رہ سکتا ہے۔!

ایک اوسط درجہ کے امیر آدمی کو لیجیئے اور دیکھئے کہ اسکے سامان مسرت کیا کیا ہیں۔ کیا جس طرح وہ ایک لامحدود طلسمی نیرنگ کے تعاقب میں بے وہ بزعم خود مسرت کیطرف سے دوڑا چلا جا رہا ہے۔ اس سے زیادہ ذلیل بے حقیقت اور غیر اطمینان بخش کوئی چیز اور بھی ہو سکتی ہے؟ اسکی مسرت اسی سراب کا نام تو ہے جس پر فریب لہریں آگے بڑھ بڑھ کر آنیکا اشارہ کرتی رہتی ہیں لیکن جو کبھی اسکے ہاتھ نہیں آتیں۔ اور اسکی مسرت وہی قوس قزح تو ہے جس سے مسحور ہو کر بچوں کیطرح ہر طرف دوڑا دوڑا پھرتا ہے لیکن رنج و افسوس کے سوا میسر کچھ نہیں آتا۔ ممکن ہے کہ اسے کبھی کبھی چند لمحوں کے لیئے اپنے اعصاب میں ایک لہر سی دوڑتی محسوس ہو جاتی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ گناہ کی عارضی اور ناپائیدار لذتیں تھوڑی سی دیر کے لیئے اسکے دماغ میں تحریک اور ہیجان پیدا کر کے اسے خوش کر دیتی ہوں۔ لیکن ان بے حقیقت چیزوں کی حقیقت کیا؟ یہ خوشی تو صرف بہیمانہ مسرت ہے اور اسکا نتیجہ تو حسرت و افسوس اور زندگی سے نفرت کے سوا اور کچھ نہیں نکلا کرتا۔ کیا ایسی خوشی کو بھی مسرت کہا جا سکتا ہے؟

ہر صاحب عقل انسان کے دل میں دنیا میں کچھ نہ کچھ کر جانے اور کچھ نہ کچھ بن جانے کی زبردست خواہش ہوتی ہے۔ اور ہر کاہل آدمی جانتا ہے کہ وہ اپنی فطرت کے اس مطالبہ کو رد کر رہا ہے۔ وہ درحقیقت اپنے آپ کو دھوکا دے رہا ہے کہ ایک ایسی چیز کے حاصل کرنے سے خود کو باز رکھتا ہے جو دنیا کی ہر چیز سے زیادہ قیمتی ہے اور دنیا میں جس سے بہتر اور کوئی چیز اسکے لیئے نہیں ہو سکتی۔

بہت سے کاہل اور امیر نوجوان اگر ان سے پوچھو تو اسبات کا اقرار کرتے ہیں کہ دنیا میں اپنا کام نہ کرنا، دنیا کی سرگرمیوں اور جدوجہد میں حصہ نہ لینا اور اس انعام کو حاصل نہ کرنا جسکو حاصل کرنیکا نیاضی فطرت نے ان کو اہل بنایا ہے سخت غلطی ہے، لیکن چونکہ وہ لوگ کام کرنے پر مجبور نہیں ہیں اسلیئے اُن کے طبعی رجحانات بھی رفتہ رفتہ مردہ ہو جاتے ہیں اور وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔

حال ہی میں ایک دولتمند نوجوان سے پوچھا گیا تھا کہ کام کیوں نہیں کرتے تو اُس نے جواب دیا کہ میرے پاس کرنے کے لیئے کوئی کام ہے ہی نہیں "کوئی کام ہے ہی نہیں" نے نوجوانوں کو جسقدر برباد کیا ہے شاید ہی کسی اور شے نے اسقدر برباد کیا ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ فطرت نے کاہل آدمی کے لیئے کوئی رعایت نہیں رکھی ہے۔ زندگی کا قانون تنازع للبقا یعنی زندگی کی جدوجہد میں سرگرم رہنا ہے۔ بس یہی وہ شے ہے جسکی مدد سے انسان قعر تنزل میں گرنے سے بچ سکتا ہے۔ انسان اگر اپنی اعلیٰ خواہشات کے مطابق اپنی جدوجہد کا دائرہ وسیع کرتا رہے تو یہ اس کی سلامتی عقل کی دلیل ہے، اور جو شخص اس جدوجہد سے بچنا چاہتا ہے اسکو زوال کی سزا بھگتنی اور درستی کار کو خیرباد کہنا پڑتا ہے۔ اپنے آپ کو یہ فرض کر کے فریب نہ دو کہ تم بیکار رہ کر بھی حقیقی مسرت حاصل کر سکتے ہو۔ مسرت اور باکاری توام بچوں کیطرح ہیں، ان کا جدا کر دینا مہلک ثابت ہوگا۔ جسطرح کوئی گھڑی بے چلے درست نہیں رہ سکتی، اسی طرح کاہل آدمی کا خوش رہنا بھی ناممکن ہے۔ حضرت سعدیؒ نے سچ فرمایا ہے "مرد بیکار یا دزد شود یا بیمار"۔

اعلیٰ مسرت اس بات میں مضمر ہے کہ انسان بھلائی کا خواستگار ہو اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ وہ سرگرم عمل ہو، اور اپنی زندگی کے

اُس اعلیٰ مقصد کو پورا کر رہا ہو جو قدرت نے اُسکے انفرادی رجحان کی صورت میں اُسکو سونپا تھا فرمائی ہے۔ گھڑی وہی اچھی ہوتی ہے جو چلتی رہے اور ٹھیک وقت دے اسی طرح انسان وہی اچھا ہے جو اپنے مقصد زندگی کو پورا کرنے میں جی جان سے لگا ہوا ہے، گھڑی نہ چلے اور آدمی مصروف کار نہ ہو تو دونوں بیکار ہیں۔

مناسب مشاغل سے زیادہ مقوی دوا کوئی اور نہیں ہوتی ہے اس سے بڑھکر کوئی مسرت نہیں ہے کہ ہم ہر جگہ اپنی پوری کوشش کیساتھ اپنا فرض ادا کریں، اس سے بڑھکر اطمینانِ قلب کی کوئی صورت نہیں ہے کہ ہر کام میں ہماری فضیلت ثابت ہو اور ہر کام جو ہمارے ہاتھ سے نکلے ہماری برتری کی شاہی مہر ثبت ہو۔

انسان کام ہی کے لئے بنایا گیا تھا اُسکی زندگی میں کامیابی کا بدل کوئی اور چیز ہو ہی نہیں سکتی، کسی اچھے مقصد کو حاصل کئے بغیر حقیقی مسرت حاصل ہونا محال ہے سب سے زیادہ قابل اطمینان یہ انسانی احساس ہوتا ہے کہ میں ترقی کر رہا ہوں، اور میرا قدم آگے ہی بڑھتا جاتا ہے۔ انسان کو سب سے زیادہ مسرت اس احساس سے حاصل ہوتی ہے کہ لاعلمی کا افق روز بروز اُس سے دور ہوتا جا رہا ہے اور وہ دنیا میں اپنا راستہ طے کرنے میں آگے ہی بڑھتا جا رہا ہے۔ وہ فقط اپنی روش کو قایم ہی نہیں رکھ رہا ہے بلکہ اُسمیں ترقی بھی کر رہا ہے۔

مسرت سکون کی نقیض ہے۔ اگر انسان اپنی قوتوں کو بڑھتے پھیلتے اور کسی اونچے مقصد کو حاصل کرنے میں جد وجہد کرتے ہوئے نہیں دیکھیگا تو اُسکو اپنی زندگی کی مسرت حاصل نہیں ہو سکتی۔

امراکو اپنا مقصد حاصل کرنے میں لڑتے جھگڑتے اور گالی گفتار کرتے اور ہر قسم کی احمقانہ چالیں چلتے دیکھکر ہمیں یقین ہوتا ہے کہ مسرت ہر گز اُن کے دل میں نہیں ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسرت ادنیٰ نصب العین، خود غرضی، کاہلی، اور لڑائی اور فساد کیساتھ موافقت نہیں رکھتی۔ یہ تو کیجہتی، سچائی، خوبصورتی شفقت اور سادگی کی رفیق ہے۔

ہزار ہا آدمی روزی کمانے میں کامیاب ہو گئے لیکن حصول زر کی سعی میں اُنہوں نے ایسے ناجائز طریقے اختیار کئے کہ اب خوشی سے لذت یاب ہونے کا اُن میں مادہ ہی نہیں رہا۔ ہمنے ایسے لوگوں کی بابت اکثر دوسروں کو کہتے سنا ہے وہ دولت تو بیشک اُسکے پاس ہے لیکن افسوس وہ اُس سے لطف نہیں اُٹھا سکتا ۔۔

اگر کوئی شخص اس فریب میں مبتلا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے بہترین حصہ کو حصول دولت میں صرف کر کے، اپنے گھر بار سے بے پرواہ رہ کر اپنے تعلقات ذاتی ترقی اور ایسی ہر چیز کو قربان کر کے جو واقعی قیمتی ہے مسرت حاصل کر سکتا ہے، تو اسکو جلد از جلد اس سے چھٹکارا حاصل کر لینا چاہیئے۔

اگر کوئی شخص اپنے مواقع اور قویٰ کو دولت میں تبدیل، اور اپنی ساری عمر کو روپیہ جمع کرنے میں صرف کرتا ہے تو وہ اُن قویٰ کو نظر انداز کر دیتا ہے جو واقعی خوشی کا سبب بن سکتے ہیں، اور اُسکا دماغ اسقدر ضعیف ہو جاتا ہے کہ وہ اُسکو دوبارہ ترو تازہ نہیں کر سکتا، مسرت تو انہیں قوتوں سے حاصل کر سکتا تھا جو روپیہ کمانے میں صرف ہو گئیں وہ کاروبار سے کنارہ کش ہونے کے بعد بھی اپنی اُن عادتوں کو جو طبیعت ثانیہ بن گئی ہیں بدل نہیں سکتا۔

اگر تم نے حسن، نیکی، اور صداقت کو پسند کرنے کی لیاقت کو ضائع کر دیا تو تم کو بھی ڈارون کیطرح تعجب کرنا پڑیگا کیونکہ ادھیڑ عمر میں اُسنے محسوس کیا تھا کہ شکسپیر کی تصانیف اور موسیقی سے لطف اُٹھانیکا مادہ اُسمیں نہیں رہا، ہم میں معقول معاش حاصل کرنے بلکہ دولتمند تک بننے کا مادہ ہونا چاہیئے۔ اسکے ساتھ ہی ہم میں یہ قابلیت بھی ہو کہ اپنی روزانہ زندگی میں ہشاش بشاش رہ سکیں۔ ہر وقت غلام بنے رہنا۔ اور شاذونادر لطف اُٹھالینا ٹھیک نہیں ہے۔ ہمارا ہر دن عید کا دن ہونا

انتہائی خوشی اور مسرت کا دن واقعہ ہو سکتا ہے۔ اگر ہماری زندگی سکون اطمینان کے ساتھ بسر ہو رہی ہو اور ہم صحیح خیالات رکھتے ہوں۔ تعجب ہے کہ حصول مسرت کی اہمیت کو بہت کم اشخاص محسوس کرتے ہیں۔ اور ان کی زیادہ توجہ فقط روپیہ کمانے پر مرکوز رہتی ہے اور اس مسرت کو محض ثانوی حاصل کرتے ہیں تو پھر اس زندگی کا دارومدار رہے حالانکہ معاش سے زیادہ زندگی کا خیال رکھنا چاہیے۔

بہت کم لوگ زندگی کی معمولی چیزوں سے لطف حاصل کرنا جانتے ہیں، حالانکہ زندگی اسی خوشی اور اطمینان کا نام ہے۔ اکثر لوگ حقیقی نہیں بلکہ امید کی زندگی بسر کرتے ہیں، وہ زندگی ان کو میسر ہی نہیں جسکے وہ خواہاں تھے۔ ہاں زندگی سے لطف اٹھانے کی تیاری میں وہ مصروف رہتے ہیں۔ وہ لطف اٹھانے کے لیئے اسوقت تیار ہو سکیںگے جب کچھ دولت، بہتر مکان، زندگی کی راحت کا کچھ سامان، کچھ فرصت، ذمہ داری اور مصروفیت سے کچھ آزادی میسر آئیگی۔

اس دنیا میں شاید ہی ایسا آدمی مل سکے جو یہ کہنے کو تیار ہو کہ میں واقعی ویسی ہی زندگی بسر کر رہا ہوں جیسی کہ میں چاہتا تھا، یا جیسی میرے نصب العین کے مطابق ایک حد تک بسر ہو سکتی ہے۔

آدمی کو ایسی عادت ڈالنی چاہیئے کہ روزانہ زندگی کی معمولی باتیں اسے خوش کر سکیں۔ خوش رہنے کی عادت بھی ہماری بھلائی کے لیئے اسیقدر ضروری ہے جسقدر محنت، دیانتداری اور صفائی معاملات کی عادت ہے۔

جس شخص کا دماغ صحیح و سالم نہیں ہے وہ اپنا کام پوری توجہ سے نہیں کر سکتا۔ مسرت ہمارے وجود کی بنیادی ضرورت ہے، یہ صحت، سلامتی عقل اور یکسوئی کی علامت ہے۔ انسانی فطرت کی بیسیوں باتیں اسبات کو ثابت کرتی ہیں کہ خدا نے ہمیں خوش و خرم رہنے کے لیئے پیدا کیا ہے اور خوش و خرم رہنا ہماری سلامتی عقل کی دلیل ہے، اور علامت حزن و ملال، بے صبری ہماری فطرت سے قطعاً اجنبی ہے۔

اسمیں کچھ شک نہیں کہ ہماری زندگی ایک اعلیٰ اور شیریں نغمہ کے مانند ہے، ہماری تعمیر اتفاق پر ہوتی ہے اور ہر قسم کا اختلاف اسکی سرحد سے باہر ہے۔ اگر اس دنیا میں کوئی ناخوش اور پریشان ہے تو اسمیں کچھ نہ کچھ خامی ضرور ہے کیونکہ قدرت نے ہم آہنگی اور خوبصورتی کو نہایت عمدہ طریقے سے ملا دیا ہے۔

ایک نہایت ہی ناقابل بیان راز جس نے ہر خودغرض امیر آدمی کو حیرت میں ڈال رکھا ہے یہ ہے کہ کبھی اُن کو اپنے متوقع مقام پر مسرت نصیب نہ ہو سکی۔ دولتمندوں کا سب سے زیادہ تلخ تجربہ یہ ہوا کہ انکی دولت باوجود مسرت کو اُن سے نہ ملا سکی۔ اب اُن پر یہ حقیقت آشکارا ہوئی ہے کہ مادی چیزیں محبت و رافت کو بڑھانے میں ناکام ہیں۔ اور دل باوجود سامان تعیش کی فراوانی کے اپنے آپ کو بھوکا محسوس کرتا ہے۔ وہ جان گئے ہیں کہ اگرچہ روپیہ بہت سے کام کر سکتا ہے لیکن وہ دلی ارمانوں اور حسرتوں کو پورا نہیں کر سکتا، عالیشان محلوں کی بہت سی رہنے والیاں مسرت کی جویاں ہیں اور وہ خوشی سے اپنے تمام سامان راحت و آسایش کو ایک شخص کی محبت سے بدل لینے پر تیار ہو جائینگی، جسکے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔

کوئی مطلبی آدمی خوش نہیں رہ سکتا۔ ایک خود ساز دولتمند اس معمے کو حل کرنے میں ناکام ہے کہ اگرچہ کروڑوں روپے اُسنے کمائے مگر مسرت کا منہ اُسے پھر بھی دیکھنا نصیب نہ ہوا، اُسکا بیان ہے کہ خدا جانے لوگ میرے دوست بننا کیوں پسند نہیں کرتے وہ مجھ سے کترلتے ہیں، اور مجھپر پورا اعتماد تو کوئی کرتا ہی نہیں ہے اور میرے ہمسایہ بھی مجھے عزیز نہیں رکھتے۔ یہ شخص سمجھ بھی نہیں سکتا کہ یہ کیوں خوش نہیں ہے۔ حالانکہ مسرت حاصل کرنیکی اسنے انتہائی کوشش کی ہے

اسمیں ایک خرابی یہ ہے کہ اسنے جو کچھ کیا ہے محض اپنے لیئے کیا ہے وہ خود غرض بھی نہیں ہے۔ مگر ہمیشہ دولت مند بننے کا جذبہ اُس پر طاری رہا ہے۔ اور وہ یہی خیال کرتا رہا ہے کہ باقی سب چیزیں دولت کے ذریعہ میسر آجائینگی۔ اُسنے ایسے ہی دوست تلاش کیئے جو کاروباری نقطۂ نظر سے اسکے لیئے مفید ہوں اور ہر قدم پر وہ نتیجہ اُسکے پیش نظر رہا ہے۔ جس سے اُسکی ذات پر اثر پڑیگا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمیشہ وہ اپنے آپسے یہ سوال کرتا رہا ہے "مجھے اِس کام سے کیا فائدہ ہے"۔ مسرت ہمارے افعال ہی کا عکس، گونج، اور جزو ہے۔ اصلی تعلق ہماری مادی دولت سے نہیں ہے۔ جسطرح جَو بو کر گیہوں کی فصل نہیں کاٹی جا سکتی، اُسی طرح ایک خود غرض حریص اور مطلبی آدمی کا دماغ مسرت نہیں محسوس کر سکتا۔ اگر ہم اعانت، مہربانی، بے غرضی، کی تخم ریزی کرینگے، تو اُسکا ثمر اطمینانِ قلب، یکسوئی اور مسرت کی صورت میں حاصل ہوگا۔

خود غرضی اور سچی خوشی ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

غیر محدود خواہش، دوسروں سے بڑھ جانے کی تمنا، بہر حال اپنی شان جمانے کی آرزو خود غرضی کو جلا دیتی ہیں، اور یہ ہماری مسرت کے تمام سوتوں کو بند کر دیتی ہیں۔ دوسروں کی دولت میں بڑھ جانے کی حسرت سوسائٹی میں دوسروں سے سبقت لیجانیکا ارمان ایک ایسی وضع کو ترقی دیدیتا ہے جو مسرت کے منافی ہے۔ کسی حریص آدمی کے دل کو خوشی نصیب نہیں ہو سکتی۔ حرص کے زیر سایہ مسرت کی تمام شاخیں مثلاً قناعت اطمینانِ قلب تصفیہ باطن، اور محبت بار آور نہیں ہو سکتیں۔

جسطرح وہ آدمی آرام سے نہیں چل سکتا جسکے جوتے میں کنکر بھر گئے ہوں، یا اُسکی کیلیں اُسکے پاؤں میں چبھ رہی ہوں، اسی طرح اُس شخص کا خوش رہنا بھی ناممکن ہے جو بے ایمان ہے۔ جس نے دوسروں کا سب سمیٹ کر اور اُن کی کمزوری و بیکسی سے فائدہ اٹھا کر دولت حاصل کی ہے۔

وہ شخص کبھی خوش نہیں رہ سکتا جو کبھی کسیطرح ہو، جو دنیا میں اپنے متعلقہ کام سے پہلو تہی کرتا ہو، جو سمجھتا ہو کہ دوسروں کے جمع کیئے ہوئے ذخیرہ سے وہ اپنا دامن بھر رہا ہے اور اس ذخیرہ میں کچھ اپنی طرف سے ڈال دینے کا اُسے کبھی خیال بھی نہیں آتا۔ ایک عیش پسند دماغ جسمیں ٹھیک طریقے سے سوچنے اور زندگی گذارنے کا مادہ نہیں رہا مسرت حاصل کرنیکا قابل ہے۔ مسرت حاصل کرنیکا قابل ذکر طریقہ فقط یہی ہے کہ انسان، سیدھی سادھی پاک، صاف، ایماندارانہ اور مفید زندگی بسر کرے، دنیا میں ایسی کوئی طاقت موجود نہیں ہے جو مذکورہ باتوں کے سوا کسی اور بات سے انسان کو خوش کر سکے،

صاف اور دیانتدارانہ کام اپنی پوری کوشش سے اپنا فرض ادا کرنیکا عزم، کانٹوں کی بجائے پھول بکھیرنے کی دلی خواہش، اوروں کی اصلاح حال میں سعی، اور اُن کو اپنے وجود سے ذرا خوش کر دینے کی عادت ہی وہ باتیں ہیں جو حقیقی مسرت کا سبب بن سکتی ہیں۔

وہ آدمی جسکی نظر میں اپنے افعال قابلِ نفرت ہوں جو اپنی نیت اور عمل کی برائی سے واقف ہو، اور جو دوسروں سے رشک، حسد، یا نفرت کرتا اور انتقام لینے کے درپے ہو وہ کبھی خوش نہیں رہ سکتا اُس کا دل پاک اور اُسکا ضمیر صاف ہونا چاہیے۔ ورنہ دولت کی خواہ کسی قدر افزاط اور سامانِ عیش کی کیسی ہی بہتات کیوں نہ ہو وہ حقیقی مسرت کبھی حاصل نہیں کر سکتا۔



نغمۂ عید

(از جناب پنڈت اندرجیت صاحب شرما)

جام سرور لے کر دنیا میں عید آئی ۔ جانِ نشاط آئی جانِ امید آئی
الفت یگانگت کے گاتی ہوئی ترانے ۔ بچھڑے ہوؤں کو آئی باہم گلے ملانے
اخلاص کی زمیں پر دنیا نئی بسے گی ۔ بندوں کی زندگانی الفت طلب بنیگی
آزادیوں کے پرچم لہرائیں گے ہوا میں ۔ پیدا نہ دل میں ہونگی اب درد و غم کی موجیں
فردا کی کلفتوں کا نام و نشاں مٹے گا ۔ بزم جہاں میں ہر سو جام طرب چلے گا
ساغر بکف کھڑی ہو پھر عیش و کامرانی ۔ راحت کی زندگی ہو اور لطف جاودانی
چرچا نہیں رہیگا ارمان و آرزو کا ۔ قصہ تمام ہوگا تفریق ما و تو کا
گونہ مسرتوں کا ہاتھ آیا ہے خزینہ ۔ ساحل پہ جا لگیگا طوفان زدہ سفینہ
گونجے طرب کے نغموں سے آسماں کا گنبد ۔ ذرے نہ رہ سکیں کے دنیا میں یوں مقید

یہ یوم ہے مبارک یہ عید ہے مبارک
عیش و نشاط کی ہاں تمہید ہے مبارک

ہمارے مُصوّر مجلّات

(از جناب مولوی غلام احمد صاحب پرویز ہوم ڈیپارٹمنٹ نئی دہلی)

یوں تو جنون کی بہت سی قسمیں ہیں لیکن خدا محفوظ رکھے اس جنون سے جو دوسروں کی کورانہ تقلید کی شکل میں آدمی سر پر سوار ہو جائے بد قسمتی سے آجکل ہمارے بہت سے ادبی رسائل اسی قسم کے جنون میں مبتلا ہیں اور مشکل یہ کہ بقول غالب؎ رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج وہ اس جنون کے اسقدر خوگر ہو چکے ہیں کہ انہیں اب غالباً اس کا احساس بھی نہیں رہا۔ اور جسے دیکھئے اس رو میں بہا چلا جا رہا ہے علمی رسائل میں تصاویر چسپاں کرنا کب سے شروع ہوا اور یہ جدت کس کے تفنن طبع کی رہین منت ہے، یہ تو کسی ریسرچ اسکالر کی تحقیق کے لیے چھوڑ دینا چاہیے۔ لیکن آج مغربی ممالک کے رسائل کے مطالعہ سے اتنا تو ضرور واضح ہو جاتا ہے کہ رسائل میں تصاویر شائع کرنے سے آخر مقصد کیا ہے۔ وہاں عام طور پر ادبی رسائل میں مشاہیر علم مدیران رسائل۔ اور مقالہ نگار حضرات کی تصاویر شائع ہوتی ہیں، اور جبکی تصویر زینت بخش رسالہ ہوتی ہے اُسکے ضروری کوائف زندگی، اور وسعت علمی کا تذکرہ بھی ضرور ہوتا ہے۔ وہاں یہ کبھی دیکھنے میں نہ آئیگا کہ ملٹن کی شاعری پر تنقید ہو رہی ہے اور مقابل کے صفحہ پر فورڈ کمپنی کے کارخانہ کی تصویر چسپاں ہے۔ بعض افسانوں میں موزوں مقامات پر تصاویر سے بیان کی وضاحت کیجا تی ہے کہیں ان تصاویر سے مختلف جذباتِ انسانی کا مظاہرہ مطلوب ہوتا ہے اور عام طور پر یہ تصاویر دستی ہوتی ہیں، وہاں بعض رسائل کسی خاص فن سے متعلق ہوتے ہیں، ان میں اس فن کے متعلق تصاویر شائع ہوتی ہیں یہ کبھی نہ ہوگا کہ کاربالک گیس کا کیمیاوی تجزیہ کیا جا رہا ہو، اور تصویر میں بھانڈوں کی نقل دکھائی گئی ہو۔ بعض رسائل مختلف النوع علوم و فنون کے گلدستہ بھی ہوتے ہیں مثال کے طور پر "السٹریٹڈ لنڈن نیوز" کو لیجئے ایک ہفتہ وار میگزین ہے۔ آرٹ لٹریچر تاریخ آثار قدیمہ، سائنس نباتیات حیاتیات فلکیات، نوادرات، غرضکہ بیسیوں موضوعات علمی پر مقالات و انکشافات درج ہوتے ہیں لیکن ہر مضمون کے متعلق تصویر اور ہر تصویر کے متعلق مضمون یا معلومات، یعنی علمی و ادبی یا ادق مضامین کی وضاحت تصاویر سے کر دیجاتی ہے۔ اور جہانتک تصاویر کا تعلق ہے مشاہیر فن کے شاہکار جمع کیے جاتے ہیں اور ہر تصویر کے متعلق اسکی تاریخ۔ مصور کے کوائف زندگی، تصویر کے فنی محاسن اور آرٹ کی خوبیاں اس طریق سے بیان کی ہوئی ہوتی ہیں، کہ ایک عطائی بھی اس سے لطف اندوز ہو سکتا ہے اور اسطرح ایک واقعہ کی صحیح صحیح تصویر۔ اور ایک تصویر کے صحیح صحیح واقعات بیک وقت ذہن نشین ہو جاتے ہیں، اور معلومات میں معتد بہ اضافہ ہو جاتا ہے ایک اسی پر کیا موقوف ہے، ایسے متعدد رسائل وہاں سے شائع ہوتے ہیں،

یہ تھا حقیقی مقصد رسائل علمی و ادبی میں تصاویر شائع کرنیکا۔ ہمارے ادبی رسائل اچھے بھلے سادے شائع ہوتے تھے۔ پتہ نہیں کسنے ان کے کان میں کہہ دیا کہ رسائل میں تصاویر کا ہونا بھی ضروریات سے ہے، شروع شروع میں تو خیر اکثر مضامین نگار حضرات کی تصاویر شائع ہوتی رہیں۔ اور یہ ایک حد تک ضروری بھی ہوتا ہے، کیونکہ یہ کچھ انسانی فطرت میں داخل ہے کہ مضمون پڑھتے وقت اگر صاحب مضمون کے حالات اور اُسکی شکل و صورت سے

بھی شناسائی ہو تو مضمون زیادہ دلچسپ ہو جاتا ہے، لیکن اول تو ہمارے ہاں گنے چنے مضمون نگار و ادیب ہیں پھر انہیں سے بھی بہت سے ایسے، جو اپنے آپ کو روشناس سرِ بازار ہونے دینا نہیں چاہتے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ یہ سلسلہ جلد ہی ختم ہوگیا، اب اگر رسائل میں تصاویر شائع کرنے کا مقصد محض قارئین کی معلومات میں اضافہ یا فنِ مصوری کے کمالات سے ان کو روشناس کرانا ہوتا تو محنت اور خرچ سے ایسی تصاویر بہم پہنچائی جاتیں، ان پر مقالات لکھوائے جاتے اور خواہ برس دن میں ایک تصویر ہی شائع ہوتی۔ ہوتی ضرور کسی کام کی۔ لیکن یہاں تو صحافت کا اصول ہی جداگانہ ٹھہرا۔ دنیا میں آج ہر شعبۂ حیات میں "مقابلہ" ہے صحافت نے بھی آخر کیا گناہ کیا تھا، کہ اس میں مقابلہ نہ ہوتا یہ علیحدہ بات ہے کہ اس کے لئے مقابلہ کا معیار یا مفہوم مختلف ہو، لیکن مقابلہ تو ضرور ہے۔ ایک رسالہ اٹھا اور بلند آہنگی سے دعوے کر دیا کہ دیکھئے صاحب! ہمارے سائز کے برابر کوئی دوسرے رسالہ کا سائز نہیں دوسرا آگے بڑھ کے آ گیا کہیں سائز لیکر ضخامت کا تو مقابلہ کر کے تیسرا بولا۔ ارے میاں ضخامت کس کام کی ہم سال میں چودہ خاص نمبر شائع کر رہے ہیں۔ چوتھا چلایا کہ جی ہاں ان خاص نمبروں کی حقیقت معلوم ہمارے تو عام نمبر بھی ان سے بدرجہا ضخیم و نفیس ہوتے ہیں۔ پانچویں نے فرمایا کہ صاحب یہ سب خصوصیتیں بیکار۔ ہمارے ایک سالنامہ میں بیس بلاک کی تصویریں، چودہ دو رنگی۔ سولہ یک رنگی (اور سینکڑوں بے رنگی ہیں) بھلا اس سے تو مقابلہ کر لیجیے۔

جہاں باہمی منافست کی یہ شرائط ٹھہریں وہاں مذاق کا معیار معلوم۔ رسالہ کے مضمون کو بھر دینا تو پھر بھی آسان کام تھا، تصاویر بہم پہنچانا تھا ذرا مشکل۔ اب جو ہٹ تبرے کی اور دھت تیرے کی شروع ہوئی، کپڑوں کے تھانوں سے سینما کے اشتہاروں سے ولایتی ٹریڈ مارکوں سے تاش کے پتوں سے اور پتہ نہیں کہاں کہاں سے تصویریں اڑنی شروع ہوئیں اور رسائل میں لگی ان کی بھرمار ہونے "صاحب"، کا دماغ ہمیشہ ایسے مواقع کی تلاش میں رہتا ہے۔ اس نے جو یہ جنون دیکھا "ٹائمس آف انڈیا" میں لگے اشتہار شائع ہونے کہ ہم شائع شدہ تصاویر کے بلاکس علاوہ معمولی شرح کرایہ پر دینے کے لئے تیار ہیں۔ مانگ زیادہ اسٹاک کم ہاتھ کی تیری توے کی میری جو شروع ہوئی تو اس افراتفری میں جو بلاک کسی کے ہاتھ لگا جھٹ چھاپ دیا۔ عید نمبر ہے اور مولانا محمد علی مرحوم کے جنازہ کا فوٹو چھپ رہا ہے۔ محرم کا پرچہ ہے اور نشاط باغ میں فصل سرو قایم ہے۔ غالب کی شرح لکھی جا رہی ہے اور اڈیسن (امریکن سائنسداں) کی تصویر۔ وادی نجد کا ایک افسانہ ہے اور رستم دستاں گاماں پہلوان گرز سنبھالے کھڑے ہیں غرضیکہ انمل بے جوڑ غیر متعلق تصاویر شائع ہو رہی ہیں اور دھڑا دھڑ ہو رہی ہیں بھلا فرمائیے اس سے فائدہ؟

———— ❖ ————

تصویر کے انتخاب کے علاوہ اس کا عنوان قائم کرنا بڑی دقت نظری اور ژرف بینی کا کام ہوتا ہے۔ ولایت کے مصور اخبارات کو تو چھوڑئیے سنا ہے "ٹائمس آف انڈیا" (مصور) کے سلسلہ میں تصاویر پر عنوان دینے والے صاحبان نظر کو اتنی گرانبہا تنخواہیں دی جاتی ہیں کہ ہمارے یہاں بڑے سے بڑے مصور یا مقالہ نگار کو اس کا خواب دیکھنا بھی نصیب نہیں ہو سکتا۔ اور حقیقت یہ بھی ہے کہ موزوں عنوان سے نہ صرف تصویر کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے بلکہ خود عنوان قایم کرنے والے کے اصلی مذاق کا صحیح صحیح پتہ لگ جاتا ہے۔ خدا مغفرت کرے مولانا محمد علی مرحوم کا ایک واقعہ اس وقت یاد آ گیا۔ ایک مصور نے ان کے لئے جامع مسجد دہلی کی ایک نہایت شاندار تصویر بنائی مسجد کے علاوہ مصور کے قلم حقیقت نگار نے ماحول کو بھی تصویر میں شامل کر دیا تھا چنانچہ مسجد کی سیڑھیوں پر دوکانداروں اور تماشائیوں کے ہجوم میں ایک غریب عورت

جیتھڑوں میں ملبوس، ایک معصوم بچے کی انگلی پکڑے بھیک مانگتی دکھائی گئی تھی مولانا مرحوم نے تصویر کو بیحد پسند کیا۔ لیکن مصور سے کہا کہ اگر تصویر کے موجودہ عنوان "جامع مسجد دہلی" کے بجائے اسکے نیچے انکا تجویز کردہ عنوان لکھدے تو وہ تصویر کو ہر قیمت پر خرید لیں گے۔ مصور رضامند ہو گیا، مولانا نے فرمایا کہ اسکے نیچے لکھدو۔ Her Fathers built it

یہ اسکے باپ دادا نے بنائی تھی

ارباب نظر خوب پہچانتے ہیں کہ صرف عنوان بدل دینے سے تصویر کیا سے کیا ہو گئی، لیکن اسکے لئے محمد علی ہی کا سا ذوق سلیم اور رفعت تخیل درکار ہے، ہمارے ہاں بدقسمتی سے اس لٹریچر کو لٹریچر ہی نہیں قرار دیا جاتا جسمیں اندھے کیوپڈ کی فسوں سازیاں اور زہرا کی کرشمہ زائیاں نہ ہوں۔ ہر افسانے کا خلاصہ " اس نے مجھے دیکھا اور میں نے اُسے اور ہم ایک دوسرے پر عاشق ہو گئے" اور ہر نظم کا موضوع "شب ہجراں کی اختر شماری" جب تک قرار نہ پائے اُسے داخل ادبیات ہی نہیں سمجھا جاتا۔ جب ادب کی یہ تعریف ٹھہری تو مصوری جو شاعری سے پہلے نہیں تو شاعری کے بعد یقیناً سب سے زیادہ جذبات لطیف کی صحیح ترجمان ہوتی ہے۔ داستان عشق و محبت سے کسطرح خالی رہے، نتیجہ یہ ہے کہ کوئی تصویر انہیں ہاتھ آجائے۔ عنوان کے لئے اسی کوچہ کی خاک چھانینگے۔ خواہ کوئی ماں اپنے بچے کی قبر پر پھول چڑھانے جا رہی ہو۔ انہوں نے بہشت سے نیچے لکھدیا "سوگوار شباب" اسی طرح محبت زار داستان شباب، "عشق رسوا"، اولیں خط، کشش عشق پیام محبت اور ہزاروں ایسے ہی بے ربط عنوانات نظر آئینگے ان سے زیادہ مضحکہ انگیز وہ مضامین یا نظمیں ہوتی ہیں جو ان کو دیکھکر لکھی جاتی ہیں۔ اکثر دیکھنے میں آئیگا کہ غرناطہ کے

کھنڈرات کی تصویر ہے اور فیروز شاہ کے کوٹلے کے متعلق مضمون چسپاں کیا جا رہا ہے کسی نظم کا ایک ادھ شعر کسی تصویر پر صادق آتا معلوم ہوا لکھدیا "نظم متعلقہ تصویر"، اس قسم کے دلچسپ لطائف دیکھنے ہوں تو مصور مجلات کے سالنامے دیکھنے چاہئیں، دیکھئے کیسی بھانت بھانت کی چیزیں نظر آتی ہیں، ایک سالنامہ حال میں ہماری نظر سے بھی گذرا یوں تو اسمیں ہر تصویر "کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجا ست" تھی لیکن دو ایک باتیں تو ایسی تھیں کہ قارئین کو اس دلچسپی میں شریک نہ کرنا بخل معلوم ہوتا ہے۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار نے غالباً فسانہ آزاد میں لکھنؤ کی ایک مجلس محرم کا ذکر کیا ہے۔ بتانا یہ تھا کہ مجلس میں لوگوں کا ہجوم بہت زیادہ تھا، کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی، لکھتے ہیں کہ ایک مرثیہ خواں حضرت منبر پر تشریف لائے پہلے ایک رباعی پڑھی، رباعی کے پہلے دو مصرعے درج کرکے فرماتے ہیں، تیسرا مصرعہ شور میں سنائی نہیں دیا۔ چوتھا مصرعہ یہ ہے۔ پھر چوتھا مصرعہ درج کر لیا بات میں لطف پیدا ہو گیا مجلس کا صحیح صحیح نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ گیا، ہمارے رسالہ نے بھی پنڈت صاحب کی تقلید کی ہے ایک تصویر (گروپ) شائع کی ہے جسمیں سات حضرات رونق فرما ہیں پہلے کا نام درج ہے دوسرے خود مدیر رسالہ ہیں، ایک صاحب کی تصویر کے نیچے لکھا ہے انکا نام معلوم نہیں، چوتھے کا یہ نام ہے وغیرہ۔ بھلا فرمائیے جن صاحب کا نام تک خود مدیر رسالہ کو معلوم نہیں، اُنکی تصویر سے قارئین رسالہ کو کیا سروکار۔ علاوہ ازیں باقی حضرات میں سے صرف ایک صاحب کا مختصر سا مضمون درج رسالہ ہے۔ دوسرے حضرات (مع مدیر رسالہ۔ جو اگرچہ رئیس التحریر ہیں) ایسے ہیں، جنکا کوئی مضمون نہ اس رسالہ میں۔ نہ کسی اور رسالہ میں کبھی نظر آیا، اگر ان حضرات کا ادبی حیثیت سے تعارف نہیں کرایا جا سکتا تھا تو کسی اور حیثیت ہی سے

انہیں روشناس خلق کرا دیا جاتا۔ اندازہ کیجئے کہ کسی پرائیویٹ گروپ کی تصویر سے قارئین رسالہ کو کیا فائدہ -

اسی طرح عنوان قائم کرنے کی بھی ایک اچھوتی مثال ملاحظہ فرمائیے شروع شروع میں جب بائیسکوپ کی فلم ہندوستان میں آئی تھی، تو فلمیں بھی کسی مسلسل فسانہ کی نہیں ہوتی تھیں، دوسرے تماشائی بھی خوگر نہ ہوئے تھے کہ فلم کی کہانی میں ربط قایم کرتے جائیں، اسلئے کمپنی والے یہ کرتے تھے کہ ایک صاحب (جو پہلے فلم کو دیکھ لیتے تھے) بتلاتے جاتے تھے کہ اب یہ ہو رہا ہے - اب یہ ہوگا - ایک دن اتفاق سے ایک صاحب نے فلم پہلے دیکھا ہی نہیں تھا، تماشا شروع ہوا ایک صاحب بہادر پردۂ تصویر پر جلوہ نما ہوئے انھوں نے کہا، دیکھئے صاحب یہ ایک صاحب بہادر ہیں پھر ایک میم صاحبہ آگئیں - وہ بولے لیجئے اب ایک میم صاحبہ آتی ہیں - وہ دونوں باتیں کرنے لگے - یہ بولے - اب یہ باتیں کرتے ہیں - صاحب نے میم صاحبہ کا منہ چوم لیا - یہ بولے - لو اب صاحب نے میم صاحبہ کا منہ چوم لیا ہے، لوگوں نے اُسدن تماشا کیا دیکھا، تماشا دکھانیوالا خود تماشا بن گیا -

در رسالہ میں ایک تصویر نخلستان کا منظر ہے - ایک عرب بار ہاتھ میں لیے ایک عورت سے مخاطب ہے - پاس ہی ایک خوبصورت اونٹ کھڑا ہے - پتہ نہیں کیوں - لیکن آرٹسٹ نے غالباً اس تصویر کا کوئی عنوان مقرر نہیں کیا، اب مرتب رسالہ سوچ رہے ہیں کہ یا اللہ کس مصیبت کا سامنا ہے - تصویر ہے، لیکن اسکا نام کیا رکھا جائے اُدھر سے پریس والوں نے تنگ کر رکھا ہوگا کہ صاحب جلدی کیجئے ورنہ تصویر وقت پر شائع نہیں ہوسکیگی، ادھر انکا دماغ حاضر نہیں کوئی موزوں عنوان سوجھتا نہیں حسین و جمیل الفاظ کا ذخیرہ پہلی تصاویر پر ختم ہو گیا - "یاد تھیں جتنی دعائیں صرف درباں ہو گئیں"، اب کریں تو کیا کریں تصویر بے عنوان بھلی نہیں معلوم ہوتی، بھلا بتلائیے کیا لکھا ہوگا؟ آپ نہیں بتا سکیں گے - سنیئے اور داد دیجئے تصویر کے نیچے لکھا ہے -

"ایک تصویر"

آپنے دیکھا ہوگا بچے کتاب مانگا کرتے ہیں کونسی؟ جس میں "مورتیں" ہوں" مطلب انکا تصویریں دیکھنے سے ہوتا ہے - بالکل وہی "ایک تصویر" اور مقابل کے صفحہ پر پامسٹری اور مردہ روحوں سے ملاقات کا اشتہار درج ہے -

خدارا بتائیے کہ اس طرح تعداد بڑھانے سے کیا فائدہ؟

تصاویر کا ایک اور بھی پہلو ہے اور وہ پنجاب میں زیادہ نمایاں ہے اسے عام طور پر Oriental tast یا مشرقی مذاق کہا جاتا ہے خطوط سے یہ تصویریں بنائی جاتی ہیں، انکے متعلق دو قسم کی آرا پائی جاتی ہیں، ایک طبقہ تو "اسفل السافلین" کا سمجھتا ہے انکے نزدیک ان سے زیادہ مہمل اور مضحکہ انگیز تصاویر ہو ہی نہیں سکتیں، دوسرے طبقہ کو "اعلیٰ علیین" کہنا چاہیئے وہ کہتے ہیں کہ ان میں آرٹ کی خوبیاں سرحد ادراک سے آگے بڑھ گئی ہیں ممکن ہے بعض لوگ اس آرٹ کی حقیقت سے واقف ہوں اور وہ ان تصاویر کی فنی محاسن کی فی الواقعہ داد دیتے ہوں لیکن ان میں سے بھی بعض مداحین کا تو یہ حال ہے کہ جب ان سے پوچھو کہ بھائی ذرا ہمیں بھی بتا دیجئے کہ تصویر میں کیا کیا خوبیاں ہیں، تو صرف اتنا کہکر ٹال دیتے ہیں کہ صاحب ع

ذوق این مے نشناسی بخدا تا نچشی

انکی خوبیاں لفظوں میں بیان نہیں کی جاسکتیں صرف آنکھوں سے دیکھی جاتی ہیں - ہمیں تو انکا دعویٰ بھی شاعرانہ تعلی سے زیادہ نہیں معلوم ہوتا - بھلا اس گونگے کے سپنے سے عوام کو کیا فائدہ؟ اس قسم کی اعلیٰ تصاویر کے شائع کرنے سے مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ عوام کو اس فن کے کمالات سے لذت آشنا کیا جائے لیکن جب کوئی انکی خوبی بیان کرنیوالا ہی نہ ہو تو انکی اشاعت سے فائدہ؟ اور تو اور خود کارکنان رسالہ بھی تو ان کے متعلق کچھ نہیں جانتے اور اگر جانتے ہیں تو رسالہ میں کچھ نہیں لکھتے کہ تصویر کی خوبیاں کیا کیا ہیں - اور فنی اعتبار سے اسے شاہکار (مسٹر منہری تو ورد مراد ہیں) کیوں کہا جاتا ہے -

ممکن ہے کہ اس فن کے مبصرین کے نزدیک ان میں فنی کمالات موجود ہوں لیکن عوام تو صرف اسی قدر جانتے ہیں کہ اگر تصویر کے مختلف اعضا کی پیمائش کیجائے تو عام انسانوں سے کسی مافوق ہستی کی تصویر سمجھی جائیگی بال اتنے لمبے لمبے کہ اگر سیدھے چھوڑ دو تو پنڈلیوں کو چھولیں، لمبے لمبے ہاتھوں کے آگے اُن سے بھی لانبی انگلیاں، اور اس کوشش میں کہ ایک دوسرے سے بڑھ جائے، پاؤں یا تو بالکل ندارد یا اتنے بڑے کہ جوتا فرمائش سے بنوانا پڑے، آنکھوں کی جگہ ایک باریک خط۔ دہن کی جگہ صرف ایک نقطہ۔ ناک شملہ کی مرچ سے بھی بڑی، گردن اتنی لانبی کہ گھوڑے کی گردن پر شبہ پڑے، قامت یا تو بالکل وائرلیس کا کھمبا، یا شطرنج کا پیادہ، سر سے پاؤں تک ایک سفید کفنی میں ملبوس، گویا ابھی ابھی قبر سے کھینچے لا رہے ہیں، بہ ہیئت مجموعی تصویر کسی بھیانک خواب کی یاد دلاتی ہے۔ اور اس مجموعۂ حسن و خوبی کے نیچے شاہکار حضرت بہزادِ زماں۔ تحریر ہوتا ہے۔

آرٹ کے متعلق آج ایسی جماعت بھی پیدا ہو گئی ہے جو غالباً دوسروں پر فوقیت کی خواہاں ہے یا خود مبتلا ہے، شاعری میں غالب کے تتبع میں غزلیں کہی جاتی ہیں جنمیں شوکتِ الفاظ و ندرتِ ترکیبات سے سامعین کو مرعوب کرنے کی کوشش کیجاتی ہے، شروع سے آخر تک بے معنی تک بندیاں، لیکن بہت حسین و جمیل ترکیبوں کے لباس میں۔ نمونہ ملاحظہ فرمائیے۔

عصمت ناہید کوثر زا بہار نغمہ سے

شعلہ جوالہ اعتبار نغمہ سے

بوئے رنگیں عنبر افشاں مرمریں نگ تباب

کیف صہبائے تمنا جوئبار نغمہ سے

جو اصحاب کوتاہ فہم تھے وہ اس سمجھ کر چپ ہو رہے جنکی سمجھ میں نہ آیا انہوں نے سمجھا کہ یہ عالم بالا کی باتیں ہیں اعتراض کرکے یا دوسروں سے پوچھکر اپنی کرکری کیوں کرائیں، شاعر کی ساکھ ضرور جم گئی۔ اسی طرح نثر میں ٹیگوری اردو، کی ایک جدت ہوئی ہے جسے انشائے لطیف کہا جاتا ہے، پیاز کے چھلکوں کی طرح لفظوں کو ایک ایک کرکے اتارتے چلے جائیے اندر سے کچھ بھی نہ نکلیگا۔ مثلاً

رعنائی! نور و سرور کی داستانِ شیریں۔ منجمد فسردہ یاسمین کا بلوریں مجسمہ، گویا فطرت کا ایک حسین خواب تھی، جو ذاکرے کے نشۂ شباب میں ڈوبی ہوئی سنہری راتوں میں بہار صد گلستاں بداماں کیف زا نوائے رنگین پیدا کرتی ہے۔

اسی انداز کی یہ مصوری ہے۔ ماہرین فن تو اس سے اظہار کمال کرتے ہونگے لیکن یہاں ہر بوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی، دھار الٹی سیدھی لکیریں کھینچیں نہ کچھ تناسب نہ ربط۔ شاہکار تیار ہے۔

نہایت ضروری ہے کہ ایسی تصادیر کے متعلق ماہرین فن سے مقالات لکھوائے جائیں، اور تصادیر کیساتھ شائع کئے جائیں ورنہ اسکے بغیر تو جس حلقہ میں ادبی و علمی رسائل جاتے ہیں وہاں یہ تصاویر مہمل ہیں۔

اس سے کسی کی تنقیص مراد نہیں، جو رسالے اس مرض میں مبتلا ہیں انھیں چاہیئے کہ ٹھنڈے دل سے اسپر غور کریں اور سوچیں کہ اناپ شناپ تصادیر شائع کرنے سے وہ روپیہ بھی ضائع کرتے ہیں اور اُلٹا اپنی بدمزاقی کا ثبوت دے رہے ہیں، عوام کو ان تصادیر سے کچھ فائدہ نہیں پہنچا۔ یہ امر موجب اطمینان ہے کہ بعض رسائل ایسے ہیں، جن کا مذاق اس مسئلہ میں نہایت شستہ واقع ہوا ہے اور وہ تصادیر شائع کرنے میں ان ضروری امور کو مدنظر رکھتے ہیں، چاہیئے کہ تعداد بڑھ جانے کی بجائے ان رسائل سے سبق لیا جائے۔ تصادیر کا ہونا ضروری ہے بشرطیکہ ان سے کوئی فائدہ متصور ہو۔ ورنہ

بچہ نمازدن بہ ازشستہا ہے افگندن جنیں۔

حُرّیت

(از جناب پروفیسر محمود اسرائیلی صاحب)

گلستاں میں جا کر صبا ہو گئی تو — شمیمِ گُل جانفزا ہو گئی تو

چٹک بن کے نکلی شگوفہ کے منہ سے — کہیں برگ رنگیں قبا ہو گئی تو

کہیں ابر تو بہ شکن بنکے آئی — کہیں قوسِ ابر و نما ہو گئی تو

کہیں کمل کے پیمانہ گُل بنی تو — کہیں پس کے رنگِ حنا ہو گئی تو

سناں بنکے چمکی کبھی رزمگہ سے — کبھی نوک تیغِ دوتا ہو گئی تو

کبھی شیونِ روح فرسا بنی تو — کبھی نغمۂ دل کشا ہو گئی تو

مساجد میں تکبیرِ حق بنکے آئی — منادر میں بُت کی ادا ہو گئی تو

جرس بنکے گونجی کبھی کارواں میں — بیاباں میں بانگ درا ہو گئی تو

سمندر سے موجِ رواں بنکے ابھری — کبھی بُلبلے کی بقا ہو گئی تو

کیا مضطرب آبِ ساکن کو تو نے — بخارات بن کر ہوا ہو گئی تو

کہاں تیرا جلوہ نہیں آشکارا
مرے دل میں بھی رونما ہو گئی تو

ابن مقلہ

(از جناب اشرف صبوحی)

مسلمانوں کا ستارۂ اقبال جب اوج پر تھا تو ان میں ہر فن کے صاحب کمال موجود تھے، اسی عروج کے زمانہ میں ابن مقلہ بھی ایک باکمال شخص گذرا ہے جس نے چھ خط ایجاد کیے جو اپنی خوبی کی وجہ سے دنیا میں رواج پا گئے۔ جسطرح لقمان کی سحبان کی فصاحت زبان زد خلائق ہے۔ ابن مقلہ کا حسن خط بھی اسی طرح ضرب المثل ہے، شعرا نے جس طرح اور بزرگوں کے مخصوص اوصاف کا ذکر کیا ہے۔ ابن مقلہ کے خط کا بھی خصوصیت کیساتھ نام لیا ہے ؎

فصاحة سحبان وخط ابن مقلة
وحكمة لقمان وزهد ابن ادهم

منوچہری کہتا ہے ؏ چو ابن معتز نحوی چو ابن مقلہ دبیر

فی زمانہ خوش نویس عموماً جاہل سمجھے جاتے ہیں اور در حقیقت یہ خیال صحیح بھی ہے مگر اگلے زمانہ میں یہ حال نہ تھا، عموماً امرا و شرفا در علوم و فنون کے سوا خوشنویسی کو بھی ایک ضروری فن سمجھ کر حاصل کرتے تھے، بخلاف اس زمانے کے کہ اکثر اہل علم بدخط ہوتے ہیں۔ اور امور دنیوی کے انجام دینے سے قاصر ہیں، لیکن زمانۂ سلف کے علما، ایک ہاتھ سے دین اور دوسرے ہاتھ سے دنیا سنبھالتے تھے، ایک ہاتھ میں پر زور قلم رکھتے تھے اور دوسرے میں تلوار کے دھنی بھی تھے۔ اور "السیف و القلم توامان" کی مثل ان پر صادق آتی تھی جسکے ثبوت میں ابن مقلہ کی مثال موجود ہے۔ تاریخ میں اسکا نام روشن ہے، چونکہ مختلف عہدوں پر بارگاہ خلافت میں سرفراز رہا اسلیے کتابوں میں کہیں ابن مقلہ وزیر اور کہیں دبیر لکھا ہے۔ اس نامور وزیر کے حالات سے لوگ کمتر واقف ہیں۔ اپنی محدود علمی معلومات کی بنا پر جو حالات معلوم ہو سکے لکھے جاتے ہیں۔

اس کا نام محمد بن علی تھا مقلہ اسکے پردادا کا نام تھا بعض لوگ مقلہ کو اسکی چھٹی پشت میں بتلاتے ہیں۔ بہر حال وہ محمد بن مقلہ ہی کے نام سے مشہور ہوا۔ اسکی ولادت بعد عصر بروز جمعرات ۹ شوال ۲۷۲ھ میں ہوئی۔ مختلف فنون یعنی فقہ۔ تفسیر، قرات، اور ادب میں نہایت ممتاز اور اپنے اماثل میں سب سے سر برآوردہ ہوا۔ خصوصاً علم ترسل و انشا و املا و مکاتبات میں تو اپنے ہمعصروں سے بڑھ گیا اسنے چھ خط ایجاد کیے جن کے نام یہ ہیں۔ محقق، ثلث، نسخ توقیع، رقاع، ریحان۔ یہ خطوط اپنے حسن و خوبی کیوجہ سے اسقدر مشہور اور رائج ہوگئے کہ خط کوفی کو اب کوئی جانتا بھی نہیں، جو اس زمانے میں رائج تھا۔ اہل عجم نے خط توقیع سے خط تعلیق ایجاد کیا مولانا جامیؒ فرماتے ہیں۔

کاتباں را ہفت خط آمد بطرز مختلف
ثلث و ریحان و محقق نسخ و توقیع و رقاع
بعد ازاں تعلیق ان خط است کش اہل عجم
از خطِ توقیع استنباط کردند اختراع

ابن مقلہ نے ابتدائے زمانہ میں سلطنت کی طرف سے بعض امور متعلقہ انجام دیئے۔ اسکی قابلیت و کارگزاری ارکان خلافت پر ظاہر ہوئی تو بارگاہ خلافت کیجانب سے صوبۂ فارس کے کسی علاقہ کا حاکم مقرر کیا گیا، ایام حکومت میں اسنے اچھے اچھے کام انجام دیئے۔

لوگوں کو جود و سخا سے فائدہ پہنچایا، اہلِ فضل و ہنر کی قدر افزائی کی، اس وجہ سے لوگوں کے دلوں میں اسکی وقعت بڑھتی گئی۔ دار الخلافہ سے اسکو خلعت و انعام ملا۔ اسکے علاقہ حکومت کی وسعت بڑھا دی گئی۔ غرض دن دونی رات چوگنی ترقی ہوتی گئی، ایک مدت کے بعد اسنے دار الخلافت کا رخ کیا اور بغداد پہنچا۔ خلیفہ مقتدر کا زمانہ تھا۔ زمام وزارت ابوالحسن بن علی فرات کے ہاتھ میں تھی جو بڑا سخی تھا، جود و سخا کی بدولت لوگ اسے بحر مواج سے تشبیہ دیتے تھے، جب ابن فرات وزیر نے ابن مقلہ کو دیکھا کہ وہ جملہ فنون کے علاوہ رسم انشا، و مکاتیب میں نہایت کمال رکھتا ہے اور اظہار خیالات پر قادر ہے تو وزارت کے کل کام اسکے حوالے کیے اور حکم دیکر اب حاجت اپنا حال اس سے کہا کریں، وزیر خود بغیر اسکی اطلاع کوئی کام نہیں کرتا تھا، اب ابن مقلہ کا اقبال اور بھی چمکا۔ اسکی شادی بہت اچھے خاندان میں ہوگئی، جس سے اسکی قدر و منزلت روز بروز بڑھتی گئی۔ ایکزمانہ تک یہی حال رہا۔ آخر زمانے نے کروٹ بدلی، ابن فرات کے بہت سے دشمن پیدا ہوگئے اور اسکی شکایت خلیفہ سے کرنے لگے۔ ابن مقلہ کو ڈرا دھمکا کر وعدہ وعید سے اپنا ہمزبان بنالیا۔ ابن مقلہ مجبوراً ان لوگوں کے ساتھ ہوگیا چنانچہ خلیفہ نے ابن فرات کو معزول کرکے اسکو قید خانے بھیج دیا، اور علی بن عیسےٰ کو اسکی جگہ پر وزیر مقرر کیا، لیکن تھوڑے زمانے کے بعد خلیفہ کو اپنے فعل پر ندامت ہوئی اور علی بن عیسیٰ کو مقید کرکے ابن فرات کو دوبارہ وزیر مقرر کیا۔ ابن فرات ابن مقلہ کی احسان فراموشی و کفران نعمت دیکھ چکا تھا اسکو قید کر دیا اور ایک لاکھ اشرفیاں جرمانہ میں وصول کیں، یہ اشرفیاں ابن مقلہ کی بیوی نے جو بڑی دولتمند تھی اپنے شوہر کیطرف سے ادا کر دیں، ابن مقلہ ایک عرصہ تک مقید رہا اور اپنے ہاتھ سے کلام مجید لکھتا اور شعر و سخن سے اپنا دل بہلاتا رہا جب قید خانے میں رہتے رہتے ایک مدت ہوگئی تو اس نے یہ چند شعر لکھے ؎

نَرٰی حُرِمَتْ کُتُبُ الْاَخِلَّاءِ بَیْنَهُمْ

میں دیکھتا ہوں کہ آپس میں خط و کتابت حرام ہوگئی ہے

اَبُوْنٌ اَمِ الْقِرْطَاسُ اَصْبَحَ غَالِیًا

کیا یہ دوری کی وجہ سے یا کاغذ گراں ہوگیا

فَمَا کَانَ لَوْ سَاَلْتَنَا کَیْفَ حَالُنَا

کیا ہوتا اگر تم مجھ سے پوچھتے کہ میرا کیا حال ہے

وَقَدْ هَمَّتْنَا نَکْبَةٌ هِیَ مَا هِیَا

حالانکہ سخت مصیبت پہنچی ہے جو بیان سے باہر ہے

صَدِیْقُكَ مَنْ رَاعَاكَ فِیْ کُلِّ شِدَّةٍ

تمہارا دوست وہ ہے جو تمہارا خیال ہر سختی میں رکھے

وَکُلًّا نَرٰی فِی الرَّخَاءِ مُوَاسِیًا

ہم راحت کی حالت میں لوگوں کو دوست نہیں پاتے ہیں

فَهَبْكَ عَدُوِّیْ لَا صَدِیْقِیْ فَاِنَّنِیْ

فرض کرو کہ تم میرے دشمن ہو دوست نہیں،

رَاَیْتُ الْاَعَادِیْ یَرْحَمُوْنَ الْاَعَادِیَا

میں دیکھتا ہوں کہ دشمن بھی دشمن پر رحم کرتے ہیں

ابن مقلہ کے نصیب پھر جاگے کہ ابن فرات وزیر مارا گیا اور اسے قید سے رہائی ملی اور سلطنت کے بعض کام اسکے سپرد کیے گئے عہدہ وزارت پر علی بن عیسیٰ بحال کیا گیا، لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد وہ عہدہ وزارت سے معزول کیا گیا اور خلیفہ کی یہ رائے ہوئی کہ کل امور وزارت ابن مقلہ کے سپرد کیے جائیں، چنانچہ اسکو خلعت عطا کیا گیا اور کل اختیارات ملے تین برس تک نہایت اقتدار کیساتھ وزارت کے کام اسنے سرانجام دیئے اور سابقہ وزراء سے زیادہ سخاوت کی لیکن شومیِ قسمت کے آگے ایک نہ چلی، لوگ دشمن ہو گئے اور خلیفہ کا

یہاں تک بدظن کیا کہ خلیفہ نے ایک مبلغ خطیر جرمانہ میں وصول کرکے ابن مقلہ کو دارالخلافت سے باہر نکال دیا۔ یہ فارس چلا گیا جہاں اول اول ملازم رہا تھا، کچھ روز کے بعد عجیب انقلاب ہوا کہ خلیفہ مقتدر کو مونس خادم نے مار ڈالا، اور تخت خلافت پر القاہر باللہ جلوہ آرا ہوا۔ القاہر کے ہاتھ پر جس دن لوگوں نے بیعت کی اُسی دن القاہر باللہ نے ابن مقلہ کے پاس طلبی کا فرمان بھیجا۔ ابن مقلہ فرمان پاکر دارالخلافت کیجانب روانہ ہوا۔ دربار خلافت میں حاضر ہوکر خلعت وزارت پایا اور پہلے سے بھی زیادہ قدر و منزلت کیگئی۔

اس زمانہ سے پہلے خلافت عباسیہ کا زوال شروع ہو چکا تھا خاندان خلافت میں جو خلافت کے لائق ہوتے تھے وہ خلیفہ نہیں بنائے جاتے تھے بلکہ ارکان خلافت اپنے مطلب کے لوگوں کو خلیفہ بناتے تھے قاعدہ ہے کہ جب بادشاہ کمزور طبیعت کا ہو یا نالائق ہو تو ارکان خلافت اور امرائے سلطنت میں باہم دشمنی ہوجاتی ہے ہر امیر اپنا اقتدار بڑھانا چاہتا ہے اسکو نفس امور خلافت و ترقی و تنزل سلطنت سے بحث نہیں ہوتی بلکہ یہ منصوبہ باندھتا ہے کہ ایسا کونسا کام کیا جائے جسمیں نفع ہو اور کسکو خلیفہ بنایا جائے جو کٹ پتلی کیطرح اُنگلی کے اشارے پر ناچے۔ یہی حالت ابن مقلہ کے وقت میں تھی۔ چنانچہ مونس خادم اور علی بن بلیق دونوں قاہر کے خلاف باہم متفق ہوئے۔ لوگوں نے ابن مقلہ کے بارے میں خلیفہ سے یہ چغلی کھائی کہ اسکی علی بن بلیق سے دوستی ہے ابن مقلہ کو جب یہ خبر ہوئی تو وہ جان کے خوف سے روپوش ہو گیا۔ گمنامی کی حالت میں رہا کرتا تھا، کبھی کبھی ارکان سلطنت میں سے جن لوگوں سے دوستی تھی ملاقات کرتا اور خلیفہ القاہر کے خلاف ان کو آمادہ کرتا۔ اس نے ایک نجومی کو جس کی آمد و رفت سیما ترک (جو ارکان سلطنت میں سے تھا) دو سو اشرفیاں دیں اور کہا کہ تم سیما سے یہ کہکر کہ قواعد نجوم کے حساب سے اس سال قاہر کو خرابی ظاہر ہوگی اسکو قاہر کیطرف سے منحرف کردو۔ چنانچہ نجومی نے سیما کو کچھ ایسی پٹی پڑھائی کہ اسنے امرائے قاہرہ سے متفق ہوکر خلیفہ کو معزول کرکے اسکی آنکھوں میں سلائی پھیر دی، اور اُسی دن محمد بن مقتدر خلیفہ بنایا گیا جسکا لقب الراضی باللہ قرار پایا۔ اور یہ واقعہ ۶ جمادی الاول ۳۲۲ھ میں پیش آیا۔

جب الراضی باللہ خلیفہ ہوگیا تو اسنے بھی ابن مقلہ کو وزیر مقرر کیا۔ قلمدان وزارت سنبھالے زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ خلیفہ اس سے ناراض ہوگیا۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ اسکی علیحدگی کی تدابیر سوچنے لگا، مظفر بن یاقوت جو اسوقت رئیس اتراک تھا اور خلیفہ کو اپنی مٹھی میں لیئے ہوئے تھا اور ابن مقلہ سے حسد رکھتا تھا، اس نے دربار کے غلاموں کو حکم دیا کہ جسوقت ابن مقلہ دارالخلافت میں آئے گرفتار کرلو۔ چنانچہ ابن مقلہ دہلیز کو عبور کرنے بھی نہ پایا تھا کہ غلاموں نے اسے پکڑ لیا اور خلیفہ کو اطلاع دی۔ خلیفہ نے عبدالرحمن بن عیسیٰ کو وزیر مقرر کرکے ابن مقلہ کو اسکے سپرد کردیا، جس نے اسے بہت کچھ ایذا پہنچائی اور رہائی کے لیئے دس لاکھ اشرفیوں کا مطالبہ کیا۔ ابن مقلہ نے رقم مطلوبہ پیش کرکے گوشہ نشینی اختیار کی اور کلام مجید کی کتابت میں اپنا وقت صرف کرتا رہا۔

خلیفہ الراضی باللہ کے زمانہ میں ابن رایق ایک امیر تھا، اسنے رفتہ رفتہ اپنا اقتدار اسقدر بڑھایا کہ خلیفہ نے خطبہ میں اپنے نام کے بعد ابن رایق کے نام پڑھنے کا حکم دیا۔ دارالخلافت کی امیر الامرائی اسے عطا ہوئی۔ ابن مقلہ کی بدقسمتی دیکھئے کہ وہ بھی اسکا سخت دشمن نکلا۔ اسنے اپنے گماشتوں کو حکم دیا کہ ابن مقلہ اور اسکے بیٹے ابوالحسین کی املاک میں دست اندازی کریں اور ابن مقلہ کو تکلیف پہنچائیں۔ ابن مقلہ نے چند بار ابن رایق سے فریاد کی تو اسنے کچھ نہ سنا، آخر ابن مقلہ نے مجبور ہوکر خلیفہ کو ابن رایق کی شکایت لکھی اور اس کے ظلم و خیانت وغیرہ جرائم سے خلیفہ کو آگاہ کیا اور یہ بھی لکھا کہ اگر

کہ اگر وزارت مجھکو عطا کیجائے اور ابن رائق میرے حوالہ ہو تو تین لاکھ اشرفیاں پیش کرونگا۔ الراضی باسم لظاہر تو راضی ہوگیا اور یہ خطوط علی بن ہارون منجم ندیم خلیفہ کے پاس رکھے گئے، ابن مقلہ کو اطمینان ہوگیا اور یہ ارادہ کیا کہ کسی پوشیدہ طریقہ سے خلیفہ کے پاس جائے۔ درحقیقہ امور انجام دے۔ اہل نجوم کے قاعدہ کے موافق کوئی پوشیدہ کام کرنا ہو تو مہینے کی آخیر دو تین راتوں میں جبکہ چاند بالکل چھپ جاتا ہے انجام دیتے ہیں۔ ابن مقلہ نے نجوم کے قواعد پر بھروسہ کر کے اندھیری رات میں خلیفہ کے پاس جانیکا ارادہ کیا اور قدرت خداوندی پر کچھ توکل نہ کیا۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ماہ رمضان المبارک کی آخیر رات کو دارالخلافہ میں حاضر ہوا تو خلیفہ نے اس سے ملاقات نہیں کی بلکہ قید خانہ میں بھیجدیا گیا۔ صبح ہوتے ان حالات سے ابن رائق کو اطلاع دی۔ اور ابن مقلہ کے خطوط جو اس نے خلیفہ کو لکھے تھے سب دکھائے۔ ابن رائق خلیفہ کی اس عنایت کا بہت شکرگزار ہوا اور ابن مقلہ کی گرفتاری سے بہت خوش ہوا۔ ابن مقلہ کو قید خانے میں چودہ دن گذرے تھے کہ ۱۴ شوال ۳۲۶ھ میں خلیفہ نے حکم دیا کہ ابن مقلہ کو بری حالت سے حاضر کیا جائے۔ چنانچہ اسکی موجودگی میں خلیفہ نے ابن رائق کو باغیانہ خطوط حوالے کیئے۔ ابن رائق نے ابن مقلہ سے ان کے متعلق بازپرس کر کے خلیفہ سے درخواست کی کہ ابن مقلہ کا سیدھا ہاتھ کاٹ ڈالا جائے۔ خلیفہ تو ابن رائق کے ہاتھ میں کٹ پتلی بنا ہوا تھا رضامند ہوگیا۔ ارکانِ خلافت نے ہر چند ابن مقلہ کے دیرینہ حقوق یاد دلا کر سفارش کی اور عرض کیا کہ اسکا دایاں ہاتھ قطع نہ کرائیے کیونکہ اسنے اسی ہاتھ سے کئی کلام مجید لکھے ہیں اور کیسے کیسے پسندیدہ خطوط ایجاد کیئے ہیں، مگر خلیفہ نے کچھ نہ سنا اور ابن مقلہ کا دایاں ہاتھ کاٹ کر قید خانہ میں بھیجدیا۔ مگر بعد میں ابن مقلہ کی اس ناحق سزا پر خلیفہ کو ندامت ہوئی۔ حکیموں کو حکم ہوا کہ ایسا علاج کریں جس سے ابن مقلہ کی زندگی کو خطرہ نہ پہونچے، انہیں اطبا میں سے ایک طبیب ابوالحسن بن ثابت بن سنان بھی تھا۔ جس نے زمانۂ دراز تک علاج کیا تب کہیں ابن مقلہ کا زخم اچھا ہوا۔ طبیب مذکور کا بیان ہے کہ ابن مقلہ کے پاس اسکے اہل وعیال تک نہیں جا سکتے تھے اسلیئے ایک دن اسنے اپنے بیٹے ابوالحسین کا حال مجھ سے دریافت کیا۔ میں نے کہا صحت وسلامتی کے ساتھ ہے یہ سنکر وہ بہت خوش ہوا اور کچھ دیر بعد اپنے دست بریدہ کو دیکھ کر اپنی حالت زار پر رویا اور کہا۔

خَدَمْتُ بِهَا الْخُلَفَاءَ وَكَتَبْتُ بِهَا الْقُرْآنَ الْكَرِيْمَ
بِخَطَّيْنِ دَفْعَتَيْنِ تُقْطَعُ بِهَا كَمَا تُقْطَعُ
اَيْدِي اللُّصُوْصِ۔

(ترجمہ) میں نے اس ہاتھ سے خلفاء کی خدمت کی اور دو خطوں میں دوبار کلام مجید لکھا۔ اسطرح کاٹا گیا جسطرح چوروں کے ہاتھ کاٹے جاتے ہیں۔

طبیب موصوف کہتے ہیں کہ میں بہت دیر تک اُسکے پاس بیٹھا رہا اور تسلی دیتا رہا اور اُس سے کہا کہ یہ تیرا آخری صدمہ ہے عنقریب مصیبت راحت سے بدل جائیگی۔ ابن مقلہ یہ سنکر رونے لگا اور یہ شعر پڑھا

اِذا مامَاتَ بَعْضُكَ فَابْكِ بَعْضًا

جب کہ تیرا بعض حصہ ضائع ہو گیا، تو دوسرے حصہ کو رو

فَاِنَّ البعضَ مِنْ بَعْضٍ قَرِيْبُ

کیونکہ بعض حصہ بعض حصہ سے قریب ہے

کتب تواریخ میں مذکور ہے کہ جب ابن مقلہ کا زخم اچھا ہونا شروع ہوا تو اسکو یہ خیال ہوا کہ دل بہلانے کے لیئے کلام مجید لکھنے کا شغل رکھے چنانچہ قلم کو ایک خاص وضع سے کلائی پر باندھ کر لکھنا شروع کیا تھوڑے دن میں ایسی مہارت ہوگئی کہ پہلی تحریر اور اس تحریر میں کوئی فرق باقی نہیں رہا۔ اسی طرح اُلٹے ہاتھ سے بھی لکھتا تھا، لوگ اسکی تحریر دیکھکر حیران

رہ جاتے تھے، ایک شاعر کہتا ہے ؎

لَئِن قَطَعُوا اِحدٰی یَدَیہِ مَخَافَۃً
جب کہ اسکے ایک ہاتھ کو کاٹ ڈالا
لِاَقلَامِہٖ لاللسُّیُوفِ الصَّوَارِمِ
اسکے قلم کے خوف سے تلوار کے خوف سے نہیں
لَمَّا قَطَعُوا رَایًا اِذَا مَا اَجَلتَہٗ
البتہ اسکی رائے کو قطع نہیں کیا جو
تَلَاتَ الرَّدٰی بَینَ اللُّحٰی وَالغَلَاصِمِ
اسکی رائے پر عمل کیا جائے تو اسکے دشمن کی موت ظاہر ہو

جب ابن مقلہ کے دشمنوں کو معلوم ہوا کہ ابن مقلہ باوجود دست راست بریدہ ہونے کے ایسا عمدہ لکھتا ہے اور الٹے ہاتھ سے بھی اسی طرح لکھتا ہے تو ان کو خوف ہوا کہ مبادا پھر اسکو وزیر بنا دیا جائے اور وہ اپنے بدخواہوں سے بدلہ لے۔ اسلئے پھر خلیفہ سے اسکی شکایت کی اور کہا کہ ابن مقلہ نہایت عمدہ خوشخط لکھتا ہے، جو صدمہ اسکو سیدھا ہاتھ کٹنے سے پہنچا تھا۔ اس سے کوئی خیر اسکی حالت میں نہیں ہوا۔ اس سے بےخوف نہیں رہنا چاہیئے۔ اسمیں ابھی شر باقی ہے اور وزارت کا سودا ابھی دماغ سے نہیں گیا۔ خلیفہ نے کہا اس واقعہ کی تصدیق کیونکر ہو سکتی ہے۔ لوگوں نے کہا یہ حال اسوقت تحقیق ہو جائیگا جب آپ اسکے پاس یہ پیام بھیجیں کہ جو کچھ ہوا اس سے مجھے ندامت ہے اگر ممکن ہوتا تو میں اسکا تدارک کرتا تمہیں وزارت کی خواہش ہو تو پھر یہ عہدہ میں تمکو دیدوں لیکن جو صدمہ تمہارے دائیں ہاتھ کو پہنچا ہے اسکی وجہ سے وزارت کا کام کیونکر انجام دے سکتے ہو؟ سچ ہے جب آدمی کا زمانہ خلاف ہوتا ہو تو عقل پہلے رخصت ہو جاتی ہے، ابن مقلہ نے خلیفہ کے اس پیام کو صحیح سمجھ کر یہ جواب دیا کہ میرا دل و دماغ سب ٹھیک ہے میں اپنے شاگردوں سے لکھنے کا کام لونگا، اسکے علاوہ میں الٹے ہاتھ سے بھی ایسا لکھ دیتا ہوں جیسا کہ حالت صحت میں دست راست سے لکھا کرتا تھا۔ جب ابن مقلہ کا یہ جواب خلیفہ کے پاس پہنچا تو اس نے سمجھا کہ ابھی تک وزارت کا خیال سر سے نہیں گیا ہے۔ دشمنوں کے اغوا سے اسی دن مار ڈالا اور جہاں مقید تھا دفن کیا۔

لیکن ابن خلکان کا بیان ہے کہ جب ابن مقلہ کا زخم اچھا ہو گیا تو قلم کلائی پر باندھ کر لکھا کرتا تھا، اور اس سے اور خلیفہ سے وزارت کے بارے میں پوشیدہ طور سے سوال و جواب ہوا کرتے تھے۔ اسی زمانہ میں بجکم ترک جو ابن رائق کا دشمن تھا بغداد میں آیا، ابن رائق کو خوف ہوا کہ شاید بجکم ترک کی بدولت پھر ابن مقلہ کی حالت اصلاح پر آ جائے، اس خیال سے اسنے حکم دیا کہ ابن مقلہ کی زبان کاٹ دی جائے۔ ابن مقلہ اسی حالت میں ایک مدت تک قید خانہ میں رہا۔ آخر مرض اسہال میں مبتلا ہوا کوئی آدمی خدمت کیواسطے پاس نہ تھا۔ اس قید خانے میں ایک کنواں تھا جب پیاس کی شدت ہوتی تھی تو بائیں ہاتھ سے پانی کنویں سے بھر کر نکالتا تھا۔ دائیں ہاتھ کے منہ اور سر سے ڈوری تھامتا تھا تب بہزار مشکل کنویں سے پانی نکالتا تھا۔ آخر اسی حالت میں ابن مقلہ نے اتوار کے دن ۱۰ شوال ۳۲۸ھ میں انتقال کیا اور اسی جگہ دفن کیا گیا پھر نعش نکال کر اسکے اعزہ کے سپرد کی گئی۔

اسی کا قول ہے اَلشِّعرُ تَادُّبًا لَا تَکَسُّبًا الغِنَاءُ تَطَرُّبًا لَا تَطَلُّبًا۔ یعنی شعر تفنن کے طور پر کہنا چاہیے پیشہ کے طور پر نہیں۔ گانا دلی خوش کرنے کے لئے چاہیے نہ روپیہ کمانے کے لئے۔

ایک دن ابن مقلہ نے کھانا کھانے کے بعد ہاتھ دھو کر اپنے کپڑے کو دیکھا تو اسپر ایک جگہ زرد داغ حلوے کا آ گیا تھا فوراً سیاہی دوات سے لیکر دھبہ پر لگا دی جس سے زردی حلوے کی مٹ گئی اسوقت ابن مقلہ نے کہا۔ ذَالِکَ اَثَرُ شَہوَۃٍ

وَ ھٰذَا اَثَرُ مِنَّا عَلَی۔ یعنی وہ (حلوے کا داغ، خواہش نفس کا نشان تھا اور یہ سیاہی کا داغ) میرے ہنر کا نشان ہے۔ پھر یہ شعر پڑھا۔

اِنَّمَا الزَّعْفَرَانُ عِطْرُ الْعَذَارٰی

زعفران عورتوں کا عطر ہے

وَ مِدَادُ الدَّوَاةِ عِطْرُ الرِّجَالِ

اور دوات کی سیاہی مردوں کا عطر ہے

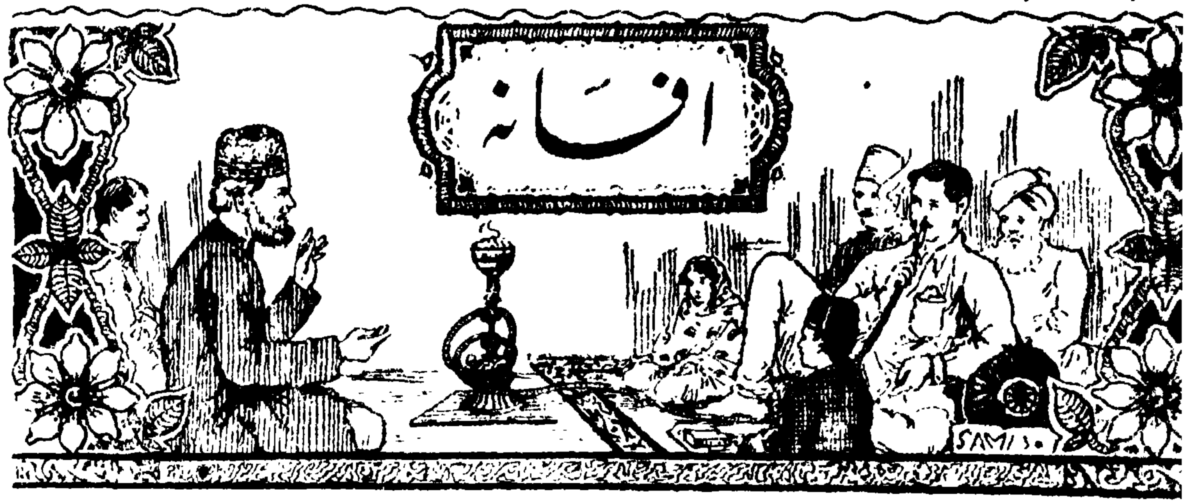
ابن مقلہ کے حسن خط کو کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے

خَطُّ ابْنِ مُقْلَةَ مَنْ وَعَاہُ مُقْلَتُہٗ

ابن مقلہ کے خط کو جس نے اپنی آنکھ کی پتلی میں جگہ دی

وَدَّتْ جَوَارِحُہٗ لَوْ اَصْبَحَتْ مُقَلًا

اُس کے سب اعضا چاہتے ہیں کہ کاش ہم سب پتلی ہوتے



بڑے دن کا تحفہ

(ترجمہ از جناب مولانا عبدالہادی خاں صاحب شاہجہانپوری)

ریاستہائے متحدہ کے صوبہ کیلفورنیا کا علاقہ ہے اور دسمبر کا آخری ہفتہ۔ بڑے دن کا زمانہ ہے۔ اس موسم میں یہاں خوب بارشیں ہوتی ہیں۔ اور نباتات اُگتی ہیں ایسے وقت میں بھاگتے دوڑتے بادلوں میں اگر کبھی آفتاب کو اپنی شعاعیں بھیانک پہاڑیوں پر ڈالنے کا موقعہ ملجاتا ہے تو اسکا اثر معجزہ سے کم نہیں ہوتا۔ اور فنا کے اندر سے بقا اور موت کی گود سے حیات پیدا اور نمایاں ہوتی لگتی ہے۔

وہی بادِ خزاں جو پیلے پیلے اور پرانے پتوں کے لیئے پیام موت تھی۔ نرم و نازک کلیوں کے لیئے نشو و نما کا باعث بن جاتی ہے برف گرنے سے جو ایک خموشی سی چھاگئی تھی، وہ اب نہیں رہی سب سے آخری بارش کے نشانات پر کسان کا ہل اُس زمین کو جوت چکا ہے جو اپنی کائنات کو جلدی سے باہر رکھدینے کے لیئے تیار ہو رہی ہے۔ شاید موسم کی انہیں خصوصیات کا اثر ہے کہ اب کے مصنوعی آرائشیں جن سے بڑے دن کے موقعہ پر کمرہ کو سجایا گیا ہے پھیکی پڑ چلی ہیں اور کچھ ادریئ سیر سی معلوم ہوتی ہیں۔ اور اُن گلاب کی تازہ کلیوں کے مقابلہ میں کہ جن کے نرم و نازک رخسار ہوا کے تھپیڑوں کی وجہ سے کھڑکیوں کے شیشوں پر آآکر بار بار لگتے ہیں۔ بالکل افسردہ اور ماند پڑ گئی ہیں۔

"اچھا"، کرسی کو آتش دان سے قریب کرکے اور آہستگی مگر اطمینان کے ساتھ اپنے اردگرد کے سنہرے سروں کے نیم دائرے پر نظر ڈالکر ڈاکٹر نے کہا۔ اس سے پہلے کہ میں اپنی کہانی شروع کروں میں چاہتا ہوں کہ یہ امر خوب اچھی طرح ذہن نشین کرلیا جائے کہ میرے سلسلۂ کلام میں لایعنی سوالات سے مداخلت نہ کیجائے اگر بیچ میں کوئی بولا تو سب سے پہلے سوال پر میں قصہ کہنا بند کردونگا اور خاموش ہوجاؤنگا دوبارہ پھر اگر ایسا ہوا تو پھر یہ میرا فرض ہوگا کہ سب صاحبان کو ایک ایک خوراک روغن بیدانجیر (کسٹرائیل) پلادوں جو صاحبزادے کہانی کے دوران میں اپنے پاؤں یا ہاتھ ہلائینگے تو اُسکے معنی یہ ہونگے کہ وہ اپنے اُس عضو سے تنگ آگئے ہیں اور وہ اُسے قطع کرانا چاہتے ہیں۔ ایسے اصحاب کی خدمت کے لیئے میں اپنے اوزار اپنے ساتھ لیتا آیا ہوں اور اگرچہ آج نوروز کا دن ہے لیکن نوسونکی مسرتیں

بھی۔ مجھے ایسے کام سے نہیں روک سکتیں جس کا تعلق میرے پیشے سے ہے۔ اب فرمایئے کہ کیا آپ صاحبان کامل خاموشی اور سکون کے ساتھ کہانی سننے کا وعدہ فرماتے ہیں؟

"جی ہاں جناب"، فوراً جمیع آوازوں نے جواب دیا اور ساتھ ہی تقریباً چھ مختصر سوالات ہوئے۔

"خاموش! بابو تم اپنے پانو سمیٹ کر بیٹھو اور تلوار سے کھیلنا بند کرو۔ فلورا ایک ننھی سی بیگم کی طرح میرے پاس بیٹھیں گی اور دوسروں کے لئے نمونہ ہونگی۔ اچھا، گیس کی روشنی دھیمی کر دو۔ بس اسقدر کافی ہے کہ صرف اتنی روشنی رہے کہ آگ ذرا اجاگر معلوم ہونے لگے اور کرسمس کی شمعیں نمایاں ہو جائیں۔ اچھا اب ہر شخص خاموش! اگر کوئی بچہ بادام توڑیگا یا اگر کوئی زور زور سے سانس بھی لیگا تو وہ کمرہ سے باہر نکال دیا جائیگا۔"

کمرے میں کامل سکون ہو گیا۔ بابو نے آہستہ سے اپنی تلوار ایکطرف رکھدی اور ہوشیاری کیساتھ اپنے پاؤں ٹھیک کر لئے۔ ننھی فلورا نے نازو انداز سے اپنے ننھے سے لباس کی جیب درست کر کے اپنا ہاتھ ڈاکٹر صاحب کے کندھے پر رکھدیا اور ڈاکٹر کے کھینچنے پر بالکل اسکے قریب ہو گئی۔ چھوٹے سے حبشی غلام ٹانگ ٹانگ نے جسے اس بیش بہا موقع پر مہمان خانہ میں بڑے دن کی خوشیوں میں شرکت کا موقع دیا گیا تھا، مجمع پر ایک ایسی مسکراہٹ کیساتھ نظر ڈالی جو نہایت خوش آیند اور فلسفیانہ تھی۔ کمرہ کے اس نوروز کا سکوت میں، جسمیں سدا بہار نئے پھولوں، دیوار کی صندوقچیوں اور سیرش اور دارنش کی مہک ایسی ملی جلی ہوئی تھی جس کا تجزیہ کرسکنا ناممکن تھا، اگر کوئی چیز مخل تھی تو وہ صرف انگیٹھی پر رکھے ہوئے اس فرانسیسی گھنٹے کی آہستہ آہستہ ٹک ٹک تھی جو ایک نہایت متناسب الاعضا بچی گولن کے سر پر رکھا ہوا تھا۔

اب سے تقریباً چار سال کا زمانہ گذرا ہوگا، ڈاکٹر نے کہا۔ جب مجھے ایک مخصوص شہر میں چند تقریریں سننے کے لئے جانا پڑا۔ وہاں ایک پروفیسر صاحب جو گو کٹ یقیدر غبی اور ضدی سے آدمی تھے، مگر ویسے ملنے کے قابل اور خلیق تھے۔ بڑے دن کی رات میں مجکو اپنے مکان پر مدعو کیا، مجکو جانے کی بڑی خوشی تھی، کیونکہ مجھے ایک لڑکے کے دیکھنے کا بڑا اشتیاق تھا جسکی عمر اسوقت صرف بارہ سال کی تھی مگر اسکے متعلق کہا جاتا تھا کہ وہ بہت ہی ہوشیار ہے۔ میں یہ نہیں بتا سکتا کہ کسقدر لاطینی اشعار وہ لڑکا ازبر سنا سکتا تھا۔ یا کسقدر انگریزی نظمیں اس نے خود کہی تھیں، کیونکہ اول تو تم مجھ سے فرمائش کر دگے کہ وہ سب تمہیں سناؤں۔ دوسرے لاطینی ہو یا انگریزی میرے سے میں شعر و سخن کا مبصر ہی نہیں ہوں، لیکن جلسہ میں ایسے ماہرین موجود تھے اور انھوں نے کہا کہ ایک بچہ کی بساط کا لحاظ کرتے ہوئے یہ نظمیں عجیب و غریب ہیں اور ان میں سے ہر ایک نے اسکے نہایت شاندار مستقبل کی پیش گوئی بھی کی۔ مگر اسکے باپ نے کچھ نہیں کہا۔ بلکہ اس پر جب کبھی اس قسم کی کوئی بات کہی گئی تو اس نے کچھ اسطرح اپنا سر ہلایا کہ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اسکو لوگوں کی اس رائے سے اتفاق نہیں ہے اور میں تم سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ وہ ایک عملی اور صرف واقعات کو ماننے والا آدمی تھا۔

پروفیسر صاحب کے مکان پر یہ محفل بہت دلچسپ تھی۔ ہمسایہ کے تمام بچے وہاں موجود تھے اور بچوں میں پروفیسر کا وہ بچہ بھی تھا جسے وہ ہوشیار رو برٹ کہکر پکارتے تھے۔ دبلا پتلا اتنا بڑا جیسے یہاں بابو ہے اور ایسا نازک اور خوبصورت جیسے میری بغل میں یہ فلورا۔ اسکے باپ کا مقولہ تھا کہ اسکی صحت کمزور ہے۔ وہ شاذونادر ہی ادھر ادھر دوڑتا بھاگتا یا بچوں کے ساتھ کھیلتا۔ بلکہ گھر ہی میں رہنے کو ترجیح دیتا اور گھر ہی میں اپنی کتابوں میں مشغول رہتا یا کچھ لکھتا رہتا تھا جیسے وہ نظمیں کہتا تھا۔

"اچھا !!" تو وہاں بھی ایک ایسا ہی درخت تھا۔ اور ہم سب ہنس بول رہے تھے، اور ان بچوں کو پکار رہے تھے جن کے تحفے درخت میں لگے ہوئے تھے کہ ایک بچہ نے کچھ پریشانی اور کچھ خوشی کی ملی جلی ایک چیخ ماری اور کہا کہ روبرٹ کے لیئے بھی ایک چیز ہے بتاؤ وہ کیا ہے ؟ ہم سب نے خیال دوڑایا کسی نے کہا ڈسک کسی نے کہا ملٹن کی نظم کا ایک نسخہ، سونے کا ایک قلم، عروضی لغت، مگر نہیں ایسی کوئی چیز نہ تھی۔ پھر کیا ؟

"نقارہ"

"ایک کیا ؟" ہر شخص نے سوال کیا۔

نقارہ۔ ڈھول کیطرح کا نقارہ ! جسپر روبرٹ کا نام لکھا ہو ہے"

سچ مچ نقارہ ہی اُس درخت پر تھا بھی، موزوں شکل کا چمکدار تانبے اور پیتل کا منڈھا ہوا نقارہ جسپر کاغذ کی ایک چپٹ لگی ہوئی تھی اور اُسپر لکھا ہوا تھا "روبرٹ کے لیئے"

ہم سب ہنسنے لگے، اور خیال کیا کہ خوب مذاق ہے۔ ایک نے کہا کہ روبرٹ اب تو تم دنیا میں ہلچل ڈال دو گے" "نظمیں لکھنے کے لیئے سوجھ پڑ گیا، بھوج پتر !" دوسرے نے کہا "روبرٹ کی آخری نظم چرمی جلد میں" - ! تیسرے نے فقرہ کسا "روبرٹ صاحب موسیقی قدیم کی کوئی گت بجا کر سنایئے" - ! چوتھی آواز آئی۔

اور علی ہذا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ روبرٹ بول سکنے پر قادر نہیں یا وہ ہونٹ چبا رہا تھا، اسکے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا۔ آخر کار وہ سسکیاں بھر کر رونے لگا اور کمرہ سے چلا گیا۔ اسپر جن لوگوں نے مذاق اُڑایا تھا وہ پشیمان ہوئے، اور ہر شخص پوچھنے لگا کہ یہ نقارہ درخت پر کسنے رکھا، لیکن کسی کو نہ معلوم ہو سکا یا اگر کسیکو معلوم بھی تھا تو وہ اُس عام ہمدردی کی وجہ سے جو اُس ذکی بچہ سے سب کو پیدا ہو گئی تھی، خاموش رہا۔ نوکر چاکر تک سے بلا کر پوچھا گیا مگر کوئی نہ بتا سکا تھا کہ وہ نقارہ کہاں سے اور کیونکر آیا، اور سب سے عجیب تو یہ بات تھی کہ پیش کیئے جانے سے پہلے کسی شخص نے اسکو درخت پر لٹکتے ہوئے بھی نہیں دیکھا تھا، اسکے لیئے میری رائے پوچھی ہے وہ یہ ہے مگر مہربانی فرما کر کوئی صاحب سوال نہ کریں تمہارے لیئے اسیقدر جاننا کافی ہے کہ روبرٹ بھر کوٹھے سے نیچے محفل میں نہ آیا اور محفل بھی جلدی سے اسکے بعد برخاست ہو گئی

میں ان باتوں کو بالکل بھول سا گیا تھا کیونکہ آئندہ موسم بہار میں جنگ بغاوت ہو پڑی اور میں ایک نئی فوج کیساتھ ڈاکٹر مقرر ہو کر محاذ جنگ پر بھیجدیا گیا، اثنائے سفر میں مجھے اُس شہر سے گذرنا ضرور تھا جہاں پروفیسر صاحب موصوف کا مکان تھا اور وہاں اُن سے میری ملاقات ہوئی۔ پروفیسر صاحب سے سب سے پہلا میرا سوال روبرٹ کے متعلق تھا۔ پروفیسر صاحب نے کسیقدر رنجیدہ ہو کر سر ہلایا اور کہا کہ وہ اچھا نہیں ہے۔ گذشتہ بڑے دن سے جب کہ آپ اُس سے ملے تھے وہ برابر کمزور ہی ہوتا چلا جا رہا ہے ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اپنی نوعیت کا یہ واقعہ بھی ایک ہی ہے اور بہت ہی عجیب ہے۔ اور اسپر بھی زور دیا کہ آپ ضرور جائیں اور اُسکو خود اپنی آنکھوں سے دیکھیں، کہ اس سے اسکی توجہ کسیقدر ہٹ جائیگی۔ اور یہ اُسکے لیئے اچھا ہو گا۔

چنانچہ میں پروفیسر صاحب کے مکان پر گیا اور روبرٹ کو آرام کرسی پر تکیوں کے سہارے لیٹا پایا۔ اُسکے گرداگرد اُسکی کتابیں پھیلی ہوئی تھیں اور ایک بات جو نسبتاً بہت عجیب سی معلوم ہوئی یہ تھی کہ وہ نقارہ جس کا میں نے تمہارے سامنے ذکر کیا ہے ٹھیک اُسکے سر پر ایک کھونٹی میں لٹک رہا تھا۔ اسکا چہرہ لاغر اور مرجھایا ہوا تھا اور اُسکے دونوں گالوں پر ایک سرخ داغ تھا اور اُسکی آنکھیں خوب چمکیلی اور خوب اچھی طرح کھلی ہوئی تھیں، مجھے دیکھکر وہ بہت خوش ہوا اور جب میں نے اسکو یہ بتایا کہ میں کہاں جا رہا ہوں تو جنگ کے متعلق اُسنے مجھ سے

ؐ بڑے دن کی خوشی میں عیسائی خاندانوں میں یہ دستور ہے کہ ایک درخت بنایا جاتا ہے اور اُس میں پھلوں کی بجائے گھر کے ہر بچہ کے لیئے ایک ایک تحفہ لٹکا دیا جاتا ہے۔

ہزاروں سوالات کر ڈالے۔ میں یہ خیال ہی کر رہا تھا کہ میں نے اسکی بیماری اور کمزوری کے خیالات کو اچھی طرح ادھر ہی طرف متوجہ کر دیا ہے کہ اُسنے بیاختہ میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور آہستہ سے کہا۔

"ڈاکٹر، تم ہنسو گے تو نہیں اگر میں تم سے کچھ کہوں؟"

میں نے کہا، ہرگز نہیں۔

پلنگ کے پہلو کیطرف اشارہ کرتے ہوئے جو دیوار میں لٹک رہا تھا اُسنے کہا آپ کو یہ نقارہ یاد ہے اور آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ یہ میرے پاس کسطرح آیا تھا۔ بڑے دن کے چند ہفتہ بعد میں یہاں تین ہفتہ سے پڑا تھا اور یہ نقارہ دیوار میں لٹکا رہا۔ اتفاق دفعۃً میں نے اسکو بجتے ہوئے سنا پہلے مدھم آواز میں اور رہ رہ کے ہوتے پھر جلد جلد اور زور زور سے یہانتک کہ اُسکی گمک سے گونج اُٹھا۔ وسط شب میں اکثر میں نے اُسے بجتے ہوئے سنا۔ مجھے کسیکی سامنے یہ قصہ بیان کرنیکی ہمت بھی نہ ہوئی۔ لیکن اُسوقت سے برابر اسے بجتے ہوئے سنتا ہوں؟

یہاں پہنچکر وہ رکا اور ایک منتظر نگاہ میرے چہرہ پر ڈالی،

پھر یوں گویا ہوا کہ بعض اوقات وہ نرم آواز سے بجتا ہے بعض اوقات زور سے لیکن یہ ہمیشہ ہوتا ہے کہ وہ رفتہ رفتہ ایک طویل گمک کیلئے تیز ہو جاتا ہے اور آواز اسقدر بلند اور چونکا دینے والی ہو جاتی ہے کہ میں اس بات کا انتظار کرنے لگتا ہوں کہ لوگ مجھ سے یہ پوچھنے کے لئے کہ کیا معاملہ ہے میرے کمرے میں آیا ہی چاہتے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے، "ڈاکٹر" میرا خیال ہے اور اس لفظ کو اُس نے مکرر آہستہ سے ادا کیا اور میرے چہرے کو ایک تکلیف دہ دلچسپی سے دیکھنے لگا۔ کہ میرے سوا اُسکی آواز کوئی اور نہیں سنتا ہے۔

میں نے بھی یہی خیال کیا مگر اُس سے پوچھا کہ کیا اُسنے کبھی رات کے علاوہ کسی اور وقت بھی اُسکی آواز سنی ہے؟

"ایک مرتبہ یا دو مرتبہ دن کے وقت بھی،" اُسنے جواب دیا۔ جب کہ میں لکھتا یا پڑھتا ہوا ہوں اور اُسوقت بڑے زور سے گویا کہ وہ ناراض ہے اور اسطرح کتابوں سے میری توجہ ہٹانا چاہتا ہے۔ میں نے اسکے چہرے کیطرف دیکھا اور اسکی نبض پر ہاتھ رکھا اُسکی آنکھیں بہت چمکیلی تھیں اور اُسکی نبض کسیقدر غیر منتظم اور تیز تھی۔ میں نے اُسکے سامنے یہ واضح کرنیکی کوشش کی کہ وہ کمزور ہے اور اُسکے حواس بہت ذکی ہیں جیسا عموماً کمزور لوگوں کے ہوتے ہیں اور یہ کہ نقارہ کے بجنے کی جو آواز اُسکے کان میں آیا کرتی ہے اُسکی اصلیت اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے کہ دماغی تکان کے وقت یا ایسے موقعوں پر کہ جب دماغ کسی امر پر غور کرنیکیلئے یکسو ہو، کان کے قریب کی رگ میں خون کی تڑپ سنائی دینے لگتی ہے، خاصکر جب کہ کان تکیہ پر رکھا ہوا ہو۔ اُس نے میری تقریر کو ایک ٹھنڈی اور یقین نہ کرنے کی مسکراہٹ کیساتھ سنا مگر میرا شکریہ ادا کیا اور تھوڑے دیر کے بعد میں اُس سے جدا ہو گیا زینہ سے اُترتے ہوئے میں پروفیسر صاحب سے ملا میں نے جو کچھ اس مریض کے متعلق میری رائے تھی اُن کے سامنے بیان کر دی اور اب تمہیں اس سے بحث نہیں ہونی چاہئے کہ وہ کیا تھی۔

پروفیسر صاحب نے کہا کہ جناب اسکو تازہ ہوا اور ورزش اور زندگی کے عملی تجارب کی ضرورت ہے۔ پروفیسر صاحب ویسے کوئی بُرے آدمی نہ تھے تاہم کسیقدر جلد باز اور عجلت پسند تھے اور جیسا کہ عام طور پر ہوشیار آدمی خیال کیا کرتا ہے وہ بھی یہی سمجھتے تھے کہ جو بات اُنکی سمجھ میں نہ آئے وہ ضرور لغو اور غیر صحیح ہے۔

اُسی روز میں نے وہ شہر چھوڑ دیا اور شفاخانوں اور میدان جنگ کی مصروفیتوں میں پھنسنے سے رابرٹ کے متعلق میں سب کچھ بھول گیا اور نہ اُسکے متعلق پھر کچھ سنا۔ یہانتک کہ ایک روز فوج میں اپنے ایک پُرانے ہم مکتب سے ملنے کا اتفاق ہوا، میرا یہ ہم مکتب پروفیسر صاحب کے

عاشق تھا اور اُسی کی زبانی معلوم ہوا کہ روبرٹ بالکل پاگل ہوگیا ہے اور ایک مرتبہ دورہ کی حالت میں گھر سے لاپتہ ہوگیا اور چونکہ اسکے بعد سے وہ کبھی نہیں ملا اسلیئے یہ خطرہ محسوس ہونے لگا ہے کہ شاید وہ کسی دریا میں ڈوب کر مرگیا ہے۔ جیسا کہ تم خیال کرسکتے ہو اس خبر نے اسوقت میرا دل ہلا دیا، اور میرے رنج والم کی کچھ انتہا نہ رہی لیکن خوش قسمتی سے چونکہ اسوقت میں جنگ کے لرزہ براندام کردینے والے ہیبتناک حالات میں اپنے دن گذار رہا تھا اسلیئے میرے پاس نہ اسقدر وقت تھا اور نہ موقع کہ ننھے روبرٹ کو اسوقت بیٹھکر روتا۔

یہ خبر سننے کے بعد زیادہ دن نہیں گذرے تھے کہ ہم کو ایک بہت زبردست جنگ کرنی پڑی جسمیں ہماری فوج کا ایک پورا دستہ کام آگیا۔ مجھے میرے لشکر سے میدان جنگ جانے کے لیئے حکم دیا گیا تاکہ موقع پر جو ڈاکٹر کام کررہے تھے اُن کا ہاتھ بٹا سکوں کیونکہ کام اسقدر زیادہ تھا کہ وہ لوگ کسیطرح سرانجام نہیں دیسکتے تھے، جب میں گھاس بھرنے کے اُس کوٹھی میں پہنچا کہ جو عارضی طور پر شفا خانہ کا کام دیرہا تھا تو میں فوراً کام میں لگ گیا

یہاں پہنچکر ڈاکٹر صاحب کچھ سوچ میں پڑ گئے اور یکایک خوفزدہ بابو کے ہاتھ سے اُسکے کھیلنے کی چمکتی ہوئی تلوار لیکر اور سب کو دکھا کر کہنے لگے کہ "آہ بابو! یہ خوبصورت کھلونے فی الحقیقت کیسی وحشیانہ اور ظالمانہ حقیقتوں کی نقلیں ہیں"۔

بانداز پر تلوار کے میان سے ایک نقشہ کھینچتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے آہستہ آہستہ اپنا قصہ پھر شروع کیا کہ میں مرہم پٹی کرنے کے لیے ایک لمبے چوڑے اور موٹے تازے سپاہی کیطرف بڑھا جسکے دونوں کولہے بہت بری طرح زخمی تھے، مگر اُسنے ہاتھ اُٹھا کر درخواست کی کہ پہلے آپ ان لوگوں کی امداد کیجئے جو مجھسے زیادہ امداد کے حاجتمند ہیں۔ اول اول میں نے اُسکی درخواست پر کوئی توجہ نہیں کی کیونکہ فوج میں اس قسم کا ایثار ایک عام بات ہے مگر وہ بدستور مصر رہا "خدا کے لیئے ڈاکٹر صاحب مجھے چھوڑ دیجئے ہماری فوج کا نقارہ نواز لڑکا جو ابھی محض بچہ ہی ہے مر رہا ہے یا شاید مر بھی چکا ہو۔ آپ جائیے اور پہلے اسکو دیکھئے وہیں پڑا ہوا ہے اُسنے ایک سے زیادہ جانیں بچائی ہیں، تباہی اور مصیبت کے اس طوفان میں بھی صبح اُسنے اپنی جگہ نہ چھوڑی اور سچ تو یہ ہے کہ ہماری فوج کی عزت ہی اُس نے بچائی، سپاہی کے فحوای کلام کی بجائے اُسکے طرز ادا سے میں متاثر ہوا اور جب آس پاس پڑے ہوئے دوسرے زخمیوں نے اس بیان کی تائید کی تو میں اُسے چھوڑکر وہاں گیا جہاں وہ طبل نواز لڑکا اپنے طبل کو سینے سے لگائے پڑا ہوا تھا میں نے اُسکے چہرے پر ایک ہی نظر ڈالی تھی ......

"ہاں ہاں بابو تمہارا خیال ٹھیک ہے" یہ نیچے بھی سب صحیح سمجھے ہیں۔

وہ واقعی وہی روبرٹ تھا، وہی شاعر اور ذہین روبرٹ!

اسپر نظر پڑنے کے بعد نہ مجھے نہ اُس صلیبی نشان کے دیکھنے کی ضرورت تھی جو دوسرے ڈاکٹر نے یہ ظاہر کرنے کے لیئے کہ اسکو بہت جلد امداد پہنچانے کی ضرورت ہے اُسکے پاس ایک تختہ پر بنا دیا تھا، نہ اُس زخمی سپاہی کے دلدوز سفارشی الفاظ کی اور نہ اُس خاک مٹی پر نظر ڈالنے کی ضرورت تھی جو اُسکے بھورے بالوں میں لپٹ گئی تھی اور بزبان حال کہ رہی تھی کہ اُسکی حالت بہت ہی خراب اور مایوس کن ہے۔ ایک عالم بے اختیاری میں میں اسکی طرف دوڑا اور اُسکا نام لیکر پکارنے لگا۔ میرا خیال ہے کہ اُس نئے منظر کو دیکھنے کے خیال سے جو اُسکے سامنے آنیوالا تھا اُس نے خوب اچھی طرح آنکھیں کھول کر دیکھا اور مجھے پہچانا، آواز تو کہاں تھی کچھ ہونٹ ہلتے ہوئے معلوم ہوئے میں نے اپنا کان قریب کردیا تو بمشکل یہ سمجھ میں آیا کہ وہ کہہ رہا ہے۔ اب شاید آپ بھی مجھے کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔

میں تم سے جھوٹی میدیں نہ دلا سکا میں اس سے کچھ بھی نہ کہہ سکا

صرف میں نے اسکا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبا لیا، ورنہ کہتا رہا شاید آپ والدہ سے ملیں گے، اُن سے درخواست کیجیئیگا کہ مجھکو معاف کردیں میں درحقیقت قصوروار ہوں۔ بہت دنوں بعد یہ بات میری سمجھ میں آئی کہ یہ نقارہ ترسے دن کی شب میں میرے پاس کیوں آیا تھا؟ اور کیوں ہر شب وہ پکارتا تھا؟ نیز یہ کہ وہ کیا کہتا تھا؟ اسوقت میں سب کچھ جانتا ہوں اب وہ مقصد پورا ہو چکا، اور میں مطمئن ہوں، والدہ صاحبہ سے عرض کیجیئیگا۔ جو کچھ ہوا اسی میں بہتری تھی اگر میں زندہ رہتا تو اُن کو پریشان کرنیکے سوا شاید اور کچھ نہ کرسکتا۔ اور میرا دل اندر سے کہہ رہا ہے کہ بس جو ہو گیا وہی درست ہے"

تھوڑی دیر تک وہ خاموش پڑا رہا پھر میرا ہاتھ پکڑ کر اس نے کہا! میں نے سننا چاہا لیکن زخمیوں کی کراہ کے سوا اور کچھ سنائی نہیں دیا۔ کمزور آواز میں اس نے کہا، کیا تمہیں نقارہ کی آواز سنائی نہیں دیتی؟ نقارہ، مجھے بلا رہا ہے جہاں نقارہ

پڑا ہوتا تھا اُسنے اسطرح اپنا ہاتھ بڑھایا جیسے کہ اُسے سینہ سے لگائیگا یہ طبلی کی آواز ہے، کیا آپ کو سنگینوں کی چکا چوند نظر نہیں آتی؟ اُنکے چہرے چمک رہے ہیں وہ ہتھیاروں کی نمائش کر رہے ہیں جنرل آرہا ہے، لیکن مجکو اسکا چہرہ اسوجہ سے نظر نہیں آتا کہ اُسکے چہرہ کے گرد بڑی روشنی ہے۔ وہ مجھے دیکھ رہا ہے۔ وہ ہنس رہا ہے اور ایک مقدس نام جو کبھی بچپن میں اسنے سیکھا تھا ادا کرتے ہوئے اسنے بڑی تکان اور تکلیف کے ساتھ تختے پر اپنے پاؤں پھیلا دیئے اور ہمیشہ کے لیئے خاموش ہوگیا۔.......

بس اب مجھ سے اور کچھ مت پوچھو۔

نہیں بالکل نہیں - تمہیں یہ سوچنے کی کیا ضرورت ہے۔

ہائیں میرا داس اور آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے کون بیٹھا ہے؟ ننھی فلورا! میری پیاری بچی! اچھا اب سب بچے ملکر میرے لیئے دعا مانگو! میری گولیوں کی ڈبیا کدھر گئی؟



تعلیم نسواں کی ضرورت

(از محترمہ عزیزیہ خاتون صاحبہ بنت جناب قاضی منعم الدین احمد صاحب)

اگرچہ تعلیم کی اہمیت اور فوائد سے اہل ہند کا تعلیم یافتہ طبقہ اب کافی طور پر واقف ہو چکا ہے مگر ابھی تک تعلیم نسواں کیطرف اسقدر توجہ نہیں کیگئی ہے جسقدر ضرورت تھی، خدا خدا کر کے اب اتنا ہوا ہے کہ ہمارے لبعض پرچوں میں اس مسئلے پر بحث ہونے لگی ہے۔ اکثر لوگوں کی رائے موافق نظر آتی ہے مگر اخباروں اور رسالوں کی موافقت سے کیا فائدہ جب کہ عملی طور پر ہم نے کوئی عملی اور قابل ذکر قدم ابتک نہیں اُٹھایا ہے اور ہماری قوم کی اکثریت اس اہم ضرورت کو رفع کرنے کے لئے مجموعی طور پر راغب نہیں ہوئی ہے۔ میرا خیال تو یہانتک ہے کہ بہت سے قدامت پسند خاندانوں میں تو کسی نے اس ضرورت پر غور ہی نہیں کیا ہے، اسلئے میں چاہتی ہوں کہ اس مضمون کے ذریعہ تعلیم یافتہ اصحاب کی مدد سے میں اپنی آواز غیر تعلیم یافتہ طبقے تک پہونچاؤں ممکن ہے اسکا اثر یہ ہو کہ کچھ لوگ اسطرف آمادہ ہو جائیں میں اس مضمون میں صرف تعلیم نسواں کی ضرورت پر بحث کروں گی اور اگر اسکی طرف توجہ کیگئی تو شاید آیندہ کچھ اور لکھنے کی جرأت کر سکوں۔

مردوں کے لئے تعلیم جسقدر ضروری ہے اس سے بدرجہا زیادہ اسکی عورتوں کو ضرورت ہے اسلئے کہ ہر شخص کی ماں ایک ہی ہوتی ہے۔ اگر وہ تعلیم یافتہ ہوگی تو اُسکی اولاد خواہ لڑکا ہو یا لڑکی تربیت یافتہ ہوگی۔ جاہل ماں تربیت اولاد کے فرائض خوبی کیساتھ انجام نہیں دیسکتی بعض لوگوں کا خیال ہے کہ پڑھانے سے لڑکیاں بگڑ جاتی ہیں بے شرم اور خودسر ہو جاتی ہیں۔ اُنکا یہ خیال غلط معلوم ہوتا ہے کیونکہ اگر ایک تعلیم یافتہ لڑکی کوئی خلاف تہذیب و شرافت کام جان بوجھکر کرسکتی ہے تو غیر تعلیم یافتہ ہونے کی حالت میں ایسے اور بھی زیادہ خطرناک حرکت سرزد ہو جانیکی توقع کیجا سکتی ہے ماسوا اسکے اولاد اپنی ماں کے خیالات کا آئینہ ہوتی ہے، اگر ماں جاہل اور تربیت اولاد کے عمدہ طریقوں سے ناواقف ہوگی تو اُسکا اثر اولاد میں بھی ضرور سرایت کریگا اور بڑے ہو کر لڑکی یا لڑکے نے کچھ پڑھ لکھ بھی لیا تو بھی خیالات کی کمزوری اُسکے دماغ سے نہیں نکل سکتی۔ کیونکہ جو باتیں بچہ ماں کی گود میں سیکھ لیتا ہے اُسکا

مذہب، قوم اور وطن تو کیا خود اپنے کام بھی نہیں آسکتیں۔ نہ عزت کسب کر سکتی ہیں اور اپنی اولاد کا پیٹ پال سکتی ہیں۔ وہ عورت جو پڑھی لکھی ہو وہ محلہ کی لڑکیوں کو پڑھا کر اپنی اور اپنی اولاد کی پرورش کر سکتی ہے۔ اور اگر خدا نے اُسے اتنا دیا ہے کہ محنت کی کچھ ضرورت نہیں تو وہ بیکار کی اور رنج میں بھی کام اور خوشی کی کوئی نہ کوئی صورت نکال سکتی ہے گھر اور محلہ کی لڑکیوں کو پڑھانا شروع کر دیا تو دل بہل جائیگا۔ دوسرے دن لڑکیاں علم سے فیض یاب ہونگی وقت آسانی سے گذر جائیگا ورنیکی کیے جو فرحت انسان کو حاصل ہوتی ہے وہ مفت میں میسر آئیگی میں نہیں سمجھ سکتی کہ باوجود ان گرانبہا فوائد کے کیوں عورتوں کی تعلیم ہمارے قوم میں عام نہیں ہے؟ ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ مستورات کی تعلیم عام کرنے کی کوشش کرے۔ کیونکہ ہماری قوم جبھی ترقی کریگی جب ہر گھر کی عورتیں تعلیم یافتہ ہونگی۔

پارہائے جگر

از جناب بابو شیام موہن لال صاحب جگر بریلوی

جان اُن پر نثار کرتا ہوں
مژدہ اے زندگی کہ مرتا ہوں

شوق نے کر دیا ہے دیوانہ
ذرے ذرے کو سجدہ کرتا ہوں

دل میں دیتا ہوں عوتیں غم کو
اپنا پیمانہ آپ بھرتا ہوں

آج قابو نہیں رہا دل پر
ہوک اُٹھتی ہے نالہ کرتا ہوں

لا رہا ہوں اُنہیں تصور میں
اپنے خاکہ میں رنگ بھرتا ہوں

ہو نہ جائے یہ باعث پندار
تیرے لطف و کرم سے ڈرتا ہوں

کیا کہوں زندگی کا حال جگر
جبر سہتا ہوں ضبط کرتا ہوں

ضبط سے غم فزوں نہ ہو جائے
ہوتے ہوتے جنون نہ ہو جائے

چشم تر داغ ہے نمائش عشق
آستین لالہ گوں نہ ہو جائے

چارہ جوئی سے دل لرزتا ہے
اور حالت زبوں نہ ہو جائے

گفتگو دشمن تحمل ہے
سر دسوز دروں نہ ہو جائے

عشق بیگانۂ مآل رہے
دل اگر رہنموں نہ ہو جائے

جام ہے زہد و طاعت و تسبیح
دل کو جیب تک سکوں نہ ہو جائے

تابع دل جگر اسے رکھیے
معصیت جوش خوں نہ ہو جائے

بیٹھے ہیں ہم تصور جاناں کیے ہوے

(از جناب نظیر بریلوی)

دل ہی نہیں حشر کا ساماں کیے ہوے
آنکھیں بھی ہیں تہیہ طوفاں کیے ہوے

پہلو میں اُنکے تیر کو مہماں کیے ہوے
بیٹھا ہوں اپنے درد کا درماں کیے ہوے

اب آرزو سے ربط ہے کس بد نصیب کو
برسیں ہوئی ہیں یاس کو مہماں کیے ہوے

تم سامنے ہو لاکھ فریب نظر سہی
بیٹھیں ہیں ہم تصور جاناں کیے ہوے

پھر آستانِ یار پہ بیٹھا ہوں منتظر
قربانِ یک نظارہ دل و جاں کیے ہوے

ہے طول شرحِ قید قفس کا یہ اختصار
مجبوریاں تھیں مائلِ زنداں کیے ہوے

اے حشر یوں ہی نزع کا عالم رہے نظیر
بیٹھے رہیں وہ بال پریشاں کیے ہوے

مآلِ آرزوے زندگانی دیکھتے جاؤ
تماشاے نشانِ بے نشانی دیکھتے جاؤ

دفورِ غم سے اشکوں کی روانی دیکھتے جاؤ
ہوا جاتا ہے اونچا سر سے پانی دیکھتے جاؤ

تم اپنی سرد مہری کی نشانی دیکھتے جاؤ
کہ اب ٹھنڈی ہے شمع زندگانی دیکھتے جاؤ

سُنے ہونگے کبھی تمنے قصص صبح محشر کو
اب اک مہجور کی شامِ جوانی دیکھتے جاؤ

یہی آنکھیں ہیں جنکو کارگاہِ یاس کہتے ہیں
یہیں بنتا ہے خون دل کا پانی دیکھتے جاؤ

قطعاتِ اکبر

(از جناب پروفیسر محمد اکبر خان صاحب حیدری)

جہاں بزمِ ہستی کا امکان مٹے گا
خدا کی ضرورت کا اعلان ہوگا

خدا سے کیا جس نے دنیا کو واقف
یقیناً وہ انسان انسان ہوگا

مشتعل سرمایہ داری اور نیرِ جہاں بنا!
اس سے بڑھ کر اور کیا اب ہوگی توہینِ حیات؟

بن کی ہستی ہیں نہ تنہا جب رشتی کا جنوں
بن گئی آزادی ہی آزادی کی کل کائنات



"باب" اور اُسکا فلسفۂ مذہب

(از جناب سید امین الدین صاحب جلالی شاہجہانپوری)

ابتداء عالم سے اسوقت تک دنیائے وجود میں ہزاروں ادیان وملل اپنی ظاہری اور صوری بوالعجبیوں کے ساتھ لوگوں کے عقل ودماغ کو تسخیر کرتے ہوئے جلوہ گر ہوئے، لیکن کچھ عرصہ کے بعد باد مخالف کے اثرات سے بحر گمنامی میں کچھ اسطرح غرق ہوگئے کہ آج ان میں سے بہتوں کے ناموں سے بھی دنیا آشنا نہیں، اگر ان کے نتائج اور عواقب کی فہرست بفرض محال تیار کیجائے تو ایک سلسلہ لامتناہی اور دفتر بےپایاں بھی غالبًا اسکے لیے کافی نہ ہوگا۔

ہر کہ آمد عمارتے نو ساخت

کے نظریہ اور اصول کے موافق ہر ایک مصلح ملت اور قائد مذہب نے نئے نئے اصول وآئین اور طرح طرح کے اساسی اور بنیادی ضوابط ایجاد کیے، اور ان کو مقبول عام بنانے میں اپنا ایڑی چوٹی کا زور صرف کردیا لیکن مشیت، فطرت اور نیرنگیٔ قدرت انہیں سے اکثر رہبران ومصلحین کا مسکرا مسکرا کر تماشا دیکھتی رہی۔۔۔ چونکہ انمیں سے اکثر کے اندر آفتاب حق وصداقت کی جھلک تک نہ پائی جاتی تھی اسلیئے۔ چند روز اپنی اولوالعزمیاں اور بلند حوصلگیاں دکھلا کر ہمیشہ کے لیئے صفحۂ دنیا سے حرف غلط کیطرح مٹ گئے اور کچھ برائے نام باقی رہگئے ہیں۔ اسی نہج کے مصلحین ملت میں سے ایک زبردست مگر گمنام ہستی کے چند مخصوص واقعات جوکہ ناظرین "سعید" کی دلچسپی اور حقیقی معلومات کا ذریعہ ہوں پیش کرتا ہوں۔

بانی مذہب کے مختصر حالات زندگی

محمد علی نام، باب خطاب، قوم سید سنہ ۱۸۱۹ء میں بمقام شیراز پردہ عدم سے عالم تکوین میں آیا، خاندانی پیشہ تجارت تھا، خود بھی اسی تجارت کو کسب معاش کے لیئے اپنا سلسلہ بنایا۔

سن بلوغ کو پہنچکر سید کاظم رشتی سے جوکہ اُس زمانہ کے جید اور متبحر علماء میں سے تھے، تلمذ اختیار کیا سنہ ۱۸۴۰ء میں اپنے بنیادی اصول وضوابط کو خلق کے سامنے پیش کیا اور اسی سن میں مسیح ومہدی ہونیکا بھی دعوےٰ کیا۔

سنہ ۱۸۴۴ء میں حج بیت اللہ کی زیارت کا شرف حاصل کیا، اور واپسی پر بحکم سلطانی گرفتاری عمل میں آئی۔

سنہ ۱۸۴۴ء سے سنہ ۱۸۴۹ء تک گویا پانچ سال صفہان و طارق میں اسیری کی مصیبتیں جھیلیں، حالتِ اسیری میں "باب" نے توبہ نامہ دربارِ شاہی میں پیش کیا جسکی وجہ سے رہائی مل گئی۔ مگر جب دوسری مرتبہ پھر یہی دعویٰ کیا تو مذہبی عالموں کے اصرار سے بادشاہ نے سنہ ۱۸۵۰ء میں "باب" مذکور قتل کروا دیا۔

وجہ شہرت

اسکو کبھی کبھی صرع یا مالیخولیا کا دورہ پڑتا تھا۔ چونکہ ایشیا کے سادہ لوح دماغوں کی یہ عام ذہنیت و خاصیت ہے کہ دیوانوں کو بہت جلد صاحب الہام اور حاملِ وحی خیال کر لیا جاتا ہے، اسلئے بقول بعض یہ دیوانگی ہی اسکے آسمانِ شہرت میں چار چاند لگانیکا باعث ہوئی۔ شاہزادہ ناصر الدین جب سریر آرائے سلطنت ہوا تو اُسنے اس فرقہ کی بابت ایک زبردست تحقیقاتی مجلس مقرر کی، اس تحقیق و تفتیش کے نتیجہ پر جب اس گروہ کی سرکشی ثابت ہوگئی تو بہت ہی سخت سزائیں اسکے متبعین کو دیگئیں، غرض کہ ان دونوں باتوں سے اس گروہ کو چہار دانگ عالم میں خاص شہرت و نمود حاصل ہوگئی۔

"باب" کی ترقی کے وجوہ اور "قرۃ العین" کی کارگذاریاں"

"باب" کی عرصۂ دراز کی قید اور اُسکی ہلاکت اُسکے اصول و آئین کی تبلیغ و اشاعت میں بہت ہی کار آمد اور معاون ثابت ہوئی۔

اس بارہ میں اسکو قرۃ العین کی فصاحت و بلاغت سے بھی جسکی علمی قابلیت کا دنیائے علم میں طوطی بول رہا تھا بہت کچھ مدد ملی۔ یہ ایک شریف النسل نوجوان خاتون تھی جس نے سب سے پہلے "بابی" مذہب کی غلامی کا طوق اپنے گلے میں پہنا تھا، جب اسکی فصاحت و بلاغت اور منطقیانہ دلائل و براہین نے ایرانیوں کے بحر ایمانی میں جزر کی کیفیت پیدا کردی تو یہ عبرتناک طریقہ سے قتل کردیگئی، اسکے واقعۂ قتل کے بارہ میں واقعہ نویسوں میں سخت اختلاف ہے، بعض کی رائے ہے کہ "نذر آتش" کردیگئی، اور بعض کا خیال ہے کہ "دار و رسن" سے سابقہ پڑا۔

مگر ڈاکٹر "پالک"، جو کہ اس واقعہ کا بچشم خود مشاہدہ کرنیوالوں میں سے ہے۔ اپنی کتاب موسومہ "سرزمین ایران اور اُسکے باشندے" میں بالتفصیل لکھتا ہے کہ "اس نوجوان حسینہ اور فاضلہ نے اپنی موت کو ایسی خندہ پیشانی اور کشادہ دلی سے برداشت کیا کہ جو انسانی قوت تحمل سے باہر ہے" مگر نہ معلوم کہ اس واقعہ نگار نے "قرۃ العین" کی سانحۂ موت پر مبصرانہ روشنی کیوں نہیں ڈالی۔

دوسری جگہ پر یہی ڈاکٹر لکھتا ہے کہ "نہ معلوم اسکے قتل میں کونسی برقی قوت موجود تھی، کہ اس واقعہ کے وقوع پذیر ہوتے ہی انتہائی تیزی کے ساتھ تمام ایران اس مذہب کے رنگ میں رنگ گیا"، آگے چلکر لکھتا ہے کہ "ایران کے صرف ادنیٰ اور نیچے طبقے کے لوگ اسمیں شریک نہیں ہوئے، بلکہ تعلیم یافتہ اور امرا بھی اس فرقہ میں شامل ہونے لگے۔ ایران کی آبادی کا ایک حصّہ جو کہ اسکے اصول و ضوابط کے اثرات سے متاثر نہیں ہوا وہ صرف فرقۂ نصیریہ اور عائی تھا"

ڈاکٹر "پالک" نے اس بیان میں اپنی مغربی حکمت عملی سے اچھی طرح کام لیا ہے۔ ڈاکٹر "پالک" کے اس بیان سے بجز اسکے دوسرا کوئی مقصد و مطلب نہیں معلوم ہوتا کہ اسلامی اصول و آئین کو ناکارہ ثابت کیا جائے اور اسلام کی ترقی پذیر برقی قوت کے اثرات کو لوگوں کے دلوں سے دور کیا جائے۔

حالانکہ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے اور تاریخ کے اوراق اس

دعوے کے شاہد ہیں کہ اس گروہ کے تبلیغی پذیرائی و جوش کو بہت جلد دبا دیا گیا تھا۔

اگر اسکے بیان کو کچھ وقعت دی جائے تو سب سے پہلے یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ "آخر وہ کونسی طاقت تھی کہ جس نے اس گروہ کا سرزمین ایران سے قلع و قمع کیا تھا۔ غرضکہ اسکا مذکورہ بالا فقرہ مذہبی موشگافیوں کا مظاہرہ ہے۔

اگرچہ اس مذہب نے ایران سے گذر کر تعبد از ہند اور شام و یورپ میں بھی قدم رکھا، مگر فطرتاً کچھ اسقدر مخالف واقع ہوئی تھی کہ اس گروہ کو کہیں بھی فروغ و معراج اور قبولیت عامہ کا شرف خصوصی حاصل نہیں ہوا۔

ہندوستان چونکہ اپنی معروضہ آزادی کے اعتبار سے "انا الحق" کہنے والوں کا مصداق بنا ہوا ہے۔ اسلئے اس فرقہ نے یہاں کی آزاد اور موافق فضا کو دیکھکر اپنے پاؤں جمانے کی ان تھک کوشش و سعی کی۔

مگر یہاں احمدیہ جماعت کی رقیبانہ روش نے اسکو اپنے مقاصد میں خاطر خواہ کامیاب نہ ہونے دیا۔

احمدیہ جماعت اس گروہ کی اتنی زبردست مخالف واقع ہوئی تھی کہ ہر ہر قدم پر خار راہ کا کام دیتی رہی، ان دونوں جماعتوں کے عقائد کچھ اسطرح پر متضاد واقع ہوئے ہیں کہ ان میں ہر وقت کشیدگی اور ان بن رہتی ہے۔

احمدیہ جماعت کا دعویٰ ہے کہ مرزا غلام احمد ہی حامل مہدویت تھے، اور یہ گروہ یہ کہتا ہے کہ اس مرتبہ سے صرف "باب" ہی فائز المرام تھے اسلئے ان دونوں گروہوں میں تفریق و تشتیت کی ایسی وسیع خلیج حائل ہے جسکی وجہ سے یہ دونوں ایک دوسرے کو فنا کر دینے کی تگ و دو میں لگے رہتے ہیں۔

باب کی تعلیم صرف دینی امور پر ہی مبنی نہ تھی بلکہ کچھ ملکی مقاصد و مفاد بھی مدنظر تھے، ایران میں چونکہ صوبوں کو خود مختار حکومت حاصل تھی اور ان کے ناظم سیاہ و سفید کے مالک بنے بیٹھے تھے، کوئی بازپرس کرنیوالا نہ تھا۔ جو کچھ ان کے دل میں آتا وہی ہوا کرتا تھا۔ اگر مرکزی حکومت بازپرس کیجانب توجہ کرتی تو یہ عام بغاوت و سرکشی کی دھمکی دیتے تھے اور مرکزی حکومت میں اتنا دم خم نہ تھا کہ ان کی اس نخوت مآبی کا دندان شکن جواب دیتی۔

بابی فرقہ چونکہ ناظموں کے اس متشددانہ رویہ کا سختی سے مخالف تھا۔ اسلئے سیاسی اور پولیٹیکل لوگوں کا اسکی طرف قدرتاً رجحان ہوتا جاتا تھا۔

دوسرے ایران کے اکثر فرمانروا قدامت پسندی کے لباس میں (جو کہ اس عہد کا عام دستور تھا) ملبوس رہتے تھے اور خصوصاً مولویوں اور مجتہدوں کا جاہل آبادی پر پورا اثر و اقتدار چھایا ہوا تھا ملک میں مفلسی اور جہالت کا دور دورہ تھا۔

اسکے برعکس "بابی" فرقہ اصلاح و تجدد کی فکر میں ہر وقت لگا رہتا تھا، اسکا سب سے بڑا کام شجر قدامت کو بیخ و بن سے اکھیڑ دینا تھا اور اپنی تمام تر توجہ اسی طرف مرکوز کر رکھی تھی۔

چونکہ ایران کا تعلیم یافتہ اور روشن خیال طبقہ اس ابدی نحوست سے بیزار تھا، اور قدامت کے جوئے سے گلو خلاصی کرنیکو تیار اور موقع کا منتظر بیٹھا ہوا تھا، اس بنا پر "بابی" مذہب کے مبلغوں کا ان پر اچھی طرح جادو چل گیا، اور اس فرقہ نے اس سنہرے موقع کو مدنظر رکھتے ہوئے خوب مذہبی نشر و تبلیغ سے کام لیکر ان کے دینی اعتقاد میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔

قیام سلطنت کی سعی نامشکور

بدو عالم سے یہ طریقہ چلا آتا ہے کہ ہر مذہب ابتداءً اپنی تمام تر

توجہات و مساعی کو صرف مذہبی نشر و اشاعت تک محدود رکھتے
اور جوں جوں اسکے مبلغین و مریدین کی جمعیت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے
اسی اندازہ سے حکومت و سلطنت کیطرف اسکی عنان توجہ بھی منعطف
ہوتی جاتی ہے۔

فتح کی صورت میں مذہبی اشاعت و تبلیغ میں آسانیاں پیدا ہونیکے
سامان خود بخود ہو جاتے ہیں اور شکست کی صورت میں اکثر کی
یہ حالت ہوتی ہے کہ حرف غلط کیطرح صفحۂ دنیا سے مٹ جاتے
ہیں اور پھر انکا کوئی نام لیوا نہیں رہتا۔

اسی قاعدہ مقررہ کے مطابق جب اس فرقہ نے بھی رفتہ رفتہ
اپنے اندر اسقدر قوت مجتمع کرلی تو اسنے بھی مذہبی نشر و اشاعت کیساتھ
حکومت کیجانب بھی اپنی توجہات کو منعطف کیا اور سازشی طریقہ سے
ملک کے اندر ایک عام انقلابی حالت پیدا کرکے حکومت وقت
کا تختہ اُلٹ دینا چاہا، اگرچہ اسنے ہمہ گیری اور طاقت کے زعم
میں کئی ایک خاص مقامات پر غاصبانہ قبضہ بھی کرلیا اور جنود
شاہی کو شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ لیکن یہ کوشش
"سعی مشکور" ثابت نہ ہوسکی

آخر میں مہدی قلی نے اپنی زیر قیادت عساکر قاہرہ کیساتھ
پے در پے زبردست شکستیں دیں، اس بے دریغ قتل و
غارتگری کیوجہ سے ان لوگوں کا تمام متحدہ شیرازہ منتشر ہوگیا،
اسکے بعد یحییٰ دہابی جو کہ "بابی فرقہ کا مبلغ اعظم تھا جسکی بابت
تمام واقعہ نویسوں کی متفقہ رائے ہے کہ "اسکے اندر عصبیت و
تعصب کا مادہ اتنا نہ تھا جتنا کہ حرص و آز کا"، اسنے اس فرقہ
کی تبلیغ و اشاعت میں نئے سر سے جان ڈال دی۔ مگر یہ بھی
حکومت وقت کی تلوار سے بچ نہ سکا اور اسی کے ساتھ اسکے تمام
"مقلدین" بھی بری طرح قتل و ذبح کر دیئے گئے۔

قتلِ شاہ کی سازش

۱۸۵۲ء میں بعض بابیوں نے بادشاہ کے قتل کی سازش شروع
کی مگر قبل از وقت اسکا راز طشت از بام ہوگیا، ایران و اصفہان
میں ان لوگوں کی زبردست خفیہ انجمنوں کا سراغ لگا جن کی اینٹ
سے اینٹ بجادی گئی اور اُن کے کارکنوں کو انتہائی عبرتناک
سزائیں دی گئیں۔

سزا

ایک پرانی مثل ہے کہ "ہر فرعونے را موسیٰ" یا "جیسے کو تیسا"
جب اس گروہ کی سرکشی نے بہت ہاتھ پاؤں نکالے تو انکے لیئے ویسی
سخت سزا بھی تجویز ہوئی۔

"واٹمیری" اپنی کتاب موسومہ ایران کا سفر اور تجربہ میں لکھتا ہے
کہ اس فرقہ کے مقلدوں کے پاؤں کو تپتے ہوئے نعلوں سے داغا جاتا
تھا اور سروں کو ڈنڈے مار مار کر پاش پاش کر دیا جاتا تھا۔ اور
بعضوں کے زخموں اور شگافوں میں جلتی ہوئی بتیاں داخل کیجاتی تھیں
جب اس سے بھی حکومت کی دیوانگی کا جوش ختم نہیں ہوتا تھا تو
آرے سے چرا کر دو ٹکڑے کر دیئے جاتے تھے، اور کسی کی آنکھیں
نکال لیجاتی تھیں۔

اصول وعقائد

اس فرقے کے اصول و جزئیات کو غور و فکر سے دیکھنے کے بعد
اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ اسکے بانی نے ہر فرقہ اور ہر مذہب سے کچھ نہ کچھ
پاکیزہ اصول اخذ کر لیئے ہیں، مثلاً مردوں کی انگلیوں میں عقیق
نگینے کا ہونا، مردہ مرد و عورت کو گول اور مدور چیز کا پہنانا، انکا
یہ عقیدہ ہے کہ انسان مرنے کے چالیس روز بعد کسی دوسری صورت میں

نمودار ہو جاتا ہے" اس عقیدہ کی اساس پر مسئلہ تناسخ کے یقین پر قایم ہے۔ انکا خیال ہے کہ خدا نے دنیا کو اپنی مرضی سے پیدا کیا اور یہ مرضی الفاظ میں ظاہر کی تھی، لیکن الفاظ حروف سے بنتے ہیں۔ اسلیئے حروف کو حقانی خواص حاصل ہیں۔ ان کے قانون وراثت کے اعتبار سے جو بابی المذہب نہیں وہ ملکیت کا حقدار نہیں ہو سکتا اور نہ وہ ملکی مراتب و مناصب اعلیٰ پر فائز ہو سکتا ہے۔ اپنی ارتقاء مراتب حاصل کرنیکے لئے عبادت الٰہی بہت ہی خشوع اور خضوع سے کرتے ہیں۔ "اس مذہب کے اصول و آئین پر ضیمر ور ڈی غلبی نے لیئے ایک مضمون میں جو انگلستان کے ایک اعلیٰ رسالہ میں شایع ہوا ہے" خوب وضاحت و تفصیل سے بیان کیئے ہیں،

انیس کا عدد

مذہبی زاویہ نگاہ سے بہت متبرک خیال کیا جاتا ہے، یہ بات دائرہ خیال میں نہیں آئی کہ اس توقیر کا سبب کیا ہے، اگر بالفرض کوئی وجہ ہو سکتی ہے تو صرف یہی ہے کہ علم نجوم کے اعتبار سے کسی قسم کے خواص اس ہندسہ میں مضمر ہیں۔

وہ جب ایسے الفاظ بناتے ہیں کہ جن سے خدا کا مفہوم ظاہر ہو تو ان حروف کی اعدادی قیمت انیس مقرر کرتے ہیں۔ مساجد خانقاہوں کے ملازم یا گدی نشین بھی انیس ہوتے ہیں۔

سال انیس ماہ پر ختم ہوتا ہے۔ ہر ماہ کے انیس دن ہوتے ہوتے ہیں۔ رمضان کے روزے بجائے تیس ۳۰ کے انیس ۱۹ رکھے جاتے ہیں۔

"محمد علی باب نے اپنے ایام حیات میں اٹھارہ ۱۸ ابدال مقرر کئے تھے اور خود کو قطب شمار کیا تھا، اس حساب سے سب ملکر انیس ۱۹ ہو جاتے ہیں۔ یہ سب خیال اسلامی اصول

تخیلات کی مسخ شدہ صورتیں ہیں۔

طریقۂ سلام

ان لوگوں کے سلام و دعا کا ایک مخصوص طریقہ ہے جو کہ چینی سلام سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے جب یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں تو ایک خاص قسم کی انگشتری جو ان کے پاس ہر وقت رہا کرتی ہے فوراً پہن لیتے ہیں۔

پوشش و زیبائش

اس فرقہ کے متبعین لباس عموماً سفید پسند کرتے ہیں، اور بالوں کو ہر وقت آراستہ رکھنا انکا خاص طریقہ ہے"

مسٹر براؤن جو کہ اٹھارویں صدی کا ایک زبردست سیاح ہے ان کی پوشش و آرائش کے متعلق ایک موقع پر لکھتا ہے کہ جب یہ لوگ سفید لباس پہن کر اور بالوں کو سنوار کر چلتے ہیں تو بیگانہ لوگوں کو بہت ہی بھلے اور خوبصورت معلوم ہوتے ہیں۔

بابی فرقہ اور طبقۂ اناث

چونکہ فرقۂ "باب" نہایت بلند آہنگی اور زور کیساتھ آزاد خیالی روشن خیالی کا دعویدار ہے، لہذا اسنے اپنے مطمح نظر کو ازادی "اناث" کیطرف صرف مبذول ہی نہیں رکھا بلکہ انتہائی جوش و خروش اور انتہائی دشغف کیساتھ اس مجہول الاعطا اور بے بس طبقہ کو ساحت ارتقا میں گامزن ہونیکی تلقین کی اور ملکی استحقاق و ملکیت میں طبقۂ ذکور کے برابر حقوق عطا کیئے اور "غیر شرعی پردہ" کے رواج کو جو کہ ان بیچاریوں کو اندر ہی اندر گھن کیطرح کھائے جاتا تھا موقوف کیا۔ دیگر اصلاحی امور کے متعلق بہت ٹھوس کام کرنیوالی انجمنوں اور مجلسوں کی بنیادیں ڈالیں۔ اسکے علاوہ انکی لسانی، ادبی، تعلیمی اور معاشرتی

ترقی کے وسائل پر تعمق نظر سے کام لیا گیا۔ غرض یہ ہے کہ اس فرقہ نے
اس بے زبان اور بے بس اور لاچار محض طبقہ کے ساتھ بہت بہتر سلوک
کیا، اور ان تمام کوششوں میں قرۃ العین کا زبردست ہاتھ کام کر رہا تھا
یہی وہ فاضلہ تھی جس نے اس پست طبقہ کو معراج کمال پر پہنچانیکی انتھک
کوشش وسعی کی۔

خلفاء اور اختلاف مذہب

یہ ایک کلیہ ہے کہ ہر ایک مذہب وملت میں کچھ عرصہ کے بعد اختلافات کے اثرات شروع ہو جایا کرتے ہیں اور ایک مذہب بہت سے فرقوں میں منقسم ہو جایا کرتا ہے اور اس مذہب وملت کی تباہی و بربادی کا اصلی سبب یہی اختلافات ہو جایا کرتے ہیں۔ آج پردۂ دنیا پر کوئی ایسا مذہب موجود نہیں ہے کہ جسکے اندر اصولی اور اعتقادی اختلافات کے در یا حائل نہوں

اسیطرح بابی فرقہ میں بھی کچھ عرصہ کے بعد اختلافات ونفسانیت کی خلیج وسعت اختیار کرتی چلی گئی،

اس فرقہ میں دو زبردست خلیفہ گذرے ہیں ایک مرزا یحیی، دوسرے مرزا حسین علی نور بہا۔

بہا نے یہ دعوے کیا کہ میرے پاس "باب" کی پیشینگوئی کے موافق خدا کے پاس سے آخری مرتبہ وحی آگئی، چونکہ بابیوں کے نزدیک ابھی تک قرآن کے اصل پارہ گیارہ ہیں جسوقت وحی آئیگی اسوقت قرآن مکمل ہوکر انیس ۱۹ پاروں پر ختم ہو جائیگا۔ وحی کے آتے ہی بابی مذہب دنیا سے رخصت ہو جائیگا، اور صرف مذہب ہی کا خاتمہ نہ ہوگا بلکہ اسکے ساتھ دنیا کا بھی خاتمہ ہو جائیگا۔ بہا کے عقیدہ کے موافق "باب" امام آخر الزمان کا پیش خیمہ تھا، جو کہ ہوا میں رہتا ہے اور حشر تک نظر نہ آئیگا۔

بہا نے جب اپنے ان خیالات کا اظہار کیا تو اسی پرانے نظریہ کے موافق وہ بابی، اگرچہ وہ بھی دو مذکورہ بالا خلفاء کی اسمی حیثیت سے دو
حصوں میں تقسیم ہو گیا، بہا کے مرید "پیروان بہا" اور یحیی کے پیرو "صبح ازل کے مرید" کہلانے لگے، ان دونوں میں پیروان بہا کی تعداد زیادہ ہے

الزامات

انسانی اصول کی یہ فطرت خصوصی ہے کہ جب حریف پر دلائل و براہین کی سحر کاری بیکار ثابت ہوتی ہے تو وہ الزام تراشی خوردہ گیری اور نکتہ چینی پر اتر آتی ہے۔

اسی اصول کی بنا پر انکی یہ فطرت اس حریف فرقہ پر بظاہر نمایاں نظر آتی ہے، اس گروہ پر سب سے بڑا اخلاقی اعتراض یہ ہے کہ یہ فرقہ ایک عورت کو نو خاوند کرنیکی اجازت دیتا ہے، اور مے نوشی میں کوئی قباحت نہیں سمجھتا بلکہ اسکو فعل محمود گردانتا ہے، اور اسی قسم کے چند لغو اور مبنی بر عصبیت اعتراضات ہیں جو کہ کچھ واقعیت اور وزن نہیں رکھتے، کیونکہ جب اس قسم کے اعتراضات کو درایت کی کسوٹی پر کسا جاتا ہے تو یہ درایت کے اصول کے سراسر خلاف اترتے ہیں بھلا یہ کیسے ممکن الوقوع اور قرین قیاس ہو سکتا ہے کہ جو گروہ آزادی اور روشن خیالی کے ثبوت میں عورتوں کو پردہ کی قیود سے آزاد کردے ملکی استحقاق اور وطنی معاملات میں مرد و عورت کا امتیاز اٹھا دے اور ان کو ارتقائی منازل تک پہنچانے کے لیئے اپنی تمام تر کوششوں کو صرف کردے وہ ایسے مخرب اخلاق اور دنائت آمیز مسئلہ کی ترویج کو کسطرح بنظر استحسان دیکھ سکتا ہے۔

موجودہ حالت

تقریباً دنیا کے ہر حصہ میں اس مذہب کے معتقدین کی تعداد پائی جاتی ہے اور مذہبی نشر و اشاعت ان سب کا بڑا مشغلہ ہے، اور زمانۂ حال کے موافق تبلیغ واشاعت کے فرائض انجام دیتے ہیں مذہبی رسائل واخبارات جو کہ اس مطلب کے لیئے نکالے گئے ہیں،

اُن کے اس مقصد میں بہت معاون ثابت ہو رہے ہیں نہایت متانت و سنجیدگی سے مذہبی اصول پر تنقید کیجاتی ہے۔ دوسرے فرقوں کیطرح آپس میں پگڑی نہیں اُچھالی جاتی ہے۔

نیو یارک امریکہ سے ایک مذہبی رسالہ مسمی "بہائی ایریک" نکلتا ہے اور مذہبی اشاعت کا کام بہت اچھے طریقہ سے انجام دیتا ہے۔

جرمنی کے دارالحکومت برلن سے بھی ایک رسالہ "نازوانا گو" اسی مقصد کے لیئے شائع ہوتا ہے، لیکن اسکی حالت کچھ زیادہ بہتر نہیں ہے نیوزیلینڈ سے مسمی ہیرلڈ آف دی سوتھ، ہفتہ وار شائع ہوتا ہے۔ چکاگو امریکہ سے بھی انگریزی میں ایک ماہوار پرچہ اسٹار آف دی ولیسٹ کے نام سے اچھی حالت میں نکلتا ہے عشق آباد روس سے ایک ماہوار رسالہ خورشید خاور نامی شائع ہوتا ہے، کوکب ہند یہ رسالہ ہر انیسویں روز بہائی مہینہ کی پہلی تاریخ کو آگرہ سے اردو زبان میں شائع ہوتا ہے اس رسالہ میں قادیانی جماعت سے بہت نوک جھوک رہتی ہے اسکا تنقیدی معیار یورپ وغیرہ کے دوسرے بہائی رسالوں سے گرا ہوا ہوتا ہے۔ زیادہ تر مذہبی مناقشات ہی سے بحث و مباحثہ اس رسالہ کا کام ہے ۔ اگر مذکورہ بالا رسائل کے اسٹائل پر اسکو نکالا جائے تو یہ موجودہ حالت سے زیادہ خدمت انجام دیسکتا ہے مگر یہاں کی مسموم فضا کے اثرات سے محفوظ و مصئون رہنا مشکل کام معلوم ہوتا ہے مخالفین کی مخالفت ضرور کیجائے مگر تہذیب و متانت کے دوائر سے تجاوز کرنا معیوب و مذموم فعل تصور کیا جاتا ہے اور تعلیم یافتہ گروہ کی بدتہذیبی کا اثر سوسائٹی کے لیئے کوئی اچھے نتائج نہیں پیدا کرتا ہے۔

مطبع محبوب المطابع برقی پریس دہلی میں سعید احمد پرنٹر و پبلشر نے چھپوا کر کوچہ چیلان دہلی سے شائع کیا

بالتصویر ماہوار رسالہ

جلد ۲ نمبر ۳

سنہ ۱۹۳۲ مارچ

سعید

دہلی

ایڈیٹر
ڈاکٹر سعید احمد سعید
بریلوی

قیمت
سالانہ۔ تین روپے
ششماہی۔ ایک روپیہ بارہ آنے
فی پرچہ۔ چار آنے (۴ر)

فہرست مضامین

ہمارے خیالات

رازِ حیات

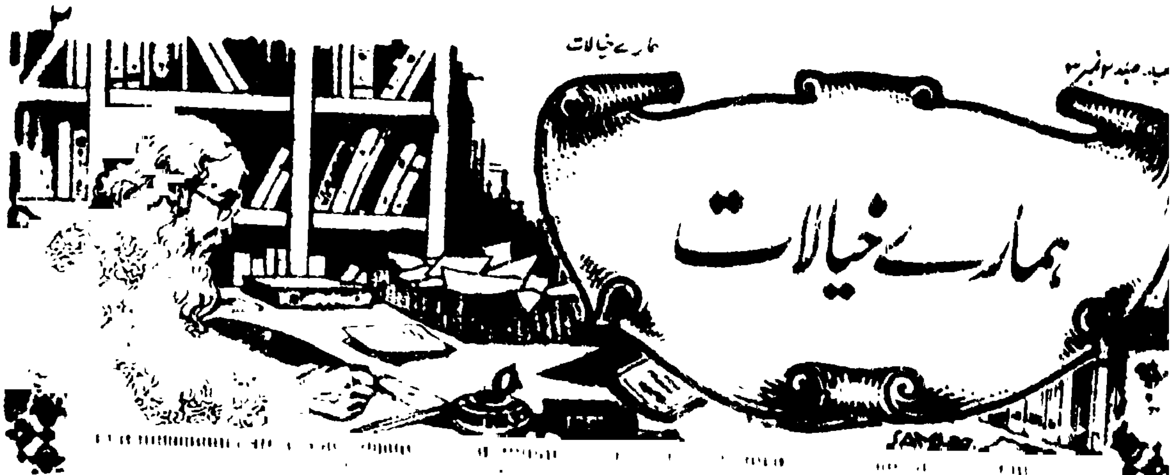
عورتوں کے چار صفحے

افسانہ

علم و ادب

اخذ ما صفا

بزم سعید



ایک دردناک فرض

قلم اٹھاتا ہوں اور پھر رکھ دیتا ہوں۔ کچھ لکھنا چاہتا ہوں، اور پھر رک جاتا ہوں۔ فرض کا احساس مجھے اکساتا ہے کہ یہ خاموش رہنے کا موقع نہیں ہے، لیکن غیرت پھر ہاتھ پکڑ لیتی ہے اور میں مجبور ہو جاتا ہوں۔ ایک بہاری کی کہاوت بہت مشہور مثل ہے کہ "کہوں تو ماں ماری جائے، نہیں تو باپ کتا کھائے"، اس کے متعلق قصہ یہ مشہور ہے کہ کوئی شخص اپنی بیوی کے ساتھ بہت ہی برا برتاؤ کیا کرتا تھا اور روزمرہ طرح طرح کے ظلم اس پر کرنے کا عادی تھا۔ ایک روز حسب معمول گھر میں پکانے کے لئے اس نے گوشت لاکر بیوی کو دیا اور وہ اس کی غفلت سے بلی کھا گئی۔ بیوی کے لئے سخت مصیبت کا سامنا تھا۔ خاوند کی واپسی کا وقت قریب آتا جاتا تھا، اور گوشت کہیں سے مہیا کرنا اس کے لئے بالکل ناممکن تھا۔ اتفاق سے کوئی کتا گھر میں آگیا اس نے فوراً اسے گھیر کر مار ڈالا اور اس کا گوشت جلدی جلدی بھون بھان کر پکانے بیٹھ گئی۔ اس کا بچہ خاصہ سمجھدار تھا وہ یہ سب معاملات دیکھ رہا تھا۔ رات کو جب باپ کھانا کھانے کے لئے بیٹھا اور وہ کتے کا گوشت اس کے سامنے رکھا گیا تو اس نے یہ کہنا شروع کیا کہ "کہوں تو ماں ماری جائے نہیں تو باپ کتا کھائے۔" اس وقت میں بھی کچھ اسی قسم کی کشمکش میں مبتلا ہوں۔ لکھنؤ سے آئی ہوئی ایک بیکس مظلومہ کی دردانگیز داستان ایک مختصر مطبوعہ پمفلٹ کی صورت میں میرے سامنے رکھی ہے اور مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کی خیالی تصویر میری آنکھوں میں پھر رہی ہے۔ اس افسانۂ غم کو پڑھ کر دل بے اختیار ہو جاتا ہے اور میں قلم اٹھاتا ہوں کہ مظلومہ کی حمایت میں اچھی طرح دل کھول کر لکھوں اور غریب اور بیکس عورتوں پر ظلم کرنے والے مردوں کی پوری طرح قلعی کھول کر رکھ دوں لیکن ہر مرتبہ مولانا کی مقدس صورت، ان کا کھدر کا بہت ہی نیچا کرتہ، اچھی خاصی لمبی ڈاڑھی اور دور سے نظر آنے والا پیشانی کا نشان سجود گویا ہاتھ پکڑ لیتا ہے اور ان کی محبت اور عظمت جو میرے دل میں بھری ہوئی ہے مجھے روک دیتی ہے۔

اگر یہ دردناک روداد صحیح ہے اور گمان غالب یہی ہے کہ وہ صحیح ہے تو اس بے پناہ ظلم کے خلاف جو خدا اور اس کے رسول کا نام لیکر کیا گیا ہے کچھ نہ لکھنا میرے نزدیک صرف اخلاقی جرم ہی نہیں بلکہ گناہ ہے کیونکہ جو باتیں مولانا کی جانب منسوب کی گئی ہیں وہ یقیناً انسانیت کی انتہائی پستی کی مظہر ہیں اور جب ان کے متعلق یہ دعوے کیا جائے کہ وہ تمام تر مطابق اسلام ہیں جیسا کہ مولانا نے کیا ہے تو وہ فعل کسی زید، عمرو، بکر کا نہیں رہتا بلکہ اسلام یا پیروان اسلام کا فعل بن جاتا ہے اور کوئی محب اسلام اسے گوارا نہیں کر سکتا کہ اغیار کی نگاہوں میں اسلام اس طرح ذلیل ہو جائے خواہ اس ذلت کا باعث مولانا عبدالماجد جیسی ہستیاں ہی کیوں نہ ہوں۔

مولانا عبدالماجد صاحب کوئی غیر ذمہ دار یا جاہل مسلمان نہیں ہیں اُن کے علم وفضل اور زہد واتقا کی داستانیں بچے بچے کی زبان پر ہیں اور اخبار "سچ" نے انہیں ایک مذہبی مقتدا اور دینی پیشوا کی حیثیت سے تمام ملک کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ اُن کا ہر ہر فعل اپنوں کے لئے قابل تقلید اور غیروں کے لئے لائق گرفت ہے اس لئے وہ اگر اپنے کسی فعل قبیح کو عین اسلام قرار دیں تو ایک طرف تو وہ دوسرے مسلمانوں کے لئے نمونہ بنجاتا ہے اور دوسری طرف معترضین اسلام کو اسلام پر ہنسنے کا موقع ہاتھ آتا ہے۔

وہ دُکھ بھرا افسانہ جو دوسرے اخباروں اور رسالوں کی طرح مطبوعہ صورت میں "سعید" کو بھی موصول ہوا تھا اسی اشاعت میں "عورتوں کے چار صفحے" کے ضمن میں شائع کیا جا رہا ہے اور اسے پڑھ کر اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہماری چار دیواریوں کے اندر ایک بیکس اور مظلوم طبقہ پر کیسے کیسے مظالم توڑے جاتے ہیں اور کوئی چوں تک نہیں کرتا۔ کمسن، نوجوان اور ناتجربہ کار لڑکیوں کی زندگیاں اپنے کسی خاص فائدے کے لئے نہیں بلکہ محض عادتاً اور تفریحاً تباہ کیجاتی ہیں اور کیسی کیسی ننھی معصوم کلیاں کہ جن کی خوشبو سے ممکن تھا کہ قوم کا باغ مہک اٹھتا توڑ مروڑ کر اس طرح پھینکدی جاتی ہیں کہ گویا ان میں جان ہی نہیں ہے اور اس کے لئے نہ مولنا عبدالماجد صاحب ذمہ دار ہیں اور نہ کوئی اور۔ سالہا سال نہیں بلکہ صدیوں سے جور و ستم اور جبر و استبداد کا برتاؤ کرتے کرتے طبقۂ نسواں کے ساتھ غیر ہمدردانہ برتاؤ کرنا قوم کی ذہنیت سی ہوگئی ہے اور یہ واقعہ ہے کہ اب ایسے حق شناس ہمدردوں کی تعداد قوم میں بہت ہی تھوڑی سی ہے جنہیں حقوق نسواں کو بیدردی سے پامال اور اپنی بیویوں اور بیٹیوں کو کند چھری سے حلال کرتے وقت یہ خیال آجائے کہ یہ بے زبان مخلوق بھی ہماری طرح انسان ہے۔ ایک مستبد خود مختار فرمانروا کی طرح ہم اپنے گھروں میں حکمرانی کیا کرتے ہیں۔ ہماری ہر خواہش اور ہماری زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ اس مختصر سلطنت کے لئے قانون ہوا کرتا ہے جس کی پابندی ہمارے سوا باقی تمام افراد پر فرض ہے۔ ہماری زندگی کی وہ سچی رفیق اور دائمی شریک جس کی شان میں خدائے پاک نے هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ (وہ تمہارے لئے زینت ہیں اور تم اُن کے لئے زینت ہو) فرما کر دنیائے انسانی میں اس کی مساویانہ حیثیت اور اہمیت کا اظہار فرما دیا ہے اور جس خدا کے سچے رسول نے یہ کہکر کہ "تین چیزوں کی محبت میری فطرت میں رکھی گئی ہے ایک نماز، ایک خوشبو، اور ایک عورت" اپنے پیروؤں کو یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ عورت اس دنیا کی محبوب ترین چیزوں میں سے ہے اور دوسرے بہت سے مذہب والوں کے اعتقاد کے مطابق نہ وہ سانپ اور بچھو ہے نہ شیطان کی بیٹی یا جہنم کی ٹھیکیدار اسی رفیقۂ حیات اور شریک زندگی کو آج ہماری بارگاہ سے جو خطاب ملا ہے وہ "پاؤں کی جوتی" ہے اور عوام کا نہیں بلکہ خواص کا بھی طرز عمل یہ ہے کہ اس "جوتی" کو جب چاہا پہن لیا اور جب چاہا اُتار پھینکا تاویل کی جاسکتی ہے اور شاید کر بھی لی گئی ہو کہ اللہ تعالی نے عورت کو "لباس" کا خطاب دیا ہے اور جوتی بھی لباس کا ایک جزو ہے

ہمیں حکم ملا تھا کہ اپنی عورتوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا کرو اور اس "اچھے برتاؤ" کی تفسیر ہم نے یہ کی ہے کہ خود بہتر سے بہتر غذا کھاتے ہیں اور اس سے کچھ مطلب نہیں ہوتا کہ جیسا مرغن سالن ہمارے پیالے میں ہمارے سامنے آیا تھا ویسا ہی بیوی اور بیٹی کے لئے بچا ہے یا ان کے کھانے کے لئے صرف اُبالی دال اور پیاز کی چٹنی ہے۔ ہم اچھے سے اچھے کپڑے پہنتے ہیں اور کبھی اس بات کا خیال نہیں آتا کہ بیوی اور بیٹیاں کس حال سے میلے کچیلے کپڑے پہنے

بلکہ شاید تمہارے لئے سے پھرتی ہیں۔ ہم ان سے بولیں کہ دودھ پلواتے ہیں [illegible] تاکہ ان کی معمولی غذا میں تھوڑا سا اضافہ کر دیں۔ [illegible] دودھ پلانے [illegible] لینا ان کی [illegible] ہم اپنے بچوں [illegible] ان سے کراتے ہیں اپنا کھانا ان سے پکواتے ہیں اپنے کپڑے ان سے [illegible] دھلواتے ہیں اپنے حقے ان سے بھرواتے ہیں اپنے پاؤں ان سے دبواتے ہیں لیکن اس تمام محنت شاقہ کے [illegible] اگر کبھی ایسا ہو جائے کہ سالن میں ذرا سا نمک تیز ہو جائے یا مقررہ وقت سے دو چار منٹ دیر میں تیار ہو یا آگ کم ہونے کی وجہ سے حقہ دیر تک نہ سلگے یا تیز گرم پانی کی بجائے ذرا گنگنا سا پانی ملے یا کوٹ کا بٹن [illegible] یا نیچا [illegible] جائے۔ یا رات کو بچے کے رونے کی وجہ سے ہماری نیند میں خلل پڑے تو پھر نہ ہمیں خدا کا فرمان یاد رہتا ہے [illegible] اور [illegible] کچھ پاس باقی رہتا ہے نہ انسانیت کا۔ بلا تکلف ایک ایک منہ میں سو سو صلواتیں سناتے ہیں۔ صرف بیوی ہی کو نہیں بلکہ بیوی کی سات پشتوں کو بھی چھان کر رکھ دیتے ہیں اور اگر دفتر میں افسر کی ناراضی یا دوستوں میں باہمی تکرار ہو چکنے کی وجہ سے یوں ہی بھرے بیٹھے تھے تو پھر اللہ دے اور بندہ لے۔ حقہ کی نے، جلتی ہوئی چولہے کی لکڑی، شوربے کا پیالہ، پاؤں کا جوتا۔ ہاتھ کی چھڑی۔ غرضکہ جو چیز سامنے پڑ جائے اسی سے بدنصیب بیوی یا بیٹی کو روئی کی طرح دھن کر رکھدیتے ہیں اور بزعم خود شاید یہ خیال کرتے ہیں کہ اس فرمان الٰہی کی عملی تفسیر ہوگئی کہ اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَی النِّسَاءِ (مرد عورتوں کے سردھرے ہوتے ہیں)

جس قوم کی یہ ذہنیت اور جس جماعت کے مردوں کی یہ خصلت و عادت ہو اس کے کسی فرد سے اس بات کی شکایت کرنا کہ تو نے بلا قصور ایک معصوم بچی کو طلاق دیکر کیوں اس کی زندگی تباہ کی، یقیناً ایک امر لاحاصل ہے۔ مجھے بھی حضرت مولینا حسین احمد صاحب قبلہ کی طرح اپنی اس مظلوم بہن سے یہی کہدینا چاہیئے تھا کہ بہن صبر کرو۔ حضرت مولینا نے یہ فرمایا ہے کہ "بیٹی صبر کرو، [illegible] کچھ چارہ نہیں [illegible] یہی ہوا جو مقدر تھا۔ میں تھوڑا سا فرق کر کے انہیں یہ لکھ بھیجتا کہ بہن صبر کرو۔ ایک بگڑی ہوئی قوم کی بدکرداریوں اور رو بہ تنزل جماعت کی بداعمالیوں سے کس کی بیٹی نہیں جاتی

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا مولینا عبدالماجد صاحب کو کسی طرح بھی عوام کالانعام میں شمار کیا جا سکتا ہے؟ اور کیا ان کی اس قسم کی بے راہ روی سے [illegible] اور ہمیں ان کی غلطیوں کی طرح چشم پوشی کی جا سکتی ہے؟ مولینا تو مشرقی اور مغربی دونوں تہذیبوں سے واقف اور علوم دینی و دنیوی دونوں کے ماہر ہیں [illegible] اس چیز سے بھی واقف ہیں کہ دیہات کے ناہموار اور دشوار گذار رستوں کے لئے بیل گاڑیاں کس قدر ضروری ہیں اور انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ پختہ اور صاف سڑکوں پر موٹریں کس قدر جلد رستہ طے کیا کرتی ہیں۔ بسی [illegible] طاقوں پر چلنے والے [illegible] انہوں نے دیکھے ہیں اور گرجاؤں کو بقعۂ نور بنانے والے بجلی کے قمقمے بھی ان کی نظر میں ہیں۔ مشرقی چار دیواریوں کے اندر مقید شرم و حیا کی دیویوں پر جو ناگفتہ بہ مظالم رات دن ٹوٹتے ہیں ان سے بھی ان کا حق شناس دل ناآشنا نہیں ہے۔ اور [illegible] اور موٹر کار کی جلوہ گاہ حسن کے حیا سوز حالات سے بھی انہیں پوری آگاہی ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ان کے کسی فعل کو ایک عامی و جاہل کا فعل تصور کر لیا

جائے اور ان سے ان کی کوتاہیوں اور فروگذاشتوں کے متعلق باز پرس نہ کی جائے۔

میں نے چاہا تھا کہ خود مولانا کو خط لکھکر ان سے کچھ باتیں دریافت کروں لیکن یہ شاید میری خیالاتی کمزوری تھی کہ جس گرامی ہستی کو ہمیشہ انتہائے تعظیم و تکریم کے ساتھ خط لکھتا رہا ہوں اس سے باز پرس کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ تاہم میں نے دوسرے ذرائع سے مولانا کا جواب حاصل کر لیا اور وہ یہ تھا کہ میں نے کوئی کام ایسا نہیں کیا جو شرع کے خلاف ہو۔ ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو۔ لیکن کیا میں نہایت ادب کے ساتھ مولانا سے یہ پوچھ سکتا ہوں کہ ان کا یہ عمل بھی کیا شرع اسلام کے مطابق تھا کہ انہوں نے غریب مطلقہ کے بھائی کو تو طلاق دینے کا سبب بتانے کی بجائے یہ تحریر فرما دیا کہ

"اسباب افتراق کی تفصیل اب تک میں نے آپ ہی لوگوں کی ہتک کے خیال سے نہیں کی تھی ایسا نہ ہو کہ آیندہ مجبوراً یہ بھی کرنا پڑے۔"

اور پھر اپنے پیر و مرشد حضرت مولانا حسین احمد صاحب قبلہ کو یہ لکھا کہ "والدہ ماجدہ کے حکم کی تعمیل میں طلاق دی" ظاہر ہے کہ آپ کے یہ دونوں مقولے صحیح نہیں ہو سکتے۔ پہلی تحریر صاف کہہ رہی ہے کہ آپ کے علم میں مطلقہ کی کوئی ایسی حرکت آگئی ہے جس کے افشا سے خود مطلقہ اور مطلقہ کے خاندان کی بدنامی متصور ہے اور وہی سبب طلاق ہے اور دوسری تحریر میں آپ کا بیان ہے کہ آپ کو خود تو کوئی شکایت نہ تھی اور آپ تعلقات برقرار رکھنے پر رضامند ہی نہیں بلکہ اس کے لئے کوشاں تھے لیکن والدہ ماجدہ کے حکم نے مجبور کر دیا۔

یہ بھی ممکن ہے کہ یہ دونوں باتیں غلط ہوں لیکن یقینی ہے کہ ان میں سے ایک بالکل غلط ہے۔ ایسی صورت میں میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کلام پاک کی وہ کونسی آیت یا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ کونسی حدیث ہے جس کی رو سے اس قسم کے صاف اور صریح جھوٹ کے لئے حکم جواز مل سکتا ہے۔

(اور اگر آپ کا وہ بیان جو آپ نے مطلقہ کے بھائی کو دیا تھا غلط ہے (کیونکہ خیال یہی ہوتا ہے کہ آپ نے اپنے پیر و مرشد سے غلط بیانی نہ کی ہوگی) تو کیا میں ڈرتے ڈرتے یہ عرض کر دوں کہ کلام مجید کی سورۂ نور میں ایک یہ آیت بھی لکھی ہوئی ہے۔ إِنَّ الَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ الْغَافِلَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ لُعِنُوا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ○

(جو لوگ پاکدامن عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں درحالیکہ وہ ایسی باتوں سے بیخبر ہیں اور ایماندار ہیں۔ ایسے لوگ دنیا اور آخرت دونوں میں ملعون ہیں اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے)

کیا اگر فی الحقیقت ایک مخصوص انداز بیان میں مطلقہ پر تہمت ہی لگائی گئی تھی تو اس آیت کی موجودگی میں بھی آپ کا فعل شرع اسلام کے مطابق تھا؟

آپ کہہ سکتے ہیں اور غالباً کہیں گے بھی ضرور کہ "میں نے تو کسی پر تہمت نہیں لگائی ہے۔" لیکن آپ کا انکار بالکل اسی قسم کا قانونی پیچ ہوگا کہ جیسے میں کسی کا آئینہ پتھر کے فرش پر گرا کر چور چور کر دوں اور جب وہ پوچھے تو یہ کہدوں کہ "میں نے تو نہیں توڑا، پتھر پر لگ کے وہ تو اپنے آپ ٹوٹ گیا ہے۔" آپ نے غریب مطلقہ پر صاف اور صریح الفاظ میں کوئی ایک تہمت لگانے کی بجائے اپنے مبہم اور مجمل الفاظ کے ذریعہ سے پڑھنے والے کے لئے یہ موقع بہم پہنچا دیا ہے کہ وہ اس مظلومہ پر بڑے سے بڑے جتنے الزام چاہے لگا لے۔ آپ مطلقہ کے بھائی سے یہ فرماتے ہیں کہ جناب طلاق کے اسباب میں نے

انہا۔ اگر نہیں لئے ہیں تو آپ نے ان پر ۔ ۔ ۔ کیا تھا یا اگر تھا ہر فرمادیتے تو مطلقہ اور اس کے خاندان کے لئے اطمینان کا باعث بنے اور تشدید رفت ہوتا اور پھر آپ نے دھمکی بھی دیتے ہیں کہ مجھے آپ مجبور نہ کیجئے میں انہیں نکال دوں گویا اگر مجبور کر دیا تو مطلقہ اور اس کے گھر والوں کو ۔ ۔ ۔ کی جگہ نہ ملے گی۔ کیا اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اپنی اس تحریر کے ذریعے آپنے خود بھائی کو بہن کی طرف سے بدگمان کرنے کی کوشش کی ۔ ۔ تہمت یا الزام کا لفظ زبان سے نکالے بغیر آپنے وہ بات کہی ہے جس کے اندر ہزار الزام اور تہمتیں پنہاں ہیں ؟

اگر فی الحقیقت یہ الزامات پاور ہوا ہوتے ۔ ۔ ۔ تب بھی صبر آسکتا تھا لیکن خود اپنے ہی قلم سے آپ جب مطلقہ کو خط لکھتے ہیں تو فرماتے ہیں کہ جو لوگ تم پر تہمتیں لگاتے ہیں وہ گنہگار ہیں۔ یہی نہیں بلکہ حضرت مولانا حسین احمد صاحب کے خط سے بھی واضح ہو رہا ہے کہ آپنے ان سے بھی مطلقہ کی کسی قسم کی شکایت نہیں فرمائی ہے اور ان دونوں تحریروں کی موجودگی میں ہر شخص یہی نتیجہ نکالنے پر مجبور ہے کہ مطلقہ کے بھائی کو آپنے جو کچھ لکھا تھا وہ غلط تھا اور چونکہ وہ الزام تھا اس لئے مجبوراً اسے "جھوٹا الزام" یا "جھوٹی تہمت" کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اور محصنات و مومنات پر جھوٹی تہمت لگانا کس حد تک شریعت اسلام کے مطابق ہے یہ اوپر کی آیت سے واضح ہو سکتا ہے۔

حضرت مولانا کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ آپنے "تعدد ازدواج کی سنت" محض ازراہ ہمدردی ۔ ۔ ۔ کی تھی تاکہ اپنے عزیز متوفی دوست کی بیوہ کی خبر گیری کر سکیں۔ نیز ایک مقصد یہ تھا کہ اپنے اس عمل سے مسلمانوں کی جماعت میں بیوہ عورتوں کے نکاح کی رسم کو رواج دیں۔ جہاں تک صرف خبر گیری کا تعلق ہے، مجھے اور آپ کو دونوں کو اس بات کا علم ہے کہ محترم بیوہ آپ کی اس قسم کی خدمات سے بے نیاز تھیں۔ اُن کی خبر گیری کرنے والے ایسے موجود تھے کہ جو اس سے زیادہ خلوص اور ہمدردی کے ساتھ اُن کی خبر گیری کرتے کہ جیسی آپنے کی اس لئے آپکے تعدد ازدواج کے لئے یہ عذر تو ایک عذر لنگ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ اب رہی عقد بیوگان کی رسم کی ترویج، اس کے متعلق بھی میں بہت ہی ادب کے ساتھ آپ کو یہ یقین دلانا چاہتا ہوں کہ مرحوم نگرامی کی بیوہ کے ساتھ آپکا یہ عقد اس نوعیت کا پہلا عقد ہرگز نہ تھا۔ اس سے پہلے لاکھوں مسلمان بیواؤں کے نکاح ہو چکے ہیں اور ظاہر ہے کہ ہندوستان کے مسلمان کبھی ہرگز ہرگز اس کے محتاج نہ تھے کہ اس مبارک رسم کی افتتاح آپکے مقدس ہاتھوں کرائیں اس کی افتتاح آج سے تیرہ سو برس پہلے ہو چکی ہے اور گو یہ ممکن ہے کہ یہ رسم جیسی ہونی چاہیئے اتنی عام نہ ہو پھر بھی اس قدر مفقود ہرگز نہیں ہے کہ مذہب اور معاشرت کی اور تمام اصلاحات پر اسی کو مقدم قرار دیا جائے اور ایک عالم باعمل اسے رواج دینے کی غرض سے اپنی پہلی بیوی، اپنی محترم والدہ اور اپنے تمام دیگر اعزا کی ناراضی اور ناخوشی مول لے لے۔

پھر بھی اگر نیت یہی تھی تو یقیناً مولینا کا یہ فعل لائق صد تحسین و آفرین تھا لیکن اس کا کیا باعث ہے کہ ایک ایسے مستحسن فعل کا ارتکاب کرکے اسے نباہا نہ گیا اور اس قدر جلد جس بیوہ سے نکاح کیا تھا اسے طلاق دیکر عام مردوں کو تو یہ خیال کرنے کا موقع دیدیا کہ جو عورتیں پہلے ایک خاوند کے ساتھ رہ چکی ہیں وہ دوسرے خاوند کو خوش نہیں رکھ سکتیں

اور دوسری طرف خود بیواؤں کے دلوں پر نقش بٹھا دیا کہ بیوہ عورتوں کی کوئی خاوند قدر نہیں کیا کرتا۔ خواہ وہ کیسا ہی عابد و زاہد کیوں نہ ہو اس لئے روز روز ایک نئے مرد سے شادی کرنے اور پھر طلاق پا کر نکالے جانے سے یہی بہتر ہے کہ خاموشی سے کسی گوشہ میں بیٹھکر زندگی گذار دی جائے اور ہرگز شادی نہ کی جائے۔

پھر اس مطلقہ کا جو دردناک انجام ہوا ہے یعنی اس کا سل اور دق میں مبتلا ہونا اور ہر وقت موت کے انتظار میں بستر مرگ پر پڑے پڑے ایڑیاں رگڑنا اسے دیکھکر تو بہت سی مسلمان بیواؤں کو شاید یہ بھی پسند آ جائے کہ خود اسلام ہی سے منحرف ہو جائیں بنسبت اس کے کہ "انکحوا الایامیٰ منکم" کی اپنے اوپر تعمیل کرا کے اس مصیبت میں مبتلا ہوں۔

کیا مولینا عبدالماجد صاحب اس حقیقت پر غور فرمائیں گے کہ ان کے اس فعل سے نادانستہ طور پر خود اسی مقصد ہی کو کس قدر نقصان پہنچا ہے کہ جس مقصد سے اپنے بیان کے مطابق انہوں نے یہ شادی کی تھی؟

اپنے اس خط میں جو طلاق دینے کے بعد مولینا نے مطلقہ کو بھیجا ہے ازراہ کرم و ہمدردی انہوں نے یہ بھی تشفی دلائی ہے کہ وہ جلد کسی نیک اور شریف مسلمان کے ہاتھ میں مطلقہ کا ہاتھ دلوا دیں گے۔ مولینا کی یہ بارش التفات و کرم بہت کچھ قابل داد ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ جب ایک ایسی ہی عورت کے لئے کہ جو صرف بیوہ ہو دوسرے شوہر کے ملنے میں دشواریاں پیش آتی ہیں تو اب ایک ایسی عورت کے لئے کہ جس کے نام کے ساتھ بیوہ کے علاوہ مطلقہ کا بھی لقب لگ چکا ہے کوئی نیک اور شریف مسلمان کہاں سے دستیاب ہو جائیگا اور اگر آج دو دو القاب کی موجودگی میں مرحوم نگرامی کی بیوہ کے لئے کوئی نیک اور شریف مسلمان مل سکتا ہے تو آج سے تقریباً سال بھر پہلے کہ جب اس کے نام کے ساتھ مطلقہ کا دم چھلا بھی نہیں لگا تھا کوئی نہ کوئی نیک و شریف مسلمان اور بھی آسانی سے مل سکتا تھا پھر خواہ مخواہ آپ نے اپنے نام کی درخواست کیوں پیش کر دی؟ ایک ماہر نفسیات، "فلسفہ جذبات" اور "فلسفہ اجتماع" کے مصنف کے متعلق کیسے یقین کر لوں کہ وہ اس بات سے بھی ناواقف تھا کہ اس کا تعدد ازدواج خواہ وہ کیسی ہی نیک اور پاک نیت پر مبنی کیوں نہ ہو اس کی بیوی کے لئے انتہائی رنج اور صدمے کا باعث ہوگا اور مرحوم نگرامی کی بدنصیب بیوہ اگر بستر مرگ پر نہ پڑی ہوتیں تو ان سے بھی میں ضرور یہ پوچھتا کہ جب مولینا عبدالماجد صاحب کی اپنی پہلی بیوی کے ساتھ "سچی" محبت اس صورت میں ظاہر ہو رہی تھی کہ وہ محض ایک رسم کو مسلمانوں میں رواج دینے کی خاطر ان کی چھاتی پر مونگ دلنے کے لئے ایک سوکن کو لیجا کر باطمینان تمام بٹھا رہے تھے تو تم اس قدر بھولی اور بے وقوف کیوں بنی تھیں کہ پھر بھی یہ یقین کر لیا کہ وہ تمہارے ساتھ الفت و محبت کا برتاؤ کر سکیں گے۔ اور پھر تمہارے ساتھ تو شادی بھی کسی قلبی جذبہ کی بنا پر نہیں کی جا رہی تھی بلکہ صرف ایک رسم کو رواج دینے کی خاطر کی جا رہی تھی۔

مولینا عبدالماجد صاحب کو بڑی خوشی سے اور نہایت آسانی کے ساتھ معاف کیا جا سکتا تھا اگر وہ اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتے لیکن اس صورت میں کہ وہ اپنے اس فعل کو عین اسلام قرار دے رہے ہیں کم از کم میں تو معاف کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ البتہ خدا سے یہ دعا ضرور ہے کہ وہ نیتوں کا حال جاننے والا ان کی نیت پر نگاہ رکھے اور کم سے کم اس جوانامرگ کی موت کے متعلق کچھ بازپرس کرے جو اس وقت نگرام ہاؤس لکھنؤ میں اپنے آخری سانس پورے کر رہی ہے۔

میں پھر حاضر ہوں

مسلسل تین ماہ تک آپ کی خدمت سے غیر حاضر اور مرگ و زیست کی گوناگوں دلچسپیوں کا ناظر رہنے کے بعد

خدا کا شکر ہے کہ اب میں پھر اس قابل ہو گیا ہوں کہ آپ کی خدمت کے لئے دلچسپی ہوں سے باز نہ آؤں ... میں قلم اٹھا کر اپنی ناقابلیت اور ... طالب ... پرچہ پر اپنا نام نے معمول ... لکھ لوں ... میرے ... کی طرف سے میری زبان بندی، زبان بندی نہیں بلکہ قلم بندی کر دی گئی تھی ... ہونے کے باوجود میں ما بیچ بھی کوئی تحریر پیش نہ کر سکا اور پہلا پرچہ ... مشترکہ ... میرے ہاتھوں ترتیب نہ پا سکا اگرچہ میں یہ بات اچھی طرح جانتا ہوں کہ اگر میں خود بھی اسے ترتیب دیتا تو بھی اس کے ... کتابت ... غلطیاں گئیں وہ کم ہو جاتیں، شاید ... کوئی خوبی اس میں پیدا ہو سکتی۔ پچھلے پرچہ میں کتابت کی غلطیاں بہت ہیں ... پہلا پرچہ نسبتاً کسی قدر دلکش ہو گا بھی ... میرا خیال ہے کہ اس کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ وہ اپنے مقررہ وقت پر نکلنے کی بجائے اس قدر دیر کے بعد نکلا۔

بہر حال اب جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔ گزشتہ پرچے میں ترقی و اصلاح کی گنجائشیں ہزار ہوں پھر بھی اصلاح کا امکان تو کوئی ہے ہی نہیں اس لئے مناسب یہی ہے کہ میں بھی اس سے قطع نظر کر لوں اور آپ بھی چشم پوشی سے کام لیں اور اس کے بعد آپ اور میں دونوں اس بات پر غور کریں کہ آئندہ کیا کرنا ہے۔

میں نے اپنی قلم بندی کی مدت سے فائدہ اٹھایا اور محض تفنن تجربہ کی خاطر ایک ہفتہ بھر کا ایک دورہ "سعید" کے خریدار فراہم کرنے کے لئے کیا۔ اس دورے میں میں دیکھتا ہوں کہ مجھے خاطر خواہ کامیابی ہوئی ہے اور میں ارادہ کر رہا ہوں کہ اگر مطب سے وقت نکال سکوں تو قریب ہر مہینے چار چھ روز اسی قسم کے دورے میں گذارا کروں۔

یہ تو میں نے سوچا ہے اور میں کروں گا، لیکن کیا آپ کو اس پرچے کے لئے کچھ نہیں کرنا ہے؟ میں اگر آپ کے شہر میں پہنچ کر آٹھ دن کے اندر پچاس یا سو خریدار مہیا کر دیتا ہوں تو کیا آپ ایک مہینے میں ایک خریدار بھی مہیا نہیں کر سکتے "سعید" بعض پہلوؤں سے برا اور بعض مخصوص مذاق کے سمجھنے والوں کے لئے ناقابل پسند ہی سہی لیکن وہ بعض حالوں سے تو ضرور اچھا اور بہت سے عام مذاق کے اصحاب کے لئے تو ضرور ہی قابل قبول ہے۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ شہر بھر میں آپ کو کوئی اس کا خریدنے والا ہی نہیں ملتا۔ کہیں میری اس کم نصیبی کا باعث آپ کی عدم توجہی تو نہیں ہے۔ یہ آپ کے سوچنے کی بات ہے اس پر آپ غور فرمائیں۔

"سعید" انشاء اللہ جلد سے جلد اپنی اشاعت کی کمی کو پورا کر کے اپنے صحیح وقت پر نکلنے لگیگا۔ اور اس میں وہ اس کی تمام مخصوص دلچسپیاں بھی ہوں گی جنہیں آپ کی نگاہیں پچھلے پرچوں میں ڈھونڈتی رہی ہیں

ہر مہینے ایک خریدار مہیا کرنا — آپ کی نوازش!

ماہ بماہ بہتر سے بہتر پرچہ مرتب کر کے حاضر کرنا — میرا فرض!

آپ اپنی نوازشوں کی بارش کیجئے اور میں اپنے فرض کو بطریق احسن انجام دوں۔



اس شخص نے اپنے دل کو اس قدر مضبوط بنایا تھا کہ تیر پر تیر
برسے ہیں مگر اُف تک نہیں کی۔









اگر خواہی حیات اندر خطر زی

(از جناب پرویز بٹالوی شیخ بسمل)

آج جبکہ دنیا میں ہر طرف سے الامن الامن کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں اقوام عالم خطرہ کی گھنٹی کے ذرا سے اشتباہ پر بھی لرزہ براندام ہو جاتی ہیں تمام ممالک میں انفرادی طور پر امن سبھائیں قایم کی جا رہی ہیں اور اجتماعی رنگ میں جمعیت الاقوام کی تمام مساعی اس مقصد کے حصول میں صرف ہو رہی ہیں کہ دنیا سے آئندہ لڑائی کے امکانات کا خاتمہ کر دیا جائے تخفیف اسلحہ کے مسئلہ پر توغل و انہماک سے غور و خوض ہو رہا ہے۔ ابھی ایسی ہستیاں بھی موجود ہیں جو لڑائی کو اہل عالم کے لئے آیۂ رحمت سمجھتی ہیں۔ اور جنگ کو نہ صرف قوم کی فلاح و بہبود کے لئے ہی ضروری تصور کرتی ہیں بلکہ اسے اس کی زیست و بقا کے لئے لاینفک قرار دیتی ہیں۔ اہل دنیا کا لڑائی سے موجودہ تنفر و بیزاری ان کے نزدیک لازمی ردِ عمل ہے گذشتہ جنگِ عظیم کا۔ اور لابدی نتیجہ ہے اس قانون فطرت کا جس کی رُو سے محنتِ شاقہ کے بعد خواہشِ راحت۔ بخار کے بعد بحران۔ اوج کے بعد پستی۔ ارتفاع کے بعد ہبوط۔ فراز کے بعد نشیب۔ اُبھرنے کے بعد گرنے اور تکان کے بعد سستانے کا نظام تسلسل ضروری ہے۔ ان لوگوں کے دلائل خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہوں لیکن اس حقیقت باہرہ میں کلام نہیں کہ ان کی ہستی مظہر ہے انسانی فطرت کے شعبۂ "یسفک الدماء" کی اور تکمیل فطرت کیلئے انکا وجود بھی ایک گونہ لازمی ہے۔ ان ہستیوں میں سے ایک انگلستان کی مشہور انشا پرداز خاتون **لیڈی ڈرمنڈ** ہے۔ ہیں جنھوں نے اس موضوع پر ایک مبسوط مقالہ سپرد قلم فرمایا ہے۔ جو جستہ جستہ مقامات سے بہ اختصار و ایجاز ہدیہ ناظرین کیا جاتا ہے۔ امید ہے ارباب ذوق کے لئے دلچسپی کا موجب ہوگا۔ لیڈی موصوفہ رقمطراز ہیں۔

"جنگ اہل دنیا کے لئے بہترین نجات دہندہ ہے۔ بنی نوع انسان امن کی بجائے لڑائی کی زیادہ رہین کرم ہے۔ لڑائی نے کبھی کسی قوم کی روح کو فنا نہیں کیا۔ نہ لوگوں کے اخلاق کا استہلاک ہی اس سے ظہور میں آیا ہے۔ مرفہ الحالی تعیش۔ قناعت اور سکون نے ہمیشہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کو تباہ کیا ہے۔ روما کی بربادی کا باعث جنگ نہ تھی۔ اس کی عظمت و جبروت کا تنزل امن و سکون کا نتیجہ تھا۔ کیا انسان اخلاقی اور روحانی ترقی کے اس اوج کمال تک پہنچ چکا ہے۔ جہاں اس پر اس درجہ اعتماد کر لیا جائے کہ وہ لڑائی اور انقلاب کے زبردست چابک کے بغیر (جس کا کام ناقابل ترقی قدامت پسندی اور کورانہ تعصبات کی آہنی زنجیروں کو توڑنا ہے) اسقدر نوعی ترقی کرلے گا جسے خالق ارض و سمانے مقدر کر رکھا ہے۔ لڑائی عام طور پر بنی نوع انسان کی کثیر جماعت کے لئے اس عمل جراحی کے

مترادف ہے جو اسے اس قابل بنا دیتا ہے کہ اس دنیا میں زندہ رہ سکے انسان دراصل اعتبارات و مفروضات پر زندہ رہنا چاہتا ہے اور حقیقت سے دوچار ہونا پسند نہیں کرتا۔ اور چونکہ لڑائی کا تخریبی جزو اس کی خود فریب جنت کو جس نے حقائق و معذرت پر پردہ ڈال رکھا تھا۔ ایک آن واحد میں پھونک ڈالتا ہے۔ اس لئے وہ اس سے حتی الوسع گریزاں رہتا ہے۔ آپ ایک ہی شخص کے اندر زمانہ قبل از جنگ اور بعد از جنگ کے خیالات میں نمایاں اور بین اختلاف و افتراق محسوس کریں گے۔ تہذیب و تمدن کی پختگی، کلچر کی وسعت، رفعت تخیل اور لامحدود ترقی لڑائی کی وساطت سے زیر ہستی دنیا میں در آتی ہے۔ لڑائی کے نتائج مسئلہ ارتقا کی اس مشق کے شاہد ہیں جس کی رو سے ایک بڑی ہستی کی بقا کے لئے چھوٹی چھوٹی ہستیوں کی فنا لازمی ہے۔ اور لڑائی کے بعد امن کا زمانہ اس صداقت کی زندہ دلیل ہوتا ہے ؎

کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

اگرچہ زمانہ امن آہستہ آہستہ انہی نتائج کو ایک نقطہ پر جمع کر دیتا ہے لیکن اس میں کلام نہیں کہ انسان ابھی روحانی ترقی کے اس معراج تک نہیں پہونچا کہ وہ استقلال و استقامت سے پرامن زمانہ میں ترقی کرتا چلا جائے۔ ابھی اس کی رسائی اس منزل تک نہیں ہوئی کہ مرض کی تکلیف اور درد محسوس کئے بغیر دنیا جہان کی خاک چھانتا پھرے اور عمل جراحی کے آلات کی ایجاد و تجربات میں سرگرداں رہے۔

نسل انسانی کے کوسیین کے عہد عتیق سے۔ میدان کارزار جوہر مردانگی، شجاعت و حمیت کے اظہار کا بہترین موقعہ قرار دیا گیا ہے۔ اگرچہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ موجودہ مکانکی دور کی لڑائیوں میں جبکہ عفریت پیکر مشینیں، رعد آسا توپیں اور دیگر آلات حرب ایجاد کئے گئے ہیں۔ جن سے خشکی، تری، ہوا، خلا، غرضیکہ کوئی جگہ محفوظ و مصئون نہیں۔ مردانگی و شجاعت کے اظہار کے لئے گنجائش نہیں اور یہ خیال کوئی آج کا نہیں۔ حضرت مسیح سے صدیوں پیشتر ارشمیدس نے جب ایک ایسی مشین کو دیکھا جو سسلی سے لائی گئی تھی اور جو خود بخود تیر پھینکتی تھی تو اس نے حیرت آمیز لہجہ سے کہا تھا کہ "اب شجاعت و بہادری کا جنازہ نکل گیا"۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ خدا کا شکر ہے کہ ابھی وہ زمانہ بہت دور ہے جسے ارشمیدس کی نگاہ دور رس دیکھ رہی تھی۔ اب بھی حقیقی شجاعت کے بہت سے مواقع لڑائی میں موجود ہوتے ہیں۔ اور بیشمار لاشوں کے تابوت جوہر مردانگی کے درخشندہ اتفاقات سے مزین نظر آتے ہیں۔ اگرچہ اس میں کلام نہیں کہ لڑائی جیسے نازک موقعہ پر خوف و حزن بعض اوقات قوت فیصلہ، توازن عمل اور حقیقی شجاعت کی قوت مظاہرہ کو مفلوج کر دیتے ہیں۔ لیکن بہ حیثیت مجموعی آج بھی لڑائی کو مردانگی اور شریف دشمنی کے اظہار کا میدان قرار دیا جا سکتا ہے۔

زمانہ قبل از تاریخ، عہد عتیق، ادوار متوسطہ اور زمانہ حاضرہ کی تاریخ کو دیکھئے۔ مذہبی صحائف کا مطالعہ کیجئے۔ غیر مہذب اور جاہل اقوام عالم کی رسومات پر نظر ڈالئے۔ ان کے اساطیر الاولین اور خاندانی روایات کو سنئے۔ ہر ایک جگہ آپ کو نظر آئے گا کہ شجاعت و مردانگی کے اظہار کے لئے لڑائی کو ایک شریف ترین جذبہ قرار دیا گیا ہے اور اس کی مدح و ستائش مردوں کا سرمدی گیت رہا ہے۔

امن جو اور سکون پسند ہستیاں ابھی قبل از وقت ہیں۔ دنیا امن کے لئے ابھی تیار نہیں۔ انسان ابھی ہزارہا سال تک روحانی طور پر اس کا اہل نہیں ہو سکے گا۔ اس زندگی کے بعد کی زندگی کو لیجئے۔ کیتھولک چرچ اہل جنت کے لئے برزخ کا قیام ضروری سمجھتا ہے جہاں تزکیہ نفس کیا جائیگا۔ بدھ مت والے روحانی ارتقا کی گردش دولابی کے قائل ہیں۔ اگر انفرادی طور پر نہیں یہ تسلیم ہے کہ روحانی طور پر ابھی ہم نامکمل ہیں اور ہمیں مسرت ابدی اور سکون سرمدی حاصل کرنے کے لئے مزید تجربات بلکہ تکالیف سے لذت آشنا ہونا ناگزیر ہے تو ہم آجاتی

طور پر یہ توقع کرسکتے ہیں کہ دنیا کی ترقی تکلیف، تجربات اور ترقی کرنے کی تحریک کے بغیر نہ صرف حاصل ہی ہو جائے گی بلکہ اسے ابدیت کا ساجری پتہ بھی مل جائیگا۔ تعجب ہے کہ تہذیب و شائستگی آج تک محض اس لئے محفوظ چلی آ رہی ہے کہ دنیا کی بیش بہا قربانی سے دنیا ایک سکون حاصل کر لیتی ہے۔ دنیا کے لئے تہذیب ہمیشہ بزریعہ جنگ حاصل کی گئی ہے نہ بوساطت امن۔

یونانیوں کی اہل ایران پر ۴۹۰ ق م کی فتح نے اہل ایران کے اس طلسم کے تار پود کو بکھیر کے رکھدیا جس کے رو سے وہ اُس وقت تک دنیا کی نظروں میں ایک ناقابل تسخیر قوم بنے بیٹھے تھے۔ اور جس اعتقاد نے یونانیوں کی قوت مردانگی کو سلب کر رکھا تھا۔ اس فتح نے بنی نوع انسان کے لئے ایتھنز کے علمی خزانے آزاد درس گاہیں۔ مغربی دنیا کی روشن خیالی صدیوں سے قائم کردہ تدریجی ترقی اور یورپین تہذیب کے ابواب کھول دئے۔

اہل یونان کا اقبال اور ان کے کلچر کی فضیلت ان کے ایام تعیش اور فارغ البالی میں بدل بہ نکبت و ادبار ہو گئے۔ لیکن وہ جنگ اسپارٹا کے ایام میں ہرگز زوال آمادہ نہیں ہوئے۔ برطانیہ اپنی تہذیب کی تاسیس کے لئے اہل روما کے حملوں اور فتوحات کی زیر بار احسان ہے ۵۵ ق م کے خوں ریز میدان کارزار میں برطانیہ کی سلطنت کی بنیاد رکھی گئی۔ روما کے وقت کے اہل برطانیہ بالکل کندہ ناتراش اور جاہل تھے۔ اہل روما نے انھیں اس وقت کی تہذیب کے مطابق درس حکمت دیا۔ شاہراہیں تعمیر کی گئیں جن کے نشانات ابھی تک باقی ہیں۔ نئے نئے پودے۔ اجناس پھل پھول، باہر سے لاکر کاشت کئے گئے۔ زمین کو مختلف ذرائع آبپاشی سے زرخیز و زرفشاں بنا دیا۔ ملک کی معدنی دولت کو بے نقاب کیا۔ کم و بیش پچاس ایسے شہر تعمیر کئے گئے جن کے گرد شہر پناہ موجود تھی منجملہ ان کے لنڈن۔ یارک۔ چیسٹر وغیرہ آج تک دنیا کے ممتاز ترین شہروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔

اگر برطانیہ اپنی تہذیب کی کشت اول کے لئے اہل روما کے ابر کرم کی رہین منت ہے۔ تو اپنی آزادی کے لئے نارمن کی فتح (۱۰۶۶ء) کی زیر بار احسان ہے۔ اگرچہ اس ترقی کا زرثمن خوں ریزی اور جنگ تھا لیکن اس سے آزادی کا استمرار ہی پڑا اور قیمتی روایات جیسی بے بہا چیزیں خرید کی گئیں۔ راپن کا قول ہے کہ نارمن کی آمد اہل برطانیہ کے لئے ان کی ترقی و تمدن کا پہلا زینہ ہے جس سے وہ آج اس رفعت و تفوق پر جا پہنچے ہیں جو انکے لئے مایہ امتیاز ہے۔ لیکن یہ مشکل تھا کہ اس زمانہ کا کوئی انگریز نارمن کی آمد میں کوئی بہتری کی شکل دیکھ سکتا۔ وار اوف روز ترقی و تہذیب کے بے شمار اسباب اپنے ساتھ لائی۔ باسورتھ کی لڑائی نے ہنری ہفتم کو تخت انگلستان پر بٹھا دیا۔ شخصی شاہنشاہیت جمہوری ملوکیت پسندی میں تبدیل ہو گئی۔ ٹیوڈرس (   ) اگرچہ تشخص پسند تھے۔ لیکن وہ اپنی پالیسی جمہور انام کی تائید پر مبنی رکھتے تھے۔ نہ کسی خاص جماعت کی حمایت پر۔ یہی زمانہ برطانیہ کی بحری طاقت کی ابتدائی نشان دہی کرتا ہے۔

جنگ اتحاد عظیم (   )
حقیقتاً مذہبی۔ تمدنی اور تجارتی آزادی کی جنگ تھی۔ اگر لوئیں چہارم دول متحدہ پر فتحیاب ہو جاتا تو پروٹسٹنٹ مذہب کا اختتام، مغربی یورپ پر ایک ملوکیت پسند فرانسیسی کا قبضہ اور نئی دنیا میں اہل فرانس کی آبادی اور دیگر اقوام کا استیصال اس کا لازمی نتیجہ تھا۔ "متحدہ فتح" نے آزادی اور تجارتی اور استعماری مہمات کو محفوظ کر دیا۔

جنگ کریمین (   ) کے دوران میں۔ روس میں اہل برطانیہ کی سپاہ کے درد انگیز اور ناقابل بیان مصائب نے فلورنس نائٹینگیل (   ) کے دل میں اس جذبہ کی روح پھونکدی کہ تعلیمیافتہ نرسز (   ) کا سلسلہ قائم کرنا چاہئیے۔ یہی بنیاد تھی جس پر آج برطانیہ کی نرسنگ سسٹم کی فلک بوس عمارت کھڑی ہے۔ نیز لارڈ ہربرٹ"

کی مسلسل مساعی سے افواج میں اصلاحات کا آغاز ہوا۔

فرانس جرمنی کی (   ) جنگ نے

موجودہ سلطنت جرمنی کی بنیاد ڈالی۔ نیز یورپ کی سیادت بد نہی میں بھی کمی شروع ہوگئی۔ اگرچہ فرانسیسی سپاہ اپنی مادر وطن کے لئے لڑنے کی غرض سے واپس بلالی گئیں۔ لیکن اس شکست نے فرانسیسی قوم میں وہ تمام جوہر پیدا کر دئے جو آج ان کے لئے طغرائے امتیاز ہیں۔ انہوں نے جوش حب الوطنی اور بیش بہا قربانیوں سے زر پیشگی وقت معینہ سے پیشتر ہی جرمنی کو ادا کر دیا۔

انقلاب امریکہ نے نہ صرف ایک جدید قوم کا سنگ بنیاد ہی رکھا بلکہ ایک نئے تمدن کی داغ بیل بھی ڈال دی۔ اور اس سرزمین ایجاد و اختراع کے مصلحہ و معامل دنیائے قدیم کی بڑی اقوام کی زبوں حالی کا موجب بنے ہوئے ہیں۔ امریکہ کی خانہ جنگی آزادی اپنے ساتھ لائی۔ اور رفتہ رفتہ تعلیم، روشن خیالی کے ایسے ابواب وا کر دئے جن سے بے شمار غلام مستفیض ہوئے۔

جاپان کی چین کے ساتھ لڑائی (   ) کی بیداری کا آغاز تھا۔ اور اس کے بعد کی سول وار نے اس میں اور بھی زیادہ بیداری پیدا کر دی۔ چین کی یہ بیداری ابھی پچاس سال تک اور معرض تعویق میں رہتی۔ اگر اس کی پچاس کروڑ نفوس کی آبادی کو امن و سکون کی زندگی میں سوتے رہنے دیا جاتا۔ گزشتہ بیس سال کے عرصہ میں چین کو خانہ جنگی کے تلخابہ کی وجہ سے تہذیب مغرب کو جلدی جذب کرنا پڑا۔ کیونکہ خانہ جنگی نے اس ضرورت کا احساس پیدا کر دیا کہ ملک میں جدید آلات حرب۔ ہوائی جہاز، مکانکی مشینیں۔ انجینیری کا سامان اور دیگر ایجادات کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ نانکنگ میں مرکزی حکومت عیسائی اہل چین کے ہاتھ میں ہے۔ عورتوں کے حقوق میں نمایاں طور پر اصلاح ہوگئی ہے۔ آہنی پاپوش سے پاؤں کا جکڑنا اب قانونی طور پر ممنوع قرار پا گیا ہے۔ چین کو اپنے دور جدید کی نئی زندگی کے لئے لڑائی کے آتشیں چابک کی ضرورت پڑی نہ کہ امن و سکون کے خواب آور جرعات کی۔

روس کی جاپان سے شکست۔ زار کے دور استبداد و قہرمانیت کے زوال کی ابتدا اور اشتراکیت کی تخلیق کا موجب بنی۔ لڑائی نے قدیم قصر حکومت کو متزلزل اور انقلاب نے اسے بالکل منہدم کر دیا۔ لیکن روس کے حوصلہ آزما عمرانی تجربہ کو دیکھتے ہوئے اس کے مستقبل کے متعلق کوئی رائے قائم کرنا ابھی قبل از وقت ہے۔

جنگ عظیم جس سے تمام دنیا لرزاں و ترساں تھی۔ میرے دلائل کی ایک زندہ مثال ہے۔ میں نے لڑائی میں خود کام کیا ہے۔ اور مجھے خوب علم ہے کہ لڑائی ایک فرد واحد۔ ایک خاندان یا ایک ملک کے لئے کیا معنی رکھتی ہے۔ نہ میں اسی بات سے ناواقف ہوں کہ لڑائی کے بعد کن دقتوں کا سامنا ہوا۔ اور کیسے کیسے اہم معاشرتی اور معیشتی مسائل کا حل سوچنا پڑا۔ لیکن اس میں کسے کلام ہے کہ لڑائی کا چار سالہ عرصہ گویا زبردستی ترقی۔ تجربات اور جہات کا زمانہ تھا اور جس سرعت و تیزی سے یہ ترقی عمل میں آتی رہی اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ لڑائی کے فوری بعد دنیا نے ایک پلٹا لیا اصلاحات و ایجادات کا دور دورہ ہو گیا۔ ان چیزوں کا امن و سکون کے زمانہ میں بیسیوں برس میں بھی ظہور میں آنا ناممکن تھا۔ سائنس اور انجینیری نے غیر متوقع ترقی کی۔ ہوائی جہازوں کے خواب نے عملی تعبیر اختیار کر لی۔ اور بری اور بحری فوج کی امداد کا بہترین ذریعہ بن گئے۔ وزارت ہوائی کا قیام عمل میں آیا۔ عہد نامہ صلح میں سب سے پہلی مرتبہ برطانیہ ایک طاقت کی حیثیت سے تسلیم کی گئی۔ آئرلینڈ کی افواج نے جو خدمات بہم پہنچائیں ان سے متاثر ہو کر آئرلینڈ کو درجہ حکومت استعماری دیا گیا۔ مستورات نے دوران جنگ میں جو خدمات سرانجام دیں ان کے صلہ میں ان کے حقوق کی برتری اور تفوق کو تسلیم کیا گیا اور انھیں انتخابی حقوق بھی دیدئے گئے۔ اندرونی معاملات کے فیصلہ کے لئے ۱۹۲۰ء میں جمعیت الاقوام کا قیام عمل میں آیا۔

جہاں تک نظریہ کا تعلق ہے یہ جنگ عظیم کے بہترین نتائج میں سے ہے۔ تاریخ عالم میں کوئی لڑائی ایسی نہیں ملے گی جس نے ایسا انقلاب پیدا کر دیا ہو کہ لوگ امن وسکون کے اس قدر دلدادہ ہو گئے ہوں کہ لڑائی کو قانونی طور پر ممنوع قرار دینے کی جد و جہد کر رہے ہوں۔

انقلاب لڑائی کے دوسرے مظاہرہ کا نام ہے۔ انقلاب فرانس نے حریت و مساوات کا علم بلند کیا۔ جو اہل فرانس کے ہاتھوں یورپ میں جمہوریت کا علم بلند کرنے کا آلہ کار بنا۔

(یہاں مقالہ نگار نے ہندوستان کا بھی ذکر کیا ہے۔ لیکن صرف ان الفاظ میں کہ "یہ انقلاب کی ہی بدولت ہے کہ ہندوستان کی ہزاروں پردہ نشین خواتین کو آزادی دیکھنی نصیب ہوئی" پتہ نہیں اس سے کون مراد ہیں۔ پرویز)

انقلاب کی بدولت اہل چین ایک خود دار قوم بن گئے ٹرکی میں دور جدید کی اصلاحات کا نفاذ عمل میں آیا۔ اطالیہ ایک طاقت تسلیم کر لی گئی ہے۔ جرمنی ایک متحدہ ترقی کرنے والی قوم بن گئی ہے۔ روس کی اشتراکیت بھی اسی کی رہین کرم ہے۔

غرضیکہ جب تک انسان تکلیف دہ اور دردانگیز تجربات دیکھنے کا محتاج ہے۔ لڑائی ناگزیر ہے۔ دائمی امن اور آزادی لازم و ملزوم ہیں۔

دنیا کبھی آزاد نہیں ہوئی۔ آج بھی یہ آزاد نہیں۔ ہمارے بڑے بڑے امن کے دعویدار معلمان قوم۔ انفرادی آزادی کو کم کرنے۔ لوگوں کی نقل و حرکت کو مقید کرنے۔ قومی تفریق پر مستقل حدبندیاں عائد کرنے کی فکر میں ہیں۔ دنیا کو ابھی لڑائی کی ضرورت ایک نجات دہندہ کی حیثیت سے باقی ہے۔ اور کون ہے جو یہ پیشین گوئی کرے کہ اب آئندہ کوئی لڑائی نہیں ہوگی۔"

اگر آتشین اجزا ہی ضروری قرار نہ دیے جائیں تو خاتون موصوفہ کا مضمون جہد البقا کے لئے غالب کے اس شعر کی تفسیر سے زیادہ نہیں کہ ؎

موجیم کہ آسودگی ما عدم ماست
ما زندہ بآں ایم کہ آرام نداریم

یا جیسے دور حاضرہ کے بہترین رموز شناس زندگی نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے ؎

بہ کیش زندہ دلاں زندگی جفا طلبی است
سفر بکعبہ نکردم کہ راہ بے خطر است (اقبال)

وقت کی قیمت

(از جناب مظہر صاحب انصاری)

کسی بزرگ کا قول ہے کہ "ہر دن ایک چھوٹی سی زندگی ہے" وقت کی اہمیت جتلانے کے لئے اس سے زیادہ موزوں فقرہ ملنا مشکل ہے۔ سچ یہ ہے کہ وقت نہ صرف ایک نعمت ہے بلکہ نعمت کا سرچشمہ ہے۔ کیونکہ دنیا کی باقی نعمتوں سے فائدہ اٹھانا بھی اسی پر منحصر ہے۔ دوست کتابیں صحت گھر کی دلچسپیاں وغیرہ کیا ہیں، اگر ہمارے پاس ان چیزوں سے لطف لینے کے لئے وقت ہی نہ ہو۔ بعض لوگ وقت کو "زر" کہتے ہیں، مگر نہیں یہ زر سے بھی بڑھ کر ہے۔ وقت زندگی ہے۔

اس کے باوجود بھی تم کو ایسے لوگ ملیں گے جو زندہ رہنے کی زبردست

خواہش اپنے سینوں میں رکھتے ہوئے بھی وقت کے ضائع ہونے کی مطلق پروا نہیں کرتے۔

شیلر کہتا ہے "عقلمندوں سے وقت کی قدر پوچھو۔ یہ لمحے جن کو ہم لاپرواہی سے کھو دیتے ہیں خود دوام کے خزانے میں بھی نہیں ملتے۔"

اسی طرح ڈانٹے کا قول ہے، "وقت کے فضول ضائع ہونے سے ان ہی لوگوں کو زیادہ تکلیف ہوتی ہے جو اس کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔"

مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ انسان صبح سے شام تک محنت کرتا چلا جائے اور مطلق آرام نہ لے۔ ایسا کرنا بھی عقل کے خلاف ہے۔ وقت کا بہترین مصرف یہ ہے کہ اسے مفید کاموں میں صرف کیا جائے۔ انواع و اقسام کی دلچسپیاں کھیل کود، دستکاری کام کاج وغیرہ وغیرہ کھیلوں میں حصہ لینے سے بھی یہ فائدہ ہوتا ہے کہ نہ صرف صحت قائم رہتی ہے بلکہ رگ پٹھوں کی بناوٹ پر اثر پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ کھیل کود، ورزش وغیرہ یوں بھی آدمی کو سو طرح کی برائیوں سے بچاتے ہیں۔

سست اور کاہل لوگ ہمیشہ قلت وقت کی شکایت کیا کرتے ہیں۔ مگر شاید یہ حقیقت انھیں معلوم نہیں کہ وقت کی کمی بیشی تو ہر شخص کے اپنے بس کی بات ہے۔ ہر شخص جتنا چاہے وقت کو گھٹا بڑھا سکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ قلت وقت کی شکایت کرنے والوں کے پاس وقت کی نہیں بلکہ قوت ارادی کی کمی ہوتی ہے۔ فرصت جس کا تنہا مصرف یہ ہے کہ اطمینان کے ساتھ اپنے کاروبار کے مسائل پر غور کیا جا سکے ان لوگوں کیلئے کاہلی کا آلہ بن جاتی ہے۔ پہلے تو فضول باتوں میں وقت گنوا دیتے ہیں اور بعد میں وقت وقت پیٹا کرتے ہیں۔

شیکسپیئر نے ایک جگہ کہا ہے کہ وقت مختلف لوگوں کے ساتھ مختلف رفتار سے چلتا ہے کچھ تو ایسے ہیں جن کے ساتھ وہ نرم رفتار سے چلتا ہے۔ کچھ وہ ہیں جن کے ساتھ وقت لڑھکتا ہے۔ کچھ لوگوں کے ساتھ وقت دوڑتا ہے اور کچھ وہ ہیں جن کے ساتھ وقت ایک قدم بھی نہیں چلتا۔

وقت سے فائدہ اٹھانے کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ زیادہ سے زیادہ سال یا دن یا گھنٹے تمہیں دیئے جائیں۔ دیکھنے کی بات تو یہ ہے کہ تھوڑا یا بہت جتنا بھی وقت تمہیں ملا اسے تم نے کس طرح استعمال کیا۔ والر کہتا ہے "ہم ان دائروں کی تعریف نہیں کرتے جو زیادہ پھیلاؤ رکھتے ہوں پسند صرف وہی دائرے کئے جاتے ہیں جو صحیح ناپ سے بنائے گئے ہوں۔ اسی طرح ہم زندگی کی تعریف پھیلاؤ کے لحاظ سے نہیں بلکہ عمل کے لحاظ سے کرتے ہیں۔ زندگی کی صحیح کسوٹی خیال اور عمل ہے۔ وقت کی زیادتی زندگی کو پرکھنے کا کوئی معیار نہیں۔ زندگی کے گنے چنے سانس ہمیں دیئے گئے ہیں کمی بیشی کا یہاں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مطلب کی بات صرف یہ ہے کہ ان گنے چنے سانسوں میں کتنے نیکی اور بھلائی کے کاموں میں صرف ہوئے اور کتنے گناہوں اور بدی میں ضائع گئے۔ وقت ہم جتنا چاہیں لے سکتے ہیں مگر یہ دائمی قوتیں اہرمنیت کے دھوئیں اڑانے کے لئے زندگی کے جس نقطے پر جمع ہوتی ہیں وہاں ہم کتنی جلدی پہنچ سکتے ہیں۔ دوسروں کی بہتری کے جنون سے سر کو پر رکھنا بنی نوع کی ترقی کی آگ سے سلگنا یہ ہے زندگی کی کامیابی۔

جرمی ٹیلر کہتا ہے "سستی انسان کے قوائے عمل کے لئے بمنزلہ کفن کے ہے جو کچھ نقصان اس کے ظالم ہاتھوں سے پہونچ جاتا ہے اس کی تلافی ممکن نہیں۔" ایک عقلمند اپنے بیٹے کو وقت کی بابت نصیحت کرتے ہوئے لکھتا ہے "عزیز من! ان لمحات کو اپنے قصر زندگی کی بنیاد کے پتھر سمجھو۔ ایک لمحہ بیکار گیا تو بنیاد کا ایک پتھر کم ہو گیا" یہی عقلمند ایک دوسری جگہ کہتا ہے "مجھے اس شخص پر تعجب آتا ہے جو یہ جانتے ہوئے بھی کہ انسان کی عمر طبعی اتنی مختصر ہے، اپنے وقت کو بیکار ضائع کرتا ہے۔۔۔۔ وقت کی قدر پہچانو اور ایک لمحہ بھی ضائع نہ ہونے دو" گیٹے نے کیا

خوب کہا ہے "کیا تم واقعی کام کرنا چاہتے ہو۔ اگر چاہتے ہو تو آؤ اسی لمحے سے کام شروع کر دیں اور جو کچھ ہم سے ممکن ہے کر گزریں۔ ترکی زبان کی یہ مشہور مثل تمنے سنی ہو گی کہ شیطان مصروف آدمی کو ورغلاتا ہے مگر کاہل آدمی خود شیطان کو ورغلانے میں پہل کرتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ کاہلی دنیا کی سب سے زیادہ گھناونی چیز ہے۔

سست آدمی اپنی پریشان خیالی سے اپنے ہی دماغ کو نقصان پہنچاتا ہے۔ انسانی جسم میں دل و دماغ اس طرح ہیں جیسے چکی میں دو پاٹ۔ چکی میں جب گیہوں کے دانے پڑتے ہیں اور پاٹ گھماتے جاتے ہیں تو دانے پس کر آٹے کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ لیکن اگر تم گیہوں کے دانے بالکل نہ ڈالو اور چکی کو یوں ہی چلائے جاؤ تو بہت جلد ہی رگڑ کھا کر پتھر ایک دوسرے کو خراب کر دیں گے۔

وقت پَر رکھتا ہے۔ وہ بہت تیزی سے اڑ کر اپنے خالق کے حضور میں جا پہنچتا ہے۔ اور خبر دیتا ہے کہ اسے دنیا میں کس طرح استعمال کیا گیا۔ ہماری تمام دعائیں۔ ہماری تمام التجائیں اُسے اپنے کام سے باز نہیں رکھ سکتیں۔ نہ واپس لا سکتی ہیں۔ کاش ہم نے اُسے اچھی خبریں دے کر بھیجا ہوتا۔ کتنے خوش آئند ہوتے ہوں گے وہ لمحات جب نہ صرف خبریں بلکہ ہمارے بہتر اوقات کے اعمال بھی خدا کے سامنے جا کر ہماری سعیٔ عمل کی سفارش کرتے ہوں گے۔

وقت کے خراب کرنے کو ہم وقت کا ضائع کرنا کہتے ہیں۔ مگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ دراصل وقت کا کچھ بھی ضائع نہیں ہوتا ہم خود اپنی قابلیتوں کا خون کرتے ہیں شکسپیر اپنے مشہور ڈرامے رچرڈ (دوم) میں ہیرو کی زبان سے کہلواتا ہے "آہ میں نے وقت کو ضائع کیا اب وقت مجھے ضائع کر رہا ہے"۔ یہ محض صنعت الفاظ نہیں ڈراماٹسٹ نے بڑے پتے کی بات کہی ہے۔ جو لوگ ابتدا میں وقت کی قدر نہیں کرتے وہ آخر میں ضرور نقصان اٹھاتے ہیں۔

جرمی ٹیلر کہتا ہے۔ "لوگ ہمیشہ اسی شخص کی قدر کریں گے جو اپنے وقت کی قدر کرتا ہے۔ آدمی کی اوسط عمر زیادہ سے زیادہ ستر سال ہے لیکن بغور دیکھو تو پاؤ گے کہ ستر سال میں سے گنے چنے چند سال ہی ایسے ہیں جنھیں آدمی "اپنے سال" کہہ سکتا ہے ورنہ زندگی کا زیادہ حصہ خواب و خور کی نذر ہو جاتا ہے۔ چارلس لیمپ ایک جگہ لکھتا ہے۔ میری عمر پچاس سال کی ہے مگر پچاس سال کا محض نام ہی نام ہے۔ اگر وہ تمام وقت جو میں نے دوسروں پر صرف کیا ان سالوں میں سے نکال لیا جائے تو تم دیکھو گے کہ میں تو ابھی بچہ ہی ہوں۔

مزاحیہ نویس موصوف نے جس وقت کے نکال دینے کی خواہش ظاہر کی ہے وہ وہ وقت نہیں ہے جو ہم دوسروں کی بہبودی کی فکر میں گذارتے ہیں بلکہ وہ ہے جس میں نہ ہم دوسروں کو فائدہ پہنچاتے ہیں نہ خود کو۔ سینکا نے ایک جگہ لکھا ہے۔ کچھ گھنٹے ہم سے لے لئے جاتے ہیں کچھ گھنٹے ہمارے پاس سے چوری ہو جاتے ہیں۔ اور کچھ گھنٹے ہم خود کھو دیتے ہیں۔ بہرحال ان تینوں صورتوں میں سے کوئی بھی کیوں نہ ہو وقت کا ضائع کرنا کسی طرح بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ یہ امر واقعی تعجب خیز ہے کہ ہم دن رات مسرت مسرت پکارتے ہیں اور محض لاپرواہی سے اسی مسرت کے گرانمایہ گوہر کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ ایران کی ایک کہاوت ہے کہ تقدیر جو مصیبت ڈالے اُسے تو ٹالا جا سکتا ہے مگر جو آفت انسان اپنے اعمال سے بلالے اس کا مداوا مشکل ہے۔

دشواریاں بہت ہیں........ صحیح

مصائب کا دریا موجیں لے رہا ہے .... درست......

مگر تم سست نہ بنو، کاہلی کو پاس نہ پھٹکنے دو۔

جنت کے خواب نہ دیکھو..... سورگ پر مت ریجھو..... سب کچھ کرنی کا پھل ہے۔ سب کچھ عمل کا ثمر ہے۔ سیوا کئے میوہ ملتا ہے۔ عمل زندگی ہے۔ اور زندگی کی کنجی وقت کے ہاتھ میں ہے۔ وقت

کی قدر کرو۔

کیا ابھی سے سست ہو جانا چاہتے ہو۔ ابھی دنیا میں ہزاروں کام کرنے جوگے پڑے ہیں۔

ابھی یتیم بچوں کو ماؤں کی طرح پالنے والی عورتیں نہیں ملتیں۔

ابھی بے سہارا معصوموں کو باپوں کی طرح پیار کرنے والے نہیں ملتے۔

ابھی مزدور پر ترس کھانے والا سرمایہ دار پیدا نہیں ہوا۔

ابھی ہم اس قابل نہیں ہوئے کہ لالہ و گل کے اوراق سے رنگ لا کر اپنے بچوں اور اپنی عورتوں کے رخساروں پر چمکا دیں۔

ابھی خوشی کا دور دُور ہے...... یہ سب کام کرنے کے ہیں اور ان کے علاوہ اور ہزاروں۔

تم سست کیوں ہوتے ہو...... کاہل نہ بنو...... وقت کی قدر کرو۔

ابھی انسان کی بستی سوئی ہوئی ہے۔ اسے جگانا بھی تو ہے۔

کاہل نہ بنو سستی کو جھاڑ دو۔

وقت تمہاری مدد کو تیار ہے۔ اس کا ساتھ دو۔



ایک مظلوم شریف خاتون کی دردناک داستان

میری شادی تیرہ سال کی عمر میں میرے حقیقی ماموں زاد بھائی مولانا عبدالرحمٰن صاحب ندوی نگرامی مرحوم سے ہوئی تھی۔ شادی کے چھٹے سال مولانا موصوف کا انتقال ہو گیا، اُس وقت میری عمر ۱۹ سال کی تھی اور میری گود میں دو سال کی ایک بچی بھی تھی جس کا نام آصفہ ہے۔ شوہر کے انتقال کے تقریباً تین سال بعد میرے والدین کو میرے نکاح ثانی کی فکر ہوئی، مختلف جگہوں سے پیام بھی آئے۔ لیکن کوئی قابلِ اطمینان نہ تھا۔

مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی جو بہت سی کتابوں کے مصنف اور اخبار "سچ" کے مالک اور اڈیٹر ہیں۔ میرے مرحوم شوہر کے بظاہر بڑے دوست بنے ہوئے تھے اور مرحوم کے انتقال کے بعد سے ہم لوگوں کے ساتھ ہمدردی اور خلوص کا اظہار کیا کرتے تھے۔ اس لئے ہم لوگ ان کو نہایت نیک خصلت سلیم الطبع اور بزرگ جانتے تھے۔

میری بیوگی کے کچھ عرصے کے بعد مولوی عبدالماجد اور میرے بڑے بھائی منشی حبیب الرحمٰن صاحب کے درمیان میری شادی کی بابت خط و کتابت شروع ہوئی اور انہوں نے میرے عقد ثانی کیلئے سخت سے سخت تقاضا کیا جس کی تفصیل کی اس مختصر میں ضرورت نہیں۔

اس کے بعد عبدالماجد کا ایک خط آیا جس میں انھوں نے لکھا "ڈرتے ڈرتے ایک صاحب کا نام پیش کرتا ہوں۔ ایک صاحب ایک بیوی رکھتے ہوئے دوسری بیوی کے خواستگار ہیں اگر آپ لوگ منظور کریں تو بہتر ہے"۔

اس وقت میرے والد مرحوم زندہ تھے۔ انہوں نے ایسے رشتے کو کسی طرح گوارا نہ کیا۔

ہمارے یہاں کے انکار پر عبدالماجد نے میرے بھائی کو کئی مرتبہ لکھا کہ اپنی بہن (یعنی مجھ کو) کو میری بیوی سے ملا دیجیے۔ ہم لوگوں سے جو اُن کے تعلقات تھے اس کے موافق یہ کوئی نامناسب بات نہ تھی اور نہ مجھے کچھ شبہ تھا کہ میری تقدیر کچھ اور رنگ لائے گی۔ میں اپنے چھوٹے بھائی اور بہن کو ہمراہ لے کر لکھنؤ گئی۔ اور ان کی والدہ، بیوی اور بہن سے خاتون منزل میں مل آئی۔ وہاں کسی قسم کی کوئی ایسی گفتگو نہیں ہوئی جس سے مجھے کچھ عبدالماجد کے دل کا حال معلوم ہوتا۔

ان لوگوں سے ملے ہوئے مجھے مشکل سے دو ہفتے گذرے ہونگے کہ عبدالماجد کا ایک طول طویل چار صفحے کا خط بھائی صاحب کے نام آیا جس کا خلاصہ مطلب یہ ہے۔

"آپ کی بہن اور میری بیوی سے ملاقات ہوئی۔ دوران گفتگو میں کچھ الفاظ والدہ آصفہ (یعنی میں) نے ایسے استعمال کئے جن کا میرے دل پر گہرا اثر ہوا۔ وہ یہ کہ زندگی کے ساتھی سب ہی ہوتے ہیں۔ لیکن مرنے کے بعد بچے اور وفادار دوست بھی ناآشنا ہو جاتے ہیں۔"

ان لفظوں نے میرے دل پر گہرا اثر کیا اور میں اب سب سے پہلے اپنا ہی نام پیش کرتا ہوں۔ میرے دو بچیاں ہیں۔ چھوٹی مجھے زیادہ محبوب ہے۔ جس طرح میری دو آنکھیں ہیں اسی طرح دو بچیاں ہوں گی۔ آصفہ کہہ کر بہ مسرت اپنی میری بچی کی نگہ رکھ سکتا ہوں۔ لیکن میں یکہ و غریب آدمی ہوں تحصیل سے شام تک دال روٹی کما سکتا ہوں۔ لہٰذا امیرانہ ٹھاٹھ سے نہیں رکھ سکتا۔ غصہ ور بھی ہوں تاہم ان کے ساتھ نرگزشتہ میرے میاں بیوی کے تعلقات ایسے خوشگوار ہیں کہ لوگوں کو رشک آتا ہے۔ میری اہلیہ بیمار بھی رہتی ہیں۔ عقد ثانی مسنون بھی ہے۔"

یہ خط پڑھ کر بھائی صاحب نے مجھ سے شادی کی بابت رائے لی۔ میں نے انکار کر دیا۔ لیکن بھائی صاحب اور والدہ صاحبہ نے سمجھا بجھا کر راضی کیا۔ چنانچہ اکتوبر ۱۹۳۰ء میں میں عبدالماجد کی نفس پرستیوں کا شکار بنی۔ یہ شادی میرے سسرال والوں سے پوشیدہ طور پر دریاباد میں ہوئی تھی کیونکہ وہ لوگ غیر خاندان ہونے کی وجہ سے اس شادی کے سخت مخالف تھے۔ بہرصورت اکیاون روپے مہر تھا۔ شادی کا ہونا تھا کہ عبدالماجد کے رجسٹری خطوط بکثرت تارگرام آنے لگے جن میں یہی لکھتے رہے کہ جلد بھیجئے میں اعلان کے ساتھ دوبارہ نکاح کروں گا۔

چنانچہ میں اپنے چھوٹے بھائی کے ہمراہ مع اپنی بچی آصفہ کے دریاباد گئی۔ وہاں اعلان کے ساتھ دوبارہ پھر نکاح ہوا۔ میرا قیام تقریباً ایک ماہ عبدالماجد کے یہاں دریاباد میں رہا۔ اب میری مصیبت کا آغاز ہوتا ہے۔

میرے دریاباد جانے کے دوسرے ہی روز میرے مرحوم شوہر کے چچا زاد بھائی مولوی مطلوب الرحمٰن صاحب میری لڑکی آصفہ کو لیجا کر نگرام لے جانے کی غرض سے دریاباد پہونچے۔ اُنکو دیکھ کر آصفہ دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کے اس طرح سے رونے پر میری جو حالت تھی اس کا میری ہی جیسی مصیبت زدہ عورت اندازہ کر سکتی ہے۔ میں نے اپنے غمگین اور درد بھرے دل کو سنبھالا۔ اور اسے تسلی دے کر رخصت کیا۔ تقریباً ایک ماہ بعد عبدالماجد کی اجازت سے میں اپنی چھوٹی بہن کی شادی میں دریاباد سے سندیلے آئی۔ کیونکہ اعزا اور سسرال والوں کے اختلاف کی وجہ سے ہم لوگوں کو وطن (نگرام) چھوڑنا پڑا اور سندیلہ میں جہاں میرے بڑے بھائی ملازم ہیں سکونت اختیار کرنی پڑی۔ یہیں سے ۲۹ نومبر ۱۹۳۰ء کو میری چھوٹی بہن کی شادی مسرور انجام پائی گئی۔

سندیلہ میں تقریباً ڈھائی ماہ مجھے رہنا پڑا۔ اس عرصے میں عبدالماجد کے خطوط میرے پاس بہت کم آتے تھے۔ میری طبیعت اکثر گھبراتی رہتی تھی۔ اس وجہ سے میں اور بھی جلد جلد خط بھیجا کرتی تھی۔ عبدالماجد نے مجھے لکھا "اتنی جلدی خط بھیجنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہفتے میں ایک بار خط آنا چاہیئے۔" عبدالماجد کی اس تحریر سے مجھے رنج ضرور ہوا۔ لیکن کیا کر سکتی تھی، خاموش ہو گئی اس کے بعد عبدالماجد نے چار روپے کرایہ بھیجکر مجھے لکھا کہ اپنے بھائی کے ساتھ دریاباد چلی آؤ۔ چنانچہ میں جنوری میں وہاں پہونچ گئی۔ دو ہفتے کے بعد عبدالماجد نے مجھ سے کہا کہ "میں باہر (حیدرآباد) جا رہا ہوں۔ تم اپنے میکے چلی جاؤ۔" یہ الفاظ سنکر مجھے صدمہ ہوا اور میں نے کہا کہ میں ابھی سندیلہ نہیں جاؤں گی، کیونکہ مجھے آئے ہی کتنے دن ہوئے ہیں۔

عبدالماجد کے بڑے بھائی عبدالمجید سہارنپور میں ڈپٹی کلکٹر ہیں۔ انہوں نے بھی اس سے پہلے مجھے سہارنپور بلایا تھا۔ اس لئے

عبدالماجد نے مجھے سہارنپور بھیج دیا۔ دو مہینے میں سہارنپور رہی۔ اس درمیان میں عبدالماجد کے خطوط ان کے بھائی عبدالمجید کے پاس تو برابر آیا کرتے تھے۔ لیکن انھوں نے مجھے کوئی خط نہ لکھا۔ ان کی بے رخی سے جو کچھ خیالات میرے دل میں پیدا ہوئے وہ ظاہر ہیں۔

تھوڑے دنوں کے بعد میرے بھائی صاحب نے مجھے بلانے کے لئے عبدالماجد کو خط لکھا۔ عبدالماجد نے بھائی صاحب کو جو جواب دیا قابل ملاحظہ ہے "میں نے تو مہینہ سوا مہینہ ہوا جب ہی والدہ آصفہ سے سندیلہ جانے کو کہا تھا۔ لیکن انھوں نے خود ہی عذر کیا اور سہارنپور چلی گئیں" گویا اس کے یہ معنی ہیں کہ میں بغیر ان کی اجازت کے سہارنپور گئی۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ بلکہ عبدالماجد نے خود ہی مجھے سہارنپور بھجوایا تھا۔ سہارنپور سے ماہ مارچ میں عبدالمجید صاحب مجھے راستہ میں سندیلے چھوڑتے گئے۔ یہاں ایک ماہ تک عبدالماجد کا کوئی خط میرے پاس نہیں آیا۔ میں روزانہ خطوط بھیجتی رہتی تھی۔ خدا خدا کرکے ایک خط آیا جس کے الفاظ یہ تھے "تمہارے جو خطوط میرے پاس آتے ہیں وہ خط ہی تو ہوتے ہیں یا کوئی تار ہوتے ہیں" اس کو دیکھ کر میرا دل مرجھا گیا۔ وہ خرچ کے لئے دس روپیہ ماہوار مجھے برابر بھیجتے رہے۔ جب سندیلہ آئے ہوئے مجھے چار ماہ ہوگئے تو میرے اضطراب اور بے چینی کی کوئی حد نہ رہی۔ میں نے مجبور ہوکر خود ہی لکھا کہ میں دریاباد آنا چاہتی ہوں۔ اس کے جواب میں عبدالماجد نے لکھا "ابھی موقع نہیں ہے جب موقع ہوگا بلا لوں گا" ماہ جون میں عبدالمجید صاحب نے میرے بھائی صاحب کو ایک گھنٹہ کے لئے سہارنپور بلایا۔ جولائی میں بھائی صاحب گئے تو ان سے کہا کہ "عبدالماجد تو کچھ بولتے نہیں ان کی بیوی (عفت) کی صحت روز بروز خراب ہوتی جاتی ہے۔ اس لئے ہم لوگوں کا ارادہ ہے کہ آپ کی بہن کو الگ کر دیا جائے" بھائی صاحب یہ الفاظ سن کر حیران رہ گئے۔ ان کی عجیب حالت ہوئی عبدالمجید کو انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا اور سندیلہ واپس آئے یہاں آکر تمام واقعہ بیان کیا۔ کیا بتاؤں یہ الفاظ سنکر میری والدہ محترمہ کا کیا حال ہوا۔ اور اپنی حالت میں تحریر ہی نہیں کرسکتی۔ لیکن ساتھ ہی اس کے مجھے پھر خیال ہوا کہ ممکن ہے انھوں نے مجھے علیحدہ مکان میں رہنے کے لئے کہا ہو۔ غرض میں اپنے درد بھرے دل کو طرح طرح سے تسلی دیتی رہی۔

اس کے چند ہی روز کے بعد طلاق نامہ آگیا۔ اس وقت میری عجیب حالت تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے مجھے اندھیری فضا میں پھینک دیا ہے۔ میری نظروں میں تمام عالم سونا ہوگیا۔ چاروں طرف گھری تاریکیاں نظر آنے لگیں۔

باوجود اعزہ کے شدید اختلاف کے جو خطوط تعزیت میں آئے ان میں سے ایک خط میرے حقیقی ماموں مولانا محفوظ الرحمن صاحب کا ملاحظہ کے لئے نقل کیا جاتا ہے۔

نور چشم میاں حبیب الرحمن صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ

دعا ہا۔ خدا کرے خوش رہو۔ آباد رہو۔ کل علی گڈھ سے عزیزی فرید سلمہ کا خط بزبانی ایچھن سلمہ حالات سندیلہ سے پُرغم و الم موصول ہوا۔ کل سے اس وقت تک کئی بار تم کو خط لکھنے بیٹھا۔ لیکن قلم نے یارانہ دیا کہ تم کو کیا لکھوں۔ آہ۔ یہ خبر خبر نہ تھی بلکہ ایک صاعقہ تھی جس نے تن بدن کو جھلسا ڈالا۔ ابتدا از تم لوگوں کی کوتاہ فہمی اور تمہارے عورتوں کی رائے کے پابند ہونے نے معاملہ کو ایک ناگوار اور ذلت آمیز طریقے سے تکمیل کو پہنچایا۔ اب اس نااہل اور ناخدا ترس انسان نے اس خاندان کی عزت و افتخار پر زبردست کاری ضرب لگائی ہے۔ اگرچہ اس وقت ہمارے آپ کے رسمی تعلقات تلخ ہیں۔ لیکن قدرتی واسطے کسی کے توڑے نہیں ٹوٹتے۔ اس ناگوار چیز نے کل گھر بھر کو بیچین کر دیا ہے۔ یقیناً کل روز قیامت یہ ظلم کا معاملہ رب العزت کے حضور پیش ہوگا۔ پھر

میاں ماجد دیکھیں وہاں کیا جواب دے کر سرخروئی حاصل کریں گے۔ ظلم کی ٹہنی ہری نہیں ہوتی۔ ان کو خدا کے غضب سے ڈرنا چاہئے تھا۔ آہ۔ ظالم۔

ایسی ناسپاسی کی حالت میں ظاہر ہے کہ اہل معاملہ کا کیا حال ہوگا اور ان کی پریشانی کا اثر اس معصوم بچہ پر کیا پڑتا ہوگا۔ یہ مالک کو اس واقعہ سے متاثر پاکر اس کے قلب نازک کی کیا کیفیت ہوگی۔ یہ نقشہ ہر وقت ہم لوگوں کے پیش نظر ہے۔ اور مجھے خطرہ ہے کہ اس کی صحت پر اس کا ناگوار اثر پڑے گا۔ والدعا۔ فقط۔

محمد محفوظ الرحمن عفی عنہ

ننگرام ۲۵ جولائی ۱۹۳۱ء

طلاق نامہ پہونچنے کے تقریباً ایک ہفتہ کے بعد عبدالماجد کا ایک خط میرے نام آیا۔ اس میں لکھا تھا۔

"میں جس وقت تک تمہاری خدمت جاری رکھوں گا اور میرا ارادہ ہے کہ تمہارا ہاتھ کسی شریف کے ہاتھ میں دے دوں گا۔" یہ خط پڑھ کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ لیکن کیا کر سکتی تھی، خون کا گھونٹ پی کر رہ گئی۔

اس کے بعد بھائی صاحب نے عبدالماجد کے پاس خط لکھا۔ جس کا مختصر مضمون یہ ہے کہ آپ نے ہم لوگوں کے ساتھ بدعہدی کی ہم لوگوں پر ظلم کیا اور بالکل ذبح کر دیا۔ اور زندہ درگور کر دیا ہے آپکو معلوم ہے کہ باوجود اعزا کی شدید مخالفت کے ایسا کیا گیا تھا۔ صرف والدہ رافت سلمہا کی صحت کے خیال سے ایسا کرنا کسی طرح آپکے لئے مناسب نہ تھا۔ کہ ایک مجبور و لاچار ہستی کو پامال کر دیا گیا۔ شریعت میں یہ فعل نہایت قبیح اور مبغوض ہے۔ اس کا آپ نے کچھ خیال نہ کیا۔ اس کے جواب میں عبدالماجد کا جو خط بھائی صاحب کے پاس آیا بعینہٖ نقل کیا جاتا ہے۔

بسم اللہ

دریاباد ۱۴ جولائی ۱۹۳۱ء

منشی حبیب الرحمن صاحب! وعلیکم السلام

آپ کے دو خط ملے۔ ایک بھائی صاحب کے نام، دوسرا خود میرے نام۔ میں چار روز کے بعد ابھی لکھنؤ سے واپس آیا ہوں۔ اس لئے جواب آج سے قبل لکھنا ممکن نہ ہوا۔

آپ کو رنج و صدمہ ہونا قدرتی ہے اور ایسی مغلوبیت کی حالت میں انسان ایک بڑی حد تک عنداللہ و عندالناس معذور ہو جاتا ہے۔ لیکن اس مانعت کے لئے بھی کچھ حدود ہوتے ہیں۔ بار بار ہم لوگوں کو گردن کاٹنے۔ ذبح کرنے قتل کر ڈالنے۔ ظلم کرنے۔ بدعہدی کرنے۔ تباہ کر ڈالنے کا مجرم قرار دینا۔ والدہ رافت سلمہا کی علالت کی بحث چھیڑنا یہ سب ان حدود سے تجاوز کر جاتا ہے۔ اسباب افتراق کی تفصیل ابتک میں نے آپ ہی لوگوں کی دلشکنی کے خیال سے نہیں کی تھی۔ ایسا نہ ہو کہ آئندہ مجبوراً یہ بھی کرنا پڑے۔ صورت حال جو آپ نے تحریر کی ہے وہ تمام تر خلاف واقعہ ہے۔ آئندہ اس قسم کے خطوط لکھ کر مجھے مجبور نہ کیجے۔ کہ تمام سچائیوں کو ظاہر کر دوں۔

اپنے اعزہ کی جو شکایتیں آپ نے لکھی ہیں ممکن ہے صحیح ہوں۔ لیکن ظاہر ہے کہ ان معاملات سے ہمارا کیا واسطہ؟ اور ہم لوگ بجز زبانی ہمدردی و اظہار تاسف کے اور کیا کر سکتے ہیں؟۔

جو کچھ کیا گیا ہے آپ یقین کریں یا نہ کریں مگر واقعہ یہ ہے کہ اس میں بڑی حد تک آپ لوگوں کی بہتری اور بھلائی کو ہی پیش نظر رکھا گیا ہے۔ یہ مسئلہ آپ کو کسی نے غلط بتا دیا ہے کہ طلاق ہر صورت میں عنداللہ مبغوض ہے۔ طلاق تو خود حضور انور صلعم نے دی ہے۔ اور صحابہ کرام نے بکثرت طلاقیں دی ہیں مطلقہ کے ساتھ نکاح بھی ان حضرات نے بہ کثرت کئے ہیں۔ اسے عیب تو ہماری موجودہ سوسائٹی نے بنا دیا ہے جس میں عقد بیوہ۔ تعدد ازدواج وغیرہ بھی داخل عیوب ہیں۔ شریعت نے جس طلاق کو ناپسند کیا ہے

وہ وہ ہے جو شوہر بلا وجہ معقول عورت کو ستانے کے لئے یا محض اپنی نفس پرستی کے لئے دیتا ہے نہ کہ وہ طلاق جس کا مقصد یہ ہو کہ زن و شوہر دونوں ایک دوسرے کی صحبت ناموافق سے آزاد ہو جائیں، یہ تو عین رفع ظلم ہے نہ کہ ظلم — آپ نے جس جذبہ ہمدردی کا واسطہ دلایا ہے یہ اسی کا تقاضا ہے جو افتراق و قطع تعلق پر مجبور کر رہا ہے۔ ظلم اگر مقصود ہوتا تو اس کی متعارف صورتیں دوسری ہیں جن سے میں آپ بھی ناواقف نہیں ہو سکتے۔ عبدالماجد

یہ خط دیکھکر مجھے اور بھی صدمہ ہوا کہ واللہ اعلم وہ کون سی سچائیاں ہیں، اور اسباب افتراق کی خدا جانے کیا تفصیل ہے میں تو بالکل بے قصور ہوں، مجھ سے کوئی ایسی شدید خطا سرزد نہیں ہوئی کہ یہ نوبت آئی — اس کے بعد میں نے خود ایک خط لکھا کہ آخر مجھے دنیا کیا کہے گی اور خدا جانے میرے متعلق لوگوں کا کیا گمان ہو عبدالماجد نے میرے خط کا جو جواب دیا بعینہ نقل کیا جاتا ہے

بسم اللہ

دریاباد ۱۲ جولائی ۳۱ء

والدہ آصفہ سلمہا۔ وعلیکم السّلام۔ کئی دن ہوئے خط ملا تھا۔ اللہ کی مشیت میں جو ہوتا ہے، وہی ہو کر رہتا ہے۔ بندہ کا کام یہ ہے کہ جو کچھ بھی پیش آئے، اس پر صبر کرے۔ تم نے لکھا کہ لوگ تم پر طرح طرح کی تہمتیں لگائیں گے۔ ان تہمتوں کی تردید میں جو کہو میں لکھ بھیجوں۔ جھوٹی تہمت لگانے والے خود اپنا نامۂ اعمال سیاہ کریں گے۔ میں نے کئی دن ہوئے تمہارے بھائی کو لکھا تھا کہ تکمیل ضابطہ کے لئے مہر کی کل رقم کی رسید میرے پاس بھیجدیں تو بقیہ رقم فوراً بھیجدوں۔ رسید ابھی تک نہیں آئی رقم تیار رکھی ہے۔ صرف تمہاری رسید کا انتظار ہے۔

رسول اللہ صلعم نے صرف ایک بیوی حضرت سودہ رضؓ کی طلاق واپس لی ہے، باقی دو بیویاں ایسی اور ہوئی ہیں جنہیں طلاق دیکر واپس نہیں لی ہے۔ شرعاً یہ ایسی کوئی بری بات نہیں ہے صرف ہمارے موجودہ رواج نے اسے اتنا برا بنا رکھا ہے جیسے دوسرے عقد کو برا سمجھ لیا گیا ہے۔ عبدالماجد

جو خط عبدالماجد کا میرے بھائی صاحب کے نام ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملے میں میں خطادار ہوں اور اگر افتراق کی تفصیل اور سچائیاں ظاہر ہوں تو مجھے شرمندہ ہونا پڑے۔ اس کے ہفتہ بھر ہی کے بعد میرے نام جو خط آیا ہے اس سے میں ہر قصور سے بالکل بری الذمہ قرار دی جاتی ہوں۔ اب کون کہہ سکتا ہے کہ صحیح بات عبدالماجد کے نزدیک پہلی ہے یا دوسری — رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا اور صحابہؓ کا بیویوں کو طلاق دینا یہ میری تسلی کے لئے لکھا گیا ہے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوات بھیجنے کے لئے۔ طلاق مبغوض نہ ہوگی، دنیاوی رسمیں بری ہی سہی مگر شریفوں کے جذبات کے موافق جیسی ہو سکتی ہیں ظاہر ہے — عبدالماجد نے مہر کے روپے بھی بھائی صاحب کے پاس روانہ کئے تھے۔ لیکن میں نے واپس کر دے — اس کے بعد میں نے تھانہ بھون مولانا اشرف علی صاحب کے پاس اور دارالعلوم دیوبند مولانا حسین احمد صاحب کے پاس خطوط بھیجے کیونکہ عبدالماجد مولانا اشرف علی صاحب کے معتقد اور مولانا حسین احمد صاحب کے مرید ہیں۔ ان حضرات کے پاس خطوط بھیجنے کی غرض صرف یہ تھی کہ ممکن ہے اس مصیبت قبیحہ سے نکلنے کی کوئی صورت پیدا ہو جائے مولانا اشرف علی صاحب نے تو میرے خط کا کوئی جواب ہی نہیں دیا۔ مولانا حسین احمد صاحب نے جو خطوط مجھے اور بھائی صاحب کو تحریر فرمائے وہ نقل کئے جاتے ہیں۔ اصل خطوط میرے

پاس محفوظ ہیں۔

محترمہ من سلمکم اللہ تعالیٰ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ آپ کا والانامہ حسرت اور رنج سے بھرا ہوا پہونچا۔ نہایت زیادہ قلق اور افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ آپ کی دستگیری فرمائے آمین۔ میں مولانا عبدالماجد صاحب کو لکھ رہا ہوں۔ مگر وہ فرماتے ہیں کہ پہلے مجھے بہت سی باتوں کا وہم وگمان بھی نہ تھا جو کہ بعد از عقد پیش آئیں۔ وہ آپ کے کسی معاملہ میں بدخلقی وغیرہ کے شاکی نہیں ہیں۔ انہوں نے نکاح سے پہلے مدت دراز تک فکر اور غور اور جد وجہد جاری رکھا کہ کوئی مناسب اور مفید موقعہ ہاتھ آجائے جہاں پر آپ کا عقد ثانی ہوجائے مگر وہ اس میں کامیاب نہیں ہوئے۔ تب انہوں نے ارادہ کیا تھا کہ میں خود ہی عقد کروں اور جیسا کہ انہوں نے آپ سے وعدہ کیا تھا اسی ارادے پر پختہ تھے مگر عقد کرتے ہی ان پر چاروں طرف سے مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ یہ گھاٹی اس قدر دشوار گزار ہوگی۔ بالآخر وہ صبر نہ کرسکے۔ اور معاملہ پیش آیا۔ خط وکتابت میں جو آخری جواب ہوگا میں پھر پیش کروں گا۔ محترمہ من قسمت کی بات کوئی نہیں جانتا۔ راضی بہ تقدیر رہنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ آپ کے لئے بہترین صورت کردے۔ خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہوجئے۔ والسلام ۲۰ ربیع الاول ۱۳۵۰ھ

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ

دوسرا خط ملاحظہ ہو۔

محترمہ من سلمکم اللہ تعالیٰ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ آپ کا والانامہ باعث سرفرازی ہوا تھا۔ چونکہ میں تقریباً دو ماہ سے پھوڑے پھنسی وغیرہ میں مبتلا ہوں۔ ادھر مشاغل تدریس وغیرہ سے فرصت نہایت کم ہوتی ہے۔ اس لئے جواب میں تاخیر ہوئی۔ مولانا عبدالماجد کا والانامہ آیا تھا۔ وہ اپنی انتہائی مجبوریوں کا ذکر کرتے ہیں ان کو اس قسم کی مجبوریوں کا خیال تک بھی نہ تھا جہاں تک مجھ کو ان کے کلمات سے اور اب کے کلمات سے پتہ چلتا ہے وہ یہی ہے کہ ان کو آپ سے پہلے بھی بعد۔ دی ہی نے مجبور کیا تھا کہ عقد کریں۔ ان کی ہرگز نیت نہ تھی کہ خدانخواستہ وہ جدا کریں گے۔ مگر یہ واقعہ اعزہ واقارب اور خصوصاً والدہ ماجدہ وغیرہ کے احکام کے ایسے پیش آئے کہ سوائے سر جھکانے کے کوئی چارہ کار ہی نہ رہا۔ مجھ کو بھی سخت افسوس ہے کہ ایسا واقعہ کیوں پیش آیا اور ان کو بھی بہت ہی زیادہ رنج اور الم ہے۔ مگر تقدیرات الٰہیہ میں کس کا چارہ ہے۔ آپ کے لئے اگر خوش قسمتی مقدر ہوتی تو مولانا عبدالرحمٰن صاحب ہی کا انتقال کیوں ہوتا۔ مالک قضاء وقدر نے جس طرح چاہا مقرر فرمایا۔ کسی کا اس میں کیا اختیار ہے۔ آپ نے بہت بڑا جہاد کیا تھا کہ نکاح ثانی قبول فرمایا۔ اب یہ دوسرا جہاد پیش آیا۔ اللہ تعالیٰ آپ کی دستگیری فرمائے اور دین ودنیا میں آپ کی فائز المرامی اور خوش کامی کی صورت ظہور میں لائے۔ بجز صبر وشکر کیا چارہ ہوسکتا ہے۔ مولوی صاحب موصوف فرماتے ہیں کہ میں مصارف روانہ کرتا ہوں مگر آپ کی طرف سے واپسی ہوتی ہے۔[1] اس لئے میں عرض کرتا ہوں کہ وہ جو کچھ اخراجات کے لئے روانہ کریں قبول فرمالیا کریں کیا عجب ہے کہ وہ اپنی زندگی بھر آپ کی اس قسم کی خبرگیری فرماتے رہیں۔ آپ کو اب بجز صبر کیا چارہ ہے میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ کریم وکارساز آپ کی پردۂ غیب سے اعانت فرمائے آمین۔ از دیوبند

۹ جمادی الاول ۱۳۵۰ھ ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ

اسی سلسلے میں بھائی صاحب کے پاس جو مولانا حسین احمد صاحب کا خط آیا وہ بھی درج ذیل کیا جاتا ہے

مکرم المقام جناب فیضمآب منشی حبیب الرحمٰن صاحب زید مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ والانامہ باعث سرفرازی ہوا۔ میں

---

[1] [illegible] روانہ کئے تھے وہ میں نے واپس کردئے تھے۔ عبدالماجد نے طلاق کے بعد میرے پاس ایک پیسہ نہیں بھیجا۔

نے مولانا عبدالماجد صاحب سے اس امر میں خط و کتابت کی۔ یوں تو اسرار کا جاننے والا خالق کون و مکان ہی ہے مگر جہاں تک ان کی پہلی اور اب کی تحریرات اور زبانی گفتگو میں بتلاتی ہیں ان کی نیت بد نہ تھی اور اس عقد ثانی میں ان کو محض ہمدردی اور خبر گیری ہمشیرہ محترمہ کی مقصود تھی اسی کے ساتھ ساتھ عقد ثانی کا اجرا بھی منظور تھا۔ اگرچہ انہوں نے اس امر میں مستقبل کی دشواریوں کو سوچا سمجھا تھا مگر ان کو اندازہ میں غلطی ہوئی۔ جس قدر وہ سمجھ رہے تھے اس کے متعلق ان کا گمان تھا کہ میں تحمل کر لوں گا، مگر خلاف امید ان کو اس قدر مشکلات کا سامنا ہو گیا جن کو تحمل کرنا ان کی طاقت سے باہر تھا۔ اور پھر بھی ایک عرصہ تک وہ برداشت فرماتے رہے مگر جبکہ بالکل ہی مجبور ہو گئے اس وقت بجز اس صورت مکروہہ کے کوئی مفر ان کو نظر نہ آیا۔ انہوں نے اپنی قدیمی سسرال والوں کے جور و جفا کو برداشت کیا اور کے اعزہ و اقارب کے طعنوں اور تشنوں کو جھیلا۔ قریبی رشتہ داروں کی بھی مگر والدہ ماجدہ کے احکام کا ٹالدینا سخت دشوار اور دین و دنیا کی بربادی کا باعث تھا۔ جناب کو معلوم ہے کہ حکم شرعی کی وجہ سے انسان مجبور ہو جاتا ہے کہ اگر والدین بلا سبب بھی لڑکے کو حکم کریں تو اس پر ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی عزیز اہلیہ سے جدائی اختیار کرے اگرچہ انہوں نے عقد سے پہلے اپنی قدیمی اہلیہ اور والدہ ماجدہ اور بڑے بھائی وغیرہ کو راضی کر لیا تھا مگر بعد از عقد یہ سب کچھ دنوں میں بدل گئے اور ایسی ایسی مشکلات ان کے سامنے آگئیں کہ ان کے موجود ہوتے ان کا اپنے وطن اور گھر بار میں رہنا اور زندگی بسر کرنا دشوار تر بلکہ تقریباً محال ہو گیا یہ سب بھی جھیل جاتے اگر والدہ ماجدہ کا حکم نہ ہوتا۔ میں مولوی صاحب موصوف کو جھوٹا نہیں سمجھتا۔ مجھ سے اس امر کی متعلق بہت زیادہ رد و قدح کی اور نوشت و خواند کی نوبت آ چکی ہے۔ ادھر آپ کی مشکلات بھی واقعی اور بہت زیادہ رنجدہ ہیں افسوس یہ تقدیری معاملات ہیں ان میں دم مارنے کی گنجائش نہیں۔ جس طرح آپ نے ایک ایسے ہونہار قابل بھائی کی نوجوانی کی موت پر صبر کیا اور یہی وہ مصیبت تھی جو کہ تمام مصائب کی سرچشمہ بلکہ تمام خاندان کے لئے ایک ناقابل تلافی مصیبت تھی تو پھر اس مصیبت پر بھی صبر فرمائیں۔ میں جہاں تک خیال کرتا ہوں مولوی صاحب موصوف دروغ گو، مکار، شہوت پرست نہیں ہیں مگر تقدیری معاملات کے سامنے بڑوں بڑوں کو گھٹنے ٹیکنے پڑتے ہیں اور جن باتوں کا وہم و گمان بھی نہیں ہوتا ان کو برداشت کرنا ہوتا ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو وجود خالق کا اقرار کرنا مشکل ہو جائے۔ آپ کی عالی ظرفی اور شرافت کا مقتضیٰ یہی تھا جو جناب نے کیا کہ ایسی گندگی کو اچھالنے سے پرہیز فرمایا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عنایت فرمائے اور آپ کی مشکلات کو دور فرمائے۔ دعوات صالحہ اور خدمات لائقہ سے فراموش نہ فرمائیں۔ والسلام از دیوبند ۹ جمادی الاول ۱۳۵۰ھ

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ

میری حالت شدت رنج و غم سے بالکل دیوانوں جیسی ہو گئی، مجھ میں بالکل سکت نہ رہی ہاتھ پیر اور بقیہ تمام جسم ٹھنڈا ہو گیا تھا لکھنؤ میں ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کا علاج ہوا۔ میں اپنی اس ردی حالت سے ذرا بھی متفکر نہ تھی۔ میری دلی تمنا یہی تھی کہ موت آکر جلد میرے مصائب و آلام کا یک لخت خاتمہ کر دے ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کے علاج سے مجھے قدرے سکون ضرور ہوا۔ لیکن اب چار پانچ ماہ سے میری حالت روز بروز بالکل ردی ہوتی جاتی ہے، اٹھنے بیٹھنے سے بالکل معذور ہوں۔ اب چارپائی پر سے ہلنے کی طاقت بھی نہیں ہے، ابتدا میں دق جیسی کیفیت تھی، حرارت قائم ہو گئی تھی، کھانسی بے حد تھی مگر اب چار پانچ روز سے بلغم کے ساتھ کچھ خون کی آمیزش ہے، علاج ہو رہا ہے لیکن بظاہر کوئی امید نہیں۔ خداوند کریم سے میری دلی تمنا یہی ہے کہ مجھے جلد از جلد ان دنیاوی مصائب سے

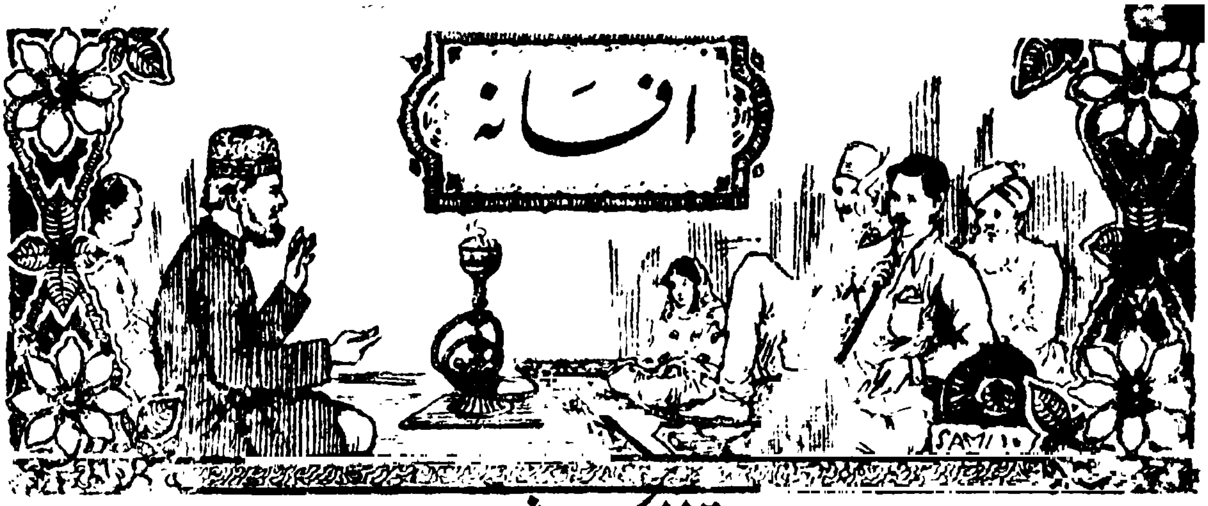
نجات دے اور اپنے حبیب پاک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل میں ایمان کے ساتھ اپنی اس ادنیٰ کنیز کو آغوش رحمت میں لے کر خاتمہ بالخیر کرے۔ آمین یارب العالمین! — ان تمام واقعات میں سب سے زیادہ قابل لحاظ یہ امر ہے کہ عبدالماجد اپنے پیر مولوی حسین احمد صاحب کو تو طلاق کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ والدہ نے مجبور کیا اور میرے بھائی کو جو خط لکھا ہے اس میں یہ تحریر فرماتے ہیں کہ "اسباب افتراق کی تفصیل اب تک میں نے آپ ہی لوگوں کی دل شکنی کے خیال سے نہیں کی تھی، ایسا نہ ہو کہ آیندہ مجبوراً یہ بھی کرنا پڑے ...... آیندہ اس قسم کے خطوط لکھکر مجھے مجبور نہ کیجئے کہ تمام سچائیوں کو ظاہر کردوں" حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں تحریروں میں سے ایک بھی سچی نہیں لیکن عبدالماجد نے یہ چال چلی کہ اُدھر تو اپنے پیر کو بھی خوش رکھنا چاہا اور اِدھر میرے اعزہ کو ایسا خط لکھا، جس سے وہ ڈر جائیں اور اس معاملہ کو آگے نہ بڑھائیں۔ دوسرا جھوٹ انہوں نے اپنے پیر سے یہ بولا کہ وہ مصارف روانہ کرتے ہیں لیکن میں واپس کردیتی ہوں حالانکہ یہ بھی بالکل غلط ہے۔ علاوہ اس کے یہ امر بھی قابل غور ہے کہ کیا پہلے نکاح کے وقت عبدالماجد ایسے مدعی زہد و اتقا نے اپنی والدہ سے اجازت نہ لی تھی، یقیناً لی ہے، پھر نکاح کے بعد ان کی مخالفت کیسی۔ اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے پیر مولوی حسین احمد صاحب کو (ناراضی والدہ کا) جو سبب بتایا وہ بھی بالکل بے بنیاد ہے بہرحال میں ان تمام واقعات کو پبلک اور علماء دین و اکابر ملت کے سامنے رکھ کر چاہتی ہوں کہ وہ خود فیصلہ کریں اور دیکھیں کہ دنیا میں ایسی بزرگ صورت، گلیم پوش، تسبیح خواں صورتیں بہت سی ہوتی ہیں جن کے دل خواہشات نفسانی، مکر و فریب اور نفاق سے لبریز ہوتے ہیں۔ اور وہ اسی طرح خفیہ طور پر ظلم کرتے رہتے ہیں۔ جن کا علم کسی کو نہیں ہوتا۔

میرا ارادہ نہ تھا کہ یہ واقعات ملک کے سامنے پیش کئے جاتے کیونکہ عبدالماجد کے مظالم سے مجھ پر تو جو کچھ مصیبت گزرنا تھی گزر رہی ہے۔ دق، سل جیسے لا علاج مرض میں مبتلا ہو کر زندگی کے دن گن رہی ہوں لیکن میں چاہتی ہوں کہ میرے اس جاں گداز واقعہ سے میری بہنیں اور ان کے والدین عبرت حاصل کریں اور ایسی مقدس ہستیوں سے بچنے اور بچانے کا ہمیشہ خیال رکھیں اور ملک کو بتائیں کہ ایسے لوگوں سے بچنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔

فاعتبروا یا اولی الابصار

زندہ درگور

ظ۔ بیوۂ مولانا عبدالرحمٰن صاحب ندوی نگرامی مرحوم



مستحق کی تلاش

(ترجمہ از جرمنی۔ مترجمہ جناب معین الدین صاحب شمسی دہلوی)

لکھ پتی بھی دوسرے معمولی انسانوں کی طرح ہوتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ ذرا امیر ہوتے ہیں۔

مارٹن۔ جو ایک بہت امیر شخص ہے اور کئی لاکھ کی مالیت رکھتا ہے اپنے کام کے کمرے میں بیٹھا ہوا ہے۔ میز پر جو گھنٹی رکھی ہوئی ہے اُسے دباتا ہے اور منتظر ہے۔ ایک منٹ بھی پورا نہ گزرنے پایا تھا کہ اس کی سکرٹری مس چام نمودار ہوتی ہے۔ کچھ عرصہ تک وہ ٹکٹکی باندھے اس کی طرف خاموش دیکھتا رہا ——— مس چام صنف لطیف کے ان افراد میں سے ہیں جن کے لئے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے کی تکلیف بخوشی گوارا کی جاتی ہے ——— پھر کہا

مس چام میں نے ابھی ارادہ کیا تھا کہ پانسو پونڈ کا چک اس انجمن کے نام کاٹ دوں جس کے زیر اہتمام غریب حبشی بچوں کے کپڑوں کا انتظام ہو رہا ہے لیکن پھر یہ خیال دامنگیر ہوا کہ میں خود ہی اس مصیبتوں بھرے شہر یعنی لندن میں کیوں نہ پھروں اور اپنی سخاوت اور خیرات کے لئے کوئی بہتر مستحق تلاش کروں۔ تجوری (   ) میں ذرا دیکھنا کہ پانسو پونڈ کے بیس بیس پونڈ والے نوٹ ہیں یا نہیں؟

ہوشیار اور فرض شناس سکرٹری نے بہت مستعدی سے جواب دیا۔ "جی ہاں۔ ہیں"

ازراہ مہربانی مجھے یہ رقم فوراً لادو۔

وہ گئی اور بہت جلد رقم لے کر واپس آئی۔

لکھ پتی نے مس چام کا شکریہ ادا کیا اور کہا "آج میں کوئی دوسرا کام نہیں کروں گا۔ لہٰذا مجھے اب آپ کی ضرورت نہیں"

پانسو پونڈ اس نے اپنے کوٹ کی سیدھے ہاتھ والی جیب میں رکھے اور سوائے اتنی دیر کے کہ ٹوپی۔ زرد دستانے اور چھتری۔ جو یہیں اور دوسری چھتریوں کے ساتھ ملی جلی رکھی تھی لے اس نے ذرا توقف نہ کیا اور گھر سے روانہ ہو گیا۔

گرمیوں کے موسم میں سہ پہر کا نہایت خوشگوار اور دلکش وقت تھا۔ اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ وہ بغیر کسی منزل مقصود کی تعین کے بغیر اس وقت تک ادھر ادھر پھرتا رہے گا۔ جب تک کہ اس کی معہود شے یعنی کوئی مستحق نہ مل جائے۔ لندن ایسے بڑے شہر میں جہاں مفلسی بمقابلہ امارت کے کثرت سے پائی جاتی ہو ایسی ہستیوں کا ملنا واقعی امر محال نہ تھا۔

ایٹن پلیس سے جو اس جیسے ہی لکھپتیوں کا محلہ ہے وہ مشرق

کی جانب وارولسٹر ٹاؤن سے ... لندن کے ایک حصہ کا نام ہے اور ہائڈ پارک کے جنوب مشرق میں واقع ہے) ہم نے وہاں ایک ایک شخص خراب خستہ حالت میں میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے نظر آیا۔ وہ "اورگل" (ایک قسم کا باجہ) بجا رہا تھا اور خالی الذہن نظروں سے سامنے دیکھ رہا تھا۔

سڑک کی دوسری پٹری پر سے "مارٹن" نے کھڑے ہو کر نہایت دلچسپی سے اس کی طرف دیکھنا شروع کیا۔ جیسے کہ کوئی موجد کسی حقیقت کے انکشاف کا غور سے مطالعہ کرتا ہے۔ چونکہ مردم شناسی میں کمال رکھتا تھا اور پہچان گیا کہ یہ وہی شخص ہے جس کا وہ متجسس سا ہے۔ پھر وہ سڑک کی دوسری طرف گیا۔ "اورگل" پر جو کچھ تحریر تھا غور سے پڑھنا شروع کیا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ اس شخص کی ایک بیوی اور چھ بچے ہیں جن کا تمام خرچ اس کے ذمہ ہے اور وہ ہر قسم کی محنت اور مزدوری کرنے کے لئے تیار ہے۔ شاید اس کا آخری دعویٰ امتحان کی کسوٹی پر پورا نہ اترتا۔ لیکن مارٹن ان چھوٹی چھوٹی باتوں کی وجہ سے اپنے ارادے سے ہٹنے والا نہ تھا۔ وہ شخص صبر کے ساتھ اپنی ٹوپی بھیک کے لئے آگے پھیلائے ہوئے تھا۔ لیکن لکھپتی نے اس کی ٹوپی کی طرف توجہ نہیں کی بلکہ سلسلۂ گفتگو اس طرح شروع کیا۔

"میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں"

باجہ والا اورگل کی ناخوشگوار آواز کی وجہ سے کوئی بات نہ سمجھ سکا۔ اور نہ باجہ کو بند کرنے پر رضامند ہوا۔ بلکہ اپنے سر کو آگے کی طرف جھکا کر اجنبی شخص کے سنجیدہ الفاظ کو جمع کرنے اور ترتیب دینے کی کوشش کی اور کہا

"جناب من۔ فرمائیے۔ فرمائیے۔ میں سراپا گوش ہوں"

لکھپتی نے جتنا اس سے چیخا گیا چلا کر کہا "تم کس وجہ سے اس بات کے لئے آمادہ نہیں ہوتے کہ ذرا اپنے ہاتھوں کو جو برابر دائرہ کی شکل میں حرکت کر رہے ہیں اور اس دماغ خراش باجہ کی آواز کو ایک لمحہ کے لئے روک لیتے تاکہ میں ذرا اپنے نرخرے پر زیادہ زور ڈالے بغیر تم سے گفتگو کرسکوں۔

اس شخص نے طوعاً کرہاً اورگل کا پہیہ پھرانا بند کر دیا اور گفتگو کا منتظر ہوا۔

"جیسا کہ مجھے معلوم ہوا ہے۔ تمہاری ایک بیوی اور چھ بچے ہیں؟"

"بالکل ٹھیک" یہ الفاظ باجے والے نے ذرا جزبز ہو کر کہے کیونکہ اُسے خوف تھا کہ کہیں لکھپتی کے دل میں تحریر کے متعلق شک نہ گذرے۔

"اور اس کے ذریعہ تم ہفتہ وار کتنا کما لیتے ہو" ساتھ ہی لکھپتی نے اپنی چھتری کے ذریعہ باجہ کی طرف اشارہ کیا۔

باجہ والے نے تفصیل کو غیر ضروری سمجھ کر بے پرواہی سے جواب دیا "کچھ زیادہ نہیں"

"ہوں! سمجھا" حالانکہ لکھپتی کچھ بھی نہیں سمجھا اور کہا "کیا تم مجھ سے پانچ سو پونڈ لینے منظور کر لوگے؟"

باجہ والے نے تبسم کے بعد کہا "واقعی! آپ بھی عجیب آدمی ہیں؟"

"میرا مطلب یہ ہے کہ کیا تم اس بات پر راضی ہو.........؟"

"آپ نے جو کچھ کہا ہے وہ میں نے سُن لیا۔ ہاں ہاں۔ لیکن بات دراصل یہ ہے کہ مجھے ایسا خراب مذاق پسند نہیں۔ اب آپ کھسکئے میں تو ایک غریب اور مفلس آدمی ہوں اور اس باجہ کے ذریعہ حلال کمائی کھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ آپ میرا مذاق اڑانے آئے ہیں۔ آپ کو شرم آنی چاہئے۔ آگے جانے کی فکر کیجئے اور مہربانی کرکے جلدی سے؛"

"لیکن سنو تو سہی..........؟"

"بس دل لگی ختم۔ میں اس قسم کے لوگوں کو خوب اچھی طرح جانتا ہوں۔ جو گلیوں اور بازاروں میں اِدھر اُدھر پڑے پھرتے

اور انہیں سوائے دوسروں کو پاگل اور بیوقوف بنانے کے دوسرا کام نظر نہیں آتا۔ لیکن یہ یاد رہے کہ تم میرے پتہ پر ٹھیک نہیں پہنچے۔ اگر تمہارا یہ خیال تھا کہ میں اس قسم کی باتوں پر کان دھروں گا...

اس شخص نے فوراً گفتگو کے سلسلہ کو منقطع کر کے باجہ کا ہینڈل بہت جلدی جلدی چلانا شروع کر دیا۔

مارٹن اپنے احساسات ہمدردی کے اس بے پرواہی سے ٹھکرائے جانے کی وجہ سے آگے بڑھا اور ایکلیڈ سٹن بلیس کی طرف رُخ کیا۔ وہاں پہنچکر اس کی نظر ایک بڈھے پر پڑی جو سڑک صاف کرنے کا برش ہاتھ میں لئے آہستہ آہستہ چلا جا رہا تھا۔ غالباً کام سے فارغ ہو کر گھر کی طرف جا رہا ہوگا۔ اس کا چہرہ زردی مائل تھا۔

مارٹن نے قریب جا کر کہا "گڈ ڈے"

برش والے آدمی نے جواب دیا "گڈ ڈے۔ جناب" اور اپنی بوسیدہ اور میلی کچیلی ٹوپی کو بھی ساتھ ہی ذرا پیچھے کی طرف سرکایا۔

مارٹن نے اس کے گھسے ہوئے فرسودہ جوتوں کو سرسری طور سے دیکھا لکھپتی نے سلسلہ گفتگو کی تمہید اس طریقہ پر کی "کیا تمہاری ایک بیوی اور چھ بچے ہیں؟"

نہیں جناب۔ خدا کا شکر ہے کہ میں اس بلا سے محفوظ ہوں۔ ہاں ایک بیوی تو ضرور ہے۔ لیکن ایک ایماندار اور دیانتدار شخص کے لئے ایک بیوی کا بوجھ کیا کچھ کم ہے۔ لیکن آپ کا مطلب"

"ارے بھئی میں یہ باتیں بہت شوق سے پوچھا کرتا ہوں اور مارٹن نے اپنی چھڑی اس کے برش پر آہستہ سے مارتے ہوئے پوچھا تم اس کے ذریعہ ہفتہ وار کیا کما لیتے ہوگے؟

تفصیل کو غیر ضروری سمجھ کر بے پرواہی کے لہجہ میں اس نے جواب دیا "کچھ زیادہ نہیں"

لکھپتی نے ٹھنڈا سانس بھرا اور دل میں کہا معلوم ہوتا ہے کہ مالی حالت کے متعلق جو سوال کیا جائے اس کا یہی جواب ہر شخص کے نوک زبان اور نقش دل ہے۔ پھر اس نے ایک جھرجھری لیکر پوچھا۔

"کیا تم مجھ سے پانسو پونڈ لینے منظور کر لوگے؟"

"کیا۔ آہ"

"میرا سوال یہ تھا کہ کیا تم پانسو پونڈ مجھ سے لینے قبول کر لوگے"

پانسو کی رقم کی بجائے اگر ایک ہزار پونڈ کے متعلق سوال کریں تو شاید میں اس مسئلہ پر غور کرنے کی تکلیف گوارا کروں" اس نے یہ جملہ کہہ کر ایک زور کا قہقہہ لگایا۔

"میں مذاق نہیں کر رہا" لکھپتی نے بطور ثبوت بیس پونڈ والے نوٹوں کی گڈی جیب سے نکال کر اس بڈھے کی طرف بڑھائی۔

لیکن اس نے اپنی تمام عمر میں بیس پونڈ والا نوٹ بھی کبھی نہ دیکھا تھا۔ ہاں شاذ و نادر ایک پونڈ والا نوٹ تو نظر سے گذرا تھا۔

اس نے لکھپتی کو مشکوک نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا اور اس کا شک ہر نگاہ کے ساتھ ترقی کر رہا تھا۔ پھر پوچھا

"یہ کاغذوں کا پلندہ کیسا ہے؟"

"یہ بیس پونڈ والے نوٹ ہیں اور کل پچیس عدد ہیں یعنی پانسو پونڈ۔ یہ میں تم کو بلا کسی شرط کے دیتا ہوں"

"اوہو! بڈھے کے منہ سے نکلا جو تعجب اور حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔ اس نے چاروں طرف بہت ہوشیاری سے دیکھا اور لکھپتی کے قریب میں پنجوں کے بل کھڑے ہو کر کان میں کہا۔

"یہ تو بتاؤ چوکیداروں کی آنکھوں میں خاک ڈال کر کیسے فرار ہوئے؟"

"میں تمہاری بات بالکل نہیں سمجھا"

"استاد اگر پکڑے گئے تو بری طرح گت بنے گی"

"میں تم کو یقین کامل دلاتا ہوں کہ میں بالکل اکیلا ہوں"

"ہاں۔ یہی تو بری بات ہے۔ لیکن یاد رکھو میں ذکر کروں گا

کہ میں نے تمہیں دیکھا ہے۔"

وہ تھوڑا پھر کچھ دیر تک مارٹن کو نہایت غور و خوض سے دیکھتا رہا اور سوچتا رہا۔ کہ ایک پاگل کے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہیئے۔ دفعۃً اسے کوئی خیال آیا وہ فوراً اپنے کندھے پر سے برش ایک طرف کو پھینک اور آخری مرتبہ کن انکھیوں سے مارٹن کو دیکھکر سر پر پاؤں رکھ کر یہاں تک کہ اس کی بڈھی ٹانگوں نے یاری کی تو فرار ہو گیا۔ یہاں تک اور سڑک کے موڑ پر نظروں سے غائب ہو گیا۔

مارٹن نے بد دل ہو کر ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کہا۔ "تعجب ہے" اور آہستہ آہستہ وکٹوریا سٹریٹ کی طرف چلنا شروع کیا۔ انسانی محبت کے خیال اور جوش کو تھوڑے عرصہ کے لئے دل و دماغ سے نکال ڈالا۔ ایک موٹر ٹیکسی میں بیٹھ کر ہوٹل کی طرف روانہ ہوا۔ چار بجے پھر ہوٹل کے متصل پارک میں ایک گھنٹے تک سیر کرتا رہا۔ شام کا کھانا گرانڈ ہوٹل میں کھایا۔ اس طریقہ سے جب اس کی طبیعت پھر ٹھکانے لگی اور تقویت حاصل کر لی تو پھر مستحق کی تلاش کے لئے روانہ ہوا۔

تقریباً اندھیرا ہو گیا تھا۔ جھٹ پٹے کا وقت تھا۔ وہ ٹیمس دریا کے کنارے کنارے چلا جا رہا تھا کہ ناگہاں اس کی نظر ایک حقیر فرد پر پڑی جو بینچ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے کی تحریر کا نزدیک سے مطالعہ کرنے کے بعد صاف یہ مطلب سمجھ میں آتا تھا کہ وہ مایوسی اور افلاس کا شکار ہے۔

مارٹن بینچ کے دوسرے سرے پر بیٹھ گیا اور اس حقیقت کے انکشاف پر اس کو بہت تعجب ہوا کہ باوجود پھٹے پرانے کپڑوں اور چہرے پر رونق نہ ہونے کے وہ شخص بہت خوبصورت تھا۔

"مجھے امید ہے کہ آپ میری اس قسم کی گفتگو کو جو میں کرنے والا ہوں معاف فرمائیں گے۔ ظاہرا اسباب کی بنا پر میرا قیافہ ہے کہ آپ سخت مصیبت اور مفلسی میں گرفتار ہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنے دل کی خواہش کے مطابق اور اپنی بساط کے موافق آپکی تھوڑی بہت مدد کروں۔ شاید آپ اس بات کو دلچسپی سے سنیں گے کہ آج سہ پہر میں نے دو مرتبہ ایک رقم خیرات کرنے کی کوشش کی۔ لیکن کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ پہلی مرتبہ ایک باجہ والے نے وارڈک سٹریٹ میں اسی بنا پر مجھ پر خفگی کا اظہار کیا۔ دوسری دفعہ ایک بڈھے نے ایکلیسٹن پلیس پر محض اسی وجہ سے مجھے پاگل پنے کا سرٹیفکٹ عنایت کیا۔ لیکن مجھے پوری طرح سے بھروسہ ہے کہ آپ ذرا زیادہ غور سے کام لیں گے ...."

اس شخص نے نہایت متانت کے ساتھ لکھ پتی کی بات کاٹ کر کہا۔ اس سے پہلے کہ آپ اور کچھ اس ضمن میں بیان کریں میں یہ جتلا دینا ضروری خیال کرتا ہوں کہ میرا کام یعنی پیشہ کتابوں کی تصنیف ہے۔ مجھے اپنے ڈرامے کے لئے دریائے ٹیمس کے قرب و جوار کے حالات دریافت کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی ہے۔ لیکن جب تک میں اپنی روزمرہ کی پوشاک یا لباس میں یہاں آتا رہا۔ مجھے اصلی حالات کا پتہ نہ چل سکا۔ اس وجہ سے میں نے یہ پھٹے پرانے کپڑے پہنکر یہاں آنا شروع کر دیا ہے اور روزانہ شام کو مایوسانہ اور غمگین شکل بنا کر یہاں بیٹھ جاتا ہوں۔ لوگ یہاں آتے ہیں اور بغیر پوچھے گچھے مجھے میرے حسب منشا حالات سنا جاتے ہیں۔ میرے خیال میں آپ کو بھی اس بات کے تجربہ کا بارہا اتفاق ہوا ہوگا کہ انسان اسی شخص کے سامنے اپنے رازوں کے پردے کو ہٹاتا ہے جس کی نسبت وہ سمجھ لیتا ہے کہ اس کا مخاطب بھی اس ہی کی طرح مبتلائے آلام ہے۔

"میں دعا کرتا ہوں کہ خدا آپ کو کامیابی عطا کرے۔ مارٹن نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ میں تو اب گھر جاتا ہوں۔ گڈ نائٹ۔"

لکھ پتی خلاف توقع واقعات کی تھکن سے چکنا چور تھا۔ اسی حالت میں اپنے کام کے کمرے میں داخل ہوا۔ کوچ پر دھڑام سے بیٹھ گیا۔ پھر گھنٹی کے بٹن کو

دبا یا۔

"مس چام" اس نے سکرٹری کو مخاطب کر کے کہا "یہ پانسو پونڈ آپ اب بھی تجوری میں رکھ سکتی ہیں۔ میں ایک چک ہی اس رقم کا اس انجمن کے نام لکھدوں گا جو حبشی بچوں کے لباس کا انتظام کرتی ہے"

"مارٹن" نے اپنے کوٹ کے اندر کی سیدھے ہاتھ والی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ لیکن وہ خالی پائی۔ پھر اس نے دوسری جیبوں میں ڈھونڈھنا شروع کیا۔ لیکن اس تلاش کا نتیجہ یہ تھا کہ صرف مندرجہ ذیل چیزیں برآمد ہوئیں۔ ٹی ایک گھڑی۔ ایک بیٹری لیمپ۔ ایک بکس موم کی دیا سلائیوں کا۔ یہ اسوقت کے لئے احتیاطاً رکھ لیا تھا۔ جبکہ بیٹری لیمپ کام نہ دے) ایک کنجیوں کا گچھا۔ ایک نوٹ بک اور دو جیبی رومال۔ لیکن پانسو پونڈ کا سراغ نہ ملا۔ وہ فوراً واقعہ کی تہ کو پہنچ گیا۔ اور کہا "مس چام میرے پانسو پونڈ چوری گئے۔ اور کسی نے میری جیب سے نکال لئے"

سکرٹری نے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا "یہ تو بہت برا ہوا" حالانکہ اسے معلوم تھا کہ اس کے آقا کے لئے یہ نقصان ایسا کوئی خطیر نہیں تھا۔

"برا ہوا!" لکھپتی نے جھلا کر کہا "یہ تو بڑی بدمعاشی ہے! بڑا کمینہ پن ہے! اتنی بڑی رقم! ایسی چالاکی کبھی دیکھنے میں نہیں آئی"

مس چام نے تسلی دینے والے لہجہ میں کہا "شاید کوئی آپ کی سخاوت کا مستحق ہی تھا۔ جس نے یہ رقم اڑا لی"

جہنم میں جائے ایسا مستحق۔ لکھپتی نے چلا کر غصہ سے کہا۔ مجھے اب ان سے کوئی سروکار نہیں۔ میں ہرگز یہ پسند نہیں کرتا کہ اس طرح میری جیب کتری جائے۔ فوراً پولیس اسٹیشن کے ڈاک کے محکمہ سے ٹیلیفون ملاؤ۔ لیکن جلدی۔ خدا کے لئے جلدی!

"غریب داداجان"

(از سعید)

"تمہیں میرا کہنا ماننا پڑے گا"—— سیٹھ عمر بھائی داؤ دجی نے اچھے خاصے تند اور تیز لہجے میں کہا۔ سیٹھ عمر بھائی کی دل میں پیوست ہو جانے والی نگاہیں یعقوب بھائی کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور ان کے انداز سے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اپنے اس نادر شاہی حکم کے خلاف وہ کوئی بات سننے کے لئے تیار نہ تھے۔

"تو سن لیا تم نے؟—— میں اس سے پہلے بھی بہت صاف لفظوں میں تم سے کہہ چکا ہوں اور آج پھر کہے دیتا ہوں کہ اگر تم اپنے اس خبط سے باز نہ آئے تو تمہیں پچھتانا پڑے گا۔ عمر بھائی کو یہ ذلت کسی طرح گوارا نہیں ہو سکتی کہ اس کا بیٹا ایک کنگال اور فاقہ لڑکی سے شادی کرے۔ خوب سمجھ لو!—— اس کا کیا نام ہے —— زہرہ!

زہرہ سے تعلق قایم کر کے تم میرے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھ سکتے۔ میں تمہیں منع نہیں کرتا۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو اولاد کے اپنی مرضی سے شادی کرنے کے خلاف ہوں۔ تمہیں اپنی شادی کے متعلق میری طرف سے کامل آزادی حاصل ہے۔ لیکن اپنی دولت کو جو میں نے اپنا چوٹی کا پسینہ ایڑی تک بہا کر پیدا کی ہے میں اپنی ذاتی ملکیت ضرور سمجھتا ہوں جس طرح تمہیں یہ حق حاصل ہے کہ جس سے چاہو اس سے شادی کرو اسی طرح مجھے بھی یہ حق پہنچتا

ہے کہ اپنا روپیہ بیٹ چاہوں دوں اور بیٹے نہ چاہوں نہ دوں۔ تم شاید یہ خیال کر رہے ہو کہ میں تم سے ناراض ہوں ——— ایسا نہیں ہے ——— میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ غصے سے نہیں بلکہ بہت ٹھنڈے دل سے کہہ رہا ہوں۔ تم زہرہ سے شادی کر سکتے ہو میں ناراض نہ ہوں گا۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ اس کے بعد تم سے قطعاً کسی قسم کا کوئی واسطہ نہ رکھوں گا۔ تمہیں اگر اس سے اس قدر محبت ہے کہ اس کے لئے فقیر بن کر زندگی بسر کرنے کو تیار ہو تو جاؤ جو جی چاہے کرو۔ محل میں ٹاٹ کا پیوند خدا تمہیں مبارک کرے۔

یعقوب بالکل چپ سا ہے کے عالم میں کھڑا تھا۔ بظاہر ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ سکتے کے عالم میں ہے اور باپ کی گفتگو کا ایک حرف بھی اس کی سمجھ میں نہیں آیا ہے۔ سیٹھ جی کے خاموش ہو جانے پر اس نے چاہا کہ کچھ کہے۔ حلق خشک تھا آواز رک گئی اور بدقت تمام وہ صرف اتنا کہہ سکا کہ

"اباجان!"

عمر بھائی۔ کہو کیا کہتے ہو تم جو کچھ کہو میں سننے کے لیے تیار ہوں۔ میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ میں غصہ میں نہیں ہوں اور تمہیں اس بات کا بھی یقین دلاتا ہوں کہ میں اولاد کے اس حق کو بھی تسلیم کرتا ہوں کہ وہ اپنی مرضی اور اپنی پسند سے شادی کریں میں کبھی کسی حالت میں بھی تمہیں اس بات پر مجبور نہ کروں گا کہ تم فلاں لڑکی سے شادی کر لو لیکن میری محبت اور میری مامتا مجھے مجبور کر رہی ہے کہ میں تمہیں گڑھے میں گرنے سے بچاؤں اور اس لئے صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ فلاں عورت سے شادی نہ کرو میرا تجربہ تم سے بہت زیادہ ہے میں نے دنیا دیکھی ہے تم ابھی نوعمر اور ناتجربہ کار ہو اس لئے میری خواہش ہے کہ تم میرے تجربہ سے فائدہ اٹھاؤ اور اپنے جوش جوانی کی بدولت کہ جس کا نام تم نے غلطی سے محبت رکھ چھوڑا ہے عمر بھر کے لئے اپنی زندگی کو تباہ نہ کرو۔ مان جاؤ بیٹے! دیکھو اب بھی مان جاؤ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں تمہارے ہی بھلے کے لئے کہہ رہا ہوں۔ آئندہ تمہاری مرضی۔

"اباجان!" یعقوب نے کسی قدر بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور پھر خاموش ہو گیا۔

عمر بھائی۔ تم جو کچھ کہنا چاہتے ہو کہتے کیوں نہیں۔ میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ میں برا نہ مانوں گا تم ایک عقلمند لڑکے ہو اور مجھے امید ہے کہ تم میرا مطلب اچھی طرح سمجھ گئے ہو اور اب یہ کہنا چاہتے ہو کہ "اباجان مجھ سے غلطی ہو گئی تھی اب میں سمجھ گیا اور آپ سے معافی چاہتا ہوں" مگر غالباً شرم کی وجہ سے تم سے کہا نہیں جاتا۔

یعقوب کے چہرہ پر کسی قدر غصہ اور ملال کے آثار نمودار ہوئے روحانی تکلیف کو کسی قدر کم کرنے کے لئے اس نے پہلو بدلا۔ آہستہ سے کھنکار کر اپنی آواز صاف کی اور بہت ہی مؤدبانہ انداز میں کہا

"اباجان! آپ کے کسی حکم سے مجھے انکار نہیں ہے مگر ——— اب میں کچھ عرض نہیں کر سکتا، یہ معلوم ہونے کے بعد کہ آپ کو زہرہ سے نفرت ہے میری ہمت نہیں پڑتی کہ آپ سے کچھ کہوں۔ میں جانتا ہوں کہ اب آپ سے اس کے متعلق کچھ کہنا فضول ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کو عربوں سے ہمیشہ سے نفرت ہے۔ آپ کے مذہب میں غریب ہونا ایک ایسا گناہ ہے کہ جس کا کوئی کفارہ ہی نہیں، مفلسی کو آپ ایک ایسا عیب خیال کرتے ہیں کہ جس کی موجودگی میں انسان کی تمام خوبیاں بیکار ہو جاتی ہیں، بلکہ شاید وہ ساری خوبیاں بھی برائیوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں اور اس کے ساتھ ہی مجھے اس بات کا بھی علم ہے کہ بدقسمتی سے زہرہ تمام انسانی خوبیوں کا مجسمہ ہونے کے باوجود غریب اور نادار ہے ایسی حالت میں میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں

آپ میری التجاؤں کو قبول نہیں کر سکتے۔ زہرہ کسی معجزہ کی بدولت بلقیس یا میرزادی نہیں بن سکتی اور میں کسی حالت اور کسی صورت میں اس کی محبت سے باز نہیں رہ سکتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

کمرہ میں تھوڑی دیر خاموشی رہی یعقوب سر جھکا کر چپکا کھڑا ہو گیا سیٹھ عمر بھائی کی نگاہیں میز پر جم کر رہ گئیں اور ان کی انگلیاں ایک عالم بیخبری میں گھڑی کی سنہری زنجیر سے کھیلنے لگیں۔ اسی حالت میں کوئی پانچ منٹ گذر گئے۔ گھنٹے نے دس بجائے اور اس کی آواز سے چونک کر سیٹھ عمر بھائی نے پہلے گھنٹے کی طرف دیکھا اور پھر ایک لمبا سانس لیکر یعقوب سے کہا۔

"دیکھو یعقوب! تم میرے اکلوتے بیٹے ہو اور تمھیں خوب معلوم ہے کہ مجھے تم سے کس قدر محبت ہے۔ آجتک تمہاری ایک بھی خوشی ایسی نہیں ہے جسے میں نے پورا نہ کیا ہو۔ تمہاری ہر خواہش تمہاری زبان تک آتے آتے پوری ہوتی رہی ہے۔ میں تمہاری اس احمقانہ خواہش کو بھی پورا کر دیتا مگر اس سے خاندان کی عزت پر حرف آتا ہے۔ میں تمھیں اجازت دیتا ہوں کہ تم اپنے ہم مرتبہ لوگوں میں سے جس کی لڑکی کو چاہو پسند کر لو اور میں خود کوشش کر کے اس جگہ تمہاری شادی کرا دوں لیکن تم خود سوچو کہ مجھے یہ کس طرح گوارا ہو سکتا ہے کہ تمہاری ایک مجنونانہ حرکت کی وجہ سے سارے خاندان کی آبرو پر پانی پھر جائے اور میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں۔ میں ایک مرتبہ پھر تم سے کہتا ہوں کہ اپنی اس ضد سے باز آ جاؤ اور اگر اب بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آتا تو میں اپنے کلیجہ پر پتھر رکھکر صاف صاف کہدینا چاہتا ہوں کہ زہرہ سے شادی کرنے کے بعد مجھ سے تمہارا کسی قسم کا تعلق نہیں رہ سکتا اور یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ فاقہ کشی کی مصیبت ہر قسم کی محبت کو دل سے نکالدیا کرتی ہے۔ ممکن ہے کہ پھر نہ زہرہ تم کو اور تم زہرہ کو اس قدر عزیز نہ رکھ سکو نوجوانی کے یہ تمام جذبات مالی تنگیوں کی بدولت ہوا کرتے ہیں اور جس وقت تک گیہوں کے دانے پیٹ میں پہنچتے رہتے ہیں اسی وقت تک آدم و حوا میں ایک دوسرے کے لئے مقناطیسی کشش باقی رہا کرتی ہے۔ میرا کہنا اگر تم نے نہ مانا تو تمھیں پچھتانا ضرور پڑے گا اور ذلیل و خوار ہو کر پچھتانے سے یہ بہت بہتر ہے کہ تم اسی وقت سمجھ جاؤ (ذرا رک کر) کہو سمجھ گئے!

یعقوب دہرائی ہوئی آواز میں "ابا جان! میں نے کبھی آپ کے کسی حکم سے سرتابی نہیں کی ہے اور اگر اب ایسا کر رہا ہوں تو آپ یقین کیجئے کہ کچھ ایسی ہی مجبوری ہے ۔ ۔ ۔ ۔

"او نالائق! مردود! بدکردار! کاش تو کبھی پیدا ہی نہ ہوا ہوتا! جا میرے سامنے سے دور ہو اور آج کے بعد کبھی اس گھر میں قدم نہ رکھنا اگرچہ دن کے فاقہ سے ہی تم اس دروازے پر آنے تو یقین رکھو کہ تمھیں اس گھر سے کھانا نہ ملیگا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

آبدیدہ اور خاموش یعقوب کمرہ سے نکل کر چلا گیا۔

"یہ تو بہت ہی برا ہوا۔ میں سیٹھ جی کو اس قدر سنگدل نہیں سمجھتی تھی۔ تم نے میرے لئے اپنا گھر بار، اپنے عزیز اور رشتہ دار اور سب سے بڑھکر یہ کہ دولت کا اس قدر انبار سب کچھ چھوڑ دیا صرف میرے لئے اپنے والد کی ناخوشی گوارا کی۔ اب میں کیا کہوں یعقوب! ظاہر میں تو یہی معلوم ہو رہا ہے کہ تم نے غلطی کی مگر میں تو اپنی زبان سے اسے غلطی نہیں کہہ سکتی۔ سچ تو یہ ہے یعقوب کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (کہتے کہتے زبان رک گئی)۔

یعقوب۔ زہرہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟ کیا دولت بھی کوئی ایسی چیز ہے کہ جس کے لئے محبت جیسی چیز کو قربان کیا جا سکے! کیا چند لاکھ اشرفیوں کے بدلے میں میں تمھیں فروخت کر دیتا تو وہ عقلمندی ہوتی:

پیاری زہرہ۔ تمہاری قیمت اس زر و جواہر کے انبار سے بہت زیادہ

ہے جو میرے والد کے خزانوں میں جمع ہے تم تو بڑی چیز ہو تمہارے صرف ایک ذہنی کاری کا ہی برابر نہیں کہیں زیادہ دولت تم پر قربان کی جا سکتی ہے مجھے اگر کچھ تھوڑا سا افسوس ہے تو صرف اس بات کا کہ ابا جان بے وجہ بے سبب تم سے ناراض ہو گئے۔ میں ہمیشہ انھیں ایک فرشتہ اور نیکی کا ایک دیوتا خیال کیا کرتا تھا میرے دل کے مندر میں ان کا بت ایک بہت اونچے سنگاسن پر رکھا ہوا تھا اور اس کی عظمت ہر وقت میرے دماغ اور میرے خیالات پر طاری رہتی تھی لیکن افسوس کہ آج انھوں نے زرپرستی اور سرمایہ داری کی جس ذہنیت کا اظہار کیا اس نے بت کو سنگاسن سے گرا دیا۔ وہ اب وہ میری نظروں میں ایک معمولی انسان رہ گئے کہ جس میں سینکڑوں کی کمزوریاں موجود ہوں۔ میں حیرت سے ابا جان کا منہ دیکھتا رہ گیا جب انھوں نے کچھ اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا کہ انسان کی سب سے بڑی خوبی سرمایہ داری ہے ان کی باتوں سے میرے دل کو سخت صدمہ پہنچا جب انھوں نے تمہیں صرف اس وجہ سے برا کہا کہ تم غریب ہو۔ وہ اگر ایسا سمجھتے ہیں تو سمجھیں میرے نزدیک غریب ہونا نہ کوئی جرم ہے اور نہ گناہ۔ کون کہہ سکتا ہے کہ سیٹھ عمر بھائی خود ہمیشہ ایسے ہی امیر اور مالدار تھے۔ کیسے بڑے بڑے خاندانوں کو اس دنیا نے فقیر ہوتے دیکھا اور بہت سے گداگر امیر کبیر بن چکے ہیں۔ آج جن امیر خاندانوں کو ابا جان عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور انھیں اپنا ہم کفو خیال کرتے ہیں ان کے متعلق اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ چند روز پیشتر وہ خود یا ان کے آباؤ اجداد مفلوک الحال اور غریب نہ تھے۔ صرف موٹروں میں چڑھے پھرنے، سینما اور تھیٹر میں بہترین نشستوں پر بیٹھنے اور اپنے ذاتی عیش و آرام پر لاکھوں روپے بیدردی کے ساتھ لٹانے سے کوئی انسان اچھا انسان نہیں بن سکتا اسی طرح یہ بھی ہرگز ضروری نہیں ہے کہ صرف غریبی اور ناداری کی بدولت کوئی شخص اپنی اخلاقی بلندیوں سے گر جائے بہت سے غریب بہترین انسان ہوتے ہیں اور بہت سے امیر بدترین شیطان۔ دولت کسی طرح بھی انسانیت کا معیار نہیں ہو سکتی۔

زہرہ۔ یعقوب! یعقوب! تم کس قدر نیکدل اور شریف ہو! کاش بڑے سیٹھ جی میں بھی یہ خوبیاں ہوتیں! انھوں نے تو تم پر بڑا سخت ظلم کیا ہے اور چونکہ یہ ظلم میری وجہ سے ہوا ہے اس لئے مجھے بڑی شرمندگی محسوس ہو رہی ہے بار بار میرے دل میں یہ خیال آ رہا ہے کہ میں کسی طرح مر جاؤں تو تمہیں اس مصیبت سے نجات مل جائے اور بڑے سیٹھ جی کے لئے ناراضی کی کوئی وجہ باقی نہ رہے۔

یعقوب۔ کیسی بچوں کی سی باتیں کرتی ہو! کیا تم یہ خیال کرتی ہو کہ تمہیں کھو کر جو دولت مجھے ملیگی اس سے میں خوش ہو سکتا ہوں؟ کیا اشرفیوں کے بستر پر لیٹ کر مجھے نیند آ سکتی ہے جبکہ یہ معلوم ہو کہ وہ بستر تمہارے بدلہ میں مجھے ملا ہے؟ نہیں زہرہ! میرے دل میں تمہاری محبت اس سے بہت زیادہ ہے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم اس واقعہ کو اس قدر اہم کیوں خیال کر رہی ہو اور اس ذرا سی بات کو اتنی پریشان کیوں ہوئی جاتی ہو آخر ابا جان کے پاس یہ تمام دولت کہاں سے آئی تھی؟ یہ سب کچھ ان کی جفاکشی اور محنت ہی کا تو نتیجہ ہے میں بھی محنت کر کے اسی قدر بلکہ ممکن ہے کہ اس سے بھی زیادہ دولت پیدا کر سکتا ہوں میں جوان ہوں تندرست ہوں، ہوش و حواس بھی میرے درست ہیں پھر مجھے کیوں فکر ہو۔ جب تک (خم ٹھونک کر) ان بازوؤں میں طاقت اور (سینہ کی طرف اشارہ کر کے) اس دل میں ہمت موجود ہے اس وقت تک مفلسی کا خوف بیفائدہ ہے البتہ یہ افسوس ضرور ہے کہ تمہارے لئے گھر کو جنت بنا دینے کے جو خواب میں دیکھ رہا تھا ان کی تعبیر الٹی نکلی اور ایسی حالت میں سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کس منہ سے درخواست کروں کہ تم ایک دکھ بھری زندگی کی شریک بن جاؤ۔

زہرہ: اب تم میرا دل دکھانے کی باتیں کرنے لگے۔ تم تو رات دن سونے اور جواہرات کے کھلونوں سے کھیل کھیل کر بڑے ہونے کے باوجود اور لعل روپے کے ڈھیر پر میری خاطر لات مار دو اور فقیری اور تنگدستی کی زندگی خوشی سے پسند کر لو اور میں جس نے دنیا کا کوئی عیش کبھی دیکھا ہی نہیں اور تمام عمر ایسی ہی سختیوں میں گزار دی ہے اب اس قسم کی زندگی کو اپنے لئے تکلیف اور مصیبت خیال کروں! گھر سونے چاندی کے برتنوں اور ریشمی قالینوں سے تو جنت نہیں بنا کرتے! گھر تو محبت کی بدولت جنت بنا کرتے ہیں اور اس کی خدا کا شکر ہے کہ ہم دونوں کے پاس کمی نہیں ہے۔ میں غریب ہوں اور غریبی میں دولت کی حرص بڑھ جاتی ہے لیکن میں سچ کہتی ہوں کہ ایسی کم ظرف بھی نہیں ہوں کہ محبت پر دولت کو ترجیح دینے لگوں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سے پہلے تو تمہارے گھر میں میرا وجود "مخمل میں ٹاٹ کا پیوند" ہی تھا لیکن اب ایسا نہیں ہے اور اب مجھے یقین ہے کہ ہمارا گھر صحیح معنوں میں جنت ہوگا۔

"اور تم اس جنت ارضی کی حور ہوگی پیاری زہرہ!" یعقوب نے بات کاٹ کر محبت بھرے لہجہ میں کہا۔

وہ ہنسی۔ "تمہیں تو ہر وقت مذاق ہی سوجھا کرتا ہے۔"

یعقوب۔ اس میں مذاق کی کونسی بات تھی میں سچ کہتا ہوں کہ جو کچھ کہا تھا سنجیدگی سے کہا تھا کیا جنت کے لئے حور کی موجودگی ضروری نہیں ہے اور کیا میری جنت کے لئے تم سے بہتر کوئی اور حور مل سکتی ہے؟

"اچھا کچھ کام کی باتیں کرو یہ حوروں اور پریوں کی داستانوں میں ضائع کرنے کا وقت نہیں ہے" زہرہ نے کہا اور اپنی ساری کا آنچل سنبھالتی ہوئی اٹھ کھڑی ہو گئی۔

یعقوب اور زہرہ کی شادی کو نو سال ہو چکے۔ ایک بہت ہی مختصر سا اور کم کرایہ کا مکان جسے صرف اس لئے مکان کہا جا سکتا تھا کہ شہر کی میونسپلٹی کی طرف سے اس پر نمبر لگا ہوا تھا ان کی قیام گاہ کا کام دیتا تھا چھپر کے چند ٹوٹے ہوئے تختوں کو کسی نہ کسی طرح کیلوں سے ٹھونک ٹھانک کر دو چیزیں کچھ ایسی بنا لی گئیں تھیں کہ جن سے چارپائیوں کا کام لیا جا سکے اور انہی پر الگ الگ دو بستر لگے ہوئے تھے۔ ایک بہت ہی پرانی اور کرم خوردہ سی میز کمرہ کے وسط میں بچھی ہوئی تھی اور اسی کے ارد گرد تین دست و پا شکستہ کرسیاں پڑی تھیں جنکے پایوں کو قائم و برقرار رکھنے کیلئے لوہے یا ٹین کی پتیاں جا بجا جڑ دی گئی تھیں۔ کمرہ اور کمرہ کی دیواریں سامان آرائش سے یکسر صاف تھیں، صرف ایک شمال رویہ کھڑکی کے بازو میں ایک چھوٹا سا آئینہ جو بجلی تھا دیوار میں ٹنگا تھا جس میں داڑھی بناتے وقت یعقوب اور کنگھی کرتے وقت زہرہ اپنے چہرے تو کیا مگر ہاں اپنے چہروں کا ایک دھندلا سا عکس دیکھ لیا کرتے تھے۔ ایک طرف کونے میں ایک انگیٹھی رکھی تھی اور اسی کے قریب ایک میلی اور پھٹی ہوئی بوری میں کوئلے اور اسی انگیٹھی کے پاس بیٹھی ہوئی زہرہ چاول پکانے میں مصروف تھی۔ ابراہیم جسے یعقوب اور زہرہ کے نخل محبت کا ثمر نورس کہنا چاہیئے دوسری طرف کونے میں قلم دوات اور دو چار کتابیں لئے بیٹھا تھا اور کاغذ پر کیڑے مکوڑے کاڑھ کاڑھ کر اپنے ذوق مصوری کی تسکین کر رہا تھا۔ ابراہیم یعقوب کی شادی کے دو سال بعد پیدا ہوا تھا اور اب اس کی عمر سات سال کے قریب تھی۔

حسین ماں باپ کا خوبصورت بچہ ابراہیم اپنی ظاہری شکل و صورت کے لحاظ سے عام بچوں سے بہت کچھ ممتاز تھا اور اس کا بھولا پن تو اس قدر دلفریب تھا کہ جو دیکھتا اسے پیار آ جاتا تھا۔ زہرہ غریب تھی مگر غیر تعلیم یافتہ اور جاہل نہ تھی اس لئے شروع ہی سے ابراہیم کو کچھ اس طرز پر اٹھایا تھا کہ اس میں وہ خرابیاں جو غریب گھرانوں کے بچوں میں بالعموم پائی جاتی ہیں مطلقاً نہ آنے پائی تھیں اور قیمتی لباس

بہن لینے کے بعد اپنی عادات و خصائل درگھ۔ کماؤ کے لحاظ سے ابراہیم بہت سے امید نگاروں کے لئے باعث فخر ہو سکتا تھا۔

یعقوب کی آمدنی بہت ہی مختصر تھی وہ مختلف اخباروں اور رسالوں کے لئے مضامین لکھا کرتا تھا بہت سے ایڈیٹر اس کے مضمون لیکر رکھ لیتے تھے اور تقاضوں پر تقاضے ہونے کے باوجود اس کی قیمت نہ دیتے تھے بہت سے صرف اس سبب کہ ان کے پاس اس وقت دینے کے لئے قیمت موجود نہ ہوتی تھی اس کے مضمونوں کو ناقابل اشاعت کہہ کر واپس کر دیتے تھے اور اس طرح ایسے مضامین کی تعداد کہ جن کی قیمت یعقوب کو وصول ہو جائے بہت ہی تھوڑی ہوتی تھی ان تمام مشکلوں کے باوجود کبھی کسی نے اسے زبیدہ اور اداس نہ دیکھا تھا جہاں تک خوش دلی اور مسرت کا تعلق تھا یعقوب اب بھی دس برس کے بچے کی مانند ہشاش بشاش نظر آتا تھا کہ جیسا شادی سے پہلے۔ سیٹھ عمر بھائی کی یہ پیشینگوئی کہ شادی کے بعد اسے پچھتانا پڑے گا اور افلاس اور احتیاج اسکے دل سے زہرہ کی محبت دور کر دینگے کسی وقت میں بھی پوری نہ ہوئی اس نے بہت سے فاقے کیے لیکن کبھی اسکی تیوری پر بل نہ آیا ناداری کی بدولت بسا اوقات اسے سارا سارا دن بھوکا رہنا پڑا لیکن پھر بھی رات کو جب وہ سونے کے لئے لیٹا تو ہنستا ہوا اور دوسری صبح کو جب اٹھا تو یہی کہتا ہوا کہ "زہرہ بھوک تو مال و اکل کا دشمن ہے"

زہرہ کے دل پر چوٹ لگتی تھی اور یہ خیال اسے انتہائی تکلیف پہنچاتا تھا کہ یعقوب کی یہ ساری مصیبتیں صرف اس کی اپنی وجہ سے ہیں لیکن وہ اس قسم کے خیالات کا اظہار کر کے یعقوب کی خندہ مزاجی پر برا اثر ڈالنا پسند نہ کرتی تھی اس فقر و فاقہ کی زندگی میں وہ بیحد مسرور تھی اور اسکی دنیا تک رنج و الم کے بادلوں کی رسائی نہ تھی اس کی مختصر دنیا مسرت اور شادمانی کے نور سے جگمگ کرتی رہتی تھی اور وہ خود ایک ایسا مہر رخ تھی کہ جو ہمیشہ نصف النہار پر رہتا ہو۔ زیور پہننا تو درکنار اس کا خیال بھی کبھی اس کے دماغ میں نہ آتا تھا اور کپڑوں میں پیوند لگانا انہیں دھونا اور سکھانا اس کا روزمرہ کا مشغلہ تھا۔ ابراہیم کے پیدا ہونے سے اخراجات کسی قدر اور بھی بڑھ گئے اور اسی کے ساتھ ان کی تکلیفیں اور مصیبتیں بھی بڑھ گئیں لیکن میاں اور بیوی دونوں کی یہ حالت تھی کہ خوشی کے مارے پھولے نہ سماتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابراہیم فی الحقیقت خوشحالی اور شادمانی کا ایک زندہ مجسمہ ہو جو ان کے گھر میں آگیا ہے ان کی سچی خوشی اور خندہ مزاجی سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انہیں کوئی تکلیف ہے ہی نہیں ان کے ہونٹوں پر ہر وقت کھیلتی ہوئی ہنسی کو دیکھکر ہر شخص یہی نتیجہ نکالنے پر مجبور تھا کہ ان سے زیادہ خوشحال اور فارغ البال شخص کبھی نہ کوئی اور نہ ہوگا اور جہاں تک خوشحالی کا تعلق ہے یہ نتیجہ غلط بھی نہ تھا۔

چاول اور تور اور ارہر کی دال جس لطف و مسرت کے ساتھ یہ خاندان مزے لے لیکر کھاتا تھا وہ حقیقتاً اس معمولی اور ادنی قسم کی خوراک کو قورمے اور بریانی سے بھی زیادہ خوش ذائقہ بنا دیتا تھا کبھی کبھی اگر کوئی پیسہ بچ گیا اور تھوڑی سی پودینے کی چٹنی بھی بنالی گئی تو وہ ایک نعمت غیر مترقبہ ہوتی تھی اور اتفاق سے کبھی چھٹے چھماہے یعقوب کی جیب میں کہیں سے کوئی بڑی رقم آگئی تو موسم کے پھل اور ترکاریاں بھی دسترخوان پر نظر آجاتی تھیں اس دن درحقیقت اس مختصر کنبہ کی عید ہی ہوتی تھی پھلوں کو دیکھکر ننھے ابراہیم کا فرط مسرت سے اچھلنا اور کودنا اور انگور کے ایک ایک دانے کو ایسی احتیاط سے اٹھانا کہ گویا وہ کوئی بیش بہا موتی ہے خصوصیت کے ساتھ یعقوب کے لئے بہت ہی دل شکن اور حسرت انگیز نظارہ ہونا چاہیے تھا مگر اس کی جبلی خندہ مزاجی اور شگفتہ دلی ایسے واقعات سے بھی رنج و الم کا اثر قبول کرنے کے بجائے حظ اور مسرت کا اثر لیتی تھی اور اپنے ظرافت آمیز جملوں اور چہچہے اڑا دینے والے قہقہوں سے وہ ان چیزوں کو بھی مسرت انگیز بنا دیا کرتا تھا۔

ادھر زہرہ کی تربیت کبھی ابراہیم کے دل میں ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خیال پیدا ہونے دیتی تھی کہ وہ کسی غریب آدمی کا بچہ ہے، یا یہ کہ تمول اور دولتمندی کا اس کے بعد بھی کوئی اور درجہ ہو سکتا ہے جو انھیں حاصل نہ تھا، قناعت پسند اور ہر حال میں خوش رہنے والے ماں باپ سے ابراہیم کے کانوں نے کبھی افلاس کی شکایت یا محتاجی کی داستان سنی ہی نہ تھی اور یہ دیکھ کر کہ اس کی حقیقی ضرورتیں سب بلاتکلف پوری ہو جایا کرتی ہیں نیز یہ دیکھ کر کہ اس کے ماں باپ بھی کبھی اپنی کسی ایسی ضرورت یا خواہش کا ذکر نہیں کرتے کہ جو پوری نہ ہوتی ہو اس کی ذہنیت ہی یہ ہو گئی تھی کہ بس ایک انسان کی ضرورتیں ان کے علاوہ کچھ اور ہو ہی نہیں سکتیں اس کے مزاج میں وہ سیر چشمی اور وہ استغنا پیدا ہو گیا تھا جو بڑے بڑے امیروں ہی کے بچوں میں ہو سکتا ہے جنھیں کسی چیز کی کمی نہ ہو۔

باسی روٹی کا ایک ٹکڑا جس پر بس ایک کوڑی بھر گھی لگا ہوا ہو اس کا دل پسند ناشتہ تھا اور یہ چیز کبھی اس کے وہم و گمان میں بھی نہ گذرتی تھی کہ ناشتہ میں اس سے بہتر بھی کوئی چیز کھائی جاتی یا کھائی جا سکتی ہے کھدر کا سپید اور بے داغ پائجامہ اور کھدر ہی کی سپید قمیص اس کا روزمرہ کا لباس تھا اور وہ اس لباس کا اس درجہ عاشق تھا کہ خوشی سے اسے مٹیالے رنگ کے ریشمی لباس سے بدلنا گوارا نہ کرتا اس کے تخیل میں اس سے بہتر کوئی اور پوشاک ہو ہی نہیں سکتی تھی اور اس کے بدلنے کا سوال اگر پیدا ہو سکتا تھا تو صرف اس وقت کہ جب وہ میلی ہو جائے بیٹھنے لیٹنے اور سونے کے لئے اس کے خیال میں کبھی یہ چیز آ ہی نہ سکتی تھی کہ اللہ کی بنائی ہوئی زمین سے بہتر بھی انسان کی بنائی ہوئی کرسیاں اور چارپائیاں ہو سکتی ہیں کھیلنے کے لئے لطف علی اور حمیدالدین سے بہتر ساتھی اور ربر کی ایک پرانی گیند سے بہتر کسی کھلونے کا تصور کبھی اس کے ذہن میں نہ گذر سکتا تھا اور یہ تو ایک کھلی ہوئی حقیقت تھی کہ اس کے لئے اس کی ماں سے بہتر ماں اور باپ سے بہتر باپ کسی طرح ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

زہرہ کھانا پکا رہی تھی اور ابراہیم کا تختہ پر لکیریں کاڑھ رہا تھا کہ کہ اتنے میں یعقوب اپنے معمول سے بھی کچھ زیادہ خوش و خرم اور فرحاں و خنداں اچھلتا کودتا گھر میں داخل ہوا۔

"زہرہ او زہرہ! ارے دوڑ کے آؤ توبہ! خدا جانے تم کیا کر رہی ہو میں کہتا ہوں سب کام چھوڑ دو پہلے ادھر آ جاؤ۔ اب تو ہزاروں برس کی دال نہیں گلیگی اس ہانڈی کو دھو کر اور بہت سنبھال کر ایک الماری میں رکھ دینا۔ آثار قدیمہ کا تحفظ بہت ضروری ہے اور ہندوستان میں تو اس کے متعلق قانون بھی نافذ ہے۔ ارے خدا کے لئے آپکو! تم واقعی بہت موٹی ہو گئی ہو آسانی سے ہلا بھی نہیں جاتا۔"

"ارے ہے تم نے تو سارا گھر سر پر اٹھا لیا۔ کیا بات ہے؟ کیوں اس قدر خوش ہو رہے ہو۔ کسی بیوقوف ایڈیٹر نے اس سڑی موئی کتاب کے دس روپے دیدیئے ہوں گے۔ میں پہلے ہی سمجھ گئی تھی کہ یہی بات ہو دس روپے تک تو خیر میں اسے صرف بیوقوف ہی کہوں گی لیکن اگر اس سے زیادہ دیئے ہیں تو ضرور اس کا دماغ خراب ہو۔"

یعقوب۔ (زہرہ کو اپنے سینہ سے لگا کر) پیاری زہرہ! ساری دنیا تمہاری ہی طرح ناقدر شناس تھوڑی ہی ہے۔ دنیا میں سمجھدار لوگ بھی بستے ہیں۔ اب تم یہ گھاسلی ساری پھینکو بہت موٹی ہو بنارسی ساریاں باندھا کرو وہ بھی تو سودیشی ہی ہوتی ہیں۔

زہرہ۔ (آنکھیں مٹکا کر) لے ہے سچ کہنا! دس روپے میں کوئی دو درجن ساریاں تو آ ہی جائیں گی۔

یعقوب۔ تمہاری پست خیالی نہیں جاتی۔ دس روپے کیسے بیگم! دس ہزار اور دس لاکھ کہو۔

زہرہ (سنجیدگی سے) اچھا مذاق تو ہو چکا اب بتاؤ تو کیا ہوا

یعقوب۔ میری کتاب بہت پسند کی گئی اور یونیورسٹی نے اسے
نصاب میں داخل کر لیا اور اتنی قدر کی اور اسامیں جلد سے جلد چھپ
کی فرمائش کر دی۔ اب تو قسمت کھل اور گھر میں دولت پہنچ گئی۔

زہرہ۔ اوہو جب خوش ہو کے آئے گھر رستے تو یہ کرانے والے!
تم نے ذرا تم نے بیان کرنا ہے میں نے کچھ سمجھنے کی بہت اس کی بہنا
تو ذرا تم نے انتظار کیا تھا میں تو اسے پہنچی ......

یعقوب۔ ابھی اب یہ لیکچر شروع ہونے پر مجھ سے اس میں اصلاحات کروا
کا جلسہ ہو گا اس پر کام آئے گا اب آپ جلدی سے کھانا نکالیے۔

ابراہیم بڑے غور سے باپ کی ان تمام حرکتوں کو دیکھ رہا تھا
ابھی تک اس کی سمجھ میں نہ آیا تھا کہ اصل واقعہ کیا ہے کھانا کھانے
کے لئے ابھی کرسی پر بیٹھے ہی تھے اس لئے باپ سے پوچھا

ابا جان! کیا ہو گیا؟

یعقوب۔ کہاں؟

ابراہیم۔ آپ ابھی امی سے کیا کہہ رہے تھے؟

یعقوب (ہنس کر) بیٹے آج وہ سنہری مچھلی ہم نے پھانس لی
جسے پانچ برس سے پھانسنا چاہتے تھے اور وہ کسی طرح پھنستی ہی نہ تھی۔

ابراہیم۔ سنہری مچھلی کیسی؟

یعقوب۔ بیٹے خالص سونے کی بڑی خوبصورت مچھلی ہے۔

ابراہیم کتنی بڑی ہے ہمیں دکھا دیجیے۔

یعقوب۔ (یہ دیکھ کر کہ ابراہیم کی نگاہ اس کی جیبوں پر ہے) نہیں
بیٹے! وہ جیب میں کہاں آسکتی تھی بہت ہی بڑی ہے اس کمرہ میں بھی
نہ آسکے گی اس کے لئے تو کوئی دوسرا بڑا سا مکان لینا پڑے گا بہت ہی
بڑی ہے۔ تاج محل ہوٹل سے بھی بڑی۔

ابراہیم (خوش ہو کر) ہم آج خوب خوشی منائیں گے۔

یعقوب۔ اور ہم آج تمہیں بہت ہی بڑھیا دعوت کھلائیں گے۔ ہا!

تمہارے دادا جان غریب کو خبر ہی نہیں ہے انھیں خبر ہو جاتی تو انھیں
بھی بڑی خوشی ہوتی۔

ابراہیم۔ ابا جان! کیا دادا جان غریب ہیں!

یعقوب۔ (مسکرا کر) بہت ہی غریب ہیں بیچارے۔

ابراہیم۔ غریب اسی کو کہتے ہیں نا، جیسے وہ بڈھا فقیر اس دن
آیا تھا اور آپ نے اسے ایک پیسہ دیا تھا۔

یعقوب۔ ہاں وہ بڈھا غریب تھا بیچارے کے پاس کھانے پہننے
کو کچھ بھی نہ تھا۔

ابراہیم۔ تو دادا جان بھی ایسے ہی غریب ہیں!

یعقوب۔ اب ایسے اور ویسے کیا! میں نے کہہ تو دیا کہ بیچارے
غریب ہیں۔

ابراہیم۔ آپ تو بہت امیر ہیں۔

یعقوب۔ (ہنس کر) اللہ کا شکر ہے ہمیں کس بات کی کمی ہے مزے سے
تینوں وقت کھانا کھاتے ہیں صاف ستھرے کپڑے پہنتے ہیں
خوب ٹھنڈا پانی پیتے ہیں، روز سمندر کے کنارے سیر کرتے ہیں اور
رات کو آرام سے پیر پھیلا کر سوتے ہیں جسے یہ عیش حاصل ہوں اسی کو
امیر کہتے ہیں۔

اتنے میں کھانا میز پر آ گیا اور تینوں کھانا کھانے میں مشغول
ہو گئے پہلے کچھ ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں اس کے بعد یعقوب نے
یہ تجویز پیش کی کہ آج شام کو بہت بڑھیا دعوت ہونی چاہیے۔

زہرہ (ہنس کر) اچھے گھر بہتر۔ باہر یا نہ ہوں کہ بہتر۔

یعقوب۔ تم بڑی شریر ہو (ابراہیم سے) کہیے ماسٹر صاحب آپ
دعوت میں کیا چیز کھائیں گے۔

ابراہیم نے روزمرہ کے معمولی کھانے کے علاوہ اگر کوئی چیز دیکھی
تھی تو وہ کباب تھے چنانچہ اس نے فوراً کہا

"ہمیں تو کباب بہت اچھے لگتے ہیں"

یعقوب۔ بہت خوب! آپ کے لئے کباب ضرور پکیں گے کون سے کباب شامی یا مچھلی کے؟

ابراہیم۔ دونوں طرح کے۔

یعقوب۔ منظور! اچھا جی اب تم بتاؤ تم کیا کھاؤگی تمھیں تو باسی روٹی اور چٹنی بہت پسند ہے۔

زہرہ۔ مجھے کچھ پسند نہیں ہے۔ جو تم کہوگی وہی پکا دونگی۔

یعقوب۔ نہیں ایسا نہیں ہوسکتا ایک ایک چیز سب کی پسند سے پکے گی۔

زہرہ شام کی دعوت کے انتظام میں مصروف ہوگئی ادھر ابراہیم لطف علی کے ساتھ کھیلنے کے لئے گھر سے نکلا برابر والے مکان سے اس نے لطف علی کو ساتھ لیا اور دونوں کھیل میں مشغول ہو گئے کھیلتے کھیلتے یکایک ابراہیم نے پوچھا

"لطف علی تم نے بھنڈی بازار دیکھا ہے؟"

لطف علی۔ میں نے تو نہیں دیکھا ہے کیوں کیا کروگے؟

ابراہیم۔ ہمارے ایک دادا ہیں بڑے غریب ان کے گھر جاتے۔

لطف علی۔ چلو کسی سے پوچھ لیں گے۔ تمہارے دادا کا نام کیا ہے؟

ابراہیم۔ سیٹھ عمر بھائی۔

لطف علی۔ چلو سپاہی سے پتہ پوچھ لیں گے۔

ابراہیم کو اس طرح گھر سے باہر جانے کی عادت نہ تھی اس لئے پہلے تو کچھ رکا مگر پھر شوق نے مجبور کر دیا اور وہ لطف علی کے ساتھ ہو لیا۔ تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر پولیس کے سپاہی انھیں ملتے اور راستہ بتاتے رہے اور بھنڈی بازار میں پہنچکر سیٹھ عمر بھائی کا مکان بھی بہت ہی آسانی سے مل گیا۔

مکان کی صورت دیکھتے ہی ابراہیم ہکا بکا ہوکر رہ گیا۔ غریب دادا جان کا گھر تو بہت ہی عالیشان تھا۔ اسے خیال ہوا کہ شاید یہ کسی اور کا گھر ہوگا مگر نام پتہ سب ٹھیک تھا۔ لطف علی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور دونوں کمرے کے اندر داخل ہونا چاہتے تھے کہ سیٹھ جی کے ملازم نے روکا۔

"ارے تم کون ہو کہاں گھسے چلے جا رہے ہو"

"ہم سیٹھ عمر بھائی کے پاس جا رہے ہیں"

"ٹھیر جاؤ پہلے میں سیٹھ جی سے پوچھ لوں"

نوکر اندر گیا اور ذرا دیر میں واپس آکر دونوں کو بلا لے گیا۔

عالیشان کمرہ۔ نہایت نفیس دری کا فرش۔ اعلیٰ درجہ کی میز کرسیاں خوشنما پردے اور دیواروں کی تصاویر! ہر چیز حیرت میں ڈالے دیتی تھی دونوں پر کچھ ایسا رعب چھایا کہ قدم آگے نہ اٹھ سکا اور قریب تھا کہ وہ چیخ مار کر رو دیں کہ اتنے میں ایک آرام کرسی میں سے بہت ہی نورانی صورت کے ایک ضعیف العمر شخص نے ہمت افزا لہجہ میں کہا:-

"کیوں بچو! کیا تم میرے پاس آئے ہو؟ آؤ آگے آؤ، ڈرو نہیں مجھے اتنی دور سے تمہاری صورت اچھی طرح نظر نہیں آتی۔"

آواز کا لہجہ شفقت آمیز تھا۔ ابراہیم آگے بڑھا اور کہنے لگا

"ہم تو دادا جان کے پاس گئے تھے۔ دادا جان کہاں ہیں؟"

"کون دادا جان؟ کس کے دادا جان؟ دادا جان کا نام کیا ہے؟"

ابراہیم۔ ہمارے دادا جان ہیں سیٹھ عمر بھائی نام ہے۔ بہت غریب ہیں بیچارے

عمر بھائی۔ (زیر لب مسکرا کر) سیٹھ عمر بھائی تو میرا ہی نام ہے۔ تمہارے والد کا نام کیا ہے؟

ابراہیم۔ ان کا نام ابا جان ہے۔ پانے دہرنی پر رہتے ہیں۔

تک تو سیٹھ جی کو پہلے ہی مر چکا تھا اب محلے کے نام سے پورا یقین ہو گیا کیونکہ گو سیٹھ جی کبھی خواب نہ دیتے تھے لیکن یعقوب برابر بیٹھے میں ایک آرہو خط انھیں بھاتا ہی رہتا تھا یہ یقین ہونے ہی کہ یعقوب کا بچہ ہے سیٹھ جی کو فوراً خیال آیا کہ اب یعقوب نے بھیجا ہوگا اور ضرور اس کے بھیجنے کا مقصد یہ ہے کہ اس پر ترس کھا کر کچھ میں دے نکلوں اس خیال کے ساتھ ہی تیوری میں بل پڑ گئے اور کسی قدر کرخت لہجہ میں انہوں نے پوچھا

"تم میرے پاس کیوں آئے ہو؟ تمہارے والد نے بھیجا ہے؟"

ابراہیم۔ پہلے آپ یہ بتا دیجئے کہ آپ بہت غریب ہیں؟

سیٹھ جی۔ ہاں میں بہت غریب ہوں تم اپنا مطلب کہو

ابراہیم۔ آپ کو شامی کباب بھی کھانے کو نہیں ملتے ہوں گے، ہمارے گھر آج شامی کباب پکیں گے اور مچھلی کے کباب بھی پکیں گے بڑی بھاری دعوت ہے میں نے سوچا کہ آپ سے بھی کہہ دوں کہ آپ شام کو ہمارے گھر کھانا کھا لیجئے امی کو خبر نہیں ہے کہ میں آپ کو بلانے آیا ہوں مگر وہ دو چار کباب ضرور زیادہ پکائینگی اور اگر زیادہ نہ بھی ہوئے تو ہم سب ایک ایک کباب آپ کو دیدیں گے شام کو ضرور آنا میرے اچھے دادا جان! دیکھئے میں بڑی دور سے آیا ہوں اور بڑی مشکل سے آپ کا گھر ملا ہے۔

سیٹھ جی۔ تم سچ سچ بتا دو کس کی دعوت ہے کس بات کی دعوت ہے اور تمہیں یہاں کس نے بھیجا ہے تو میں آؤں گا نہیں تو نہیں۔

ابراہیم۔ بات یہ ہے کہ ایک بہت بڑی بھاری سونے کی مچھلی تھی اس گھر سے بھی بڑی۔ نہیں یہ تو بہت بڑا گھر ہے۔ ہمارے گھر سے بھی بڑی ابا جان پانچ برس سے اسے پھانس رہے تھے اور وہ نہیں پھنستی تھی بس آج وہ پھنس گئی اسی کی خوشی میں ابا جان نے آج مجھے اور ان کو بڑی بھاری دعوت دی ہے اور اسی وقت انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ تمہارے دادا جان غریب کو خبر بھی نہیں ہے اگر انھیں خبر ہوتی تو آج انھیں بڑی خوشی ہوتی۔ اسی سے مجھے معلوم ہوا کہ آپ بہت غریب ہیں اور ملتے ہیں پھر میں نے ابا جان سے بہت سی باتیں پوچھیں ابا جان چلے گئے تو میرا گھر میں دل نہیں لگا اور یہی جی چاہا کہ آپ کو بھی خبر کر دوں۔ اکیلے تو مجھ سے آیا نہیں جاتا لطف علی کو ساتھ میں لے لیا انھیں بہت سے راستے معلوم ہیں سپاہی بڑے اچھے تھے سب نے ٹھیک ٹھیک راستہ بتا دیا آؤ نہیں بھرا ابھی نہیں آپ شام کو ضرور آئیگا۔ شامی کباب بڑے مزے کے ہوتے ہیں ہمیں بھی کبھی کبھی ملتے ہیں تو آپ کو تو کہاں ملتے ہوں گے۔

سیٹھ جی نے خاموشی سے رومال جیب سے نکالا آنکھیں پونچھیں، اور پھر کھنکار کر گلا صاف کیا

"اچھا تو تم تھک گئے ہو گے تھوڑا سا دودھ پی لو۔"

ابراہیم۔ لائیے۔

سیٹھ جی نے گھنٹی کے بٹن پر انگلی رکھی، نوکر آیا اور ضروری احکام لیکر چلا گیا۔ ذرا سی دیر بعد بڑے سلیقے سے دو پیالیوں میں دودھ اور کچھ کیک اور بسکٹ لا کر میز پر رکھ دیئے دونوں بچوں کو بھوک لگی ہوئی تھی بہت لطف سے وہ چیزیں کھائیں اور پھر جب دادا جان سے وعدہ لیکر رخصت ہونے لگے تو انہوں نے نوکر ساتھ کر دیا کہ حفاظت سے پہنچا دے۔

زہرہ کو کام کاج میں خیال بھی نہ آیا تھا کہ ابراہیم کتنی دیر سے غیر حاضر ہے وہ آتے ہی اپنے حسب معمول کھیل کود میں مصروف ہو گیا شام کو یعقوب کے آنے پر جب زہرہ نے کھدر کی پھٹی ہوئی ساری نکال کر میز پر بچھائی اور نام چینی کے خستہ اور فرسودہ برتنوں میں کھانا لا لا کر میز پر رکھنا شروع کیا تو ابراہیم نے کہا۔

"امی ہم بھی ایک آدمی کی دعوت کر آئے ہیں وہ اب آتے ہی ہونگے"

زہرہ۔ لطف علی کی دعوت کی ہوگی آپ نے ؟

ابراہیم۔ نہیں تو۔

زہرہ۔ تو پھر اور کسے بلا لادے آئے ؟

ابراہیم (مسکرا کر) ہم بتائینگے نہیں جب وہ آ جائینگے تو دیکھ لینا۔

زہرہ۔ ابرا کس قدر ہے بیچارہ ! ساری عادتیں بادا ہی کی سی سیکھی ہیں بتاتا کیوں نہیں۔

ابراہیم۔ نہیں بتاتے کیوں بتائیں ؟

زہرہ۔ اچھی بات ہے میں تمہارے مہمان کو کھانا بھی نہیں دونگی مت بتاؤ۔

ابراہیم۔ مت دیجئے گا ہم اپنا حصہ انھیں کھلا دینگے۔

زہرہ۔ میں تمھیں ہی نہیں دوں گی تو پھر کیا کروگے . . . . .

دروازہ پہ دستک ہوئی۔ ابراہیم نے دوڑ کر دروازہ کھولا اور خوش ہو ہو کر چلانا شروع کیا "امی وہ آ گئے، امی وہ آ گئے"

ایک بہت ہی بوڑھا شخص عینک لگائے موٹی سی چھڑی لیئے اندر داخل ہوا۔ یعقوب کی پشت دروازہ کی طرف تھی کرسی گھما کر اس نے دیکھا اور فوراً کرسی سے اچھل پڑا

"ہائیں ! ابا جان ! . . . .

ایک خفیف سی مسکراہٹ سیٹھ عمر بھائی کے چہرہ پر نمودار ہوئی اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

زہرہ نے آگے بڑھکر بہت ادب سے سلام کیا

"عمر دراز، خوش رہو ! اچھی ہو بیٹی ؟

زہرہ۔ جی ہاں آپ کی دعا سے بالکل اچھی ہوں۔

اتنے میں ابراہیم ایک پلیٹ میں شامی کباب لئے ہوئے آ گیا۔

"دیکھئے دادا جان شامی کباب ایسے ہوتے ہیں"

یعقوب۔ بڑا بدتمیز بچہ ہے۔ ابا جان تشریف رکھئے۔

چونکہ کرسی گھر میں نہ تھی اس لئے ابراہیم کو یعقوب نے گود میں بٹھا لیا اور کھانا شروع کرنیکی درخواست کی۔

مگر سیٹھ جی اسی طرح کھڑے رہے۔ کمرہ کی ایک ایک چیز کو انہوں نے غور سے دیکھا۔ رومال سے آنسو پوچھے اور پھر جیب میں ہاتھ ڈال کر تین لفافے نکالے۔

"یعقوب ! مجھے بہت افسوس ہے کہ میں نے تمہارے ساتھ زیادتی کی میں غلطی پر تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنی غلطی کی کچھ تلافی کر دوں۔ یہ دونوں لفافے تم دونوں میاں بیوی کے ہیں، اور یہ تیسرا مسٹر ابراہیم کا ہے جنھوں نے مجھے شامی کبابوں کی دعوت دی تھی"

لفافے کھولے گئے تو معلوم ہوا کہ سیٹھ جی نے ایک ایک لاکھ روپیہ بیٹے اور بہو کو دیا تھا اور پوتے کو تمام جائداد کا وارث بنا دیا تھا۔

"ابا جان ! . . . . . . ابا جان ! . . . .

"بس بس کسی کے کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے رنج ہوگا"

ابراہیم۔ دادا جان آپ تو کہتے تھے کہ آپ غریب ہیں آپ کے پاس اتنا بہت سا روپیہ کہاں سے آیا !

سیٹھ جی۔ بیٹا سچ مچ میں غریب آدمی ہوں۔ روپیہ پیسہ کسی کو امیر نہیں بنا سکتا۔ میں اس سے بہی زیادہ عمدہ پکے ہوئے شامی کباب روز کھاتا ہوں لیکن ان کے مزے سے میں نہیں بلکہ تم ہی واقف ہو۔ قورمہ اور بریانی میری روزمرہ کی غذا ہے مگر اس میں وہ ذائقہ نہیں ہوتا جو تمہاری تور کی دال اور چاولوں میں ہوتا ہے موٹر دل میں بیٹھتے بیٹھتے اب میں پیٹرول کی بدبو سے اکتا چلا ہوں اور پیدل چلنے کو جی ترستا ہے۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ تمام عمر دولت کی تلاش میں سرگرداں رہنے کے بعد اب جبکہ اس کے ڈھیر بھرے خزانوں میں لگے ہوئے ہیں تو میری سمجھ میں آیا ہے کہ دولت اس

چیز کا نام نہیں ہے وہ دولتمند صرف وہ شخص ہے جس کی سب ضروریں پوری ہو جائیں وہ شخص محتاج ہے جس کی ضروریں پوری نہ ہوں اور حاجت مندی باقی رہے۔ میری ضرورتیں سونے چاندی کے اتنے بڑے ڈھیر سے بھی پوری نہیں ہوئیں اس لئے میں محتاج اور غریب ہوں تمہاری ضرورتیں سونے چاندی کے انبار کے بغیر ہی پوری ہو جاتی ہیں اور چونکہ تم حاجتمند نہیں ہو اس لئے امیر ہو۔ امیری در اصل دولت کے بڑھانے کا نہیں بلکہ ضرورتوں کے گھٹانے کا نام ہے اس لئے میرے بچے! درحقیقت تم ہی امیر ہو اور میں غریب ......



اردو شاعری اور اعتراضات کی نوعیت

(از جناب عشرت صاحب رحمانی)

شاعری کیا ہے؟ دلی جذبات کا اظہار ہے

ارباب حل وعقد نے شاعری کے متعلق مختلف نقاط نظر سے بحث وتجس کی ہے اور بہت کچھ خیالات وآرار کا اظہار کیا جاتا رہا ہے۔ لیکن طوالت سے قطع نظر کرکے اگر اختصار وجامعیت کا جامہ پہنایا جائے اور مختصر الفاظ میں اصل مطلب بیان کرنا ہو تو تمام خیالات کا مرکز یہی تسلیم کرنا پڑے گا کہ

شاعری (کیا ہے؟) دلی جذبات کا اظہار ہے

گو مختلف گروہ مختلف انداز میں شاعری کے مقاصد بیان کرتے نظر آتے ہیں۔ لیکن بہرصورت اس سے کسی کو اختلاف نہیں۔

یہ دوسری بات ہے کہ اہل منطق کے نزدیک بعض عقائد کے لحاظ سے شاعری کی جو تعریف ہو وہ ایک شاعر وادیب کو جب وہ شعریت کے جمال وکمال پر نظر ڈالے تو خشک اور کسی قدر غیر دلچسپ معلوم ہونے لگے۔ لیکن اس میں صرف فرق یہ ہوگا کہ شاعر شعر کی تعریف کرتے وقت الفاظ کے خط وخال کا لحاظ رکھے گا۔ اور اصطلاحی خشکی کو خوشگوار رنگ میں دلچسپ بنا دے گا۔ برخلاف اس کے منطقی تعریف اپنے دلائل وبراہین کی طوالتوں کے اعتبار سے خشک ضرور ہو جائے گی۔ لیکن اس سے کسی کو اختلاف نہیں ہوسکتا کہ

"شاعری دلی جذبات کے اظہار کا نام ہے"

اب اس سے آگے منطقی دلائل کے لحاظ سے یا ادیبانہ انداز میں اس اجمال کی بہت سی تفصیلات ہوسکتی ہیں اور ہو چکی ہیں۔ جو بجائے خود بہت کچھ درست اور مناسب ہیں۔

اس لئے اگر ان تفصیلات سے بحث کی جائے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ محققین کے اقوال کو کسی قدر جدید لباس میں پیش کردیا جائے۔ اور بہرحال وہی سب کچھ کہا جائے جو اب تک کہا ہے زیادہ تر کہا جا چکا ہے۔ اس لئے ان کو دہرانا نہ چنداں ضروری ہے اور نہ مناسب۔

شاعری کی اس اجمالی تعریف سے تو کسی کو اختلاف نہیں ہوسکتا۔ البتہ تفصیلات میں جب بیان کے مختلف پہلو ہوجاتے ہیں اس حالت میں تقسیم کے ساتھ تفریق کا پیدا ہونا بھی قدرتی ہے۔ چنانچہ اسی اصول کی فروعات میں طبائع واذواق کے

اعتبار سے اختلاف پیدا ہوتا گیا ہے۔ اور جس کا ذوق جس طرف رہبری کرتا ہے وہ اس کے مطابق عمل پیرا ہے۔

اصل یہ ہے کہ جذبات و کیفیات کی مناسب و موزوں الفاظ میں تصویر کھینچنے کا نام شاعری ہے۔ اب وہ کی تصویر کشی کا انداز کچھ ہے کسی کا کچھ۔

بعض خورد و نگاہیں صرف عشقیہ جذبات کے اظہار کو ہی شاعری تصور کرتی ہیں۔ اور ان کے نزدیک موزوں الفاظ وہ ہوتے ہیں جو سنجیدہ طبقہ کے نزدیک پست ترین سمجھے جاتے ہیں۔

اسی طرح ایک طبقہ سرے سے عشقیہ جذبات کو شاعری کے لئے معیوب سمجھتا ہے۔ ان دونوں گروہوں کے خیالات بڑی حد تک غور طلب ہیں۔ اور ان کے خیالات کی تشریح اور اس کی اصلاح کی شاعری کی تعریف و توضیح سے زیادہ ضرورت ہے۔

ہمارے نقادانِ ادب میں ایک گروہ ہے جو مغرب کے رنگ میں اس قدر ڈوبا ہوا ہے کہ ایشیائی شاعری کی تعریف کرتے وقت بھی جب نفسی شاعری سے بحث کرتا ہے تو اہلِ مغرب کے اقوال دلیل میں پیش کرکے اپنی تعریف کو مکمل کرتا ہے۔ ان حضرات کے خیال میں اس طریقہ سے ان کی تنقید و تبصرہ کی کچھ وقعت زیادہ ہو جاتی ہوگی۔

خدا جانے یہ حضرات مشرق کو مغربی نظر سے کیوں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کیا اقوال پیش کرنے کے لئے ہمارے اسلاف کے خیالات رہبری نہیں کرتے۔ ضرورت تو یہ ہے کہ اپنے بزرگوں کے خالص مشرقی اقوال سے دیگر معترضین کے اقوال اور الزامات کی جو اُن کے برخود غلط نقطۂ نظر نے قائم کئے ہیں، تردید کریں اور بتائیں کہ ایشیائی شاعری کا دامن مغربی شاعری سے کم مالا مال نہیں۔ اردو شاعری پر خصوصاً اور مشرقی شاعری پر عموماً الزام یہ ہے کہ حسن و عشق کی داستانہائے پارینہ کے سوا اس میں کچھ نہیں۔ لیکن حقیقت پر غور کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ اعتراض و الزام نہ کچھ زیادہ وقعت رکھتا ہے اور نہ یہ خیالِ الزام کی مکروہ اہمیت اختیار کرتا ہے۔ بلکہ ہمارے اپنے ہی غلط خیالات نے اسکو جس حد تک بھی اہمیت دی ہے، مل گئی ہے۔

غور کی نگاہیں جانتی ہیں کہ یہ خزینہ ہر قوم اور ہر رنگ کے جواہرات و آسائشی اشیائے آبدار سے مالا مال ہے۔ تصوف، فلسفہ، معرفت ہر قسم کے مضامین اردو شاعری کا (عہدِ آغاز سے) حسن بنے ہوئے ہیں۔ لیکن ہماری شاعری میں منجملہ دیگر اصناف کے سب سے زیادہ مقبول و مرغوب غزل ہے۔ غزل میں عموماً عشق و محبت کے افسانے دوہرائے جاتے ہیں۔ چونکہ فطرتِ انسانی کا لگاؤ خصوصیت سے جذبۂ عشق سے ہے اور یہ کلیہ ہے کہ جن معاملات سے انسان کو اُنس اور شغف زیادہ ہوتا ہے۔ انھیں کا بیان زیادہ ذوق و شوق سے کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غزل محبوب ترین صنفِ شاعری مانی جاتی ہے اور اس طرف کثرت سے عام مبالغہ کا رجحان ہوتا ہے۔

مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حسن و عشق پر تغزل کا مدار نہیں بلکہ کل کائنات کا مدار ہے۔ عشق وہ جذبۂ حقیقی ہے جس کے بغیر انسان انسان کہلانے کا مستحق نہیں اور ہر دل حسن کا قدردان بلا امتیاز ہوتا ہے۔ عشق کا پاکیزہ اثر ہر قلبِ حساس کو گرماتا ہے۔ دنیا کی کوئی شے نہیں جو حسن سے معمور نہ ہو۔ اس حالت میں عشقیہ شاعری پر الزام ہو سکتا ہے تو کیسا۔

اردو شاعری کے متعلق ہی اگر یہ الزام ہے تو پھر دوسری ترقی یافتہ زبانوں کی شاعری کو اس سے بری نہیں کیا جا سکے گا کیونکہ جب

"شاعری دلی جذبات کا اظہار ہے"

اور بلا امتیاز ملک و قوم "عشق و حسن" کے اثرات سے کوئی جگہ خالی

نہیں تو کسی زبان کی شاعری ان "جذبات عشق" کے اظہار بغیر نہ ملیگی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ "عشقیہ جذبات" کا اظہار معیوب نہیں ور جن آراء کے مطابق معیوب ہے ان کی چنداں کوئی اہمیت نہیں یہاں مسئلہ جو غور طلب ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے اکثر اردو شعراء عشق کے جذبۂ صادقہ اور "ہوس و حرص" میں تفریق نہیں کرتے اور وہ ہوس کارانہ جذبات جن سے انسانیت مجروح ہو اور جن کا اظہار خودداری کو پامال کرے۔ خصوصاً ان کی غزل کا حسن بن جاتے ہیں۔ اور انہیں بدنام کنندہ نکونامے چند کی گم کردہ راہوں کی بدولت "عشقیہ شاعری" پر الزام دہرے گئے ہیں لیکن وہ عشق نہیں بوالہوسی ہے جس کا اظہار وہ کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایشیائی شاعری اور خصوصاً اردو شاعری کو انہیں مجہول جذبات کا مخزن سمجھکر مورد عتاب قرار دیا جانے لگا۔ مخصوص غزل گو طبقہ میں "حسن" نمایش کا نام ہوا۔ اور "بوالہوسی" یہ عام ہوئی کہ اہل نظر کی آبرو پر پانی پھر گیا۔

اب تعلیم و ترقی کا جو زمانہ آیا۔ تعلیم یافتہ یعنی مغرب زدہ حضرات نے سرے سے اردو شاعری کو یہ کہہ کر مکروہ ٹھہرایا کہ یہ دفتر بے معنی "عشق و حسن" کی داستانوں سے بھرا ہوا ہے اس لئے تمام شعراء متقدمین مردود اور انکا کلام جلا دینے کے قابل ہے۔ یہاں یہ بہت کم سوچا گیا کہ اس رطب و یابس کے دفاتر میں سے کنکر اور موتی تمیز کرکے کچھ کہیں۔ اگر یکطرف ناکارہ خذف ریزوں کو نظر سے گراتے ہیں تو دوسری طرف جواہر کی قرار واقعی ستائش کرکے دنیا کو ان کی خوبیوں سے روشناس کرائیں۔ مگر یہاں تو مغربی عینک تھی۔ مشرق کی ہر شے دھندلی ہی نظر آئی اور اس کے حصہ میں الزام ہی الزام آکر دوسرا الزام اردو شاعری پر یہ لگایا گیا کہ ادائیگی کے طریقے متقدمین نے غیر فطری اختیار کئے یعنی استعارات و تشبیہات نے واقعات کو حقیقت سے بعید کر دیا۔ جن ارباب نظر نے غور کیا ہے ان سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ یہ الزام ہی بڑی حد تک غلط فہمی پر مبنی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ بعض جگہ ہماری شاعری میں انداز بیان اس قدر غیر فطری ہو جاتا ہے کہ مضحکہ خیز ہو جائے۔ مثلاً "مرنے کے بعد عاشق نامراد کی صدائیں" "خرام نازِ محبوب سے مرقدِ عاشق کی پامالی کے لئے حسرتوں کی چیخ پکار" وغیرہ۔ کہ

کس کے خرام ناز نے قبر میں دل ہلا دیا
چین سے سو رہا تھا میں کس نے مجھے جگا دیا

ضرور سنجیدگی سے دور اور معیوب ہیں۔ لیکن چند مثالوں سے یہ کہہ دینا کہ اردو شاعری کا دامن انہیں عیوب سے بھرا ہوا ہے۔ غلط اور بالکل غلط ہے۔

جہاں تک تشبیہ و استعارہ کا تعلق ہے وہ شاعری کا حسن ہیں۔ کلام بغیر تشبیہ و استعارہ کی چاشنی کے پھیکا اور بے مزہ رہتا ہے جب تک بداعت اسلوب اور نزاکت تخیل رنگینی نہ پیدا کرے شعر لطیف اور دلکش نہیں ہو سکتا۔ ہاں "زلف و رخ" "خد و خال" "کنگھی چوٹی" کے مضامین میں جو بیجا غلو بعض شعرائے متقدمین نے روا رکھا وہ ضرور قابل اعتراض ہے۔ کیونکہ زیادتی خوبی کی بھی ہو تو بے لطفی پیدا کر دیتی ہے جیسے ع "کون کہتا ہے کہ معشوق کمر رکھتے ہیں" اور اسی قبیل کے دیگر کلام۔

لیکن ذیل کے اشعار میں کس کو حسن نظر نہیں آتا۔ اور کون سی نظر اعتراض کا غیر مناسب پہلو نکال سکتی ہے۔ حالانکہ ان میں بھی حسنِ محبوب کا ہی اظہار ہے۔

ے

خیال زلف میں خود رفتگی نے قہر کیا
اُمید تھی مجھے کیا کیا بلا کے آنے کی

مر بھی گئی عشاق تری زلف سے مل مل
تو اگر نکلے چمن سے تو بہار آ جائے

چھپنا تو دیکھنا اک قیامت سے بھی ندرم
طرز خرام شوخی رفتار کے لئے

ان اشعار میں جو استعارات و کنایات ہیں وہ (جیسا کہ ظاہر ہے) بجائے خود ضروری اور برمحل ہیں۔ ان کے بغیر پیچیدگی پیدا ہو جاتی اور اس قدر لطف اس مضمون کی ادائیگی میں نہ رہتا۔

مندرجہ بالا بیانات سے الزامات کی نوعیت واضح ہو جاتی ہے اور صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اعتراضات غیر اہم ہیں اور کلیہ کی صورت اختیار نہیں کر سکتے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ شعرا کن کن صحبتوں میں جلوہ گر ہوئے ہیں اور ان کے کارناموں کو کیوں معرض الزام قرار دیا جا سکا۔ حقیقت یہ ہے کہ فرق افراط و تفریط کا ہے۔

ایک گروہ بیجا قدامت پرستی کے زعم میں کہیں سے کہیں پہنچا ہوا ہے اور بجائے اس کے کہ بعض اساتذہ متقدمین نے جو کچھ کہہ دیا اس کو وقت اور زمانہ کی مناسبت سے قابل غور سمجھ کر کچھ ترمیم کرے اس پر بیجا طور پر مصر ہے کہ اگر وہی پیش پا افتادہ اور پامال چوٹی کنگھی اور زلف و کمر کے مضامین اسی انداز میں جس طرح شاعری کے باوا آدم نے کہے ہیں اگر آج تک نہ دہرائے جاتے رہیں تو ہماری شاعری آسمان سے باہر متصور ہو گی۔ اس طرح وہ تمام محاسن کو جو واقعی محاسن ہیں اور ان تنگ نظر پرانی لکیر کے غلط رو فقیر شاعروں کی اپنی غلطی سے معیوب سمجھے جاتے ہیں اردو شاعری میں کیف و اثر پیدا کرنے کے ضامن ہیں۔ جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ اور یہ سب کچھ اس طبقہ سے ظہور میں آتا ہے جو صحیح محاسن شاعری کو تو اپنی کم سوادی اور کم فہمی کے سبب سمجھتا نہیں آسانی سے جو کچھ خود کہہ سکتا ہے اور پامال ترکیب و قدیم طرز اس کی تقلید کر سکتا ہے آنکھیں بند کئے کرتا چلا جاتا ہے۔

مثلاً :-

عرض بادہ کے عواقب کو سمجھتا ہوں مگر
اس قدر بس تیرہ کیوں ہے تماشائی کا

نور صبح خنداں آنسا جبر کی جبیں سے ہے
ابد کا سلسلہ مربوط زلف عنبریں سے ہے

با ملا طلاقت بت تیرہ جبین سجدہ ریزا
شان تکوین دو عالم دعوت یک سجدہ ہے

ان اشعار سے ظاہر ہے کہ الفاظ مرعوب کن ہیں مگر معنویت؟ "کوہ کندن و کاہ برآوردن" کے مصداق!

دوسرا گروہ وہ ہے جس کا ہر رکن اپنے آپ کو ٹکسالی شاعر کہنے کا مدعی اور اپنے دفاترین کے مقابلے میں تمام دوسرے مجموعہ ہائے کلام کو قطعاً قابل منسوخی سمجھتا ہے۔ یہ بھی الفاظ کو ترجیح دیتے ہیں مگر عامیانہ الفاظ ان کے کلام کا حسن اور یہ ان کے نزدیک شاعری ہے۔

معاملے کے ہے بالکل خلاف اے ساقی
کہ ہم کو جام دے یا اور دام لے سبو کے لئے

اور حقیقت میں شاعری نہ وہ ہے اور نہ یہ۔

دونوں گروہ کے خیالات ایک نہ ایک حد تک اصلاح طلب ہیں۔ اکثر وہ اعتراضات جو آج کل ہماری شاعری پر وارد ہو رہے ہیں بڑی حد تک دوسرے گروہ کے غلو کا ہی نتیجہ ہیں۔ صرف موزونیت کا ہی نام شاعری نہیں۔ شاعری واقعی طور پر ان دونوں گروہوں کے درمیان ہے۔ یعنی حقیقی شاعری مذکورہ ہر دو گروہ کی شاعری کی اصلاحی شکل کا نام ہے۔ کہ نہ الفاظ و

تراکیب اسقدر مغلق ہوں کہ سوقیت پیدا ہوجائے اور غرابت اور کاداکی نمایاں ہوکر بدنما بنادے۔ اور نہ اس قدر عامیانہ کہ ابتذال سے کراہت ظاہر ہو۔

یعنی اسلوب ادر۔ تناسب لفظی۔ اور صحت تراکیب کیساتھ برجستگی اور سادگی سے پاکیزہ خیالات: جذبات کا اظہار شاعری ہے۔ اس حیثیت سے نہ عشقیہ شاعری عیب ہے اور نیچرل شاعری۔ تکبندی اور قافیہ پیمائی اور حقیقی شاعری میں وہی فرق ہے جو زمین اور آسمان میں۔

شاعری کے جن گروہوں کا تذکرہ کیا گیا ہے آیندہ مثالوں کے ذریعہ ان کے موازنہ سے صحیح اور غلط کی تفصیلات بیان کی جائیں گی۔ جن میں شعرائے متقدمین متاخرین اور دورِ جدید کی بحث ہی آئے گی۔ مختصر یہ ہے کہ "اہل ذوق کے شعر کہنے کو شاعری کہتے ہیں" خصوصاً آج کل شاعری عجیب کشمکش میں مبتلا ہے اور عجیب عجیب بحثیں شروع ہوگئی ہیں۔

ایک گروہ کا عقیدہ ہے کہ "شاعری چند پیچیدہ اور بھونڈے بھاری بھاری الفاظ کے الٹ پھیر کا نام ہے۔ یہ حضرات کوشش کرتے ہیں کہ ادائیگی میں اغلاق و اشکال پیدا کیا جائے۔ اور دانستہ اہمال و ابہام پیدا کرنے کی کوشش ہوتی ہے"

اس گروہ کے اکثر غلط رو شعرار کا عقیدہ ہے کہ یہ جدید شاعری ہے اور انہوں نے ا.. رو شاعری کی بہت کچھ اصلاح کی ہے ان میں سے بعض حضرات کو مغالطہ ہے کہ وہ غالب کے جانشین خاص ہیں۔ ان کو گمان غالب ہے کہ الفاظ کے بھاری پن سے خواہ مخواہ معنویت بھی پیدا ہوجاتی ہے اور شعریت بلند۔ ع دوسرے گروہ کی یہ حالت ہے کہ دندانِ تو جملہ در دہان اند یعنی شعر ہوا۔

اکہتر۔ بہتر۔ تہتر۔ چوہتر
پچہتر۔ چھہتر۔ ستتر۔ اٹھتر

ان کے عامیانہ الفاظ میں خیالات بھی عام اور پامال ہی ہوتے ہیں جس کو یہ سہل ممتنع کا رتبہ دیتے ہیں اور عام فہم و مقبول عام سلیس و سادہ کلام کہتے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

غلط کیوں کر کہے کوئی غلط مشکل سے ہوتی ہے
وہی تو بات ہوتی ہے جو سچے دل سے ہوتی ہے
اِدھر اقرار کرنا اور اُدھر فوراً مکر جانا!
مجھے خفت تمہارے وعدۂ باطل سے ہوتی ہے

غمزدہ کی عید

ننھی سی سونے کی کشتی میں برائے خاص و عام — آسماں لایا ہے رکھ کر اک مسرت کا پیام
نیلا نیلا آسماں ہے جس کا دریا بے کنار — اس میں چھوٹی سی سنہری ایک مچھلی آشکار
ایسی بے تابی سے کیوں ہر شخص محو دید ہے — اب میں سمجھی یہ سنہری شے ہلال عید ہے
روزہ داروں کے لئے اللہ نے بھیجی ہے عید — چاند ہے گویا کہ روزوں کے پہنچنے کی رسید
ہے یہ پیغام خوشی آسودہ حالوں کے لئے — عید آئی ہے جہاں میں عید والوں کے لئے
کیوں کہوں اس کو خوشی کا اور خوشحالی کا چاند — ہے جو گھر خالی تو پھر یہ چاند ہے خالی کا چاند
دور ہے مجھ سے مرا سرتاج برسیں ہو گئیں — ہے تمنا میرے گھر میں آج برسیں ہو گئیں
کیا خبر ہو عید کیا ہے اور کیا ہے یہ ہلال — دل میں آتا ہی نہ ہو جب شادمانی کا خیال
ہاتھ پیلے ہیں تو ہوں مہندی لگاؤں کس لئے — شیر خرما کون کھائے گا، پکاؤں کس لئے
سرمہ دانی ساری آنکھوں میں لگا بھی لوں تو کیا — عطر سیروں لے کے میں اس میں نہا بھی لوں تو کیا
ہو خوشی یا شادمانی سب نصیبوں کی ہے بات — وہ نہیں گھر پر تو کیسی عید، کیسی شب برات!
کس سے جی بہلاؤں کوئی شے مجھے بھاتی نہیں — کیا ہنسوں بولوں کہ جھوٹوں بھی ہنسی آتی نہیں

ننھے سے اس چاند کے بدلے فلک پر اے خدا — اک بڑا سا آئینہ ہوتا اگر رکھا ہوا
عکس سب پردیسیوں کا اس میں ہوتا جلوہ گر — وہ نہ آتے لیکن ان کی شکل آ جاتی نظر
دیکھ لیتے وہ مجھے میں ان کی حالت دیکھتی — جس کو یہ آنکھیں ترستی ہیں وہ صورت دیکھتی

یوں خوشی کی ہو بھلا اس چاند سے امید کیا؟
وہ نہیں ہیں پاس تو مجھ غمزدہ کی عید کیا؟

سعید بریلوی

درس عمل

(از حضرت حکیم آزاد انصاری مدظلہ)

اہلِ غیرت ہے تو غیرت پیش کر ملکی و ملّی حمیت پیش کر
قوم کے جانباز خادم! پیشِ قوم اپنی جانبازانہ خدمت پیش کر
مال بہرِ دفعِ اہلِ شر نکال جان بہرِ حفظِ ملّت پیش کر
عرضِ حالِ بے کسی کے دن گئے اب وفورِ عزم و ہمت پیش کر
خوفِ مرگ و ذلیت سے منہ موڑ کر شانِ اربابِ جلادت پیش کر
مرد کو خوف و خطر شایاں نہیں مرد بن، مردانہ خصلت پیش کر
قوم کو اپنی اعانت سے اُبھار دین کو اپنی حمایت پیش کر
بادشاہی کی ہوس برحق، مگر بادشاہی کی لیاقت پیش کر
سلطنت کو قابلیت شرط ہے سلطنت کی قابلیت پیش کر
دادِ پامردی بلا حجت نہ چاہ کوئی پامردی پہ حجت پیش کر
جنسِ آزادی بلا قیمت نہ مانگ جنسِ آزادی کی قیمت پیش کر
لاکھ اقوالِ شجاعت رائگاں چند اعمالِ شرافت پیش کر

پھر ادب سے ایشیا کے سامنے
ربع مسکوں کی سیادت پیش کر

یک لمحۂ زیست

(از جناب پروفیسر شفیع احمد صاحب مظہری ایم اے)

لمحہ لمحہ جمع ہو کر زندگی پاتا ہے نام   حیف اس لمحے پہ جس سے زندگی کو عار ہو
یعنی جو انسانیت کے واسطے ٹھہرے مضر   یا وہ بھی جس کی دل انسان کا بیزار ہو
جس سے نادانستہ یا دانستہ کیسے بھی سہی   دوسروں کے دل کو ناحق صدمہ و آزار ہو
مختصر یہ ہے کہ جس سے غیر کا یا اپنا دل   مردہ و پژمردہ یا افسردہ و بیمار ہو

اب ذرا اس کے مقابل میں وہ لمحہ لیجیے   جس میں اک طوفاں زدہ انساں کا بیڑا پار ہو
آبنائے تنگ تر بھی بحر بے پایاں میں بھی   ایک لفظ اور اک نظر مستول ہو پتوار ہو
اک نگاہ ہمت افزا، اک تبسم دل نواز   مستقل تعمیر مستقبل کا اک معمار ہو
ہاں، مگر یہ لفظ یہ برق تبسم، یہ نگاہ   دیکھنا ایسا نہ ہو بے سود اور بے کار ہو
امتیاز اعتقاد و رنگ و ملت کے بغیر   "احتیاج صادق" استحقاق کا معیار ہو
سعی پیہم پر بھی ناکامی کامل کا شکار   جو ہوا ہو بس وہی امداد کا حقدار ہو
مفلس و قلاش ہو یا منعم و سرمایہ دار   صاحب تسبیح ہو یا بندۂ زنار ہو

ہاں، مبارک آپ کو یہ عید اور یہ زندگی   ہر گھڑی اک جشن ہو، ہر روز اک تہوار ہو

درسِ عبرت

(از جناب اسرار احمد صاحب آزاد سابق اڈیٹر العزم)

اے تغافل کیش رنگِ عالمِ فانی بھی دیکھ — شانِ تعمیرِ ہوس دیکھی ہے ویرانی بھی دیکھ

حال و استقبال کی تمہید طولانی بھی دیکھ — پھر اُٹھا کر سرگزشتِ عمرِ نادانی بھی دیکھ

درسِ عبرت کائناتِ دہر کی ہستی سے لے — اے پریشان سبب وجہ پریشانی بھی دیکھ

نکتہ چینی اب مجاذیبِ ستم کی چھوڑ دے — اے گرفتارِ بلا اپنی گراں جانی بھی دیکھ

اپنے اعمالِ حقیقت کوش پر آنسو بہا — خود سبب جس کا بنا تھا وہ پریشانی بھی دیکھ

ناز نسبت پر نہ کر نسبت کو تجھ سے عار ہے — جامۂ ہستی میں اپنی آج عریانی بھی دیکھ

فطرتِ ہستی کے آئینہ میں صیقل پیش کر — اے حقیقت بے خبر اسبابِ حیرانی بھی دیکھ

بحرِ عرفانِ قضا میں جزر بھی ہے مد بھی ہے — قلتِ وحدت کو دیکھا ہے فراوانی بھی دیکھ

خیز اے مسلم کہ تو خوابِ پریشاں دیدۂ
عالمِ توقیرِ خود را جملہ حیراں دیدۂ

کیفِ تغزل

(از جناب عبد السمیع خان صاحب نگہت شاہجہانپوری بی اے (آنرز))

جب نہیں سنتے وہی آواز کو ۔۔۔ کیا کریں دل کے شکستہ ساز کو
اللہ اللہ کیفِ اربابِ نیاز ۔۔۔ دیکھ لو ساقی کی چشمِ ناز کو
آئے تم اور جان میں جاں آگئی ۔۔۔ اب میں سمجھا زندگی کے راز کو
مرحبا خاکِ شہیدانِ وفا ۔۔۔ وہ مٹائیں کشتہ ہائے ناز کو
میری چشمِ شوق کی یہ شوخیاں ۔۔۔ لے اُڑیں ظالم تیرے انداز کو
شمعِ دل کی لو کہیں بجھتی ہے یوں ۔۔۔ خوب چلنے دو ہوائے ناز کو

تم کہاں نگہت کہاں یہ نو بہار
دو دعائیں ساقیِ گلباز کو

سلطانہ رضیہ کی قبر دیکھکر

(از محترمہ رفعت شہرانیہ صاحبہ)

بغایت رنج و غور و فکر سے دورِ زماں دیکھا ۔۔۔ مزارِ رضیہ شاہنشہ ہندوستان دیکھا
وہی رضیہ جو شاہ التمش کی نورِ دیدہ تھی ۔۔۔ وہی رضیہ جو خود بھی کشور آرا و فریدہ تھی

وہ جس کا نام سن کر مردِ میداں تھرتھراتے تھے
وہ جس کی ہمتوں پر صف شکن بھی رشک کھاتے تھے

نگاہِ غیظ جس کی موت کا پیغام تھی گویا
نگاہِ لطف کے رہتے تھے سب ذی شان تک جویا

نہ رکھتی تھی نظیر اپنی زمانے کے دلیروں میں
لیا جاتا تھا جسکا نام ادب کے ساتھ شیروں میں

رہی اس دارِ فانی میں جو برسوں حکمراں بن کر
گلِ نازک بدن زینت طرازِ گلستاں بن کر

شکستہ سی لحد گویا کتابِ درسِ عبرت ہے
چراغِ کاخِ شمس الدین کی تاریک تربت ہے

بجائے اطلس و دیبا میسر خاک کا بستر
نگاریں چھت کے بدلے سایہ گستر چرخِ نیلوفر

پڑیں تپتی ہوئی دھوپیں، کہ جھڑ ہو ابرِ باراں کا
پڑا سہتا ہے سب کچھ جسمِ نازک اس پُر ارماں کا

مسلط حسرت و حرماں کے تھے آثار تربت پر
پڑا تھا آہ برگِ خشک کا انبار تربت پر

وہ جس کے قصر و ایواں رشکِ فردوس بریں ہونگے
حسین و منتخب جس ماہرو کے ہمنشیں ہوں گے

غلاظت گاہ حیواں آج اس ملکہ کا مرقد ہے
فلک تیری ستمگاری کی آخر کوئی بھی حد ہے؟

زمانہ ہو گیا تاریک اس منظر سے آنکھوں میں
اُمنڈ کر آ گیا خونِ جگر اندر سے آنکھوں میں

ہے سب بے سود فخر و نازِ دو روزہ حکومت پر
عبث ہے آدمی کا یہ تکبر جاہ و حشمت پر

وفاداری سے عاری دوستو دنیائے فانی ہے
حباب آسا زمانے میں ہماری زندگانی ہے

سمجھتے ہی نہیں غافل کہ کیا ہے رازِ فطرت کا
ہے تخلیقِ بنی آدم سے کیا مقصود قدرت کا

جو سمجھا زندگی کا راز دایم ہے بقا اُس کو
مٹا سکتا نہیں زنہار طوفانِ فنا اُس کو



خدا کی تلاش

ڈاکٹر ٹیگور کا ایک ادبی شاہکار

آدھی رات گزر چکی تھی ——— اس نے آنکھ کھولی، بستر سے اٹھا طلب معرفت کی آگ اس کے سینہ میں بھڑک رہی تھی۔ اس نے اپنے دل میں کہا ——— گھر بار چھوڑ کر بھگوان کی تلاش میں نکلنے کا وقت اب آگیا ——— مجھے کس نے اس مایا کے جال میں اب تک باندھ رکھا تھا؟

بھگوان نے آہستہ سے کہا ——— میں نے لیکن اس نے بھگوان کی یہ آواز نہیں سنی۔

بستر پر اس کی بیوی بے خبر سو رہی تھی ——— اس کی گود میں ایک شیرخوار بچہ بھی تھا ——— اس نے اپنی بیوی اور بچہ کی طرف دیکھا اور کہا ——— تم کون ہو ———؟

وہی جنہوں نے مجھے اب تک اپنی محبت کی زنجیروں میں گرفتار رکھا ———؟

آہستہ سے ایک آواز آئی ——— اے بے خبر یہ بھی خدا ہی کا کام ہے ——— لیکن اس نے پھر بھی یہ آواز نہ سنی۔

بچہ سوتے میں ڈر کر چونک اٹھا۔ ماں نے اسے اپنے سینہ سے لگا لیا ——— بھگوان نے پھر آواز دی ——— بیوقوف گھر بار نہ چھوڑ ——— لیکن شاید یہ الفاظ بھی اس کے کانوں تک نہ پہنچے ———!

بھگوان نے آہ بھر کر کہا ——— میرا طالب مجھے چھوڑ کر میری تلاش میں کیوں جا رہا ہے ———؟ وہ ——— مکان سے باہر نکل چکا تھا۔

(اشان بھارت)

حسینہ

(ایک ترکی غزل کا لفظی ترجمہ)

محبت کے دیوتا نے دیکھا کہ میں خوش و خرم ہوں، میرا دل غم سے خالی اور آنکھیں آنسوؤں سے خشک ہیں۔

کہنے لگا "نوجوان! ——— غافل آدمی! تیری زندگی بیکار ہے تو زندہ ہے پر مردہ سے بدتر!"

میں نے کہا "پھر"

کہنے لگا "تجھے اپنا جوڑا ڈھونڈھنا چاہیئے"

میں نے کہا "کہاں ڈھونڈھوں؟"

کہنے لگا "آنکھ بند کر ——— یہ دیکھ تیرے پاس وہ موجود ہے!"

میں نے آنکھ کھولی ——— حسینہ پاس کھڑی تھی!

ہنستی ہوئی آنکھیں، کھیلتا ہوا چاند ماتھے پر۔ رخساروں پر گلاب کے دو پھول لیے ہوئے سر سے کمر تک پیٹھ پر سونے کے تار چھوٹے ہوئے ـــــــ!

میں نے کہا حسینہ جنت کی حور ـــــــ میری جان کی مالک! میں اپنی زندگی تجھے ہبہ کرتا ہوں؛ تجھے پوجنے کی قسم کھاتا ہوں، باپ نہ ماں دنیا نہ آخرت۔ خدا بھی نہیں بس۔ تیرا ہوتا ہوں، تو میری ہوجا!

حسینہ کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ شانے ہلائے اور چلی گئی:

محبت کے دیوتا نے کہا، تو کیسا ہے؟

میں نے کہا بیمار ہوں ـــــــ لاعلاج بیمار: محبت کے دیوتا! خدارا بتا حسینہ کہاں چلی گئی؟"

محبت کا دیوتا مسکرایا، کہنے لگا۔ نہیں تو اب اچھا ہے اب تجھے زندگی کا لطف حاصل ہوگا"

میں نے کہا۔ کیا زندگی کا لطف یہی ہے جو میرے دل کے ٹکڑے اڑائے ڈالتا ہے؟"

کہنے لگا۔ ہاں زندگی کا لطف یہی ہے! اب تو مردہ نہیں ہے، زندہ ہے۔

(ہند جدید)

رازکی باتیں

(از جناب نیر بھوروی)

"ہندوستان میں کپڑے بننے کو ہر زمانے میں بےنظیر کمال اور ناقابل تصور ہنرمندی کے ساتھ برقرار رکھا ہے۔ ان کے بعض کپڑے تو ایسی حیرت انگیز نفاست سے تیار ہوتے ہیں کہ پرستان کے بنے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ کمال در اصل ہندوستانیوں کے بہترین ذوق نفاست پسندی اور سلیقہ کا نتیجہ ہے۔" (برنس ۱۸۲۰ء میں)

اس بات کا ثبوت موجود ہے کہ ہندوستان اور بابل کے مابین ۳۰۰۰ قبل مسیح میں تجارتی تعلقات قایم تھے ۲۰۰۰ قبل مسیح کی مصری مومیائی ہوئی لاشیں نفیس ہندوستانی تنزیب میں لپٹی ہوئی دستیاب ہوئی ہیں۔

روم میں ہندوستانی پارچہ جات کی بہت بڑی کھپت تھی"۔ یہ واقعہ اس طرح صحیح معلوم ہوتا ہے کہ ایڈمینی نے شکایت کی ہے کہ

"روم کی بہت بڑی رقم ہر سال ہندوستانی کپڑے پر خرچ ہوتی ہے؛ ڈھاکہ کی ململ یونان میں گنجی ٹیکا کے نام سے مشہور تھی۔ (پروفیسر ہیرن)

ہمیں صرف اسی حد تک ہندوستانیوں کو تعلیم و تربیت دینی چاہئے جس حد تک ہم ان سے اپنی تجارت اور حکومت چلانے میں فائدہ اٹھا سکیں"۔ (کلکتہ جرنل ۱۸۱۹ء)

"یہ بالکل یقینی ہے کہ ہندوستان ایک بہت بڑا علمی مرکز تھا جہاں یورپ کی قدیم مہذب ترین قوموں نے اپنا علم صنعت اور ادب حاصل کیا" (اے ایف شلر)

"ہندوستان کبھی مہذب نہ ہوتا اگر خود اس کے فرزندوں کی مدد نہ ہوتی"۔ (سرجان میکوم)

"ہندوستان کا ہمیشہ خون چوستے رہنا چاہئے"۔ (لارڈ سالسبری ۱۸۷۵ء)

"۸۰ سے ۹۰ سال کی عمر والی ہندوستانی عورتیں بہترین سوت کاتتی ہیں۔ روپیہ بھر وزن کی روئی سے چار میل سے بھی زیادہ لمبا سوت تیار کرسکتی ہیں"۔ (جیمس ٹیلر)

"۱۷۴۰ء میں بنگال دنیا کا سب سے زیادہ مالدار اور زرعی ملک تھا"۔ (بنگال کی تحقیقات ۱۸۲۴ء)

ہر منٹ میں ہندوستان سے ایک گائے باہر جاتی ہے۔ (ڈلبوبک ۱۸۹۰ء) (بنات)

اردو شاعری میں صرف لفاظی رہ گئی ہے

(از جناب مرحوم محمد عظمت اللہ خاں صاحب بی اے دہلوی)

بدقسمتی سے اردو ادبی دنیا میں شاعر کا یہ جذبہ کھو گیا ہے کہ نری لفاظی ہی لفاظی شاعری کی جان بن گئی ہے۔ ہماری شاعری ایک چینی دلہن کی گڑیا سی ہے۔ جس کو ہم [illegible] سنگار پہنا دیتے ہیں، پوشاک اور ریشم کا زیور ہے خد و خال، ماشاء اللہ جیسے ہمارے ہاں گڑیاں ہوتی ہیں۔ وہ ہی ہے ایک لمبا سا سیاہ دھاگا۔ گھونگھٹ ناک اور بھوں کی علامت ہوتی ہے۔ ایک سرخ تاگے کا ٹانکا ہوتا ہے۔ [illegible] غائب ہوتا ہے۔ [illegible] اس قسم کی گڑیاں کھیلتے ہیں۔ [illegible] کی برات بہا کے [illegible] زندگی کی ہماری [illegible] جان چراتے ہیں۔ شاعر کی قادر الکلامی کے یہ معنی ہو گئے ہیں کہ توڑ مروڑ کر الفاظ کی ایسی نرالی نامانوس اور بے ضرورت ترکیبیں نکالی جائیں کہ شاعری عام لوگوں سے کاٹ کر کوسوں دور جا پڑے۔ اور اس میں اصلی زندگی کی چھینٹ بھی نہ پڑے۔ ایک مخصوص طبقہ سمجھے یا بے سمجھے اس قسم کے اشعار کی ضرب لے۔ اور رسالوں میں پورے پھیپھڑوں کے زور کے ساتھ داد دے۔ اس لئے کہ اب شاعروں کی جگہ جگہ رسالوں نے لے لی ہے۔

قادر الکلامی کی بڑی نشانی یہ ہے کہ گہرے سے گہرے بلند سے بلند مضمون کو سیدھے سادے الفاظ میں ادا کیا جائے اور اس کی بہترین مثال کبیر کا کلام ہے۔ اس نے دونے شعر کے ساتھ دوسرا شعر پڑھئے

سائیں سب ریا بانیا تنج کرے بیوپار
بن ڈانڈی بن پالڑے تول کرے سنسار
سائیں! تجھ سے باہر کوڑی بھی نا لکائے
جا کے سر پہ تو دھنی، لاکھوں مول کرائے

اب تو آپ اس ان پڑھ شاعر کی قادر الکلامی کی قائل ہو گئے اس سے زیادہ دل میں کھب جانے والا خیال اور اس سے زیادہ سادی زبان جو محلوں اور جھونپڑوں دونوں جگہوں میں دل میں اتر جائے ممکن نہیں۔ لیکن زبان تو بیشتر شاعر کے خیالات ادا کرنے کا آلہ ہے۔ شاعر کے لئے بڑی ضروری چیز سوچ ہے۔ زندگی کے منجدھار میں جو اثرات اس کے قلب پر ہوتے ہیں ان پر سوچ بچار کر کے بات کی اس تہ کو پہنچے جہاں اور دل کی نظر نہ پہنچی ہو۔ اور اس سوچ بچار سے جو نفسی کیفیتیں وہ اپنے میں محسوس کرے ان کو ایسی زبان میں ادا کر دے کہ اس زبان کے بولنے والے امیر غریب، پڑھے لکھے ان پڑھ، چھوٹے بڑے ان کیفیتوں سے متاثر ہوں۔ یہ کمال شاعری ہے۔ قدیم یا جدید فلسفہ یا تصوف کی کتابوں سے مضامین کا اڑا لینا، ان کو غیر مانوس زبان میں ادا کر دینا شاعری کی ایک قسم۔ یعنی تک بندی ضرور ہے لیکن وہ شاعری نہیں۔ شاعر تو وہ ہے جو عامۃ الناس کے دلوں کو گرمائے ان کے دماغوں کو سوچ پر لگائے اور ان کی روزمرہ کی ظاہرا بے معنی سی زندگی کو معنی خیز بنا دے۔

خود اپنے منہ سے اعتراف جرم

ڈاکٹر سر محمد اقبال نے اپنے خطبہ صدارت میں صاف اعتراف کر لیا ہے کہ مسلم نمائندوں نے خیانت کی۔ صرف یہی نہیں کہ مسلم حقوق سے خیانت کی۔ بلکہ خود مسلم کانفرنس کے فیصلوں کو بھی ٹھکرا ڈالا۔ اب یادش بخیر ہمارے پرانے ہنسنے ہنسانے والے مہربان مولوی محمد شفیع داؤدی نے بھی بعینہٖ یہی اعتراف کیا ہے وہ اعلان کرتے ہیں۔

"میں نے مجلس مشاورت میں اپنی ذاتی رائے یہ دی کہ جو صورت اس وقت واقعات کی بن گئی ہے اس کا اقتضا یہی ہے کہ کانفرنس کے مسلم ممبر اسوقت تک کانفرنس کے کسی اجلاس میں شریک نہ ہوں جب تک مسلم مطالبات کے متعلق برطانی حکومت اپنے تصفیہ کا اعلان نہ کردے۔ مجھے افسوس ہے کہ میری اس رائے کی حاضرین میں سے کسی ممبر نے تائید نہیں کی۔۔۔۔"

ڈاکٹر اقبال اور مولوی داؤدی دونوں کا اعتراف ہے کہ مسلم نمائندوں نے قومی مفاد و فیصلہ کا کچھ خیال نہ کیا اور محض اپنے آقاؤں کے خوش کرنے کے لئے گول میز کانفرنس میں برابر حصہ لیتے رہے حالانکہ اگر یہ لوگ حصہ لینے سے انکار کر دیتے تو یقیناً اسی وقت مسلمانوں کے حقوق کا تصفیہ ہو جاتا۔

اب سوال یہ ہے کہ وہ کون مسلم نمائندے تھے جنھوں نے یہ حرکت کی؟ ممکن ہے پبلک نے اس سوال پر کبھی غور نہ کیا ہو اس لئے ہم چند سربرآوردہ نام یاد دلاتے ہیں اور وہ حسب ذیل ہیں۔

مولوی فضل حق۔ مسٹر عبدالحلیم غزنوی۔ ڈاکٹر شفاعت احمد خاں مرحوم سر محمد شفیع۔ سر آغا خاں اور خود مولانا شوکت علی صاحب!

مولانا شوکت علی صاحب کا دعویٰ ہے کہ تنہا وہی مسلمانوں کے حقوق کے محافظ ہیں اور پوری قوم کو ان پر کامل اعتماد ہے مگر خود ان کے رفیق خاص ڈاکٹر محمد اقبال اور مولوی داؤدی انھیں بھی غدار قرار دے رہے ہیں! اب تو کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ ہم مولانا شوکت علی پر تہمت لگا رہے ہیں یہ تو خود ان کے اپنے آدمی کہہ رہے ہیں کہ مولانا نے اور ان کے دوسرے رفقاء نے گول میز کانفرنس میں مسلم حقوق سے غداری کی۔ (ہند)

پیرس کی راتیں

پیرس ۱۴ جنوری۔ رات کے وقت سڑکوں پر مسلح بدمعاشوں کے اضافہ کو دیکھکر پولیس کے پہرہ داروں کو بھی اب دوگنا کرنا پڑا ہے۔ نیز بیس پولیس موٹروں اور سوسائیکل سوار پولیس والوں کا دستہ۔ عورتوں پر تو ہر رات یہ گزرتی رہتی ہے کہ ان کے ہاتھ سے ان کے منی بیگ اڑائے جاتے ہیں اور مردوں پر یہ بیتی رہتی ہے کہ موٹر سوار مسلح رہزن آئے ان کی جیبوں پر ہاتھ مارا اور معاً موٹروں پر بیٹھ نظروں سے غائب!

(رائٹر کی تار برقی)

یہ اندھیر وہاں ہو رہا ہے۔ جہاں کی راتیں بجلی کے قمقموں کی روشنی سے مشرق کے رندوں کو شرمندہ کرتی رہتی ہیں۔ فرانس اور پھر فرانس کا بھی کوئی کوردہ نہیں۔ عین دار السلطنت مشہور و معروف شہر پیرس جہاں کی نفاست و شائستگی، یونیورسٹی اور لائبریری کا شہرہ ہر اقلیم اور ہر دیار میں گونج رہا ہے۔

شاہان اودھ کو حکومت سے معزول کرنے وقت فرد جرم یہ لگی تھی کہ بادشاہ کچھ توجہ نہیں کرتے اور شہر میں چور اچکے۔ بدمعاش اٹھائی گیرے بہت سے بسنے لگے ہیں، اب کیا کوئی "صاحب" جذبۂ معدلت گستری سے بے قرار ہو کر حکمرانانِ فرانس اور پیرس کے حق میں بھی خلع سلطنت کی تجویز پیش فرمائیں گے۔

(سچ)



معذرت رنگین

گزشتہ اشاعت میں میں نے ذکر کیا تھا کہ میری ایک پرانی اور بہت سے مختلف رسالوں میں شائع شدہ نظم "دوشیزہ گوالن" جناب ایم اے رنگین صاحب کے نام سے "منصوری کا ایک خوشگوار منظر" کے زیر عنوان رسالہ "زمانہ" میں شائع ہوئی ہے۔

اس پر میں نے بھی چند سطریں لکھی تھیں اور بعض دیگر معاصرین نے بھی از راہ ہمدردی اپنے اپنے پرچوں میں جناب رنگین کی اس غارت رنگین پر کچھ نہ کچھ اظہار خیال کیا تھا۔ اب مجھے یہ دیکھ کر دلی مسرت ہوئی ہے کہ حضرت رنگین اس نظم کو اپنی کہنے پر مصر نہیں ہیں اور ہوتے بھی کیسے؟ وہ اس سے بدرجہا بہتر نظم کہہ لینے پر خود قادر ہیں تو انہیں کیا ضرورت پڑی ہے کہ کسی دوسرے کی ایک سڑی سی نظم کے ساتھ اپنا نام شامل کرکے اپنی وقعت گھٹائیں۔

مارچ ۳۲ء کے رسالہ "زمانہ" میں مندرجہ ذیل نوٹ شائع ہوا ہے:

"عید نمبر میں ہم نے لکھا تھا کہ آئندہ نمبر کے پرچہ میں جناب ایم اے رنگین صاحب اور جناب ڈاکٹر سعید احمد صاحب کے واقعہ پر روشنی ڈالینگے ہم اپنی تحریر کے مطابق بالتفصیل اس واقعہ کو ضرور ناظرین کی خدمت میں پیش کرتے مگر عید نمبر کی اشاعت کے بعد جناب ایم اے رنگین کے ایک دوست سے ملاقات ہوئی تھی جن سے معلوم ہوا کہ ایم اے رنگین کو اس بات کا اعتراف ہے کہ وہ نظم جو "زمانہ" بابت ماہ نومبر ۱۹۳۱ء میں ایم اے رنگین کے نام سے بعنوان "منصوری کا ایک خوشگوار منظر" شائع ہوئی وہ حقیقتاً جناب ڈاکٹر سعید احمد صاحب کی ہے۔ اور نظم کے ساتھ وہ اپنے نام کے ساتھ لفظ (مرسلہ) لکھنا بھول گئے تھے لہذا اس اتفاقی غلطی کا خیال کرتے ہوئے جناب ڈاکٹر سعید احمد صاحب کوئی مزید کارروائی عمل میں نہ لائیں تو مناسب ہے۔"

بہت بہتر وہی ہوگا جو آپ کے خیال میں مناسب ہے۔ بہر حال آپ میری طرف سے جناب رنگین کی خدمت میں اس رنگینی کی داد تو پہنچا ہی دیجئے کہ اب بھی انہوں نے یہ نہ فرمایا کہ نظم کے ساتھ میرا نام لکھنا بھول گئے تھے بلکہ یہی ارشاد ہوا کہ لفظ مرسلہ غلطی سے رہ گیا تھا۔ حضرت رنگین کی اس نوازش بیجا کا بھی دلی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ نظم کے متعلق انہوں نے مجھے یہ سرٹیفکٹ عطا فرمادیا کہ وہ حقیقتاً میری ہی ہے اور میں بلا شرکت غیرے اس پر بحالت صحت نفس و ثبات عقل ہمیشہ قابض و متصرف و دخیل رہا ہوں۔

اس سند کے بعد امید ہے کہ وہ نظم آئندہ کے لئے اس قسم کی رنگین چوریوں سے محفوظ ہو جائے گی۔

جلد ۲ — باتصویر — مئی
نمبر ۵ — ماہوار رسالہ — سنہ ۱۹۳۲ء

سعید دہلی

ایڈیٹر
سعید احمد
بریلوی

قیمت
سالانہ تین روپیے ۳؍
ششماہی ۱؍۱۲
فی پرچہ ۴؍

فہرست مضامین

ہمارے خیالات

افسانہ

عورتوں کے چار صفحے

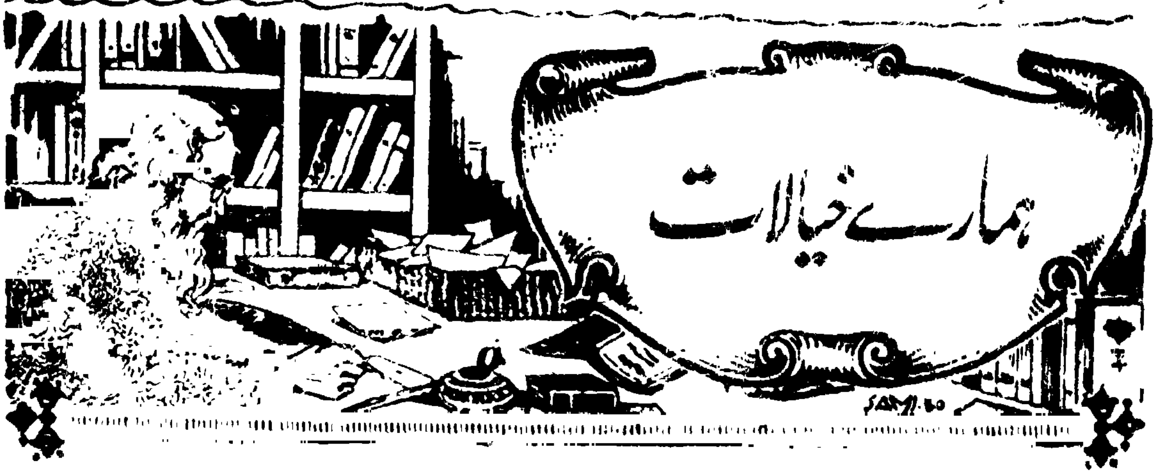
علم و ادب

رازحیات

اخذ ما صفا

حفظان صحت

بزم کامیابی



ہماری "مذہبی" لڑائیاں

کسی ملک کی اس سے زیادہ بدنصیبی اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس میں روزمرہ کشت و خون ہوتا ہے اور آئے دن اس کے باشندے آپس میں ایک دوسرے کا خون بہاتے ہیں لیکن یہ بدنصیبی اور بھی انتہا کو پہنچ جاتی ہے، اگر لوگ ایسے ان وحشیانہ افعال کو کہ جن کی بدولت اللہ کے بندوں کے گلوں پر اللہ ہی کا نام لیکر چھری پھیری جاتی ہے مذہب کے نام کے ساتھ منسوب کرنے لگیں، اور اس طرح اپنی ان ذلیل اور ناپاک حرکتوں پر شرمندہ ہونے کے بجائے ان پر فخر کرنا سیکھ جائیں۔ لڑائی جھگڑے ہر ملک اور ہر قوم میں ہوا کرتے ہیں، اور اگر اس حقیقت کو پیش نظر رکھا جائے کہ آج دنیا میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ ان ہی قوموں کو سمجھا جاتا ہے کہ جن کے پاس اپنے بھائیوں کا خون بہانے اور آباد ترین شہروں کو چند گھنٹوں کے اندر ویرانہ بنانے کے بہترین آلات موجود ہیں، تو مجبور ہو کر ماننا پڑیگا کہ انسانی ترقی اور انسانی تہذیب شاید نام ہی اس بات کا ہے کہ انسان اپنے بنی نوع کے گلے کاٹنے میں زیادہ سے زیادہ ماہر اور مشاق ہو جائے، اور بھائی کو اپنے بھائی کا گلا اپنے ہاتھ سے کاٹتے ذرا سا بھی درد اور ترس نہ آئے، لیکن اس قدر "مہذب" اور اس درجہ "ترقی یافتہ" ہو جانے پر بھی ان قوموں کو یہ جرأت کبھی نہیں ہوتی کہ علی الاعلان اپنی ان خونریزیوں پر فخر کر سکیں۔ ایک نئی قسم کی توپ، ایک مہلک ترین زہریلی گیس، ایک جدید طرز کا ہوائی جہاز اور ایک لاانتہا قوت کی بجلی کی لہر یا شعاع دریافت اور ایجاد کر کے انہیں خوشی بھی ہوتی ہے اور فخر بھی لیکن یہ ہمت ان میں کبھی پیدا نہیں ہوتی کہ دنیا کے سامنے وہ یہ کہکر اپنی خوشی کا اظہار کریں کہ ہم نے انسانی خون بہانے اور بستیوں کو اجاڑ بنانے کا ایک بہترین آلہ دریافت کر لیا ہے۔ جنگ اور خونریزی ایسی مذموم اور اس درجہ ذلیل چیزیں ہیں کہ وہ اپنی ان ایجادات پر فخر کرتے وقت یہ کہنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ ہم نے سائنس میں ایسی حیرت انگیز ترقی کی ہے اور اپنے علمی اور ادبی خزانوں کو جدید ترین تحقیقاتوں سے مالا مال کر دیا ہے۔

لیکن اس بدنصیب ملک میں کہ جسے ہندوستان کہا جاتا ہے آج جو حالت رونما ہو گئی ہے وہ اس سے بالکل مختلف اور اس سے بہت ہی زیادہ افسوسناک ہے۔ یہاں ہم اپنی ہر لڑائی کا نام مذہبی جنگ رکھدینے اور اپنی تمام سفاکیوں اور جلادیوں کو خدا کے نام کے ساتھ منسوب کر دینے کے عادی بنا دیئے گئے ہیں، تاکہ بھائی کو بھائی کا سر پھوڑتے وحشی و نامہذب ہونے کے باوجود اتنا بھی درد اور

افسوس محسوس نہ ہو کہ جتنا ایک "مہذب" اور "ترقی یافتہ" انسان کو ہوا کرتا ہے۔ آج ہماری ہر وہ لڑائی کہ جس میں بدقسمتی سے ایک فریق ہندو اور ایک مسلمان ہو "مذہبی لڑائی" ہے اور اس سفاکی اور جلادی کو یہ مقدس اور متبرک لقب کسی عالم دین یا دھرماتما کی طرف سے نہیں بلکہ جناب ریوٹر صاحب کی بارگاہ سے ملا کرتا ہے، جن کا ہر تار ملک کے اخبارات کے لئے وحی و الہام کا مرتبہ رکھتا ہے، اور جس کے پڑھ لینے کے بعد کسی بڑے سے بڑے صاحب عقل کو بھی اس بات کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے دل میں کسی قسم کا شک لائے۔

ایک مسلمان لڑکا محرم میں سبیل لگانے کے لئے چندہ مانگنے ایک ہندو کے پاس جاتا ہے، وہ اسے جھڑک دیتا ہے اور لڑائی شروع ہو جاتی ہے۔ چند ہندو ہندو کی مدد کو آجاتے ہیں، اور چند مسلمان مسلمان لڑکے کی حمایت کرنے لگتے ہیں، اور پھر اس بلوہ کو فرو کرنے میں پولیس اور فوج بھی ناکام رہتی ہے جو کانگریس کے جلوسوں کو پانچ منٹ میں منتشر کر دیا کرتی ہے۔

ریوٹر صاحب دور کھڑے ہوئے اپنی مصلحت وقت کی دوربین سے اس ہنگامے کو دیکھتے ہیں اور فوراً ہندوستان کے طول و عرض میں تار کھڑکا دیتے ہیں کہ بمبئی میں ہندو مسلمانوں میں "مذہبی جنگ" ہو گئی۔ اخبارات کچھ سوچے سمجھے بغیر یا شاید "اچھی طرح سوچ سمجھ کر" اس خبر پر بہت کافی اشتعال انگیز حاشیہ آرائی کرتے ہیں، اور ریوٹر صاحب کے "اعلان جہاد" کو ملک کے گوشہ گوشہ میں پہنچا کر سب کو اس بات پر آمادہ کر دیتے ہیں کہ ہندو مسلمان ہر جگہ چھتوں پر پتھر اور گھروں میں لاٹھیاں جمع کر لیں اور جو لوگ کہ جنگ آزادی میں درجہ شہادت حاصل کرنے سے محروم رہ گئے ہیں اور اس بہتی گنگا میں ہاتھ نہیں دھو سکے ہیں وہ اس خون کی ندی میں ہاتھ دھو لیں اور اعلیٰ ترین مراتب حاصل کر لیں۔

ایک ہندو خوانچہ والے سے ایک مسلمان گاہک کا کچھ جھگڑا ہو جاتا ہے۔ دونوں طرف کے دس دس بیس بیس آدمی اس میں حصہ لیتے ہیں اور فوراً ریوٹر صاحب کی بارگاہ عالی سے یہ اطلاع تمام ہندوستان میں پہنچ جاتی ہے کہ الور میں ہندو مسلم فساد جس کے معنی دوسرے لفظوں میں مذہبی جنگ کے ہیں ہو گیا ہے۔

نل سے پانی بھرتے وقت ایک ہندو اور ایک مسلمان میں تو تو میں میں ہوتی ہے۔ دس پانچ بے فکرے ادھر سے اور دس پانچ ادھر سے اس میں شرکت کر لیتے ہیں اور ایک گھنٹہ کے اندر تمام ہندوستان اس خبر سے گونج اٹھتا ہے کہ فلاں مقام پر "شدید ہندو مسلم فساد" ہو گیا۔ دور دراز مقامات کے بسنے والے سچ مچ یہی سمجھ لیتے ہیں کہ فساد زدہ مقام کے تمام ہندو اور تمام مسلمان ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے ہیں اور دونوں فرقوں کے پیرو اپنے اپنے مذہب کے نام پر اپنی جانیں فدا کر رہے ہیں۔ مذہب کی محبت ان کے دلوں میں یہ تمنا پیدا کرتی ہے کہ کاش ہم بھی غازی یا شہید بن سکتے!

ملک میں بعض ایسے کج فہم بھی ہیں کہ جو ریوٹر صاحب کے فتوے پر نادیدہ ایمان لے آنے کی بجائے اس مسئلہ پر غور کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں کہ آیا یہ خانہ جنگیاں درحقیقت مذہبی لڑائیاں ہیں بھی یا نہیں۔ جب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ سبیل کے لئے چندہ مانگنا اور پھر غیر مذہب والوں سے مانگنا نہ فرض ہے اور نہ سنت اور جب وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ کسی مانگنے والے کو خواہ وہ غیر مذہب ہی کا کیوں نہ ہو دھتکار دینا شاستر اور وید کی رو سے کوئی دھرم کا کام یا پن نہیں ہے تو وہ حیرت میں رہ جاتے ہیں کہ آخر اس لڑائی کو مذہبی لڑائی کیوں کہا جائے۔

جب وہ سوچتے ہیں کہ خوانچے والوں سے سودا خریدنا کسی

مذہب نے بھی انسانی جماعت پر ذمہ عائد نہیں کیا ہے؟ اور جب ان کی عقل انہیں یہ بتاتی ہے کہ اپنے حملہ آوروں سے لڑا اور تلوار کے نیچے مقابلہ بھی کسی طرح گردن میں ... تعجب ہوتا ہے کہ آزاد اور کے قضیہ کا نام مذہبی اشاعت یا ہندو مسلم فساد کیوں رکھ دیا گیا۔

یہاں تک پہنچ لینے کے بعد اب قدرتی طور پر دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کوئی مذہب ایسا بھی ہے جس نے اس قسم کی بیدریغ خونریزی کو جائز رکھا ہو یا بے گناہ اور بے قصور انسانوں کے گلے کاٹنے کا حکم دیا ہو۔ دوسرے مذہبوں کے متعلق اپنی محدود واقفیت کا سچے دل سے اعتراف کرنے کے باوجود ہم بلا خوف تردید یہ کہنے کے لئے تیار ہیں کہ دنیا میں کوئی ایسا مذہب کبھی کسی حالت میں مقبولیت اور ہردلعزیزی نہیں حاصل کرسکتا کہ جو انسانی جانوں کی قدر و قیمت اس قدر کم مقرر کرے اور جو اپنے پیروؤں کو صلح جو اور امن پسند بنانے کی بجائے درندوں کی طرح خونریز اور خونخوار بنا دے۔ جدال و قتال کے متعلق اسلام کے احکام ہمیں معلوم ہیں اور وہ یہ ہیں کہ ہمیں صرف اُس وقت تلوار اُٹھانے کی اجازت ہے کہ جب ہم پر حملہ کیا جائے ہمیں ہمارے گھروں سے نکال باہر کرنے کی کوشش کی جائے ہماری عورتوں کی عصمت دری پر دشمن آمادہ ہو اور ہمیں فرائض مذہبی کے ادا کرنے سے روکے۔ اگر اس قسم کے حالات رونما ہو جائیں تو اس وقت مسلمانوں کو اجازت ہے کہ وہ لڑیں اور اُس وقت تک لڑتے رہیں کہ جب تک ظلم و عدوان کا خاتمہ نہ ہو جائے لیکن ان حالات میں بھی اسلام نے جنگ کی اجازت کو یہ حکم دیکر محدود کر دیا ہے کہ ہمیں اپنے دشمنوں پر صرف اسی قدر اور اسی حد تک زیادتی کرنی چاہیئے کہ جتنی انہوں نے ہم پر کی ہو۔ یہ اُس وقت بھی جائز نہیں ہے کہ ہم موقعہ اور قابو حاصل کرکے دشمنوں پر ہر قسم کے مظالم روا رکھیں اور ہماری زیادتیوں کی کوئی حد ہی نہ رہے۔ یہ احکام نافذ کر دینے کے بعد ہمیں یہ بھی بتایا ہے کہ ناک کے بدلے ناک اور کان کے بدلے کان ایک منصفانہ اصول ہے، لیکن اللہ ان ہی لوگوں کو دوست رکھتا ہے کہ جو عفو اور درگذر سے کام لیں اور دوسروں کی زیادتیوں کو معاف کر دیں۔ اپنا ذاتی انتقام لینے کے لئے نہیں بلکہ ملک سے، یا دنیا سے ظلم و عدوان کے مٹانے کے لئے جو لڑائی ظالموں کے خلاف لڑی جائے وہ اسلام کے نزدیک جہاد فی سبیل اللہ ہے، اور ایسی لڑائی میں لڑنے والا غازی اور مرنے والا شہید کہلاتا ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ایک واقعہ بہت ہی مشہور ہے اور اس سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ اللہ کے واسطے لڑنے اور اپنے واسطے لڑنے میں کیا فرق ہے۔ حضرت علیؓ ایک جنگ میں شریک تھے اور بحالت جنگ آپ نے اپنے مدمقابل کو زمین پر گرا دیا اور اس کے سینہ پر چڑھ کر چاہتے تھے کہ اس کا سر تن سے جدا کر دیں۔ اُس نے مجبوری اور بیکسی کی حالت میں جب اور کچھ بن نہ پڑا تو آپ کے منہ پر تھوک دیا۔ منہ پر تھوک پڑتے ہی جناب شیر خدا کا ہاتھ جہاں تھا وہیں رک گیا اور آپ فوراً اُس کے سینہ سے اُتر آئے۔ وہ شخص اُٹھ بیٹھا، لیکن سخت متعجب تھا کہ منہ پر تھوکنے کا یہ عجیب و غریب اثر کس طرح رونما ہوا۔ آخر نہ رہا گیا اور اس نے حضرت علی سے پوچھا کہ آپ نے مجھے کیوں چھوڑ دیا حضرت علیؓ مسکرائے اور فرمانے لگے کہ تمہارے اس طرح تھوکنے سے مجھے غصہ آگیا تھا، اور اگر میں اس حالت میں تمہیں قتل کر دیتا تو وہ اپنی ذاتی توہین کا انتقام ہو جاتا، خدا کی راہ کی لڑائی نہ رہتی۔ اس شخص کو حیرت ہوگئی اور بے اختیار آپ کے قدم چوم لئے۔

بمبئی ہو یا احمد آباد، اور کلکتہ ہو یا الور، ہندو مسلمانوں میں جتنے بھی فساد ہوئے ہیں وہ سب کے سب ذاتی اختلافات کی بنا پر ہوئے ہیں اور انہیں کسی طرح بھی مذہبی جنگ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن اگر وہ مذہبی لڑائیاں نہ تھیں تو اب مجبوراً یہ سوچنے کی ضرورت پڑتی ہے کہ پھر آخر انہیں کس قسم کی لڑائی خیال کیا جائے۔ اس سوال کا جواب دینے کے لئے ہمیں گذشتہ تاریخ کے صفحات پر نظر ڈالنی پڑیگی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے پہلے اور اس کے مدتوں بعد تک بھی ہندو مسلمانوں میں اس قسم کی لڑائیوں کا کہیں وجود نہ تھا۔ دونوں قوموں کے تعلقات دوستانہ اور بالکل برادرانہ تھے۔ شیخ شہاب الدین کے لڑکے کی شادی میں جب تک لالہ خوشوقت رائے شریک نہ ہوں اُس وقت تک شیخ صاحب کا لڑکا دولہا ہی نہ بنتا تھا اور ساری بارات اسی طرح بیٹھی رہتی تھی اور سیٹھ کندن لال اس وقت تک اپنی بیٹی کو رخصت ہی نہ کیا کرتے تھے کہ جب تک میر فرزند علی برات میں شریک نہ ہو جائیں۔ خیر یہ تو ذرا کسی قدر زیادہ عرصہ کی باتیں ہیں، اب سے پچیس تیس برس پہلے ہر شہر اور ہر قصبہ میں ہزاروں اور لاکھوں مسلمان ایسے موجود تھے جو اپنے پڑوسی ہندوؤں کو چچا اور تایا کہا کرتے تھے اور فی الحقیقت ان کی اسی قدر عزت اور وقعت کرتے تھے کہ جیسی ایک بزرگ کی کی جاتی ہے، اور بالکل یہی حالت ہندوؤں کی تھی، ان کا برتاؤ بھی اپنے ہمسایہ مسلمانوں سے بالکل عزیزوں اور رشتہ داروں کا سا ہوتا تھا۔ کبھی کبھی آپس میں لڑائی جھگڑے بھی ہو جاتے تھے، لیکن ان کی حیثیت بالکل مقامی رہتی تھی اور نہ رائیٹر صاحب کی نظر لطف انہیں تمام دنیا میں مشتہر کیا کرتی تھی، اور نہ ملک کے اخبار ہی انہیں کوئی خاص اہمیت دیا کرتے تھے، تاریخ کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ جوں جوں ہم تعلیم سے بہرہ ور اور مغربی تہذیب سے آشنا ہوتے گئے اسی نسبت سے ہمارے درمیان تعصب اور نفرت کی خلیج بھی وسیع ہوتی چلی گئی۔ جدید تعلیم نے ہمیں اپنے حقوق طلب کرنا، اور مغربی تہذیب نے دوسروں کے حقوق غصب کرنا سکھا دیا، اور آہستہ آہستہ ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کے دلوں سے ایثار نفس اور ہمدردی بنی نوع کے پاک اور اعلیٰ جذبات کچھ اس طرح مٹ گئے کہ گویا کبھی ان کا گذر ان کے دلوں میں ہوا ہی نہ تھا۔ بنی نوع اور ابنائے جنس کی ہمدردی محدود ہوتی چلی گئی، اور رفتہ رفتہ وہ وقت آگیا کہ ہمیں اپنے نفس اور اپنی ذات کے سوا اور کسی سے محبت نہ رہی، اور اب ایسے لوگ بھی "اندھوں میں کانے راجا" شمار ہونے لگے کہ جنہیں اپنی ذات کے علاوہ اپنے خاندان یا اپنی جماعت سے کچھ محبت تھی، اور جن کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ کسی طرح اپنے مخصوص فرقہ کی کوئی خدمت کریں اور اسے فائدہ پہنچائیں۔ جدید تعلیم نے ہمیں پکا نفس پرست اور انتہا درجہ کا خود غرض انسان بنا دیا، اور اس کے ساتھ ساتھ جب ہم نے مغربی طرز معاشرت اختیار کیا تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یورپ کی چمکدار، سستی، اور خوشنما، ہزار ہا چھوٹی چھوٹی چیزیں ہماری زندگی کی ضروریات میں داخل ہوگئیں اور ان کے مقابلہ میں اب ہمیں نہ دیسی کپڑا پسند آتا تھا نہ دیسی چاقو۔ ہمارے ملک کا وہ طبقہ کہ جس کا گذر صنعت و حرفت پر تھا ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہنے پر مجبور اور اپنے پیٹ کے لئے روٹی کمانے سے معذور ہوگیا۔ یہ اگر دو چار یا دس بیس آدمی ہوتے تو کچھ بات نہ تھی، دوسروں کی خیرات پر ان کی گذر ہو سکتی تھی، لیکن بدقسمتی سے ان کی تعداد تمام ملک میں کروڑوں تک پہنچتی تھی، اور کسی ملک میں کروڑوں انسانوں کا یک لخت بیکار

اور مفلس و نادار بن جانا ایک اتنی بڑی مصیبت ہوتی ہے کہ جس کا تدارک بڑی سے بڑی مرحلہ [illegible] بھی نہیں کر سکتی۔

بے روزگاری اور جسمانی ناداری نے کروڑوں بھوکے اور ننگے ملک میں پیدا کر دیئے اور جس طرح جنگلی جانور وغیرہ ڈاروں آب و آذوقہ کی تلاش میں جنگلوں کے اندر مارے مارے پھرتے ہیں بالکل اسی طرح اس وقت مخلوق تمام انسان کے گروہ کے گروہ روٹیوں کی تلاش میں مارے مارے پھرنے لگے۔ ان کے پاس نہ پیٹ میں ڈالنے کو روٹی تھی اور نہ تن ڈھکنے کو کپڑا، اور ان کی قیام گاہ اگر کوئی تھی تو بس درختوں [illegible] کی سیڑھیاں، کیونکہ انسانی آبادیوں کا تو ذکر ہی کیا ہے، خدا کے گھروں کے بھی دروازے ان پر بند کر دیئے جاتے تھے۔

"مرتا کیا نہ کرتا" اس فاقہ کش گروہ نے بھی اپنے لئے راستے نکالے، بعض نے تعلیم حاصل کر کے سرکاری ملازمتیں حاصل کیں، بعض نے چوری اور نقب زنی کو اپنا شعار بنایا اور بعض جو بالکل ہی بزدل اور پست ہمت تھے، وہ دوسروں کے آگے دست سوال پھیلا پھیلا کر سر راہ بیٹھ گئے۔ سرکاری ملازمتیں ان تینوں طریقوں میں سب سے بہتر اور سب سے زیادہ نفع رساں ذریعہ معاش تھیں اس لئے قدرتی طور پر بڑی تعداد ان ہی کی جانب مائل ہوئی، اور چونکہ امیدواروں کی تعداد زیادہ اور نوکریوں کی تعداد بہت کم تھی اس لئے آپس میں دھکم دھکا اور دھینگا مشتی شروع ہو گئی۔ ہندوؤں نے نئی تعلیم شروع ہی سے قبول کر لی تھی، اس لئے انہوں نے خوان نعمت سے بہت زیادہ فائدہ اٹھایا۔ مسلمان ایک عرصہ دراز تک اس تعلیم کو شجر ممنوعہ خیال کرتے رہے، لیکن بالآخر یہ دیکھ کر کہ ان کے برادران وطن دولت اور منصب کے حصول میں خاطر خواہ کامیابی حاصل کر رہے ہیں، وہ بھی آگے بڑھے، اور حکومت کے دسترخوان کی ریزہ چینی شروع کر دی۔ پہلے دھکم دھکا صرف ہندوؤں ہندوؤں کے درمیان ہوتا تھا، لیکن اب مسلمانوں نے آکر گویا جنگ بدل دیا۔

یونیورسٹیوں کی تعلیم نے کچھ اور سکھایا تھا یا نہیں سکھایا تھا، لیکن محمود غزنوی کے حملوں کی داستانیں اور اورنگزیب اور سیواجی کے تعلقات کے افسانے سب کو اچھی طرح ازبر کرا دیئے تھے، اور اب سب نوکری لوٹنے میں دھینگا مشتی کی نوبت آئی تو تقریباً ہر مسلمان اورنگزیب اور ہر ہندو سیواجی بن گیا۔ ایک ایک روزی کے لئے خواہ مصلحت وقت کے لحاظ سے کتنا ہی ضروری ہو، لیکن ایک پست اور ذلیل فعل نظر رکھا اس لئے دنیا کی نظروں میں ذلیل و خوار ہونے سے بچنے کے لئے اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ باہمی جنگ و جدال کا کوئی ایسا سبب مقرر کیا جائے کہ جو پست اور ذلیل نہ ہو بلکہ جسے دنیا قدرت و عزت کی نگاہوں سے دیکھے۔ اس تانبے پر چاندی اور سونے کی قلعی کی ضرورت تھی اور خوش قسمتی سے وہ نہایت آسانی کے ساتھ اس طرح پوری ہو گئی کہ دونوں فرقوں کا مذہب مختلف تھا اور مذہب کے لئے لڑنا ہرگز ہرگز ایسی چیز نہیں ہے کہ جسے کوئی شخص بھی حقارت کی نگاہ سے دیکھ سکے لیکن اب بھی لڑائی جس کا اصلی باعث شکم پرستی اور نفس پروری تھا، اور جسے بظاہر مذہبی رنگ دیدیا گیا تھا صرف تعلیم یافتہ طبقہ تک محدود تھی۔ اور چونکہ تعلیم یافتہ فرقہ کا تناسب ہماری آبادی میں تین چار فیصدی سے زیادہ نہ تھا اس لئے اس کے اثرات بہت ہی محدود تھے۔ دفتروں کے ہندو ہیڈ کلرک رات دن اس بارہ میں کوشاں رہتے تھے کہ تا حد امکان اپنے دفتر میں کسی مسلمان کو نہ گھسنے دیں، اور مسلمان کوتوال یا تحصیلدار یہ چاہتا تھا کہ جس طرح بھی ہو سکے اس کے ماتحتوں میں کسی ہندو کی صورت نظر نہ آئے۔ یہ بات کہ یہ دھکم دھکا مذہب کے

لئے نہیں بلکہ پیٹ کی خاطر ہوتا تھا، ان واقعات سے اچھی طرح ثابت ہوجاتا ہے کہ بسا اوقات ہندو ہیڈ کلرک صاحب ایک ہندو ماتحت کو، اور مسلمان کوتوال ایک مسلمان سپاہی کو صرف اس لئے نکال دیا کرتے تھے کہ اپنے کسی عزیز یا دوست کو جگہ دے سکیں۔

اس کے بعد ایک دوسرا دور شروع ہوا۔ یورپ میں جب سرمایہ داروں کا دور شروع ہوا، اور مزدوروں کی حیثیت غلاموں کی سی ہوچلی تو وہاں ایک تیسرا طبقہ ماہرینِ فن کا پیدا ہوگیا تھا۔ یہ لوگ عام طور پر بڑے آدمیوں کے بیٹے تھے، لیکن بڑے بیٹے نہیں جو ازروئے قانون باپ کی جائداد اور خاندانی خطابات کے مستحق ہوں، بلکہ منجھلے اور چھوٹے بیٹے تھے جنہیں باپ کی دولت و ثروت کی بدولت اعلیٰ تعلیم میسر آجاتی تھی، اور امیر گھروں میں پرورش پاکر خوبو اور گفتار اور رفتار سب امیرانہ ہوجاتی تھی، لیکن اس امیرانہ شان و شوکت کے برقرار رکھنے کے لئے جن کے پاس سرمایہ نہ ہوتا تھا عام مزدوروں کی طرح محنت و مشقت کے کام کرنے کی بجائے ان لوگوں نے اپنے آپ کو مختلف قسم کے فنون کا ماہر بنایا، اور سرمایہ داروں کی ملازمت اختیار کرکے اپنی عقلمندی اور علم کے ذریعہ سے ان کے کاروبار کو ترقی دینی شروع کی، اور رفتہ رفتہ ہر قسم کے کاروبار کے لئے اپنے آپ کو اس قدر ضروری بنادیا کہ کسی سرمایہ دار کا کام ہی اب ان کی مدد کے بغیر اعلیٰ پیمانہ پر نہ چل سکتا تھا۔ ہر ایک چیز بنانے کے لئے طرح طرح کی کلیں ایجاد کرکے انہوں نے مزدوروں کو بھی لاشئے محض بنادیا، کیونکہ اب کارخانہ بھر میں ایک کاریگر بھی ایسا نہ رہا جو کوئی سی چیز پوری کی پوری بنانی جانتا ہو۔ ہر مزدور اپنے حصہ کا مقررہ کام انجام دیتا تھا، اور اس طرح الگ الگ چھوٹے چھوٹے جزو ہزاروں مختلف مزدوروں کے ہاتھ سے تیار ہوکر کارخانے کے اندر لاکھوں کی تعداد میں وہ چیز تو تیار ہوتی رہتی تھی لیکن ماہرینِ فن کے سوائے اور کوئی بھی پوری چیز کی تیاری کی ترکیب سے واقف نہ ہوتا تھا۔ تجارت کو فروغ دینے اور چھوٹے سرمایہ سے بڑے بڑے کام کرنے کے راستے انہوں نے ایجاد کئے، بینک، شرح تبادلہ اور ہنڈی وغیرہ کے ذریعہ سے ہر قسم کی آسانیاں پیدا کیں، اور ایک ملک سے دوسرے ملک میں سامان تجارت لے جانے کے مختلف ذرائع پیدا کردیئے اور اس طرح سرمایہ داروں کو اپنا دست نگر بنالیا دوسری طرف نئی نئی مشینیں ایجاد کرکے مزدوروں کے ہاتھ سے صنعت و حرفت تو چھین لی، لیکن اپنے کارخانوں میں ان کے لئے کام مہیا کردیئے تاکہ وہ بھی ہمیشہ مٹھی میں رہیں، اور ان ہی کو اپنا اَن داتا خیال کیا کریں۔ اس طرح مزدور اور سرمایہ دار دونوں کو اپنا محتاج بناکر انہوں نے صحیح معنوں میں اپنی حکومت قائم کرلی، اور آج یورپ اور امریکہ میں درحقیقت ماہرینِ فنون ہی کا راج ہے۔

تعلیم یافتہ ہندو مسلمانوں میں اس باہمی کشاکش اور نااتفاقی کو دیکھ کر ہندوستان میں بھی یورپ کی طرح ایک نیا طبقہ پیدا ہوا، جسے درحقیقت نہ ہندوؤں سے کچھ مطلب تھا نہ مسلمانوں سے، اور جو تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے کوئی ادنیٰ درجہ کا کام کرنے کے لئے تیار نہ تھا، اور جسے بدنصیبی کے سبب سے سرکاری ملازمت حاصل کرنے میں کامیابی حاصل نہ ہوئی تھی۔ اس فرقے نے بر سر عام کھڑے ہو ہو کر بانگ بلند اپنی اپنی قوم کے عوام کے سامنے اپنی "ناکردہ خدمات" کا اعلان کیا، دوسری قوم کی زیادتیوں کا خوب اچھی طرح رونا رویا، اور ایک عرصہ دراز تک اسی قسم کی مسلسل کوششوں کے ذریعہ سے اپنی قوم کے دل پر یہ بات نقش کردی کہ قوم کا سچا ہمدرد خواہ اگر دنیا میں کوئی ہے تو بس وہی ہیں، اور قوم کے حقوق کا تحفظ اگر کرسکتے ہیں تو بس وہی کرسکتے ہیں۔ اس خیال کا قائم ہونا تھا کہ بس پھر موٹروں کی سواری تھی، اور جلوس پر ہر چہار طرف سے گلباری، قورمے تھے اور بریانی یا حلوے مانڈے، اور پلاؤ، غرضکہ جہاں جاتے تھے

لوگ ان کی راہ میں آنکھیں بچھاتے تھے، اور اپنے سروں پر بٹھاتے تھے۔

عوام کے دلوں پر قبضہ حاصل کر لینے کے بعد حکومت وقت کو مٹھی میں کر لینا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ دو چار موقعوں پر حکومت کے کام آنا، اور کوئی خاص خدمت سرانجام دینا بالکل کافی تھا۔ آدھر سے "بھی نواز کبھا بیجا" کی بھرمار ہونے لگی، اور اب یہ حضرات نہایت اطمینان کے ساتھ "سیہرے دولوں میٹھے" کا راگ گاتے اور ہر طرح سے مزے اڑانے لگے۔ ان کی قوم ان کی رہنمائی کی محتاج تھی، اور حکومت وقت ان کی دست نگر اور ممنون احسان۔ ہندوستانیوں کو تو سوراج ملنے میں بہت کافی دیر ہے، اور تنہا ہندو یا تنہا مسلمان تو اس قسم کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے لیکن ان خود ساختہ لیڈروں کو یقینی طور پر سوراج حاصل ہو گیا، اور آج ہندوستان پر انہی کا راج ہے۔ حکومت اپنا کام چلانے کے لئے ان کی امداد کو بہت کارآمد خیال کرتی ہے، عوام اس خوف سے کہ کہیں ہمارے حقوق پامال نہ ہو جائیں ان کے اشارہ پر چلتے ہیں، اور اخبارات کی یہ رائے یا تو خریدی جا چکی ہے یا اگر آزاد بھی ہے تو انہیں خود اپنی بھلائی اور اپنا مالی نفع اسی میں نظر آتا ہے کہ ان کا ساتھ دیں۔

اپنی لیڈری کے قیام و استحکام کے لئے ان بزرگوں کو کبھی کبھی کچھ تھوڑی سی تکلیف کرنی پڑتی ہے، اور وہ اس طرح کہ جیسے بھی ممکن ہو ہندو مسلمانوں کو ایک دوسرے سے برگشتہ اور ان کے خیالات کو ایک دوسرے کے خلاف مشتعل رکھا جائے، کیونکہ ظاہر ہے کہ اگر یہ دونوں قومیں باہم متحد ہو جائیں یا ان میں باہم کسی قسم کا سمجھوتہ ہو جائے تو پھر حقوق کی پامالی اور حقوق کا تحفظ دونوں بے معنی الفاظ رہ جاتے ہیں، اور اسی کے ساتھ ساتھ ان کی لیڈری بھی ختم ہو جاتی ہے۔ ان کی لیڈری کے قیام کے لئے ہندو مسلم فسادات کی سخت ضرورت ہے، اور جب تک ہندو مسلم فسادات کا وجود ملک میں ہے اس وقت تک ہندو اور مسلمان ان لیڈروں کی قیادت سے بے نیاز نہیں ہو سکتے۔ انڈے کے لئے مرغی لازمی، اور مرغی کے لئے انڈا، اور جب تک اس صورت حالات میں تبدیلی نہیں ہوتی اس وقت تک نہ لیڈر راج ہندوستان سے جا سکتا ہے اور نہ ہندو مسلم فسادات۔

مذہب اور دھرم کے نام پر سینکڑوں کی تعداد میں سر کٹانے والے اور خدا کی راہ میں ہزاروں کی تعداد میں زخم کھانے والے عوام میں سے اکثر و بیشتر ایسے ہوتے ہیں کہ جنہیں یہ بھی خبر نہیں ہے کہ دھرم یا مذہب کہتے کسے ہیں، اور اس نے ہمیں کیا حکم دیا ہے، لیکن ان لیڈروں کو خوب اچھی طرح معلوم ہے کہ کس چیز کے نام پر جان دینے کے لئے عوام جلد سے جلد تیار ہو جاتے ہیں۔ وہ جب یہ دیکھتے ہیں کہ ہندو مسلمانوں کے جذبات جنگ کسی قدر ٹھنڈے پڑ چلے اور وہ ایک دوسرے سے قریب ہوتے جا رہے ہیں اسی وقت وہ اٹھتے ہیں، اور محرم یا بقرعید، دسہرہ یا دیوالی، جو تہوار بھی سب سے پہلے آ گیا اسی پر "خونی ہولی" کھلوا دیتے ہیں، اور پھر ایک مدت کے لئے ان کی لیڈری بالکل محفوظ و مصئون ہو جاتی ہے۔ ریوٹر صاحب اور ان کی ذریات تمام دنیا میں یہ خبر پہنچا دیتی ہیں کہ ہندوستان میں مذہبی جنون زوروں پر ہے، اور دوسرے مذہبوں والے ہندو مسلمانوں کے مذہبوں کا مضحکہ اڑایا کرتے ہیں کہ یہ عجیب مذہب ہیں جنہوں نے اپنے پیرووں کو جنگ کی تعلیم دی ہے۔

یہ لڑائیاں اگر فی الحقیقت سیاسی ہوتیں تو صبر آ جاتا، یا اگر پیٹ کے لئے ہوتیں تب بھی انہیں گوارا کر لیا جاتا کیونکہ ان صورتوں میں اچھا یا برا کوئی مقصد تو ہمارے پیش نظر ہوتا، لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ اگرچہ ہندوستان کے کسی نہ کسی گوشہ سے ہندو مسلم فساد کی خبر تو روزمرہ آ جاتی ہے مگر یہ اطلاع کسی جگہ کے لڑنے والوں کے متعلق نہیں ملتی کہ لڑائی سے ان کا کوئی خاص مقصد بھی تھا۔ چند چالاک دست اور شکم پرست لیڈر جب چاہتے ہیں ہمیں مشتعل کر دیتے ہیں، اور ہمیں کبھی یہ سوچنے کی توفیق نہیں ہوتی کہ ہم کس کی انگلیوں پر ناچ رہے ہیں۔

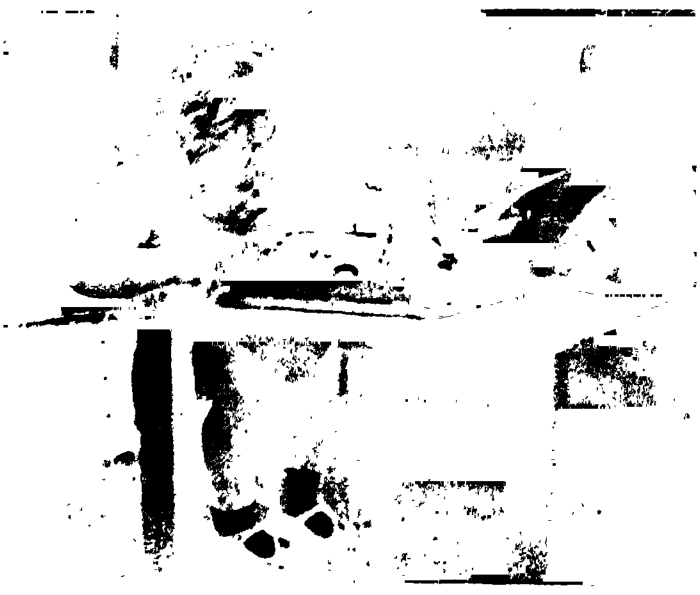


عرب کی دیہاتی زندگی کا ایک منظر

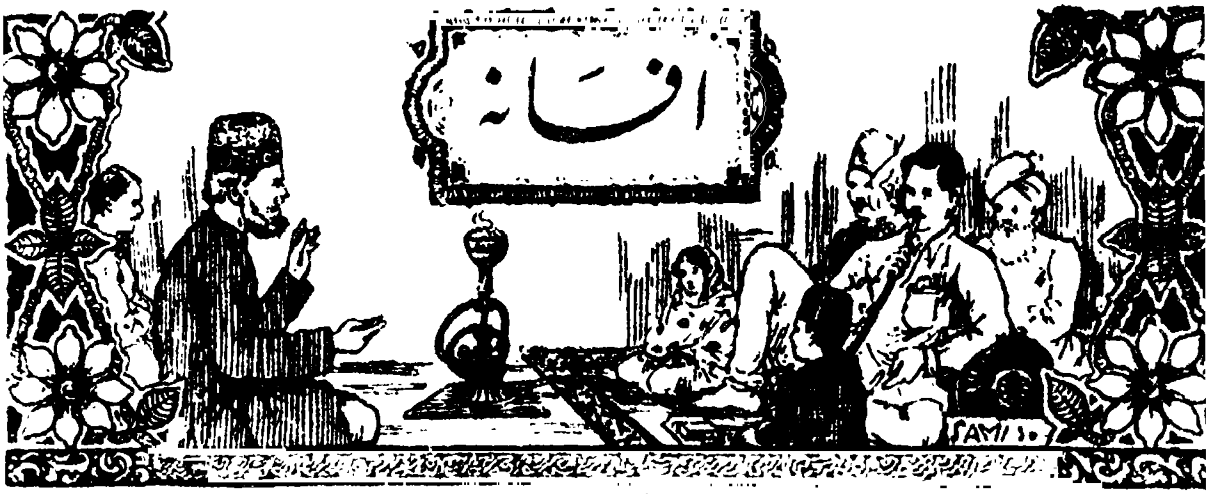
[illegible]



[illegible]



[illegible]



لازوال محبّت

(از جناب سید احمد صاحب آزاد دہرہ دون سابق اڈیٹر العزم)

والدین ہی کے نہیں بلکہ خاندان بھر کے محبوب قلوب اور منظور نظر بچہ نے معصومانہ انداز میں رو کر سب کو بےچین کر دیا' آج اس کی جسمانی حرارت حدِ اعتدال سے متجاوز تھی' ماں کا آغوش محبت کشادہ ہوگیا۔ بچہ ہُمک کر سینہ سے چمٹ گیا۔ "کسی قسم کا اندیشہ نہیں" ڈاکٹر نے طبّی معائنہ کے بعد کہا" بچہ کو سرد ہوا سے محفوظ رکھنا چاہیئے" باپ اطمینان کے ساتھ اپنے کاروبار میں مصروف ہوگیا۔

دفعتًہ رات کے غیر معمولی سکوت میں بچہ کی خواب گاہ پر ملک الموت نے اپنے ہیبت ناک اور ہلاکت خیز بازو پھیلا دیئے۔ سب لوگ خواب شیریں سے لطف اندوز ہو رہے تھے' ماں ایک محبت اور مجسمۂ ایثار ماں!! تنہا اِس غنچۂ نیم افسردہ کو سینہ سے لگائے ہوئے کرب و نزع کے اس جگر شگاف منظر کو دیکھ رہی تھی۔۔

اس غیر مرئی قوت نے جو بہر حال والدین کو اولاد پر شفیق ہونے کے لئے مجبور کرتی اور انہیں ان کے جگر گوشوں کے ساتھ ہمیشہ وابستہ رکھتی ہے' باپ کو خواب راحت سے بیدار کردیا۔ ملک الموت اپنا "عمل تخریب" شروع کرچکا تھا۔ "موت کے سنگ دل فرشتہ" باپ نے طفلِ معصوم کی پیشانی کو بوسہ دیتے ہوئے کہا "کیا تیرا وجود خلاق عالم کے دائرہ تکوین سے خارج ہے؟ ورنہ تیرا دل رحم و کرم کے جذبات سے یکسر معرّا نہ ہوتا" فرشتہ نے اپنی گرفت کو سخت تر کرلیا!

باپ نے بےچین ہوکر کہا "رحم! رحم!! میں اس معصوم روح کے لئے تجھ سے رحم کا طالب ہوں۔ لیکن اگر تو تنہا واپس جانا نہیں چاہتا تو اس کی بجائے مجھے لے چل' میں تجھے یقین دلاتا ہوں کہ بچہ کی جدائی ماں کے لئے بھی پیام مرگ بن جائے گی۔ میری التجا قبول کر اور اس کی بجائے مجھے لے چل۔

موت کے فرشتہ نے بچہ کو اس کی حالت پر چھوڑ دیا اور باپ کو ساتھ لئے ہوئے خاموشی سے باہر نکل گیا۔

"مجھے اپنی جان دیگر اپنے لخت جگر کو موت کی آہنی گرفت سے نجات دلانی چاہیئے" یہ خیالات تھے جو فرشتۂ موت کی معیت میں برق سرعت کے ساتھ پرواز کرتے ہوئے بار بار اس کے دل میں پیدا ہوتے تھے "اس فانی دنیا کو میری نسبت معصوم بچہ کی زیادہ ضرورت ہے میں اس کی دلچسپیوں سے سیر ہوچکا ہوں مجھے اپنی جان دیکر اپنے لخت جگر کو موت کی آہنی گرفت سے نجات دلانی چاہیئے"

حیرت انگیز طریقہ پر ظلمت شب کافور ہوگئی! آفتاب اپنی زر نگار شعاعوں کے ذریعہ اہل عالم کے رگ و پے میں روح عمل کو بیدار کر رہا تھا۔ شہر کی رفیع الشان عمارات مرکز اطمینان و تقدس معابد، خوشنما راستے اور ان پر نفاست و پاکیزگی کے ساتھ تربیت یافتہ کنج ہائے سرو سمن، کشادہ بازار اور ان میں عامۃ الناس کی کاروباری مصروفیت تماشہ گاہیں اور ان میں لعبتان جن کی زہد شکن عشوہ طرازیاں، قہوہ خانے اور ان کی اشربہ نفیسہ، سر سبز و شاداب باغات، اثمار خام و پختہ کی دیدہ زیبی اور خوشنما نہروں کی دوندگی غرضیکہ "خواہش زیست" اپنی جملہ رعنائیوں کے ساتھ اس کے روبرو جلوہ گر ہوگئی "مجھے اپنے فیصلہ پر غور کرلینا چاہیئے" باپ نے اپنے دل میں کہا اور پھر اس کی تمامتر توجہ "حب زیست" کی ان تحریصات میں جذب ہو کر رہ گئی۔ "میرا کاروبار تباہ ہو جائیگا، املاک پر اعزہ و اقارب متصرف ہوں گے اور میری روز افزوں عزت و شہرت ہمیشہ کے لئے آج ہی پر ختم ہوکر رہ جائے گی یقیناً مجھے ابھی زندہ رہنا چاہیئے" اس نے کہا "نیک دل فرشتہ! مجھے ابھی زندہ رہنا چاہیئے"

اب وہ پھر قریب المرگ بچہ کی خواب گاہ میں تھا اور موت کا فرشتہ اپنے "عمل تخریب" میں مصروف!

بچہ کی حالت خراب تر ہوگئی تھی، مایوس و اندوہ گیں رشتہ دار گہوارہ کے گرد جمع ہو رہے تھے کہ بچہ کے نوجوان بھائی نے موت کے فرشتہ کو مخاطب کرکے کہا "کیا تو نہیں دیکھتا کہ میرے عزیز بھائی کی موت ہم سب کے لئے افسردگی کا باعث ہوگی! میری قوت کم ہو جائیگی یہ میرا قوت بازو ہے اسے چھوڑ دے یا اس کی بجائے میری زندگی کا خاتمہ کردے!!"

موت کے فرشتہ نے خاموش رہ کر اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔

نوجوان بھائی اس مقام کے نزدیک پہنچ گیا تھا جہاں پہنچکر تمام امنگیں، تمام خواہشیں، اور تمام جذبات معدوم ہوجاتے ہیں کہ یکایک اسے خیال آیا "کیا میں زندگی کے جملہ برکات سے محروم ہو جاؤں گا؟ ایام طالب علمی کے پرکیف مشاغل، علم و ادب کی پر لطف مجالس اور درخشاں مستقبل کے مسرور کن تصورات؟ کیا ان سب کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہدینا ہوگا؟ نہیں مجھے زندگی کے زرّین لمحات کی قدر کرنی چاہیئے، رحم دل فرشتہ میں ابھی ظلمت عدم میں مستور ہونے کے لئے تیار نہیں"۔

نوجوان بھائی پھر بچہ کے گہوارہ کے قریب موجود تھا اور موت کا فرشتہ اپنے عمل تخریب میں مصروف

اب بچہ کے جسم کا نصف زیرین حصہ سرد ہوچکا تھا، نبض کی

رفتار بتدریج کم ہوتی جا رہی تھی۔ سب لوگ اپنی بیچارگی کو صبر سے تعبیر کر رہے تھے کہ بچہ کی کمسن بہن نے سسکیاں بھرتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر کہا "کیا تیری بجائے میری روح قبض نہیں کی جاسکتی؟ کاش موت کا فرشتہ اسی قدر مہربان ہو جائے"۔

موت کا فرشتہ بہن کو ہمراہ لے کر پرواز میں مصروف ہوگیا، اُس وقت بہن کو اپنی سہیلیاں یاد آئیں اور وہ نئے کھلونے جن کو چھوٹے بھائی کی بیماری کے باعث اچھی طرح دیکھنے بھی نہ پائی تھی، کیا میں ان سب سے جُدا کر دی جاؤں گی؟ مجھے زندہ رہنا چاہیئے "مہربان فرشتہ" اس نے ملتجیانہ انداز میں کہا "مجھے زندہ رہنا چاہیئے" وہ جاں بلب بھائی کے قریب موجود تھی، اور موت کا فرشتہ ایک مرتبہ پھر اپنے عمل تخریب میں مصروف۔

موت کے فرشتہ نے اب اپنا کام پوری قوت کے ساتھ انجام دینا شروع کر دیا تھا، بچہ کے چہرہ پر مردنی چھا گئی تھی اور قریب تھا کہ وہ ایک ہچکی کے بعد ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائے کہ ماں نے سر اُٹھایا، اس کی پُرنم آنکھیں! موت کے فرشتہ نے اس کی جانب نگاہ کی۔ "بدنصیب ماں پر رحم کر! یہ بچہ میرا لختِ جگر ہے ایسا نہ ہو کہ بدبخت ماں بچے کی قبر پر کھڑی ہو، احسان کر اور بچہ کو اس لئے چھوڑ دے کہ وہ ماں کی قبر پر کھڑا ہو سکے! اچھے فرشتہ کیا میری یہ تمنا پوری نہیں کی جاسکتی؟ میں اس پر قربان ہونے کے لئے تیار ہوں"

موت کا فرشتہ ایک مرتبہ پھر اس بے رحمانہ شغل سے دست کش ہوگیا۔

ماں! افسردہ و غمگین ماں!! اطمینان و استقلال کے ساتھ مصروف پرواز ہے "مرصّع زیورات" مشجر پارچات آرام دہ مسکن اور لذیذ ماکولات" غرضکہ ایک عورت کو دنیا کے ساتھ وابستہ رہنے پر مجبور کر دینے والے تمام خیالات کے بعد دیگرے اس کی نگاہوں سے گذرنے لگے، بیگم صاحبہ ...... کی آمد پر جشن مسرت کا وہ دلفریب منظر جہاں وہ خود بھی مدعو تھی انجمن اصلاح نسواں کا وہ جلسہ جہاں اس کا انتظار کیا جا رہا تھا، اس روح فرسا اور غم انگیز وقت کا تصور جب اس کا شوہر اس کی بجائے کسی دوسری عورت کو گھر کی ملکہ بنائیگا "آہ! اس وقت میرے بچوں کا کیا حال ہوگا؟" اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے "اُف" اُس نے کہا "کیا ان کی حفاظت کے لئے مجھے زندہ نہیں رہنا چاہیئے؟"

موت کا فرشتہ ٹھہر گیا "کیا ماں کی محبت بھی متزلزل ہوسکتی ہے، اور کیا دنیا کی دلچسپیاں اور زندگی کی رعنائیاں اسے بھی متاثر کر سکتی ہیں؟ بچہ! معصوم بچہ!! تیری زندگی کسی ایک شخص کو بھی عزیز نہیں چل! میرے ہمراہ چل!! حوران جنت کے آغوش تیرے لئے بیتاب ہیں اور آسمانی گہوارہ تجھے ابدی نیند سلانے کے لئے تیرا انتظار کر رہا ہے، لاریب محبت دنیا سے معدوم ہو چکی ہے کیا اسی خود غرض مخلوق کی تعظیم نہ کرنے کی پاداش میں خلاق عالم نے معلم الملکوت کو مردود قرار دیا تھا؟

ماں کی آواز نے موت کے فرشتے کو چونکا دیا۔ "زندگی کی مسرتیں اور دنیا کی راحتیں [illegible] میں" موت کے فرشتے نے ان الفاظ میں اپنے خیال کی صداقت [illegible] کی۔ ماں نے کہا "لیکن اپنے جگر گوشہ کی زندگی خرید لینے کے لئے میں اپنی جان قربان کر دوں گی" موت کا فرشتہ متحیر ہو گیا۔ [illegible] سب بچے کی [illegible] پر منحصر ہے۔

ماں کا [illegible] اس کے ہونٹوں پر تبسم نمایاں ہو گیا۔ ایک نورانی خیال [illegible] خیال اس کے دل میں پیدا ہوا "[illegible] عالم بھی [illegible] جانتا ہے۔"

کیا موت کا فرشتہ بھی متبسم ہو سکتا ہے؟ ماں نے حیرت کے ساتھ ایک لمحہ کے لئے اس معاملہ پر غور کیا، اب فرشتہ عالم بالا کی جانب پرواز کر چکا تھا اور ماں اپنے بچے کے گہوارہ کے قریب کھڑی ہوئی تھی۔

بچے کے معصومانہ تبسم نے ماں کے افسردہ و غمگین دل کو شگفتہ کر دیا، اس کا آغوش محبت کشادہ ہو گیا اور بچہ لپک کر اس کے سینہ سے چمٹ گیا۔

موت کا فرشتہ اعتراف ہزیمت پر مجبور ہو گیا تھا، محض ماں کی لازوال اور بے غرضانہ محبت کے صدقہ میں۔

سنہ ۵۷ء کی دکھیا

(گذشتہ سے پیوستہ)

چھٹا باب
پناہ

ہم عورتوں کی حالت دیکھنے کی قابل تھی، ہر ایک مجسم خوف بنی ہوئی تھی۔ جان کے خوف ہم سب ایک بالاخانہ پر جا چھپے۔ مجھے وہ دن عمر بھر نہیں بھول سکتا جبکہ ہر ممکن امید منقطع ہو چکی تھی، اور ہر شخص راضی برضا و تن بقضا موت کا منتظر تھا۔ ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ کسی ایسی مجلس کی کیا حالت ہوگی، جہاں اشکباری ہو رہی ہو، اور دل دھڑک رہے ہوں۔ اپنی بچی کے خیال سے اور اس کو دیکھ کر میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہوا جاتا تھا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ میری ننھی بچی کے لئے یہ ساعت عیش ساعت غم سے کیوں تبدیل ہو گئی؟ میں بار بار سب کی طرف دیکھتی تھی اور جی میں کہتی تھی کہ اب دوبارہ ایسی محفل کبھی کیوں نصیب ہوگی؟

ہم سب کا حال اس وقت بالکل ان بھیڑ بکریوں کا سا تھا جو بقرعید کے موقع پر قربانی کئے جانے کا انتظار کر رہی ہوتی ہیں۔ ہم بھی ان قصابوں کے منتظر تھے کہ آئیں اور قتل کر دیں۔ جس بالاخانہ پر ہم سب جا کر چھپے تھے وہ دھوپ سے تپ رہا تھا، اور جس کی وجہ سے ہم لوگوں کا دم گھٹا جا رہا تھا حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے اور یہ نوبت پہنچ گئی تھی کہ دشمن کے آنے سے پہلے یہ گرمی ہی کام تمام کر دے گی۔ بعض شریف زادیاں

خوف کے مارے تھر تھر کانپ رہی تھیں، بعض آلتی پالتی مارے بیٹھی مستقبل کا انتظار کر رہی تھیں اور بعض ایسی ہو رہی تھیں جیسے کوئی بدمست اور حواس باختہ شخص ہوتا ہے، لڑکیوں کے باہر کی آوازوں پر کان لگے تھے، اور خیالات میں مستغرق تھیں۔ غرضکہ کمرہ میں جو بھی کوئی تھا حواس باختہ اور خودرفتہ سا ہو رہا تھا، سب کے دل دھڑک رہے تھے اور چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

گو دلوں کی جو حالت تھی اُس کو تو اللہ خوب جانتا تھا مگر میں اور کچھ اور عورتیں کسی قدر اپنے حواس درست کئے ہوئے ایک دوسرے کو تسلی و دلاسا دے رہی تھیں، وِلی کو بیٹے اپنی چھاتی سے چپٹا رکھا تھا اور یہ عزم کر چکی تھی کہ شیرنی کی طرح اُس تک کسی مفسد کے آنے سے پہلے میں اپنے ان کمزور ہاتھوں سے مفسد کا گلا گھونٹ دوں گی اور جب تک میری جان میں جان رہے گی وِلی تک کسی کو بڑھنے نہ دوں گی۔

جس بالاخانہ پر ہم سب پناہ گزیں تھے اُس کے مشرق میں میرٹھ والی سڑک واقع تھی، اور جہاں تک نظر کام کرتی تھی، سڑک صاف نظر آ رہی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف درخت لگے ہوئے تھے، مغرب میں قلعہ سلیم گڑھ، لال قلعہ برجیاں، دُھس، جمنا کا پل، امراء و وزراء کے محلات اور مساجد کے منارے وغیرہ نظر آتے تھے۔ جنوب اور شمال سے دیہات کھیت، نہر، باغات، پارک، گلشن وغیرہ وغیرہ نظر آتے تھے، اور جو عورتیں کسی قدر کڑے دل کی تھیں وہ بالاخانہ کی کھڑکیوں سے مشرق کی طرف میرٹھ کی سڑک کو دیکھنے لگیں۔ میں بھی اُسی طرف دیکھ رہی تھی، مگر اُس طرف سے کوئی ایسی بات نظر نہیں آئی جس سے نظم و نسق میں کوئی ابتری معلوم ہو سکتی اگر کچھ نظر آیا تو یہ کہ ڈاک کا ہرکارہ دہلی سے میرٹھ کو جا رہا تھا، تھوڑی ہی دیر کے بعد پھر خیریت سے واپس بھی آگیا، اِس سے ہمارے دلوں کو ذرا ڈھارس ہوئی اور اُمید بندھی کہ غالباً شورش کنندگان کو میرٹھ میں شکست ہوگئی ہے اور ہرکارہ جلدی جلدی کامیابی کی بشارت لا رہا ہے اس خیال کو تقویت اس امر سے اور ہوتی تھی کہ میرٹھ کی چھاؤنی جس سردار کے ماتحت تھی وہ بڑا دلاور اور بہادر افسر تھا، اور شورش پسندوں کا اُس سے بازی لے جانا سخت مشکل امر تھا۔ اس بنا پر ہم کو یقین سا آتا جا رہا تھا کہ وہ ضرور کامیاب ہوگیا ہوگا اور سب شور و شغب بھی اب ختم ہوا چاہتا ہے۔ مگر ہماری یہ شیخ چلی جیسے منصوبے تنکے کی عمر سے زیادہ دیرپا نہ نکلے۔ اس قسم کی گفتگو کا یہ سلسلہ ختم بھی نہ ہوا تھا کہ جمنا کی طرف سے گو ہوا کا رُخ اُس طرف نہ تھا ڈھول اور بگل کی آواز آنے لگی اور برابر بلند ہوتی رہی، رفتہ رفتہ عسکری موسیقی کی آواز بھی آنے لگی۔ پاؤ گھنٹہ میں جنرل گراؤ پیدل اور سواروں کا ایک دستہ لئے ہوئے شورش کنندگان کو روکنے کے لئے ہمارے پاس سے گذرے سپاہیوں کو اُبھارنے کے لئے عسکری موسیقی بجتی جا رہی تھی۔ جس وقت یہ لوگ ہمارے پاس سے گذرے تو انگلستان زندہ باد کے نعرے لگاتے ہوئے گذرے۔

یہ وطنی ہمت افزا نعرہ سُنکر ہم سب خوشی کے مارے نیچے اُتر آئے۔ ہمارے شوہروں نے ہم کو روکا بھی مگر ہم میں کسی نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی، اور صحن میں جمع ہو کر اُن کے لئے کامیابی و فتحمندی کی دعا کرنے لگے۔ فوج کا کچھ

ہم کو فال نیک معلوم ہوا اور یہ اُمید بندھی کہ انشاء اللہ یہ لوگ ضرور کامیاب اور فتحمند ہوں گے، کیونکہ گو یہ لوگ نہ ابھی دشمن کے سامنے پہنچے تھے اور نہ جنگ و جدال کی نوبت آئی تھی، مگر ان کے جھنڈوں پر ہم کو کامیابی اور فتحمندی برستی معلوم ہو رہی تھی۔ فوج کے آگے بڑھ جانے کے بعد ہم سب نوکر چاکر آقا و غلام جو تقریباً پچاس نفر ہونگے بڑے پھاٹک سے دروازہ کے سامنے سڑک کے کنارہ کنارہ صف بستہ کھڑے ہو کر خبر فتح کا انتظار کرنے لگے، ادھر ہم اسی انتظار میں تھے کہ ایک بہت گہرا غبار اٹھ کر اُفق پر چھا گیا اور ہماری طرف بڑھنے لگا۔ رفتہ رفتہ جب غبار چھٹا تو انگریزی فوجیں نظر آئیں کہ کبھی تو وہ اکٹھا ہو کر شورش کنندگان کو روکتی اور توپیں داغ کر اُن کو بڑھنے سے باز رکھتی تھیں، لیکن مخالفین کی کثرت تعداد سے مغلوب ہو کر پھر پیچھے ہٹتی تھیں۔ جنرل گراؤ کی ماتحتی میں تین ہندوستانی فوجیں نمبر ۳۸، ۵۴ اور ۷۴ تھیں، لیکن جب یہ تینوں شورش کنندگان کی اتنی بڑی جماعت کے مقابل پہنچیں تو وہ بھی جنرل گراؤ کو چھوڑ کر مخالفوں سے جا ملیں جنرل گراؤ کے ساتھ صرف مٹھی بھر انگریز افسر رہ گئے۔ فریقین میں گھمسان کی لڑائی ہونے لگی اور موقعہ پا کر جنرل گراؤ ہوشیاری کے ساتھ پسپا بھی ہوتے رہے یہاں تک کہ ہمارے گھر کے پاس پہنچ گئے، یہاں پہنچ کر ذرا دہ رُکے اور ایک ٹیلے کی آڑ لے کر توپیں داغنے لگے۔ تھوڑی دیر میں تمام فضا پر دھواں چھا گیا اور لوگ زخمی ہو ہو کر گرنے لگے۔ ہمارے گھر کے پاس جنرل گراؤ کی اس رکاوٹ نے گیلی مٹی کے لئے مزید پانی کا کام دیا اور ہماری مصیبتوں کا باعث ہو گئی۔

کیونکہ مخالفین نے جب اپنا راستہ بند پایا تو داہنی طرف مڑے اور گو بہت سے کام آئے تاہم زخمیوں اور مقتولین کو چھوڑ کر برابر بڑھتے رہے اور ہمارے گھر کی طرف آنے لگے۔ یہ دیکھ کر ہم سب پھر گھر میں گھس گئے اور جہاں پہلے تھے اُسی بالاخانہ پر پناہ گزیں ہو گئے، اور ایک عجیب گڑبڑ اور افراتفری پڑ گئی توپوں کی آوازوں سے کانوں کے پردے پھٹے جا رہے تھے اور دھوئیں سے دُنیا اندھیری ہو رہی تھی، اور رہ رہ کر دل میں یہ خیالات آتے تھے "یا اللہ کیا ہوگا؟ یہاں سے رہائی بھی ہوگی یا نہیں؟ کیا ہم کو یہاں ہی رہنا چاہیئے مگر یہاں ٹھہرنے میں تو جان کے ساتھ عزت و آبرو کا بھی خوف ہے، تو کیا خودکشی کر لیں کہ سب باتوں سے امن ہو جائیگا۔ کاش ایسے وقت وزیر یہاں ہوتا تو اپنی بیوی کی حالت کو دیکھ سکتا! خدا جانے وہ کہاں اور نہ معلوم ایسے وقت کیوں یہاں موجود نہیں ہے؟ مگر نہیں وہ بارود خانہ کی حفاظت پر متعین کر دیا گیا ہوگا، ورنہ اگر آ سکتا تو اس حال میں ہم کو کبھی نہ چھوڑ دیتا کہ یہ بے اعتنائی اُس کی طبیعت سے بعید ہے۔ مانا کہ اُس کو ہمارا خیال نہیں تھا مگر اپنی بیوی کی تو ایسے وقت میں حفاظت ضروری تھی" عورتوں کا تو یہ حال تھا اُدھر مرد ہاتھوں میں بندوق اور پستولیں لئے لڑنے مرنے اور عزت و آبرو پر قربان ہو جانے کے لئے تیار تھے۔ ہم سب اسی حال میں تھے کہ ایک ہندوستانی بھیڑ کو چیرتا پھاڑتا ہمارے گھر کی طرف آتا ہوا نظر آیا جب وہ گھر میں آ گیا تو اُس نے پکار کر پوچھا کہ یہ کس کا گھر ہے؟ اُس کو بتایا گیا کہ اس گھر کے مالک وہ ہیں تو اُس نے اپنی آستین میں سے ایک خط نکال کر ہم کو دیا اور واپس ہو گیا خط کو

کھولا تو اُس میں یہ لکھا ہوا تھا :-

جنرل کراؤ کی جنگ کی وجہ سے ابھی مخالفین کا راستہ رُکا ہوا ہے اس لئے اس موقع کو غنیمت سمجھو اور پُل پر سے ہوکر شہر میں آ جاؤ اور جب شہر میں آ جاؤ تو مجھے اپنی جائے پناہ کی اطلاع دینا میرے لئے خود آپکے پاس آسکنا ناممکن ہے کیونکہ میں بارود خانہ کی حفاظت پر متعین ہوں اور یہی وجہ ہے کہ میں اب تک آپکے پاس پہنچ نہیں سکا۔ میں یہ خط لکھ رہا ہوں، لیکن مجھ کو آپ لوگوں کی طرف سے سخت پریشانی ہو رہی ہے۔ میری بیوی کو بعد سلام کے کہدیں کہ ذرا ہمت سے کام لیں اور اللہ پر بھروسہ رکھیں، بہت جلد ملاقات ہوگی، اور خدا نے چاہا تو حالات بہت جلد درست ہوجائیں گے۔

ولیم کا خط دیکھ کر تھوڑی دیر کے لئے ہمارے جی خوش ہوگئے، اور دل کا بار کسی قدر ہلکا ہوگیا، اور ہم یہ سوچنے لگے کہ موقع سے جلد از جلد کیونکر فائدہ اُٹھایا جاسکتا ہے، کیونکہ تاخیر میں خطرہ ہی خطرہ تھا۔ پادری کراؤن نے اُس وقت اپنا سر آسمان کی طرف اُٹھا کر اور ہاتھ پھیلا کر کہا کہ " بھائیو! اور بہنو! ہمارا ٹھکانا صرف خدا ہی کے پاس ہے، وہی ہم کو اپنے سایۂ عاطفت میں پناہ دے سکتا ہے اس لئے اُسی کے سامنے عجز و زاری کرو، جس کو وہ عزت دے اُس کو کوئی ذلیل نہیں کرسکتا اور جس کو وہ برباد کرے اُس کو کوئی آباد نہیں کرسکتا"۔ سب کے ہاتھ دُعا کے لئے اُٹھ گئے اور ایک خاموشی سی طاری ہوگئی۔ دعا سے فارغ ہوکر اور سب تو بھاگنے پر تیار ہوگئے، مگر ایک اُن کی یہ رائے تھی کہ ہم کو وہیں ٹھیرا رہنا چاہیئے۔ اُن کا یہ خیال تھا کہ شورش کنندگان جب فصیل شہر کے پاس پہنچیں گے تو دروازہ بند اور بُرجیوں پر حفاظت کا انتظام مکمل پاکر منتشر ہو جائیں گے اور میدان میں نہ ٹھہر سکیں گے۔ اسی لئے وہ نوکروں چاکروں سے کہہ رہے تھے کہ مخالفین جب ادھر آنا چاہیں تو اُن کو روکنا نہیں گھر میں آنے دینا، کیونکہ میں اُن کے زخمیوں کی خبرگیری کرنا چاہتا ہوں۔ اُن کا خیال بھی صحیح تھا اور انسانیت پر مبنی تھا، مگر اب جنگ شروع ہوچکی تھی جنرل کراؤ نے ہمارے گھر کے پاس مورچہ قایم کرلیا تھا اور قتل و غارت شروع ہوگئی تھی۔ ایسے وقت میں یہ انسانیت کام نہیں آسکتی تھی، بلکہ یہ تصادم اور رُکاوٹ تو اور مُضر ہوئی۔ لوگ چاروں طرف سے ٹوٹ پڑے اور گھر کو نرغہ میں لے لیا اور زبانوں پر یہی کلمات تھے کہ اب ہم ان کافر فرنگیوں سے جو ہمارے آقا بن بیٹھے ہیں بدلا لیں گے اور سب کو قتل کردیں گے۔

ساتواں باب
فرار اور شورش

غور و فکر کے بعد صلاح یہی قرار پائی کہ اس وقت ہمارے لئے بھاگنے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں ہے مگر وہ اب بھی متردد تھے۔ یہ دیکھ کر میں نے اُن کے پاؤں پر سر رکھ دیا اور کہا کہ پانی اب سر سے اونچا ہوچکا ہے، خدا کے لئے ان بچوں کو مصیبت سے نکالو، اور ہم سب کے ساتھ بھاگ چلو، ہمارے تو ہول کے مارے کلیجے پھٹے جا رہے ہیں۔ میری اس التجا کا اُن پر اثر ہوا، اور ہم سب بھاگنے کے لئے تیار ہوگئے۔ سینے اور ایلن نے کچھ روپیہ اور کچھ ایسے جواہرات جو قیمت میں زیادہ اور وزن میں کم تھے ساتھ لے لئے اور گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ باہر ہم کو تین کوتل گھوڑے ملے۔

گھوڑوں پر سوار ہو کر ایک منٹ ٹھہرے۔ پھر ہم لوگ دہلی کی طرف چل پڑے۔ نوکروں چاکروں میں سے صرف ایک مرد اور ایک عورت کے سوا اور کوئی پیچھے زندہ نہ بچا اور عہد کا پورا نہ نکلا۔ سب کے سب وعدے وعید کھوکھلے ہوئے اور فریب ثابت ہوئے۔ مرد محمد فضل خان اور عورت ولی کی انّا تھی۔ محمد نے بھی ہاتھی کو ہاتھی خانہ میں سے نکال کر تیاری کی اور عماری میں کچھ سامان رکھ کر ہمارے پیچھے روانہ ہو گیا، اور ولی کی انّا نے ولی کو اپنی بھائی سے چھٹا لیا، کہ ولی کو میں نے لے لیا، اور اس سے کہا کہ ہاتھی پر بیٹھ جاؤ۔ ولی کو گود میں بٹھا کر میں نے بھی گھوڑے کو ایڑ لگائی اور امین اور اس کے ابا سے جا لی جو مجھ سے آگے آگے گھوڑے بھگاتے لے جاتے تھے۔ میرے فرار کی سرگذشت یہ ہے مگر اس مصیبت کا کون اندازہ کر سکتا ہے، خدا دشمن کو بھی ایسی مصیبت میں نہ ڈالے۔

پل کے پاس پہنچ کر جب میں نے مڑ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ گھر میں آگ لگی ہوئی ہے، اور شعلے اٹھ رہے ہیں، چھتیں گر چکی ہیں۔ اس منظر کو دیکھ کر بلا ارادہ میرے منہ سے چیخ نکل گئی جسے سن کر وہ اور امین بھی متوجہ ہو گئے، اپنی آنکھوں سے اپنے مکان کو جلتے دیکھ کر ہمارے دلوں کو بہت صدمہ ہوا کہ ہماری امیدوں اور آرزوؤں کا ماوی و ملجا ہماری دولت و ثروت کا مخزن اور ہماری راحت و آرام کا ٹھکانا کیونکر خود ہماری اپنی آنکھوں کے سامنے چشم زدن میں تباہ برباد اور خستہ و خراب ہو کر رہ گیا۔ میدانوں اور کھلی جگہوں میں ہزارہا خاص و عام ہر قسم کے لوگ جمع تھے، جن کا صحیح اندازہ کر سکنا بھی مشکل ہے کچھ لوگ پل کے دونوں طرف قطار باندھے کھڑے تھے۔ ہم کو ابھی پل سے گذرے ہوئے کچھ زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ کچھ زخمی ملے جو مخالف کے سامنے سے بھاگ کر آ رہے تھے ان لوگوں کی زبانی معلوم ہوا کہ جنرل گراؤ کو شکست فاش ہو گئی ہے اور وہ بھی آیا ہی چاہتا ہے۔ شہر میں جب یہ خبر پہنچی تو یہاں کا رنگ بھی کچھ سے کچھ ہونے لگا، جو بھیڑ تھے وہ شیر بن گئے اور جن کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں سربلندی کرنے لگے، اور ہندوستانیوں نے اب انگریزوں سے اپنی پوشیدہ عداوت کو گندی زبانوں سے ظاہر کرنا اور ہم لوگوں کو انگاروں جیسی درشت کلامی سے دھمکانا شروع کر دیا۔ ہندوستانی عموماً اور دہلی والے خصوصاً امن و چین کے زمانہ میں نرم طبع، اطاعت شعار اور صلح پسند واقع ہوئے ہیں۔ جب کبھی ہم لوگوں سے ملتے تھے تو بڑے عجز و انکسار کے ساتھ ملتے تھے، راستہ میں ہوتے تھے تو تعظیماً کھڑے ہو جاتے ہیں اور بڑی خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے، جس سے معلوم ہوتا تھا کہ ان لوگوں کے دلوں میں ہماری کس قدر عزت ہے۔ لیکن اس وقت اُن کی بھیڑیں شیر بن گئیں اور ہر ٹھوبد ہوتے تیس مار خاں بن کر انتقام کا منصوبہ پختہ کر لیا۔ اور وہی لوگ جو ابھی کل تک ہمارے سامنے خمیدہ پشت اور نگوں سر رہا کرتے تھے آج اکڑتے ہوئے پھر رہے تھے اور ہماری طرف اس طرح گھور گھور کر دیکھ رہے تھے گویا ہم کو کھا جائیں گے، ہم کو دیکھ دیکھ کر دانت پیستے اور ہونٹ چباتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ اُن کے دلوں میں یہ بات جم گئی تھی کہ ہندوستان کے تو باپ دادا کے وقت سے ہم مالک ہیں یہ غیر ملکی یہاں آنے اور آ کر قبضہ جمانے والے کون ہوتے ہیں؟ اور پھر قبضہ کر کے ہماری جان و مال پر تصرف کا ان کو

کیا حق ہے؟ ہم کو اپنے وطن عزیز کے ذرائع دولت ثروت کے استفادہ سے باز رکھنا، اور ہمارے بجائے اُن ذرائع کو خود اپنے کام میں لانا کس مذہب و قانون کی رُو سے درست اور جائز ہے؟ یہ جبر و ظلم آخر کب تک ہوگا؟ اور اس ذلّت خواری کا خاتمہ کب ہوگا؟ غرضکہ قومیت کے جذبات اس وقت ہر شخص پر غالب ہو رہے تھے، اور اگر خدانخواستہ ہماری طرف سے ادنیٰ تُند مزاجی یا انانیت کا اظہار ہوتا تو ہمارا فوراً مقتول ہو جانا یقینی تھا۔

مگر آہ ایسا ہوتا تو خوب تھا! کاش شروع ہی سے مجھ سے کوئی ایسی حرکت سرزد ہو جاتی، جس سے مشتعل ہو کر وہ لوگ مجھ کو قتل کر ڈالتے تو یہ روز بد تو مجھ کو نہ دیکھنا پڑتا۔ حاصل کلام یہ کہ ہم پُل سے پار اُتر کر اُس سڑک پر پڑ لئے، جو راہ کلکتہ کے نام سے مشہور ہے، لیکن معلوم ہوا کہ راستہ لوگوں کے اژدحام سے بند ہو رہا ہے اور ہم آگے نہیں جا سکتے۔ یہاں ہم کو ہمارے مہمان بھی ملے جو ہمارے گھر سے بھاگ کر آئے تھے، بیچاروں کا بُرا حال ہو رہا تھا، اُن لوگوں نے ہم کو اشارہ کیا کہ گھوڑوں سے اُتر جاؤ اور کہا کہ یہ لوگ خدا جانے کب سے اپنے دلوں میں ہماری طرف سے نفرت و عداوت کے جذبات پرورش کر رہے تھے مگر موقع نہیں ملتا تھا، آج ان کی دلی مراد برآئی ہے کہ ان کو ایک دفعہ پھر اپنی گذشتہ عظمت حاصل کرنے کے لئے خدا نے موقع عطا فرمایا ہے اور ہم خوار و ذلیل ہیں۔ اگر اس وقت ہم کو پا جائیں گے تو لامحالہ قتل کر ڈالیں گے اور نہ جانے کیا کیا حرکات کریں گے۔ اس لئے ان کی نظروں سے اوجھل ہو جانا چاہیئے۔ یہ سُن کر ہم گھوڑوں سے اُتر پڑے اور مجمع میں رَل مِل گئے۔

مجمع میں سے جس وقت ہم لوگ گذر رہے تھے تو انگریزی محلہ کی طرف سے جہاں انگریزی حکومت کے دفاتر وغیرہ تھے بہت سخت شور و غوغا سنائی دیا، اور شورش پسندوں کی یہ آوازیں کان میں پڑیں کہ سب انگریزوں کو قتل کر دو بعد میں معلوم ہوا کہ مخالفین کی ایک ٹولی نے دارالحکومت پر ہجوم کر کے چاہا کہ اُس کو لوٹ لیا جائے شور کی کوئی حد نہ تھی۔ اس منظر کو دیکھ کر ہماری جان نکلی جا رہی تھی۔

دو ہی منٹ میں ہمارے سامنے ایک اور اس سے زیادہ خوفناک منظر آیا ایک بہت بڑا انگریز اپنے گھوڑے پر سوار کھڑا تھا، مجمع نے پہلے تو اُس کی طرف متوجہ ہو کر اُس کو خوب گالیاں دیں اور بعد میں ٹانگ پکڑ کر اُس کو گھسیٹا اب جو کوئی دیکھتا ہے وہ دوڑ کر لات مُکا جوتی لکڑی تو، غرض جو پاتا ہے اُس کو مارتا ہے اور یہاں تک کہ اپنے خیال میں اس کو مار ڈالا۔ پھر اُس کی ٹانگ گھسیٹ کر نالے میں ڈال دیا جہاں گندگی کے ڈھیر لگے تھے۔ یہ دیکھ کر ہم نے خدا کا شکر کیا کہ ہم لوگ گھوڑا چھوڑ چکے تھے۔ اب رات ہو چکی تھی۔ ہاتھی ہمارے آگے آگے چل رہا تھا اور ہم اس کے پیچھے پیچھے اطمینان سے چلے جا رہے تھے۔ محمد فیل بان ہاتھی کی گردن پر بیٹھا ہوا تھا اور سبز عمامہ اُس نے باندھ رکھا تھا، اسی وجہ سے مجمع اُس کی طرف متوجہ نہیں ہوتا تھا۔ ہم نے اُس سے کہہ رکھا تھا کہ وہ ایک انگریز سوداگر کے گھر چلے جو ہم لوگوں کا پُرانا دوست تھا۔ محمد ہاتھی لئے جا رہا تھا مگر ہماری طرف مُڑ کر دیکھتا نہیں تھا کہ کہیں شریر لوگ ہماری طرف توجہ نہ ہو جائے۔ کئی مرتبہ میرے جی میں آیا

کہ دل کو اپنی بر تھلادوں کہ وہاں آرام سے ہو جائے لیکن وہ مجھ سے ایسی بُری طرح چمٹا ہوا تھا کہ کسی طرح مجھ کو چھوڑنے پر تیار نہ تھا اور مامتا بھری ماں کے لئے یہ ناممکن ہے کہ اپنے بچہ کو جسے اُس نے ہزاروں ارمان سے پالا ہو، دشمنوں کے حوالے کر دے۔ میں نے دل میں کہا کہ کچھ بھی ہو جب تک جان میں جان ہے اُس وقت تک تو میں اس کو اپنے سے جدا نہ کروں گی۔ جو بعد میں ہو ہو۔ ہم لوگ آہستہ آہستہ آگے بڑھتے رہے اور سورش بھی برابر بڑھتی رہی۔ اندھیرا ہو گیا تو دشمنوں نے مشعلیں جلائیں اور پھر دن جیسی روشنی ہو گئی۔ روشنی میں اُن کے کالے کالے چہرے نظر آ رہے تھے اور ہم فرنگیوں پر لعن طعن کی آوازیں ...

آتی تھیں۔ ہوتے ہوتے ہم سلیم گڑھ کے پاس پہنچ گئے۔ وہاں دیکھا کہ گولندازوں کی ایک ٹولی توپیں بھرے اور بتی لگائے افسر کے حکم کی منتظر کھڑی ہے کہ جونہی حکم ہو وہ مخالفین پر گولہ اندازی شروع کر دیں، مگر جونہی شورش کنندگان کا مجمع اُس طرف گیا گولندازوں نے بھی بتیاں وغیرہ خندق میں پھینک اُن کی ہمنوا بن گئے اور مخالفین کے بجائے خود انگریزوں پر گولہ باری شروع کر دی۔ یہ دیکھ کر ہمارے صدمہ میں کچھ اور اضافہ ہو گیا اور طرح طرح کے وسواس اور توہمات زیادتی کے ساتھ آنے لگے۔ مخالفوں نے جب قلعہ کی فوج کی شرکت دیکھی تو خوب خوشیاں منائیں، تالیاں بجائیں اور شریک ہونے والوں کی ثنا و صفت کی اور فریقین میں عہد و پیمان ہو گئے۔



بی ہمسائی

از سعید بریلوی

"آپا میں سچ کہتی ہوں کہ آپ بڑی بد قسمت ہیں۔ کل آپ جلسے میں نہیں گئیں، نہیں تو ایسے ایسے تماشے دیکھتیں کہ حیرت میں رہ جاتیں۔ میری تو عقل دنگ ہو کر رہ گئی تھی۔ میں سچ کہدوں مجھے تو کل معلوم ہوا کہ ہمارے ہندوستان کی عورتیں بھی اب اس قدر ترقی کر گئی ہیں۔"

فہمیدہ۔ کیا بتاؤں بہن، کل کچھ جانا ہوا ہی نہیں۔ اِدھر تین چار روز سے میری طبیعت کچھ بہت بہت گری گری سی رہنے لگی ہے، مجھے خیال تو آیا تھا خاصکر اس لئے کہ تم جا رہی تھیں کہ میں وہاں جاؤں، مگر سارے بدن میں کچھ ایسا درد اور ایسی بے چینی سی ہو رہی تھی کہ کسی طرح ہمت ہی نہ پڑی۔

حمیدہ (مسکراکر) آپ ہی نے مجھے بتایا تھا کہ جو لوگ بیکار پڑے رہتے ہیں، اور کام کاج میں یا چلنے پھرنے میں ہاتھ پاؤں نہیں ہلاتے اُن کے بدن سے خراب مادّے خارج نہیں ہو پاتے اور یہی خراب مادّے جوڑوں میں اور رگ پٹھوں میں اکٹھے ہوجاتے ہیں اور ان میں درد اور اکڑاؤ سا پیدا ہوجاتا ہے۔

فہمیدہ بالکل ٹھیک ہے۔ اب کوئی پندرہ بیس دن سے میں کچھ بہت ہی سست ہو کر رہ گئی ہوں۔ کچھ کام کاج بھی نہیں کرتی اور ٹہلنے کو جانا بھی بند ہے۔ اچھا خیر! تم دو تو بتاؤ کہ جلسے میں تم نے کیا کیا دیکھا۔

حمیدہ۔ آپا ایک بات ہو تو کوئی بیان کرے سینکڑوں باتیں تھیں، ایک سے ایک عجیب اور ایک سے ایک بڑھ کر۔ میرے تو وہم وگمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ یہ کنوئیں کی مینڈکیاں ایسے ایسے کام کریں گی۔ تنکا میں جو تھا وہ بارن ہی گز کا تھا، جو عورت آتی تھی وہ پچھلی سے بڑھ چڑھ کے تقریر کرتی تھی، اور اسکولوں کی لڑکیوں نے تو ایسے ایسے گانے گائے اور ایسے ایسے تماشے دکھائے جو ہمیں وہاں بیٹھی تھیں وہ بھی حیرت میں رہ گئیں۔ اور ہاں دیکھئے! ایں اُس دن آپ سے کہہ رہی تھی کہ ہندوستان کی عورتیں بال

کٹوانے کا فیشن ہرگز اختیار نہیں کروں گی۔ مگر کل مجھے معلوم ہوا کہ میرا خیال غلط تھا۔ جلسہ میں بہتیری لڑکیاں ایسی تھیں جن کے بال کٹے ہوئے تھے، مجھے تو ان کی صورتیں بہت ہی بُری معلوم ہو رہی تھیں مگر ان کی یہ حالت تھی کہ گویا وہ فخر کے مارے زمین پر قدم ہی رکھنا نہیں چاہتی تھیں اور منہ پر پوڈر لگا کر شاید یہ سمجھنے لگی تھیں کہ وہ میم صاحب ہیں۔ بالوں پر دو چار بوندیں کسی خوشبو کی چھڑک لیں تو موقع اور بےموقع اور ضرورت اور بے ضرورت رومال نکال کر پسینہ پونچھ لیتی تھیں اور شاید اس طرح رومال کو ہلاتی تھیں گویا پنکھا جھل رہی ہیں تاکہ اس کی خوشبو دور دور پھیلے اور سب کو معلوم ہو جائے کہ انہوں نے انگریزی خوشبو لگائی ہے۔ ایک خاص بات جو مجھے بہت ہی بُری معلوم ہوئی یہ بھی تھی کہ ان کا دل ہم لوگوں میں نہیں لگتا تھا۔ میں تو خیر ایک جاہل عورت تھی لیکن وہاں جلسے میں حاجی ناصر الدین بیرسٹر کی اہلیہ خلیل احمد خاں صاحب کی، اور ڈاکٹر عثمانی وغیرہ کی لڑکیاں بھی تھیں جو سب کی سب بہت ہی اعلیٰ درجہ کی تعلیم یافتہ ہیں، لیکن ان "کالی میموں" کا دل ان کی صحبت میں بھی نہ بہلتا تھا، اور وہ اپنے نزدیک ان سب کو بھی حقیر اور ذلیل سمجھ کر بار بار اُن میموں کے پاس جاتی تھیں اور انہی سے انگریزی میں باتیں کرکے، ہم سب پر اپنی انگریزی دانی کا سکہ جمانا چاہتی تھیں۔ اور تماشا یہ ہے کہ ان میموں کے انداز سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ بھی انہیں کچھ اچھا نہیں سمجھتی ہیں۔ وہ جواب تو ضرور دیدیتی تھیں مگر کسی قدر کراہت کے ساتھ اور اکھڑا اکھڑا۔ ڈاکٹر عثمانی کی لڑکی نے ہم سب کو بتایا کہ انہوں نے ان میموں سے ہم سب کے متعلق یہ کہا کہ یہ سب جاہل عورتیں ہیں اور پُرانے فیشن کی پابند ہیں، اس لئے یہ ہمارے بال کٹوانے کو اور مہذب لباس اختیار کرنے کو بُری نگاہوں سے دیکھتی ہیں۔ اس پر ایک بوڑھی سی میم نے کہا تو پھر آپ کو ایسا نہ کرنا چاہئیے کیونکہ آپ بال کٹوا کر یا پوڈر لگا کر انگریز تو نہیں بن سکتیں پھر اپنی قوم کی وضع کیوں چھوڑتی ہیں۔ یہ جواب سُن کے وہ خفیف تو بہت ہوئیں مگر بیحیائی کی ہنسی ہنس کے ٹال گئیں اور اترانے میں پھر بھی فرق نہ آیا۔

فہمیدہ۔ ہاں بہن! اب آجکل ترقی اور تہذیب اسی چیز کا نام رہ گیا ہے کہ انسان فطرت سے بغاوت کرے۔ اب علم و فضل میں ترقی کرنے کو ترقی نہیں کہتے بلکہ دولت اور مال میں ترقی کرنے کو ترقی سمجھا جاتا ہے، اور تہذیب سے مراد اب نفس کو آراستہ کرنا نہیں، بلکہ جسم کو آراستہ کرلینا ہے۔ پُرانے زمانے کی بے علم عورتوں پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ انہیں زیور سے بڑی محبت ہے، اور سر سے پاؤں تک گوندنی کی طرح زیور میں لدا ہونا ان کی انتہائی آرزو ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ الزام درست ہو لیکن وہ بھدّا اور بھاری زیور خوشنما تھا یا بدنما، بہرحال ایک چیز تو تھی، اور اس پر روپیہ برباد تو نہ ہوتا تھا۔ آج مہذب اور ترقی یافتہ عورت کی تو یہ حالت ہے کہ وہ زیور اور لباس پر دولت برباد کرنے کے علاوہ اپنی آرائش اور اپنے سنگار پر روزانہ چار چھ گھنٹے کا وقت بھی برباد کیا کرتی ہے۔ صبح سے شام تک لبے پوڈر لگانے، بال بنانے، ہونٹوں پر رنگ لگانے اور

موزوں اور جوتوں کا انتخاب کرنے ہی سے فرصت نہیں ملتی۔ تہذیب اور ترقی جس چیز کا نام رکھا گیا ہے اس کی حقیقت آجکل تو بس اتنی ہی رہ گئی ہے کہ عورت ہر کام سے جی چرائے، اور اپنا تمام وقت سنگار میں یا بیکاری میں گنوائے۔ ہندوستان تو غریب کسی شمار و قطار میں ہے ہی نہیں، میں تو ان ملکوں کے متعلق کہتی ہوں کہ جنہیں ترقی یافتہ اور مہذب ملک کہا جاتا ہے، وہاں کی عورتوں کا مقصد زندگی بھی اب بالکل بدل گیا ہے، اور موجودہ تہذیب انہیں آہستہ آہستہ عورت سے مرد بناتی جا رہی ہے۔ یورپ اور امریکہ کی عورتیں اب اس بات پر فخر نہیں کرتیں کہ وہ کھانا پکانے کی بہترین ماہر ہیں، یا کپڑے کی کاٹ چھانٹ بخیہ اور رفو کا کام ان سے اچھا کوئی نہیں جانتا۔ اب تو انہیں اس بات پر فخر اور ناز ہوتا ہے کہ وہ کریکٹ اور فٹ بال کھیلنے میں اپنی نظیر نہیں رکھتیں، اور ہوائی جہاز میں بیٹھ کر ہزارہا میل کا سفر کرنے میں انہیں ذرا سا تامل نہیں ہوتا۔ اپنے کلیجے کے ٹکڑوں کو اپنا خون خوش ہو ہوکر پلانا، اور بچے کو ذرا سی تکلیف ہو تو رات رات بھر اسے گود میں لئے ٹہلنا اب مہذب عورت کا کام نہیں ہے۔ ان کے بچوں کو اگر اتفاق سے بچے پیدا ہو بھی جائیں تو اب کرایہ کی دائیاں، اور اسپتال کی نرسیں پالا کرتی ہیں، اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بچہ اسپتال میں چیچک یا خسرہ کی وجہ سے دم توڑ رہا ہے اور مہذب ماں بڑی اطمینان سے کلب میں بیٹھی تاش کھیل رہی ہے۔

حمیدہ۔ لے ہے آپا! کیا سچ مچ ایسے کٹڑ دل کی مائیں ہوتی ہیں؟

فہمیدہ۔ بہن تہذیب کا پہلا سبق یہی ہے کہ دل کے جذبات سے کوئی واسطہ نہ رکھا جائے اور ضرورت اور مصلحت وقت کے مطابق کام کیا جائے۔ شادی اور بیاہ تک اب مطابق ضرورت اور مصلحت وقت ہونے لگے ہیں۔ خاوند کے ساتھ وفاداری کسی زمانے میں ایک عورت کی سب سے بڑی خوبی خیال کی جاتی تھی، لیکن اب یہ ایک ایسا جملہ ہے کہ جس پر مہذب عورت کو بے اختیار ہنسی آجاتی ہے۔ وہ ہر موقع اور ہر حالت میں اپنے ذاتی فائدہ اور اپنی ذاتی مصلحت کو دیکھتی ہے، اور ان ہی چیزوں کے مطابق کام کرتی ہے۔ یورپ کے مرد نے ہزارہا سال تک اپنی ترکیبوں اور اپنی چالبازیوں سے اسے غلام بنائے رکھا تھا، اب اسے اپنی اس ذلت کا احساس ہوا ہے اور وہ مرد سے انتقام لینے پر آمادہ ہوئی ہے۔ اب تک اس نے مردوں کے جس قدر ظلم سہے تھے وہ چونکہ عورت ہونے کی حیثیت سے سہے تھے، اس لئے اب اسے عورت ہونے ہی سے نفرت ہوگئی ہے، اور اب وہ نہایت تیزی کے ساتھ ان تمام خصوصیتوں کو چھوڑتی جا رہی ہے جو اب تک عورت سے متعلق تھیں۔

تم سنو نہیں، بہن! یہ بالکل سچی باتیں ہیں۔ اس نے اپنے بال کٹوا دیئے کہ جو دور ہی سے بتا دیا کرتے تھے کہ یہ عورت ہے۔ وہ مردوں کی طرح بر جس بہن کر اب گھوڑے پر سوار ہوتی ہے، اور عورتوں کے مخصوص انداز کے زیور سے اسے نفرت ہوگئی ہے۔ وہ بالکل مردوں کی طرح ہر قسم کی ورزش کیا کرتی ہے، اور اب اس کے بدن سے وہ نرمی اور وہ گدازی دور ہو چکی ہے کہ جس کی بدولت اسے جنس لطیف

خضاب لا چکا۔ وہ اب نظافت اور نازک ہونے کو اپنے لئے ہتک اور توہین کا باعث خیال کرتی ہے اور اب اس کے چہرے پر وہ مخصوص نسوانی ملائمت اور وہ نزاکت گویا برائے نام کو بھی باقی نہیں رہی ہے کہ جو اس کے دل کی نرمیوں اور محبت کی گرمیوں کو ظاہر کیا کرتا تھا۔ اس کے رخساروں کی ہڈیاں اب ابھر چلی ہیں، اور ٹھوڑی اور گال اپنی گولائی سے خالی ہوتے جا رہے ہیں، اور اس کے چہرے پر اس کی صورت پر مردانہ کرختگی چھانے لگی ہے اور سونے کی نرمی کی جگہ فولادی کرختگی نے لے لی ہے۔

حمیدہ۔ تو آپا اس میں برائی ہی کیا ہے؟ آخر آپ یہ کیوں چاہتی ہیں کہ عورت ہمیشہ چھوئی موئی بن کر دنیا سے ناواقف بے وقوف اور کمزور بنی رہے۔ میرے خیال میں تو یہ ایک بہت اچھی بات ہے کہ عورتیں مردوں پر یہ بات ظاہر کر دیں کہ وہ بھی انہی کی طرح انسان، اور ان ہی کی طرح مضبوط عقلمند اور دلاور ہیں۔

فہمیدہ۔ کس پر ظاہر کر دیں؟ مردوں پر؟

حمیدہ (مسکرا کر) اور نہیں تو کیا عورتوں پر؟

فہمیدہ۔ تو اس کے معنی یہی تو ہوں گے کہ مرد اپنے آپ کو الگ ایک جنس خیال کرنے لگیں، اور عورتیں الگ۔ انسان سے مراد نہ صرف مرد ہیں اور نہ صرف عورتیں، اس لفظ میں نوع انسانی کی دونوں صنفیں بالکل برابر کی شریک ہیں۔ کوئی انسانی زندگی اس وقت تک مکمل ہی نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس میں ایک مرد اور ایک عورت شامل نہ ہو۔ ایسی صورت میں ضرورت تو اس بات کی ہے کہ ہر انسان خواہ مرد ہو یا عورت اپنی عقل اپنے علم، اور اپنے عمل کے ذریعہ سے باقی تمام مخلوق پر یہ ثابت کر دے کہ وہ سب سے افضل اور سب سے اشرف ہے، اور اگر فرشتوں نے سجدہ کیا تھا تو درحقیقت وہ اس قابل بھی تھا کہ اسے سجدہ کیا جائے۔ لیکن اس کی بجائے اگر ہم خود اپنی ہی جنس کے افراد پر یہ ظاہر کریں کہ ہم تم سے بہتر ہیں، اور ان ہی سے مقابلہ کرنے کو اپنا مقصد بنا لیں تو اس کے سوا اور کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ ہم میں آپس ہی میں پھوٹ پڑ جائے، اور ہماری اپنی زندگیاں ہی نامکمل رہ جائیں۔ قدرت نے ہمیں دو آنکھیں دی ہیں، اور جب تک یہ دونوں ساتھ ساتھ کام کرتی ہیں، اور جس طرف کو ایک دیکھے اسی طرف کو دوسری بھی دیکھتی ہے تو اس وقت تک ہمیں ہر چیز صاف نظر آتی ہے، اور ہماری نگاہ میں کوئی فرق نہیں پڑتا، لیکن اگر یہی دونوں آنکھیں الگ الگ چیزوں کو اور الگ الگ سمتوں کو دیکھنا شروع کر دیں تو آنکھوں میں بھینگا پن یا ٹیڑھا پن پیدا ہو جاتا ہے اور ہم کسی چیز کو بھی صحیح طریقہ پر نہیں دیکھ سکتے گویا ہماری آنکھوں کا مقصد ہی سرے سے فوت ہو جاتا ہے بالکل اسی طرح ایک مرد اور ایک عورت بنی نوع انسان کی دو آنکھیں ہیں ان کا کام اسی وقت تک صحیح اور ان کا مقصد زندگی اسی وقت تک پورا ہو سکتا ہے کہ جب تک مرد اپنی راہ اور عورت اپنی راہ نہ ہو۔ جس وقت یہ دونوں اپنی اپنی الگ الگ راہیں اختیار کریں گے اسی وقت ہر کام میں کجی اور خرابی پیدا ہو جائیگی۔

حمیدہ (مسکرا کر) لیکن آپا! اس کا تو یہی مطلب ہوا کہ جو عورتیں مردوں کی عادتیں اور مردوں کے سے انداز اختیار کر رہی ہیں وہ صحیح راستہ پر ہیں، کیونکہ اُن کی کوشش

یہی تو ہے کہ مرد اور عورت کا فرق اُٹھ جائے اور جو کچھ ایک مرد کرے وہی ایک عورت بھی کرے۔

فہمیدہ بن اپنے مطلب کو اچھی طرح صاف نہیں کر سکتی تھی اسی لئے تمہیں یہ غلط فہمی پیدا ہوئی۔ ہماری آنکھوں کا خاصہ یہ ہے کہ جب دہنی طرف کی چیزوں کے دیکھنے کے لئے دہنی آنکھ گھومتی ہے تو اُس کے ساتھ ساتھ بائیں آنکھ بھی فوراً گھوم جاتی ہے، اور اس طرح چیزوں کا عکس دونوں آنکھوں پر یکساں پڑتا ہے اور وہ چیزیں ہمیں نظر آتی ہیں۔ ایسا کرنے کی بجائے اگر دہنی آنکھ بائیں یا بائیں آنکھ دہنی بننا چاہے تو یہ مقصد ہرگز پورا نہیں ہو سکتا اور فوراً کجی پیدا ہو جائیگی۔ مرد اور عورت بھی جب تک زندگی کے ہر کام میں ایک دوسرے کے شریک اور مددگار ہیں اس وقت تک تو انہیں ہر کام میں کامیابی حاصل ہوتی ہے اور ان کی زندگی کا مقصد پورا ہوتا رہتا ہے، لیکن ادہر مرد کو عورت، یا عورت کو مرد بننے کا خیال آیا اور اُدہر سارا نظام درہم برہم ہو گیا۔ آج مہذب دنیا میں جو خرابی فی الحقیقت پیدا ہو گئی ہے وہ یہی ہے کہ مردوں اور عورتوں نے اپنی اپنی جگہ رہ کر زندگی کے ہر کام میں ایک دوسرے کی مدد کرنے کی بجائے ایک دوسرے کی جگہ چھیننے کی کوشش شروع کر دی ہے۔ دہنی آنکھ بائیں آنکھ بننا چاہتی ہے، اور بائیں آنکھ دہنی کی جگہ لینے کے درپے ہے اور اس کا لازمی نتیجہ دونوں آنکھوں کا بیکار ہو جانا ہے۔ ایک طرف مرد کی یہ تمنا ہے کہ وہ صبح ہی صبح ذرا سا صابون لگا کر گالوں پر اُسترہ پھیر لینے کی بدولت اپنے چہرہ میں زنانہ دلکشی اور نرمی پیدا کرے، اور دوسری طرف عورت کی یہ خواہش ہے کہ وہ کھیل کود اور ورزش کی مدد سے اپنے بازوؤں میں مردانہ سختی اور مردانہ قوت بھر لے، اور یہ دونوں کوششیں اور تمنائیں ایک حماقت اور ایک جنون سے زیادہ کوئی وقعت نہیں رکھتیں۔ کوا ہنس کی چال تو سیکھ نہیں سکتا، اپنی چال بھی بھول جاتا ہے، اور اس کا نتیجہ کوے کی تباہی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ سونا اگر لوہے کی سی سختی اختیار کرلے تو ظاہر ہے کہ پھر اسے کوئی دس روپے تولہ کو بھی نہیں پوچھ سکتا عورت اسی وقت تک عزت اور احترام کے لائق ہے کہ جب تک وہ عورت رہ کر ترقی کرے، اور اسے مرد بننے کا شوق نہ گدگدائے، اور مرد کی بھی تمام وقعت و عظمت اسی وقت تک ہے کہ جب تک اس کے دماغ میں عورت بننے کا خبط نہ سمائے۔ عورتیں اگر مردوں کی وضع اور مردوں کی عادتیں اختیار کریں گی تو یہ عورتوں کی ترقی نہیں ہے، کیونکہ جب وہ عورتیں ہی نہ رہیں تو پھر خواہ وہ چوتھے آسمان پر جا بیٹھیں تب بھی کیا فائدہ۔ یہ ترقی تو درحقیقت عورتوں کی نہیں بلکہ مردوں کی ہو گی، کیونکہ مردوں کی تعداد میں تھوڑی سی مرد نما عورتوں کا اضافہ ہو جائیگا۔ عورتوں کی ترقی تو میری بہن! اُسی وقت کہی جا سکتی ہے کہ جب وہ علم و فضل اور اخلاق و عادات میں تو ترقی کریں اور اپنی زنانہ خصوصیتوں کو پورے طور پر قائم رکھیں۔ تم نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ عورت کی شکل و صورت میں مرد کے لئے، اور مرد کے چہرے مہرے میں عورت کے لئے ایک خاص دلکشی رکھی ہے، جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کی طرف کھنچتے ہیں۔ اب اگر عورتیں اپنے تمام انداز مردانہ کرلیں اور مرد اپنے چہروں کو زنانہ بنالیں تو وہ قدرتی دلکشی کس طرح باقی رہ سکتی ہے۔ ایک عورت کا چہرہ تو ایک عورت کے لئے دلکش نہیں ہوا کرتا، اور مرد ایسے مردوں پر تو عاشق ہوتے

نہیں ہیں اُسے جو ہر لمحہ ... سگریٹ منہ میں دبائے چھڑی گھماتے کسی کلب میں لیکچر دیتے تو جا سکتے ہوں۔ مرد کبھی ہو کہ اس طرح عورتیں مردوں میں اکثر ہوتی ہیں اور قریب ہوتی جا رہی ہیں۔ جہاں تک ظاہری شکل وصورت کا تعلق ہے تمہارا خیال صحیح ہے، عورتیں مرد نما ہوتی ہیں اور عورت نما مرد دونوں میں ایک دوسرے سے جب جب ... دور ہوتے چلے جا رہے ہیں اور اس کا باعث صرف یہی ہے کہ عورت میں نسوانیت باقی نہیں ہے جو مرد کو اپنی طرف کھینچے، اور مرد سے وہ مردانہ ادائیں مفقود ہو چکیں کہ جن کی بدولت عورت اس کی طرف مائل ہوتی۔ شاید اب تمہاری سمجھ میں یہ بات بھی آ گئی ہوگی کہ امریکہ اور یورپ میں ایک دم سے طلاقوں کی اتنی کثرت کیوں ہو گئی ہے۔

حمیدہ۔ طلاقوں کا یہاں کیا ذکر تھا، اور طلاقوں کی کثرت سے اور ان باتوں سے کیا تعلق؟

فہمیدہ۔ کیسی بھولی بنتی ہو بیچاری، جیسے سچ مچ ان کی سمجھ میں کچھ آیا ہی نہیں۔ وہ تو مطلب یہ ہے کہ بس میں کہے لی جاؤں۔

حمیدہ۔ اس میں تو ذرا بھی شک نہیں ہے کہ میری خواہش یہی ہے کہ ہر بات آپ ہی کی زبان سے سنا کروں، کیونکہ جو کچھ میں آپ سے سن لیتی ہوں وہ میرے دل پر نقش ہو جاتا ہے، مگر اس وقت تو میں سچ کہہ دوں کہ میں سمجھی ہی نہ تھی۔

فہمیدہ۔ بہن! یہ تو بالکل کھلی ہوئی بات ہے۔ شروع شروع میں تو شوق اور جوانی کا جوش ہوتا ہے، شادی کر لیتے ہیں، اور اس کے بعد جب کچھ دنوں میں عقل ٹھکانے آتی ہے اور تجربہ ہوتا ہے تو ایک مرد قدرتی طور پر اپنی بیوی میں زنانہ خصوصیتوں اور دلکشیوں کو ڈھونڈھتا ہے، اور ایک عورت کو اپنے خاوند میں مردانہ انداز اور مردانہ اداؤں کی تلاش ہوتی ہے۔ شوق اور جوش کا عالم تو ہمیشہ قائم نہیں رہ سکتا کہ اس کی رو میں انسان فطرت کے پڑھائے ہوئے سبقوں کو بھول جائے۔ محبت اور عشق کے ولولے اب ختم ہو چکے ہیں، اور اب صحیح معنوں میں ایک مرد اور ایک عورت کی زندگی شروع ہوتی ہے۔ مرد کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی بیوی ہر لحاظ سے عورت ہو اور اس میں تمام زنانہ دلکشیاں موجود ہوں، اور عورت کی تمنا ہوتی ہے کہ اس کا خاوند ہر لحاظ سے مرد ہو، اور اس میں تمام مردانہ انداز پائے جائیں۔ جوش اور شوق کی عینک آنکھوں سے اترتے ہی اب عورت کو اپنے خاوند کا زنانہ چہرہ اور اس کی چال ڈھال اور نشست و برخاست میں زنانہ لوچ اور نرمی ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ اس کی فطرت اسے مجبور کرتی ہے اور اس کا دل چاہتا ہے کہ اس کا خاوند قد و قامت میں اس سے کم از کم کچھ اونچا ہو، شانے اور بازو خوب بھرے ہوئے ہوں اور جب وہ عافیت اور پناہ ڈھونڈھنے کی خاطر اپنا سر اس کے سینہ پر رکھے تو اس کی مضبوطی اور چوڑائی اس کے دل کو یہ اطمینان دلا دے کہ اس سینے اور ان بازوؤں میں اس کی اور اس کے بچوں کی حفاظت کے لئے کافی طاقت موجود ہے۔ وہ یہ دیکھ کر تو خوش ہوتی ہے کہ اس کے خاوند میں مہربانی، اور دل سوزی بہت کچھ موجود ہے، لیکن وہ صرف مہربانیوں سے مطمئن نہیں ہوتی، اور غیر محسوس طریقہ پر اسکی فطرت اسے اپنے خاوند میں تھوڑی سی مردانہ سنگدلی اور کرختگی تلاش کرنے پر ہر وقت مائل رکھا کرتی ہے۔ تھیٹر یا سینما سے واپس آکر جب خاوند ایک معمولی نوکر کی طرح اس کا کوٹ اتارتا

یا اس کے جوتے کے تسمے کھولتا ہے تو اسے فخر ضرور محسوس ہوتا ہے، لیکن ایک نامعلوم آواز اس کے دل میں چپکے سے یہ کہہ اُس وقت بھی دیتی ہے کہ کاش! تماشا دیکھ کر آنے کی بجائے میرا خاوند دن بھر ہل چلا کر اور زمین کھود کر آیا ہوتا، اور میں اس وقت اُس کے پاؤں دھو دھو کر پیتی ہوتی!

میری بہن یہ عورت کی فطرت ہے اسے نہ تعلیم بدل سکتی ہے اور نہ تہذیب، یہی وجہ ہے کہ ایک تہذیب یافتہ عورت سنہری زیوروں، ریشمی لباسوں، پوڈروں اور لیونڈروں اور موٹروں اور تفریح گاہوں کے باوجود کبھی خوش اور مطمئن نہیں رہتی۔ عیش و آرام کے یہ تمام سامان عارضی طور پر اس کے دل کو کسی قدر خوش ضرور کر دیا کرتے ہیں اور اکثر ایسے موقعوں پر کہ جب دوسروں سے مقابلہ آپڑے اس کا دل دولت کی اس افراط پر فخر اور غرور بھی محسوس کیا کرتا ہے، لیکن ان تمام اوقات میں اس کی نسوانیت ایک کمی کو محسوس کرتی رہتی ہے، اور وہ ایک ایسا خاوند ہے کہ جو اس کی تعظیم کرنے اور بار بار اس کے سامنے اپنی ٹوپی اُتارنے کی بجائے کوئی ایسی چیز ہو تاکہ جس کی تعظیم پر وہ خود مجبور ہوتی اور جسے دیوتا بنا کر وہ ہمیشہ پوجا کرتی۔ خاوند کو اپنے قدموں میں بچھا ہوا دیکھ کر اس کے غرور کو ضرور تسکین ہوتی ہے، لیکن اس کی فطرت اب بھی مضطرب اور بے چین ہی رہتی ہے اور اسے سکون حاصل نہیں ہوتا کیونکہ اس کی فطرت دوسروں کو اپنے لئے مٹانا نہیں، بلکہ دوسروں کے لئے خود مٹ جانا ہے۔ وہ اس دنیا میں زور اور طاقت کے ذریعہ سے حکومت کرنے کے لئے نہیں بھیجی گئی ہے، بلکہ اپنی محبت، اپنے ایثار اور اپنی ہمدردی کے ذریعہ سے سب کے دلوں پر قابو حاصل کرنا اس کی زندگی کا مقصد ہے، اسی لئے وزارت کی کرسیوں پر بیٹھ کر اور فوجی پلٹنوں اور رسالوں کی صفوں کے آگے کھڑے ہو کر وہاں تھوڑی دیر کے لئے اترا تو جا ہے جتنا لے لیکن خوش اور مطمئن کبھی نہیں ہو سکتی کلیو پیٹرا اور ایلزبتھ یا رضیہ سلطانہ اور چاند بی بی بن جانے کے بعد بھی اسے اس کسان کی عورت کی قسمت پر رشک آیا کرتا ہے جو اپنے ہاتھ سے جوار یا باجرہ پیس کر اور موٹی موٹی چار روٹیاں پکا کر گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ میں ٹھیک دوپہر کے وقت کھیت پر لیکر جاتی ہے اور اپنے سے ایک بڑی اور طاقتور ہستی کے سامنے اپنی عقیدت کا یہ نذرانہ پیش کیا کرتی ہے۔

حمیدہ۔ آپا کہتی تو ٹھیک ہو۔ مرد میں اگر مردانہ پن نہ ہو تو عورت کا دل اس کی طرف ہرگز نہیں کھینچ سکتا۔

فہمیدہ۔ بہن! بالکل اسی طرح عورت میں اگر زنانہ پن نہ ہو تو مرد بھی اس کی طرف پورے طور پر مائل نہیں ہو سکتا۔ مرد کی فطرت کبھی اسے اس بات پر راضی نہیں ہونے دیتی کہ اس کی بیوی اس سے زیادہ طاقتور ہو، یا اس سے زیادہ پڑھی لکھی ہو، یا اس سے بہتر کرکٹ اور فٹ بال کھیلتی ہو، یا اس سے تیز دوڑتی ہو، یا اس سے زیادہ جانباز اور بہادر ہو کلب میں جب اس کی بیوی کی ہوائی پرواز کی تعریفیں، یا اسکی دھواں دھار تقریروں کے تذکرے ہوتے ہیں تو اسے اچھا ضرور معلوم ہوتا ہے، اور وہ بھی ایک مرتبہ فخر کے ساتھ اپنے پہلو میں بیٹھی ہوئی اپنی شریک زندگی کے چہرہ پر نگاہ ڈال لیتا ہے، لیکن پہنچتے پہنچتے اس کا دل جس چیز کو ڈھونڈنے لگتا ہے وہ ایک ایسی ہستی ہے جو اس سے زور و طاقت میں کچھ

کچھ کم ہو، اور جسے اپنی حفاظت کے لیے اس کے طاقتور بازوؤں کی ضرورت ہو۔ ریشمی کپڑے اس کی ایک گٹھڑی، ہلکے ہلکے اور سہانے رنگوں کا ایک دوپٹہ، اور مشک و عنبر کی ایک پٹاری کو لے کر گھر میں بیٹھا ہوا دیکھ کر کسی قدر فرحت اسے ضرور حاصل ہوتی ہے، لیکن اس کی فطرت جس نرمی کو ڈھونڈتی ہے وہ ریشم کی نرمی نہیں، بلکہ خود عورت کے جسم کی ملائمت ہے۔ اسکی آنکھ ایک ایسے دل کی تلاش ہوتی ہے کہ جس میں سوز اور گداز بھرا ہوا ہو۔ اور اس کی نگاہیں ایک ایسے چہرہ کی جستجو کرتی ہیں کہ جس پر مسکراہٹ کے سوا سختی اور کرختگی کا کہیں نام نہ ہو۔ اپنی زندگی کی شرکت کے لیے اسے ایک عورت کی ضرورت تھی لیکن جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ اس کی زندگی کی شریک ایک سچ مچ کی عورت نہیں بلکہ ایک جھوٹ موٹ کا مرد ہے تو آہ اس سے کوئی تسکین اور کوئی راحت حاصل نہیں ہوتی اسے تو ایک ایسی ہستی کی تلاش تھی جس پر وہ اپنی مردانہ برتری کے ذریعے حکومت کر سکتا، اور جو اپنے آپ مرد بن بیٹھنے کی بجائے اس کی مردانہ خصوصیتوں کی پرستش کیا کرتی اور جس کی ہمدردی، محبت، نرمی اور شیرینی اس کے مضبوط دل اور فولادی بازوؤں کو اپنا غلام بنالیتی۔

میاں بھی مہذب اور بیوی بھی مہذب اور دونوں کے دونوں میں خوش حال اور کامیاب زندگی بسر کرنے کی تمنا، لیکن ایک ذرا سی غلطی اور ایک ذرا سی کج روی دونوں کو افسردہ اور مضمحل بنادیا کرتی ہے، اور میاں بیوی صرف قانونی میاں بیوی رہ جاتے ہیں۔ اب تم خود سمجھ سکتی ہو کہ اس قسم کی قانونی محبتوں کو کے دن نباہ ہو سکتا ہے۔ چند ہی روز کے بعد یہ نتیجہ دیکھنے میں آتا ہے کہ میاں اپنی راہ اور بیوی اپنی راہ۔ خدا طلاق اور خلع کے قانون کا بھلا کرے کہ وہ ایسے وقت میں ان کے آڑے آجاتا ہے، لیکن مصیبت یہ ہے کہ کہ مہذب میاں کو پھر مہذب بیوی، اور مہذب بیوی کو پھر مہذب ہی میاں ملتا ہے، اور پھر دونوں کی تہذیبیں اسی طرح ٹکرایا کرتی ہیں۔

"ارے ہے آپا غضب ہو گیا! میں یہاں آپ کی باتوں میں کھڑی رہ گئی، اور وہ کچہری سے آ بھی گئے! کہتی ہوئی نسیمہ بھاگ گئی۔



دھلی کے چند فارسی گو شعرا

(از جناب جلالی، شاہجہانپوری)

خدا جانے اس جنت نشان سرزمین نے کتنی ایسی ہستیاں اپنے بطن سے پیدا کی ہونگی، جنہوں نے اپنے دماغی افکار سے دنیائے علم و ادب میں غلغلۂ انقلاب پیدا کر دیا ہوگا لیکن ہماری علمی بے حسی اپنی قدیم زبان سے اس حد کو پہنچ چکی ہے کہ ان باکمال ہستیوں کی جگر کاویوں اور دماغ سوزیوں سے بھی ہم واقف نہیں۔

جس زمانہ تک فارسی علم و ادب پر مغلیہ حکومت کے آثار باقی رہے اُس وقت تک ہم کو اپنی قدیم اور نیم مذہبی زبان سے ایک گونہ تعلق رہا، لیکن جونہی زمانہ نے اپنی انقلابی کروٹ بدلی اُس وقت سے نہ تو ہمارے اندر وہ علمی حس و حرکت باقی رہی اور نہ وہ ذوق فارسیت اپنی جگہ پر قایم رہا۔

ہندوستان کی مقدس اور علم پرور زمین نے فارسی زبان و ادب کی ترقی میں جتنی "سعی مشکور" کی اس پر سرزمین ایران کو حسد رہا لیکن ع "یہ باتیں ہیں جبکی کہ آتش جوان تھا"

اب تو اسی علم پرور زمین میں ہماری بے توجہی اور بے حسی کی وجہ سے اس کی حالت مردہ زبان کی حد کو تقریباً پہنچ چکی ہے۔

موجودہ جمودی فضا کو دیکھتے ہوئے اس زبان کی حالت یا اس پر تبصرہ بظاہر سعی لاحاصل سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا مگر خدا کا شکر ہے کہ صوبہ دار شرقی فارسی امتحانات کی وجہ سے پھر اس کے جسد مردہ میں جان سی پڑ چلی ہے، اور علم دوست طبقہ کی نگاہیں اس طرف متوجہ ہوتی جاتی ہیں، اسی خیال نے آج میرے دل میں بھی اس مضمون کے لکھنے کی ہمت پیدا کر دی، اس کے علاوہ پچھلوں کی دماغ سوزیوں اور جگر کاویوں کا تعارف خود بھی ایک مستحسن فعل ہے۔

فارسی شاعری کو جس قدر عروج دلّی کی سرزمین میں حاصل ہوا ہندوستان کے کسی دوسرے خطہ میں اس کو یہ بات نصیب نہیں ہوئی، بلکہ یہ کہنا اپنی جگہ پر بالکل بجا اور درست ہوگا کہ دلّی کی خاک فارسی گو شعرا کے لئے ہمیشہ سے لجاؤ ماوی

نہیں رہی۔ اسی وجہ سے میں نے اپنے اس مضمون پر صرف ان فارسی گو شعرا کا ذکر اور ان کے کلام پر تبصرہ کروں گا جن کو صرف بطن دہلی سے پیدا ہونے کا شرف حاصل ہے۔

چونکہ فارسی علم و ادب کی اشاعت و ترقی میں برادران وطن کی جگر کاویوں کو بھی پورا دخل ہے، اس لئے اس سلسلۂ مضمون میں اُن کے شاعرانہ افکار کا ذکر بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

ضمیر

پنڈت نرائن داس، المتخلص بہ ضمیر، المتوطن دہلی آپکی غزلیات میں سادگی بلا کی پائی جاتی ہے، اور اسی چیز کو غزل کا جوہر اصلی کہہ سکتے ہیں۔ شعر کی اصلی تعریف یہی ہے کہ "قائل کے منھ سے نکلتے ہی سامع کے دماغ میں ایک سروری کیفیت تھوڑی دیر کے لئے پیدا کردے اور اُس کا اثر بہت دیر تک قایم رہے۔"

پنڈت جی موصوف کی غزلیات کا خاصہ جذب و کشش ہے، یعنی ادہر شعر منھ سے نکلا اور اُدہر سامع کے دماغ میں اُتر گیا۔ آپ کی غزلیات میں نہ تو تلمیحات کی اس قدر بہتات ہے کہ جسکی وجہ سے شعر ایک قسم کا اچھا خاصہ گورکھ دہندا بن کر رہ جائے، اور نہ عامیانہ پن پایا جاتا ہے کہ جس کو ابتذال کے درجہ میں لایا جاسکے، بلکہ ان تمام تکلفات و عمومیت سے آپ کی غزلیات کو کوئی واسطہ اور تعلق نہیں، معاملات عشقیہ کے باندھنے میں آپکو ید طولیٰ حاصل تھا، روانی بندش میں بھی کوئی کمی نہیں۔

مستیٔ چشم یکے سرخوشیٔ بادہ یکے
نشۂ آں بت میخوار دو بالا افتاد

دیکھیے اس شعر میں تغزل اپنی پوری جامعیت اور شان کے ساتھ موجود ہے، تاثر کے لحاظ سے بھی یہ شعر بلند ہے۔

او و شوخی و تبسم بہزار ناز کردن — من و عجز و جان فشانی ز سر نیاز کردن
چو خمار زور آرد چہ خوش است سوئے ساقی — پئے جام بادہ دستے بہوس دراز کردن

پہلے شعر میں "شوخی و تبسم" کے مقابلہ میں بجز "عجز و جانفشانی" اور "ناز" کے مقابلہ میں "نیاز" کس قدر شاعرانہ لطافت رکھتا ہے اور یہ امر واقعہ ہے کہ "شوخی و تبسم" کے مقابلہ میں بجز "عجز و جانفشانی" اور ناز کے مقابلہ میں سوائے نیازمندی کے اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا، رہروان منزل یار اس راستہ کے پیچ و خم سے خوب واقف ہوں گے۔ اور اس کی لذت ان ہی سے دریافت کرنا چاہیئے جو کہ مے عشق کے لذت چشیدہ ہوں دوسرا دوسرا شعر بھی جوش و خروش اور امر واقعہ کے اعتبار سے بہت خوب ہے ؎

صد شیشۂ شراب بہ بزم طرب شکست
دلہا ز دست محتسب بے ادب شکست

"بزم طرب" میں شیشہ ہائے مے کے شکست کی وجہ سے محتسب کی صفت "بے ادب" شاعرانہ لطافت سے خالی نہیں۔ اس لطافت کے علاوہ چونکہ رندوں کا سرمایۂ نشاط سوائے شیشۂ شراب اور جام مے کے کچھ ہوتا نہیں، اس لئے اس کی شکست یقینی طور پر شکستہائے دل کے برابر ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر اگر کچھ کہا جائے تو وہ بھی مبالغہ کے تحت میں نہیں آسکتا۔

اسی مضمون کو حضرت اصغر شاہجہانپوری نے نہایت جامعیت کے ساتھ پیش کیا ہے ؎

اے محتسب مگر تجھے اس کی خبر نہیں
شیشہ کے ساتھ دل بھی کئی چور ہو گئے

منعم

منشی موہن لال، نام منعم تخلص، قوم کائستھ وطن دہلی فارسی زبان سے خاص لگاؤ تھا، اور اس کے اندر کمال بھی حاصل تھا، قدرے عربی سے بھی نسبت تھی، شعر و شاعری سے تعلق رکھتے تھے، لیکن چونکہ ذوق شعریت فطری نہیں تھا، اس لئے شاعری میں کوئی نیا اسلوب پیدا نہ کر سکے ۔ع

چہ رنگ و بو کہ دل غنچہ در نہاں دارد
بود بہار دگر عالم خموشی را

میکش

میر احمد حسین نام، میکش تخلص دہلی زاد بوم، علوم درسیہ کی تحصیل کے متعلق کچھ پتہ نہیں چلتا، کلام پر نظر کرنے سے اس بات کا ضرور اندازہ ہو جاتا ہے کہ دست فطرت نے ذہن رسا عطا کیا تھا، کلام کی روانی و لطافت بتاتی ہے کہ فن شعر سے فطری مناسبت اور تعلق تھا، اصناف شعر میں غزل سے زیادہ تعلق تھا، اسی وجہ سے اس کے اندر عذوبت و چاشنی، رندی و سرمستی، طرب و جوش اور ولولہ انگیزی بہت پائی جاتی ہے، تغزل اور کیف و صہبائیت کا رنگ بھی چوکھا ہے، صاحب تذکرہ "نگارستان سخن" آپ کے متعلق لکھتا ہے "ذات میکش ساغر زن صہبائی مضامین است" رنگ طبع ملاحظہ ہو۔

گفتمش دے، باکہ رفتی سوئے باغ؟
گفت میکش بودہ باشد، کاں گرفتار من است

کلام کے حسن و قبح کا سمجھنا صرف ذوق شعریت پر منحصر ہے، ایک شعر ایک شخص کے دماغ میں کیف و تلاطم پیدا کر دیتا ہے، لیکن دوسرے شخص کے لئے وہی شعر باعث حرکت بھی نہیں ہوتا، اسی وجہ سے اہل الرائے کسی شعر پر اپنی حتمی رائے کبھی نہیں لکھتے، اس مسطورہ شعر میں "بودہ باشد" کا جملہ پورے شعر کی جان ہے، اس کے اندر معشوق کی عاشق کی جانب سے غفلت و بے اعتنائی جو معشوقوں کی ادنیٰ ترین خصلت ہے مکمل طریقہ سے پائی جاتی ہے۔

محبوب کو یہ تو بخوبی معلوم ہے کہ میکش نامی شخص میری زلف دراز کا اسیر ہے، لیکن اس بات کو جانتے ہوئے بھی وہ میکش کی شکل و صورت سے قطعی آشنا نہیں، بلکہ غفلت کی انتہا یہ ہے کہ اس کو یہ بھی معلوم نہیں کہ کل تفریح گلزار میں میرے ساتھ کون تھا۔

جب یاد دہانی کرائی جاتی ہے تو سوچ کر بے اعتنائی سے جواب دیدیتا ہے کہ "میکش بودہ باشد" یعنی اس کو یقین نہیں ہے کہ وہ میکش ہی تھا بلکہ اس کے لئے ماضی شکی کا صیغہ استعمال کیا ہے۔

شاعر کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ صرف طرز ادا کے اندر مطالب و معانی کا دریا موجزن کر دے، لیکن اس کے لئے سب سے بڑی شرط یہ ہے کہ طرز ادا سے سامع کا دماغ فوراً ان معانی و مطالب مستترہ کی طرف متوجہ ہو جائے، یعنی طرز ادا خود بخود معانی کو دماغ کے اندر اُتار دے۔

یہ مسلمات سے ہے کہ یہ کمال جس کے اندر پایا جائیگا وہ حقیقی معنوں میں فطری شاعر ہوگا، اور قدرت نے اس کا دماغ صرف اسی فن کے لئے بنایا ہوگا، یہ بات ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتی یہ عطیۂ فطرت ہے جس کو نصیب ہوگیا وہ خوش نصیب میکش کے اس شعر کے تیور خود بتا رہے ہیں کہ یہ بے ساختہ زبان سے نکلا ہے، یہ روانی و کیفیت آمد ہی میں ہو سکتا ہے، آورد میں کہاں؟

اشکی

برکت زماں نام اشکی تخلص دہلی کے باشندہ تھے۔ خاندانی شرافت اور دودمانی نجابت کے علاوہ ذاتی جواہر کی ضو بھی سایہ فگن تھی۔ طبیعت کا بھولاپن فطری سوز و گداز اپنے ساتھ لایا تھا۔ جس کا اظہار غزلیات کی شکل میں ہوتا رہتا تھا۔ اگرچہ آپ نے شعر و شاعری کے مشغلہ کو جزو حیات نہیں بنایا تھا لیکن طبیعت کی جودت اور مزاج کی نیرنگی سے جو کچھ بھی نکلتا تھا وہ درد آشنا طبائع کے لئے تیر و نشتر کا مرادف ہوتا تھا۔ یہ مسلمات سے ہے کہ الہامات شعری کا زیادہ تر تعلق وجدانیات و کیفیات باطنیہ سے ہے۔ قوت کسبی اس میدان میں کبھی بھی تخم ریزی نہیں کر سکتی۔ اگر اس کے بل پر شاعری کی وسیع زمین کو ہموار بھی کر لیا جائے تو بھی اس کے اندر قوت نمو اور بہار و شگفتگی نہیں پیدا کی جا سکتی۔ کیفیات و وجدانیات کا تعلق قوت تخیل کی پختگی اور احساسات و کی عمیق ترین گہرائیوں میں مضمر و مستور ہے۔ ان دونوں چیزوں کے اندر جس قدر پختگی ہوگی اور حسن و حرکت پائی جائیگی اسی قدر کلام میں زور و استواری نزاکت و خیال آفرینی، سوز و گداز اور اسرار و غوامض پائے جائیں گے، اور ان چیزوں کے فقدان سے شعریت کا رنگ پھیکا پڑ جائیگا۔ شاعر کے لئے مدرک بالطبع اور رازدار حکمت ہونا جس قدر لابدی ہے، اسی قدر احساسات و تخیلات کی گہرائیوں اور اس کے نکات و رموز سے آگاہ ہونا بھی بہت ضروری ہے۔ شاعر جس قدر فطرت کی سحر کاریوں اور عجوبہ پسندیوں کا رازدار ہوگا، اسی قدر اس کے کلام میں جدت و پختگی اور طرفگی و نیرنگی زیادہ پائی جائیگی۔ اشکی کے کلام پر اگر غائرانہ نظر ڈالی جائے تو آپ کا کلام پختہ فکری اور اعلیٰ تخیل کا مکمل نمونہ معلوم ہوتا ہے۔ طبیعت کی فطری موزونیت ہر لفظ سے آشکارا ہے، یہ پتہ نہیں چلتا کہ آپ نے شاعری کو مستقل فن بنا لیا تھا۔ سلاست و روانی جوش و خروش و مستی و کیفیت کا دریا بہتا معلوم ہوتا ہے۔

روز محشر ہمہ نالند بہ پیش حق من — دامنت گیرم و ہم پیش تو فریاد کنم
وعدہ روزی دہ رفتی سوئے اشکی اکنوں — باز فرما کہ چہ گویم کہ دلش شاد کنم

غزل کی تعریف یہ ہے کہ اس میں عشق و محبت، سوز و گداز رقت و لطافت، خاکساری اور اطاعت کے مضامین پائے جائیں، اور بہترین غزل گو یہی اسی کو کہا جاتا ہے جو ان عاشقانہ حالات کو بیان کرے جو پیش آچکے ہوں یا آنے والے ہوں۔"

ان اشعار کے اندر عشق و محبت، سوز و گداز، اور اطاعت و خاکساری کا سمندر موجزن ہے۔ غزل میں شیفتگی، دلفتگی، رنج و غم شوق و مسرت، اور سوز و گداز کا بیان ہوتا ہے۔ الفاظ شیریں اور واضح ہوتے ہیں، طرز ادا طرب انگیز ہوتی ہے، اپنی رفعت و نخوت کا بیان غزل میں نہیں ہوتا ہے، کیونکہ یہ منافی عجز ہے۔ اشکی کی غزلیات ان تعریفات و محاسن کی حامل و سرمایہ دار ہیں

شریف

شریف حسن نام، قوم سادات سے تعلق رکھتے تھے باپ کا نام مولوی نظام الدین تھا۔ خاندان میں مولویت کا سلسلہ عرصہ سے چلا آرہا تھا، گھر میں ایک نہ ایک مولوی ہونا ضروری تھا، باپ چونکہ خود بھی مولوی تھے، اور اپنے عہد کے مشہور و معروف علماء میں سے تھے۔

مذہبیات کے شغف کی وجہ سے اپنے دونوں لڑکوں کو ابتدا ہی سے مذہبی راستہ پر لگا دیا تھا، اور خدا کے فضل سے دونوں لڑکے تھوڑے ہی عرصہ میں اپنے فن میں کامل ہوگئے تھے اور

صحیح معنوں میں اپنے باپ کے جانشین کہے جاتے تھے۔ بڑے لڑکے کا نام شریف حسن اور چھوٹے صاحبزادہ کا نام شریف حسین تھا، غالباً والد کے انتقال کے بعد وطن مالوف کی سکونت ترک کر دی تھی۔

چھوٹے صاحبزادہ یعنی شریف حسین کا چونکہ ریاست بھوپال کے منصب قضا پر تقرر ہوگیا تھا، اس لئے انہوں نے بھوپال ہی کو اپنا ملجاؤ ماوٰی بنا لیا تھا۔

بڑے لڑکے یعنی سید شریف حسن کو اودھ کے کسی نوابی خاندان سے وظیفہ ملتا تھا، اور اس وظیفہ کے عوض چونکہ ان کو ریاست کی کچھ نہ کچھ خدمت بھی کرنی پڑتی تھی، اس لئے انہوں نے اپنا وطن ثانی فرخ آباد بنالیا۔

شعر و شاعری سے ذوق کامل طبیعت میں موجود تھا "شریف" تخلص کرتے تھے، اگرچہ یہ شوق حد جنوں کو نہیں پہنچا تھا بلکہ تفنن طبع اور دوست احباب کی فرمائش سے مجبور ہوکر کبھی کبھی کچھ نہ کچھ کہہ لیا کرتے تھے، مگر اس کم گوئی کے باوجود جب کبھی کچھ کہتے تھے تو اس میں پختہ کاری کی جھلک، اور استادانہ رنگ نمایاں رہتا تھا، مناسبت نظری اور ذوق طبع کی وجہ سے کلام میں زور، پختگی، مناسبت الفاظ، جوش بیان اور رنگ تغزل، خوب پایا جاتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

برق یا صبح تجلی یا رخ زیبا ست ایں — ماہ یا مہر درخشاں یا ید بیضا ست ایں
روز من یا شام ہجر قیس گیسوئے تو — یا سواد زلف لیلیٰ یا شب یلدا ست ایں
مشتری یا زہرہ یا ماہیت یا خود یا سحر — آئینہ یا لوح سیمیں ست یا سیما ست ایں
چشم سوزن یا گرہ یا نقطۂ شک یا دہن — یا معما یا عدم یا رمز ناپیدا ست ایں
فتنہ یا تیغ کشیدہ یا قیامت یا بلا — یا نہال گلشن جاناں یا قد رعنا ست ایں

ان اشعار میں جوش و خروش، مناسبات لفظی، معنی آفرینی، اور تخیل کی بلند پروازی جیسی کچھ ہونا چاہئیے اپنی جگہ پر بہت کچھ موجود ہے۔

ولی

شاہزادہ دارا شکوہ کے پرائیویٹ محرروں میں سے تھے، صوفیانہ مذاق کے آدمی تھے، ہمیشہ ایسے ہی لوگوں میں صحبت گرم رہتی تھی۔ ملا شاہ بدخشی سے جو کہ اس دور کے مشہور متصوفین میں سے تھے آپ کو خاص ارادت تھی، اور اکثر اوقات انہیں کی صحبت حق پژوہ میں رہا کرتے تھے، اس مناسبت سے اپنا تخلص بھی "ولی" رکھا تھا۔ آپ کا کلام تصوف و معرفت کی چاشنی سے لبریز ہے، دو رباعیاں آپ کی بہت مشہور ہیں۔

در خود بنگر کہ جان و جانانہ توئی — در مجلس خود چراغ و پروانہ توئی
تا چند بگرد خانہ گشتن شب و روز — در خانہ درآ کہ صاحب خانہ توئی

دیکھئے! کس قدر بلند تعلیم ہے، ہر مصرع اعلیٰ تخیل کا مالک ہے خودداری اور اعلیٰ اخلاق کی تعلیم کس انداز سے پیش کی ہے فلسفۂ حیات اور طرز زندگی کی شرح میں کیا نیا اسلوب پیش کیا ہے، اس کے بغور مطالعہ کے بعد ایک نئے قسم کا تخیل اور ایک نئی کیفیت آپ اپنے دماغ میں محسوس کریں گے، دوسری رباعی بھی ملاحظہ کے قابل ہے۔

مطلوب تو ہست با تو اے طالب ذات — موجود بذاتی نہ بآیات و صفات
آں چاہ خودی را دو سہ گز گر بکنی — در خانۂ خود بیابی آں آب حیات

خودی اور کبر و نخوت جو کہ تمام معائب کا سرچشمہ ہے اس کے خلاف کس خوبی اور نرمی سے تعلیم دی ہے، دونوں رباعیاں ایک کیفیت مجسم کی حیثیت رکھتی ہیں، فلسفیانہ مذاق جدت ادا اور انداز بیان کا حقیقی لطف و کیف ان میں موجود ہے۔

"درسِ عبرت"

(از جناب حشمت اوری متعلم ایم اے ایل ایل بی کلاس مسلم یونیورسٹی)

گُل سے یوں اک روز بلبل نے کہا　　میں ہوں اے گُل تجھ پہ سو جاں سے فدا
حُسن تیرا کتنا فرحت بخش ہے　　رنگ تیرا کتنا نزہت بخش ہے
دیکھ لے گر تیرا رنگِ لاجواب　　شرم و غیرت سے ہو آتش آب آب
عارضِ خوباں میں وہ سرخی کہاں　　جو کہ اے گُل رُخ سے ہے تیرے عیاں
ہے تجھی سے زینت باغِ جہاں　　پھولا پھرتا ہے خوشی سے باغباں
نازاں ہے تجھ پہ سو جاں سے نثار　　زندہ ہے دم سے ترے نامِ بہار
تیرے سب خورد و کلاں دیوانے ہیں　　شمع ہے تو اور سب پروانے ہیں
تیرا جھونکوں سے ہوا کے جھومنا　ق　اور شاخوں کو برابر چومنا
بُت بنا دیتا ہے ہر انسان کو　　تازگی سی بخشتا ہے جان کو
کس قیامت کے ترے انداز ہیں　　تجھ پہ صدقے سب بتِ طناز ہیں
جبکہ گل تقریرِ بلبل سُن چکا　　بھر کے آہ سرد یوں کہنے لگا
حُسن پر میرے نہ جا اے عندلیب　　چند ساعت ہیں فقط اس کو نصیب
رنگ کا میرے جہاں میں ہے یہ حال　　ہوگا آتے ہی خزاں کے پائمال
میری بُو سے کیا تو راحت پائیگی　　ایک ہی جھونکے میں یہ اُڑ جائیگی
میری خوبی و نزاکت میری شان　　دو گھڑی کی ہے جہاں میں میہماں
کیا بتاؤں تجھ کو اپنا حالِ زار　　ہے مرے پہلو میں پنہاں نوکِ خار
زندگی میں پھر مزا کیا خاک ہو　　جب جگر خاروں سے سارا چاک ہو
رنج و غم سے میں پٹکتا ہوں جو سر　　جھومنا وہ تجھ کو آتا ہے نظر
الغرض میری حکایت ہے عجیب　　ہوں کسی کے بھی نہ میرے سے نصیب
محو لوحِ دل سے کر میرا خیال　　اُس سے اُلفت کر نہیں جس کو زوال!
رہ الگ ہر ایک فانی چیز سے　　کیا محبت آنی جانی چیز ہے؟

فریبِ التفات

(از جناب اصغر شاہجہانپوری)

آہ! فصلِ گل میں ہم کیا کیا گماں کرتے رہے آشیاں میں رہ کے فکرِ آشیاں کرتے رہے
یوں ترے ناکام شرحِ داستاں کرتے رہے ایک لفظِ آرزو برسوں بیاں کرتے رہے
دل کے ہر پہلو میں اک دنیا بنی اک مٹ گئی ہم اُمید و یاس کا یوں امتحاں کرتے رہے
اُن کی نظروں سے ٹپکتا تھا فریبِ التفات ہم نہ جانے آج کیا وہم و گماں کرتے رہے
ایک "اُف" پر ختم تھا افسانۂ سوز و گداز لوگ دو حرفوں سے شرحِ داستاں کرتے رہے
تیغِ قاتل پر تصدق کی غرض سی عمر بھر ہم تلاشِ زندگی جاوداں کرتے رہے
آج ہم بیٹھے ہوئے خاموش ان کی بزم میں ہر نگاہ لطف پر سو سو گماں کرتے رہے
شمع کے مانند چپ ہونا پڑا وقتِ سحر! حالِ دل جب تک رہی طاقت بیاں کرتے رہے

جب تک اے اصغر رہے گلشن میں ہم محو بہار
دیدۂ عبرت نگر سیرِ خزاں کرتے رہے

شکوۂ رنگین

(از سعید دہلوی)

"تجھ سے ہیں اُلفت ہے" تمہیں نے یہ کہا تھا ۔۔۔ اُلفت تھی اگر مجھ سے تو پھر آج یہ کیا ہے؟
وہ چاہ وہ پیار، اور محبت کے وہ اقرار ۔۔۔ اُن گذری ہوئی باتوں کو دل ڈھونڈ رہا ہے
کیا ہے کہ مرا نام ہے اب صرف شکیلہ ۔۔۔ "پیاری" مجھے سو بار تمہیں نے تو کہا ہے
اب ایسا نیا کونسا نکلا ہے کلب اور ۔۔۔ گھر راتوں کو آنا تمہیں دشوار ہوا ہے
چھوڑا ہے اکیلا مجھے اتنے بڑے گھر میں ۔۔۔ میں پوچھتی ہوں کچھ بھی تمہیں خوف خدا ہے
کاٹے نہیں کٹتی ہیں یہ برسات کی راتیں ۔۔۔ بادل کی گرج سے مرا دل کانپ رہا ہے
بس اک یہ دیا ہے مری تنہائی کا ساتھی ۔۔۔ میری ہی طرح شام سے جل وہ بھی رہا ہے
تنہائی کی اک رات سے تم ڈرتے تھے کتنا ۔۔۔ قسمت میں مری روز وہی کالی بلا ہے
گنتے انہی تاروں کو گذر جاتی ہیں راتیں ۔۔۔ ایک ایک ستارہ یہ مرا دیکھا ہوا ہے
سُدھ بُدھ ہے نہ کنگھی کی نہ چوٹی سے ہے مطلب ۔۔۔ آئینہ پڑا جانے کہاں لوٹ رہا ہے
ریشم جنہیں تم کہتے تھے اب کے وہی بال ۔۔۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ اک جھنڈ کھڑا ہے
گاتا ہے پپیہا تو دل اب ہوتا ہے ٹکڑے ۔۔۔ ناشاد کی آواز میں کیسا درد بھرا ہے
کوئل سے میں ہنس ہنس کے لڑا کرتی تھی پہروں ۔۔۔ اب اس کی بھی "کوکو" میں مزہ آنے لگا ہے

مغرور تھی میں دل میں محبت پہ تمہاری — بیجا تھا غرور اور اسی کی یہ سزا ہے
دُکھتا تھا مرا سر بھی تو ہو جاتے تھے بیچین — اب مرتی رہوں میں تو دوا ہے نہ دُعا ہے

مانا میں خطاوار ہوں، ننھا تو ہے معصوم — اب گود میں لینا اسے کیوں چھوڑ دیا ہے؟
تکتا تمہیں رہ جاتا ہے وہ موڑ کے گردن — تم یہ بھی نہیں پوچھتے "تو کون بلا ہے"
سوتے سے جگا کر کبھی ہوتا تھا اسے پیار — اب اس کی طرف آنکھ اُٹھانا بھی بُرا ہے
میں لاکھ بُری ہوں مگر انصاف سے کہنا — دو سال کی بیاہی پہ ستم اتنا روا ہے
ہے اپنی اسی چاہ پہ مردوں کو بڑا ناز — کیوں مُفت محبت کو بھی بدنام کیا ہے
ہانڈی کا اُبال، اور ہے نام اس کا محبت! — دو روز کی چاہ! اور لقب اس کا وفا ہے

جو جی کو جلائے اسی جلّاد پہ مرنا — یہ حوصلہ اللہ نے عورت کو دیا ہے
ماں باپ جو مٹی کا بھی پتلا کوئی لادیں — کہدیں اسے شوہر، تو وہ عورت کا خدا ہے
آجائے کسی پر تو کبھی پھر نہیں سکتا — دل سینہ میں عورت کے نہیں، قبلہ نما ہے
عورت ہی سمجھ سکتی ہے مردوں کو خبر کیا — جلنے میں جو لذت ہے، جو مرنے میں مزا ہے

تم لاکھ جلاؤ مجھے ہوں پھر بھی تمہاری
تم لاکھ ستایا کرو دل تم پہ فدا ہے



ہماری آیندہ نسل

(از سعید بریلوی)

مسلم لیگ، خلافت کمیٹی، جمعیۃ العلماء اور آل مسلم پارٹیز کانفرنس کی روئدادیں پڑھ کر اور ان کی تجاویز کو دیکھ دیکھ کر جو آئے دن قوم کی ان ممتاز انجمنوں میں پاس ہوتی رہتی ہیں، خیال ہوچلا تھا کہ غیروں کے ساتھ مسلمان بھی شاید اب چونک پڑے، اور ان کا نصیب بھی اب جاگ گیا، اور اگر اس بات کو پیش نگاہ رکھا جائے کہ مسلمانوں کے ہزاروں بہی خواہ اور ہمدرد شب و روز قوم کی فلاح اور بہبود کی فکروں میں لگے رہتے ہیں، اور ان کی ہر انجمن کا نصب العین صرف یہی ہے کہ جس طرح بھی بنے اس درماندہ اور از ہر سو راندہ قوم کو ترقی کی شاہ راہ پر ڈال دیا جائے تو مسلمانوں کی بیداری کی توقعات قائم کرلینا کچھ بیجا بھی نہ تھا۔ مسلمان زعما کی دل ہلا دینے والی تقریریں، مسلم ارباب صحافت کی پُرجوش تحریریں اور مسلمانوں کی نمایندہ جماعتوں کی نہایت اہم اور مناسب وقت تجویزیں سب ایسی ہی چیزیں تھیں اور ہیں کہ انہیں پڑھنے اور سننے کے بعد تھوڑی دیر کے لئے تو لازمی طور پر یہ دل خوش کن اُمید قائم ہوجاتی ہے کہ بس اب خدا نے چاہا تو ہمارے بھی دن پھرے، اور اب ہماری قوم بھی خدا کا نام لیکر انگڑائیاں لیتی ہوئی اُٹھ ہی کھڑی ہوئی۔ لیکن خدا ہی جانے یہ کیا مصیبت ہے، اور یہ کونسا طلسمی اثر ہے کہ اس قدر زبانی جمع خرچ اور زور و شور کے بعد بھی قوم کی گاڑی ٹھیک اسی جگہ کھڑی نظر آتی ہے کہ جہاں سو برس پہلے کھڑی تھی اور مسلمان اب بھی جہالت اور افلاس کے سمندر میں اسی طرح ہاتھ پاؤں مارتے نظر آتے ہیں کہ جس طرح اب سے دو صدی پیشتر مارا کرتے تھے، نہ علماء کرام کا وعظ کچھ کام دیتا ہے نہ تلقین نہ صوفیائے عظام کی باطنی توجہ مفید ثابت ہوتی ہے نہ دعا نہ لیڈروں کی دھواں دار تقریریں اس طلسم جمود کو توڑتی ہیں، نہ اڈیٹروں کی پُرزور تحریریں اور نہ مختلف سیاسی اور مذہبی انجمنوں کی ہمدردانہ جد و جہد کارآمد ثابت ہوتی ہے، نہ حکومت وقت کی مربیانہ کوششیں اور خدائے واحد کی پرستش کرنے والی مسلم قوم ایک مایوس العلاج مریض کی

طرح اپنی زندگی کے دن پورے کر رہی ہو۔

کچھ زیادہ دن نہیں ہوئے ہیں کہ قوم کا ایک یتیم خانہ دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ میں نہ اس شہر کا نام بتاؤں گا کہ جہاں یتیم خانہ واقع ہے' اور نہ ان "بزرگان قوم" کے نام لوں گا کہ جن کی نگرانی اور سرپرستی کا فخر اس "بچوں کے جیل خانہ" کو حاصل ہے کیونکہ میرا مقصد کسی کو بدنام کرنا اور ذلیل کرنا نہیں ہو۔ لیکن ارباب قوم کے سامنے ان دردناک مناظر کا نقشہ ضرور پیش کرنا چاہتا ہوں جن کا دیکھنا میری قسمت میں لکھا تھا مجھے یہ بھی معلوم ہو کہ تقریباً یہی یا اس سے ملتی جلتی حالت ہر اس درس گاہ اور تربیت گاہ اور محتاج خانہ کی ہو کہ جس کے انتظام کی ذمّہ داری مسلمانوں پر عائد ہے۔ اس لئے اس مضمون کے ذریعہ سے میں ارباب قوم کی توجہ اس سوال کی طرف منعطف کرانی چاہتا ہوں کہ کیا یہ حالات اس قابل ہیں کہ ہم ٹھنڈے دل سے بیٹھے ہوئے انہیں دیکھا کریں اور قطعاً کوئی مداخلت نہ کریں اور کیا مسلمانوں کے وہ بچّے جنہیں صرف اتفاقات نے ماں اور باپ کی آغوش شفقت سے محروم کر دیا ہے ایسے "سخت مجرم اور گنہگار" ہیں کہ انہیں حکومت کے جیل خانوں سے بھی زیادہ تکلیف دہ گھروں میں رکھا جائے اور پھر رکھا بھی جائے ایسے بزرگوں کی نگرانی میں کہ جن کے دل میں بچّوں کی محبّت' قوم کی ہمدردی اور خدا کا خوف نام کو بھی نہ ہو۔ بدیشی حکومت قابل صد نفرت اور بدیشی مال کا بائیکاٹ ہمارا فرض اولین سہی۔ لیکن کیا یہ غریب بچے بھی بدیشی ہیں کہ قوم نے انہیں دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیا ہے اور کوئی ان کا پرسان حال نہیں ہوتا کہ ان پر کیا گذرتی ہو۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہو کہ ان میں سے بہت سے بچّے ایسے ہیں کہ اگر اُن کے ماں باپ زندہ ہوتے تو اُن کی پرورش' تعلیم اور تربیت ہمارے بچوں سے بھی بدرجہا بہتر طریقے پر ہوتی اور کیا اس حقیقت کے ماننے میں کسی کو تامّل ہو سکتا ہو کہ ان ہی چیتھڑوں اور گدڑیوں میں بہت سے ایسے لعل ہیں کہ اگر اُنہیں مناسب تعلیم میسّر آجاتی تو وہ قوم کے اُن ہزاروں بچّوں سے کہیں اچھّے اور لائق ثابت ہوتے' جن کی سفیہانہ حرکتیں آج قوم کے لئے باعث صد شرم ہیں۔ اگر یہ واقعات ہیں اور اگر ان صداقتوں کو جھٹلایا نہیں جا سکتا تو کیا قوم کو یہ حق حاصل نہیں ہو کہ ان تمام انجمنوں سے جنہیں قوم کی نمایندگی کا دعویٰ ہو اور ان تمام رہنماؤں اور پیشواؤں سے جن کی زبان پر ہر وقت ہائے وطن اور ہائے قوم کے نعرے رہتے ہیں' اتنا پوچھ لے کہ آخر وہ کون سی قوم ہو جس کی نمائندگی کا اہم فرض آپنے اپنے ذمّہ لیا ہے' اور وہ کونسا وطن اور کونسی ملّت ہے جس کا درد آپکے دلوں کو بیچین کئے ہوئے ہے۔ کیا اسی قوم کا جس کے لاکھوں بچوں کو آپ ننگے بھوکے پھرتے یا سڑکوں پر گلّی ڈنڈا کھیلتے دیکھتے ہیں' اور آپ کو پرواہ تک نہیں ہوتی اور کیا اسی قوم کے غم میں آپ گھُلے جا رہے ہیں کہ جس کے ہزاروں بچّے بے قصور اور بے گناہ ان تنگ و تاریک مکانوں میں قیدیوں سے بدرجہا بدتر زندگی بسر کر رہے ہیں کہ جنہیں یتیم خانے کہا جاتا ہو۔ کیا قوم پر ان بچوں کا کوئی حق نہیں ہو' اور اگر ہے تو کیا اُن انجمنوں پر کوئی فرض عائد نہیں ہوتا جو آپس میں صرف اسی لئے لڑا مرتی ہیں کہ تنہا وہی قوم کی نمایندہ قرار پائیں اور ان پیشواؤں کے سر کوئی ذمہ داری نہیں آتی جو باہمدگر صرف اس لئے دست وگریباں ہوتے رہتے ہیں کہ تنہا وہی قوم کے قائد اعظم بنے رہیں۔

حصول سوراج کی کوششیں مبارک' اور کونسل کی ایک ایک کرسی کے لئے صدہا جانوں کا لینا اور دینا بالکل جائز۔

لیکن پھر بھی تو یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ اس سوراج سے اور اس حکومت خود اختیاری سے فائدہ کون اٹھائیگا کیا ہمارے ہی بچے جنہیں ہم نے ان کی تعلیم اور تربیت کی جانب سے غفلت برت کر جنگلی جانوروں سے بھی بدتر بنا دیا ہے؟ اگر خدا نے وہ مبارک گھڑی دکھائی اور کل کو ہندوستان آزاد ہو گیا تو اس آزادی کی قدر کرنے والا کون ہوگا۔ کیا یہی نوجوان جنہیں الف کے نام سے بھی نہیں آتا اور جنہیں دنیا کے کسی برے فعل سے بھی نفرت اور اجتناب نہیں ہے؟ کیا کبھی کسی "نمائندہ انجمن" کو یا کسی "ہمدرد قوم" پیشوا کو بھول کر بھی اس بات کا خیال آتا ہے کہ مکتبوں میں، مدرسوں میں، اور یتیم خانوں میں جا کر ایک نظر ان حالات پر بھی ڈال لیں کہ جن میں وہ بچے تعلیم اور پرورش پا رہے ہیں کہ جن کا نام دس برس کے بعد ہندوستانی قوم ہوگا؟ ہمارے جاہل اور غیر تعلیم یافتہ والدین نے کہ جنہیں والدین کہنے اور سمجھنے سے بھی بہت سے "مہذب" اور تعلیم یافتہ ارباب قوم کو آج شرم آتی ہے کم از کم اتنا ضرور کیا تھا کہ اپنی اولاد کو اپنے سے بہتر اور اپنے سے زیادہ تعلیم یافتہ اور مہذب بنا دیا تھا اور ان کی حقیر کوششوں کا نمونہ آج ہم موجود ہیں۔ لیکن ان سے زیادہ عقلمند اور تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود ہم نے اپنی اولاد کو کیسے اٹھایا ہے، اس کی طرف بھی تو توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ کیا ہمیں اپنی آئندہ نسل سے اتنی سی بھی محبت اور ان کا اتنا سا بھی خیال ہے جتنا اپنے کتوں اور گھوڑوں کا جنہیں روزانہ غسل دلانا اور وقت پر خوراک دینا نماز سے بھی زیادہ پابندی کے ساتھ عمل میں آیا کرتا ہے؟ ہندوستان دوسرا سرسید آج تک نہ پیدا کر سکا وقار الملک کی جگہ صف میں اس وقت تک خالی پڑی ہے، اور حکیم اجمل خاں کی مسند پر بیٹھنے والا قوم میں کہیں نظر نہیں آتا، اور کون نہیں جانتا کہ اس کا باعث صرف یہی ہے کہ ہماری ترقی اور اصلاح کی تمام کوششیں صرف اپنی اپنی ذات تک محدود ہیں۔ ہمیں اس سے قطعاً کوئی سروکار نہیں ہے کہ ہماری آیندہ نسل کیا ہو گی۔ قومی اور اجتماعی زندگی میں اس سے بڑھ کر کوئی اور گناہ نہیں ہو سکتا کہ ہم یہ سمجھنے لگیں کہ جس جو کچھ ترقی کرنی ہے وہ ہم ہی کر لیں۔ فٹ بال اور ہاکی وغیرہ کے کھیلوں میں وہ جماعتیں کبھی بازی نہیں جیت سکتیں جن میں ہر کھلاڑی کی یہ آرزو ہو کہ بس وہ خود ہی گیند کو مقررہ مقام تک پہنچا دے، اور ہمیشہ فتح اور کامرانی اسی ٹیم کے حصہ میں آتی ہے، جس کا ہر کھلاڑی اپنے پیچھے سے آنے والے ساتھیوں کے لئے گیند چھوڑ کر خود آگے بڑھتا ہے، ہم بھی آج فٹ بال کے میدان میں ہیں اور اگر یہ غلطی ہم سے سرزد ہو رہی ہے کہ خود ہی گیند کو لئے بھاگے چلے جا رہے ہیں اور اپنے پیچھے آنے والے ساتھیوں کی مدد سے بے نیاز ہیں، تو ہمارے حصہ میں ناکامی کے سوا اور کچھ نہیں آ سکتا۔ کوئی قوم کبھی اور کسی حالت میں بھی کسی قسم کی ترقی نہیں کر سکتی اگر وہ اپنی آیندہ نسل کو اپنے سے بہتر بنانے کی انتہائی کوشش نہ کرے، جنگ میں فتح صرف ان ہی فوجوں کو نصیب ہوتی ہے جن کے پیش رو دستے اس لئے آگے نہ بڑھیں کہ وہ خود دشمن کے قلعہ پر قبضہ کریں گے، بلکہ صرف اس لئے آگے بڑھتے رہیں کہ خود قلعہ کی خندق میں اوپر نیچے لیٹ کر خندق کو پاٹ دیں گے اور اس طرح پیچھے آنے والے دستوں کے لئے انسانی لاشوں کا ایک پل بن جائیگا۔ اگر ہم اپنی آیندہ نسل کے لئے اس طرح پل نہیں بنا سکتے اور زندگی کی پرخار وادیوں میں ان کے لئے راستہ صاف نہیں کر سکتے تو ترقی، و اصلاح اور بہبود و فلاح کا خیال کرنا بھی بالکل بے سود اور بیکار ہے۔

جس یتیم خانہ کی حالت زار میری نظر سے گذری وہ اپنی نوعیت میں ممتاز یا نرالا نہیں ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ دو ایک کے سوا ہندوستان بھر کے تمام اسلامی یتیم خانے ایسی ہی حالت میں ہیں۔ ایک نگراں یا مہتمم جسے بمشکل پندرہ بیس روپے تنخواہ ملتی ہے ان پر مقرر کر دیا جاتا ہے، اور اسے صبح سے شام تک روزانہ صرف یہی ایک فکر رہتی ہے کہ یتیم خانہ کی آمدنی میں سے کس طرح کوئی حصہ اپنی جیب میں داخل کر لیا جائے یتیموں سے وہ اپنی ذاتی کام اور ذلیل سے ذلیل کام لیا کرتا ہے اور اگر کسی کو اُن کے بجالانے میں تامل ہو تو اس کے احکام "بنوک بید" صادر ہونے لگتے ہیں۔ شہر کے "مخیر" دولت مند جنہوں نے بلا تکلف اپنے "ذوی القربیٰ" کی جائدادوں پر ہاتھ صاف کیا ہے، اکثر ان "یتامیٰ" کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ لیکن اس طرح نہیں کہ یتیم خانہ کو کوئی رقم دیدیں بلکہ اس طرح کہ یتیموں کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ ایک لمبا راستہ طے کرکے ان کے دولت کدے پر حاضر ہوں اور وہاں بیٹھ کر کھانا کھائیں یتیموں کی یہ دعوتیں بالعموم ایسے ہی موقعوں پر کی جاتی ہیں کہ جب گھر میں کوئی تقریب ہو اور اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ "معزز مہمانوں" کے آگے کا بچا ہوا کھانا قوم کے اُن بچوں کے آگے رکھدیا جاتا ہے جن کا حق رشتہ داروں کے بعد خدا نے سب سے زیادہ رکھا ہے، تربیت اطفال کے ماہر خصوصی جناب مہتمم صاحب اپنی چھڑی ہاتھ میں لئے ان بچوں کی ایک باقاعدہ اور قواعد داں فوج بناکر دو دو کی قطاروں میں گائے بھینسوں کی طرح ہانکتے ہوئے لے جاتے ہیں، اور راستہ بھر ان رئیس صاحب کی تعریف بچوں کو سناتے جاتے ہیں جنہوں نے دعوت کی ہے، تاکہ بچوں کو اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ وہ بھیک کے ٹکڑے کھا کھا کر پلے ہیں اور اپنی آیندہ زندگی میں اُنہیں بھیک مانگ کر اپنا پیٹ بھر لینے میں کوئی تامل نہ ہو اور بھیک نہ مریں ان بچوں کے کپڑوں کے متعلق جھوٹ بولنا نہیں چاہتا اور مجھے سچے دل سے اعتراف ہے کہ ان میں سے کسی ایک کو بھی ننگا نہیں دیکھا۔ لیکن یہ ضرور کہنا پڑیگا کہ ان کے کپڑوں میں اور بھیک مانگنے والے فقیروں کے کپڑوں میں اگر کوئی فرق تھا تو اس قدر باریک کہ جسے مہتمم صاحب جیسے دقیق النظر ہی محسوس کر سکتے ہیں۔

بچوں کی جسمانی صفائی کے متعلق یہ تو کامل وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے ہاتھ اور منہ تو اکثر دُھلتے رہتے ہیں لیکن باقی جسم کو دھونے اور صاف کرنے کی رسم خود مہتمم صاحب کے گھر میں بھی ادا نہیں کی جاتی تو پھر بھلا یہاں اس کی توقع کس طرح کی جائے۔ ان کی وضع اور ان کے لباس کی خوشنمائی کا اندازہ اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ عام طور پر لوگ جب کسی بچے کو نہایت ہی بُری وضع کے ڈھیلے ڈھالے اور میلے کچیلے کپڑے پہنے دیکھتے ہیں تو کہا کرتے ہیں کہ یہ یتیم خانے کے کپڑے کہاں سے پہن لئے اور یہ اس "شہرت" کا بہترین ثبوت ہے جو یتیم خانوں کے کپڑوں نے حاصل کر لی ہے، اور جس پر شاید ہر مہتمم یتیم خانہ کو "بجا طور پر فخر" کرنا چاہیئے۔ بچوں کی جسمانی صحت کی طرف غالباً دور اندیش مہتمم صاحب اس لئے توجہ نہیں کرتے کہ اگر وہ خدانخواستہ تندرست ہوئے تو بہت سا کھا جایا کریں گے، اور یہ یقیناً قوم کے لئے نقصان عظیم کا باعث ہوگا۔ یا شاید اس میں یہ راز پنہاں ہو کہ بیمار اور کمزور ہو کر قوم کا یہ "عضو معطل" جس قدر جلد قوم سے ہمیشہ کے لئے الگ ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ منطقی مہتمم صاحب نے ان بچوں کو علم و ہنر سے ناآشنا

رکھنے کی یہ "نہایت ہی معقول" وجہ بتائی تھی کہ پڑھنے لکھنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ آدمی کو کہیں نوکری چاکری مل جائے تو صاحب نوکری اس زمانے میں بغیر سفارش کے بغیر میسر نہیں آتی۔ یہ غریب اگر پڑھ لکھ بھی گئے تو اُن کے لئے سفارش کرنے والا کون بیٹھا ہے جو انہیں نوکری مل جائے۔ پھر بھلا خواہ مخواہ اُن کا وقت "ضائع" کرنے سے بھی کیا حاصل ہے۔ مہتمم صاحب نے کسی قدر فخر کے ساتھ ادھر اُدھر نگاہ ڈالی، جب ہم نے یہ دیکھا کہ اس "مدلل گفتگو" کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ یتیم خانوں کے لئے بالعموم شہر کے مکانوں میں سے کوئی مکان کرایہ پر لے لیا جاتا ہے، اور مکان کے انتخاب کے وقت اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے کہ وہ اتنا بڑا اور وسیع یا خوبصورت اور شاندار نہ ہو کہ اس میں رہ کر بچوں کی عادتیں ہی بگڑ جائے اور آیندہ وہ تنگ و تاریک کوٹھریوں میں یا کسی مسجد یا مکان کی سیڑھیوں پر یا کسی دوکان کے تختہ پر جو باہر نکلا ہوا ہو سوہی نہ سکیں، اور اس طرح یتیم خانہ کے منتظمین پر یہ الزام عائد ہو سکے کہ انہوں نے بچوں کو اس زندگی کے لئے پورے طور پر تیار نہیں کیا تھا کہ جو انہیں آیندہ گذارنی تھی۔ ان حالات اور اس ماحول میں ایام طفولیت اور ابتدائے شباب بسر کر چکنے کے بعد بھی اگر دو چار یتیم کسی یتیم خانہ سے ایسے نکلیں کہ وہ محنت مزدوری کرکے اپنا پیٹ پالنا اور ایماندار شہریوں کی زندگی بسر کرنا پسند کریں تو حق یہ ہے کہ اس کے لئے منتظمین بالکل معذور ہیں کیونکہ دنیا میں بہت سی ایسی روحیں آتی ہیں جو کسی طرح بھی چوری کرنے، فریب دینے یا بھیک مانگ کر کھانے پر آمادہ نہیں ہوتیں، اور یہ چند یتیم اسی قسم کی "تربیت ناپذیر" روحوں کے قالب ہوتے ہیں۔

یہ حالات اور یہ کیفیات اگر صرف یتیم خانوں تک محدود ہوتیں تو شاید میں اتنی جرأت نہ کرتا کہ "اتنی ذرا سی بات" کی طرف رہنمایانِ قوم کی یا باعظمت قومی مجالس کی توجہ منعطف کراتا، قوم میں بفضلہ تاحال نتیجے پیدا کرنے والوں کی کوئی خاص کمی نہیں ہوئی ہے۔ اس لئے اگر دس بیس یا پچاس ہزار یتیم بچے مر کھپ گئے یا آوارہ اور بدمعاش بن گئے تو کروڑوں کی مردم شماری میں ان کا تناسب زیادہ سے زیادہ وہی ہو سکتا ہے جو آٹے میں نمک کا ہوتا ہے۔ اور چونکہ کوئی صفت اس وقت تک نمایاں ہی نہیں ہوا کرتی کہ جب تک اس کی ضد اس کے بالمقابل نہ ہو، اس لئے قوم میں "خیر" کی اکثریت کے بالمقابل "شر" کی یہ اقلیت اور وہ بھی ناقابلِ لحاظ اقلیت قوم کی صفات عالیہ کو اور بھی نمایاں کرنے کے کام آسکتی تھی، لیکن بدقسمتی سے اسکولوں اور مدرسوں میں بھی ہمارے بچوں کی حالت بہت زیادہ قابلِ رشک یا قابلِ اطمینان نہیں ہے اور گو وہاں تعلیم پاکر ان میں سے بہت سے اپنی مراد کو پہنچ جاتے ہیں اور انہیں کہیں نہ کہیں حکومت کے یا ریلوے وغیرہ کے دفتر میں کوئی ٹوٹی پھوٹی کرسی بیٹھنے کو اور ایک اعلیٰ درجہ کا ٹائپ رائٹر دل بہلانے کو مل ہی جاتا ہے، لیکن افسوس یہ ہے کہ ان میں بھی وہ صفاتِ حسنہ ہرگز نہیں پیدا ہوتے جو ایک ترقی کی آرزومند قوم کے بچوں میں ضروری ہیں۔ اسکولوں اور مدرسوں ہی پر کیا منحصر ہے۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ اگر ذرا دقتِ نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہمارے گھروں میں بھی بچوں کی تربیت کچھ بہت بہتر طریقے پر نہیں ہوتی اور ان میں اور یتیم خانوں کے بچوں میں اگر کچھ فرق ہے تو یہی کہ یہ ان سے اچھا کھاتے پہنتے ہیں، اور زیادہ تندرست اور صاف ستھرے رہتے ہیں۔

جن بچوں کے والدین زندہ ہیں وہ خواہ گھروں پر رہ کر زیر تعلیم ہوں یا اسکولوں میں جاکر مجھے اس وقت ان سے بحث نہیں ہو کیونکہ اُن کے ماں باپ اُن کی تعلیم اور تربیت کے لئے ذمہ دار ہیں۔ قوم کی ان ذی اثر ہستیوں اور محترم انجمنوں سے کہ جنہیں اس وقت مسلمانوں کی قیادت کا فخر حاصل ہو میں ادب کے ساتھ یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ دعوتوں کے پرتکلف کھانوں تھیٹروں کے دلکش ترانوں "اور حسین و نوخیز لڑکیوں سے بڑھاپے میں شادی کرنے کی مصروفیتوں سے اگر کبھی کچھ تھوڑی سی فرصت میسّر آجائے تو ذرا اس بات پر بھی غور فرمائیں کہ قوم کے یتیموں کی جانب سے ان کا اس درجہ تغافل اور قوم کے بچوں کی تعلیم کی طرف سے ان کی اس قدر بے پروائی کہیں اس لئے تو نہیں ہو کہ ان بچوں کی خدمت کرنا "سنگ بے نمک لیسیدن" کا ہم معنی ہے "اور ایک ایسی تکلیف ہے کہ جس کا کوئی معاوضہ ملنے کی اُمید نہیں کی جاسکتی۔

(نظام المشائخ)

قید خانے کے دروازے پر

(از جناب منظہر انصاری بی۔ اے)

"ایک طویل سلسلۂ مضامین کی یہ پہلی قسط ہو جو جناب منظہر انصاری نے ازراہ کرم "سعید" کو عنایت فرمائی ہو۔ جناب انصاری نے جرائم کے متعلق علم النفس کا بغور مطالعہ کیا ہو' اور ہمیں اُمید ہے کہ آپ اپنی وسیع معلومات سے اہل ملک کو مستفیذ ہونے کا پورا پورا موقعہ دیں گے۔ یقیناً یہ مبحث اس قابل ہو کہ اہل الرائے اور اہل قلم اصحاب اس کی طرف توجہ فرمائیں۔" ایڈیٹر

(یہ ایک اصلاحی مضمون ہو جس میں ایک ایسے اہم مبحث کی تمہید اُٹھائی گئی ہو جو کم از کم ہمارے عالم ادب میں اب تک بالکل غیر اہم اور ناقابل اعتنا سمجھا جاتا رہا ہے۔ موجودہ زمانے کی تبدیلیاں یہ حقیقت روز بروز آشکار کر رہی ہیں کہ ادب' شاعری' اور اسی نوع کے دوسرے فنون لطیفہ اپنے مقاصد میں اسی وقت کامیاب کہے جاسکتے ہیں جبکہ ان کا منتہائے نظر قوم کی تعمیر ہو۔ آدم کا سپوت" تمام دنیا میں ایک متحدہ بادشاہت کا خواب دیکھ رہا ہو' اور یہ بالکل غلط ہے کہ فطرت کا ہاتھ اُن قوموں کو جو اپنے مختلف پہلوؤں کو مضبوط نہیں بنا رہی ہیں اس مملکت میں سب سے آخری صف میں لاکر بٹھائے۔ حالت جب یہ ہو تو آپ ہی بتائیے کہ اہل ہند کا جرائم پیشہ افراد کی اصلاح کی طرف متوجہ نہ ہونا کس قدر افسوسناک ہو۔ "قید خانے کے دروازے پر" ایک ایسے ہی سلسلۂ مضامین کی پہلی کڑی ہو جو میں اس مبحث پر پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی مجھے بڑی خوشی ہوگی اگر دیگر اہل الرائے حضرات بھی اس ضمن میں خامہ فرسائی فرماکر اس قومی خدمت میں شریک ہونا پسند فرمائیں گے۔ "سعید" کے صفحات غالباً ان حضرات کے لئے کھلے ہوں گے۔ منظہر انصاری)

قیدی اندر داخل ہوا اور جیل کا دروازہ اُس پر بند ہوگیا ——— بڑا خوفناک سماں ہوتا ہے۔

قید خانے کا دروازہ کھلا اور قیدی باہر نکل آیا ——— بڑی خوشی کا موقع ہوتا ہے۔

لیکن یہی خوشی کا موقع اس پہلے خوفناک سماں سے بھی بڑھ کر اندوہناک ثابت ہو سکتا ہے اگر رہا ہونے والے کی ذہنیت میں کوئی تبدیلی لازم نہیں ہوئی ہو۔

اگر ہم یہ بتا سکتے کہ لوگ جرم کا ارتکاب کیوں کرتے ہیں تو ہم یہ بھی بتا سکتے کہ وہ ایک مرتبہ جیل کا مزہ لینے کے بعد بھی جرم کرنے پر کیوں آمادہ ہو جاتے ہیں کیونکہ بہرکیف ایسے لوگوں کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے جن کے لئے ایک مرتبہ قید خانے کی ہوا کھا لینے کے بعد ارتکاب جرم پہلے سے بھی زیادہ آسان ہو جاتا ہے۔ اگر وہ طاقتیں جو انسان کو جرم پر آمادہ کرتی ہیں کبھی کم سے کم حد تک بھی جنون یا پریشان خیالی کا براہ راست اثر کہی جا سکیں تو ہمارے پاس یہ یقین کرنے کے لئے ذرائع موجود ہوتے کہ ہر مرتبہ جب بھی کوئی شخص جرم کرتا ہے وہی طاقتیں کارفرما ہوتی ہیں (اور اگر یہ امر واقعتاً ثابت ہو جائے تو ہر ایک جرم کی وجہ دریافت کر لینا آسان ہو جائیگا) اس کے ساتھ ہی اگر کسی مجرم کی ابتدائی زندگی میں سوشل عناصر یا ماحول سے متعلق اثرات پائے گئے تو ہم یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہوں گے کہ یہی چیزیں مابعد کے جرائم کی بھی محرک ہوئیں۔

اگر کسی مجرم کے پہلے جرم میں غالب عنصر سوشل یا ماحول سے متعلق اثرات کا نتیجہ تھا تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں جیل سے رہا ہونے پر اُس غریب کے لئے حالات اور بھی ناقابل برداشت ہوں گے کیونکہ وہ اُسی حالت میں تو در کنار بلکہ بعض پہلوؤں سے تو اور بھی زیادہ بدتر حالت میں جیل سے باہر نکل رہا ہے جس حالت میں وہ داخل ہوا تھا، اور وہ حالت پہلے ہی ناقابل اطمینان تھی۔ برخلاف اس کے اگر جرم پیشگی کی علت اس میں نسلاً دولیعت ہوئی ہو تو شاید بہشت بریں کے موعودہ محلات بھی اس کی یہ عادت چھڑانے سے عاجز رہیں گے۔

۲ اچھا! اب ہم ایک لمحے کے لئے یہ فرض کئے لیتے ہیں کہ جتنے مجرم سوشل اثرات کے تحت ارتکاب جرم کرتے ہیں بالکل اتنے ہی گنے چنے مجرم نسلی عادت کی بنا پر اس بلا میں گرفتار ہوتے ہیں تو بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تنہا جرم کا نشان بھی سوسائٹی کے دامن پر ایک بدنما دھبا ہے۔

آؤ! ہم ایک رہا ہونے والے قیدی کی صورت حال پر غور کریں، اور بعض بہت ہی ابتدائی باتوں کو نگاہ غور سے دیکھیں ان ابتدائی باتوں کو فراموش کر جانا بادی النظر میں آسان معلوم ہوتا ہے (اور بعض پبلک ریفارمرز اسی لئے انہیں چھوڑ بھی جاتے ہیں) لیکن آگے چل کر یہی باتیں بڑے بڑے اسرار اور معموں کی صورت اختیار کر لیتی ہیں جن کا حل بہت کچھ زور لگانے سے بھی نہیں سوجھتا۔

۱ رہا شدہ قیدیوں کے ساتھ وہ لوگ یقیناً دشمنی کرتے ہیں جو حکومت کے اختیار کئے ہوئے ذرائع کے متعلق دو ایک تعریفی فقرے یا بصورت دیگر دو ایک پھبتیاں کس کر خاموش ہو جاتے ہیں، اور اُن غریبوں کو، جن کے علاج کی درحقیقت ضرورت ہے حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتے ہیں۔ بہتر ہوتا اگر ہم سنجیدگی کے ساتھ معاشرتی پیکر کے اس دوامی مریض حصے کی طرف متوجہ ہوتے اور اس کی صحت یابی کی تدابیر سوچتے۔

رہا شدہ قیدیوں کا بہترین دوست، بہترین بہی خواہ بہترین ہمدرد وہ شخص ہے جو میگزین اور اخبارات میں لمبے لمبے آرٹیکل لکھنے کی بجائے یہ چیز ان کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ جُرم بذات خود ایک تعزیر ہے، اور اگر جرم کرنے کے بعد قانون نے مجرم کو نہ بھی پکڑا تو کم از کم اس کا شرمندہ ضمیر

خود اس کے لئے تمام عمر ضرور تازیانۂ لعنت بنا رہیگا۔ جیل کے اندر اور جیل کے باہر دونوں جگہ یہ طرزِ عمل اختیار کیا جائے اور ہمیں یقین ہے کہ نتائج ضرور خوشگوار ہوں گے۔ حکومت، قانون، سزا، خوف، دھمکاوا ——— ان سب سے بڑھ کر جو چیز اثر کرتی ہے وہ ذہنیت کی تبدیلی ہے۔

ہم اس سلسلے میں چند مفید مطلب تجاویز پیش کرتے ہیں:—

سب سے پہلی چیز قابلِ غور یہ ہے کہ جیل سے نکلتے وقت قیدیوں کے پاس ضرور کچھ نہ کچھ سرمایہ ہونا چاہیئے، اور خصوصیت سے ان قیدیوں کے پاس جو تین یا چار سال جیل کی چار دیواری کے اندر گذار چکے ہوں، امریکہ کے ساٹھ فیصدی قید خانوں میں یہ دستور ہے کہ قیدیوں کو ان کی مزدوری کی اُجرت دی جاتی ہے یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ جتنی سخت محنت وہاں قیدیوں سے لیتے ہیں بالکل اسی تناسب سے مزدوری بھی دی جاتی ہے لیکن یہ بہرحال صحیح ہے کہ امریکہ کے بیشتر جیل خانہ جات قیدیوں کو ان کے کام کی مزدوری دیتے ہیں۔ مسٹر جے، آر، پرکنز امریکہ کے ایک مشہور اہلِ قلم ہیں اور قیدیوں کے معاملات میں خصوصیت سے دلچسپی لیتے ہیں۔ صاحب موصوف کا بیان ہے کہ بعض قیدیوں کے متعلق مجھے معلوم ہوا کہ انہوں نے جیل میں ایک ڈالر روزانہ کمایا جبکہ معمولی مزدوری کی اوسط آمدنی جیل سے باہر صرف پچاس سینٹ تھی۔ اس حساب سے دو سال جیل میں رہنے کے بعد ایک امریکن قیدی سات سو ڈالر اپنی جیب میں لئے جیل سے باہر آ سکتا ہے۔ کیونکہ جب تک وہ جیل میں رہتا ہے اپنے ذاتی اخراجات کے لئے تو اسے اپنی گرہ سے کچھ دینا ہی نہیں پڑتا، اس کی ذمہ دار تو گورنمنٹ ہے، اس لئے اپنی کمائی صحیح سلامت لے کر وہ اپنے گھر لوٹ سکتا ہے، گویا یوں سمجھئے کہ ایک قیدی اچھا خاصا سرمایہ دار بن جاتا ہے اب اگر اس کے آگے پیچھے کوئی نہیں ہے اور مجرموں کے آگے پیچھے عموماً کوئی ہوتا بھی نہیں، تو اسے کُلّی اختیار ہے کہ سرمایہ کسی معقول تجارت میں لگا دے اور باقی زندگی آرام سے بسر کرنے کا سامان مہیا کرے اور اگر یہ نہیں تو اور بہت سی لائنیں کھلی پڑی ہیں اور زندگی کو فارغ البالی سے گذارنے کے لئے خواہ کوئی بھی راستہ کیوں نہ ہو اختیار کیا جا سکتا ہے۔

ایک دوسری چیز یہ ہے کہ قیدیوں کے لئے ضرور کوئی نہ کوئی ہنر یا دستکاری سکھانے کا بندوبست ہونا چاہیئے۔ ایک ایسا شخص جسے قید خانے سے نکلنے کے بعد سوسائٹی بہ نظرِ کراہ دیکھیگی اگر کسی ہنر یا دستکاری یا کسی اور مفید پیشے سے واقف ہو تو ظاہر ہے کہ اپنے گذارے کا بہتر انتظام کر سکیگا۔

یہاں ایک بڑا اہم سوال ہوتا ہے اور اسی سوال کا جواب دیئے بغیر ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔

سوال یہ ہے کہ ایک رہا شدہ قیدی کو دنیا اپنے کسی پیشے میں بھی لینے کے لئے تیار ہوگی؟ ہم اس سوال کا جواب دو پہلوؤں سے دیتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ایک رہا شدہ قیدی کے لئے بہتر سے بہتر مواقع حاصل ہو سکتے ہیں۔ بشرطیکہ اس کے زمانۂ گذشتہ پر تاریکی کے پردے پڑے ہوئے ہوں یہ کام کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے اور اگر ایک شخص ہمت کرے تو بڑی آسانی سے اس کا بندوبست کر سکتا ہے کہ کسی متنفس کو بھی اس کی گذشتہ زندگی کے حالات معلوم نہ ہوں، اور اپنے عیبوں کو چھپانا نہ تو کوئی بُری بات ہے نہ اخلاقی جرم، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ اگر کچھ عرصے کے بعد حقیقت کے چہرے سے نقاب ہٹ گیا تو نقصان بھی بہت زیادہ اُٹھانا پڑیگا۔ تاہم ہم یہی کہیں گے کہ ایسے نقصان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے (جو بہرحال ایک عارضی چیز ہے)

اس قسم کی کوشش سے کبھی احتراز نہ کیا جائے۔

لاتعداد مثالیں ایسی دی جا سکتی ہیں جن میں صحیح حالات معلوم ہو جانے پر رہا شدہ قیدیوں کو الگ کر دیا گیا لیکن ایسی گنتی کی صدہا مثالیں ایسی بھی ہیں کہ لوگوں نے حالات کو نامعلوم رکھ کر کام شروع کیا اور رفتہ رفتہ اتنا اعتماد حاصل کر لیا کہ صحیح صحیح واقعات معلوم ہو جانے کے بعد بھی مالکان نے انہیں ملازمت سے سبکدوش کرنا مناسب نہ سمجھا۔

ہاں ایک چیز ضرور سدِ راہ ہے کہ مالکان صنعت و حرفت قید خانوں کے حالات سے عموماً باخبر رہتے ہیں اور ایسی حالت میں رہا شدہ قیدیوں کے لئے جگہ تلاش کرنا دشواری کا باعث ضرور ہوگا۔

میں بہت سی کمپنیوں سے واقف ہوں جنہوں نے جیل سے نکلے ہوئے آدمیوں کو اپنے کاروبار میں شامل کرنے سے انکار کر دیا مگر اس کے ساتھ ہی بہت سی ایسی کمپنیاں بھی ہیں جنہوں نے بغیر کسی قیل و قال کے ایسے آدمیوں کو اپنے کاروبار میں جگہ دیدی۔ عام طور سے اگر کسی فرم یا کمپنی کو ایک آدمی کی ضرورت ہو اور کوئی رہا شدہ قیدی اس جگہ کو پُر کر سکے اور اپنے متعلق کسی قابلِ اعتماد آدمی کی ضمانت بھی لے آئے تو سو میں سے صرف پانچ فیصدی اس امر کا امکان ہے کہ اسے جواب دیا جائیگا ورنہ عام طور سے رکھ ہی لیا جاتا ہے، یہ ضرور ہے کہ ایسے زمانے میں جبکہ عام بے روزگاری کا چرچا ہے متذکرہ صدر لوگوں کا معاملہ خاصی اہم صورت اختیار کر لیتا ہے، اس بات پر زور دینا غالباً درست نہ ہوگا کہ مالکان کمپنی کی ایک بڑی تعداد رہا شدہ قیدیوں سے نالاں نظر آتی ہے۔ اس بحث میں ہم یہاں پڑنا نہیں چاہتے مگر اشارۃً اتنا ضرور کہیں گے کہ صدہا مالکان کمپنی اس قسم کے نوکروں سے بیحد خوش بھی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ایک عام قیدی کی ذہنیت ایک عام آدمی کی ذہنیت سے پست تر واقع ہوتی ہے۔

ہم اس سے بھی انکار نہیں کرتے کہ صدہا قیدیوں کو باوجود بہتر اثرات سے کام لینے کے بھی ان کی مجرمانہ حرکات سے باز نہ رکھا جا سکا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ فراموش نہ کرنا چاہئیے کہ صدہا قیدی ایسے بھی ہیں جو رہا ہونے کے بعد ہی کاروبار میں مصروف ہو گئے اور آج مہذب شہریوں کی زندگی گذار رہے ہیں۔

ان قیدیوں کی صورت حال بہت زیادہ قابل توجہ ہے جن کا عرصۂ قید دس سال سے اوپر اوپر ہے، معمولی ترکیبوں سے ان کے معاملے میں کام نہیں لیا جا سکتا۔ ایسے ویسے ہتھکنڈوں سے ان کا قابو میں آنا مشکل ہے۔ جیل میں رہتے رہتے وہ باہر کی دنیا کو بھول جاتے ہیں اور سچے دل سے یہ یقین کرنے لگتے ہیں کہ ہماری خلقت ہی مجرم ہے، اور ہم دنیا میں صرف جرم کرنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ ایسے مجرموں کی عادات کو اس ڈھنگ سے بدل دینا کہ جیل سے باہر نکلنے کے بعد باقی دنیا کے دوش بدوش خدمات انجام دے سکیں نہ صرف دشوار بلکہ محال بھی ہے۔

ہماری سوسائٹی آدمی کو جیل میں ٹھونس دیتی ہے اور پھر خاموش ہو رہتی ہے۔ جیل میں ٹھونستے وقت وہ ضرور اس کے معاملے میں دلچسپی لیتی ہے لیکن جیل سے نکلتے وقت اس میں دلچسپی لینا تو کجا، اعتنا کی نظر بھی نہیں کرتی۔ اب جیل کی چار دیواری سے نکل کر وہ غریب کیا کرے، بالکل یکہ و تنہا، سوسائٹی سے بیگانہ ہر شے سے ناواقف۔ جائے تو کدھر، چھپے تو کونسے کونے میں، اور کرے تو کیا کام۔ سراسیمگی ایسی ہی حالت کو کہتے ہیں، اور یہ واقعہ ہے کہ سوسائٹی نے اس امر میں بہت ظالمانہ رویّہ اختیار کر رکھا ہے۔ جرم کی نوعیت خواہ کتنی بھی معمولی کیوں نہ ہو لیکن ہمارا معاشرتی

نظام کچھ اس طرح واقع ہوا ہے کہ ہم اپنے آپ کو اس غریب سے متنفر پاتے ہیں۔ اس ذہنی تعصب کی پٹی کو آنکھوں سے اُتار کر ہمیں سوچنا چاہیئے کہ آخر کب تک سوسائٹی کے اس حصّے کو جو تھوڑی سی توجہ سے کارآمد بن سکتا ہے، بیکار ضائع ہوتا دیکھیں گے۔

اُدھر رہا شدہ کو قیدی کو بھی چاہیئے کہ وہ صبر و شکر کے ساتھ اپنی غلطی کا خمیازہ بھگتے اور کمر ہمت باندھ کر گذشتہ کوتاہیوں کا ازالہ اپنے حال اور مستقبل کی کوششوں سے کرنے کے لئے تیار ہو جائے۔

سوسائٹی اُس کے لئے کوئی آسانی بہم نہیں پہنچا سکتی، اور اور نہ وہ لوگ اس کی کوئی مدد کر سکتے ہیں جنہیں سوسائٹی کے ستون کہا جا سکتا ہے —— یہ واقعہ ہے اور ایک رہا شدہ قیدی جتنے جلدی بھی اس سے آگاہ ہو جائے بہتر ہے۔

آسانیاں بہم پہنچنے کا جہاں تک تعلق ہے، یہ میدان اُسے اُن نام نہاد "قومی خادموں" کے واسطے چھوڑ دینا چاہیئے، جو بناوٹی رونا رو کر، ٹسوے بہا کر، خواہ مخواہ کی سرگرمیاں دکھا کر اپنی جیبیں بھر لیتے ہیں اور پھر اپنے خود غرضانہ مفاد کے لئے قوم کے گلے پر بلا تأمل چھری پھیر دیتے ہیں۔ اسے سمجھ لینا چاہیئے کہ عزّت کی نگاہیں اس کی بجائے ان لوگوں پر پڑنے کے لئے ہیں جن کی کُلاہ افتخار میں "خطابات" کی جھلملاتی کلغیاں لگی ہوئی ہیں اور جو قوم و ملک کے مفاد کو اپنی انفرادی شان و شوکت کی بقا پر بلا دھڑک قربان کر رہے ہیں۔۔۔۔

اور۔۔۔۔۔ اسے جان لینا چاہیئے کہ۔۔۔۔

یہ سب کچھ ہونے کے باوجود بھی قوم اتنی سوئی ہوئی ہے کہ وہ سوسائٹی کے گرتے ہوئے فرد کو سنبھلنے میں مدد نہیں دے سکتی —— صرف دور سے کھڑی تماشا دیکھ سکتی ہے۔

مگر پھر بھی اسے ہمت نہیں ہارنی چاہیئے۔ حق و صداقت کی قوتیں، مظلوم کو ظالم کے پنجے سے چھڑانے والی جبروتی طاقتیں ہر بیکس کا حال دیکھتی ہیں اور اس کی مدد کو آتی ہیں۔ ایک اچھا شہری بننے کے لئے اسے ہر وقت کوشاں رہنا چاہیئے اور وہ ضرور کامیاب ہوگا۔

یہ خیال غلط ہے کہ خلوص دب جاتا ہے، یہ خیال غلط ہے کہ صداقت فنا ہو جاتی ہے۔۔۔۔ کام کرو کام کا اجر ملیگا۔ ایک رہا شدہ قیدی کے لئے، انسانی کارواں کے ایک ایسے فرد کے لئے بھی جو ہم سے بچھڑ کر غلط راستہ پر جا پڑا تھا اور اب واپس لوٹ آنا چاہتا ہے —— ہاں اُس کے لئے بھی ہمارے قصر رواداری کے دروازے ہر وقت کھلے ہوئے ہیں اور وہ ہمارے بھائی چارے کا، جب چاہے، شریک ہو سکتا ہے۔

تمام دنیا کو پریم کا سبق دینا ہمارا پہلا فرض ہے۔۔۔۔۔

محبت کے راگ سے دیش کے باسیوں کو آشنا کرنا ہمارا نصب العین ہے۔۔۔۔۔۔

پیار کی لوریاں دے کر حرص و بغض اور ظلم و عدوان کے دیو بچّوں کو موت کی گہری نیند سلا دینا ہماری حیات کا منتہا ہے۔۔۔۔۔ تو پھر تو کیوں اس سے محروم رہے۔۔۔۔۔

بھٹکے ہوئے بھائی —— آ —— ہم اور تو گلے ملیں اور پھر اچھے شہری بن جائیں۔

"سعید" کہاں سے مل سکتا ہے؟

پشاور میں — صادق نیوز ایجنسی بازار قصہ خوانی سے۔

حیدرآباد میں — محمد صالح صاحب ایجنٹ اخبارات سعید بازار عابد سے

رنگون میں — عبدالرزاق خاں صاحب فیض آبادی نیوز ایجنٹ بارا سٹریٹ سے



پریتم کا پریم

(ایک بنگالی شاہکار ادب)

میدان میں جھیل نرمل جل سے لبریز ہے، کنارے پر ہنس کا جوڑا کلیلیں کر رہا ہے ـــ کنول کے پھول غرورِ حسن کی بادۂ رنگین سے سرشار ہو کر جھوم رہے ہیں، محبت کا مارا بھونرا دفورِ شوق میں ان کے گرد منڈلا رہا ہے ـــ لیکن بادِ نسیم کے سرد جھونکے دستِ اجل بن کر بھونرے کو اتنی مہلت نہیں دیتے کہ وہ اپنے محبوب کنول کے پھول کا عارضِ رنگین چوم سکے۔ اے سکھی ـــ! سچ بتانا پریتم کا پریم ان خوبصورت پھولوں میں چھپا ہوا ہے یا متوالے بھونرے کے دل میں! ـــ !!

سورج کا دیوتا اپنی سنہری رتھ پر سوار ہو کر کرنوں کا نیزہ ہلاتا ہوا پورب سے نکلتا ہے۔ زمین چاروں جانب اس کے نور سے جگمگا رہی ہے ـــ اے سکھی سچ بتانا ـــ ! کیا پریتم کا پریم سورج کی کرنوں میں پوشیدہ ہے؟! مگر نہیں سکھی دیکھ میری آنکھیں تو بے نور ہو رہی ہیں۔ رات رات بھر پریتم کی یاد میں جاگتی ہوں، اشکِ حسرت بہاتی ہوں، اگر میرے پریتم کا پریم سورج کی کرنوں میں پوشیدہ ہوتا تو میری آنکھیں اس قدر بے نور نہ ہوتیں! (ریاست)

ہندوستانی شوہر ایک فرنگن کی نظر میں

ہندوستانی شوہر کے سب سے بڑے عیب دو ہیں۔ غلاظت اور غلامانہ ذہنیت، ہندوستان کا مرد ''صفائی'' کے مفہوم سے ناآشنا ہوتا ہے اور اپنی یورپین بیوی سے وہی برتاؤ کرتا ہے جو وزیرِ اعظم برطانیہ یا وائسرائے سے کر سکتا ہے، اُس کے خیال میں ہر سفید چمڑے کا انسان مرد ہو یا عورت اُس کا حاکم ہے۔ (امین)

امریکہ کی فردِ جرم

امریکہ کے مشہور شہر شکاگو میں دس ہزار سے زائد جرائم پیشہ اس وقت آزاد پھر رہے ہیں۔ نیویارک میں ۳۰ ہزار ان کی تعداد ہے۔

وٹ ورآیٹ اور ممفس میں ان کی تعداد اس سے بھی زائد ہے۔ امریکہ میں ہر سال ۲۰ کروڑ اور ۳۰ کروڑ پونڈ کے درمیان یہ غارتگر لوٹتے رہتے ہیں۔ یہ بدمعاش انسانوں کے قتل کر ڈالنے میں اتنا بھی دریغ نہیں کرتے جتنا ایک دیوانے کتے کے گولی مارنے میں کیا جاتا ہے'' انسانی زندگی سے متعلق جو شقاوت و بیدردی آج امریکہ کے بڑے بڑے شہروں میں پائی جاتی ہے اس کی نظیر سے

شاید انسانیت کی تاریخ خالی ہو۔

ڈاکوؤں کے سردار ال کیپون نے شراب، جوئے، افیون اور حرام کاری کے اڈے کھول رکھے ہیں، اور پانچ برس میں ان ذرائع سے ایک کروڑ ۴۰ لاکھ پونڈ کی دولت حاصل کرلی ہے ۱۹۲۹ء میں امریکہ کی شرح قتل انسانی برطانیہ سے ۱۲ گنی زائد تھی۔ دس برس کے عرصہ میں اس میں فیصدی ساڑھے تین سو کا اضافہ ہوگیا ہے۔"

یہ اقتباسات پروفیسر ڈبلو ٹی مارگن کے مضمون "جرائم امریکہ" سے ماخوذ و منقول ہیں، جو رسالہ "کنٹمپری ریویو" (لندن) کے فروری نمبر میں شائع ہوا ہے اور "لیڈر" کے توسط سے ہندوستان میں شائع ہوا ہے ہمارے "روشن خیال مصلحین" جو اس دھن میں لگے ہوئے ہیں کہ ہندوستان کو بھی جس طرح ممکن ہو، امریکہ بنادیں۔ امریکہ کے تمول و امارت، موٹر کاروں اور بلند کوٹھیوں کے ساتھ امریکہ کے قاتلوں اور خونیوں، ڈاکوؤں اور رہزنوں، بدمعاشوں اور اوباشوں کو خدا معلوم کیوں بھولے ہیں! "صاحب" کی زبان سے اب تک سنایہ تھا اور ہم نے بھی اسی آموختہ کو دہرانا شروع کردیا تھا کہ افلاس اور ناخواندگی ہی سارے جرائم کی جڑ ہے، پھر یہ کیا فطرت کی ستم ظریفی ہے کہ جو ملک دنیا میں سب سے متمول و تعلیم یافتہ ہے، وہی سب سے زیادہ جرائم پیشہ بھی ہے! (دیج)

بھکاری کی بھیک

(ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کی تازہ سحر طرازی)

میں بدھ کے نام پر یہ کشکول گدائی لیکر نکلا ہوں۔

اے بستی والو! اُٹھو اور جو کچھ تمہارے پاس ہو مجھے دیدو۔

سرسوتی کے شاہی شہر میں یہ آواز گونجتی ہے۔ مشرق میں سپیدۂ سحری دمک رہا ہے، لیکن اہل شہر ابھی مصروف خواب ہیں ——— کوئل کوک رہی ہے، مرغان نوا سنج کے نغمے فضا میں گونج رہے ہیں ——— پکارنے والا پکار رہا ہے ؎

اٹھو سونے والو سحر ہو رہی ہے

یہ صدا شہنشاہ سنتا ہے وہ اپنی طاقت کو ہیچ سمجھتا ہے دولتمند کی نگاہوں کو دنیا فانی نظر آتی ہے اور وہ اسے ترک کرنا چاہتا ہے۔ ایک لڑکی اپنے بستر پر آنسو بہاتی ہے ——— لیکن اسے خود نہیں معلوم کہ وہ کیوں رو رہی ہے۔

دنیا کی تمام مسرتیں بوسیدہ اور گلے سڑے پھولوں کی طرح ہو جاتی ہیں۔

کھڑکیاں کھلتی ہیں، عورتیں اور مرد صبح کی دھندلی روشنی میں جھانکتے ہیں، اور انہیں ایک سادھو کی صورت نظر آتی ہے وہ گلیوں میں تنہا گشت کرتا ہے، سوداگر اس کی خدمت میں جواہرات پیش کرتے ہیں، لیکن وہ قبول نہیں کرتا۔ وہ اپنا کشکول گدائی بلند کرکے چلاتا ہے۔

"اے بستی والو، مجھے اپنے مالک کے نام پر سب سے زیادہ بیش قیمت چیز دو۔"

شہنشاہ شہر کو واپس آجاتا ہے، سوداگر اور دولت مند منھ لٹکائے ہوئے واپس آتے ہیں، کسی کا تحفہ بھی سادھو کے لئے قابل قبول نہیں۔ نیا بھکاری پایہ تخت کی تمام دولت کو ٹھکرا چکا ہے۔

وہ مال اور محلوں کو چھوڑ کر ایک تاریک گلی میں داخل ہوتا ہے، ایک غریب عورت اس کی فریاد سنتی ہے اور اپنی شکستہ جھونپڑی سے باہر نکلتی ہے۔ وہ سادھو کے قدموں کی خاک چھوکر احترام کچھ دیر پیر سلنے کے لئے کہتی ہے، دروازہ کی اوٹ میں وہ اپنے پہنے ہوئے کپڑے جسم سے اُتارتی ہے اور ہاتھ بڑھاکر سادھو کو دیدیتی ہے۔ اُس کے پاس جو کچھ تھا اُس نے نذر کردیا اب وہ برہنہ دروازہ کے پیچھے کھڑی ہے۔

سادھو کا چہرہ فطرت مسرت سے کھل گیا۔ اس کی زبان سے نکلا۔" دھنیہ ہے، تجھ کو ماتا، تو نے جو راجہ کی دولت سے قیمتی چیز مجھے دی"

سادھو نے ان چیتھڑوں کو اپنے کلیجہ سے لگا لیا اور اپنے مالک کی خدمت میں پیش کرنے لے گیا، وہ خوش تھا —— مدتوں کی تلاش کے بعد اس کا سوال آج پورا ہوا تھا —— اُس نے بادشاہوں کے محلات کے سامنے آوازیں دیں دولتمندوں کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ سوداگروں کے سامنے دست سوال دراز کیا —— لیکن کوئی شخص اُسے وہ چیز نہ دے سکا جو اس کے کشکول گدائی کے لائق ہوتی —— آج ایک غریب بڑھیا نے اس کا سوال پورا کیا، جو کچھ اس کے پاس تھا خدا کے نام پر قربان کردیا، اس کا نذرانہ اس قدر بیش قیمت تھا کہ اس پر تمام دنیا کی دولت قربان ہوتی تھی۔

(ریاست)

روس میں مزدوروں کی تعلیم کا حیرت انگیز انتظام

مختلف فنون کے اسکولوں اور یونیورسٹیوں کی تعداد

روسی گورنمنٹ کے سامنے جو پنج سالہ اسکیم درپیش ہے اس کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ ملک میں ایسے لوگوں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے جو صنعت و حرفت کے ماہر ہوں۔ چنانچہ بالشویک حکومت ارادہ کررہی ہے کہ موجودہ ۱۶ ہزار انجینئروں کی تعداد کو بڑھاکر ساٹھ ہزار کردی جائے ساٹھ ہزار دیگر ماہرین کو ۹۰ ہزار کردیا جائے اور ۳۵ ہزار ایسے لوگ پیدا کردیئے جائیں جو فن زراعت کے استاد ہوں۔ اس وقت روس میں یونیورسٹی کے پیمانہ پر ۱۸۸ ٹیکنیکل اسکول ہیں۔ اس سے کم درجہ کے اسکولوں کی تعداد ۳۶۶۳ ہے۔ زراعتی درسگاہوں کی تعداد ۳۲۱۱ تک پہنچ چکی ہے۔ جن میں ۱۰۶۸ اسکول یونیورسٹی کے ہم پلہ ہیں۔ اعلیٰ اور اول میں جو طلباء تعلیم حاصل کررہے ہیں ان میں سے نصف طلباء کو ستر روبل (روسی سکہ) تک ماہوار وظیفہ دیا جاتا ہے اسی طرح زراعتی اسکولوں کے تین چوتھائی طلباء کو بھی وظائف دیئے جاتے ہیں۔

امسال "ورلیڈ" میں (جہاں ۲۵۰۰۰ ایکڑ زمین زراعت کے لئے موجود ہے) چھ سو نوجوان طلباء زراعتی اسکولوں میں داخل ہوئے گذشتہ سال ان کی تعداد چار سو تھی، آیندہ سال طلباء کی تعداد آٹھ سو تک پہنچ جائیگی۔ تعلیم کی یہ تحریک مزدور پیشہ لوگوں کے لئے بہت مفید ثابت ہوئی ہے اور ان کو تعلیم اس وقت دی جاتی ہے جب وہ اپنے کام سے فارغ ہوتے ہیں، مزدوروں کو صبح کے وقت کھلی اور صاف ہوا میں تعلیم دی جاتی ہے اور مختلف مسائل پر لیکچروں کے ذریعہ اظہار خیال کیا جاتا ہے۔

گذشتہ سال روس کی سرخ فوج کے ایک لاکھ آدمی ملک کے مختلف حصص میں روانہ کئے گئے، جن میں سے ۲۵ ہزار آدمیوں نے ڈرائیوری کا کام سیکھا۔ ۲۲ ہزار نے مویشیوں کی غور و پرداخت میں مہارت حاصل کی۔ ۱۳ ہزار نے زراعت میں حصہ لیا۔ ۱۲ سو نے باغات کے کام کو سنبھالا، ۱۷ ہزار ۵ سو نے زراعتی تنظیم کا کام انجام دیا، اور باقی تیرہ ہزار ۵ سو مختلف کاموں پر مامور ہو گئے۔ (الجمعیۃ)

مُسلمان بننے کی راہ

جس وقت عرب کے ملک میں اسلامی قومیت کی تعمیر ہو رہی تھی، اس کے داہنے اور بائیں دو اور قومیتیں موجود تھیں، ایک طرف ایرانی قومیت اور دوسری طرف رومی شہنشاہی وطنیت، مگر عرب کی نئی قومیت کے اخلاق نے نہ ادھر دیکھا اور نہ ادھر کہ ان دونوں کی کمزوریاں آشکارا تھیں، بلکہ وہ اپنے لئے ایک تیسری قومیت کا مسالہ تیار کرتا رہا، اور بالآخر ایک نئی قوم بنا کر کھڑی کر دی جس نے آن کی آن میں دونوں گذشتہ قومیتوں کو تہ و بالا کر کے ان کو اپنے میں مدغم ہو جانے پر مجبور کر دیا۔

مسلمان اگر آج مسلمان ہیں تو اس نکتہ پر غور کریں کہ محمد رسول اللہ صلعم نے اپنی نئی قومیت کی تعمیر کے وقت یہ نہیں کہا کہ اے مسلمانو! تم ایرانیوں کی طرح بن جاؤ تو درفش کاویانی جیسا علم تمہارے سروں پر لہرانے لگے، یا اے مسلمانو! تم رومیوں کی طرح بن جاؤ تو عالمگیر شہنشاہی کے تخت پر تم کو بیٹھنا نصیب ہو، بلکہ جب کہا تو یہی کہا یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اٰمِنُوْا۔ اے ایمان والو! ایمان والے بن جاؤ! یعنی اے بے مثال قوم والو! اپنی قوم آپ بن جاؤ۔

پھر یہ کیا بدبختی ہو کہ آج مسلمانوں کے نزدیک ان کے مسلمان بننے کی صرف دو راہیں ہیں، کچھ کے نزدیک یہ کہ تمام مسلمان یک لخت فرنگی بن جائیں اور بعضوں کے نزدیک یہ کہ وہ ہندی بن جائیں، اور مسلمان بننا اب مسلمان بننے کے لئے ضروری نہیں رہا تو خدارا بتاؤ کہ یہ پوری قوم کی قوم کو ایک دوسری قوم میں مدغم ہو جانے کی صریح دعوت ہے یا نہیں؟" (معارف)

"دُور کے ڈھول سُہانے"

یُورپ میں ٹیکس، فاقہ اور مصیبت

ذیل کے مضمون میں یہ دکھلایا گیا ہے کہ متمول ترین مغربی ممالک میں مختلف ٹیکسوں کا موجودہ بار کتنا ہے اور عوام کی اقتصادی حالت پر اس کا کیا اثر ہے۔

فرانس

فرانس میں لوگوں کو دن بھر میں تقریباً ساٹھ قسم کے ٹیکس کسی نہ کسی صورت میں ادا کرنے پڑتے ہیں، ایک ٹیکس غیر شادی شدہ لوگوں پر ہے، دوسرا جنگ کی بیواؤں اور یتیموں (اگر وہ لوگ مکان میں رہتے ہوں) اسی طرح بیئر، شراب، مکان کرایہ، آمدنی، تنخواہ اور تقریباً ہر چیز پر جو کسی دوکان میں بکتی ہو ٹیکس لگا ہوا ہے، اگر کوئی شخص اپنے کتے کو باہر سیر کرانے کے لئے لے جاتا ہے تو اسے ٹیکس دینا پڑتا ہے، اگر نکٹائی خریدنا ہو تب بھی ٹیکس ادا کرنا لازمی ہے، اگر اپنے گھر کی کھڑکی سے جھانکنا ہو تب بھی اس کو ٹیکس دینا پڑتا ہے، کیونکہ فرانس میں کھڑکیوں پر بھی ٹیکس موجود ہے، چہرے کے پاؤڈر اور رنگ پر بھی ٹیکس لگے ہوئے ہیں۔

جرمنی

جرمنی کے تمام بڑے بڑے شہر دیوالیہ ہونے کے قریب ہیں

خودکشی کے واقعات روزانہ ہوتے ہیں، اور کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ گھر کا گھر خودکشی کر لیتا ہے، جن دولت خانوں میں عیش و عشرت کے سامان مہیا تھے وہاں روشنی کے لئے صرف ایک موم بتی جلائی جاتی ہے۔ لوگوں کے لباس اچھے ہیں، لیکن چہرے پر بھوک کے آثار نمایاں ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ٹیکس سے لوگ پسے جاتے ہیں۔ ہر قسم کی آمدنی پر دس فیصدی ٹیکس لگا ہوا ہے اور اگر وقت پر ادا نہیں کیا جاتا تو اس پر ۲۰ فیصدی سود کا اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ ناچ گھر، تھیٹر اور سینما جانے والوں کو بھی ٹیکس دینا پڑتا ہے۔

اطالیہ

یہاں تو لوگوں کا کھانا کپڑا اور سونے کا بستر سب کچھ مسولینی کے زیر احکام ہے، اگرچہ سرِدست ٹیکس بہت زیادہ نہیں، لیکن صحیح حال اُس وقت معلوم ہوگا جب بجٹ میں پونے دو کروڑ پونڈ کے متوقع خسارہ کا اعلان ہوگا۔

ناروے اور سویڈن

ناروے میں رہائشی مکانات اتنے کم ہو گئے ہیں کہ چھوٹے چھوٹے جہازوں کو مکانات میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔ سویڈن کے جدید بجٹ میں آمدنی پر غیر معمولی ٹیکس اور تمباکو و شراب پر مزید ٹیکس شامل ہیں۔

آسٹریا

یہاں تمام قصبات کو فاقوں کا مقابلہ درپیش ہے، ہزاروں لڑکوں کو کلیساؤں سے ایسا خیراتی کھانا دیا جا رہا ہے جو جانوروں کے لائق بھی نہیں۔ وہاں نہ دوکانیں ہیں، نہ کام ہے، نہ مزدوری ہے اور نہ معاوضہ ہے۔ ایک شہر میں ایک سائیکل فیکٹری جس میں ۱۵۰۰ مزدور کام کرتے تھے بالکل ویران پڑی ہے، دوسرے شہر کے باشندے اطالیہ میں بھیک مانگنے کے لئے ایک مہم کی ترتیب میں مصروف ہیں، ہر جگہ کھانے اور کوئلے کی بہم رسانی گھٹتی جا رہی ہے۔

روس

روسی ہوٹلوں کے باہر دُبلے اور بھوکے آدمی دکھائی دیتے ہیں، قیمتیں بہت زیادہ ہیں، اور مکانوں میں کینوں کی غیر معمولی کثرت ہے۔ ماسکو اور دیگر شہروں میں ایک ایک کمرہ تین تین خاندانوں کی رہائش کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، جوتوں کی قیمت کئی پونڈ تک پہنچ گئی ہے۔

ہسپانیہ

ہزاروں مرد عورتیں اور بچے جانوروں کی طرح پہاڑ کے غاروں میں رہتے ہیں، درختوں کی جڑیں کھاتے ہیں، اور گندے چشموں کا پانی پیتے ہیں۔ ہنرمند کاریگر تو پانچ شلنگ روزانہ کما سکتے ہیں لیکن مزدوروں کی اکثریت بے ہنر ہے، اور ہزاروں گھرانے اچھی غذاؤں سے محروم ہیں۔ اسکول صرف برائے نام ہیں، ہسپتال نہیں ہیں اور پانی کی نکاسی کا نظام اتنا بُرا ہے کہ بارسلونا میں پچھلے نول پلیگ پھیل گیا تھا۔

امریکہ

امریکہ میں بھی جرمنی کی طرح اکثر شہر دیوالیہ ہو گئے ہیں شکاگو میں پولیس اور ٹیچروں کی تنخواہیں ادا نہیں کی گئی ہیں۔ اسکول بند ہونے والے ہیں، اور صحت عامہ کے محکمے مفلوج ہو گئے ہیں۔ ڈیٹرائٹ میں کم از کم تین آدمی روزانہ فاقوں سے مر جاتے ہیں، مصیبت سے سینکڑوں آدمی دیوانے ہو رہے ہیں۔ نیویارک میں تین لاکھ بیکار آدمی رات کو راستوں پر سوتے ہیں، بھوکے مزدور ملک میں بھیک مانگتے پھرتے ہیں۔ "زمین"



لُکنت
اِس کی پیدائش اور علاج

(از حضرت مجور میرٹھی)

لُکنت جس کا دوسرا نام عقدۃ اللسان ہے، ہندی میں اس کو ہکلانا اور انگریزی میں اسٹیمرنگ (Stammering) کہتے ہیں۔ یہ کوئی پیدائشی بیماری یا اصولی مرض نہیں بلکہ عرض ہے جو اکثر ہکلوں کی نقل کرنے سے بھی عارض ہوتا ہے، اور نقل کرنے والے کو بھی مرض متعدی کی طرح چمٹ جاتا ہے، جلد جلد بولنے اور بات کرنے والے اس عیب میں علی العموم جلد گرفتار ہو جاتے ہیں۔ لکنت کی پیدائش جس طرح طبی تشریحات سے مستغنی ہے، اسی طرح اس کا علاج بھی اجزائے ادویہ سے بے نیاز ہے۔ اہل حکمت جانتے ہیں کہ ناطقہ یا گویائی ادراک و احساس کی تابع ہے۔ متخیلہ ناطقہ کو حرکت دیکر حنجرہ کے اعصاب الصوت (Vocal Nerves) کی مدد سے آواز میں تبدیل کرتی ہے۔ یہ آواز سامعہ کے اعصاب سے بذریعہ ہوا کے ٹکراتی ہے، اور سامعہ کو اس آواز کے مفہوم معینہ و مفروضہ سے باخبر کرتی ہے۔ اب اگر کوئی تیز حس جلد باز اظہار مافی الضمیر میں اتنی جلدی کرتا ہے کہ حنجرہ کے اعصاب الصوت پر ناقابل برداشت دباؤ پڑتا ہے تو حلق سے صاف و ہموار نکلنے والی آواز اس دباؤ یا جبر سے متدجج ہو کر مرتعش (لرزنے والی) ہو جاتی ہے اور ناطقہ کی مسلسل آمد کو روک کر متخیلہ کی محولہ امانت کی ناقص ادائگی کو مکمل کرنے کے لئے بار بار پیچھے لوٹتی ہے اور اس ردو قبول کی محنت سے تھک جاتی ہے۔ یہی بات چیت میں جلدی کرنیوالوں کو عارض ہو جاتی ہے۔

بعض یوروپین ماہرین لکنت کی رائے میں بلند آواز سے گانا لکنت کی عادت چھڑا دیتا ہے، اور وہ اپنے دعوے پر دلیل یہ لاتے ہیں کہ ہکلے آدمی گاتے وقت کبھی نہیں ہکلاتے۔ یہ دعویٰ اس بنا پر تو صحیح مانا جا سکتا ہے کہ گانے والے کے تمام حواس داخلی و خارجی بالعموم اور متخیلہ و ناطقہ خاص طور پر گاتے وقت اپنے راگ کے تال سم اور زیر و بم کی پرداخت میں ایسے منہمک و مصروف ہو جاتے ہیں کہ اپنی آواز کی قطع و برید کا اُن کو ہوش نہیں رہتا، لیکن گانا لکنت کا کوئی اصولی علاج نہیں، کیونکہ راگوں کی تانیں علی العموم لمبی ہوتی ہیں، ان کی کشاکش کے وقت البتہ آواز کو لُکنت

نہ ہوگی، لیکن جن راگوں میں (مثلاً آرچیرا یا ہندی ترانہ وغیرہ) زمزمہ ... نقل لازمی ہے جیسے لکنت کو اور تقویت ہوگی اس لئے یہ راستے ... نیچ ہیں کہ ان کا لکنت پر اثر پڑتا ہے۔

لکنت کی عادت چھڑانے کی مجرب اور آزمودہ ترکیب جس کو راقم نے ... ہکلوں پر ... یہ ہے کہ اول کئی روز تک ہکلے آدمی کو قطعاً آواز نکالنے نہ دیں۔ اس کے بعد نہایت دھیمی آواز سے لبوترے الفاظ میں اُس سے بات کریں اور اس کو ہدایت کریں کہ وہ بھی اسی طرح ٹھیری ہوئی لمبی آواز میں جواب دے۔ اس ٹھیراؤ اور طوالت کلام کا اندازہ ذیل کے فقرات سے بخوبی ہو جائیگا یعنی اس تحریر میں حرفوں کو جو طوالت دی گئی ہے وہی طوالت آواز میں ملحوظ رکھی جائے۔

ھـــمیـــشـــہ دھـــیـــمی اور ٹھـــیری ہوئی آواز سے بات کرو اور ھـــرگز جلدی نہ کرو۔ تحمل ...

آواز کی اس سست رفتاری اور ادائے مطلب کی طوالت سے متکلم اور مخاطب دونوں کو اُلجھن ہوگی، لیکن دو تین روز تک اس اُلجھن میں پڑنے سے مدت کے دراز سے ہکلے اور لکنت زدہ اشخاص فصیح البیان ہو جائیں گے۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ ایسے سست تکلم میں سانس بھی منہ سے نکلتے وقت بھی اور سست رکھی جائے۔

اس امر کا ثبوت کہ لکنت کی عادت مرض متعدی کی طرح اکثر ایک شخص سے دوسرے کو لاحق ہو جاتی ہے۔ اس واقعہ سے ملیگا کہ میرٹھ میں ایک شریف خاندان اور اعلیٰ عہدیدار کے تین بیٹوں میں سے بڑے لڑکے کو ہکلانے کی عادت پڑ گئی۔ ان کے منجھلے بھائی بطور تمسخر یا مذاق کے انکی نقل اُتارنے لگے۔ دو چار دفعہ کی پریکٹس سے نہایت آسانی کے ساتھ انہوں نے بھی لکنت کی سند حاصل کر لی، پھر تیسرے بھائی ان کی ہمنوائی کو اُٹھے، وہ بھی اس ناخواندہ مہمان کے میزبان بن گئے۔ اب تینوں بھائی تمام شہر میں "ہکلے برادران" مشہور ہو گئے، بول چال اور ضروری بات چیت بھی دشوار ہو گئی۔ گویا نحوی اصطلاح کی تینوں صفات مبالغہ اغراق و غلو ان تینوں بھائیوں نے اپنی شخصیت سے نمایاں کر دیں اور مشتق فن کے اعتبار سے ان کو تفصیل بعض تفصیل بعض اور تفصیل کل کی تعریف میں لایا جا سکتا ہے کیونکہ بلحاظ عمر بڑے بھائی تو اتنے مشاق ہیں کہ بات کرنے کے لئے کسی لفظ کا ایک حرف منہ سے نکالتے ہی دوران سر میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اور چند لمحے تک سر ہلانے، آواز چبانے اور لبوں کو حرکت دینے کے بعد جب اس لفظ کا دوسرا حرف "کوشتہ بخیہ مگر صاف نمودہ" صورت میں برآمد کر پایا کہ پھر دوران سر کا دورہ پڑ گیا۔ پھر جب بہزار جر انتقال تیسرے حرف پر پہنچے اتنی دیر میں سامع یا مخاطب نے دق ہو کر اس آفت ناگہانی یا بلائے آسمانی سے راہ فرار اختیار کی۔ اگر کوئی عزیز یا دوست ہے تو چار ناچار ان کی لسان العصافیر سننے اور متوجہ رہنے پر مجبور ہے مگر سمجھ بوجھ سے پھر بھی دور ہے۔ منجھلے بھائی کمتر اور چھوٹے کمترین سمجھ لیجئے۔ اس ہکلی پارٹی کے وسطی ممبر رحلت فرما گئے۔ کیا عجب کہ قبر میں نکیرین بھی ان سے جواب لئے بغیر ہی رخصت ہو گئے ہوں، کیونکہ ان کو کثرت کار متعلقہ کے باعث اتنی فرصت کہاں کہ ایک ایک مُردہ سے گھنٹوں اُلجھے رہیں۔ اگر ایسا کریں تو اُن کا بہت سا کام بقایا میں پڑ جائے۔ کیونکہ موتیں بیک لمحہ ایک ایک شہر میں متعدد ہوتی ہیں۔ یہاں یہ وسوسہ پیدا ہوتا ہے کہ دنیا بھر کے روزانہ ہزاروں مُردوں سے دو نفر نکیرین کس طرح عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح ملک الموت تن واحد لاکھوں اجل گرفتہ افراد کس طرح نمٹاتے ہوں گے۔ مگر نہیں جب اس خاک کے پتلے مادی ساخت اولیاء کاملین بیک وقت متعدد مقامات میں موجود ہو سکتے ہیں تو نورانی پیکر فرشتے کا بیک لمحہ ہزار کام انجام دینا کیا دشوار ہے، اگرچہ ہماری سمجھ سے بعید ہے۔



ترسم نہ رسی بہ کعبہ اے اعرابی کایں رہ کہ تو میروی بہ ترکستان است



نقد و تبصرہ

"اخبار کارزار"

حضرت حفیظ جالندھری کے نام سے ملک بہت اچھی طرح روشناس ہو چکا ہے۔ آپ نہ صرف صوبۂ پنجاب کے بلکہ ہندوستان کے مشہور شعراء میں سے ہیں اور اس سے پیشتر رسالہ "ہزار داستان" اور رسالہ "مخزن" لاہور کے ایڈیٹر رہ چکے ہیں۔ اب آپ نے کچھ عرصہ تک آرام لینے کے بعد "کارزار" کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار نکالنا شروع کیا ہے، جس کا مقصد قوم کی ہر جہتی اصلاح ہے۔ حضرت حفیظ غالباً ان بزرگان قوم میں سے ہیں جن کا خیال ہے کہ تخریب کے بغیر تعمیر نہیں ہو سکتی، اور شاید یہی وجہ ہے کہ "کارزار" کا بہت سا حصہ ایڈیٹر "ادبی دنیا" کے لئے وقف کر دیا گیا ہے۔ ہم حضرت حفیظ کی خدمت میں نہایت ادب کے ساتھ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ تعمیر سے پہلے جس تخریب کی ضرورت ہوتی ہے وہ دوسروں کی نہیں بلکہ خود اپنی تخریب ہے۔ دانہ جب خاک میں مل کر اپنی ہستی کو فنا کر دیتا ہے، تب قدرت کے فیاض ہاتھ اسے لالہ و گل کا ملبوس عطا کرتے ہیں۔ یہی دانہ اگر دوسروں کے سر پھوڑنے میں اپنی عمر عزیز ضائع کر دیتا تو اسے کبھی زینت چمن بننے کی عزت و فضیلت حاصل نہ ہوتی۔

ممکن ہے کہ مولانا تاجور نجیب آبادی میں بہت سی کمزوریاں ہوں، اور اُن کے کلام میں بھی بہت سی غلطیاں موجود ہوں، لیکن ابھی تک دنیا وہی ٹھیٹھ پرانی ہی چال کے انسان پیدا کر رہی ہے جو خطا و نسیان سے مرکب ہیں، اور ایسے مکمل انسان کے پیدا ہونے میں ابھی بہت عرصہ باقی ہے جو کوئی غلطی نہ کرے اور جس سے حضرت حفیظ بھی مطمئن ہو سکیں۔

زیب داستان، یا رونق بزم کے لئے کبھی کبھی کسی کے مقالات کا مضحکہ اُڑانا اور بات ہے، اور کسی کے پیچھے خواہ مخواہ کو ہاتھ دھو کے پڑ جانا اور بات۔ حضرت حفیظ ہمیں معاف کریں اگر ہم یہ کہیں کہ وہ ہاتھ دھو کر ہی پیچھے پڑ گئے ہیں، اور یہ حفیظ صاحب کی شان سے گری ہوئی بات ہے۔ حفیظ کو اس سے زیادہ بلند رہنا ہی مناسب ہے۔

تاجور صاحب کے ذاتی اذکار کے علاوہ "کارزار" میں اور جو کچھ بھی ہے قابل تعریف ہے، اور اخبار یقیناً اس قابل ہے کہ اسے خریدا جائے۔ قیمت سالانہ تین روپے۔ مینیجر اخبار "کارزار" ماڈل ٹاؤن لاہور سے مل سکتا ہے۔

"طبیہ کالج میگزین"

مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے طبی شعبہ کی طرف سے اس نام کا ایک

سہ ماہی رسالہ نکلنا شروع ہوا ہے، جس کا پہلا نمبر اِس وقت ہمارے سامنے ہے۔ اخباروں اور رسالوں کے پہلے نمبر بالعموم اچھے ہی ہوا کرتے ہیں، اس لئے اس کی خوبیوں کے متعلق کوئی رائے قائم کرنا ابھی ذرا قبل از وقت ہے۔ پھر بھی ایڈیٹوریل بورڈ میں جن ناموں کا اعلان کیا گیا ہے انہیں دیکھ کر کم سے کم اتنا نتیجہ تو ضرور نکالا جاسکتا ہے کہ جو خوبیاں اس پہلے نمبر میں موجود ہیں وہ صرف اسی ایک نمبر تک محدود نہ رہیں گی، بلکہ آیندہ بھی یہ پرچہ اسی قدر آب و تاب سے نکلتا رہیگا۔ ایک سو بہتر صفحے کی ضخامت ہے، اور یہ تمام کے تمام صفحات طبّی مضامین سے بھرے پڑے ہیں، اور ان میں سے ایک مضمون بھی ایسا نہیں ہے جسے بھرتی کا مضمون کہا جاسکے اچھے اچھے فاضل ماہرینِ طب کے گرانقدر مقالات اس میں جمع ہیں جن کے مطالعے میں محو ہو کر بالکل ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ گویا کسی طبّی کانفرنس میں شریک ہیں، اور مختلف ڈاکٹر اور حکیم اپنے اپنے بیش بہا خیالات سے مستفید کر رہے ہیں۔ رسالہ مصور بھی ہے اور پیشِ نظر نمبر میں چار تصویریں موجود ہیں۔ کتابت و طباعت کے لحاظ سے بھی یہ رسالہ بہت کچھ دیدہ زیب ہے، اور اِن تمام باتوں کو ملحوظ رکھ کر کہا جاسکتا ہے کہ صرف چار روپے سالانہ اس کی قیمت مناسب کی حد سے بھی کم ہے۔

مخصوص علوم و فنون سے جو رسالے متعلق ہوں اُن کے لئے غالباً اس کی بالکل ضرورت نہیں ہے کہ خواہ مخواہ کہنے کے لئے کوئی نظم بھی اسمیں شامل کردیں۔ ہمارا خیال ہے کہ "نغمۂ طب" اگر اس ساز میں نہ ہوتا تو زیادہ اچھا ہوتا۔ شعر و شاعری کو بیکار لوگوں ہی کے لئے چھوڑ دیا جائے تو بہتر ہے آخر ایک طبیب سے ہم یہ توقع کیوں کریں کہ وہ شعر بھی اسی قدر صحیح کہہ سکیگا کہ جیسے وہ نسخہ لکھتا ہے۔ طبیہ کالج کے اس میگزین کو دیکھ کر ہمیں بڑی مسرت ہوئی ہے، خدا اس نونہال کو ہمیشہ سرسبز اور بارآور رکھے۔

طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڈھ سے یہ رسالہ نکلتا ہے۔

شاعر کی راتیں

شبیر حسن خاں صاحب جوش ملیح آبادی کا نام دنیائے شاعری میں اب اس قدر شہرت پا چکا ہے کہ آپ کے مجموعہ کلام کے متعلق صرف اِس قدر کہدینا کہ یہ جناب جوش کا کلام ہے بالکل کافی ہے۔ شاعر کی راتیں آپ کی چند دلآویز نظموں کا مجموعہ ہے، جو جناب اعجاز قدوسی نے مرتب فرما کر شائع کیا ہے۔ مجموعہ میں جتنی بھی نظمیں ہیں سب کی سب "رات" کے متعلق ہیں، اور اگرچہ مشہور تو یہ ہے کہ "شب پردہ دارِ عاشقاں" ہوتی ہے لیکن ہمارا خیال ہے کہ یہ "شاعر کی راتیں" یقینی طور پر مسئلہ کے خلاف حضرت جوش کی پردہ داری کرنے کی بجائے ان کا نام بیش از بیش روشن کردینگی۔ چھوٹی تقطیع کی ۹۲ صفحوں کی کتاب ہے اچھی لکھی ہوئی اور عمدہ کاغذ پر اچھی چھپی ہوئی، اور ایک روپیہ میں جناب اعجاز الحق صاحب قدوسی نامپلی جدید ۱۶۷ حیدر آباد دکن سے مِل سکتی ہے۔

مجموعہ میں سب سے پہلی نظم "سنہری رات" کے عنوان سے شائع ہوئی ہے اور اس طرح شروع ہوتی ہے۔

کیا میکدے کی رات نشاط آفریں ہے آج — گلرنگ موجِ بادہ سے اُکی جبیں ہے آج
ہر لغزشِ قدم سے ٹپکتے ہیں زمزمے — ہر جنبشِ نگاہ سرود آفریں ہے آج
بے چین شوخیوں سے ہے چشمِ حیا پرست — تمکیں سے بے خبر نگہِ شرمگیں ہے آج

کسی مستانہ رو کی قدم قدم پر لڑکھڑاتی ہوئی چال کا اس سے زیادہ صحیح نقشہ اور کیا کھینچا جاسکتا ہے کہ شاعر اس کے متعلق یہ کہدے کہ اس کی ہر لغزشِ قدم سے زمزمے ٹپک رہے تھے حقیقت یہ ہے کہ لغزشِ قدم سے زمزموں کی چکیدگی اس قدر بلند تخیل ہے کہ جس کی نظیر اُردو شاعری میں کم ہے۔ اسی طرح چشمِ حیا پرست کا نشہ مے کی حالت میں شوخ اور شوخ بھی اس قدر کہ شوخیوں کی وجہ سے بیچین ہو جائے بنجانا، اور نگاہ شرمگیں کا عالم کیف و سرور میں تمکن و وقار سے بے خبر ہو جانا، ایسے بلند خیالات ہیں کہ جن کی داد نہیں دی جاسکتی۔

"مست رات" کے عنوان سے ایک اور نظم ہے، اور اس میں کسی سرمست شباب کی حالت بدمستی کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے

سر نشے میں تھوڑا سا جھکا اور اٹھی آنکھ گویا در میخانہ کی زنجیر
ہلا دی۔

ایک بدمست شرابی کے سر کا کسی قدر جھکنا، اور اس کے ساتھ چشم مخمور کا اٹھنا رندوں کی دنیا میں ہل چل ڈال دیا کرتا ہے، اور کسی کو اپنے سر و پا کا ہوش نہیں رہتا۔ اس عالم مدہوشی کے طاری ہو جانے کو "در میخانہ کی زنجیر ہلا دینے سے" تعبیر کرنا حق یہ ہے کہ حضرت جوش ہی کا کام تھا جسے بلا کسی مبالغہ کے اعجاز کہا جا سکتا ہے۔

آگے چل کر اسی نظم میں کسی مجبور شباب اور مخمور شراب کی بعض اداؤں کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے۔

ہونٹوں پہ زباں پھیر کے وہ ہنس دی کہ گویا
دنیا کا کوئی ساز جسے چھو نہیں سکتا
آنکھوں نے کیا شکر تمنا نے دعا دی
انگڑائی جو آئی تو اس اوج سے دیکھا
معلوم نہیں آگ لگا دی کہ بجھا دی
المختصر آنکھوں میں مری ڈال کے آنکھیں

آج اردو زبان کے کتنے شاعر ہیں جن کی نظر ان جزئیات تک پہنچتی ہو کہ نشۂ شراب کی وجہ سے معشوق کے ہونٹوں پر خشکی طاری تھی جسے رفع کرنے کے لئے قدرت کے بتلائے ہوئے علاج سے کام لیا گیا اور گیلی زبان ان پر پھیری گئی تا کہ وہ تر ہو جائیں۔ لب لعلیں پر زبان کا آزادانہ ادھر سے ادھر گھومنا ایک ایسی ادا تھی جس نے عاشق کی روح پر کیفیت وجد طاری کر دی اور اسے یہ محسوس ہوا کہ وہ ایک ایسا دلفریب نغمہ سن رہا ہے کہ جس کا ساتھ دنیا کوئی ساز نہیں دے سکتا۔

اللہ اللہ! کس قدر پاکیزہ خیال ہے اور پھر کتنا اچھوتا۔

اور ان تمام اداؤں کے بعد کسی نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر خدا ہی جانے کیا جادو کر دیا کہ اب یہ بھی ہوش نہیں ہے کہ اس حرکت سے دل میں آگ لگ گئی یا دل کی لگی بجھ گئی

اس مختصر سی جگہ میں تمام نظموں پر تفصیل کے ساتھ تبصرہ کرنا ناممکن ہے

ہم صرف ایک اور نظم کے چند اشعار لکھ کر بادل ناخواستہ [illegible] ہیں اگرچہ یہ ممکن ہے کہ آئندہ اشاعتوں میں اس مجموعہ کی ایک ایک [illegible] قارئین "سعید" کو لطف اندوز کرنے کا سلسلہ جاری رہے۔ اس نظم کا عنوان "بدمست رات" ہے جو کچھ بہت زیادہ موزوں نہیں معلوم ہوتا۔ اس قدر عمدہ نظم کے لئے اتنا بھدا سا عنوان خدا جانے حضرت جوش کو کیونکر پسند آ گیا۔ ممکن ہے یہ خیال آیا ہو کہ حسن حقیقی کسی زیور یا سنگار کا محتاج نہیں ہوتا۔ اس نظم میں آپ نے اپنے یار پری چہرہ کا سراپا بیان کیا ہے۔

گل پیرہن گلبدن و گل رخ و گل رنگ
ایمان شکن، آئینہ جبیں، انجمن آرا
گل بیز و گہر ریز و گہر بار و گہر تاب
کلیوں نے جسے رنگ دیا گل نے سنولا
صبح گل نو خاستہ و شام شگوفہ
مر رہنے کا سامان تو جینے کا سہارا
آئینہ رخسار پہ اک خال سیہ تاب
پیشانی گل رنگ پہ آنچل کا کنارا
نظریں جو اٹھانے تو لرزنے لگے خورشید
ابرو کو جو بل دے تو ہو مہتاب دو پارا
تھا میری نگاہ طرب آموز کا پابند
رنگ لب و رخسار کا چڑھتا ہوا پارا
ہر سانس میں اپنے ہی یہ پیچیدہ جوانی
ہر گام پہ لیتا ہوا زلفوں کا سہارا
سرشار جوانی تھی کہ اٹھتے ہوئے بادل
شاداب تبسم تھا کہ جنت کا نظارا
رخ بات کا اقرار سے انکار کی جانب
جس طرح ہرن دشت میں کترا کے گزارا

یہ چند اشعار جا بجا سے لے لئے گئے ہیں اور ان سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ نظم کس پایہ کی ہوگی۔ جلوۂ یار کو گل نو خاستہ کی صبح اور شگوفہ کی شام کہنے کا خیال ہر کس و ناکس کو نہیں آیا کرتا، اور پھر مر رہنے کا سامان اور جینے کا سہارا دونوں ٹکڑے اس قدر خوبصورت اور اس قدر موزوں ہیں کہ ان سے بہتر الفاظ کا خیال بھی نہیں آ سکتا جن کے حسب کا جس بلیغ انداز میں جناب جوش نے ذکر کیا ہے کہ "نظریں جو اٹھائے تو لرزنے لگے خورشید" وہ بس انہی کا حصہ ہے۔ سرشار جوانی تھی کہ اٹھتے ہوئے بادل کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کی طبیعت ایک بحر ذخار ہے کہ اس سے سحاب کے طوفان امڈے چلے آ رہے ہیں۔

اس مختصر مجموعہ میں پچیس نظمیں ہیں، اور ہمارا خیال ہے کہ ایک روپیہ جو اس مجموعہ کی قیمت رکھی گئی ہے وہ اگر ایک ایک نظم کی ہوتی تب بھی اسے کسی طرح مہنگا نہیں کہا جا سکتا تھا۔

(محبوب المطابع برقی پریس دہلی سے سعید احمد پرنٹر و پبلشر نے چھپوا کر کوچہ چیلان دہلی سے شائع کیا)

منھ میں سانپ

اگر آپ کے مسوڑھوں سے پیپ نکلتی ہے تو آپ کے مسوڑھے اب مسوڑھے نہیں رہے ہیں بلکہ تم نے اپنے منھ میں سانپ پال رکھے ہیں۔ مسوڑھوں کی پیپ سانپ کے زہر سے کم نہیں۔ یہ پیپ کھانے اور پینے کی ہر چیز کے ساتھ معدہ میں پہنچتی ہے اور معدہ کو خراب کر دیتی ہے اور تم نے جا بجا یہ باتیں تک سنا ہوگا کہ معدہ کی خرابی تمام بیماریوں کی جڑ ہے مگر باخبر لوگ جانتے ہیں کہ دانتوں کی خرابی تمام بیماریوں کی جڑ ہے کیونکہ معدہ خود عموماً دانتوں کی خرابی سے خراب ہوتا ہے۔

واحدی صاحب کا منجن

اکسیر دنداں

اس سانپ کے زہر کا تریاق ہے۔ اللہ کے فضل سے یہ منجن دانتوں کی ہر ہر خرابی کو دور کرتا ہے۔ مسوڑھوں کی پیپ نکلنے سے بڑھ کر تو کوئی خرابی نہیں۔ یہ ہلتے دانت ہلنے بھی لگے ہوں تو ان شاء اللہ واحدی صاحب کا منجن انہیں جوڑ دیگا۔ منجن اکسیر دنداں کا نسخہ واحدی صاحب کو حضرت مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں رحمۃ اللہ علیہ نے عطا فرمایا تھا، سنہ ۱۹۱۲ء میں جبکہ واحدی صاحب اخبار "طبیب" کے اڈیٹر تھے۔

جو لوگ پائریا یعنی دانتوں سے پیپ نکلنے کے مریض ہوں وہ واحدی صاحب کا منجن اکسیر دنداں تھوڑا سا ہر وقت پاس رکھیں اور جب کھانا یا پھل یا پان وغیرہ کھائیں تو فوراً بعد انگلی سے دانتوں اور مسوڑھوں کو صاف کرلیں اسی طرح شاید پانچ چھ دفعہ انہیں منجن استعمال کرنے کی زحمت اٹھانی پڑیگی لیکن یہ زحمت انکی بے پروائی کا نتیجہ ہے انہیں یہ برداشت کرنا چاہیئے اور اس برداشت کا فائدہ وہ فوراً محسوس کرینگے ورنہ مزید بے پروائی انہیں بہت بڑی زحمتوں میں مبتلا کردیگی۔ کھانے کے بعد منجن ملنا ممکن نہیں ہو تو جیسے ہی انگلی اور پانی سے دانتوں کی صفائی کرلینی کافی ہوگی۔ جن لوگوں کو ابھی پائیریا نہیں ہوا ہے یعنی جن کے دانتوں سے پیپ نہیں نکلتی خون نکلتا ہے ان کے لئے واحدی صاحب کا منجن اکسیر دنداں صرف صبح بیدار ہوکر اور شام کو سوتے وقت ملنا ضروری ہے۔ باقاعدہ دونوں وقت وہ منجن نہیں ملیں گے تو پھر پانچ چھ وقت ملنے پڑیں گے۔ جنہیں اتفاقیہ کوئی شکایت ہو جاتی ہے مثلاً بادی کی وجہ سے مسوڑھے پھول گئے ہوں یا دانتوں میں درد ہونے لگا ہو تو وہ حسب ضرورت جتنی دفعہ چاہیں اس منجن کو استعمال کرسکتے ہیں اور جنہیں ابھی کوئی خفیف سی تکلیف بھی دانتوں کی نہیں ہے وہ ایک دفعہ صبح بس اس منجن کو مل لیا کریں۔ اللہ سے امید ہے کہ کبھی انہیں دانتوں کی کوئی تکلیف ہوگی ہی نہیں۔ ایک احتیاط واحدی صاحب کا منجن اکسیر دنداں استعمال کرنیوالے لازمی طور سے کریں خواہ وہ مریض ہوں یا تندرست کہ پان یا پھل کھاکر ہمیشہ پانی یا انگلی سے دانتوں اور مسوڑھوں کو صاف کرلیں غلاظت کسی قسم کی زیادہ دیر تک لگی رہنی اچھی نہیں۔ پان کو ڈاکٹر مضر بتایا کرتے ہیں حقیقتاً تمباکو کے سوا اس کی کوئی جز بھی مضر نہیں ہے۔ اس پان ہر وقت چبانے سے لعاب دہن ضائع ہوتا ہے یہ بڑی نقصان رساں بات ہے۔ دوسرے پان کھاکر لوگ دانت نہیں صاف کرتے اور ہر وقت کے کھانیوالے بھلا کیسے دانت صاف رکھ سکتے ہیں تو پان کی کثرت سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ مفصل ترکیب استعمال منجن کے ساتھ عرض کی جائیگی۔ واحدی صاحب کا منجن دنداں شیشی میں بھیجا جاتا ہے۔ قیمت فی شیشی صرف ۸ر علاوہ محصولڈاک۔ محصولڈاک ایک شیشی پر ۵ر لگتا ہے اور دو شیشیوں پر ۶ر

ملنے کا پتہ:- احمد مجتبیٰ مینیجر رسالہ "نظام المشائخ" نمبر ۲۴۴ کوچہ چیلان دہلی

سینکڑوں میں لاجواب

یہ بات عام طور پر مسلّم ہے کہ دنیا میں ایسا شقی القلب انسان ملنا مشکل ہے، جو مصورِ غم علامہ راشد الخیری کے قلم سے نکلی ہوئی داستانِ غم پڑھ کر روتا نہ ہو۔ اس وقت تک ان کتابوں کے سولہ سولہ اور سترہ سترہ ایڈیشن چھپ چکے ہیں اور پھر اسی قدر مانگ موجود ہے۔

صبحِ زندگی ۸ر شامِ زندگی ۸ر شبِ زندگی ہر دو حصے عمہ الزہرا ۱۲ر اُمت کی مائیں عمہ

ہزاروں میں انتخاب

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی شائع کردہ کتابیں اکثر و بیشتر ایسی ہیں کہ ہزار ہا کتابوں کے ڈھیر میں نگاہِ انتخاب جب پڑے گی انہیں پر پڑے گی

نفسیاتِ شباب (تین روپے)

برلن یونیورسٹی کے پروفیسر اور فلسفہ تعلیم و تمدن کے ماہر اڈیورڈ اشپرانگر کی تازہ تصنیف کا نہایت ہی نفیس ترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم اے، پی ایچ ڈی نے کیا ہے۔ ترجمہ میں کمال یہ ہے کہ پیچیدہ سے پیچیدہ مقامات بھی اصل سے کچھ زیادہ صاف کر دیے گئے ہیں۔ اخلاقی نشو و نما پر اردو میں اس سے بہتر کوئی کتاب موجود نہیں ہے۔ زبان بہت سلیس، طرزِ انداز بیان بیحد دلکش۔ قیمت صرف تین روپے (ٹکے)

تاریخ الاُمّت

مولانا اسلم جیراجپوری کی تصنیف ہے اور تاریخ نویسی کے جدید ترین اصولوں کے مطابق لکھی گئی ہے اس قدر مستند کہ علاوہ جامعہ ملیہ کے اور بھی مدرسوں اور کالجوں میں داخلِ نصاب ہے۔

حصہ اول	سیرۃ الرسول	قیمت	عہ	مجلد	عمہ	حصہ پنجم	خلافتِ عباسیہ بغداد	قیمت	عمہ	مجلد عمہ
" دوم	خلافتِ راشدہ	"	عمہ	"	عمہ	" ششم	خلافتِ عباسیہ مصر	"	عمہ	" عمہ
" سوم	بنو امیہ	"	عہ	"	عمہ	" ہفتم	خلافتِ عثمانیہ	"	عہ	" عہ
" چہارم	خلافتِ عباسیہ	"	عمہ	"	عمہ		مکمل سیٹ		۱۲	" للعہ

کلامِ جوہر

رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر مرحوم کے کلام کا مجموعہ ہے جس کے متعلق مولانا عبدالماجد دریابادی کی یہ رائے ہے کہ "وہ اُن کے قلب کی زبان، اُن کے جذبات کا ترجمان اور اُن کے واردات کا بیان ہے۔ آورد، تصنع اور تکلف کا اُن کے ہاں گزر نہیں۔ اُن کا معشوق مردہ نہیں زندہ ہے، فانی نہیں باقی ہے، سفاک و ستمگر نہیں رحمٰن و رحیم ہے"

اس کتاب کی ضخامت تقریباً ۱۶۰ صفحات ہے اور قیمت صرف آٹھ آنہ ۸ر

کھیتی

پروفیسر محمد مجیب صاحب بی اے (آکسن) کا نہایت دلچسپ اور سبق آموز ڈرامہ جس میں قوم و ملت کی موجودہ ضروریات پر اچھی طرح نظر ڈالی گئی ہے۔ قیمت ۸ر

ملنے کا پتہ :- مینیجر رسالہ "سعید" دہلی

جلد ۲ — باتصویر
نمبر ۶ — ماہوار رسالہ — سنہ ۱۹۳۲ء

سعید دہلی

ایڈیٹر
سعید احمد
بریلوی

قیمت
سالانہ تین روپے ۳ر
ششماہی ۱۲؍۱ر
فی پرچہ ۳ر

فہرست مضامین

ہمارے خیالات

صفحہ

افسانہ

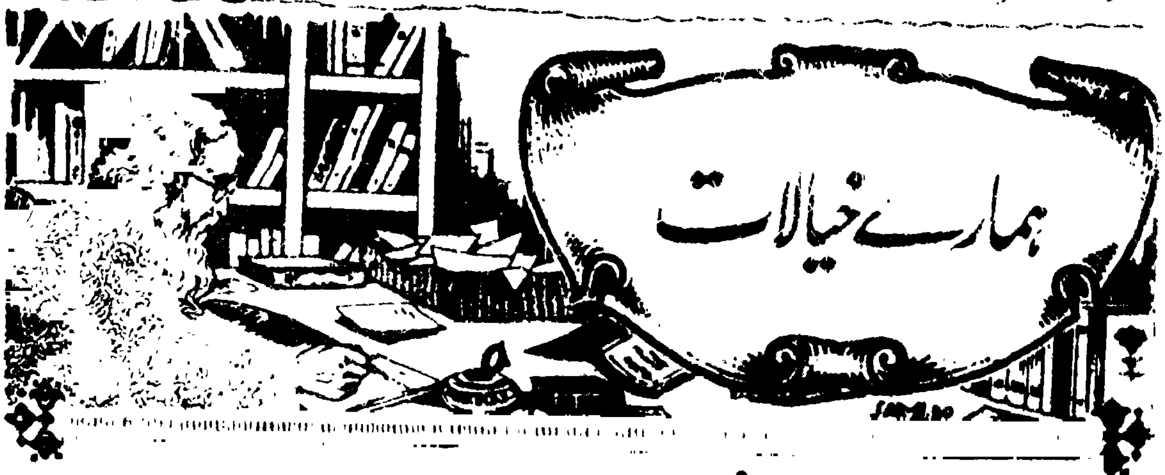
عورتوں کے چار صفحے

رازحیات

صفحہ

علم وادب

بزم سعید



"سعید" کے متعلق میری کوششیں

کسی پرچے کی اشاعت میں اگر بے قاعدگی پیدا ہو جائے، اور وہ اپنے مقررہ وقت پر نہ نکلے تو لازمی طور پر اس کے خریداروں میں ایک طرح کی بددلی اور ایک بڑی حد تک بے اعتمادی پیدا ہو جاتی ہے۔ بدقسمتی سے "سعید" کو اپنے ابتدائی زمانے ہی میں اس مصیبت سے دوچار ہونا پڑا، اور سبب خواہ کچھ بھی تھا لیکن اس کے خریداروں کو اس کے انتظار کی تکلیف بہت کافی اُٹھانی پڑی۔ شکایتوں کے خطوط سے ایڈیٹر کی میز بھر گئی، اور اتنے بہت سے خطوط کے محصول کی صورت میں ڈاکخانہ کی آمدنی میں بھی اچھا خاصا معقول اضافہ ہو گیا۔ شکایت کے مختلف انداز اور عتاب ناموں کے مختلف لہجوں نے مختلف انسانی طبیعتوں کا بھی بہت کچھ اندازہ کرا دیا، اور یہ غالباً ایڈیٹر کی معلومات میں ایک فیمتی اور گرانقدر اضافہ تھا۔

بہرحال جو کچھ ہونا تھا وہ ہو لیا، اور اب میں خواہ کتنی ہی آرزو کیوں نہ کروں کہ کاش ایسا نہ ہوا ہوتا، پھر بھی یہ ناممکن ہے کہ ایک گذرا ہوا واقعہ حقیقت کی بجائے افسانہ بن جائے۔ میں یہی کر سکتا تھا کہ مافات کی تاحدِ امکان تلافی کر دوں، اور بیماری سے اُٹھنے اور کام کرنے کی اجازت ملنے کے بعد میں نے یہی وعدہ بھی کیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے اس وعدہ کے پورا کرنے کا موقع دیا، اور اب جہاں مجھے اپنی اس کوتاہی پر ندامت ہے کہ اپنی مسلسل بیماری کی وجہ سے میں پرچہ کو صحیح اوقات پر شائع نہ کر سکا، وہیں یہ تجربہ یہ مسرت بھی ہے کہ ایک ایک مہینے میں دو دو پرچے نکال کر میں نے گذشتہ کی پوری کر دی، اور اس کی اشاعت کو صحیح وقت پر لے آیا۔ یہ جون کا پرچہ ہے جو اس وقت نکل رہا ہے اور جولائی کا پرچہ لکھا جا رہا ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ مہینہ کے چند ہی روز کے بعد وہ آپ کے ہاتھوں میں ہوگا۔

میں نے اس کے علاوہ کچھ کام اور بھی کیا ہے، حالانکہ یہ واقعہ ہے کہ وہ میرا نہیں بلکہ آپ کے کرنے کا کام تھا۔ میں نے شاہجہانپور اور بریلی دو مقامات کے دورے کئے، اور اگرچہ پرچہ کی تیاری کی مجبوریوں کی وجہ سے میرے دونوں دورے مہینے کی آخری تاریخوں میں ہوئے تھے جبکہ ملازمت پیشہ اصحاب کی جیبیں خالی، اور اخبار اور رسالوں کا چندہ مانگنے والوں کے لئے اُن کی زبان پر اچھی سونٹی گالی ہوا کرتی ہے پھر بھی مجھے بہت کافی کامیابی ہوئی، اور دونوں جگہوں سے میں ایک سو سے زیادہ خریدار لے ہی آیا۔

"ڈاکٹر صاحب مجھے تو اخبار بینی کا کچھ ذوق نہیں ہے۔" "ڈاکٹر صاحب میں تو کئی پرچوں کا پہلے ہی سے خریدار ہوں۔" "ڈاکٹر صاحب

آپ کا پرچہ تو ماشاءاللہ بہت اچھا ہے، مگر صاحب آجکل تو تنخواہوں کی تخفیف نے سخت مجبور کر دیا ہے۔" "اجی حضرت کاروبار تو سب بند پڑا ہے، بھلا پرچے اور رسالے کوئی خریدے تو کہاں سے خریدے۔"

یہ اور اسی قسم کے اور بہت سے فقرے لوگ کہتے جاتے تھے اور بادل ناخواستہ یا ممکن ہے کہ بادل خواستہ "سعید" کے سالانہ چندہ کے تین روپے جیب سے نکال کر دیئے جاتے تھے۔ بعض مقامات پر یہ روپے ننھے کے ابا کی جیب کی بجائے ننھے کی اماں کے بٹوے سے نکلوائے گئے، اور یہ کام فی الحقیقت بہت دشوار تھا۔

"بھاڑ میں جائے یہ رسالہ، میرے پاس روپے نہیں ہیں تمہیں خریدنا ہے تو اپنے پاس سے خریدو۔ یہاں ویسے ہی گھر کا خرچ پورا کرنا دشوار ہو رہا ہے۔ کل وہ بنارسی ساڑی تک تو میں نے اسی سبب سے خریدی نہیں۔ بس تمہارے پاس تو کوئی بھی کچھ چیز لے کے آجائے، اچھی ہو یا بُری لے خریدنے سے مطلب۔ گھر کی کلموہی تو اس پر نہ سوچی ہے وہ بھلا پڑھنے کے قابل ہوگا!"

اس تمام ادب لطیف کی ارزانی کے بعد بھی "سعید" کے لئے کسی کسی صندوقچے یا بٹوے سے روپے نکل ہی آتے تھے، اور خدا میرے اور میرے ساتھ ننھے کے ابا کی اقتصادی مشکل حل کر ہی دیتا تھا۔

میری حقیر اور ناچیز کوششیں یہیں تک محدود نہیں رہیں، بلکہ کچھ قدم اور آگے بڑھی ہیں۔ اس عرصہ میں میں نے ملک کے مشہور اور ممتاز ادیبوں کی بارگاہ تک بھی کسی نہ کسی طرح اور کسی نہ کسی حد تک رسائی حاصل کی ہے، اور اگر ان کے وعدوں پر اعتبار کر لیا جائے، تو اب میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ آئندہ "سعید" کا دامن بھی گلہائے رنگا رنگ سے رشک ارم و فردوس ہوا کریگا، اور یہ اتنی بڑی کامیابی ہے کہ جس پر میں جتنا فخر بھی کروں کم ہے، کیونکہ ملک میں اچھے اچھے اہل قلم کی تعداد بدقسمتی سے بہت ہی کم ہے، اور مانگ کی کثرت نے انہیں صحیح معنوں میں "یک انار و صد بیمار" کا مصداق بنا دیا ہے۔ آپ کسی موسم میں بھی ان کے پاس جائیے آپ سے پہلے وہاں ایک دو "مدیر مسئول" صاحبان قسم کے ایڈیٹر ع

سر زیر بار منت دربان کئے ہوئے

ضرور ملیں گے اور آپ اُن کی کسی تاریخ کی ڈاک بھی دیکھیں، کم سے کم چار چھ خط "مدیر التحریر" صاحبان کے آپ کی نظر سے ضرور گذر جائیں گے۔ عرضداشتوں کی ایسی بوچھاڑ، اور تقاضوں کی اس قدر بھرمار کے باوجود اگر وہ غریب "سعید" کے لئے ایک آدھ صفحہ لکھنے کا وقت نکال لے تو یقیناً یہ ان کا ایسا کرم ہوگا کہ جس کا شکریہ ادا کرنا "سعید" کے مستجمع الصفات منیجر صاحب سے بھی شاید ہی ممکن ہو سکے۔

اس عظیم الشان کارنامے پر بھی میری کوششیں ختم نہیں ہو گئی ہیں۔ میں نے رسالہ کے انتظامی شعبہ میں بھی بہت کچھ دخل دیا ہے اور اپنے ہمہ دان و ہمہ گیر اور جامع و مانع شخصیت والے محترم منیجر صاحب کے احتجاج کے باوجود چند ایسی تبدیلیاں کر دی ہیں کہ جو منیجر صاحب کے خیال میں غیر ضروری اور فضول، لیکن میری رائے میں بہت ہی ضروری اور مفید تھیں۔ مثال کے طور پر صرف ایک کا ذکر کر دوں اور وہ یہ کہ اگست ۱۹۳۳ء میں کہ جب "سعید" اپنی زندگی ناپائیدار میں بقدر ایک سال کے پائیداری حاصل کر چکیگا تو جناب منیجر صاحب کی قلیل تنخواہ میں آجکل کے رسم و رواج کے خلاف تخفیف کی بجائے "قدرے اضافہ" کر دیا جائیگا اور امید قوی ہے کہ آئندہ جو صاحبان دفتر "سعید" میں تشریف لایا کریں گے انہیں منیجر صاحب کی زنگ آلودہ پانوں کی ڈبیہ جو غالباً شاہی خاندانوں کے جواہرات کی طرح مدتہا مدت سے ورثہ میں باپ سے بیٹے کی طرف منتقل ہوتی چلی آرہی ہے، اور جس کے متعلق اب یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو گیا ہے کہ آیا وہ ٹین سے بنی ہوئی ہے یا صرف زنگ سے، وہ یادگار اور تاریخی ڈبیہ آئندہ پانوں سے خالی نہ ملا کریگی

اس بات کے قوی امکانات ہیں کہ آیندہ نجم صاحب کی تحریر او نشر کا لہجہ بھی اس قدر درشت اور تلخ نہ ہوگا کہ جس پر یہ گمان ہوتا تھا کہ گویا لڑنے کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔

مختصر یہ ہے کہ اب میں ہمہ تن اور بہ دل و جان "سعید" کی ترقی دینے میں مصروف ہوں، اور مجھے امید ہے کہ آیندہ اگست سے وہ اگر کچھ نہیں تو ایسا ضرور ہو جائیگا کہ اچھے سے اچھے نازک مزاج اہل ذوق بھی اسے اشتیاق سے ردی کی ٹوکری میں نہ پھینک سکیں۔

آپ کی نوازشیں

جس طرح سورج نہ تنہا ہندوؤں کو مل سکتا ہے اور نہ مسلمانوں کو اسی طرح "سعید" کی ترقی نہ تنہا میری کوششوں سے ہو سکتی ہے اور نہ آپ کی نوازشوں سے۔ اگر یہ صحیح ہے کہ دو حصے ہائیڈروجن اور ایک حصہ آکسیجن کے باہم مل جانے سے پانی بن جاتا ہے تو یہ بھی اسی قدر صحیح ہے کہ دو حصے میری کوششیں اور ایک حصہ آپ کی نوازشیں باہم ملکر اس گلشن ادب کی آبیاری کر سکتی ہیں کہ جس کا نام "سعید" ہے۔ میں ان سب احباب کا سچے دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ جنھوں نے اس عرصہ میں "سعید" کی ترقی اشاعت کے متعلق کوششیں کی ہیں، اور اپنے اپنے حلقۂ اثر میں اس کی اشاعت بڑھائی ہے، لیکن پیاس بجھانے کے لئے اوس کے چند قطرے کافی نہیں ہوا کرتے۔ کسی پرچے کی خریداروں کی تعداد میں سو پچاس کا اضافہ اس کی مالی حالت پر کچھ بہت زیادہ اثر نہیں ڈالا کرتا، اور اگر آپ کی یہ خواہش ہے کہ آپ کا یہ پرچہ پوری آب و تاب اور پوری شان رعنائی کے ساتھ شائع ہو کر آپ کی خدمت میں پہنچا کرے تو اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ آپ اس کے حال پر اس سے ذرا زیادہ توجہ کریں کہ جتنی اب تک کی ہے۔ میں اس سے پہلے بھی یہ عرض کر چکا ہوں کہ یہ کسی سرمایہ دار کا پرچہ نہیں ہے اور نہ یہ تجارتی اغراض کے لئے تجارتی اصولوں پر نکالا گیا ہے۔ یہ فی الحقیقت ایک مزدور کا پرچہ ہے، اور ایک مزدور کی اتنی حیثیت نہیں ہوتی کہ وہ مستقل طور پر ایک عرصۂ دراز تک ہر مہینے نقصان اٹھانا خوشی سے گوارا کرتا رہے۔

میں برابر کوششیں کر رہا ہوں، اور ان کا نتیجہ اس صورت میں آپ کے سامنے ہے کہ پرچے کی اشاعت وقت پر آ گئی، اور اب وہ پہلے سے بہت بہتر مضامین آپ کی خدمت میں پیش کر سکتا ہے۔ آپ کی نوازشیں بھی اگر اسی رفتار سے ساتھ دیتیں تو میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت تک "سعید" کی اشاعت نقصان رساں ہونے کی بجائے منفعت بخش ہو گئی ہوتی۔ بہرحال زمین میں ہل چلا دینا، کھاد ڈال دینا اور تخم ریزی کر دینا میرا کام تھا، اور وہ ایک حد تک میں کر چکا اور ابھی برابر کر رہا ہوں۔ اب اس باغ کی سرسبزی اور شادابی آپ کی بارش کرم پر منحصر ہے، اور اس میں آپ کی طرف سے تکلف اور تامل نہ ہونا چاہیئے۔

خاص نمبر

مجھ سے پوچھا جا رہا ہے کہ کیا دوسرے رسالوں کی طرح "سعید" کا کوئی خاص نمبر نہ نکلیگا۔ حیران ہوں کہ اس کا کیا جواب دوں۔ مجھے معلوم ہے کہ عام طور پر رسالوں اور اخباروں کے خاص نمبر نکالے جا رہے ہیں، اور اکثر و بیشتر ان خاص نمبروں کی خصوصیت صرف یہ ہوتی ہے کہ چند صفحے زیادہ کر دیئے، اور چند تصویریں، خواہ وہ حقیقتاً کپڑوں کے تھانوں ہی پر سے کیوں نہ چھڑالی گئی ہوں، انتہائی بے ترتیبی کے ساتھ کہیں کہیں ان صفحات پر چپکا دیں۔ کسی کے نیچے لکھ دیا "کشتۂ انتظار" اور کسی کے نیچے "محو خیال" اور کسی کے لئے اگر کوئی عنوان سمجھ میں نہ آیا تو بقول مولانا پرویز کے اس کے نیچے بھی لکھ دیا کہ "ایک تصویر"۔ عید نمبر اور شہید نمبر، اور لطیف نمبر اور ظریف نمبر، اور افسانہ نمبر اور میخانہ نمبر سب تجارتی اختراعات ہیں، اور ان کا مقصد بس اسی قدر ہوتا ہے

کہ خریداروں کے دل میں یہ خیال پیدا کیا جائے کہ ہمارا پرچہ معمولاً جیسا نکلتا تھا اُس سے بہت بڑھ چڑھ کر مضامین ہم نے اس خاص نمبر میں جمع کئے ہیں اور مزید تکلیف یا زیادتی ضخامت کے لئے خریداروں کی جیب پر کوئی بار نہیں ڈالا ہے، لیکن سال کے بارہ مہینوں میں سے اگر ہم نے صرف ایک مہینے یہ اعلیٰ درجہ کے مضامین اپنے پرچے میں شائع کئے تو اس کے یہی معنی تو ہوں گے کہ باقی گیارہ مہینوں میں ہم نے جو مضامین پیش کئے وہ ادنیٰ درجہ کے تھے، میں یہ الزام اپنے سر کیوں لوں، جبکہ میں جانتا ہوں کہ میں ہر مہینے صرف وہی مضامین شائع کیا کرتا ہوں کہ جو اعلیٰ درجہ کے ہوں، جس کے یہ معنی ہیں کہ "سعید" کا ہر نمبر خاص نمبر ہوا کرتا ہے۔

خاص نمبر کا جو مفہوم میرے ذہن میں ہے وہ یہ ہے کہ کسی بہترین تصنیف کے کسی بہترین مصنف کے یا کسی بلند پایہ ہستی کے ذکر کے لئے کسی نمبر کو مخصوص کر دیا جائے اور کسی مخصوص کتاب یا مخصوص ہستی کے متعلق بہتر سے بہتر معلومات اس نمبر میں فراہم کر دی جائیں۔ اگر اسی کا نام خاص نمبر ہے تو ایسے خاص نمبر تو یقیناً میں نکال سکتا ہوں، اور اکثر نکالتا رہوں گا۔ باقی رہے عام قسم کے خاص نمبر ان کی ترتیب میں سچ کہدوں کہ میرے امکان سے باہر اور میری استعداد سے بالاتر ہے۔

کوئی خاص نمبر نکالنے کا خیال ابھی تک میرے ذہن میں نہ آیا تھا اور یہ واقعہ ہے کہ اگر اس قدر تقاضے نہ ہوتے تو شاید ابھی میں کچھ عرصہ تک اس طرف توجہ نہ کرتا، لیکن اب جبکہ اس کی طلب میں اتنے بہت سے خطوط آچکے ہیں تو میں نے بھی ارادہ کر لیا ہے کہ "سعید" کا ایک خاص نمبر نکالدوں اور اس کے لئے تیاریاں بھی شروع کر دی ہیں۔

حاجی بلغ العلیٰ مرحوم و مغفور

حاجی بلغ العلیٰ ولد حاجی کشف الدجیٰ کی گراں مایہ اور بلند پایہ ہستی کی جلوہ باریوں سے "سعید" کے صفحات کچھ عرصہ سے محروم ہیں، اور اس عرصہ میں ان کی خیریت مزاج اور کیا نام کہ وجہ روپوشی دریافت کرنے کے متعلق پچاسوں ہی خط دفتر میں موصول ہو چکے ہیں۔ بدقسمتی سے حاجی صاحب نے اب وعدہ خلافی کی نئی ادا اختیار کر لی ہے اور "سعید" کی طرف سے پیہم اور متواتر تقاضوں، اور اپنی طرف سے بار بار پختہ وعدوں کے باوجود ابھی تک نہ انہوں نے کوئی آدریس عنایت فرمایا ہے اور نہ کوئی لیکچر یا اسپاچ۔ اب تو کچھ ایسی حالت ہو گئی ہے کہ جب ان سے تقاضا کیا جاتا ہے تو ایک معنی خیز تبسم کے ساتھ فرما دیتے ہیں کہ "بھائی کیا نام کہ آجکل سارے ہندوستان میں آرڈے ناس اور مارڈے ناس جاری ہیں، اور چھینکتے ناک اور بات کرتے زبان کاٹی جاتی ہے ایسی حالت میں کیسے ممکن ہے کہ ہم کوئی چیز از قسم تحریر و تقریر و املاء و انشاء خود افرنڈو کانگریس بلیٹین وغیرا نہا تم کو دیدیں۔ آج کل کے زمانے میں حکومت پر نکتہ چینی ہو یا نکتہ جاپانی بالکل مناسب نہیں ہے۔ بہت پھونک پھونک کر بلکہ برش سے جھاڑ جھاڑ کر قدم رکھنے کی ضرورت ہے، آجکل بس اتنا ہی کافی ہے کہ سب سے کہدیا جائے کہ بھائیو اور بہنو! کھدر پہنو! کیونکہ سودیشی کی ترقی گورنمنٹ بہادر بھی چاہتی ہے اور اگر خواہ مخواہ کے لئے بھائی گاندھی جی چرخا لیکے نہ کھڑے ہو گئے ہوتے تو اب تک اربوں اور کھربوں روپے کی سودیشی روئی اور پدموں اور سنکھوں روپے کے سودیشی گیہوں ولایت ہائے مختلفہ از قسم روس جاپان و امریکہ و جرمنی و انگلستان و کولمبو و ٹمبکٹو کو کہ جن کا ذکر بھائی سند باد جہازی نے اپنی کتاب موسومہ الف لیلہ و داستان امیر حمزہ و دیگر کتب جغرافیہ ہیچو قسم میں کیا ہے، چلے جاتے، اور انگلستان اور روس کہ جسے کیا نام کہ بول شوکیک بھی کہتے ہیں اور جرمنی جسے الامانی بھی کہا جاتا ہے، اور افریقہ جہاں ۔۔۔۔ "وہ بھائی ہمارے بہت کاٹے کاٹے رہتے ہیں و جملہ دیگر مہذب ممالک ہیچو قسم کے بازار سودیشی صنعتوں سے از قسم لکھنؤ کے مٹی کے بوے، و سندیلہ کے لڈو

وا گرہ کی دال، وٹھل دتھرا کے بھٹیرے، برہل کا مرنڈ و فرید آباد کی جوڑی وغیرہ یور کے سڑتے وغیرہ ... سے با ... بٹ جاتے اور ٹکڑوں اور چھانگوں ... الوقت از قسم بینک نوٹ و بینک نوٹ و پرامیسری نوٹ وغیرہ، نوٹ و ہنڈی ہنڈی کے جن کے لئے ... قیمت کے ... ٹکڑے بل جائیں ... ہندوستان ... آجائے۔ اور کیا نام کہ ... ہے کہ یہ چیزیں "کاغذی" ... ہے، جیسے کہ کاغذی بادام اور کاغذی اخروٹ اور کاغذی لیموں جیسے دوسروں کے ... بیل" اور کاغذی ... کا محصول یا ... جانے کے باوجود ملک کے اس سرے سے اس سرے تک دوڑتے پھرتے ہیں بس لازم آیا کہ "کاغذی سونا" کہئے جیسے بینک یا ہنڈی وغیرہ کو کہا جاتا ہے اس بھاری بھاری تھیلے اور ایک ... سونے سے بہت بہتر ہوتا ہے کہ جو آجکل ہر ہفتہ لاکھوں کروڑ روپے کا بمبئی یا بندر پینانگ ... سے جہازوں میں لد لد کر ملک سے باہر چلا جا رہا ہے اور اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس طرح ... ہمارا ... ہو جاتا ہے، اور کیا نام کہ ہم بھول گئے تھے سو اب یاد آیا ... کاغذی وعدے بھی بہت عمدہ اور مضبوط ہوتے ہیں بالکل اسی قسم کے جس قسم کے بھائی اسد اللہ خاں نوشہ یا بھائی شیخ ابراہیم غالب کہہ گئے ہیں کہ

ترے وعدے پر جئے ہم (یا جانے مرے ہم) تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے (شاید بچ جاتے ہوں گے) اگر اعتبار نہ ہوتا

مگر لاحول ولا قوۃ الا باللہ ہم یہ کونسا شعر پڑھ گئے؟ وہ شعر تو یہ ہے جو ہم سنانا چاہتے تھے کہ

تری نازکی سے جانا (یعنی جان لیا) کہ بندھا تھا عہد بودا
کبھی توڑ تو نہ سکتا (یا شاید جوڑ نہ سکتا) اگر استوار ہوتا

نہیں کیا نام کہ صغریٰ کبریٰ اور اصغری و اکبری سب کی رو سے ثابت ہو گیا کہ کاغذی وعدے بہت مضبوط ہوتے ہیں، اور اگر ایک دفعہ بھائی ... نے یا ... مولوی نے کسی نورانی یا دیر سیلزی قسم کے عہد نامہ پر دستخط کر کے اس کے آگے تعلیم خود لکھ دیا تو بس پھر کیا ... کہ مسلمانوں کو گورنمنٹ بہادر بھی ہندوستان سے نہیں نکال سکتی۔ اسی لئے تو کیا نام کہ ہمارے بڑے بڑے لیڈر اور لیڈر قسم بھائی حاجی توشک آلی و بھائی حاجی داؤد شافعی و بھائی حاجی تلوار علی خاں و بھائی ذوالدیسر البقا و دیگر بڑے بڑے سرمایہ ہیچو قسم سب رات دن اسی فکر میں لگے ہوئے ہیں کہ کسی طرح چپکے سے ہندوؤں سے اس قبالے پر دستخط کرالیں، حتیٰ کہ بعض بعض لیڈروں پر تو کھانا پینا سب حرام ہو گیا ہے۔ سنا ہے کہ بھائی حاجی توشک آلی کو اسی فکر میں نیند نہیں آیا کرتی تھی، اس لئے اب مجبور ہو کر انہوں نے روئی کپڑے پر ایک ولایتی قسم کی فرنگن نرس گھر میں رکھی ہے جو ان کو روزمرہ جدید ترین سینٹی فک طریقوں سے ان کے دماغ پر "..." یا خدا جانے "یام شو" کیا کرتی ہے تب کہیں جا کے ان قومی فکروں میں نیند آتی ہے اور مشکل ادنیٰ سیر ڈیڑھ سیر پانی اور دودھ ہضم ہو پاتا ہے۔ جب کیا نام کہ ایسی ایسی مصیبتیں جھیلی جاتی ہیں تب کہیں ہمارے مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ ہوتا ہے اور مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ از خود ضروری ہے خواہ ان کی جانیں بالکل ہی غیر محفوظ ہو جائیں، کیونکہ جانیں اگر غیر محفوظ ہو جاتی ہیں یا ضائع ہوا کرتی ہیں تو وہ عام مسلمانوں کی ہوتی ہیں جو نہ حاجی ہوتے ہیں اور نہ مولانا، اور جو کیا نام کہ اگر خاں صاحب بھی ہوتے ہیں تو گورنمنٹی قسم کے خان بہادر اور خاں صاحب نہیں ہوتے ان کی جان کی قیمت ہی کیا؟ جیسے دس بیس سو پچاس کتے بلیاں مر جاتی ہیں اور کوئی خبر نہیں ہوتا، اسی طرح سو پچاس عام مسلمان بھی اگر چھٹے چھ ماہے اپنے لیڈروں کے سر صدقے ہوتے رہیں

تو اس میں کیا قباحت ہے۔ البتہ بڑے بڑے لیڈران و لیڈران و ڈاکٹران و ممبران کے سر سلامت اور کرسی برقرار رہنی چاہئیے کیونکہ کونسل اور اسمبلی کی کرسیوں کے ایک ایک پائے سے ہزار ہزار حقوق مسلمانوں کے وابستہ ہیں، اور اگر کبھی کوئی ایک کرسی ادھر سے اُدھر ہو گئی اور اس پر کوئی غیر مسلم قسم کا آدمی بیٹھ گیا تو مسلمانوں کے تمام کے تمام حقوق کچل جائیں گے۔ پس لازم آیا کہ اپنا ایک کونسلی قسم کا آدمی بیٹھ گیا تو مسلمانوں کے تمام کے تمام حقوق کچل جائیں گے۔ پس لازم آیا کہ اپنا ایک کونسلی قسم کا حق کچلوانے سے یہ بہتر ہے کہ اپنے ایک ہزار سر کچلوا دیئے جائیں بشرطیکہ کچلے ہوئے سروں میں کوئی سرکاری حاجی یا مولانا یا ڈاکٹر یا مسٹر قسم کے آدمی کا نہو۔

اتنی گفتگو کے بعد حاجی بلغ العلیٰ صاحب نے کسی قدر دم لیا اور پھر فرمانے لگے کہ اندریں حالات بنا بریں حادثات کہ جو پریس آرہے ناس و دیگر آرہے اس ہمارے ہنگامی وضع الوضعی کے ملک میں جاری و ساری ہونے کی وجہ سے منصۂ شہود پر (کیا نام کہ ہم تھی اُردو بولنا بھی جانتے ایسے بغلول تخلص) آگئے ہیں، ہم نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ بھائی "ریاست" کی طرح سے ہم بھی اپنے تمام شذرات و مقالات و تحریر کے اسپاچھا وغیرہ کو بند رکھیں اور اپنی عمر عزیز آیندہ زیادہ نیک کاموں میں گذارا کریں۔ فاہذا قلمی ہوتا ہے، یا یوں کہیئے کہ زبانی ہوتا ہے کہ آیندہ ہم یعنی بندہ حاج الحرمین الشریفین الی یار الہیٰ المعروف بہ حاجی بغلول قدس سرہٗ بعون خلاق زمین و زمان و بفضل صناع مکین و مکان دریں ایام نیک فرجام گوشہ نشینی کا ارادہ کر چکا ہے، اور اب اپنا تمام وقت جدید قسم کی تحقیقات و تازہ بتازہ نو بنو قسم کی ایجادات میں صرف کیا کرتا ہے۔ اندریں دلاہیں ایک بہت بڑی قسم کی کامیابی بھی ہوئی ہے، اور وہ یہ کہ ہم نے ایک نئے وبائی مرض کے کہ جو از قسم ملیریا و ہیضہ و طاعون و تپ محرقہ و تپ دق و تپ لرزہ وغیرہ کے ہے، اور کچھ عرصہ سے ہندوستان میں پھیلنا شروع ہوا ہے، جملہ اسباب و علامات وغیرہ بکوشش بلیغ معلوم کر لئے ہیں حالانکہ تمام بڑے بڑے اور نامی گرامی اطبا اور ڈاکٹر اور قدیم کتاب قسم کے حکما اور وید ابھی تک اس سے بالکل ناواقف ہیں۔ اس وبا کا نام "اعضا شکنی" ہے کیونکہ اس میں مریضوں کے دست و بازو ٹوٹتے اور سر پھوٹتے ہیں۔ حال ہی میں یہ وبا بلدہ بمبئی میں ظاہر ہوئی تھی اور کم بیش ہندوستان کے بعض دوسرے مقامات تک بھی اس کے اثرات پہنچ گئے تھے۔

طاعون اور ہیضہ کی طرح اس بیماری کے بھی ایک خاص قسم کے جراثیم ہوتے ہیں، لیکن یہ جراثیم خوردبینی قسم کے نہیں ہوتے کہ جو آنکھ سے نظر نہ آئیں بلکہ بڑے موٹے موٹے ضخیم و تخیم اور کرسی نشینی قسم کے ہوتے ہیں۔ یہ فربہ و دبیز اور طول و عریض جرثومے انسانی خون کے اندر خود داخل نہیں ہوتے جیسا کہ دوسرے جراثیم کا قاعدہ ہے، بلکہ ان کے منہ سے ایک خاص قسم کی چنگاریاں نہیں شرارے یا آتش پارے کہا جاتا ہے عالم دیوانگی یا عالم فرزانگی میں نکلا کرتی ہیں، وہ کانوں کے راستے سے لوگوں کے جسم میں داخل ہو کر ان کے دل اور دماغ پر کہ رئیس اعضائے جسم ہیں اثر کیا کرتی ہیں۔ دماغ متورم ہو جاتا ہے اور سوچنے سمجھنے کی قوت اس سے زائل ہو جاتی ہے اور دل میں ایک عجیب قسم کی آگ لگ جاتی ہے کہ جس سے بیچین اور بیقرار ہو کر مریض دیوانے کتے کی طرح بھاگا بھاگا پھرتا ہے اور تاوقتیکہ دوسروں کا سر نہ پھوڑے یا اپنا سر نہ پھڑوا لے کسی طرح چین ہی نہیں پڑتا۔ اسقدر فرمانے کے بعد حاجی صاحب کی یکایک ہم پر نظر پڑی "ہائیں! کیا نام کہ آپ تو ہماری باتیں بھی سب لکھتے جا رہے ہیں؟ اب ہم کچھ نہیں کہیں گے۔ کیا نام کہ بہت خراب قسم کے آدمی ہیں آپ بالکل ایڈیٹر قسم کے!"

ہم نے پھر خوشامد درآمد شروع کی اور اُس وقت معلوم ہوا کہ سعدی صاحب نے جو گلستاں میں فرمایا ہے کہ "احمق را ستائش خوش آید" وہ بالکل صحیح ہے، حاجی صاحب پھر راضی ہو گئے، فرمانے لگے۔

"اچھا منیجر صاحب، اس وقت تو ہم [illegible] کچھ نہیں بتا سکتے لیکن [illegible] بار بار کا نام کر [illegible] آئندہ [illegible] کہتے ہیں [illegible] بعد کی ساری [illegible] کو پوری [illegible] سے اس بیان کی [illegible] پورا کر دیں گے۔

ڈاکخانہ والوں کی "نوازشہائے بیجا" یا "نگہ ناروا"

ہماری صاف گوئی [illegible] کہ ہم نے اکثر پرچوں میں اپنے دفتر کے بعض راز آ پوشیدہ کی اعلان کر دئے [illegible] اسی طرح ڈاکخانہ والوں کو یہ معلوم ہو گیا کہ [illegible] دفتر میں بجائے [illegible] ایک ہی منیجر صاحب ہیں اور وہ بھی خیر سے ایک بڑی حد تک [illegible] قسم کے، وہی پتے لکھتے ہیں، وہی ٹکٹ لگاتے ہیں اور وہی رسالہ روانہ کرتے ہیں۔ اس لئے انہوں نے یقین کر لیا کہ "سعید" کے دفتر میں کام کے متعلق بہت کچھ ابتری اور بدنظمی ہو گی، لہذا اس کے بیشتر پرچے بھی راستہ میں غائب [illegible] کر دئیے جائیں، وہ سب بآسانی [illegible] کے سر تھوپے جائیں گے کہ [illegible] بھیجا ہی نہیں ہے۔ چنانچہ گذشتہ [illegible] مہینوں میں خریداروں کی بکثرت شکایتیں دفتر میں آئی ہیں کہ پرچہ وصول نہیں ہوا۔

ہمارے منیجر صاحب "مختصر ہوں یا طویل و عریض" اور "واحد ہوں یا ثلاثہ و ثالث در بلغ" وہ [illegible] منیجر صاحب، اور ہم کامل وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ دفتر میں کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ کسی خریدار کے نام پرچہ روانہ ہونے سے رہ جائے، کیونکہ ڈاک خانے بھیجنے سے پہلے ایک مرتبہ خود ہم بھی رجسٹر ہاتھ میں لیکر ایک ایک نام کا پرچہ اپنی آنکھ سے دیکھ لیتے ہیں، اور پھر مجموعی تعداد بھی رجسٹر کی تعداد خریداران سے ملا لیتے ہیں۔ اس لئے اس کا تو قطعاً کوئی امکان ہی نہیں کہ [illegible] کسی خریدار کا پرچہ نہ روانہ ہو، اور چونکہ خریداروں کے ہاتھوں میں پہنچنے سے پہلے وہ ڈاکخانہ والوں کے علاوہ کسی اور زید، عمر، بکر کے ہاتھ میں نہیں جاتے، اس لئے مجبوراً یہی نتیجہ نکالنا پڑتا ہے کہ جو پرچے [illegible] خریداروں تک نہیں پہنچتے وہ مختلف مقامات کے پوسٹ ماسٹروں، کلرکوں اور ڈاکیوں کے ہاتھوں میں ضرور پہنچ جاتے ہیں اور "ضائع" نہیں ہوتے۔

اور حقیقتاً ہمارے لئے باعث مسرت اور موجب صد اطمینان ہے کہ "سعید" کے پرچے ضائع نہیں ہوتے اور ایسے قدرشناسوں کی نذروں پر تکیہ پاتے ہیں کہ جنہیں اُن سے اس شدید عشق ہے کہ چوری کر کے پڑھتے ہیں لیکن انہیں پڑھتے ضرور ہیں، پھر بھی جب ہر مہینے کم و بیش پچاس پرچے منیجر صاحب کو دوبارہ روانہ کرنے پڑتے ہیں تو انہیں بہت ہی ناگوار گذرتا ہے، اور وہ کئی مرتبہ ہم سے کہہ چکے ہیں کہ اس سے تو یہی بہتر ہے کہ جن جن مقامات پر "سعید" جاتا ہے ان سب جگہوں کے ڈاکخانوں کے نام ایک ایک پرچہ جاری کر دیا جائے اس طرح اگرچہ نقصان میں تو کمی نہ آئیگی لیکن خریداروں کو پرچہ وقت پر مل جایا کریگا اور انہیں شکایات کے خطوط پر ہر مہینے چند پیسے خرچ نہ کرنے پڑیں گے۔

تجویز ایک حد تک معقول ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ اگر پورے ڈاکخانے کے لئے ایک پرچہ لے لینے پر قناعت نہ کر کے کلرکوں اور پوسٹ مینوں نے الگ الگ اپنے لئے پرچے حاصل کرنے کی کوشش کی تو ہمارے اس قدر نقصان اٹھانے کے باوجود مصیبت پھر بدستور موجود رہیگی۔ غالباً اس سے یہی بہتر ہے کہ ہم بھی ڈاکخانہ والوں سے "بصد ادب استدعا" کریں اور خریدار صاحبان بھی اپنے اپنے طور پر مقامی ڈاکخانوں کو شکایتی خطوط لکھیں، شاید خدا ان کے دلوں میں رحم ڈال دے اور وہ اس طرح ناجائز طریقے پر حاصل کر کے "سعید" کو پڑھنے کی بجائے اسے خرید کر پڑھنے پر آمادہ ہو جائیں۔

"سعید" کی عمر ایک سال

"سعید" کا پہلا پرچہ

اگست ۱۹۳۱ء میں نکلا تھا، اور اس حساب سے جولائی ۱۹۳۲ء میں اس کی عمر کا پہلا سال پورا ہو جائیگا۔ ہر نوزائیدہ کے حق میں اسکی زندگی کا پہلا سال طرح طرح کے خطرات اور گوناگوں مشکلات سے پُر ہوا کرتا ہے۔ "سعید" بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہ رہ سکا اور اسے بھی اپنے ایڈیٹر کی طویل علالت، اپنے قدر دانوں کی ناقدرشناسی، اور مضمون نگاروں کی سرد مہری و بے التفاتی کی مصیبتیں برداشت کرنی پڑیں، جن کی وجہ سے مقررہ وقت پر اس کی اشاعت بھی ممکن نہ ہو سکی، اور وہ اپنی ظاہری اور معنوی خوبیوں میں بھی اس قدر ترقی نہ کر سکا کہ جتنی اس کے ایڈیٹر کی تمنا تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ جن ناخوشگوار حالات اور ناموافق کیفیات میں وہ نکلتا رہا ہے ان کی تاب شاید ہر نیا پرچہ نہیں لا سکتا اور یہ واقعہ ہے کہ خود نیم مردہ ہو جانے کے باوجود اگر میں "سعید" کو زندہ رکھنے میں اب تک کامیاب ہوا ہوں، تو اسے خدائے کردگار کے فضل و کرم کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

میں اس حقیقت سے ناواقف نہیں ہوں کہ ملک میں آج صدہا اخبار اور رسالے موجود ہیں، اور روز مرہ اس تعداد میں دو چار کا اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے اور مانگ کی کمی اور پیداوار کی کثرت کا نتیجہ ہمیشہ یہی نکلتا ہے کہ پیداوار کی قدر و قیمت گھٹ جائے، اور ہر خریدار نئے سال کا چندہ دیتے وقت طرح طرح کے رنگ لائے۔ گذشتہ سال کا چندہ ختم ہوتے ہی اسی رسالے میں کہ جسے اب تک انتہائی شوق کے ساتھ پڑھا کرتے تھے، اور جسے بہترین رسالہ خیال کیا جاتا تھا، اسی میں صدہا اصلی اور خیالی عیب نکل آتے ہیں اور کل جدید لذیذ (ہر نئی شے زیادہ لذیذ معلوم ہوا کرتی ہے) کے مطابق بیسیوں دوسرے رسالوں کے نام ذہن میں گھومنے لگتے ہیں۔ اب تک ان میں جو بُرائیاں تھیں وہ نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہیں، اور ان کی خوبی چشم تصور کے سامنے آتی ہے اور اشتیاق بڑھاتی ہے نئی چیز کا شوق پُرانے تعلقات پر پانی پھیر دیتا ہے، اور فوراً دل پر پتھر رکھ کر دو پوسٹ کارڈ لکھ دیئے جاتے ہیں ایک پُرانے رسالے کے دفتر کو کہ آیندہ پرچہ نہ بھیجا جائے، اور دوسرا نئے انتخاب شدہ رسالے کے منیجر کو کہ پرچہ فوراً جاری کر دیا جائے

"سعید" کو بھی یہ نازک وقت سامنے نظر آ رہا ہے، اور جس طرح ماں کا دودھ چھڑایا جانا بچے کی صحت و قوت کے لئے حد سے زیادہ مضرت رساں ثابت ہوا کرتا ہے اسی طرح "سعید" کو بھی پہلا سال پورا کرنے پر بہت سی بارگاہوں سے نکالے جانے کے خطرات لگے ہوئے ہیں۔ بالخصوص اس لئے کہ اس سے تو یہ ناقابل معافی گناہ بھی سرزد ہو چکا ہے کہ اس کی اشاعت پورے ایک ایک مہینے کی تاخیر سے ہوتی رہی ہے اور اس طرح گویا نئی دلچسپیوں میں مصروف ہونے والوں کو پُرانے تعلقات منقطع کرنے کے لئے کوئی اور بہانہ ڈھونڈنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔

اپنی صفائی میں میں اگر کوئی چیز پیش کر سکتا ہوں تو وہی اپنی بیماری کی پُرانی داستان جسے سننے کے لئے بھی کوئی تیار نہیں ہے، اور جسے سُناتے مجھے خود بھی شرم آتی ہے، یا پھر تلافیٔ مافات کا یہ واقعہ کہ میں نے جس طرح بھی ہو سکا سال کے پورے بارہ پرچے خریداروں کی خدمت میں پہنچا دیئے، اور اب نئے انتظامات کے ساتھ نیا سال شروع کرنے کے لئے تیار ہوں۔

بہرحال میری ان کوششوں اور خدمت گذاری کی ان خواہشوں کے باوجود اگر آپ "سعید" سے بددل ہو چکے ہیں، اور کسی نئے رسالہ کی عریاں و نیم عریاں تصاویر یا سال بھر میں دو دو اور تین تین خاص نمبروں کے وعدے آپ کی توجہ کو اپنی

اپنی طرف منعطف کر چکے ہیں تو مجبوری ہے' لیکن اگر ابھی آپ نے فیصلہ نہیں کیا ہے تو میں "سعید" کی طرف سے صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ برا یا اچھا' اور مفید یا غیر مفید جیسا کچھ بھی ہے وہ آپکے سامنے ہے۔ آپ ایک مرتبہ پھر ایک سرسری سی نظر سال بھر کے بارہ پرچوں پر ڈال جائیے' اور اگر اس میں برائیوں سے زیادہ بھلائیاں نظر آئیں تو اس کی سرپرستی بدستور جاری رکھیئے' ورنہ بصورت دیگر اگر نظر ثانی کے بعد بھی وہ آپ کو اچھا نہ معلوم ہو یا اس کی عدم پابندی وقت کا جرم ناقابل معافی ہی ٹھہرے تو آپ اس سے قطع تعلق کر لیجئے' لیکن خدا کے لئے موافق یا مخالف جو فیصلہ بھی آپ کریں وہ "سعید" کی اپنی خوبیوں اور اس کی اپنی کوتاہیوں کو مدنظر رکھ کر کیجئے۔ اسے مقابلہ کے لئے ان بے شمار خوبصورت اور چمکدار' ادبی' اصلاحی' اخلاقی' تمدنی علمی اور مذہبی رسائل کی صف میں لاکر نہ کھڑا کیجئے کہ جہاں اس کی جگہ نہیں ہے۔ غریب "سعید" پاک اور صاف کھدر ہے اور کسی حالت میں بھی سستے اور خوشنما جاپانی یا جرمنی ریشم کے مقابلہ میں آنا نہیں چاہتا!!

ہماری "خدمتگذار" انجمنیں

گذشتہ پچیس (۲۵) تیس سال کے عرصہ میں بڑی اور چھوٹی' اور کھری اور کھوٹی پچاسوں انجمنیں ایسی قایم ہو چکی ہیں کہ جن کا یہ دعویٰ ہے کہ ان کا مقصد صرف اسلام اور مسلمانوں کی خدمت گذاری ہے' اور واقعہ یہ ہے کہ اگر ان انجمنوں کے کاموں پر نہیں' بلکہ صرف ناموں پر نظر ڈالی جائے تو دل فرط مسرت سے لبریز ہو جاتا ہے۔

چھوٹی چھوٹی انجمنوں کا تو ذکر ہی کیا ہے' بڑی بڑی اور مشہور انجمنوں میں سے خلافت کمیٹی' مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس ہر ایک کا یہ دعویٰ ہے کہ مسلمانان ہند کی نمایندگی اگر کوئی انجمن کر سکتی ہے تو صرف وہی کر سکتی ہے' اور اگر مسلمانان ہند کی خدمت کرنیکا فخر کسی جماعت کو حاصل ہے تو وہ صرف ایک وہی جماعت ہے۔ ہندوستان کا جاہل اور ناواقف حالات مسلمان ایک عالم سراسیمگی میں منھ پھاڑ پھاڑ کر ہر سمت کو دیکھتا رہ جاتا ہے اور کسی طرح اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ان سب میں سے کس انجمن کو اپنا نمایندہ' اپنا خادم اور اپنا رہنما خیال کرے' جبکہ خدمت اسلام کے ہزاروں بلند بانگ دعووں کے باوجود کوئی سی دو انجمنیں بھی اپنے مقاصد میں متحد اور مشترک نہیں ہیں' اور ان میں سے ہر ایک اپنے سوا باقی سب انجمنوں کو فریب کار' غیر مخلص اور بے راہرو خیال کرتی ہے۔ یہ مصیبت اگر اسی جگہ ختم ہو جاتی تب بھی صبر کیا جا سکتا تھا' لیکن بدقسمتی سے ایسا نہیں ہے اور ہر انجمن کے اندر ایک مزید تفریق یہ بھی موجود ہے کہ اس کے کوئی سے دو ممبر بھی آپس میں ہم خیال نہیں ہیں' اور ان میں کا ہر ہر فرد صرف اپنے آپ کو مسلمانوں کا نمایندہ سمجھتا اور ظاہر کیا کرتا ہے۔

ہر انجمن کا زبانی دعویٰ تو یہ ہے کہ وہ قوم کی خادم اور قوم کی دردخواہ ہے' لیکن عملاً جو کچھ وہ کرتی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خدمت کرنے کی بجائے اس کا مقصد قوم سے خدمت کرانا ہے۔ ہر انجمن اپنی تحریر و تقریر میں زور تو اسی بات پر دیا کرتی ہے کہ مسلمانوں کی ہر قسم کی فلاح و بہبود خواہ وہ سیاسی ہو یا تمدنی اور معاشرتی' مذہب سے وابستہ ہے' اور مسلمان صحیح معنوں میں مسلمان بنے بغیر ہرگز ترقی نہیں کر سکتے' لیکن دیکھا یہ جاتا ہے کہ ایسا کہنے والی انجمنوں کے ممبروں میں سے اکثر اور بیشتر ایسے ہوتے ہیں کہ جنہیں مذہب سے کوئی دور کا واسطہ بھی نہیں ہوتا' اور اگر قوم کی رہنمائی کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ مذہبی

جماعت کے ہاتھوں میں ہو تو ان انجمنوں کو آخری صف سے آگے اور کہیں جگہ نہیں مل سکتی۔

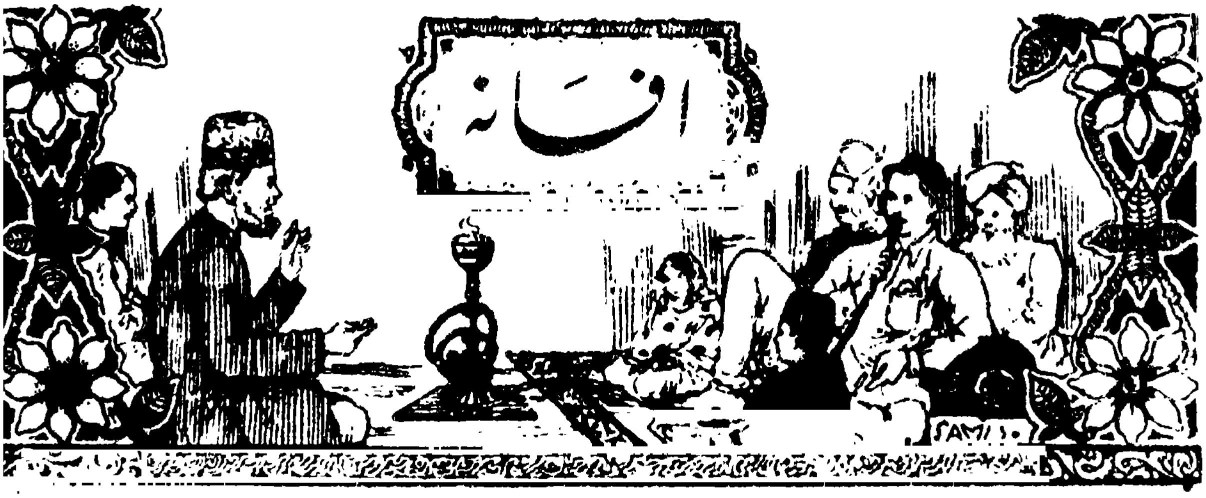
مسلمانوں کا خیال ہے، اور یہ ان کا صرف خیال ہی نہیں بلکہ حقیقت بھی ہے کہ مسلمان کا مرنا جینا کھانا پینا سونا جاگنا سب کچھ اللہ ہی کے لئے ہے۔ اور ان کی سیاست اور ان کا تمدن، ان کی معاشرت، غرضکہ اس دنیا میں زندہ رہنے کے متعلق ان کے تمام اصول ان کے مذہب سے وابستہ ہیں۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ ان کی نمایندگی یا ان کی رہنمائی اگر کر سکتی ہے تو صرف ایک ایسی ہی انجمن کر سکتی ہے جسے مذہبی اصولوں سے پوری پوری واقفیت اور علوم مذہبی پر پورا پورا عبور ہو، اور جنگ ہو یا صلح ہر حالت میں قوم کی قیادت کے لئے صف سے آگے نکلنے والے صرف وہی لوگ ہونے چاہئیں کہ جنھوں نے اپنی عمریں مذہب کے مطالعہ، اور مذہبی اصولوں کے سمجھنے میں صرف کر دی ہیں۔ یہ قابلیت یہ اہلیت، اور یہ استحقاق صرف ان ہی کو حاصل ہے کہ ہر دشواری کے موقعہ پر وہ قوم کو بتائیں کہ ایسے موقعہ کے لئے مذہب کا کیا حکم ہے، اور ایسی حالت پیش آجانے پر مسلمانوں کا کونسا طرز عمل مطابق مذہب ہوگا۔

خلافت کمیٹی ہو، یا مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس ان میں سے ایک جماعت بھی ایسی نہیں ہے جو ہماری صحیح رہنمائی کر سکے یا جسے یہ معلوم ہو کہ اسلام ہم سے کیا چاہتا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے کہ ہمارا مذہب ہی ہمارا اصلی رہنما ہے تو ہماری صف سے آگے نکلنے کا حق صرف اسی جماعت کو ہے جس کے ہاتھوں میں اسپنسر اور مل کی کتابوں کی بجائے خدا کی کتاب ہو، اور جس کا مقصد مخدوم بننے کی بجائے صحیح معنوں میں ہمارا خادم بننا ہو۔

ڈاکٹر سعید احمد صاحب کی نئی تصنیف

ڈاکٹر صاحب کے مقبول عام اور حد سے زیادہ دلچسپ افسانوں کا مجموعہ "دامن باغبان" کے نام سے چھپ کر تیار ہو گیا ہے۔ قصہ کی دلآویزی اور سلاست بیان کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کے افسانوں کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ بیحد سبق آموز ہوتے ہیں۔ بچوں، جوانوں، مردوں اور عورتوں سب کے لئے یکساں مفید ہونے میں شاید ہی کوئی مجموعہ اس کا مقابلہ کر سکے۔ کتاب نہایت عمدہ آرٹ پیپر پر چھپی ہے اور کتابت اور طباعت بیحد دیدہ زیب و دلنظر فریب ہے۔ عزیزوں اور دوستوں کو دینے کے لئے تحفہ کا کام دے سکتی ہے۔ ایک سو چھتر صفحوں کی خوب ضخیم کتاب ہے لیکن ان تمام خوبیوں کے باوجود قیمت صرف ایک روپیہ رکھی گئی ہے۔ ابھی سے فرمائشوں کی اس قدر کثرت ہے کہ اگر آپ نے منگانے میں دیر کی تو اندیشہ ہے کہ شاید دوسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا پڑے۔ اسی وقت فرمائش بھیج دیجئے۔

منیجر رسالہ "سعید" دہلی



۵۷ء کی دکھیا

گذشتہ سے پیوستہ

آٹھواں باب

ہم لوگ ابھی شہر کی اصلی آبادی میں داخل نہ ہو سکے تھے ابھی تو صرف اطراف شہر میں تھے، کاش محمد ہاتھی کو جلدی جلدی چلا کر مجمع کو چیرتا پھاڑتا راستہ بنا لیتا تو اس سے قبل شہر کے محفوظ محلوں میں پہنچ جاتے اور مزید بلاؤں سے محفوظ ہو جاتے کیونکہ شہر دلی ہندوستان میں بلحاظ آبادی سب سے بڑا اور مرکزیت کے لحاظ سب سے اہم ہے۔ دلی کی شہر پناہ کا مقابلہ دلی میں کوئی اور شہر پناہ مقابلہ نہیں کر سکتی بڑے بڑے ماہر مہندسین کی زیر نگرانی اس کی تعمیر ہوئی تھی۔ انگریزوں نے بھی اپنا بارود خانہ اسی لئے دلی میں رکھا تھا کہ اتنی محفوظ کوئی اور جگہ مشکل سے ہو سکتی تھی۔ غیر ملکیوں کے لئے بھی شورش کے موقع پر حفاظت کا اس سے بڑھ کر کوئی اور دوسرا موقعہ ناممکن تھا۔ چند قدم اور چلکر شہر پناہ کا دروازہ تھا اور ہم لوگ اس میں داخل ہی ہو رہے تھے کہ اندر سے غنڈوں اور لفنگوں کا ایک مجمع باہر آنے لگا۔ ہر شخص کی یہی کوشش تھی کہ سب ایک ساتھ نکلیں۔ اتنے بڑے مجمع کے سامنے ہماری کیا حقیقت تھی، اس لئے ہم لوگ پیچھے جا پڑے۔ شور و غل اور توپوں اور بندوقوں کی آوازوں جن سے آگے پیچھے دائیں بائیں سے ہم لوگ گھرے ہوئے تھے، کانوں کے پردے پھٹے جا رہے تھے۔ کچھ دیر کھڑے رہنے پر ہم کو معلوم ہوا کہ خوش قسمتی سے لوگ باری باری دروازہ میں سے نکل بھی رہے ہیں، اور اندر جا بھی رہے ہیں۔ ہم لوگ بھی جانے والوں کے ساتھ ملکر شہر میں داخل ہو گئے۔ چلتے چلتے ہم لوگ بارود خانہ کے سامنے والے میدان میں جا کر ٹھہر گئے معلوم ہوا کہ وہ لوگ جنرل گراؤ کی ہزیمت خوردہ فوج کے بقیۃ السیف ہیں جو شکست کھاتے ہی ہوا کے گھوڑے پر چڑھ کر شہر کو واپس بھاگ آئے تھے۔ ادھر جنرل گراؤ نے شہر میں آتے ہی حکم دیا کہ پل اٹھا دیا جائے، تاکہ میرٹھ کی بھیڑ شہر میں گھس کر اہل شہر کی

مزید تقویت کا باعث نہ ہو۔ مگر جنرل ابھی اچھی طرح حکم دینے بھی نہیں پایا تھا کہ وہ لوگ پل کو عبور کر کے فصیل شہر پر قابض ہو گئے۔ اب ہم کو یقین ہو گیا کہ اگر ان بے رحم مفسدوں کا اس قدیمی دارالحکومت اور سب سے بڑے مرکز پر قبضہ اور انگریزی ذخائر پر تسلط ہو گیا تو ہم سب لوگوں کا قتل یقینی امر ہے۔

مجھکو شورش کنندگان کے دہلی پر تسلط کے حالات بیان کرنا نہیں ہیں، اور نہ یہ ذکر کرنے کی کوئی ضرورت ہے کہ اس دوران میں کیا کیا حادثات و واقعات پیش آئے، کیونکہ نہ میرے پاس وقت ہے، نہ اُن کو میرے قصہ سے کوئی خاص تعلق ہے۔ میرا تو مقصد وحید صرف یہ بیان کرنا ہے کہ مجھ پر میرے شوہر پر اور میری بچی اور بچے پر اس حادثہ عظیمہ میں کیا پیش آیا اور صرف اُن مصائب میں ذکر کرنا ہے جن سے میرے قوائے مضمحل اور جان و مال برباد ہو گئے۔ انگلستان نہ میرا مرزبوم ہے، اور نہ میں اپنے آپ کو انگریزن سمجھتی ہوں۔ میں ایک فرانسیسی ہوں اور فرانس ہی میری جائے پیدائش ہے۔ ہاں میں نے تقدیر کے لکھے کے مطابق ایک انگریز سے شادی کر لی تھی، اور خدا نے مجھے اس شادی سے اولاد بھی دی، صرف اس لحاظ سے میں انگریز ہوں، اس سے اگر میرا اپنا گھر آباد، دولت و ثروت باقی اور سرتاج اور میرے جگر پارے صحیح و سالم باقی رہتے تو پھر مجھے اس کی بالکل پرواہ نہ تھی کہ ہندوستان سے انگریزی حکومت اُٹھ جائیگی یا رہیگی۔ دنیا میں انگلستان کا نام لیوا کوئی باقی رہیگا یا نہ رہیگا، یونین جیک سرنگوں ہو جائیگا یا سر بلند رہیگا، تمام کی تمام فوج مقتول ہو جائیگی یا بچ جائیگی۔ دولت و ثروت اور جاہ و جلال فقر و فاقہ یا ضعف و کمزوری سے بدل جائے یا رہ جائے۔ جو عورتیں میرے اس قصہ کا مطالعہ کریں گی، اور جو جو مصائب میں نے جھیلے اُن سے آگاہ ہونگی، اُنہیں معلوم ہو جائیگا کہ اس طرح زندگی سے تو موت بدرجہا بہتر چیز ہے، کیونکہ عورت کے نزدیک خاوند اور اپنے بچوں کی صحت و سلامتی سے زیادہ پُرلطف اور کوئی دوسری حالت نہیں ہے۔ مگر وائے افسوس میرے شوہر کے اس عقیدے نے کہ "جو شخص اپنے مُلک قوم کی عزت چاہتا ہے اور اپنی حکومت کی مدد کرنا چاہتا ہے اُس کو ضرورت کے وقت میدان جنگ میں کود پڑنا چاہیئے خود مارے یا مر جائے" میری تمام آرزوؤں کو خاک میں ملا دیا۔

خلاصہ یہ کہ ہم لوگ مجمع سے بچتے بچاتے اندھیرے میں گلی کے پیچھے پیچھے منزل مقصود کی طرف چلتے رہے، اور دارالحکومت سے آگے نکل گئے۔ پھر سینٹ جیمس کے گرجا کے پیچھے کے راستہ پر پڑ لئے۔ اس طول طویل راستہ کو اس لئے اختیار کیا کہ میدان میں جو مجمع ہو رہا تھا اُس کے سامنے سے نہ گذرنا پڑے۔ چلتے چلتے آخر ہم سب اپنے دوست سوداگر کے دروازہ کے سامنے پہنچ گئے جس کا شروع ہی سے قصد کر کے چلے تھے۔ دروازے سب مقفل اور کھڑکیاں بند تھیں اور گھر پر ایسی خاموشی طاری تھی جیسے اس گھر کو حوادث کا مقابلہ کرنے کے لئے اہل خانہ کو چھوڑے ہوئے برسیں گذر گئیں ہوں۔ اُنہوں نے دروازہ کھٹکھٹایا مگر کسی نے جواب نہیں دیا۔ پھر دوبارہ کھٹکھٹایا مگر ایک خاص طرح سے مگر اب کے بھی کسی نے جواب نہیں دیا۔ طرح طرح کے خیالات آنے لگے۔ کبھی خیال ہوتا تھا کہ ایسا قدیم اور مخلص دوست کہاں چلا گیا اسی دوست پر تو سب سے زیادہ ہم کو بھروسہ تھا، پھر جبکہ وہی حقوق دوستی و برادری کا اس طرح جواب دے رہا ہے تو اب کس سے اُمید کی جائے؟ لیکن اس طرح بے رُخی کرنیکا کیا سبب ہے؟ اور اپنے آپ بے چین سے ہو کر آخر ہماری اس مصیبت سے کیونکر اُس کو

کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ ہم محمد سے اُنہی سے اُتر کر چاروں طرف دیکھا کہ اس گھر میں کوئی انسان رہتے ہی یا نہیں، مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ بسری مرتبہ ہم لوگوں نے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا جس سے ایک دفعہ سارا گھر گونج اُٹھا۔ اس پر ایک کھڑکی کھلی اور اُس میں سے ایک بڑھیا نے سر نکال کر کہا کہ اگر تم صاحبان کی تلاش میں ہو تو وہ تو مسلح ہو کر اپنے نوکروں اور نوکرانیوں کے ساتھ برج میگزین گئے ہوئے ہیں جہاں انگریزی افسر مقیم ہیں لڑکیوں اور عورتوں کو بیگم شمرو کے محلہ میں بھیجدیا ہے کہ اُن کی حفاظت میں رہیں۔ اس کے بعد بڑھیا نے کہا کہ یہاں سے جلدی سے بھاگ جاؤ کوئی اور ٹھکانا تلاش کر لو۔ کیونکہ یہ گھر دولت و ثروت میں مشہور ہے۔ مفسد آج رات میں اس پر ضرور حملہ کریں گے۔ یہ کہکر بڑھیا نے کھڑکی بند کر لی اور ہم لوگ سڑک پر حیران و پریشان کھڑے رہ گئے۔

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکی ہوں اُن کا شروع ہی سے ارادہ تھا کہ اپنے ابنائے وطن کے ساتھ شریک ہو کر دفاع کی کوشش کریں۔ مگر بیوی بچوں کی محبت باز آتی تھی کیونکہ ایسے وقت میں تو ہر شخص کے لئے تقریباً ناممکن ہی سا ہے کہ اپنی بیوی بچوں کو مصائب اور آفات کا نشانہ بننے کے لئے بے یار و مددگار چھوڑ دیتے۔ اگر ہم لوگوں کی سواریاں بھی ہمارے پاس ہوتیں تو ممکن تھا کہ کشمیری دروازہ کے راستہ ہم لوگ جنرل کراؤ سے جا ملتے۔ مگر اس قدر طول طویل راستہ کا پیدل طے کرنا گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ سے کم کا کام نہ تھا، اور شور و شغب کی زیادتی یہ بتا رہی تھی کہ مفسدوں کو بدستور غلبہ حاصل ہو رہا ہے اور انگریز بدستور مغلوب ہوتے چلے جا رہے ہیں، ایسی حالت میں جلد از جلد کسی جائے پناہ تک پہنچ جانا ضروری تھا۔ ایلین فرار کے وقت سے بالکل خاموش تھی اور ایک لفظ بھی اُس نے اب تک زبان سے نہیں نکالا تھا، اُس کی تمام تر توجہ اپنے شوہر پر مرکوز تھی جسم اُس کا ضرور ہمارے ساتھ تھا مگر وہ خود ولیم کے پاس تھی۔ مگر جب اُس نے دیکھا کہ ہمارے دونوں کوئی ٹھکانا قائم کرنے سے قاصر ہیں کہ اب کہاں پناہ لی جائیں تو اُس نے چپکے کہا کہ یہاں کھلی سڑک پر کیوں کھڑے ہو بارود خانہ کیوں نہیں چلتے۔ بارود خانہ نہایت اہم اور محفوظ جگہ ہے، ہم لوگ وہاں امن سے ہو جائیں گے۔ ایلین کی یہ تجویز ظاہر ہے کہ صرف اس لئے تھی کہ کسی طرح وہ اپنے شوہر کے پاس پہنچ جائے، جو بارود خانہ کی حفاظت پر مامور تھا۔ مگر اس تجویز کو سن کر وہ خوش ہو گئے، اور کہنے لگے ایلین سچ کہتی ہے اور میرے نزدیک اُس کی رائے صحیح ہے اگر ہم وہاں پہنچ گئے تو اس وجہ سے کہ تمام انگریز وہاں جمع ہیں ہم کو کوئی مصیبت نہیں پہنچ سکتی۔ میں نے بھی دونوں سے اتفاق کیا اور سب چل پڑے مگر ہم ابھی کچھ تھوڑی دور چلے تھے کہ ایک نئی مصیبت نے آ گھیرا اور ہم لوگ آگے بڑھنے سے رُک گئے اور ہمارا راستہ بند ہو گیا۔

ہمارے پیچھے سے ایک فوج آتی ہوئی معلوم ہوئی، ان لوگوں کے ہاتھوں میں مشعلیں تھیں اور بہت تیز چال چل رہے تھے، اور اپنے بادشاہ کی تعریف کرتے جاتے تھے! سامنے سے مفسدوں کی ایک ٹولی آئی۔ اس ٹولی کا ہر فرد دوسرے کو انگریزوں کے قتل کر دینے اور اُن کے مال و منال کو لوٹ لینے پر اُبھار رہا تھا۔ ہماری قسمت سے ہاتھی ہمارے لئے بہت بڑی حفاظت ثابت ہوا، ہم اُس کے پیچھے پیچھے چلتے تھے، اور اگر وہ نہ ہوتا تو ملاقات کے موقع پر دونوں ٹولیوں کے درمیان میں ہمارا گھر جانا اور گھر کر ہلاک ہو جانا بالکل یقینی تھا۔ ہاتھی ہمارے اور اُن جماعتوں کے درمیان حائل ہو گیا۔ غرض ہم انہیں حالات میں آگے بڑھتے رہے، یہاں تک

سامنے ایک پھاٹک نظر آیا، اور ہم لوگ پھاٹک میں چلے گئے اور وہیں کسی محراب کے نیچے چھپ کر کھڑے ہوگئے۔ دونوں ٹولیاں مل گئیں، مگر ہم کو نہیں دیکھا۔ یہ دیکھ کر کہ پلٹن نمبر ۷۴ اور نمبر ۲۰ نے اپنے انگریز افسروں کو قتل کرکے اُن کے سر سنگینوں پر اُٹھا رکھے ہیں، ہم کو یقین کامل ہوگیا کہ شورش ضرور بڑھیگی اور پھیلیگی اور ایسی پھیلیگی کہ تمام اگلی شورشیں اُس کے سامنے ماند ہو جائیں گی اور اس سے کامیابی کے ساتھ مقابلہ سخت مشکل ہوگا۔ جب راستہ صاف ہوگیا تو ہم لوگ پھر بارود خانہ کی طرف چلے۔ ایلن کا ہاتھ پکڑے ہوئے سب سے آگے وہ تھے اور اُن دونوں کے پیچھے میں تھی اور میری گود میں ولی تھا جسے نیند آنے لگی تھی، اور میرے پیچھے ولی کی انّا تھی۔ ان مناظر کو دیکھ کر ہم میں سے ہر شخص تھر تھر کانپ رہا تھا۔ چلتے چلتے ہم لوگ انگریزی حکومت کے باغ تک پہنچے۔ باغ کی دیواریں خستہ وخراب ہو رہی تھیں مگر یہاں ہماری آنکھوں کے سامنے ایک اور ہولناک منظر تھا جس نے ہمارے اضطراب قلق کو اور زیادہ کر دیا۔ راستہ کے ختم پر ایک مسجد تھی ہم نے دیکھا کہ فوجیں اس محلہ میں جانا چاہتی ہیں اور گو قتل ہو ہو کر گر رہی ہیں مگر پیہم اور مسلسل سخت حملے کر رہی ہیں کہ کسی طرح محلہ میں گھس جائیں۔ مفسدوں کے اس حملہ سے معلوم ہوا کہ غالباً انگریزوں نے مسجد کو فوجی مستقر بنالیا ہے کہ وہاں سے مفسدین کو اُدھر سے گذرنے سے روک سکیں مگر آخرکار مفسدوں نے مسجد پر قبضہ کرلیا اور چن چن کر سب کو قتل کر ڈالا۔

مکانات جل رہے تھے، اور ہندوستانی عجیب عجیب اور خوفناک طریقوں سے گھروں میں گھستے پھرتے تھے، اور ایک گھر میں سے دوسرے گھر میں کودتے اور جلتی ہوئی لکڑیاں گھروں میں ڈالتے پھرتے تھے کہ آگ اچھی طرح پھیل جائے۔ شاہی محلات اس جگہ سے مشرق میں تھے، اور اتفاق سے ہوا بھی پُروا ہی تھی ان لوگوں کا ارادہ یہ تھا کہ انگریزوں کے مکان تک پھونک دیں اس لئے کسی ایک گھر میں آگ لگا دی تھی، اور یہ قاعدہ ہے کہ آگ جس وقت لگتی ہے تو حرارت سے ہوا میں حرکت پیدا ہو جاتی ہے، ہوا تیز ہوگئی اور آگ بھڑک اُٹھی، اور انگریزوں کی عالیشان عمارات سب کی سب جلکر خاک کا ڈھیر ہوگئیں۔ مگر شاہی محلات بالکل محفوظ رہے، اِس دوران میں ہجوم اور اژدھام اور زیادہ بڑھ گیا۔ ہر شخص ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش میں لگا تھا۔ ہم لوگ ان کے درمیان پھنس گئے، ان میں سے ہر شخص کی زبان پر یہی الفاظ تھے کہ انگریزوں کو قتل کردو۔ خوبی اتفاق سے داہنی طرف ایک مکان نظر پڑ گیا اور ہم اُسکی طرف چل پڑے اگو ہم کو خوب معلوم تھا کہ مفسد اُس پر قابض ہوکر لوٹ کھسوٹ چکے ہیں اور اب تک اُس میں موجود ہیں۔ جب ہم اُس گھر کے اندر پہنچے تو معلوم ہوا کہ اُس کا دروازہ بہت بڑا ہے، اور اندھیرے کی وجہ سے محفوظ بھی ہے۔ اس لئے ایسے وقت میں اس کے اندر چھپ رہنا بھی بہت غنیمت معلوم ہوا۔ محمد فیلبان محلہ کے نکڑ تک تو ہمارے ساتھ رہا، مگر اس کے آگے اُس کے لئے صفیں چیر کر چل سکنا ناممکن ہوگیا، اور مجبوراً اُس کو دوسرا راستہ اختیار کرنا پڑا۔ ولی میری گود میں غافل سو رہا تھا مگر اب خوفزدہ ہوکر جاگ اُٹھا اور چیخنے چلانے لگا، اس خیال سے کہ کہیں شورش کنندگان اُس کی آواز سُن کر ہماری موجودگی سے آگاہ نہ ہو جائیں۔ میں اُس کو بہلانے پھسلانے اور چمکارنے اور پیار کرنے لگی مگر وہ بدستور روتا رہا۔ بچہ کو کیا معلوم کہ ہم اُس وقت کس حال میں تھے۔

نواں باب

ہولناک سرداب

جس گھر میں ہم نے پناہ لی تھی وہ ایک مالدار انگریز کا تھا۔ جس کے متعلق ہم کو کچھ معلوم نہیں کہ وہ شروع ہی میں اپنے اہل و عیال کے ساتھ وہاں سے بھاگ گیا تھا یا موت کا شکار ہو گیا تھا۔ اس وقت وہاں ہندوستانیوں کا قبضہ تھا اور وہ لوگ بالائی منزل پر دوڑتے اور پاگلوں کی طرح کمروں کی تلاشی لیتے اور مندروں بیلوں کی طرح چیختے جاتے تھے اور ایک کھڑکی سے دوسری کھڑکی کودتے پھر رہے تھے۔ آلات و ظروف کو توڑتے پھوڑتے، عطر کی شیشیوں کو لنڈھاتے اور بار بار بستروں اور گدّوں کو جلاتے، آئینے اور دیبا و حریر کے پردوں اور تکیوں کو چیر پھاڑ رہے تھے۔ جب یہ لوگ ان حرکات سے فارغ ہو گئے تو صحن میں چتا کی طرح لکڑیوں کا ایک انبار لگا دیا۔ چتا تیار کر کے وہ لوگ زیرین منزل اور گھر کی چھوٹی چھوٹی جگہوں کو ڈھونڈنے لگے۔ ہمارے کانوں میں ان کی کتوں جیسی آوازیں برابر آ رہی تھیں کہ جب کتے کو شکار پر چھوڑا جاتا ہے اور وہ اس کے پیچھے بھونکتا ہوا دوڑتا ہے، اور جب پا جاتا ہے تو شکار کے گوشت میں اپنے دانت گاڑ کر خوشی اور کامرانی میں بھونکتا ہے۔ مفسدوں کی یہ آواز ہر چند منٹ کے بعد آتی تھی، اور اس کے فوراً بعد ایک دوسری آواز ایسی آتی تھی جیسے کسی کو کوئی تکلیف ہوتی ہو، جس سے معلوم ہوتا تھا کہ لرزہ کی آواز مظلوموں کی ہے اور خوشی و مسرت کی آواز ظالموں کی ہے۔

دروازہ میں اندھیرا ہونے کی وجہ سے اب تک ہماری طرف کوئی متوجہ نہیں ہوا، مگر اب ہم پر یہ خوف غالب ہونے لگا کہ جب گھر کا کام ختم کر چکیں گے اور گھر میں سے نکلنے لگیں گے تو دروازہ کی بھی تلاشی لیں گے اور ہم کو قتل کر دیں گے، اور ہمارا انجام بھی کسی طرح اچھا نہیں ہوگا۔ اس لئے اللہ پر بھروسہ کر کے ہم صحن میں چلے گئے، اور اس خیال سے ہمارے دل دھڑک رہے تھے کہ عنقریب کوئی رنج دہ منظر سامنے آیا چاہتا ہے۔ بہرحال گھر میں پہنچ کر ایک کونے میں جدھر کہ بہت سے درخت اور جھاڑیاں تھیں ہم لوگ چھپ کر کھڑے ہو گئے۔ تھوڑا ٹھہرنے پر دیوار میں ایک دروازہ نظر آیا، جس کے نیچے سرداب تھا۔ کچھ دیر بعد اس راستہ سے مندر زور سے چیخیں اور خوفناک آوازیں آنے لگیں، اور کئی مرتبہ گولی چلنے کی آواز بھی آئی۔ اس کے بعد سرداب میں کسی قدر روشنی ہوئی۔ ہم نے غور کر کے جو دیکھا تو معلوم ہوا کہ کچھ انگریز ان مفسدوں کے ہاتھ لگ گئے ہیں، جنہیں وہ اپنے جذبۂ انتقام کا نشانہ بنا رہے ہیں۔ پانچ منٹ تک یہ ہنگامہ رہا، اس کے بعد چراغ گل ہو گیا، اور سرداب میں بدستور اندھیرا چھا گیا۔ تھوڑی دیر بعد دیکھا کہ مفسد ایک دراز قد آدمی کو کھینچتے ہوئے باہر لا رہے ہیں، اور جب اس کو بیچ آنگن میں لے آئے تو چتا میں آگ لگا دی، اور اس شخص کو چتا کے پاس لائے۔ ہمارا خیال تھا کہ وہ لوگ اس کو قتل کر کے آگ میں ڈال دیں گے۔ مگر نہیں انہوں نے اس سے زیادہ شرمناک حرکت کی جس کو دیکھ کر ہم کانپ اٹھے اور ہماری روح فنا ہو گئی۔ انہوں نے اس کو زندہ آگ میں ڈال دیا، اور تلواریں اس کی طرف سونت لیں، اور پستولوں کی نالیں اس کی طرف کر دیں اور چاروں طرف سے اس کو گھیر لیا۔ آگ بھڑکنے لگی، اور شعلے بلند ہونے لگے، وہ بدقسمت جب شعلوں میں سے نکلنا چاہتا تھا تو سنگینوں کی نوکوں اور تلواروں کی دھاروں سے اس کو پھر آگ میں دھکیل دیتے تھے اور گالیوں اور لعنت پھٹکار سے اس کو

جواب دیتے تھے۔

مگر اس شیر ببر کی جرأت اور ہمت پر آفریں ہے، پہلے اُس نے تین مرتبہ آگ سے بھاگنے اور جان بچانے کی کوشش کی لیکن جب مایوس ہوگیا تو مفسدوں سے التجا و زاری کرنے کے بجائے جوانمردی کے ساتھ شعلوں کے بیچ میں حصہ لیا، اور آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھا کر خدا سے دعا و التجا کرنے لگا، یہاں تک کہ آگ نے اُس کو کھا لیا اور وہ جل کر بھسم ہوگیا۔ اس ہولناک منظر کو دیکھکر جس میں موت اپنی انتہائی بھیانک شکل کے ساتھ ہمارے سامنے مجسم ہوکر آگئی، ہماری حالتوں کا کیا پوچھنا۔ ہم پر ایسا ہول سوار تھا کہ الفاظ اُس کو ادا نہیں کرسکتے۔ ڈر کے مارے مینے اپنے مُنھ پر کپڑا باندھ لیا کہ کہیں اس لرزہ براندام کردینے والے منظر کے ہول سے بیساختہ مُنھ سے چیخ نہ نکل جائے اُن لوگوں کی آپس کی گفتگوؤں سے اس قدر ہم کو اندازہ ہوگیا کہ جس شخص کو اس طرح بے دردی سے ان لوگوں نے ابھی جلاکر خاک سیاہ کیا ہے وہ انگلستان کا بڑا مشہور و معروف اور سلطنت دہلی و اودھ کا چیف جسٹس تھا۔ اسی شخص کی کوششوں کی بدولت انگلستان کا نظام اور قوانین رائج ہوئے تھے۔ اسی لئے اس بیدردی سے ان لوگوں نے اس کو قتل کیا۔ جج جب راکھ ہوچکا تو آہستہ آہستہ وہ لوگ گھر میں سے نکل گئے اور مکان کو اپنے وجود سے پاک کرگئے۔ مگر ہم حیران تھے کہ کیا کریں اور کہاں جائیں اور کہاں سے کوئی راہبر لائیں جو ہم کو اپنے اہل وطن کے پاس برج میگزین تک پہنچائے۔ اگر ہم اس راستہ سے گذرتے ہیں تو راستہ بہرحال مسجد کے سامنے سے گذریگا اور وہاں پر شورش کنندگان انگریزوں سے اُسے چھیننے کے لئے جمع ہیں، اُن کی موجودگی میں ہم کیونکر گذر سکیں گے۔ اس پر وہ بولے کہ رات اب بہت آچکی ہے، اور ہم کو فیلبان کے آنے تک یہیں رہنا چاہیئے۔ اُس کو بھیڑ بھاڑ کی وجہ سے آنے میں دیر لگی ہے، اور اب جبکہ راستے صاف ہوتے جارہے ہیں اور بھیڑ کم ہورہی ہے تو وہ ہم کو ضرور ڈھونڈھ نکالیگا، اور باہر نکل کھڑے ہونے کے مقابلہ میں یہاں چھپا رہنا بہرحال اچھا ہے۔

مینے بھی غور کیا تو میرا بھی یہی خیال ہوا کہ اُن کا خیال صحیح ہے کیونکہ ہندوستانی جبکہ جج کو جلا چکے اور اس گھر کے اور لوگوں کو قتل کرچکے ہیں تو اب دوبارہ واپس نہ آئیں گے۔ چنانچہ ہم نے اُس وقت تک کے لئے اُسی جگہ قیام کا ارادہ کرلیا جب تک کہ شورش فرو نہ ہوجائے اور بےچینی دور نہ ہوجائے۔ ہندوستان کی راتیں دن سے مختلف ہوتی ہیں اور سخت ٹھنڈی ہوتی ہیں۔ جب تک چتا کی آگ باقی رہی ہم اُس آگ سے تاپتے رہے، جب آگ گل ہوگئی تو کسی ایسی جگہ کی ضرورت معلوم ہوئی جہاں سردی کا بچاؤ ہوسکے۔ اُنہوں نے کہا سب سے محفوظ صورت تو یہی ہے کہ ہم کسی کوٹھے پر چلے چلیں۔ پھر وہ آگے ہولئے، اور اُن کے پیچھے پیچھے ہم سب ایک زینہ پر چڑھ گئے۔ یہ زینہ ایک بہت بڑے بالاخانہ میں ختم ہوتا تھا، جس کے چاروں طرف اور مکانات تھے اور سب کا راستہ اس بڑے بالاخانہ میں سے ہوکر تھا۔ اوپر پہنچکر جب ہم نے کمروں کو خالی اور قفل ٹوٹے ہوئے پائے، کیونکہ جو بیش قیمت چیزیں وہ لے جاسکتے تھے لے گئے تھے اور جو نہ لے جاسکے اُن کو توڑ پھوڑ دیا اور جلا ڈالا تھا تو ہم نے چاروں طرف تلاش کی کہ شاید کہیں کوئی ایسی چیز مل جائے جو بچھونے کا کام دے سکے۔ تلاش کرتے کرتے ان تمام کمروں کے پیچھے ایک بہت چھوٹی سی کوٹھری میں ہم کو کچھ پرانے کچھ بستر اور گدے مل گئے۔ ان میں سے تو ایک کو بچھا کر ڈیزی کو مینے اُس پر لٹا دیا اور اُس کا مُنھ چوم کر مینے اللہ سے دعا کی کہ بارالٰہا اس معصوم کو

اپنی حفاظت میں رکھیں اور تاکہ اُس کے پاس بٹھا دیا۔

پھر ہم تینوں وہاں سے نکل گئے اور اس فکر میں ہوئے کہ کہیں سے ذرا سی موم بتی مل جائے۔ چنانچہ تھوڑی سی بتی مل گئی۔ اُس کو جلا کر ہم سب اُس سرداب میں اُترے جس میں سے مقتول بچ کو مفسدوں نے پھینک کر باہر نکالا تھا۔ سرداب سے ہمارے کانوں میں زخمیوں کی کراہ کی آواز برابر آ رہی تھی۔ اس لئے ہمارے دل نے گوارا کیا کہ اس سرداب میں اُتر کر ضرور دیکھنا چاہیئے شاید ابھی کوئی بچ سکتا باقی ہو اور اُس کی جان بری ہو سکے۔ غرض ہم لوگ سرداب میں اُترے تو وہاں کیچڑ میں پاؤں پھسلنے لگے۔ پہلے تو اس طرف خیال نہیں کیا کہ کیچڑ جما ہوا خون تھا یا شراب تھی۔ مگر جب دیوار سے ہاتھ لگا کر بتی کی روشنی میں دیکھا تو کوئی گاڑھی گاڑھی چیز سی معلوم ہوئی جس کو قریب سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ خون ہے۔ تب میری سمجھ میں آیا کہ زمین پر کیچڑ بھی خون ہی کی تھی۔ اس ہولناک تہ خانہ میں ہم تین قدم بھی نہ چل پائے ہوں گے کہ گنج شہیداں میں پہنچ گئے۔ کہیں بے سر لاش اور کہیں بے لاش سر اور کسی طرف ہاتھ اور کسی جگہ پاؤں پڑے تھے۔ ایک طرف چند زخمی عورتیں دم توڑتی ہوئی تھیں جنہیں نہایت بے دردی سے قتل کیا تھا اور بے رحمی سے زیورات اُتار لئے گئے تھے۔ دوسری طرف لاشوں اور سروں کا ڈھیر لگا تھا۔ غرضکہ ان مفسدوں اور غنڈوں نے کوئی طریقہ وحشت و بربریت کا ایسا باقی نہیں چھوڑا تھا جو ان مقتولوں کے ساتھ نہ برتا ہو۔ یہاں ہماری آنکھوں کے سامنے وہ دردناک اور ہولناک منظر آئے جن کو نقل کرنے کے لئے پتھر کا کلیجہ اور سننے کے لئے فولاد کا دل چاہیئے۔

اُف کیسی ہولناک رات تھی کیا کیا مناظر آنکھوں کے سامنے آئے جنہیں دیکھ کر دل شق اور جگر پارہ پارہ ہو گئے۔ پھر میں اور وہ لاشوں کو سرداب سے باہر نکالنے لگے کہ جن کی ابھی شکل آسانی سے ہوئی ہو اُن کو آسانی ہو جائے۔ لاشوں میں ہم کو دو عورتیں نظر آئیں جن کے نسبتاً کم زخم تھے اور ایلن کو ایک بالکل صحیح سالم بچہ ملا۔ ایک عورت کو اُنہوں نے گود میں اُٹھا کر چاہا کہ صحن میں لے جائیں کہ یہاں پڑے پڑے گھٹ کر مر جانے سے بچ جائے مگر جونہی اُنہوں نے زینہ سے نکلنا چاہا تو وہ زخمی درد کی شدت سے ہائے کر کے بہت زور سے چلائی۔ اُن کو خوف ہوا کہ مبادا وہ لوگ جو ابھی اڑوس پڑوس کے مکانات میں قتل و غارت لوٹ کھسوٹ میں مشغول ہیں واپس آ جائیں یا اُن کے جاسوس اُن کو خبر کر دیں اس لئے اُس کو زمین پر اُتار دیا۔ اُس زخمی نے چاہا کہ بغیر امداد غیر کے وہ خود اُٹھے مگر شدت ضعف کی وجہ سے اچھی طرح کھڑی بھی نہ ہوئی تھی کہ لڑکھڑا کر گر پڑی۔

سہارے کے لئے میں جب اُس کی طرف بڑھی تو معلوم ہوا کہ اُس کا ایک ہاتھ کلائی سے کٹ گیا ہے اور اُس میں سے خون کی پچکاری چھوٹ رہی ہے۔ وہ بچہ جسے ایلن نے پایا تھا اُس کی عمر بمشکل تین چار سال کی ہوگی۔ اُس نے جب ہم کو اپنی طرف آتا ہوا دیکھا تو اس خیال سے کہ ہماری نیت بد ہے وہ ہم سے بھاگا اور لاشوں میں جا چھپا۔ مگر ایلن اُس کو انگریزی میں بہلانے اور پھسلانے اور پُچکارنے لگی، جس سے رفتہ رفتہ اُس کو معلوم ہو گیا کہ ہم اُس کو اس بلا سے بچانا چاہتے ہیں، اس لئے وہ لاشوں کے نیچے سے نکل کر ہمارے پاس آ گیا اور ایلن کی گردن میں ہاتھ ڈال کر چمٹ گیا اور اُس کا منہ چومتا جاتا تھا اور روتا جاتا تھا جسے دیکھ کر میرا بھی دل بھر آیا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ ہم لوگ اس شغل میں تھے کہ دروازہ پر بادل کی گڑگڑاہٹ جیسی بڑی کرخت آواز معلوم ہوئی، جس سے معلوم ہوتا تھا کہ

یہ ہاتھی کی چنگھاڑ ہے اور یہ محمد ہے جس نے ہم کو ڈھونڈھ لیا ہے۔ محمد کے آجانے سے ہم کو بڑی خوشی حاصل ہوئی، کیونکہ اس خیال سے ہم کو بڑی کوفت تھی کہ ایسے وقت میں جبکہ اُسے ہماری خلاصی کی کوشش کرنی چاہیئے تھی وہ ہم کو چھوڑکر چلاگیا۔ یہ جان نثار وفادار آدمی مسلمان تھا۔ ہمارے گھر میں اپنی نوجوانی سے لیکر اب تک جبکہ اُس کی عمر چالیس سے متجاوز ہوچکی تھی رہتا تھا اور ہر چند کہ اُس کے ابناء وطن فرنگیوں کو قتل کرنے کے درپے تھے مگر وہ اس کے خلاف ہی رہا۔ اور رنج وراحت، سختی و نرمی میں ہمارے ساتھ رہا، اور اُس وقت تک اُس نے ہمارا ساتھ نہیں چھوڑا جب تک کہ وہ ہم پر سے فدا نہیں ہوگیا جیسا کہ اُس کا ذکر آگے کسی جگہ آئیگا۔ محمد کی اس بات کو جس قدر بھی سراہا جائے کم ہے۔ کیا آدمی تھا جو وعدہ کیا تھا اور جب تک اُس کے دم میں دم رہا اُس نے نبایا اور جان دیدینا گوارا کرلیا، مگر کسی وقت اور کسی موقع پر راہِ وفا سے ہٹنا گوارا نہیں کیا۔ جب وہ ہم سے ملا تو اُس نے اپنے خدا اور رسول کی قسم کھاکر بیان کیا کہ اُس کا ہم سے چھوٹ جانیکا باعث اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا کہ ہجوم کی وجہ سے ہاتھی کے لئے کسی طرح راستہ نہیں مل سکا، اور اب جبکہ راستے صاف ہوگئے تو وہ روانہ ہوگیا، اور جب اس مکان کے مقابل پہنچا اور ہاتھی بیاباں پہنچکر رُک گیا تو اُس کو معلوم ہوگیا کہ ہم لوگ اس مکان میں ہیں۔

پھر ہم نے اُس سے شورش کی کیفیت اور دہلی کا حال پوچھا تو اُس نے بتایا کہ بڑے سخت سخت معرکے ہوئے اور بڑے رن پڑے، مگر نتیجہ انگریزوں کی ہزیمت و شکست کے سوا اور کچھ نہیں ہوا۔ اب سرکش فوج تمام دہلی پر مسلط ہوچکی ہے اور اُس نے گوشہ نشین شاہ کو اپنا بادشاہ قرار دے لیا ہے اور وہ تخت نشین ہوگئے ہیں۔ امراء اہل دول کو ان لوگوں نے خوب دل کھولکر لوٹا کھسوٹا ہے عورت، مرد، جوان، بوڑھے، شریف، ذلیل غرض جس کو پایا قتل کردیا ہے کسی کی نہ داد ہے نہ فریاد۔ انہیں مفسدوں کا پورا پورا تسلط ہے جو جی میں آتا ہے کرتے ہیں۔ کوئی ٹوکنے والا نہیں ہے۔ جو فوج بارود خانہ پر متعین تھی اب اُس کی بھی ہمت شکستہ اور ارادے پست ہوچکے ہیں اُن میں بھی بدنظمی پھیلی ہوئی اور بھگدڑ مچی ہے۔ انگریزوں کے پاس اب اس وقت صرف بارودخانہ باقی ہے اور بس۔ تمام افسر اور حکام ادہر اُدہر سے بھاگ کر وہیں جمع ہوگئے ہیں۔ کابلی دروازہ کے دُمدمہ پر بھی مخالفین کی ایک مسلح چاق چوبند جماعت کا قبضہ ہے جو لڑنے کے لئے آمادہ اور تیار ہے۔ جنرل کراؤ شورش کنندگان سے لڑرہے ہیں اور اب اُن کے ساتھ عورتوں، بچوں، یتیموں اور بیواؤں کی اچھی خاصی بھیڑ ہوگئی ہے۔

اعترافِ شکست

(ترجمہ از جرمنی - جناب سید نفیس اللہ صاحب شمس آبادی)

شام کے چار بجنے کا وقت ہے۔ دفتر میں پانچ بجے چھٹی ہوتی ہے۔ ہم جس دفتر کا ذکر کر رہے ہیں وہ امریکہ کے ایک مشہور پبلشر کا ہے۔ جس کی شاخیں تمام یورپ اور امریکہ میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اس دفتر میں ایک نوجوان نہایت حسین و شکیل مگر شکستہ ایک کلرک کے کام کرتا ہے۔ یہ کلرک اپنے کام میں منہمک ہے۔ دفتر کا دروازہ کھلا اور ایک مس صاحبہ نہایت عمدہ لباس پہنے ہوئے ناک ونقشہ کی ست بہت اندر داخل ہو گئیں۔ اول تو دفتر کے ٹائپ رائیٹروں کی کٹ کٹ پٹ پٹ نے ان کا خیر مقدم کیا۔ ہماری مس صاحبہ اسی دفتر کی برلن کی شاخ کی منیجر ہیں اور کسی کام سے ہیڈ آفس آئی ہیں۔ ادھر اُدھر نظر ڈالتی ہوئی دفتر کے انتظام پر غور کرتی ہوئی خراماں خراماں منیجر کے کمرے کی جانب جا رہی ہیں۔ کمرے پاس پہنچکر اپنا ملاقاتی کارڈ بھجوایا اور پھر ایک سرسری نظر دفتر کے کارکنوں پر رفع الوقتی کے لئے ڈالی۔ کیونکہ الانتظار اشد من الموت۔ اسی اثنا میں آخر کار ہمارے ہیرو پر نظر کا تیر جا کر پڑا۔ اب کیا تھا جیسے کوئی خواب غفلت سے چونکا ہو چونکی! اُدھر کلرک اپنی جگہ مبہوت گھبرا کر کھڑا رہ گیا۔ کچھ عرصہ تک ایک دوسرے کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے رہے۔ آخر کار مس صاحبہ نے کلرک کی طرف قدم بڑھایا۔ نظروں کے ساتھ ساتھ ہاتھ بھی مل گئے، گویا دل مل گئے۔

مس صاحبہ "ہیں! ! بوب تم یہاں کیسے ؟

بوب -" میری تم یہاں کہاں ؟

میری -" میں تمہارے دفتر کی شاخ کی منیجر ہوں۔ اور یہاں ضروری کام سے آئی ہوں - ہاں! بوب بہت عرصے کے بعد ہم دونوں پھر ملے -

بوب -" ہاں میری دس سال گذر گئے۔ اب میری شادی بھی ہوگئی ہے، بلکہ پانچ بچوں کا باپ ہوں۔ (بوب نے اپنے بچوں کی تصویر جیب سے نکال کر دکھائی)

میری -" اچھا! خوب! بوب تمہیں یاد ہے کہ ہم چھوٹے چھوٹے کھیلا کرتے تھے۔ (میری محبت بھری آنکھوں سے بوب کو دیکھ رہی تھی)

اتنے میں منیجر نے دروازہ کھولا اور میری کے استقبال کو آگے بڑھا۔

بوب -" آپ کا حرج ہو رہا ہے۔ دیکھئے منیجر صاحب انتظار کر رہے ہیں "

میری -" کوئی حرج نہیں! بوب مجھے تم سے بہت ساری باتیں کرنی ہیں۔ چھٹی کے بعد میں تمہارے گھر چلونگی وہاں اطمینان سے باتیں کریں گے۔

بوب -" اچھا میں بھی یہی کہتا، منتظر رہوں گا۔

میری - رخصت ہوکر منیجر کے کمرے میں چلی گئی۔ دوران گفتگو میں منیجر کے استفسار پر میری نے بوب کے متعلق کہا کہ وہ بوب کی بچپن کی دوست ہے اور اس سے ہمیشہ محبت کرتی ہے۔ بلکہ وہی ایک شخص ہے جس سے کہ اسے دلی پہلی اور آخری محبت ہے۔ پھر یہ بھی کہا کہ جب بوب اس کے ساتھ تھا تو وہ بہت اچھا مضمون نگار تھا۔ اب خبر نہیں اسے کیا ہوگیا جو ایک کلرک کی جگہ کام کر رہا ہے

غرض ضروری گفتگو کے ختم ہونے تک چھٹی کا وقت ہوگیا میری منیجر سے اجازت سے لیکر بوب کو اپنی موٹر میں بٹھا اس کے گھر کی طرف روانہ ہوگئی (یہ موٹر میری کی ذاتی تھی)

بوب کے مکان پر پہنچے۔ بوب نے گھر کا دروازہ کھولا دروازہ کا کھلنا تھا کہ سب بچوں نے بوب پر ہلہ بول دیا۔ اور اُس کو زمین پر لٹا کر کھیلنا شروع کردیا۔ میری خاموش کھڑی دیکھتی رہی، اُدھر بوب کی بیوی بھی کھڑی ہوئی بچوں کا تماشہ دیکھ دیکھ مسکرا رہی تھی، دل خوشی کے مارے دھڑک رہا تھا، آنکھوں اور چہرے سے بشاشی کے آثار ٹپک رہے تھے لیکن غور سے دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ عارضی خوشی تھی، کیونکہ تفکرات نے اس کے خط و خال کو بدل دیا تھا، اور حرکات و سکنات میں سستی نمایاں تھی، وہ زندگی کی برق اس میں نہیں پائی جاتی تھی، جو ایک بے فکر نوجوان اور متمول انسان کے رگ و ریشہ میں دواں ہوتی ہے۔ تھوڑے عرصہ کے بعد اُس نے بچوں کو بوب سے علیحدہ کرکے دوسرے کمرے میں بھیج دیا۔ بوب کپڑے جھاڑ کر کھڑا ہوا، اور بیوی سے مخاطب ہوکر سلسلۂ گفتگو یوں چھیڑا۔

"مارگولڈ۔ تم تو میری کو نہیں جانتی ہوگی؟"

"نہیں"

"یہ میری بچپن کی دوست ہیں، ہمارے دفتر کی شاخ کی منیجر ہیں، یہاں ضروری کام کو آئی ہوئی ہیں"۔

مارگولڈ نہایت تپاک سے میری سے ہاتھ ملاتی ہے۔ میری مارگولڈ کی حرکات کا بنظر امعان مطالعہ کرتی ہے۔

مارگولڈ۔ "کیا آپ کا قیام امریکہ میں دیر تک رہیگا"۔

میری" ہاں دسوچ کر فی الحال تو میں امریکہ ہی میں ہونگی ابھی مجھے یہ نہیں معلوم کہ نیویارک کو کب چھوڑوں"۔ پھر ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ مارگولڈ گھر بار کے انتظام میں مصروف ہوگئی بچوں کا گھر تھا خوب چہل پہل ہو رہی تھی۔ بوب بھی بچوں میں بچہ بن کر کھیل رہا تھا، لیکن میری خاموش بیٹھی تماشہ دیکھتی رہی۔

میری۔ "بوب! تم نے اب مضمون لکھنے چھوڑ دیئے"؟

بوب۔ "میری کیا لکھوں، تم دیکھتی ہی ہو۔ بھلا ان بچوں کی اودھم میں بھی کوئی کام ہوسکتا ہے۔ تفکرات کا دماغ پر تسلط ہو تو پھر وہ بیچارا مطلق العنانی سے کیسے کام کرسکتا ہے۔ بھلا تم ہی بتاؤ کہ ایسی حالت میں کیا کچھ لکھا جاسکتا ہے"؟

اسی اثناء میں مارگولڈ کمرے میں داخل ہوئی، اور سب کو کھانے کے کمرے میں لے گئی، کھانا شروع ہوئے کچھ دیر ہوئی تھی کہ ایک ننھے بچے کے رونے کی آواز آئی۔ بوب بیتابی سے کھڑا ہوگیا اور بچہ کو بہلانے جانا چاہتا تھا، لیکن مارگولڈ اسے روک کر خود چلی گئی۔ میری نے مارگولڈ کے واپس آنے تک گذشتہ زمانہ کی باتیں شروع کردیں ؎

چہ خوش است از دو یکدل سر حرف باز کردن
سخن گذشتہ گفتن گلہ را دراز کردن

میری نے ناصحانہ تقریر کرتے ہوئے کہا، بوب تم پھر لکھنا شروع کردو، تم بہت کچھ نام پیدا کرسکتے ہو۔ اس طرح گوشہ گمنامی میں غفلت کی زندگی گذارنے سے کیا فائدہ۔ بیوی بچوں کے خیال میں تم اپنے زرین مستقبل کو خراب کر رہے ہو۔ مارگولڈ آجاتی ہے اور سب کھانے سے فارغ ہوکر گول کمرے میں بیٹھ جاتے ہیں۔ میری بوب سے اُس کی لکھی ہوئی کہانی سننے کی خواہش ظاہر کرتی ہے۔ بوب اوپر اپنے کمرے میں کاغذات یعنی مسودہ لینے جاتا ہے، لیکن اپنی میز پر بچوں کے کھلونوں کا انبار دیکھتا ہے، اس کے لکھے ہوئے کاغذوں کی بچوں نے کہیں آدمی، کہیں جانوروں کی

کاٹ کاٹ کر شکلیں بنا لیتی ہیں۔ غرضیکہ تمام کمرے میں بچوں کی شرارت کے آثار نظر آرہے تھے۔ آج پہلی مرتبہ بچوں کی شرارت نے اس کی نفرت کے شعلے میں چنگاری لگی۔ وہ شرارت جو پہلے تفریح تھی اور اس کی دماغی کیفیت کو معلق بدل دیتا ہے اس کے دل میں اس بات کا احساس پیدا ہوتا ہے کہ اس کے بچے اس کی ترقی کے راستوں میں سنگِ راہ ہیں۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہی بچے ہیں جو مجھے ترقی سے دور رکھتے ہیں اور اب بھی میری ترقی میں حائل ہیں۔ یہ جذبہ بلا واسطہ عملی جامہ پہن لیتا ہے۔ وہ میرے بچوں کے کھلونے یکے بعد دیگرے اٹھا اٹھا کر کونوں کھدروں میں پھینک دیتا ہے۔ اس طرح اس کے غضب کی آگ کچھ بجھ جاتی ہے۔ نتیجے کچھ [illegible] لیکر بیٹھ آتا ہے اور آرام کرسی پر بیٹھ کر میری کو کہانی سنانی شروع کرتا ہے میری ہمہ تن گوش ہو کر سنتی ہے۔ اس انداز سے بیٹھی ہوتی ہے کہ کہانی کے پہلے باب اختتام پر بوب کی نظر اتفاقاً میری پر پڑتی ہے۔ پھر مارگولڈ کی جانب دیکھا۔ مارگولڈ گھرداری کے دھندوں سے تھکی ہاری تھی، کہانی سنتے سنتے سو گئی تھی۔ لیکن طبیعت کے بگاڑ کی وجہ سے بوب کے چپ ہوتے ہی چونک اٹھی اور اس سے اپنے سو جانے کی معافی مانگی۔ ساتھ ہی سادہ الفاظ میں اس کی کہانی کی تعریف کی۔ لیکن میری نے نہایت غلو کے ساتھ بوب کی فہم و قابلیت کی داد دی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میری نے اس کے دل میں گھر کرنا شروع کر دیا۔ وہ مارگولڈ کی اس حرکت پر خفا ہو کر کتاب بند کر کے کھڑا ہو گیا۔ میری نے اس سے وہ مسودہ گھر پر پڑھنے کے لئے مانگ لیا۔ پھر میاں بیوی میری کو دروازہ تک چھوڑنے آئے۔ میری کے چلے جانے کے بعد بوب کچھ عرصہ تک دروازہ پر خاموش کھڑا رہا۔ مارگولڈ اس کے پاس کھڑی تھی۔ آخر کار بوب نے چبا چبا کر یہ الفاظ کہے۔ "پانچ بچے اور ان کا خرچ مجھے رات دن پریشان رکھتا ہے۔ مارگولڈ ذرا خیال تو کرو سال میں تین مرتبہ پانچ جوڑے جوتوں کے، سال میں دو مرتبہ کپڑے کیا کچھ کم ہے۔ آخر کب تک ....." مارگولڈ پہلی مرتبہ ایسی گفتگو سن کر خاموش ہو جاتی ہے لیکن تعجب سے پوچھتی ہے "بوب تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

بوب "ہاں مارگولڈ دیکھو نا میں بالکل کام نہیں کر سکتا، بچے مجھے کام کرنے سے روکتے ہیں، اتنا غل مچاتے ہیں کہ گھر سر پر اٹھا لیتے ہیں، میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میری مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ اگر میں پھر لکھنا شروع کر دوں تو بہت کچھ کما سکتا ہوں"۔

مارگولڈ۔ "بوب! آج تمہیں کیا ہو گیا، یہ دوسری مرتبہ ہے جو میں تمہارے منہ سے بچوں کے متعلق ایسی باتیں سن رہی ہوں۔ بوب میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں، لیکن بچوں سے بھی محبت ہے۔ بوب خدا کے لئے اس خیال کو اپنے دماغ میں جگہ نہ دو۔"

آخر کار دونوں میاں بیوی کمرے میں چلے گئے، اور دونوں کچھ کھچے کھچے سے رہے۔ اب بوب کے دل میں بیوی کی طرف سے بھی وہی بدگمانی جو بچوں سے تھی پیدا ہو گئی۔

دوسرے دن جب بوب دفتر گیا، تو منیجر نے بلا کر کہا کہ مس میری کے مکان پر جا کر کام کرو، وہ جو حکم دیں اس کی تعمیل کرو۔ بوب میری کے ہاں پہنچا، وہ پہلے ہی سے منتظر بیٹھی تھی، بوب کا استقبال کیا۔ اپنے گھر کی تمام سیر کرائی، پھر اسے اس کمرے میں لے گئی، جو اس نے خاص بوب کے لئے آراستہ کرایا تھا، ویسے تو سارا مکان ہی امیرانہ ٹھاٹ کا تھا۔ اب بوب نے جو اپنے کام کرنے کا کمرہ دیکھا تو آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ کمرہ نہایت صاف شفاف تھا۔ میل کہیں نام کو نہ تھا، ہر چیز

نہایت قرینے سے رکھی ہوئی تھی، چاروں طرف نظر ڈالنے سے دماغ کو راحت، طبیعت کو سکون اور دل کو مسرت حاصل ہوتی تھی۔ بوب بیا مدہوش ہوا کہ میری سے روزانہ اس کمرے میں بیٹھ کر لکھنے کا وعدہ کر لیا بلکہ فوراً کام کرنے بیٹھ گیا۔ میری نے نوکروں کو ہدایت کر دی کہ بوب کے ہر ایک کام کا خیال رکھیں کھانا اور چار وغیرہ وقت پر دے۔ بوب نے شام کا کھانا بھی میری کے ساتھ کھایا۔ دوسرے دن کام ختم کر کے جب بوب شام کو گھر جانا چاہتا تھا تو میری نے اسے نہایت ہوشیاری اور سیاست سے وہیں کھانا کھانے پر آمادہ کر لیا۔ بوب نے اطلاعاً مارگولڈ کو ٹیلیفون کیا ٹیلیفون پر بوب کا چھوٹا بچہ آیا، وہ باپ کی آواز سن کر بہت خوش ہوا۔ لیکن بوب نے بالکل بے التفاتی برتی اتنے میں مارگولڈ دوڑی ہوئی ٹیلیفون پر آئی۔

بوب۔ "مارگولڈ آج بھی شام کا کھانا میں میری کے ساتھ ہی کھاؤں گا۔"

مارگولڈ "آج دوسری مرتبہ ہے کہ تم شام کا کھانا وہیں کھا رہے ہو۔"

بوب "ہاں۔ میری کا اصرار ہے مجبور ہوں (ٹیلیفون بند کر دیتا ہے) اور بچے یہ سن کر کہ ابا ٹیلیفون کر رہے ہیں، ارد گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ ماں سے باپ کے ساتھ باتیں کرنے کی اجازت مانگتے ہیں۔ ماں ٹیلیفون کے بند ہونے کے باوجود بچوں کی تسلی کے لئے ان کو ٹیلیفون دیدیتی ہے، وہ پیارے پیارے بچے اپنی توتلی زبان میں اپنے باپ سے باتیں کرتے ہیں، لیکن ان کی باتیں سننے والا دوسری طرف کوئی بھی نہیں مارگولڈ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ بالآخر بچوں سے ٹیلیفون لیکر ان کو سونے کے کمرے میں لے گئی۔

اسی کشمکش میں چند دن گذر گئے، بوب بہت کم گھر آتا ہے بلکہ رات کو صرف سونے آتا ہے۔ ایک دن مارگولڈ باورچی خانہ میں اپنے کاروبار میں مصروف تھی کہ میری اندر داخل ہوئی۔ مارگولڈ نے خندہ پیشانی سے میری سے ہاتھ ملایا، اور آنے کا سبب دریافت کیا

میری، مارگولڈ میں تمہیں ایک خوشخبری سنانے آئی ہوں

مارگولڈ، خوشخبری!! میرے لئے کیا خوشخبری ہو سکتی ہے۔

میری۔ تمہارے میاں کی دو کتابیں چھپ گئیں۔ اب بوب بہت جلد مشہور ہو جائیگا۔ میں اسے ترقی کی اونچی سے اونچی چوٹی پر پہنچاؤں گی کہ تم بھی حیران رہ جاؤ گی۔ جب تک تمہارے پاس رہا وہ اس شہرت کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ایک عورت کو میاں کی ترقی میں کامل دخل ہے، میں اسے اپنے ساتھ پیرس کی برانچ میں لے جاؤں گی، اور بوب سے بڑی اچھی اچھی کتابیں لکھواؤنگی

مارگولڈ، "میرا خیال ہے کہ تم بوب کی اس ترقی سے بہت خوش ہوگی

مارگولڈ۔ (پہلے تو اس کے چہرہ سے افسردگی کے آثار نمایاں تھے، لیکن اب اس کے چہرہ پر خون دوڑنے لگتا ہے) میری! لعنت ہے ایسی ترقی پر، مجھے تم سے ایسی امید نہ تھی، گو میرا ماتھا تو اول ہی روز ٹھنکا تھا، میری تمہاری آنکھیں کیا چرنے گئی ہوئی ہیں، کیا تمہیں یہ نہیں دکھائی دیتا کہ میں کس مصیبت سے زندگی کے دن گذارتی ہوں، لیکن بوب کو پیشانی پر بل ڈالنے کا موقع نہیں دیتی۔ اپنے اوپر سب کچھ جھیلتی ہوں۔ نہیں نہیں اس نے اسے پانچ ننھے ننھے اور تندرست بچے دیئے ہیں اب تم بوب کو مجھ سے ہتھیانا چاہتی ہو، اس پر ڈاکہ مارنا چاہتی ہو، میں ہرگز اسے نہیں جانے دوں گی، مجھے خوب معلوم ہے، تم بوب کی ترقی کی آڑ میں شکار کھیلنا چاہتی ہو، میں کچی گولیاں نہیں کھیلی ہوں جو تم مجھے بنالو۔ میری تمہیں شرم نہیں آئی، کیا تمہارے دل میں ان معصوم بچوں کے لئے رحم نہیں، میں بوب کو ہرگز ہرگز نہیں چھوڑوں گی، مجھے اس سے محبت ہے، میں نے اس کے

رنج و مصیبت کے دن ختم ہونے والے ہیں۔ (مارگولڈ رونا شروع کر دیتی ہے)

"میری خاموشی رائیگاں نہیں گئی" (بوب باہر سے آتے ہوئے اپنے گھر کے دروازے کے آگے میری کی موٹر دیکھ کر دوڑتا ہے لیکن اس کے پہنچنے تک وہ روانہ ہو جاتی ہے۔ بوب جلدی سے گھر میں داخل ہوتا ہے اور بیوی سے جاکر پوچھتا ہے۔)

بوب: کیا میری آئی تھی۔

مارگولڈ: ہاں۔

بوب: "یہ دو ہزار ڈالر کا چیک، میری کتابیں فروخت ہوگئیں، اب کسی بات کا فکر نہیں، جو تمہارا جی چاہے خریدو، بچوں کو بھی اچھی طرح سے رکھو، مارگولڈ یہ سب کچھ تمہارے ہی لئے ہے۔ ایک خوشخبری اور ہے، اور وہ یہ ہے کہ میں پیرس کی تلاش میں جا رہا ہوں وہاں میری کے ساتھ کام کروں گا۔

مارگولڈ: اب ہمارے مصیبت کے دن ختم ہوگئے، اب ہم چند دنوں میں امیر ہو جائیں گے۔ . . بوب جلدی سے اوپر جاتا، چند کاغذات بغل میں دابے اور ٹوپی ہاتھ میں لئے واپس آتا ہے اور میری کے پاس کام کرنے کے لئے اس کے مکان پر جانا چاہتا ہے۔

مارگولڈ۔ "بوب تمہیں نہیں معلوم کہ مجھے تم سے کتنی محبت ہے۔ پیارے بوب تم یہیں کام کرو، میں تمہارے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں، لیکن خدا کے لئے یہیں گھر میں بیٹھ کر کام کرو۔ اچھے بوب آج تم یہاں گھر پر ہی کام کرکے دیکھو، میں بچوں کو بالکل خاموش رکھوں گی، تمہارے کام میں کوئی مخل نہیں ہوگا۔ آج تم گھر ہی پر رہو۔"

بوب (تیوری چڑھاکر) مارگولڈ تم جانتی ہو کہ میں یہاں کام نہیں کرسکتا، یہ ناممکن ہے۔ (یہ کہکر دروازے کی طرف قدم بڑھاتا ہے)

(مارگولڈ دروازے اور بوب کے بیچ میں حائل ہوجاتی ہے اور کہتی ہے) "بوب میں تمہیں آج نہیں جانے دوں گی۔"

بوب مجبور ہوکر طوعاً و کرہاً اوپر اپنے کمرے میں چلا گیا اور پریشان خاطر کرسی پر بیٹھ گیا۔ خیالات سب منتشر ہوگئے وہ سوچ رہا تھا کہ کیا کرے۔ یہ ظاہر تھا کہ ایسی حالت میں کام کرنا محال تھا لہذا پنسل سے کھیلنا شروع کردیا۔

اسی اثناء میں بچے باہر سے کھیلتے ہوئے، گھر میں غل مچاتے ہوئے داخل ہوئے۔ مارگولڈ جلدی سے دروازہ پر آئی اور بچوں کو چپ کرایا۔ بچوں نے تعجب سے خاموش رہنے کا سبب پوچھا تو کہا کہ آج تمہارے پاپا گھر میں اور اپنے کمرے میں کام کر رہے ہیں، تمہارے غل مچانے سے وہ کام نہیں کرسکیں گے، بلکہ گھر سے باہر چلے جائیں گے۔ وہ ننھی سی معصوم جانیں یہ سن کر خاموش ہوگئیں اور آہستہ آہستہ گفتگو کرنی شروع کردی۔ بچے بل اپنے کمرے میں داخل ہوئے۔ لیکن آخر بچے ہی تو تھے۔ کھسر پھسر ان کی جاری رہی۔ آخرکار دونوں بچے کمرے کے پاس پہنچے اور کنجی کے سوراخ میں سے جھانکنا شروع کیا کہ دیکھیں پاپا کیا کر رہے ہیں۔ ایک جب دیکھ چکتا تھا تو دوسرا دیکھتا تھا۔ اسی طرح چند منٹ گذرنے کے بعد جب دوسرا بچہ بھی شوق سے اپنے پاپا کی حرکتوں کا مشاہدہ کرنا چاہتا تھا کہ وہ پنسل کو اچھال کر پھر کس طرح لپک لیتا ہے، تو اس بچے نے جو کنجی کے سوراخ کے پاس تھا، دوسرے کو دھکا دیدیا، وہ بچارا لڑھکتا ہوا روتا چلاتا نیچے آ پڑا۔ مارگولڈ جلدی سے بھاگی ہوئی آئی اور بچے کو گود میں لیکر چپ کرانا شروع کردیا۔ بوب غصہ میں بھرا ہوا کمرے سے باہر نکلا۔ مارگولڈ نے کہا "بوب اس میں میرا تو قصور نہیں ہے۔" بوب بغیر جواب دیئے نیچے چلا گیا۔

مارگولڈ بچوں کو جپکا کر کے نیچے آئی، لیکن بوب کا پتہ نہیں تھا، مارگولڈ نے بچوں کو کپڑے پہنا کر تیار کیا اور ایک خط بوب کے نام لکھ کر موٹر میں بیٹھ چلی گئی۔

بوب جب شام کو واپس آیا، اخبار اس کے ہاتھ میں تھا، سیدھا کمرے میں گیا، اور کرسی پر بیٹھ کر اخبار پڑھنا شروع کر دیا۔ چند منٹ گذرنے پر جب اس کے کان میں کوئی آواز نہیں پہنچی تو ادھر اُدھر کان لگائے، پھر کچھ خیال کر کے اخبار پڑھنا شروع کر دیا، لیکن اخبار میں دل نہیں لگا، اب بھی کوئی آواز نہیں آئی، تو اٹھ کر دوسرے کمرہ میں گیا۔ میز پر ایک خط پڑا ملا، روشنی جلا کر پڑھنا شروع کیا۔

پیارے بوب! مجھے تم سے بیحد محبت ہے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں مطلق اس کا احساس نہیں۔ میری محبت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ اس دس سال کے عرصہ میں میں نے تمہاری اور تمہارے بچوں کی خدمت کی، اور تمہیں ہر طرح خوش رکھنے کی انتہائی کوشش کی، لیکن افسوس تم نے اس خدمت کی کچھ بھی قدر نہ کی۔ اب تمہیں یہ خیال ہو کہ ان بیوی بچوں کی وجہ سے میں ترقی نہیں کر سکتا تو لو میں اس کے لئے بھی تیار ہوں۔ میں بچوں کو اپنے ساتھ لیکر کیلیفورنیا (California) جا رہی ہوں، تاکہ تم آزادی سے کام کر سکو، اور تمہاری ترقی کی راہیں مسدود نہ رہیں۔ خدا کرے تم دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرو۔

تمہاری۔ مارگولڈ

یہ خط پڑھتے ہی بوب کی آنکھوں کے نیچے اندھیرا آ گیا۔ لیکن تھوڑے عرصہ کے بعد وہ اس کو بھول گیا، اور اخبار پڑھنا شروع کر دیا۔ اسی اثنا میں بہت زور کی بارش شروع ہو گئی، بادل کی گرج بجلی کی چمک اندھیری رات، موسلا دھار بارش، بچوں کا ساتھ آدم نہ آدم زاد، جنگل سنسان کے عالم میں مارگولڈ موٹر میں چلی جا رہی تھی، وہ کچھ ایسی مدہوش تھی کہ اُسے یہ ہوش ہی نہیں تھا کہ موٹر کس سڑک پر جا رہی ہے۔ بچے موٹر میں سو گئے، آخر موٹر رک گئی، پیٹرول ختم ہو گیا، انجن کے سٹارٹ کرنے کی ہر چند کوشش کی لیکن انجن نے چلنے کا نام تک بھی نہ لیا، یہ حالت دیکھ کر مارگولڈ کے سفید سفید رخساروں پر اشکوں کی لڑیاں جاری ہو گئیں بچوں کو دیکھا تو وہ سو رہے تھے، آخر کار روتے روتے اس کی بھی آنکھ لگ گئی۔

اُدھر بوب اخبار پڑھ کر اسی بارش میں میری کے ہاں پہنچا اس کے کپڑے جو تمام چور تھے۔ میری نے نہایت محبت سے اس کے آنے کا سبب پوچھا۔

بوب "میری، مارگولڈ اور بچے مکان چھوڑ کر چلے گئے اور دیکھو یہ خط چھوڑ گئے ہیں۔

میری۔ کیلیفورنیا کس کے پاس گئے ہیں۔

بوب۔ "وہاں مارگولڈ کی بہن رہتی ہے۔

میری۔ اچھا بوب اب تم میرے ساتھ اوپر چلو، اور جلدی دوسرے کپڑے پہنو، ورنہ دیکھنا تم کہیں بیمار نہ پڑ جاؤ۔"

میری۔ اور بوب کمرے میں داخل ہوئے۔ بوب کے لئے ایک کمرہ تیار کیا گیا، بوب کپڑے اُتار کر گرم گرم بستر پر لیٹ گیا، میری نے چاء وغیرہ پلائی اور اس کو آرام سے سُلا کر اپنے کمرے میں آ سو گئی۔

صبح کا سورج نکل آیا۔ مارگولڈ اور بچے موٹر میں سو رہے ہیں، ایک موٹر پاس سے ہورن بجاتی ہوئی گذری، مارگولڈ چونک پڑی اور بچے بھی اُٹھ گئے، دیکھا تو موٹر مکان کے آگے ہی کھڑی ہے۔ بچے بھوک بھوک پکارنے لگے، آخر کار مارگولڈ بچوں کو لیکر اپنے مکان میں داخل ہوئی۔

بوب اور میری صبح اُٹھے، دونوں اپنے کمروں سے باہر آئے

ڈمیری نے ٹوب کے گلے میں ہاتھ ڈال کر کہا کہ ٹوب میں دس سال سے اس دن کی منتظر تھی۔ ٹوب نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر پیار کیا۔ پھر دونوں ناشتے سے فارغ ہو کر ٹوب کے مکان پر آتے ہیں۔ میری باہر موٹر ہی میں بیٹھی رہتی ہے۔ ٹوب اندر داخل ہوا تو دیکھا کہ مارگولڈ اور بچے موجود ہیں۔ ناشتہ کی میز آراستہ ہے اور مارگولڈ اندر کھانا کھلا رہی ہے۔ ٹوب حیران ہو گیا۔

مارگولڈ۔ ٹوب آؤ ناشتہ کرو۔ چائے گرم تیار ہے۔ اتنی بارش میں ہم راستہ بھول گئے اور یہاں آ گئے۔

ٹوب۔ میں ناشتہ نہیں کروں گا۔ دل میں اپنی اس بیجا حرکت پر پشیمان ہوتا ہے۔

ٹوب باہر جانا چاہتا ہے۔ مارگولڈ اس کے پیچھے پیچھے آتی ہے اور پھر ناشتہ کرنے کی استدعا کرتی ہے لیکن ٹوب کرخت لہجہ میں لے نفی میں جواب دیتا ہے اور کھڑکی میں سے میری کو دیکھنا شروع کر دیا۔ مارگولڈ سمجھ گئی اور کہا "اب میں سمجھی، ٹوب سچ بتاؤ کیا بات ہے، جو کچھ دل میں ہے اگل دو۔"

ٹوب۔ "مارگولڈ اب میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتا۔"

اتنے میں دروازہ کی گھنٹی بجی۔

مارگولڈ نے گھبرا کر کہا "ٹوب جاؤ خدا کے لئے جاؤ، اگر میری اب گھر میں آئی تو اچھا نہیں ہوگا۔ تم چلے جاؤ، میں اب اس کی شکل نہیں دیکھ سکتی۔"

ٹوب آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا دروازہ کی طرف بڑھا اور دروازہ کھول کر میری کے ساتھ موٹر میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔

مارگولڈ بت کی مانند کھڑی کی کھڑی رہ گئی، سکتہ کا عالم طاری تھا، آنکھوں سے آنسو جاری تھے، آنکھیں دیکھو تو معلوم ہوتا تھا کہ پتھرا گئی ہیں۔

اس واقعہ کو دس سال گذر گئے

مارگولڈ کے بچے اب جوان ہو گئے، اس کی اب کپڑوں کی عالیشان دوکان ہے۔ اس پر گذارہ ہے۔ بچے اسی دوکان کی آمدنی پر پلے اور جوان ہوئے۔ دس سال بعد ٹوب کا تار آیا ہے کہ میں بچوں کو دیکھنے آ رہا ہوں۔ آج سب ٹوب کے آنے کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ اسی انتظار میں ٹوب کی موٹر دروازے کے آگے آ کر ٹھیری۔ ٹوب اندر داخل ہوا اور مارگولڈ سے ہاتھ ملایا۔ بچوں کو نہایت غور سے دیکھتا رہا۔ پھر ایک ایک کو گلے لگا کر رو دیا۔ بچے ٹوب کو اپنے کمرے میں لے گئے۔ اس کو اس کی لکھی ہوئی کتابیں دکھائیں، اخباروں میں جہاں جہاں اس کا ذکر تھا وہ بچوں نے جمع کر رکھے تھے وہ بھی اس کو دکھائے۔ خوب باتیں کرنے کے بعد ٹوب مارگولڈ سے باتیں کرنے علیحدہ کمرہ میں گیا۔

ٹوب۔ تم جیسی عورت بھی میں نے نہیں دیکھی، تمہارے بچے بھی بالکل تمہیں پر گئے ہیں۔ میں تو کہتا ہوں تم جیسی صاحب استقلال اور باہمت عورت شاید ہی کوئی دنیا میں نکلے۔"

مارگولڈ "ہاں ٹوب! میں نے تم سے علیحدہ ہو کر یہ دوکان کر لی، اور اسی آمدنی پر اپنی حیثیت کے مطابق بچوں کو پالا پوسا۔ اب یہ تمہارے سامنے ہیں جیسے ہیں، تم دیکھ رہے ہو۔"

ٹوب۔ مارگولڈ میں نے تم کو اس عرصہ میں کئی خط لکھے اور کتنے ہی چیک بھیجے، لیکن مجھے کوئی کامیابی نہیں ہوئی بلکہ سب واپس آ گئے۔

مارگولڈ۔ "مجھے تمہارے پیسے کی ضرورت نہیں تھی۔"

ٹوب۔ میں شام کو آ کر بچوں کو اپنے ساتھ لیجاؤں گا اور موٹر میں سیر کرا کے لاؤں گا۔"

مارگولڈ۔ "اچھا تمہاری خوشی یہی ہے تو شوق سے لے جانا۔"

بوب۔ پھر چلا گیا، شام کو بچوں کو اپنے ساتھ لے گیا، مارگولڈ کام سے فارغ ہو کر اپنے پلنگ پر لیٹی تھی کہ بچے باہر سے واپس آئے اور سیدھے ماں کے کمرے میں داخل ہوئے، سب نئے اور عمدہ کپڑے پہنے ہوئے تھے، بہت خوش خوش ماں کے پلنگ کے چاروں طرف بیٹھ گئے، اور اپنی اپنی چیزیں جو باپ نے خرید کر دی تھیں، دکھانی شروع کیں۔ مارگولڈ بھی مسکرائی، پھر بچوں نے ذکر کیا کہ پاپا ہمیں کالج میں پڑھنے کو بھیج رہے ہیں، اور ہم سب وہیں رہیں گے۔ مارگولڈ یہ سن کر چپ رہی۔ دوسرے دن سب نے اپنی اپنی چیزیں باندھنی شروع کر دیں۔ سب سے چھوٹے لڑکے نے بھی ضد کرنی شروع کی کہ ہم بھی سب کے ساتھ جائیں گے۔ مارگولڈ یہ سب تماشہ خاموش دیکھ رہی تھی اور دم بخود تھی، گو اس کا دل بیٹھا جاتا تھا، اتنے میں بوب بھی آ گیا، بچوں نے پاپا کو دیکھ کر اور جلدی کرنی شروع کی، مارگولڈ نے کھانا تیار کر رکھا تھا، بچوں کو کھانے پر بلایا، لیکن سب نے انکار کر دیا، اور کہہ دیا کہ ہمیں بھوک نہیں۔ مارگولڈ نے بوب کو دوسرے کمرے میں علیحدہ لے جا کر اس طرح گفتگو شروع کی۔

مارگولڈ۔ "بوب تم آئے، تم نے بچوں کو دیکھا، انہیں چیزیں دلوائیں۔ یہ سب کچھ اچھا کیا، بہت خوب کیا، لیکن خدا کے لئے یہ تو بتاؤ کہ میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا، جو تم مجھ سے ایسا بدلہ لے رہے ہو، انہیں مجھ سے چھڑا رہے ہو، تمہیں معلوم ہے کہ دس سال تک میں نے محنت کر کے انہیں پالا، اپنی جان کھپائی، رنج و دکھ سہا، اور تم کل آئے ہو اپنے پیسے کے زور سے ان کی محبت مجھ سے چھینے لیتے ہو تمہیں شرم نہیں آتی۔ کیا یہی ظلم توڑنا اور باقی رہ گیا تھا۔ تمہارے پیسے میں اتنا زور ہے کہ تم ان کے معصوم دلوں کو لبھا لو، لیکن نہیں تمہیں میرے ساتھ ایسا سلوک ہرگز روا نہ تھا۔ وہ بچے ہیں اس بات کو نہیں سمجھتے، لیکن تم تو ایسے نادان نہیں ہو۔ افسوس۔ افسوس!!...... (مارگولڈ رونا شروع کر دیتی ہے)

اتنے میں سب سے بڑا لڑکا اندر داخل ہوتا ہے، جو ماں کی تقریر باہر سے سن رہا تھا، اور ماں کا ہاتھ پکڑ کر کہتا ہے۔ "اماں ہم تمہیں چھوڑ نہیں رہے، کیا تم چاہتی ہو ہم ترقی نہ کریں، آگے نہ پڑھیں یونہی جاہل کے جاہل رہیں، ہم تو صرف ترقی کو مد نظر رکھ کر پاپا کے ساتھ جا رہے ہیں۔ اماں ہم تمہیں کب چھوڑ سکتے ہیں۔ ہم تو یہ خیال کرتے ہیں کہ ہماری ترقی تمہیں بھی منظور ہے۔"

مارگولڈ آنکھیں پھاڑ کر اپنے لڑکے کو دیکھتی ہے، پھر چپ ہو جاتی ہے۔ آخر کار دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ بوب سب بچوں کو جمع کر کے ماں کی مفارقت پر بچوں کو آگاہ کرنا چاہتا ہے، لیکن مارگولڈ بوب کو انگلی کے اشارے سے منع کر دیتی ہے، اور اپنے دل پر پتھر رکھ کر بچوں کو اجازت دیدیتی ہے۔

بچے خوشی خوشی اپنا اسباب لئے باپ کے ساتھ جانا چاہتے ہیں مارگولڈ انہیں یاد دلاتی ہے کہ بچو ماں سے تو ملتے جاؤ۔ پھر مارگولڈ ہر بچے کو گلے لگا لگا کر رخصت کرتی ہے، بوب خاموش کھڑا دیکھتا رہتا ہے، آخر میں رخصت ہوتے وقت مارگولڈ سے کہتا ہے۔ "مارگولڈ تمہاری جیسی عورت دنیا میں چراغ لیکر بھی ڈھونڈوں تو نہ ملیگی" پھر بچوں کو موٹر میں بٹھا کر روانہ ہو گیا۔

مارگولڈ کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری تھا، دیر تک موٹر کو تکتی رہی، یہاں تک کہ وہ نظروں سے غائب ہو گئی، دل میں کہہ رہی تھی، خدا اولاد کسی کو نہ دے، میں نے انہیں اسی دن کے لئے پالا پوسا تھا کہ وہ پیسے کے بھوت کے کہنے میں آ کر مجھے چھوڑ جائیں گے" پھر کھانے کی میز پر بیٹھ گئی اور ڈبڈبائی آنکھوں سے شغل کے طور پر کھانا شروع کر دیا۔

اتنے میں میری اندر داخل ہوئی، مارگولڈ تعجب سے کھڑی ہو گئی،

اور اسلئے کا سبب دریافت کیا۔ نہ بتا کر وہ رنجیدہ خاطر آہستہ آہستہ مارگولڈ کے قریب آئی اور ہاتھ ملا کر بولی

"مارگولڈ تم جیت گئیں اور میں ہار گئی۔ میں نے دس سال تک بوب کو خوش رکھنے کی کوشش کی، اور اس کا دل لبھانے کے سب جتن کر ڈالے، لیکن ناکامیاب ہوئی۔ اور بوب کا دل تمہاری یاد سے خالی نہ کر سکی۔ اب تمہارا بوب تمہیں کو دئیے دیتی ہوں، اور اپنا راستہ لیتی ہوں، وہ تمہیں مبارک ہو۔ مجھے اس بات کا احساس ہے کہ میں نے تم پر بہت بڑا ظلم کیا، یہی وجہ میری ناکامی کی ہے۔ مارگولڈ خدا کے لئے مجھے معاف کر دو۔" مارگولڈ نے اس کو محبت سے کرسی پر بٹھایا، چائے پلائی۔ اس کے بعد میری بوب سے رخصت ہو کر اپنے کام میں مشغول ہو گئی، اور بوب اور مارگولڈ ہنسی خوشی سے رہنے لگے۔

ہری ہر ہری، مری بار کیوں دیر اتنی کری

(از جناب فیض محمد صاحب پراچہ)

بچپن کا زمانہ تھا، شوخی، شرارت طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، نہ اچھے کی تمیز تھی، نہ بُرے کی پہچان۔ صرف اپنی تفریحِ طبع کا خیال تھا۔ جہاں کہیں دلچسپی کا سامان مہیا ہوسکا، کتابیں ایک طرف رکھیں اور دن وہیں بسر کیا۔ مجھے روز سکول جاتے وقت گھر کے دروازہ پر ایک نوجوان نابینا "الفاظِ عنوان" کہتا ہوا ملتا۔ میں محلّے کے لڑکوں کے ساتھ ملکر اُس کے ساتھ طرح طرح کی شرارتیں کرتا۔ کبھی بچارے کی لٹھیا چھین لیتا کبھی گُدڑی دور کر دیتا، کبھی کیا اور کبھی کیا۔ نوجوان فقیر ہماری شرارتوں کو بڑے تحمل سے برداشت کرتا، اور بڑے پیارے "بچو نا کرو، بچو نا کرو" کہے جاتا۔ لیکن اُس کے یہ الفاظ ہمیشہ ہمارے فلک شگاف قہقہوں میں غرق ہو جاتے، اور ہماری چھیڑ چھاڑ میں ذرا فرق نہ آتا۔ اُدھر اسکول کا گھنٹہ بجا اِدھر اس بچارے کو نجات ملی تمام کے تمام لڑکے ایک ایک کر کے اسکول کے ڈیسکوں کے سپرد ہو جاتے۔ دن رفتہ رفتہ گذرتے رہے میں نے مڈل پاس کر لیا اور سلسلۂ تعلیم میں اپنے وطن سے باہر چلا گیا۔ وقت گذرتے دیر نہیں لگتی وہ دن بھی آگئے کہ میں تکمیل تعلیم سے فارغ ہو کر وطن واپس لوٹا۔

رات کے چوتھے پہر کا زیادہ حصّہ گذر چکا تھا، صبح کی ہلکی ہلکی روشنی اور ٹھنڈی ہوا زلفِ شب کو بکھیر چکی تھی۔ میں نہا دھو کر بازار سے متعلق نشستگاہ میں ایک کرسی پر بیٹھا ہوا، مشہور فلسفی شاعر گوئٹے کا "فلسفۂ غم" پڑھ رہا تھا۔ طائرانِ سحر برآمدے کے آویزاں پھولوں کے دوروں پر آ آ کر چہچہا رہے تھے۔ شاعر کے فطرتی تخیل نے مجھے سراپا غم کر دیا تھا۔ میں اپنی حالت کا طائرانِ خوش باش سے مقابلہ کر رہا تھا کہ ایک خورد و خوبصورت چڑیا نے سوسن کے دور پر بیٹھ کر ایسا نالۂ دل گداز بلند کیا کہ میرا دل پھڑک اُٹھا، کتاب ہاتھ سے چھوٹ گئی اور میں گہرے تفکرات میں ڈوب گیا، تھوڑا ہی وقت گذرا ہوگا کہ فقیر کی دل سوز

المناک آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"ہری، ہر، ہری، میری بار کیوں دیر اتنی کری"

شاید آج کی صبح میں صرف غم کھانے کے لئے جاگا تھا! آواز سنتے ہی میری روح مضطرب ہوگئی، ایام رفتہ کی یاد تازہ ہوگئی فقیر کا نالہ اور بچپن کی شرارتیں یاد آگئیں۔ بہت افسوس ہوا، فقیر سے ایک قسم کی ہمدردی پیدا ہوگئی، اور حقیقت جو طبیعت نے اس کے حالات معلوم کرنے کے لئے مجبور کر دیا، میں کرسی سے اٹھا، خیالات کی بیہوشی میں لڑکھڑاتے ہوئے سیڑھیاں طے کر کے فقیر کے پاس پہنچا۔ اس کی لاٹھی کو چھوا ہی تھا کہ نیک دل فقیر نے "بچو نا کرو" کی صدا بلند کی۔ میں نے اس کی آواز کا جواب نہایت ہمدردانہ لہجہ میں دیا کہ میں بچہ نہیں ہوں، ہاں بچپن میں تمہارا گناہگار رہ چکا ہوں۔ میں مدت سے تمہیں اپنے قصبہ میں دیکھ رہا ہوں تم ہمیشہ ایک ہی راگ گاتے ہو۔ آج آؤ، چائے میرے ساتھ پیو اور مجھے اپنا کچھ حال سناؤ۔ میں نے فقیر کی لاٹھی کو تھام کر اس کی راہبری کی اور اپنی جگہ لے آیا، اسے بیٹھنے کے لئے کرسی دی، لیکن وہ نیچے ہی قالین کے فرش پر بیٹھ گیا، اور بیٹھتے ہی کہنے لگا "اوہ! کتنا نرم فرش ہے، بہت مدت بعد ایسی جگہ بیٹھنا نصیب ہوا"۔ میں نے اسے چائے کا پیالہ اور چند بسکٹ دیئے، لیکن اس نے ایک ہی بسکٹ اور چائے کا پیالہ پیا، اور باوجود میرے اصرار کے زیادہ کچھ نہ کھایا۔ معلوم نہیں اسے کیا یاد آگیا، اس کی آنکھوں کے بند حلقوں سے آنسو بہنے لگے۔ میری تسلی و تشفی کچھ کام نہ کر سکی، اور میں نے یہی مناسب سمجھا کہ اسے جی بھر کر رونے دوں تاکہ اس کا غبار دل سے صاف ہو جائے۔ جب وہ اچھی طرح رو چکا تو میرے دریافت حال پر ایک بہت پُردرد داستان سنائی۔

ایک زمانہ میں میں ایک خوشحال انسان تھا، اس قدر خوشحال کہ جس کی تمنا ایک انسان کر سکتا ہے، جوانی کی ابتدا تھی، اور مستی کا زمانہ تھا۔ میں وہی کچھ کرتا تھا جو ایک امیر آدمی کا لڑکا کرتا ہے۔ رات دن محفل رقص و شراب قائم رہتی، اور ادہر ادہر کے آوارہ دوست شریک بزم ہو کر میری فیاضیوں کی داد دیتے۔ الف، ب تو میں نے سیکھی ہی نہیں تھی لیکن مجھے اپنی اقبال مندی اور فراست پر بہت ناز تھا۔ میرا ایک چچازاد بھائی تھا، صد درجہ نیک، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور خوش خلق انسان تھا۔ وہ ہمارے پاس منتظم کی حیثیت سے ملازم تھا۔ میرے افعال اسے پسند نہ آتے تھے، وہ ہمیشہ مجھ سے نفرت کرتا تھا، میں بھی اسے اچھی نگاہوں سے نہ دیکھتا، لیکن والد صاحب زندہ تھے، ان کے خوف سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ اسی عرصہ میں میرے والد بیمار ہوئے اور دار فانی سے چل بسے۔ کرشنا میرے چچازاد بھائی کی ایک ہم جماعت لڑکی، ماتم پرسی کے لئے ہمارے گاؤں میں آئی، بلا کی حسین تھی، اور شاید اسے میرے چچازاد بھائی سے عشق بھی تھا۔ میں نے اس لڑکی کو دیکھا، اور جی میں شادی کی ٹھان لی۔ کچھ دن گذرے تو میں نے کرشنا کے والدین کو شادی کا پیغام بھیجا۔ میرے چچا پہلے ہی وہاں اپنے لڑکے کے لئے بات چیت کر رہے تھے، لیکن جب لڑکی والوں کو میرا پیغام پہنچا تو انہوں نے دوسری طرف سے بے اعتنائی برتنی شروع کر دی، میری دولت نے انہیں اندھا کر دیا، میرے چچازاد بھائی رو ہری کے محاسن اور میرے عیوب انہوں نے نہ دیکھے، آخر کار میرے بیاہ کا معاملہ طے ہو گیا۔ لڑکی کو رو ہری سے بہت انس تھا، لیکن وہ کیا کر سکتی تھی۔ رسم و رواج کی پابندیوں سے مجبور تھی، والدین کے فیصلہ کے خلاف اسے دم مارنے کی طاقت نہ تھی، اس نے اپنے زیر سرپرست والدین کے فیصلہ کو سنا، لیکن دامن صبر نہ چھوڑا اور

خاموش رہا۔ جب رودہری کو یہ حال معلوم ہوا تو اُس نے لڑکی کے نام ایک خط لکھا اور اُسے تلقین کی کہ تم والدین کے حکم سے سرتابی نہ کرو، مجھے بھول جاؤ اور اُن کی منشا کو پورا کرو، اور خود ایک رات زہر کھا کر مر گیا۔ اُس کی موت کا اُس کے والدین کے سوا کسی کو صدمہ نہ ہوا، تمام لوگ اس واقعہ کو بھول گئے۔ کرشنا کے ساتھ میری شادی ہوگئی، بڑی دھوم دھام سے رخصتی کی رسم ادا کی گئی۔ میں کرشنا کو اپنے گھر لے آیا، رات کو جونہی خلوت گاہ میں پہنچا، کرشنا نے مجھے نفرت کی نگاہوں سے دیکھا اور اُٹھ کر تیزاب کی شیشی میرے منہ پر کر دی۔ ایسی دوا چھڑکی کہ میرا تمام چہرہ جھلس گیا۔ میں بیہوش ہو کر گر پڑا۔ صبح ہسپتال میں ہوش آیا تو معلوم ہوا کہ کرشنا نے اپنے آپ کو ہلاک کر لیا ہے۔ میرا علاج ہوتا رہا لیکن افاقہ نہ ہوا۔ آخر کار ڈاکٹر نے دونوں آنکھیں نکال ڈالیں، میں اندھا ہو گیا۔ چند ہی دن بعد قرض خواہوں نے جن سے کہ میں نے باپ کی زندگی میں قرض لیکر دگنی رقم کی مع سود رسیدیں لکھ دی تھیں، میری تمام جائداد قرق کرا لی، اور میں مفلوک الحال ہو گیا۔

عیاش دوست تو پہلے ہی سے علیحدہ ہو چکے تھے، اور خویش و اقارب سے کبھی میرے تعلقات اچھے تھے ہی نہیں، مجھے کسی نے نہ پوچھا۔ ایک دیرینہ ملازم نے ازراہ کرم مجھے اپنے گھر رکھ لیا۔ میری بدقسمتی سے وہ بھی زیادہ دیر زندہ نہ رہ سکا، اُس کے بعد اُس کے متعلقین نے مجھے گھر سے نکال دیا۔ اب میرے لئے سوائے بازار کے تختوں اور بھیک کی روٹی کے کیا تھا۔ پچھلے واقعات کو یاد کر کے روتا ہوں۔ نیک دل رودہری اور کرشنا کی موت نے میرے دل کو بےچین کر دیا ہے، خدا سے اپنی موت کی دُعائیں مانگتا ہوں، لیکن بے سود۔ معلوم نہیں فرشتۂ اجل نے مجھے رنج برداشت کرنے کے لئے کیوں باقی رکھ چھوڑا ہے۔

فقیر نے داستان ختم کی۔ میرے نوکر نے اُسے بازار میں پہنچا دیا۔

میری روزانہ دفتر کی آمد و رفت کو بھی کئی سال گذر چکے ہیں، لیکن نوجوان نابینا بڈھا ہو کر ابھی تک زندہ ہے میں روز اُسے "ہری! ہر ہری! میری بار کیوں اتنی دیر کری" کہتے سنتا ہوں۔ اُس کا نالہ میرے لئے درس عبرت ہے۔



عورتوں کی تعلیم

(از جناب مولانا عبد الہادی خاں صاحب شاہجہانپوری)

تعلیم نسواں کا مسئلہ ہمارے اہم ترین مسائل میں سے ایک ہے، اور افسوس ہو کہ اسی جانب سے انتہائی بے توجہی برتی جا رہی ہو، قوم کو اگر اچھے لائق اور شریف فرزندوں کی ضرورت ہے تو اس کا فرض ہو کہ ماؤں کے نیک شریف اور لائق بننے کے سامان جلد سے جلد مہیا کرے اور یہ سامان عمدہ درسگاہیں اور مناسب تعلیم ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ اس مضمون کو کافی غور سے پڑھا جائیگا، اور ارباب فکر اپنی اسی قدر توجہ اس پر مبذول فرمائیں گے کہ جس قدر توجہ کا وہ محتاج ہے۔ (ایڈیٹر)

لڑکا یا لڑکی اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ تعلیم بہرحال دونوں کے لئے ضروری ہو، جو لوگ بظاہر تعلیم نسواں کے مخالف نظر آتے ہیں وہ بھی فی الحقیقت تعلیم کے مخالف نہیں ہوتے، البتہ یہ ضروری ہے کہ اپنی کوتاہ نظری کی وجہ سے غلط تعلیم کے بدنتائج سے متاثر ہو کر وہ لوگ تعلیم ہی کو بُرا کہنے لگے ہیں۔ ورنہ ایسا کون کوڑھ مغز اور کودن ہوگا جو تعلیم جیسی مفید شے کو بُرا کہہ دے۔ علم ہی تو وہ چیز ہے جو انسان کو انسان اور اشرف المخلوقات کے ممتاز لقب کا مستحق بناتی ہو۔ اب غور طلب یہ امر ہے کہ تعلیم کیسی ہو؟ اور کیا سکھایا یا پڑھایا جائے؟

اللہ تعالیٰ نے انسان کی دو صنفیں مرد و عورت پیدا کی ہیں اور دونوں اصناف سے مختلف خدمات وابستہ ہیں۔ خدمات کے اختلاف کی نوعیت سے دونوں اصناف کی طبیعتوں، مزاج اور جسمانی ساخت میں بھی بہت نمایاں فرق ہو۔ تعلیم کی غرض جبکہ انسانیت کی تکمیل ہے تو ہر صنف کی تعلیم میں اُس کے خلقی رجحانات و ضروریات کو پیش نظر رکھنا سب سے اول اور مقدم شرط ہونی چاہیئے، تاکہ ہر صنف اپنی متعلقہ خدمات کو بوجہ احسن پورا کرنے کی صلاحیت پیدا کرے۔

عورت مرد کی جسمانی ساخت، دماغی قوتیں اور صنفی عوارضات

[redacted]

نظر ڈالی جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ازدواجی زندگی میں اُن میں سے باہر کی محنتی درشت و کرخت اور پامشقت ادا کی جانیوالی خدمات ہیں وہ مرد سے متعلق ہیں۔ اور نرم و نازک اور ایسی خدمات جن میں جذبات شفقت و رحمت کی ضرورت ہے اُن کا انصرام عورت کی ذات سے وابستہ ہے۔ یہ فرق مراتب اتنا زیادہ نہ سہی جانوروں میں بھی نمایاں ہے۔ جہاں نہ کوئی تہذیب تمدن ہے نہ تعلیم و تربیت بلکہ جو کچھ ہے تقتضائے فطرت کے مطابق ہے۔

مادہ کی حفاظت اور اُس کے نان و نفقہ کا بار انسان ہی نہیں حیوانات میں بھی نر کے ذمے ہوتا ہے جنگل میں ہرنوں کا گلہ اطمینان سے چر رہا ہوتا ہے تو چوکی داری ہرن کرتا ہے۔ مرغیاں بڑے وقت دانا دُنکا چُگ رہی ہوتی ہیں تو مرغ چاروں طرف چوکنا ہوکر کھڑا دیکھتا رہتا ہے کہ کہیں آڑ میں سے کوئی دشمن نکلکر غافل مرغی کو دبوچ نہ لے جائے اور جونہی ذرا سا کھٹکا ہوتا ہے ٹُرک گڑ ٹک کرکے فوراً سب کو ہوشیار کر دیتا ہے، کُتّا اپنی فطرت سے مجبور ہوکر ہم جنس کو دیکھتے ہی جھپٹتا ہے، مگر جونہی اُس کو معلوم ہوتا ہے کہ دشمن نر کی بجائے مادہ ہے اُس کا غصہ فرو ہو جاتا ہے اور غرّش بند ہو جاتی ہے۔ کبوتر جو دانا چُن چُگ کرلاتا ہے وہ بچوں کو بھراتا ہے اور بچے نہیں ہوتے ہیں تو کبوتری کو بھراتا ہے۔ شیرنی خود بہت کم شکار کرتی ہے بلکہ شیر کرتا ہے، اور جب شیر کھا چکتا ہے تو بقیہ شیرنی کھالیتی ہے۔ غرضیکہ اکثر و بیشتر مادہ اور اولاد کی خبرگیری اور حفاظت اور اُن کے نان نفقہ کی کفالت نر کے ذمہ ہوتی ہے۔ ضرورت تھی کہ ہماری موجودہ تعلیم مردوں کے اس مردانہ جوہر کو اور چمکاتی مگر معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ ہماری تعلیم ہمکو ایثار پسند اور متعلقین کا محافظ اور خبرگیراں نہیں بتاتی بلکہ ہم کو نفس پرست اور بندۂ شکم بنا دیتی ہے۔ ہم بیوی بچوں کی بجائے اپنے نفس کو ترجیح دینے لگ جاتے ہیں اور کفالت کے لئے اپنے پیچھے کی بجائے وہ ہم کو بارگراں معلوم ہوتے ہیں۔

عورت کا سب سے بڑا فرض اولاد کی نگہداشت اور گھر کا انتظام و اہتمام ہے۔ ماں کی مامتا ضرب المثل ہے۔ مگر آجکل کی تعلیم یافتہ عورت شفیق اور مامتا بھری ماں اور گھر کی سلیقہ مند اور کفایت شعار منتظمہ ہرگز نہیں ہوتی بلکہ اولاد اُس کے لئے وبال جان اور گھر کی نگہداشت بیجا پابندی ہوتی ہے۔ ایک مہذب ملک کی ماں کا بچہ خواہ ہسپتال میں بڑا ایڑیاں رگڑ رہا ہو مگر ماں کو کلب اور سینما اور تھیٹر میں احباب کے ساتھ لطف اندوزی سے فرصت نہیں مل سکتی۔ لاکھوں کا گھر خاک ہو رہا ہو مگر یہ اُس کے لئے ناممکن ہے کہ گھر کی دیکھ بھال، کھانا پکانے کا انتظام اور خاوند کی راحت رسانی کا خیال اُس کو گھر کا پابند بنا سکے۔ پھر ایسے باپ اور ایسی ماں کی اولاد جب آنکھیں کھولتے ہی خودغرضی، نفس پرستی، اور بندگی شکم کا سبق حاصل کرے گی تو بڑے ہوکر اُس سے رحم و انصاف، ایثار و قربانی، اہل و عیال کی کفالت و خبرگیری کے جذبات کی کس طرح توقع کی جا سکتی ہے؟ ہندوستان ابھی اس قدر تعلیم یافتہ نہیں ہے کہ ان خرابیوں کی تکمیل ہو جاتی مگر یورپ و امریکہ جو بزعم خود تہذیب تمدن کے ٹھیکیدار ہیں وہاں کی حالت دیکھنے کے لائق ہے۔

ایک کا جو فرض ہے وہی دوسرے کا حق ہوتا ہے۔ اگر ایک کو اُس کے حقوق کی بجائے اُس کے فرائض بتلائے جائیں تو خرابیوں کی بڑی حدتک خودبخود اصلاح ہو جائے۔ خرابی تو یہی ہے کہ "مجھے کیا دینا ہے" کی بجائے "مجھے کیا لینا ہے" سکھایا جاتا ہے۔ اگر میں اپنا مطالبہ کئے جاؤں اور دوسرا اپنا مطالبہ کئے جائے

تو تصادم بالکل یقینی اور اٹل ہے، لیکن اگر اس کے برخلاف بلا طلب میں دوسرے کے حقوق ادا کرتا رہوں، اور دوسرا میرے حقوق ادا کرتا رہے تو تصادم عنقا ہو جائے، بلکہ دن دونی رات چوگنی الفت و محبت ترقی کرے گی۔ مگر ہماری موجودہ تعلیم ہم کو ہمارے فرائض کے بجائے ہمارے حقوق بتاتی ہے۔ عورتوں کو تو یہ بتایا جاتا ہے کہ مرد نے تم پر یہ زیادتی کی اور وہ جبر کیا، مگر یہ نہیں بتایا جاتا کہ تم نے اگر گھر کے انتظام، بچوں کی غور و پرداخت اور خاوند کی اطاعت اور خدمت گذاری میں کوتاہی کی تو تم سے کیا باز پرس ہوگی؟ یہ درست ہے کہ نصاب تعلیم میں کوئی ایسی کتاب یا کوئی ایسا مضمون داخل نہیں ہے جو خاص اسی عنوان اور اسی موضوع پر ہو۔ مگر یہ بھی اسی طرح درست ہے کہ نصاب میں کوئی ایسی کتاب بھی شامل نہیں ہے جس سے عورتوں کو تکمیل انسانیت کے متعلق ھدایات مل سکیں۔ دوسری طرف مشاہدہ یہ ہے کہ ڈگری یافتہ عورت گھر کی منتظمہ ہونے کی بجائے دفتروں کی محرر، کارخانوں کی مزدور، ناٹکوں اور سینماؤں کی ایکٹرس، بچوں کی مامتا بھری ماں ہونے کے بجائے شفاخانوں کی ڈاکٹر اور نرس اور مرد کے لئے سکون و راحت کا ذریعہ ہونے کی بجائے مستقل پریشانیوں اور کلفتوں کا باعث ہو جاتی ہے تو کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ یہ تعلیم کی خرابی نہیں ہے۔ اگر تعلیم یافتہ ہونے کے یہی معنی ہیں کہ انسان کی انسانیت مکمل ہو جائے تو کیا تکمیل انسانیت کی یہی صورت ہے کہ مرد اپنے فرائض سے لاپروا ہو جائے، اور عورت اپنے فرائض سے غافل بن جائے؟

ہماری اس قسم کی تعلیمی ضرورت صرف مذہبی تعلیم سے پوری ہو سکتی ہے، کیونکہ مذہب ہی ہر ہر فرد کو یہ بتاتا ہے کہ تم کو یہ کرنا ہے اور یہ تمہارے فرائض ہیں، اور ظاہر ہے کہ جب کسی جماعت کا ہر ہر فرد وہی کرنے لگ جائے جو اسے کرنا چاہیے تو پھر کسی کو کوئی شکایت نہیں ہو سکتی۔ شکایت تو صرف اسی صورت میں پیدا ہوتی ہے کہ جب کچھ لوگ وہ نہیں کرتے جو انہیں کرنا چاہیے تھا، مذہب عورت کو یہ نہیں بتاتا کہ تیرے مرد کے ذمہ کیا حقوق ہیں؟ بلکہ یہ بتاتا ہے کہ مرد کے تجھ پر کیا حقوق ہیں؟ علی ہذا القیاس مرد کو بھی یہی سکھایا جاتا ہے کہ تم کو عورتوں کے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہیے، اور ان کے تمہارے ذمہ کیا حقوق ہیں؟

ابتدا میں لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کے لئے اتنی مذہبی تعلیم کی سخت ضرورت ہے کہ دونوں کو اپنے اپنے فرائض کا بخوبی علم ہو جائے اور ان کو معلوم ہو جائے کہ میاں بیوی ہونے کے لحاظ سے ان کے کیا فرائض ہیں؟ اور ان کو کیا کچھ سرانجام دینا ہے؟ ماں اور باپ ہونے کی حیثیت سے ان پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں؟ بیٹا اور بیٹی ہونے کے اعتبار سے ان کو کن کن امور کی بجا آوری ضروری اور لابدی ہے؟ بھائی اور بہن ہونے کی صورت میں کن کن باتوں کا لحاظ و پاس لابدیات میں سے ہے؟ اور انسان ہونے کے لحاظ سے کس قسم کے اخلاق و ملکات ظاہر کرنے کی ان کو ضرورت ہے؟ تاکہ کسی کو کسی قسم کی شکایت کا موقع پیدا نہ ہو اور ہر ایک اپنی متعلقہ خدمات کو اچھی طرح اطمینان اور سکون کے ساتھ ادا کرتا رہے، کیونکہ فرائض سے چشم پوشی اور بے اعتنائی اکثر و بیشتر بے چینی اور بے اطمینانی کی حالت میں پیدا ہوتی ہے، اور بے چینی اور بے اطمینانی وقت ہوتی ہے جب ہر شخص اپنے فرائض ادا نہ کرے۔

مگر لڑکیوں کے لئے، لڑکوں کی بہ نسبت، مذہبی تعلیم کی ضرورت بعض وجوہ سے اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ مردانہ صنف عورتوں کے نان و نفقہ کی کفیل اور ان کی محافظ سہی، لیکن مرد کی

زندگی کا دور ابتدا اس کا ... یہ بالکل سادہ اور صاف و صلح ہوتا ہے عورت کی گود اور اس کی آغوش شفقت میں بسر ہوتا ہے اس لئے عورت اگر مذہبی رنگ میں رنگی ہوئی اور اس اثر سے متاثر ہوگی تو لازماً اس کا نشان بھی کسی حد تک ضرور مذہبی تعلیمات کے ماتحت ہوگا اور اس روایت کا اثر آئندہ ناموافق حالات کی وجہ سے چاہے ہلکا پڑ جائے لیکن بالکل مٹ نہیں سکتا۔ اور شاید اسی وجہ سے حضور سرور دو عالم نے فرمایا ہے جس نے تین لڑکوں کی بھی صحیح تعلیم و تربیت پر جنت کی بشارت نہیں دی، مگر تین لڑکیوں کی تربیت و تعلیم پر جنت کی بشارت دی ہے اور تین لڑکیوں کی اصلاح گویا تین خاندانوں کی اور ان سے جتنا چاہے اور کتنے خاندانوں کی اصلاح ہوگی برخلاف لڑکوں کے کہ ان کی تربیت کے لئے اور یہ نتائج پیدا نہیں ہو سکتے۔

اس کے علاوہ چونکہ عورت کی فطرت اسی کی مقتضی ہے کہ وہ گھر میں بیٹھ کر گھر کی نگہداشت کرے اور مرد باہر نکل کر تلاش معاش کرے اس وجہ سے مردوں کے لئے وقتی ضروریات کا سیکھنا اور اُن میں مہارت بہم پہنچانا ضروری ہو تو ہو۔ عورتوں کے لئے اُن امور کا سیکھنا کسی طرح ضروری قرار نہیں دیا جا سکتا، اور اگر عورتوں کی واقفیت و مہارت اُن کے اپنے فرائض میں مخل ہو تو پھر ایسی واقفیت اور مہارت کسی طرح بھی جائز قرار نہیں دی جا سکتی۔ رہی مذہبی تعلیم سو اُس کی ضرورت کسی وقت اور کسی حال میں رفع نہیں ہو سکتی، کیونکہ انسان کو انسان صرف مذہب بناتا ہے، اور سب کچھ سے چاہے اور سب کچھ آجاتا ہو مگر آدمیت نہیں آتی۔

مردوں کے دوش بدوش عورتوں کا ہر شعبہ حیات میں گھسنا اور اُس میں واقفیت و مہارت بہم پہنچانا اقتصادی لحاظ سے بھی سخت مُضر ہے۔ یورپ میں بہت زیادہ اور ہندوستان میں بھی کسی قدر بیکاری بڑھ رہی ہے، جس کی وجہ سے ایک عام بے چینی اور اضطراب پھیل رہا ہے، اور یہ صرف اس لئے ہے کہ مردوں کے ساتھ عورتیں بھی کارخانوں اور دفتروں میں مشغول ہیں، اور چونکہ عورتیں مرد کی بہ نسبت کم اُجرت پر مل جاتی ہیں کہ اُن کو صرف اپنے جیب خرچ بھر کی ضرورت ہے کیونکہ اُن کا نان و نفقہ بہر حال مرد کے ذمہ ہے، اور جب کم اُجرت پر کام کرنے والے مل سکتے ہیں تو زیادہ اُجرت لیکر کام کرنے والوں کی بیکاری لازمی ہے۔ گھر کے اخراجات تو عورت کے کارخانہ اور دفتر میں کام کرنے کی وجہ سے بڑھ گئے ہیں کہ اب اُن تمام کاموں کے لئے جن کو عورت گھر میں رہ کر سرانجام دے سکتی تھی دوسرے سے اُجرت پر کرانے کی ضرورت ہوتی ہے اور بیکاری کی وجہ سے اُجرت دینے کے لئے مرد کے پاس پیسہ ہے نہیں، ایسی حالت میں بے چینی اور اضطراب کے سوا اور کیا توقع ہو سکتی ہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب سمجھنا بھی کسی طرح صحیح نہیں ہے کہ عورتیں مذہبی تعلیم کے سوا اور کچھ قطعاً نہ سیکھیں۔ جن کو حالات اجازت دیں اُن کے لئے ضروریات دین اور اپنے فرائض سے واقفیت حاصل کر لینے کے بعد اسی طرح کچھ اور مفید اور اُن کی اپنی صنفی حالات کے مناسب اُمور کے سیکھ لینے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ فرائض میں خلل اور فتور نہ آنے پائے۔ خلق اللہ کی خدمت بہترین شغلہ ہے اور اگر کوئی عورت اپنے فرائض کی بجا آوری کے ساتھ اس کو بھی کر سکتی ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ مگر خلق اللہ کی خدمت کی یہی صورت متعین کرنا درست نہیں کہ عدالت کی کرسیوں پر بیٹھ کر مجالس قانون ساز کا رکن منتخب ہو کر، عدالت کے سامنے وکیل کی حیثیت سے کھڑے ہو کر، اسکولوں اور کالجوں میں مُدرس اور استاد ہو کر، موٹر ڈرائیور

اور جہاں تک ہو کر سر انجام دی جائے، اولاد کی صحیح پرورش و تربیت، خاوند کی خدمت، اعزا و اقربا کی خبر گیری اور بیماروں کی تیمارداری بھی تو خلق اللہ ہی کی خدمت ہے، اور خدمت کی یہ صورت عین مقتضائے فطرت بھی ہے۔ اس لئے اس صورت کو چھوڑ کر کوئی دوسری غیر فطری صورت کیوں اختیار کی جائے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ غیر معمولی حالات کے علاوہ اپنے متعلقین کی خدمت جن کا بار ہمارے اپنے سر ہے بہرحال مقدم ہے۔ اس لئے فرض کو چھوڑ کر مستحب اور نفل کے درپے ہو لینے کو کیونکر اچھا کہا جا سکتا ہے؟

ان وجوہ سے ہماری رائے ناقص میں عورتوں کی موجودہ تعلیم تمام تر مذہبی اور اُن کی اپنی صنفی ضروریات و مقتضیات کی مناسبت سے ہونی چاہیئے۔ ملک کو کسی ایسی عورت سے ہرگز کوئی معقول فائدہ نہیں پہنچ سکتا جو تجربہ گاہ میں سائنس کے تجربات میں مشغول و منہمک رہتی ہو۔ مجمع میں لوگوں کے سامنے دھواں دھار تقریر کر کے جوش و ہیجان پیدا کر دیتی ہو۔ عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر وہ وہ قانونی رموز و نکات حل کرتی ہو جن سے بڑے بڑے فاضل وقت جج اور بیرسٹر انگشت بدنداں رہ جاتے ہوں کہ ان سب کاموں سے اگر وہ الگ ہو جائے تو مرد ان سب کاموں کو بلا ادنیٰ احساس کمی کے باحسن الوجوہ سر انجام دے سکتے ہیں، لیکن اگر وہ انتظام خانہ داری سے سبکدوشی حاصل کرے یا بچوں کی نگہداشت سے کنارہ کش ہو جائے تو اس کمی کو پورا کر سکنا، خدا کی انسانی مخلوق میں اور کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ گھر کا انتظام اور بچوں کی تربیت خدا کی انسانی مخلوق میں سے اگر کوئی صنف کر سکتی ہے تو صرف عورت کر سکتی ہے، مرد اور سب کچھ کر سکتا ہے مگر یہ نہیں کر سکتا۔ پہاڑ دن کو کاٹ سکتا ہے، دریاؤں کو خشک کر سکتا ہے، بڑی بڑی زبردست سلطنتوں کو زیر و زبر کر سکتا ہے، دنیا کے بڑے لمبے چوڑے رقبہ پر حکومت کر سکتا ہے مگر نہیں کر سکتا ہے تو گھر کا انتظام۔ بڑے بڑے سرکش قبائل کو بڑی بڑی زبردست اور ناتربیت یافتہ اقوام کو قابو میں لا سکتا ہے، اور اپنے چشم و ابرو کے اشاروں سے کام کرنے کا اُن کو عادی بنا سکتا ہے مگر اولاد کی تربیت نہیں کر سکتا۔ کس قدر زبردست غلطی ہوگی اور کیسی ناقابل تلافی فروگذاشت ہوگی اگر عورتیں اس کام کو چھوڑ کر جسے صرف وہی کر سکتی ہیں ایسے کاموں میں لگ جائیں، جن کے کرنے سے دنیا کو اُن کی ذات سے کوئی معقول فائدہ نہ ہو اور نہ کرنے سے کوئی ادنیٰ کمی محسوس نہ ہو! اور کس قدر بدقسمت ہوگا وہ ملک اور وہ قوم جس کے نزدیک قانون فطرت کی یہ خلاف ورزی تہذیب و تمدن کا معیار ہو۔

ہمارا اخلاق

(از محترمہ مسز برلاس صاحبہ)

ہم محترمہ برلاس صاحبہ کے تہ دل سے ممنون ہیں کہ بالآخر انہوں نے اپنی انتہائی مصروفیتوں کے باوجود "سعید" کے لئے کچھ لکھنے کی زحمت گوارا فرما ہی لی۔ اپنی [illegible] تعلیم یافتہ بہنوں کی ترقی اور اصلاح کے لئے جس قدر خدمات وہ انجام دے رہی ہیں "سعید" سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ دعا ہے کہ خدا آپ کی عمر میں برکت دے اور آپ کی مساعی کو مشکور فرمائے۔ (ایڈیٹر)

ہر کس و ناکس کی زبان پر اخلاق کا چرچا ہے۔ کسی محفل میں چند بہنیں جمع ہوئیں اور انہوں نے اخلاق کی کہانی شروع کر دی مگر صد ہزار افسوس کہ وہ خود ہی اس کے برعکس چلتی ہیں۔ بھلا یہ کونسا انصاف ہے کہ خود اخلاق پر سے اتنی گہری ہمدردی رکھیں اور پھر خود ہی اس کے خلاف عملدرآمد کریں۔ مثل مشہور ہے "ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور" اس کے ماننے میں کسی ذی ہوش کو ہرگز تامل نہ ہوگا کہ اخلاق انسان کے لئے بہت بڑی صفت ہے۔ مانا کہ ایک بہن زیور علم سے مالا مال ہے اور دولت کی بھی مالک ہے لیکن اگر وہ اخلاق سے کوسوں دور ہے تو بادی النظر میں اس کی کچھ قدر و قیمت نہیں۔ اخلاق کے اصول ہر ایک پر یکساں لازم ہیں۔ یہ نہیں کہ امیر کے لئے کچھ اور غریب کے لئے کچھ۔ اخلاق کا زریں اصول یہ ہے کہ ؏

ہر چہ بر خود نہ پسندی بر دیگراں ہم مپسند

مگر کتنی بہنیں ہیں جو اس پر عمل کرتی ہیں۔ عام طور سے تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ کسی کے پاس دولت ہوئی خواہ زر کی خواہ علم کی اور خواہ حسن کی یا اس کا شوہر کسی رتبہ پر فائز ہوا بس اس کا دماغ آسمان پر چڑھ گیا۔ سب اس کے بے مول غلام ہیں، اگر اس کی خوشامد نہ کریں تو مغرور ہیں۔ پھر مصداق۔ ؏ پیراں نمی پرند مریداں می پرانند۔ کچھ بہنیں ایسی بھی ہیں جو ان کی جا و بیجا خوشامد کرنے میں اپنی عزت سمجھتی ہیں۔

میں جو کچھ بھی اپنے خیالات حوالۂ قلم کر رہی ہوں وہ اپنے مشاہدے سے لکھ رہی ہوں۔ اکثر جلسوں، پارٹیوں اور دیگر محفلوں میں دیکھا گیا ہے کہ ہماری مسلمان بہنیں سب سے پہلے پوشاک کا جائزہ لیتی ہیں، جو بہن قیمتی زیورات بھاری ساڑھی پہنے نظر آئی اسی کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو گئیں اور لگیں اس سے ملاقات کی سبیل ڈھونڈھنے۔ اگر اتفاق سے کسی جاننے والی بہن نے ان کے شوہر کے ڈیڑھ گز لمبے نام کے ساتھ تعارف کرا دیا تو تو کیا کہنا، ورنہ خود بھی ان بہن سے بات چیت کرنے میں کوئی تامل نہیں، اور کیوں ہونے لگا! ان کی پوشاک میں خود ہی زبردست کشش ہے۔ تعظیماً ان سے مصافحہ کرنے کھڑی بھی ہوئیں اور باتیں شروع کر دیں حالانکہ ان سے قطعی ناواقف ہیں مگر ناممکن تھا کہ ان کے لباس اور زیور کی بھڑک ان کو چپکا بیٹھنے دیتی۔ الغرض تھوڑی دیر میں خاصی رسائی حاصل ہو گئی۔ دوسری بہنوں سے ان کے اخلاق و اوصاف میں تعریف کے پل باندھ دیئے۔ میں حیران ہوں کہ ایسی بہنوں کا ضمیر کس خمیر کا بنا ہوا ہے، جھوٹی خوشامد اور شور سے ان کو کونسی عزت حاصل ہو گئی۔ بعض بہنوں میں یہ عادت نہایت خراب ہے،

کہ جس قدر امیر آدمی ان کے خیال میں ہوں گے انہیں بلاتکلف اپنا رشتہ دار ظاہر کریں گی، اور غریب جو درحقیقت ان کے قریبی رشتہ دار ہیں ان کا نام بھی نہ لیں گی۔ متمول بہن کے خاندان کا کچھ لحاظ نہیں، علمی لیاقت سے کچھ سروکار نہیں۔ ان کا لباس اور زیورات ان کے تمام عیوب کو ڈھانکنے کے لئے کافی ہیں۔ آہ! یہ دولت کی پرستش ہے، انسان کی کچھ قدر نہیں۔

معمولی لباس والی بہن کے ساتھ جو برتاؤ ہوتا ہے وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ خاندان سے اعلیٰ ہیں بلکہ دہلی کی ناک ہیں، سینہ میں علم کا خزانہ دفن ہے، اخلاق حسنہ اور اوصاف حمیدہ سے مزین ہیں مگر ان کی وقعت کہاں۔ غریب کے پاس نہ رہنے کو کوٹھی ہے، نہ سواری کو موٹر ہے، نہ فوق البھڑک لباس ہے، اور نہ آنکھ میں چکاچوند پیدا کرنے والے زیورات ہیں۔ البتہ دولت لازوال کی ضرور مالک ہیں۔ مگر ہر شخص اس کی کب قدر کرتا ہے، عوام الناس دولت کے عاشق ہیں، باوجود ان تمام اوصاف کے اور مدت کی دوستی کے ممکن نہیں کہ ہماری معزز بہن ان بہن سے آنکھ تو ملالیں۔ غریب برابر پہلو میں بیٹھی ہے، اور ضرور ان بہن کے اخلاق کے ملہار اپنے دل میں گا رہی ہے مگر وہ شان نواز بہن دولت کی پجاری ان سے بات چیت کرنا اور انہیں قریب بٹھانا کسر شان سمجھتی ہیں۔ خصوصاً جبکہ ان کو اتنا بڑا رسوخ حاصل ہوگیا ہے کہ قیمتی ساڑھی والی بہن ان سے بات چیت کرنے لگی ہیں۔ وہ تو دل ہی دل میں دعا مانگ رہی ہیں کہ خدا کرے یہ اٹھ کر دوسری طرف چلی جائیں، کیا اس کا نام اخلاق ہے؟ کیا اس کو آپ اور میں اور صاحبان انصاف اخلاق کہیں گے؟ نہیں ہرگز نہیں! یہ دولت کی پرستش ہے جو نہایت زبوں طریقہ سے کی جا رہی ہے۔ ہمارے پیغمبر صاحب (جن کے نام پر میں قربان ہوجاؤں) ہمیشہ غریب آدمیوں سے دوستی رکھتے تھے۔ ہمیں چاہئے کہ آپ کے اسوۂ حسنہ کی تقلید کریں، کتابوں میں آپ کے اخلاق کا مطالعہ کریں اور نیک اوصاف حاصل کریں۔

دولت کے غرور اور شریفوں کی خوشامد سے غریبوں کی تذلیل کے نئے نئے طریقے جاری ہو رہے ہیں، جو اسلام میں ہمیشہ مذموم مانے گئے ہیں۔ ہمارے یہاں دولت کی کمی زیادتی نے سوسائٹی میں کبھی ایسے تفرقے نہیں ڈالے جو اب دیکھے جا رہے ہیں۔ دولت کا یہ امتیاز مغرب سے آیا ہے، مگر صرف عیب کی صورت میں جلوہ گر ہو رہا ہے۔ وہاں دولت کے ساتھ کچھ فرائض بھی ہوتے ہیں جن کا احساس یہاں کے دولتمند بہت کم بلکہ شاذ کرتے ہیں، مغرب میں تمام قومی کام ملک کے دولتمند چلاتے ہیں، بڑی بڑی یونیورسٹیاں اور ہسپتال ان کے روپے سے چل رہے ہیں، دیگر چھوٹے موٹے کام تو بیشمار ہیں، جن کا بار صرف دولتمندوں کے کندھوں پر ہے۔ ہمارے یہاں یہ فیاضیاں عنقا ہیں، مگر دولت کے نشہ میں مغرب کی تقلید نمائشی ضرور ہے، دولت کے تمام حقوق لینے کے لئے نہایت دلیر مگر فرائض کی انجام دہی میں غایت درجہ سست۔

میں ایسی بداخلاقیوں کی صرف دو مثالیں دوں گی۔ اکثر محفلوں میں یہ ہوا کرتا ہے کہ معزز مہمانوں کے لئے صدر کے قریب چند نشستیں مخصوص ہوتی ہیں۔ ان کے علاوہ کوئی تخصیص نہیں ہوتی۔ مگر بعض محفلوں میں دو قسم کی نشستوں کا انتظام ہونے لگا ہے، امیر بہنیں کرسیوں پر ڈٹی رہتی ہیں، اور غریب بہنیں فرش پر بٹھائی جاتی ہیں۔ حال ہی میں مجھے ایک محفل میں شرکت کا موقع ملا۔ اس محفل میں صاحب محفل کی فراخدلی سے پہلے ہی سے دونوں انتظام تھے۔ کرسیاں کافی نہ تھیں، بہنیں کثرت سے جمع ہوئیں امیر بہنیں کرسیوں پر بیٹھنے لگیں، حتیٰ کہ سب امیر بہنیں کرسیوں پر

بیٹھی نظر آئیں۔ علاوہ وہ فرش پر اس طرح بیٹھ سکتی تھیں۔ افسوس دفعی اس بہن مثلاً اور ... کا ... فرش پر نہیں بیٹھیں۔ دفعتاً اس خیال نے میرے دل میں چٹکیاں لیں، ... بیٹھنے والی بہنوں کو ... لائی گئی ... یہ کیا بداخلاقی ہے ... کھانا ... ہیں اور غریب بہنوں کا فرش پر ہے ... فرش پر بیٹھیں ... گھٹنے سے کچھ بہنوں کو حیرت ... اور کئی نہیں ... کر رہی تھیں۔ یہ تفریق صاحب انتظام کی تھی۔ ... ایک قسم کا انتظام رکھنا تھا۔ خدا تعالیٰ نے امیر غریب دونو کے لئے موت اور پیدائش ایک ہی طریقے سے رکھی ہے اور اس کے نزدیک سب ... برابر بلکہ بھائی بھائی ہیں۔ اگر یہی تفریق جاری رہی تو ... کہ امیر ... اپنے لئے ... کام ... کرنے لگیں ... فرش ... بیٹھنے والے غریبوں سے ... ہو جائیں۔

اس ... میزوں کھانے میں تفریق کی ... دستر خوانوں پر بٹھا کر کھانا کھلانے کی ... کی جا سکتی ... یہ کہاں سے جائز ہوا کہ غریب مہمانوں کو گھٹیا کھانا دیا جائے اور امیر مہمانوں کو پُرتکلف۔ مہمان مہمان سب برابر ہیں ہر شخص کو ایک آنکھ سے دیکھنا چاہئے۔ یہ نہایت شرم کی بات ہے کہ غریب مہمانوں کو اس طرح ذلیل کیا جائے اس سے بڑھ کر کیا بداخلاقی اور بدتمیزی ہوگی؟ میزبان کو امیر بہنوں کو پُرتکلف دعوت دینی ہو تو اس کے اور طریقے ہیں، دوسرے روز انتظام کیا جا سکتا ہے اگر چاہے پارٹی دی جائے جیسے ڈنر، کوئی اعتراض نہیں کریگا۔ مگر ایک ہی روز ایک ہی وقت دو قسم کے دسترخوان بچھانا تو کڑی بے غیرتی کی بات ہے۔

... دل ... حقیقت ... تکلیف ... جب بہنوں ... ایسا ... دیکھتی ہوں، اور بداخلاقی کا یہ نتیجہ نکل رہا ہے ... غریب بہنوں کے دل سے امیروں کی وقعت اٹھتی جا رہی ہے اگر یہ ... نفرت ... بدل گئی تو انجام خراب ہوگا۔ مجھے اکثر قومی کاموں میں حصہ لینا پڑا ہے، اور غریب بہنوں نے بعض موقع پر صاف کہا ہے کہ امیر بہنیں تو ہم سے بات چیت کرنا بھی کسر شان سمجھتی ہیں، ہم ان سے امداد کی توقع کیسی! اور یہ ... ہے۔

... کہ ... تعلیم حاصل کریں وہ اپنا زیور حسن اخلاق بنا کر ... کسی کی دل شکنی روا نہ رکھیں، اور یہ رو کھاپن ترک کر دیں۔ تعلیم کے ساتھ تربیت بہت ضروری ہے بغیر تربیت کے تعلیم ادھوری ہے۔ دل آزاری گناہ کبیرہ ہے، اخلاق سے محبت دوسروں کے دلوں میں پیدا ہوتی ہے وہ مرنے کے بعد بھی بہترین یادگار بن جاتی ہے۔



آغوشِ جرم میں

(از جناب مظہر انصاری بی اے آنرز دہلوی)

"سعید" کے گذشتہ نمبر میں ہندوستان کے جرائم پیشہ لوگوں کے متعلق میں نے "اپنی پکار" کا "پہلا حرف" پیش کیا تھا، اور ساتھ ہی یہ وعدہ بھی کہ اس سلسلہ میں اپنے مطالعہ کا نچوڑ قسط وار قسط حاضر کروں گا۔ آج ایفائے عہد کی سمت پہلا قدم اُٹھتا ہے۔

تمہیدی سطروں کے بعد جن میں یہی اس مسئلہ کو چھیڑنے کا مدعا اور اپنے رجحان کا کھلا کھلا اظہار کر دیا تھا آگے کی دو چار قسطیں ان تمام جرائم پیشہ قوموں کے جائزے کے لئے وقف ہونی چاہئیں جو آج ادر وطن کی گود میں پل رہی ہیں۔

آج کی صحبت میں اس سلسلہ کی پہلی کڑی آپ کے سامنے پیش کی جاتی ہے۔ یہ معلومات جنوبی ہند سے متعلق ہیں شمالی ہند اور دیگر اطراف کا ذکر بعد میں آئیگا۔ (مظہر انصاری)

(۱)

جنوبی ہند کی جرائم پیشہ قومیں "رخت بردوش" پھرتی ہیں۔ یہ لوگ تجارت کر کے پیٹ پالتے تھے، اگرچہ جب سے ریلیں جاری ہوئیں، رہزنی کرنے لگے۔ آج بھی اپنی مجرمانہ حرکتوں پر پردہ ڈالنے کے لئے کچھ نہ کچھ تجارتی سامان ساتھ رکھتے ہیں، اور یہ کہتے رہتے ہیں کہ ہم سوداگر ہیں۔ ذیل میں مختلف قوموں کی بعض دلچسپ باتوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

کوراوا یہ لوگ تنکوں کی ٹوکریاں بناتے ہیں، ان کی اصلی زبان تامل ہے، مگر جو زبان آپس میں بولتے ہیں وہ نوعیت کے لحاظ سے کچھ ایسی عجیب ہوتی ہے کہ دوسرے بالکل نہیں سمجھ سکتے۔ کنگھیاں اور تسبیحوں کے دانے بیچنے کے بہانے سے جگہ جگہ پڑے پھرتے ہیں، مگر اصلی مدعا اپنے مطلب کی معلومات حاصل کرنا ہوتا ہے تاکہ دوسروں کے مال پر ہاتھ دراز کرنے میں آسانی ہو۔ جیلوں اور ریفارمیٹری اسکولوں میں کوراوا قوم کے بچے اور بڑے

سب کے سب قاعدے قانون کی پوری پوری متابعت کرتے ہیں لیکن ہونے کی بات یہ ہے کہ ادھر جیل سے چھوٹے اور ادھر پرانے ساتھیوں میں جا ملے، اور اُن کی جیب و دستیوں میں ہاتھ ناچنے لگے۔

جنوبی ہند کے ریفارمیٹری سکولوں میں گورنمنٹ اس قانون پر بڑی سختی سے عمل کرتی ہے کہ جو لڑکا رہائی پائے اس کے بعد اُسی موضع میں پہنچا دیا جائے جہاں اس کی سکونت ہو لیکن لڑکے کے وارثوں کی تدبیریں جو خود مجرمانہ ترکتوں کے عادی ہوتے ہیں سرکاری مرضی کی راہ میں روڑے اٹکاتی ہیں۔ چالاک اور ہوشیار باپ نقل مکانی کی جھوٹی کہانیاں گھڑ کے لے آتے ہیں اور ذمہ دار افسروں کے سامنے درخواستیں گزرانے لگتے ہیں کہ لڑکے کو ہماری نئی سکونت گاہ پر پہنچا دیا جائے۔ مطلب اس سے یہ ہوتا ہے کہ اگر بعد کو پولیس اس کی نگرانی کرنی چاہے تو وہ کامیابی کے ساتھ ایسا نہ کر سکے اور ہم اپنی من مانی کارروائیاں کرتے رہیں۔ آخر کار گورنمنٹ کو یہ قانون بنانا پڑا کہ جرائم پیشہ اقوام کے بچوں کے واسطے مجسٹریٹ کچھ نہ کچھ تدبیر ایسی ضرور اختیار کرے جس سے رہائی کے بعد وہ اپنے سابقہ ہم پیشوں سے میل ملاپ نہ رکھ سکیں، اور اس پر عمل بھی کیا جاتا ہے، مگر قانون بنانا اور اس پر عمل کرانا دونوں ایک چیز نہیں۔ موقع ملے تو شاید سرکاری تدبیریں کارگر ہوں، مگر ماں باپ چلنے ہی نہیں دیتے۔ عام طور سے یہی دیکھا گیا ہے کہ سب کیا کرایا یونہی دھرا رہ جاتا ہے، اور "دھاڑی" ماں باپ نوآموز مجرم کو "جرم پیشگی" کے چکر میں پھنسا لیتے ہیں۔ پچھلے اثرات سے دور رہیں تو شاید یہ ننھی ننھی کونپلیں کسی دن پھل پھول سکیں مگر مشکل تو یہ ہے کہ جیل سے نکلتے ہی یہ بچے اپنے گروہ میں جا ملتے ہیں اور پھر اُن کا نام و نشان بھی نہیں ملتا۔ کرنول اور جنوبی آرکوٹ کے ضلعوں میں جتنے قیدی بچے چھوڑے گئے ایسے غائب ہوئے کہ پھر ڈھونڈے نہ ملے۔

کورادا قوم کے بچے بڑے ذہین اور طبّاع ہوتے ہیں۔ گورنمنٹ کی صدہا رپورٹیں ان کی ذہانت کے ذکر سے بھری پڑی ہیں۔ ذیل میں مسٹر جے ڈبلیو کومبیز (J.W. Combese) کی ایک رپورٹ سے چند لڑکوں کا حال درج کیا جاتا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ ذہانت اور قابلیت میں یہ لوگ کسی سے پیچھے نہیں۔ کاش ان لڑکوں کی صحیح تربیت ہوتی اور ملک کو ان سے زیادہ پہنچتا۔

۱۔ زرین کنا سوامی۔ ایدا پاٹی واقع ترچناپلی کا رہنے والا ہے (یہ ضلع مجرمانہ کارروائیوں کا مرکز ہے) اس کے ماں باپ کاشتکار ہیں کسی معمولی جھگڑے پر گھر سے بھاگ نکلا تھا، روپیہ چرانے کے جرم میں ماخوذ ہے۔ بڑے زبردست کیرکٹر کا لڑکا ہے۔ ناٹک میں بڑی دلچسپی لیتا ہے۔

۲۔ کورانا سوامی۔ سکونت ایدا پاتی، چوری کے جرم میں ماخوذ ہے، اس کے ماں باپ نہیں ہیں۔ متعلقین کا پیشہ کاشتکاری ہے۔ دیکھنے میں بڑا متین اور سنجیدہ معلوم ہوتا ہے، ایک ماہر ایکٹر کی طرح مذاقیہ پارٹ کرتا ہے۔

۳۔ سباپان۔ قید سے چھوٹنے کے بعد ایک سال کے لئے مچلکے ہوئے، مگر باز نہ آیا، پھر پکڑا گیا۔

۴۔ کوراگروپان۔ مدورا کا رہنے والا ہے۔ اس کا باپ گوالا تھا اور ماں ٹوکریاں بناتی تھی۔ اس نے ایک عورت کے گھر کا تالا توڑ کر سامان نکالا تھا، معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس کے بڑوں نے اسے آلۂ کار بنایا تھا۔

۵۔ جینا تنگھم۔ آرکوٹ کے قریب پچاپاندوا مالائی کا رہنے والا ہے۔ ڈاکوؤں کے ایک گروہ سے تعلق رکھتا ہے، جب گروہ تباہ کیا گیا، اور سب مجرم جیل میں بھیجے گئے تو اس لڑکے کا باپ بھی قید ہوا، پانچ برس کے بعد وہ رہا ہوا اور چھوٹتے ہی بیٹے سے ملنے آیا

تعجب کی بات ہے کہ بیٹے نے باپ کو پہچاننے سے انکار کر دیا یہ لڑکا کا مدار جوتیوں کی ایک جوڑی چُراتا پکڑا گیا۔ اس کا سر دگنا ہے، بہت اچھا ناچنا گانا جانتا ہے۔ کھال بڑی عجیب غریب ہے، اُنگلیاں عورتوں کی سی ہیں، پہلے پہلے اس کی بول چال سمجھ میں نہیں آتی تھی، اور اب تامل بولنے میں بھی بڑا عجوبہ لہجہ استعمال کرتا ہے، کیرکٹر بہت پختہ ہے، کبھی کبھی جنگلی عادتیں عود کر آتی ہیں، اور ریت کھانے لگتا ہے۔ ایک دو مرتبہ بھاگنے کی کوشش بھی کی، مگر پکڑا گیا، مزاج میں گرمی ہے، وہ سردی کی چھیڑ چھاڑ برداشت نہیں کر سکتا۔ ایک دفعہ بندروں کو کھلانے کے لئے دیئے گئے اُن میں سے آدھے چٹ کر گیا۔

کوراوا قوم کے چوری کرنے کے طریقے یہ ہوتے ہیں:۔

(۱) اُچکوں کی ایک جماعت دیکھتی ہے کہ لوگ باگ اِدھر اُدھر کھڑے ہیں یا آ، جا رہے ہیں۔ ان میں سے ایک کسی درخت کے نیچے پہنچتا ہے اور چیخنے لگتا ہے "اے درخت پہ سانپ، درخت پہ سانپ، دوڑنا دوڑنا" مجمع ہو جاتا ہے، یہ لوگ جیبیں کاٹ لیتے ہیں۔

(۲) جنوبی ہند کی عورتیں اپنے گھروں کے باہر کپڑے دھو کر سکھانے کو ڈال دیتی ہیں۔ ایک بدمعاش راستہ چلتے چلتے کہنے لگتا ہے "کتنی مرتبہ ان عورتوں سے کہا ہے کہ یہ کپڑے یہاں نہ سکھایا کرو، مگر باز ہی نہیں آتیں"۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ ان کپڑوں کے مالک آپ ہی ذات شریف ہیں، اُچکّے صاحب کپڑوں کی گٹھری بغل میں دبا کر رفو چکر ہوتے ہیں۔

(۳) چار پانچ بدمعاش جمع ہو کر کسی ندی یا دریا پر آتے ہیں، اُن میں سے ایک جو تیرنا بھی جانتا ہے اپنے آپ کو پانی میں گرا دیتا ہے۔ باقی بدمعاش چیخ پکار کرنے لگتے ہیں "ارے چلنا بھئی چلنا، آدمی ڈوب رہا ہے" لوگ جمع ہو جاتے ہیں اور اچکّوں کو جیبیں کاٹنے کا موقع مل جاتا ہے، خوب ہاتھ صاف کرتے ہیں۔

اوڈا

یہ لوگ کھدائی کا کام کرتے ہیں، بہت محنتی اور جفاکش ہوتے ہیں، ان کے بچے دیکھنے میں بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں، پینے پلانے کا چسکا اتنے سے لیکر اُتنے تک سب کو ہوتا ہے اور اسی شغل کو نبھانے کے لئے ڈاکے ڈالتے ہیں۔ ان لوگوں میں جرم پیشگی وراثت سمجھی جاتی ہے۔ رہنے سہنے کی کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ مستقل رہائش سے گھبراتے ہیں۔ شادی بیاہ کے کاج میں زبردستی گھس آتے ہیں اور دن دہاڑے چوریاں کرتے ہیں۔ ان کا ایک فرقہ جسے پاچھی پا کہتے ہیں بہت بہادر ہوتا ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ محولہ بالا رپورٹ میں سے اس قوم کے افراد کا کچھ حال لکھا جائے۔

(۱) بونا لنگا دو عرف لنگا، گوداویری کا رہنے والا ہے۔ قوم اوڈا فرقہ پاچھی پا، بہت خوبصورت ہے، بات کرتے ہوئے شرماتا ہے

(۲) وارا لنگا دو۔ سکونت کولا پالیم تیروتانی واقع جنوبی آرکوٹ چوری کے جرم میں ماخوذ ہے، اخلاق بہت اچھا ہے، قانون کی پوری پابندی کرتا ہے۔

(۳) ستّھا دو ساکن گوداوری، ذات پاچھی پا۔ ایک دس برس کی لڑکی کے گلے سے مالا چُرانے کے جرم میں ماخوذ ہے۔ مالا ایک دعوت کے موقع پر دن دہاڑے اُتاری گئی تھی۔

پاچھی پا فرقہ کے لوگ بڑی سختی کے ساتھ اپنے بچوں کو جرم کی تعلیم دیتے ہیں، ہاتھ پیر باندھ کر کنوئیں میں لٹکا دیتے ہیں، اور پھر باہر نکال کر بچّہ سے کہتے ہیں "اگر تو نے باپ دادا کا پیشہ اختیار نہ کیا تو اسی طرح لٹکا دیں گے اور پھر کبھی کنوئیں سے باہر

باہر نہیں نکالیں گے۔ اسی قوم کے ایک لڑکے کا ذکر ہے کہ جب جیل سے نکلا تو مجسٹریٹ نے اس سے پوچھا "تم کیا ڈاکے ورک شاپ میں نوکری داری کی جگہ لینا پسند کرو گے"۔ لڑکے نے آمادگی ظاہر کی اور واپس آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ ایک مدت گذر گئی مگر وہ نہ آیا۔ آخر کار پورے تین سال کے بعد ڈاکوؤں کے ایک گروہ کے ساتھ پھر گرفتار ہوا اور مجسٹریٹ کے سامنے آتے ہی پھر ملازمت کرنے کے لئے تیار ہو گیا مگر ماں باپ کا اثر قوی تھا، اس سے نوکری نہ ہو سکی، تھوڑے ہی عرصہ بعد بدمعاشوں میں جا ملا، اُن ہی میں اس کے ماں باپ بھی شامل تھے۔ نوکری چھوڑنے سے پہلے کا واقعہ ہے، مجسٹریٹ نے اسے بلا کر کہا "دیکھو تو بدمعاش مت بنو اگر تم اپنے ماں باپ سے قطع تعلق نہ کرو گے تو تمہاری زندگی کا بیشتر حصہ جیل کی نذر ہو جائیگا"۔ لڑکا ذرا بھی متاثر نہیں ہوا۔ بلکہ کہا یہ جاتا ہے کہ اس نے لال لال دیدے نکالے دانت پیستے ہوئے مجسٹریٹ کی طرف دیکھا اور زیر لب کچھ کہا بھی۔

دیساری

ان میں تین بڑے فرقے ہیں۔ (۱) ڈونگا دساری (۲) کیترا دساری (۳) گولا دساری

یہ قوم عموماً جیبیں کاٹتی ہے۔ کیترا دساری بچپن سے جرم کی تربیت پائے ہوئے ہوتے ہیں۔ ڈونگا دساریوں کے جرائم کا مرکز ضلع کرنول میں ایک مقام شاپالی نام ہے۔ یہ لوگ بناوٹی نام اختیار کر لیتے ہیں۔ شاپالی میں بیٹھ کر بڑی بڑی دور تک بدمعاشیوں کا جال پھیلاتے ہیں۔ اِن کی منتظمانہ قابلیت کو دیکھ کر آدمی کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ بڑے بڑے گروہوں کی تنظیم کرتے ہیں مختلف نام رکھ کر اور طرح طرح کے بھیس بھر کے بستیوں پر ہاتھ صاف کرتے ہیں۔

بوراجا

اس قوم کے لوگ تلنگو زبان بولتے ہیں، اور مختلف جگہوں پر قلیوں اور لُہاروں کی حیثیت میں کام کرتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض چھوٹی موٹی دوکانیں کھول لیتے ہیں اور اس طرح گذارا چلاتے ہیں، اور بعض (اور یہ لوگ تعداد میں بہت کم ہیں) سرکاری عہدوں پر ہیں۔

بھیس بدلنے اور نام تبدیل کر ڈالنے میں بوراجا قوم کے افراد بہت طاق ہوتے ہیں۔ جب کبھی ایسی ویسی آن بنتی ہے جھٹ گلے میں مالا ڈال ماتھے پر تلک جما برہمن دیوتا بن بیٹھتے ہیں۔ ان کی آنکھیں بہت بڑی اور خوب چمکدار ہوتی ہیں اور اُن سے جرم ٹپکا پڑتا ہے۔

ان کے علاوہ

جن قوموں کا ذکر اوپر ہوا وہ جرائم پیشگی کی تاریخ میں بڑی نمایاں حیثیت رکھتی ہیں یعنی ساری کی ساری قوم ان ہی کاموں میں زندگیاں گذار دیتی ہے ان کے علاوہ کچھ قومیں اور بھی ہیں جنہیں گو جرائم پیشہ قوموں میں شامل نہیں کیا جا سکتا مگر جن کے افراد جرم کی سیاہی میں اپنے ہاتھ کالے کرتے رہتے ہیں بہتر ہو کہ اُن پر بھی ایک نظر ڈال لیں۔

عیسائی

عیسائی عموماً رومن کیتھولک فرقے کے ہوتے ہیں اور نسلی اعتبار سے بہت کچھ مشتبہ۔ تبدیل مذہب کی صورت یہ ہوتی ہے کہ باپ مفلسی میں چھوڑ کر مر گیا اور ماں نے بچے کی پرورش اور اس کی دیکھ بھال کو اپنے لئے کٹھن گردان کر بہت چھوٹی عمر میں اُسے کسی پادری کے حوالے کر دیا اور وہ بڑا ہو کر عیسائی شمار ہونے لگا۔ اس قسم کے لڑکے ۸ یا ۹ سال کی عمر میں پکے "آوارہ" ہو جاتے ہیں، اور رفتہ رفتہ چوری چکاری کے قبیح شغل میں دلچسپی لینے لگتے ہیں۔ جیلوں میں آنے والے عیسائی بالکل بے ضمیر اور احساسات کی نزاکت سے بالکل معرا ہوتے ہیں۔ مگر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بعض حیرت انگیز تقدس کا بہروپ بھر لیتے ہیں۔ بہت ہوشیار اور تیز ہوتے ہیں اور اپنے ارد گرد کی فضا میں بڑی آسانی سے گھل مل جاتے ہیں۔ فطرتاً بڑے حلیم الطبع

ہوتے ہیں مگر چوری کا لپکا ہزار کوشش کرنے پر بھی اُن سے نہیں چھوٹتا۔ عموماً طبیعت پُرمذاق ہوتی ہے۔ ایک عیسائی لڑکے کا ذکر ہے کہ ایک دفعہ جب وہ جیل میں تھا تو مدراس کے چڑیا گھر کے سپرنٹنڈنٹ صاحب نے چند لفافے کبوتر ریفارمیٹری سکول میں بھیجے تاکہ ان سے چھوٹے لڑکوں کے بہلانے کا سامان ہو سکے۔ عیسائی لڑکا انگریزی جانتا تھا، اُس سے کہا گیا کہ تم شکریہ کا ایک خط سپرنٹنڈنٹ صاحب کے نام لکھو۔ لڑکے نے خط لکھا جس کا دوسرا فقرہ یہ تھا۔

(We pray God will make you honest)

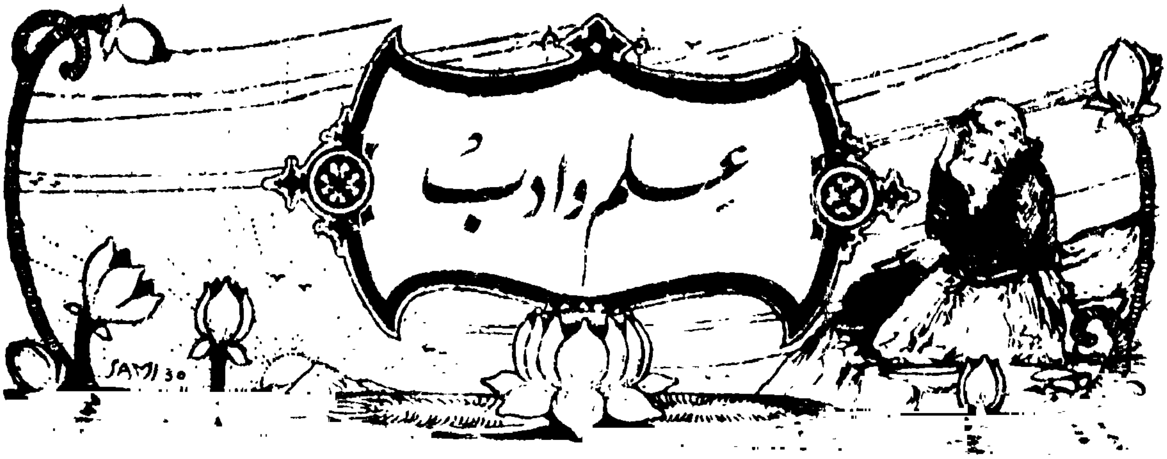
ہم خدا سے دعا کرتے ہیں وہ تمہیں ایمان دار بنائیگا

خط بھیجا نہیں گیا، ورنہ سپرنٹنڈنٹ صاحب ضرور پڑھ کر محظوظ ہوتے۔

مُسلمان یہ لوگ احاطۂ بمبئی کے ہوتے ہیں۔ اکتوبر کے مہینے میں جب مینہ برس چکتا ہے، اپنے گھروں سے نکلتے ہیں، اور کمانے دھمانے کا بہانہ بنا کر چوری چکاری کرتے پھرتے ہیں۔ اپنا اسلامی لباس اُتار کر جوگیوں اور بن باسیوں کے سے کپڑے پہن لیتے ہیں، اور قریہ بہ قریہ گھومتے پھرتے ہیں سفر بھی کرتے جاتے ہیں، بھیک بھی مانگتے جاتے ہیں اور اپنے نامۂ اعمال پر چوریوں کے سیاہ دھبّے بھی لگاتے جاتے ہیں۔ دیہاتی بستیاں اِن کے مظالم کا بہت شکار ہوتی ہیں..... کھوٹے سکّے خوب چلاتے ہیں، اپنی صدریوں اور دھوتیوں کی تہوں میں چھپائے رکھتے ہیں اور جب موقع دیکھتے ہیں نکال کر دوسکا ندار کے سر تھوپ دیتے ہیں

یہ لوگ ایسی جگہوں سے بہت کتراتے ہیں جہاں ان کی مجرمانہ کارروائی قانون کی روشنی میں آسکیں۔ اس لئے مملکت نظام اور احاطۂ بمبئی کے بین بین رہتے ہیں۔ کبھی کبھی ان کے محاربے ریاست میسور کے اندرونی علاقوں تک بھی پہنچ جاتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو بھی اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ بھیک مانگنے کے بہانہ سے گھروں کے اندر بھیجتے ہیں اور سمجھا دیتے ہیں کہ جب گھر والا اندر جائے تو آنگن میں جو چیز نظر آجائے لیکر نکل بھاگنا

اپنے جُرم کا اقرار بہت جلد کر دیتے ہیں، مگر کیا مجال جو آنکھ نیچی ہو جائے۔ برابر آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتے رہتے ہیں اور سوالات کا جواب نہایت بیباکی سے دیئے جاتے ہیں۔



آج اور کل

"دورِ اوّلین جتنا ہم سے دور ہوتا گیا ہم اسلام کی قوموں اس کی ہمہ گیر سچائیوں اور ترقی یافتہ راہوں سے اُتنے ہی دُور ہوتے گئے اور ہوتے جا رہے ہیں کہاں تھے، کہاں پہنچے کیا تھے اور کیا ہوگئے۔ اسد صاحب کی نظم "آج اور کل" کے عنوان سے ان دونوں حالتوں کا مکمل صحیح خاکہ ہے، اور اس قابل ہے کہ اس کو "سعید" میں شایع کیا جائے۔ ناظرین اس کو پڑھیں اور غور کریں کہ انہوں نے اپنے بچوں کو کس دین کا انسان بنایا ہے۔ بچہ کا پہلا مکتب ماں کی گود ہے۔ وہ آنکھ کھولتا دیکھتا، سمجھتا اور اختیار کرتا ہے جو اس کو دنیا کے پہلے مکتب میں بتلایا اور پڑھایا گیا ہے۔ اس لئے ضرورت ہے نہیں بلکہ فرض ہے کہ مائیں اپنے بچوں کو ان کا بھولا ہوا سبق یاد کرائیں۔ وہ اپنے اسلاف کے کارنامے پڑھیں سمجھیں اور عمل کریں، اچھوں کی اچھی باتیں وہ سنیں۔ اچھے بنیں اور اچھے کہلائیں۔"

سید محمد نعیم الدین (مودودی) موضع حاجی گنج ضلع سلطان پور

آج تیرا دل ہی کافر کل مسلماں تھا تو کیا
اب گماں آباد ہے کل شہرِ ایماں تھا تو کیا

آج تیرے دل میں بھی اسکی جھلک باقی نہیں
کل ترے چہرے سے نورِ حق نمایاں تھا تو کیا

آج چشمِ جہل کا حسرت بھرا آنسو ہے تو — کل ترا دل گوہرِ دریائے عرفاں تھا تو کیا

آج تجھ کو اپنے گھر کا راستہ ملتا نہیں — کل اگر تو رہنمائے نوعِ انساں تھا تو کیا

آج تو یکسر رہینِ منّتِ اغیار ہے — کل ہر اک گردن پہ تیرا بارِ احساں تھا تو کیا

آج تیرے حامیوں کے دل پہ ہے شکوہ ترا — کل مخالف بھی اگر تیرا ثنا خواں تھا تو کیا

آج تیرا بار اُٹھانے سے زمیں بیزار ہے — کل جو دورِ چرخ تیرے زیرِ فرماں تھا تو کیا

آج تو دوشِ ہوا پر ہے ترا مشتِ غبار — کل ترے قبضہ میں گر تختِ سلیماں تھا تو کیا

آج تجھ کو دیکھتا ہوں میں غلاموں کا غلام — کل جو ہفت اقلیم میں تو شاہ شاہاں تھا تو کیا

آج دنیا میں ترا جینا بھی مشکل ہو گیا — کل تجھے حق کیلئے مرنا بھی آساں تھا تو کیا

آج صحرا میں پریشاں ہیں ترے نالے اسد
کل جو تو صحنِ گلستاں میں غزل خواں تھا تو کیا

جوتی کی جوتیاں

(از جناب مجید حیدرآبادی)

محرم کا مہینہ تھا اور ہم امام باڑیں راستے سے گذرتے ہوئے آہ و زاری کی آواز سن کر ہم بھی ایک امام باڑے میں پہنچے۔

پاؤں سے جوتی نکال، بغل میں دباکر آگے بڑھے۔

مجلس کھچا کھچ بھری ہوئی تھی، تل دھرنے کو کہیں جگہ نہ تھی، اس پر بھی ہم کسی طرح سمٹ سمٹا کر ایک کونے میں بیٹھ گئے، مگر ہماری بغلی جوتی کے لیے ہماری بغل کے سوا اور کہیں جگہ نہ تھی، کچھ دیر تو بغل میں دبی رہی، پھر بغل میں درد ہونے سے جوتی نکال کر گود میں رکھ لی۔

پیٹ کو روٹی باندھنا تو سنا کرتے تھے، مگر پیٹ کو جوتی باندھنے کا محاورہ آج ہی ایجاد ہوا۔

جوتی اور پاؤں کی جوتی کی آغوش نشینی نے سارا لطف کرکرا کر دیا، مرثیہ کا کوئی مصرعہ سمجھ میں آیا ہو تو قسم لے لیجئے۔

جوتی کی اس ہم آغوشی پر پاک اور پلید کپڑے اندر ہی اندر مرثیہ پڑھ رہے تھے، ناک الگ، ناک بھوں چڑھا رہی تھی، آنکھیں الگ آنکھیں نکال نکال کر دیکھ رہی تھیں، عرش نشیں دماغ الگ بد دماغ ہو رہا تھا۔

غرض ہم کے ہر طرف سے غریب جوتی پر لعن طعن کی جوتیاں برس رہی تھیں، بیچاری جوتی آخر کب تک صبر کرتی؟ کہاں تک اپنی ذلت گوارا کرتی؟

زبان کی صورت تو تھی ہی اب سچ مچ زبان بن گئی۔

بگڑ کر کہہ اٹھی کہ اے بے مجد مجد! اے مغرور انسان! اے جلدی حیوان! اپنی ہم جنس چمڑے کی جوتی کو زیادہ ذلت سے نہ دیکھ ——— کیا میں اس لئے ذلیل ہوں کہ ——— خود نجاستوں میں پڑ کر تجھ کو پاک صاف رکھتی ہوں؟ کیا میں اس لئے ذلیل ہوں کہ ——— چمڑے سے بنی ہوں؟ تو کب سونے سے بنا ہے؟ اے تو بھی تو سر سے پاؤں تک خالی ڈھول کی طرح چمڑے سے مڑھا ہوا ہے، پہلے اپنی آنکھ کا شہتیر نکال، پھر دوسرے کی عیب جوئی کر۔

اے ظالم! اپنے محسن کے ساتھ یہ سلوک؟

یا محسن کشی اور کسے کہتے ہیں؟

اے مغرور انسان! کیا تو شیطان تو نہیں ہے؟

شیطان نے تو ایک حجت بھی پیش کی تھی یعنی "خلقتنی من نار و خلقته من طین" لیکن یہاں تو یہ بھی فرق نہیں ہے۔ چمڑا ہی ہمارا ظاہر و باطن ہے، اے احسان فراموش، میں تو اس قابل ہوں کہ پاؤں میں پہننے کے بعد تمنا تا تو مجھے سر پر بھی رکھ لیا کرے ——— لیکن میں اس کی خواہشمند بھی نہیں ہوں، ہاں اتنا ضرور کہوں گی کہ آئندہ کسی کو، اور خصوص اپنے محسن کو ذلیل نہ کرنا۔

کام سے، مگر نام نہ دھر

ہم جوتی کی اس دریدہ دہنی اور بیان واقعی کو خاموشی سے سنتے رہے، جواب کا کیا موقع تھا، اپنی ارمان کر جوتی کی مدح سرائی کرتے، اور یہ قطعہ قاطع الغرور پڑھتے ہوئے اپنے گھر واپس ہوئے۔

نوع انسانی ہے سرتاپا جہان احتیاج
اشرف عالم کی یہ درگت، خدا کی شان ہے
مادّی دنیا میں کس کس کا ہوں میں منت پذیر
میرے سر پر، پاؤں کی جوتی کا بھی احسان ہے

ہر ذرّے کے ہم ہیں زیر بار احساں ؏ — اک اک قطرہ ہے جو شبار احساں
حیوان و نبات، سب کے ممنوں ہیں ہم — ممنوں اگر نہیں، تو مجنوں ہیں ہم

ہمدردئ غیر میں ہے راحت اپنی
ہر شخص کی قسمت میں ہے شرکت اپنی

مخفی ہے جماعت میں کرامت ساری — شیر اور شکر سے ہے حلاوت ساری
صرف اک اپنی خوشی نہیں ہو سکتی — اک شخص کی زندگی نہیں ہو سکتی

ہمدردئ غیر میں ہے راحت اپنی
ہر شخص کی قسمت میں ہے شرکت اپنی

بھنگی بیمار ہو تو مشکل پڑ جائے — دھوبی نہ اگر آئے، تو کپڑا سڑ جائے
خط کون بنائے، جبکہ نائی نہ ملے — موچی نہ ملے تو زیر پائی نہ ملے

ہمدردئ غیر میں ہے راحت اپنی
ہر شخص کی قسمت میں ہے شرکت اپنی

معمار اگر نہو، تو گھر کون بنائے — عشرت منزل کا بام و در کون بنائے
دہقان نہ ہو، تو کھیت کیونکر ہوگا ؏ — جب کھیت نہو، پیٹ پہ پتھر ہوگا

ہمدردئ غیر میں ہے راحت اپنی
ہر شخص کی قسمت میں ہے شرکت اپنی

چمکی ہے فقیروں سے امیری ساری — دنیا میں مریدوں سے ہے پیری ساری
خادم ہی سے ہے نام و نمود مخدوم — خادم ہی کے دم سے ہے وجود مخدوم

ہمدردئ غیر میں ہے راحت اپنی
ہر شخص کی قسمت میں ہے شرکت اپنی

بیماری سے زندگی ہے نقصانی میں — دم سے پیاسوں کے آب ہے پانی میں
میخواروں سے ہے نام و نمود ساقی — تفصیل بہت ہے، قس علیہا الباقی

ہمدردئ غیر میں ہے راحت اپنی
ہر شخص کی قسمت میں ہے شرکت اپنی

اپنا ہی وجود ہے یہ عالم سارا ؏ — اپنی ہی نمود ہے یہ عالم سارا
آئینۂ دہر میں ہے رویت اپنی ؏ — پتھر کی بھی مورت میں ہے صورت اپنی

ہمدردئ غیر میں ہے راحت اپنی
ہر شخص کی قسمت میں ہے شرکت اپنی

ایک ادیب "ڈاکو"

"جس طرح بہت سے گراں بہا جواہر زر پرستوں کی ہوسناکی کی وجہ سے ان کے خزانوں میں زیر زمین مدفون پڑے ہیں، اسی طرح ملک کی سیاسی تحریکوں نے بھی بہت سے بلند خیال اور عالی دماغ نوجوانوں کو زندان فرنگ میں محبوس کر دیا ہے، اور دنیائے علم و ادب ان نوشگفتہ پھولوں کی خوشبو سے محروم رہ گئی ہے"

ذیل میں جو خط ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے وہ ملتان جیل سے ہمارے مخدوم محترم جناب مولانا عارف ہسوی صاحب کے پاس آیا تھا۔ مولانائے ممدوح "سعید" کے لئے ایک بہت ہی گراں قدر مضمون "شاعر آذربائیجان" لکھ کر جو دسمبر کے "سعید" میں شائع ہو چکا ہے جیل چلے گئے تھے اور اپنی سزا کی مدت پوری کر کے ابھی چند روز ہوئے واپس آئے ہیں۔ مولانا کی ملاقات شیر جنگ صاحب سے کہ جو اس خط کے کاتب ہیں ملتان جیل ہی میں ہوئی تھی۔ آپ ایک سیاسی ڈاکہ کے الزام میں ماخوذ ہو کر پہلے پچیس سال کی مدت کے لئے سزایاب ہوئے تھے، لیکن بعد میں ہائی کورٹ نے گھٹا کر بیس سال کر دی، اور اب کمال صبر و سکون کے ساتھ آپ اسی مدت کو ملتان جیل میں پورا کر رہے ہیں۔

سیاسی ڈاکے، سیاسی قتل، بم سازی اور بم بازی یورپ کے انارکسٹوں کے طریقے ہیں، جنہیں بدقسمتی سے ملک کے بعض جوشیلے مگر نادان نوجوانوں نے اختیار کر لیا ہے، اور یہ حد درجہ افسوسناک ہے۔ یہ افسوس اور رنج اور بھی بڑھ جاتا ہے جب کوئی ایسی مثال سامنے آجاتی ہے کہ اس گمراہی میں مبتلا ہونے والا نوجوان کوئی عالی خیال اور بالغ النظر ہستی ہو، اور جو ایک شریف مقصد کی خاطر ایک غلط راستہ اختیار کر کے اپنی زندگی تباہ کر ڈالے۔ مرحوم اشفاق اللہ اور بھگت سنگھ کی طرح شیر جنگ صاحب نے بھی کسی وجہ سے غلط راستہ اختیار کر لیا، اور صد حیف کہ ادب اردو کی دنیا ان کے جواہر افکار سے محروم ہو گئی۔ یہ پاکیزہ تخیل، یہ سوز و گداز سے بھرا ہوا دل، اور یہ ہمت بلند اگر صحیح راستوں پر گامزن ہوتی تو کون کہہ سکتا ہے کہ آج شیر جنگ کیا چیز ہوتے!!

ہم مولانا عارف کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انہوں نے یہ خط ہمیں اس اجازت کے ساتھ مرحمت فرما دیا کہ اس سے قارئین "سعید" کی ضیافت طبع کی جائے۔ (ایڈیٹر)

مولانا صاحب!

"شبنم" کی طرح جو کہ چمکتے ہوئے سورج کے نیچے گزرانہ طور پر پھولوں سے بغلگیر ہوتی ہے، اور جو اپنا تمام سرمایہ محبت یعنی شیرینی، شفقت اور لطف انگیز احساسات، بغیر اس کے کہ وہ اظہار کے لئے شرمندۂ الفاظ و معانی ہو، اپنی تمام خصوصیات کی بخشش پھولوں کو خاموشانہ عطا کر دیتی ہے، ٹھیک اسی طرح ہی تمام لطیف جذبات کے ساتھ آپ کا شفقت نامہ آیا اور میرے دل کو اس شریف لمس کے ساتھ جو کہ قوس و قزح، بارش سے دھلے ہوئے عریاں افق کو چومتے وقت اختیار کرتی ہے ہلکے سے چھو لیا۔

موسم سرما میں پہاڑی شہد کی تمام روح افزا مٹھاس، لمبے دنوں کی تمام ظریفانہ شوخی، موسم بہار کے تمام دلآویز وعدے، پھیلے ہوئے سبزہ زاروں کی شبنم آلودہ تمام خوشبو، بہتے ہوئے

چشموں کے تمام روح پرور نغمے وادیِ کوہ میں کھلی ہوئی یاسمین کی تمام مستی آپکے محبت نامہ نے میرے دل پر مرتسم کر دی۔ اسمیں نغمہ سنج پرندوں کے مسکراتے راگوں کا ابتسام، دامنِ کوہ میں پتھر کے پیچھے سے جھانکتے ہوئے گلِ بنفشہ کی چشمک زنی ہے۔ پہاڑوں پر سرسراتی ہوئی گھاس کی چیخ چہار ہے، اور غروبِ آفتاب کے دامن میں گرانڈیل درختوں کی باشکوہ ملندی ہے۔ کاش کہ اس کرم و شفقت سے ابھرے ہوئے جذبات کے اظہار کا کوئی ذریعہ ہوتا! جو برگِ کاہ پر تھرکتی ہوئی شبنم کی طرح بادِ نسیم تک سے بے نیاز ہو۔ میں لکھتے لکھتے سوچنے لگتا ہوں! سوچتا ہوں! یا کیا ہو جاتا ہوں! ہاں، ان سب سے الگ کچھ ہو جاتا ہوں، اور جب یہ کوشش کرتا ہوں کہ جو کچھ سوچ رہا ہوں اسے سیاہ و سفید میں سپردِ قلم کر دوں تو اس نتیجہ پر پہنچتا ہوں کہ "کچھ نہیں سوچا"۔ یہ جیسے ٹوٹے ہوئے تار کی آخری لرزش کے مرتے ہوئے نغموں کی تھرتھراہٹ ہوتی ہے۔ روتی ہوئی آنکھ کے آخری آنسو میں بہتے ہوئے درد کی گونج ہوتی ہے اور شاخ سے ٹوٹتے ہوئے بہار میں، برگِ سبز کی مرجھائی ہوئی زیرِ لب آہ ہوتی ہے، جو کوئی شاعر، کوئی مصوّر اور کوئی مغنّی اپنے انتہائے کمال سے بھی ظاہر نہیں کر سکتا۔ آہ! انسان کس قدر بیکس لاچار اور دور از فہم ہو جاتا ہے جب "یادِ رفتہ" صبحِ صادق کی طرح اپنے نرم گلابی پاؤں رکھتی ہوئی اس تاریک افق پر نمودار ہوتی ہے جیسے حسین دامنِ صبح کے کہرے کی طرح اس طرح اُڑ جاتے ہیں گویا ان کا کبھی نمود ہی نہیں تھا۔

آپ تشریف لے گئے اور اس کے بعد میرے دل پر کیا بنی وہ آپ نہیں جان سکتے، اور حقیقت یہ ہے کہ شاید میں خود بھی اس کی حقیقت سے ناواقف ہوں۔ دن کی روشنی ایسی معلوم ہو رہی تھی گویا آسمان کے مغربی کونے سے لڑکھڑاتے ہوئے، بادل کے ایک بڑے سے اور مہیب شگاف سے، جو ایک کھلے ہوئے خوفناک زخم کی مانند تھا وہ نکیل نکالی گئی ہو۔ دن، قبرستان کی جھاڑیوں میں کھلی قبر کے دہانے پر رکھا ہوا ایک ایسا کھلا جنازہ جس میں لاش عریاں پڑی ہو، دم ہو رہا تھا۔ اور وقت کسی ماندہ سے راہ گم کردہ گرد آلودہ، قافلہ سے دبے ہوئے اونٹ کی طرح، بیچ ریگستان میں حیرت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا سا جان پڑتا تھا اور آئندہ کے زمانے سب "فردا" ایک لمبی قطار میں کھڑے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ تعداد بیشمار تھی، سب سے پہلا سب سے بڑا اور صاف نظر آتا تھا، اور جو جتنا دور تھا اتنا ہی چھوٹا اور دھندلا معلوم ہوتا تھا۔ تھے سب منہ پھاڑے۔ بھیانک اور سنگدلانہ انداز میں کھڑے ہوئے، اور گویا سب چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے "خبردار، مجھ سے بچ ..... مجھ سے دور بھاگ! ....." اور میں اُس بچّہ کی طرح جو کسی بڑے دریا کے پل پر بیٹھا ہوا لہراتے ہوئے پانی میں اپنے بنتے عکس کو دیکھ کر جو مختلف ڈراونی صورتیں ہر لمحہ تبدیل کرتا رہتا ہے کانپ رہا تھا، پھر رونے لگا، اور پھر دریا میں ٹپکتے ہوئے آنسوؤں کی نہ ٹوٹنے والی لڑی کو دیکھنے لگا، اور دیکھتے دیکھتے نہ پھر آنسو ہی رہے اور نہ دریا ہی، نہ پل ہی رہا اور نہ میں ہی۔ آنکھوں کے اندر ایک گاڑھا سیاہ دھواں سا چھا گیا۔ کسی کی دھندلی سی تصویر، کہرے میں لپٹی ہوئی، دور سے آتی ہوئی بانسری کی تان کی طرح دل میں گدگدی کرنے لگی، اور میں اس کے احساس میں ڈوب کر احساس کو بھی کھونے لگا۔ کھو دیا، کھو گیا، اور پھر سو گیا۔

پانی کے گھڑے میں کافی وزن ہوتا ہے۔ ایک گلاس پانی میں بھی تو کچھ نہ کچھ وزن ہوتا ہی ہے، لیکن سمندر میں غوطہ لگا دینے سے، اس کے باوجود کہ ہزاروں گھڑے پانی بار دوش ہوتے ہیں۔ لاکھوں من پانی سر کے اوپر ہوتا ہے، لیکن ہم محسوس نہیں کرتے۔ یہی نہیں بلکہ ایک راحت سی محسوس کرنے لگتے ہیں۔

بس ٹھیک اسی طرح غم کا سبب پیدا ساغر جب میرے ہاتھ میں آیا تو کچھ دن بھی معلوم ہوا ... تھا ... لیکن جوں جوں اس کی گہرائیاں ... ہوتی گئیں ... زندگی ... کی کہانی میرے سینے میں بھی ... ہوتی گئی، ہاں درد ضرور بڑھتا گیا۔ لیکن جس دن کہ الم ایک تلاطم خیز لہروں میں ... ٹکرا گیا اور جوں جوں ... یہ مسلسل ہو گیا وزن بھی گھٹتا گیا، اور اب تو اس کے تہ میں غرق ہوں، اس لئے ... آتا نہیں البتہ ایک ... ہے اور وہ یہ ہے کہ کوئی اپنے کاندھے پر بٹھا کر مجھے ساحل کی جلتی ہوئی ریت پر تڑپنے کے لئے نہ پھینک دے۔

میں ٹھیک اس جھیل کی مانند ہوں جو ہر طرف اونچے اونچے پہاڑوں سے محصور ہو، اور کالی اندھیری شب کی طرح گہری ہو۔ پہاڑوں کی چوٹی سے جو غم کی چٹان ٹوٹ کر اسمیں گرنے کے لئے لڑھکتی ہے، وہ راستہ میں آتے آتے ایک کی بجائے سینکڑوں نوکیلے ٹکڑوں میں منقسم ہو جاتی ہے اور اپنی پوری قوت سے سطح آب سے ٹکرا کر جھیل کی انتہائی گہرائی کو بھی اپنے جانکاہ صدمہ سے ہلا ڈالتی ہے۔ لیکن جوں جوں اس کے قعر کی طرف بڑھتی جاتی ہے اس کی سطح —— لڑکپن کے ٹھیک بعد اور شباب سے عین پہلے، امن میں سوتے ہوئے جوبن کی طرح —— باامن ہوتی جاتی ہے، اور آخر میں ذہن شاعر میں سوتے ہوئے اشعار کی طرح، اس کی سطح بھی سو سی جاتی ہے۔ ہاں، اس کی تہ میں ایک اور بار اور روح پر ایک اور زخم کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ بس اب یہ اپنے اوپر، دور بہت دور پھیلے ہوئے آسمان میں ٹمٹماتے اپنے محبوب ستاروں کو تکا کرے جو اپنی مدہم شعاعوں میں لپٹے ہوئے ایسے نظر آتے ہیں، گویا آنسو بھری آنکھ دور سے کسی شمع کی ضیاء کو دیکھ رہی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ستارے اس کی پہنچ سے بہت دور ہیں، لیکن ان کا عکس تو اس کی ابھری ہوئی لہروں سے لیکر اس کی انتہائی گہرائیوں تک میں مرتسم ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اب ستارے اگر خود بھی اس عکس کو جھیل کی دھڑکتی ہوئی ننگی چھاتی سے مٹانا چاہیں تو یہ ناممکن ہے۔

مجھے اب ایسا معلوم ہونے لگا ہے گویا میری زندگی جنگل کی اس بیل کی مانند ہے، جو کسی درخت کے سہارے ہی کھڑی ہو سکتی ہے آندھی کے بیدردانہ جھٹکوں سے ٹوٹ کر جب یہ زمین پر ٹوٹ کر میں گر پڑتی ہے تو بے جان سی ہو کر سوکھنے لگتی ہے، اور پھر اپنے لیے باز کسی دور کھڑے ہوئے درخت کی طرف التجا سے کانپتے ہوئے بڑھا دیتی ہے۔ ایک غریق درد امید ضرور رہے، اور وہ یہ! کہ اس کی اپنی شاخ جو ٹوٹ کر گر چکی ہے وہ اس سے الگ ہو کر مر چکی۔ لیکن اس کا اپنا تنا جو کسی دوسرے درخت سے ٹکرا کر گر گیا تھا وہ ضرور پھر کھڑا ہو سکیگا۔ لیکن کب؟؟؟

دھوپ کی شعاعیں پہاڑ کے اوپر سے ترچھی ترچھی وادی پر تو ناچ رہی ہیں، لیکن پہاڑ کا اپنا دامن سائے سے ڈھکا ہوا ہے۔ ٹھیک ہے کہ وہ بھی روشن ہو جائے گا۔ لیکن کب؟؟؟

میرا دل ایک زخم خوردہ کشتی کی طرح ہے جو غم کے سمندر میں اس کی کف آلود لہروں کے تھپیڑے کھا رہی ہے، اس میں دم بدم پانی بھرتا جا رہا ہے۔ یہ ساحل کی ملتجی ہے، ساحل آئیگا تو سہی، لیکن کب؟؟؟

معلوم نہیں یہ خط آپ تک پہنچتا بھی ہے یا نہیں، اور نہ جانے میں نے کیا کچھ لکھ گیا ہوں، اس وقت میرے خیالات خزاں میں بکھرے ہوئے سوکھے پتوں کی طرح جذبات کے بگولوں میں تیزی سے چکر کاٹ رہے ہیں، اور میں بچے کی مسکراہٹ کی طرح جو بلا وجہ اور بغیر جانے بھی نیند کے بارے بوجھل آنکھیں

کئے ہوئے مسکرا رہا ہو، بغیر سوچے ہی لکھتا جا رہا ہوں۔ میں خوش ہوں؟ نہیں! غمزدہ ہوں؟ نہیں! بجیس ہوں؟ نہیں! آہ! نہیں کیا ہوں؟ کچھ نہیں جانتا! - کیا ہوں؟ کیا ہوں؟ کیوں ہوں؟ کیوں ہوں؟........ اور نہیں کچھ نہیں۔

آپکا پہلا خط اور دوسرا خط، ہر دو اکٹھے آج ہی دیئے گئے ہیں۔ شاید جواب میں کچھ دیر ہو گئی۔ م......ع! نہیں کچھ نہیں! جو میں نے نہیں کہا، اور نہ کہنا ہی چاہیئے تھا۔ شاید آج میں وہ سب کچھ کہہ گیا ہوں ــــ اچھا اب ــــ ہونٹوں سے جو میں نے نہیں کیا، اور شاید کرنا بھی نہیں چاہیئے تھا وہ بھی کئے دیتا ہوں۔ (   )

"بزرگوار" کی طبع خاطر پر میری وجہ سے اگر اب تک غبار ہو تو کیا آپ بتلا سکتے ہیں کہ اُس کے صاف کرنے کے لئے میں کس سے التجا کروں؟ کیا اُن کی خدمت میں مجھے سلام عرض کرنا واجب ہے؟ جواب سے ممنون فرمائیں۔

بھیا بھوت ناتھ اُمید ہے اپنی تمام اداؤں کے ساتھ اسشیشہ شکن، خوب خوش ہوگا۔ میں اُسے embrace کرتا ہوں۔ شام کا کیا حال ہے؟ میری طرف سے اُسے بہت بہت kiss کر دیجئے گا

ــــ تلسی صاحب کو ــــ

ڈاکٹر صاحب (تنکا توڑ) آپکے یاد نہ کرنے پر شکریہ ادا کرتے ہیں اور سلام عرض کرتے ہیں۔ جیند رجی اور بے زبان ڈاکٹر صاحب حسب معمول خوش و خرم ہیں، اور آپ کا تذکرہ کرتے رہتے ہیں۔

میں اپنی اُردو کی خامیوں سے واقف ہوں اور شاید آپ بھی، اس لئے مؤدبانہ اور شرمسارانہ معافی چاہتا ہوں، اور وہ اس لئے چونکہ میں خود اُس تکلیف سے واقف ہوں جو بے ربط خیالات اور پراگندہ زبان، روح کو پہنچاتی ہے۔

آپکا ہمیشہ ہی جنگ

"ڈوبتے کا سمت ساحل دیکھنا"

(از جناب عاطر حسن صاحب قریشی بی، ٹی عاطر بریلوی)

سامنے اُن کے ذرا بیتابیٔ دل دیکھنا
اضطراب موج اور تمکین ساحل دیکھنا

چشم قاتل چاہتی ہے رقص بسمل دیکھنا
اور بسمل چاہتا ہے شانِ قاتل دیکھنا

میرا حیرت کی نظر سے سوئے قاتل دیکھنا
یوں سمجھئے ڈوبتے کا سمتِ ساحل دیکھنا

ایک برقِ مضطرب کا کوندجانا یک بیک
دفعتاً حیرت سے میرا صورتِ حائل دیکھنا

چین سے سو جا لپٹ کر سینۂ گرداب سے
ڈوبنے والے نہ ہرگز سوئے ساحل دیکھنا

وہ ہمارا چلتے چلتے بیٹھ جانا راہ میں
وہ ہمارا بیٹھے بیٹھے سمتِ منزل دیکھنا

رہروی کا پاک جذبہ لیکے اُٹھو تو سہی
ہر قدم پر ایک دل آویز منزل دیکھنا

دُھو رہا ہے آج ظالم اپنی رسوائی کے داغ
رو رہا ہے نعش پر یہ نازِ قاتل دیکھنا

زیرِ خنجر آج اے عاطر تڑپتا رہ یونہی
تیرا حصّہ ہے جمالِ روئے قاتل دیکھنا

تعمیل فرمان

(از محترمہ مسز نور الحسن صاحبہ)

چونکہ میرے بار بار کے تقاضوں کے بعد یہ غزل لکھی گئی تھی، غالباً اس لئے اس نفیس اور پاکیزہ غزل کو یہ عجیب عنوان دیا گیا ہے کسے یقین آسکتا ہے کہ حرم کی چہار دیواریوں کے اندر سورج کی دھوپ و تازہ ہوا سے محروم رہ کر بھی تخیل انسانی کے باغ ایسے ایسے پھول کھلا سکتے ہیں کہ جن کی نکہتیں مشک عنبر کو شرما دیں، اللہ کرے زور قلم اور زیادہ ہے۔ (ایڈیٹر)

ملکر گلے سے ہوں نہ جدا کاش ہم کبھی ہو — کرنا نہ ہم پہ چرخ کہن یہ ستم کبھی ہو
اے ہمنشیں نہ پوچھ دل مضطرب کا حال — یہ درد وہ نہیں ہے جو ہو جائے کم کبھی
بخت سیہ کی جائے گی پیچیدگی کہاں — نکلا ہے تیری زلف کا یہ پیچ و خم کبھی!
اے رہروان دہر نہ زنہار بھولنا — کرنا ہے طے مسافت ملک عدم کبھی
سوز تپ فراق میں تڑپیں گے عمر بھر — نکلے گا تیرے ہجر میں ہرگز نہ دم کبھی
دو گھونٹ پی کے مشعل میخانہ بن گیا — وہ شیخ جس کو کہتے تھے شمع حرم کبھی

رباعیات

(از جناب اسعد حسین صاحب اشرفی عرشی دہلوی)

مفلس کی طرف کرتے ہیں نخوت سے نگاہ — ابلیس سے بڑھ کر ہیں تونگر گمراہ
اس دولت دوروزہ پہ اور اتنا غرور — لا حول ولا قوۃ الا باللہ

دنیا میں کوئی کام نہیں ہے دشوار — ہاں ہمت عالی ہے بشر کو درکار
رکھ ہمت مردانہ کہ ہمت کے حضور — خردل سے بھی کم رکھتا ہے وقعت کہسار

بخشی ہے اگر تجھ کو خدا نے دولت — تو اس سے غریبوں کی کیا کر خدمت
دولت کا اگر نیک ہے مصرف تو تجھے — جنت ہے یہاں اور وہاں بھی جنت

کیا کہیئے کہ احباب کو کیسا دیکھا — کام آئے کبھی کوئی نہ ایسا دیکھا
سب زر کے ہیں بے زر کا نہیں کوئی رفیق — دنیا میں جو کچھ دیکھا وہ پیسا دیکھا

دنیا کو تو کہتا ہے برا اے واعظ — سب تاکہ تجھے سمجھیں بھلا اے واعظ
تیرا بھی جو بس چلے تو مر کر بھی کبھی — دنیا کو نہ چھوڑے بخدا اے واعظ

"گل کھلا گیا کوئی"

(از جناب پنڈت پرتھو دیال صاحب منصر عاشق لکھنوی)

آج پھر گل کھلا گیا کوئی   دل پہ چرکا لگا گیا کوئی
شکل اپنی دکھا گیا کوئی   بیٹھے بیٹھے رلا گیا کوئی

خواب میں آج آگیا کوئی   بخت خفتہ جگا گیا کوئی
کیا کہوں کچھ کہا نہیں جاتا   چُپ کچھ ایسی لگا گیا کوئی
باغ عالم ہے ایک عجیب سرا   کوئی آکر بسا - گیا کوئی
چار جانب وہی ہے پیش نظر   آنکھ میں کیا سما گیا کوئی

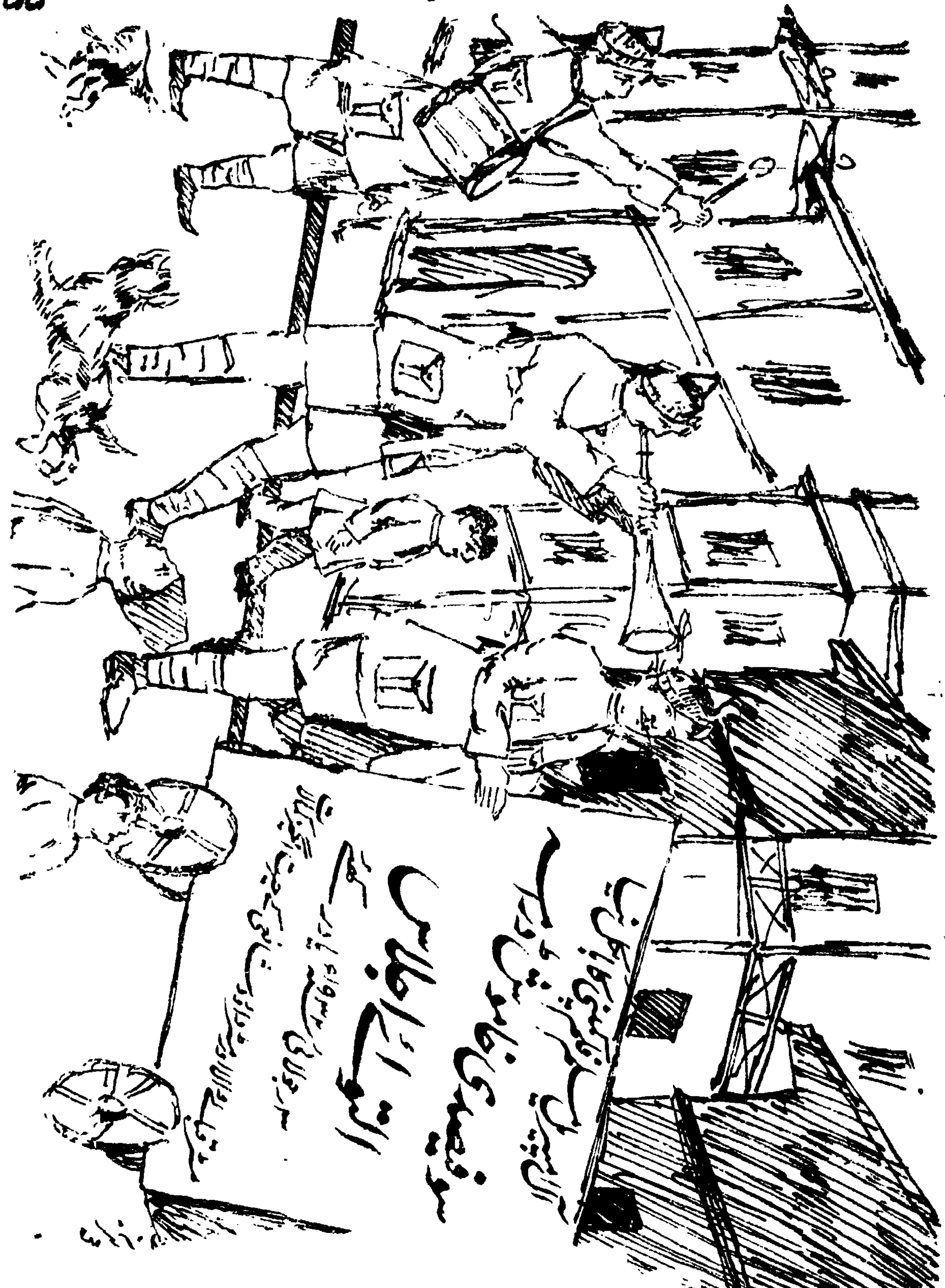
للہ الحمد قبر عاشق پر
پھول آکر چڑھا گیا کوئی

رباعیات

(از جناب سید ابن حسن صاحب شارق دہلوی)

ناکی سے یہ ہے باہنر انہیں زر نہ دیا (۱)   زر جن کو دیا خدا نے جوہر نہ دیا
سش ہوئی علم کی نہ قدر اخلاق   کچھ بھی نہ دیا اگر مقدر نہ دیا

باب حیا جی سے گذر جاتے ہیں (۲)   اہل غیرت ہی نام کر جاتے ہیں
دہ رہتی ہے وضعداری انکی   وہ مرد ہیں جو بات پہ مر جاتے ہیں





نقد وتبصرہ

گناہ کی دیوار اور ہمزاد

پروفیسر اشتیاق حسین صاحب قریشی ایم اے نے یہ دونوں ڈرامے لکھے ہیں اور انہیں جامعہ دہلی کے مکتبہ نے شائع کیا ہے۔ قیمت بارہ آنے اور چھ آنے ہے۔ دونوں کتابیں بہت خوبصورت چھپی ہیں اور منیجر صاحب مکتبہ جامعہ دہلی سے مل سکتی ہیں۔

اُردو زبان اور اُردو داں پبلک کے لئے یہ ڈرامے کسی قدر عجیب و غریب سی چیز ہیں، کیونکہ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں ڈرامے کا مفہوم یہ ہے کہ وہ کوئی عشقیہ افسانہ ہو، اس کے تقریباً سارے کے سارے واقعات مافوق العادۃ ہوں اور موقع بےموقع اس میں اتنے گانے ٹھونس دیئے گئے ہوں کہ چوبدار اگر بادشاہ کے حضور میں کسی کی آمد کی اطلاع کرے تو وہ بھی گا کر، اور غیض و غضب میں آکر اگر بادشاہ کسی کے قتل کا حکم دے تو وہ بھی اشعار میں، نہ خود بادشاہ اپنے منصب، اور اپنے مرتبہ کے مناسب آداب شاہی سے واقفیت رکھتا ہو، اور نہ درباریوں میں سے کسی کو اتنی تمیز ہو کہ وہ سمجھ سکیں کہ وہ کسی قہوہ خانے میں نہیں بلکہ اپنے بادشاہ کے حضور میں بیٹھے ہیں۔ چند پریاں آجائیں اور اپنا ناچ دکھا جائیں، کچھ دیو آکر اپنے کرتبوں سے محفل کو حیران بنا جائیں، اور بیچ بیچ میں تھوڑی سی چاشنی بازاری مسخرہ پن کی ہو جس پر تماشائیوں میں قہقہے پڑ جائیں اور "ونس مور" (once more) کی صداؤں سے تمام اسٹیج گونج جائے۔ بادشاہوں اور شاہزادوں سے کم درجہ کے لوگوں کا قصہ نہ ہو اور ہیرو اور ہیروئن میں تمام خوبیاں اور تمام طاقتیں فوق الانسان موجود ہوں، مختصر یہ کہ بحیثیت مجموعی تمثیل ایسی ہو کہ جس پر بھول کر بھی حقیقت کا گمان نہ ہو سکے، اور اصل سے نقل کا فرق کسی صورت میں بھی بعد المشرقین سے کم نہ ہو۔

اس قسم کے ڈراموں کے دیکھنے والے کسی ایسے ڈرامے سے مشکل ہی سے خوش ہو سکتے ہیں کہ جس میں نہ ناچ ہو نہ گانا، نہ راجہ اندر کے اکھاڑے ہوں نہ پریوں کے نظارے، اور نہ بازاری پھکڑ ہو نہ مافوق العادۃ طلسماتی منظر، لیکن کوئی پسند کرے یا نہ کرے اور کسی کو اچھا معلوم ہو یا بُرا، ڈرامہ یا تمثیل جس چیز کا نام ہے وہ یہی ہے جو جناب اشتیاق حسین صاحب نے پیش کیا ہے۔ عام لوگوں کی زندگی کا ایک عام واقعہ ہے اور اصلیت سے اس قدر قریب کہ اسے پڑھتے وقت یہ خیال ہی نہیں آسکتا کہ ہم کوئی فرضی افسانہ پڑھ رہے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس دور بدمذاقی میں اس قسم کی صحیح چیزوں کی کافی قدر نہ ہو لیکن آہستہ آہستہ مذاق کی پستی دور ہوتی جاتی ہے اور وہ زمانہ دور نہیں ہے کہ جب صرف انہی چیزوں کی قدر ہوگی کہ جو اچھی ہوں اور

(ڈاکٹر سعید احمد پرنٹر پبلشر نے محبوب المطابع برقی پریس میں چھپوا کر کوچہ چیلان دہلی سے شائع کیا)

مُنہ میں سانپ

اگر تمہارے مسوڑھوں سے پیپ نکلتی ہے تو آپکے مسوڑھے اب مسوڑھے نہیں رہے ہیں بلکہ تم نے اپنے منہ میں سانپ پال رکھے ہیں مسوڑھوں کی پیپ سانپ کا زہر ہے کم سمجھو یہ پیپ کھانے اور پینے کی ہر چیز کے ساتھ معدہ میں گرتی ہے اور معدہ کو خراب کر دیتی ہے اور تم نے جاہلوں پہلوانوں تک سے سنا ہوگا کہ معدہ کی خرابی تمام بیماریوں کی جڑ ہے مگر باخبر لوگ جانتے ہیں کہ دانتوں کی خرابی تمام بیماریوں کی جڑ ہے کیونکہ معدہ خود عموماً دانتوں کی خرابی سے خراب ہوتا ہے۔

حکیم واحدی صاحب کا منجن

اکسیرِ دندان

اس سانپ کے زہر کا تریاق ہے، اللہ کے فضل سے یہ منجن دانتوں کی ہر ہر خرابی کو دور کرتا ہے، مسوڑھوں سے پیپ نکلنے سے بڑھ کر تو کوئی خرابی نہیں، پیپ نکلنے سے دانت ہلنے بھی لگے ہوں تو ان شاء اللہ واحدی صاحب کا منجن انہیں جوڑ دیگا۔ منجن اکسیرِ دندان کا نسخہ واحدی صاحب کو حضرت مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں رحمۃ اللہ علیہ نے دیا تھا، سنہ ۱۹۱۲ء میں جبکہ واحدی صاحب اخبار "طبیب" کے ایڈیٹر تھے۔

جو لوگ پائیوریا یعنی دانتوں سے پیپ نکلنے کے مریض ہوں وہ واحدی صاحب کا منجن اکسیرِ دندان تھوڑا سا ہر وقت پاس رکھیں اور جب کھانا یا پھل یا پان وغیرہ کھائیں تو پہلے منجن سے انگلی کے ذریعہ دانتوں اور مسوڑھوں کو صاف کریں اسی طرح شاید پانچ چھ دفعہ انہیں منجن استعمال کرنا پڑیگا زحمت اٹھانی پڑیگی لیکن یہ زحمت انکی بے پروائی کا نتیجہ ہے اور اسے انہیں برداشت کرنا چاہیئے اور اس برداشت کا فائدہ وہ فوراً محسوس کرینگے ورنہ مزید بے پروائی انہیں بہت بڑی زحمتوں میں مبتلا کر دیگی۔ کھانے کے بعد منجن ملنا ضروری نہیں ہے جیسے ہی انگلی اور پانی سے دانتوں کی صفائی کر لینی کافی ہوگی جن لوگوں کو ابھی پائیوریا نہیں ہوا ہے یعنی جن کے دانتوں سے پیپ نہیں نکلتی خون نکلتا ہے ان کے لئے واحدی صاحب کا منجن اکسیرِ دندان صرف صبح بیدار ہو کر اور شام کو سوتے وقت ملنا ضروری ہے، باقاعدہ دونوں وقت وہ منجن ملیں گے تو پھر پانچ چھ دفعہ ملنے سے مجبور ہو جائینگے جنہیں اتفاقیہ کوئی شکایت ہو جاتی ہے مثلاً بادی سے مسوڑھے پھول گئے ہوں دانتوں میں درد ہونے لگا ہو تو وہ حسبِ ضرورت جتنی دفعہ چاہیں اس منجن کو استعمال کر سکتے ہیں اور جنہیں ابھی کوئی خفیف سی تکلیف بھی دانتوں کی نہیں ہے وہ ایک دفعہ صبح بس اس منجن کو مل لیا کریں۔ اللہ سے امید ہے کہ کبھی انہیں دانتوں کی کوئی تکلیف ہوگی ہی نہیں۔ ایک احتیاط واحدی صاحب کا منجن اکسیرِ دندان استعمال کرنیوالے لازمی طور سے کریں، خواہ وہ مریض ہوں یا تندرست، یعنی پان یا پھل کھا کر بھی ہمیشہ پانی یا انگلی سے دانتوں اور مسوڑھوں کو صاف کر لیں غلاظت کسی قسم کی زیادہ دیر تک لگی رہنی اچھی نہیں۔ پان کو ڈاکٹر مضر بتایا کرتے ہیں حقیقتاً تمباکو کے سوا پان کی کوئی جز بھی مضر نہیں ہے۔ ہاں پان ہر وقت چبانے سے لعابِ دہن ضائع ہوتا ہے یہ بڑی نقصان رساں بات ہے۔ دوسرے پان کھا کر لوگ دانت نہیں صاف کرتے اور ہر وقت پان کھانیوالے بھلا کیسے دانت صاف رکھ سکتے ہیں تو پان کی کثرت سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ مفصل ترکیب استعمال منجن کے ساتھ عرض کی جائیگی۔ واحدی صاحب کا منجن اکسیرِ دندان شیشی میں بھیجا جاتا ہے۔ قیمت فی شیشی صرف ۸ر علاوہ محصولڈاک۔ محصولڈاک ایک شیشی پر ۵ر لگتا ہے اور دو شیشیوں پر ۶ر

ملنے کا پتا:- احمد مجتبیٰ منیجر رسالہ "نظام المشائخ" ۱۴۳ کوچہ چیلان دہلی

کچھ کتابیں

آپ کے بچّوں کے لئے

نہ شب برات کی آتشبازی کام آتی ہے نہ بقرعید کے کھلونے اور مٹھائیاں یہ ضرور ہے کہ ان چیزوں سے بچوں کو خوشی بہت کافی محسوس ہوتی ہے آپ اُنہیں ایسی چیزیں کیوں نہ دیجئے جن سے وہ خوش بھی ہوں اور جوان ہوکے کام بھی آئیں، یہ کتابیں منگا کر دیکھئے یہ یقیناً ایسی ہی ثابت ہونگی۔

ترکوں کی کہانیاں قیمت ۴ر	تاریخ ہند کی کہانیاں قیمت ۴ر	ہیار یار قیمت ۱۲ر	لڑکیوں کی انشا قیمت ۱۲ر
دنیا کے بسنے والے قیمت ۱ر	ہمارے نبی قیمت ۱ر	نانی عشو قیمت ۱ر	مراۃ العروس قیمت ۱۲ر (؟)
ہمارے رسول قیمت ۶ر	سرکار کا دربار قیمت ۸ر	نبیوں کے قصے قیمت ۶ر	بنات النعش قیمت ۸ر
محصولڈاک	منتخب الحکایات قیمت ۲ر (؟)	اقبال دلہن قیمت ۸ر (؟)	بذمہ خریدار ہوگا

ملنے کا پتہ

منیجر رسالہ ”سعید“ دھلی

جلد ۲ — نمبر ۷

ایڈیٹر: سعید احمد بریلوی

باتصویر

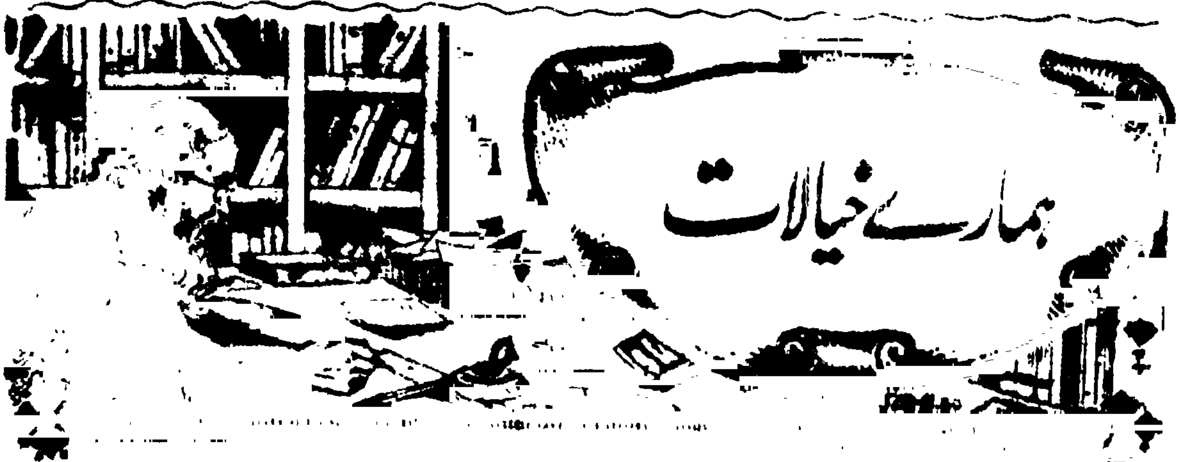
ماہوار رسالہ

سعید دہلی

جولائی سنہ ۱۹۳۲ء

قیمت
سالانہ تین روپے (سعہ)
ششماہی ......۲ عہ
فی پرچہ ۴ر

فہرست مضامین



انڈی پنڈینٹ مسلم پارٹی مشہور و معروف شیدائے حریت مولٰنا حسرت موہانی، اور مولانا آزاد سبحانی وغیرہ کی کوششوں سے مسلمانوں کی ایک نئی جماعت عالم وجود میں آئی ہے۔ اور پرانے سیاسی کارکنوں کی اس نوزائیدہ انجمن کا نام "انڈی پنڈینٹ مسلم پارٹی" رکھا گیا ہے۔ اس نئی جماعت کے قیام کا باعث یہ بتایا جاتا ہے کہ آل پارٹیز مسلم کانفرنس جو کچھ عرصہ سے قایم تھی اسمیں ہر طبقہ اور ہر خیال کے مسلمانوں کی بجائے صرف ایک ہی خیال اور ایک ہی عقیدے کے لوگ شامل تھے اور اس وقت تک اس نے کوئی کام ایسا نہ کیا تھا کہ جس سے مسلمان مطمئن ہو سکتے۔

انڈی پنڈینٹ پارٹی نے اپنے جس مسلک اور جس عقیدہ کا اظہار کیا ہے وہ وہی ہے کہ جس سے ہر محب وطن اور ہر محب قوم کو اتفاق ہے اور ہونا چاہئے لیکن یہ بات کسی طرح ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ جب پہلے ہی سے قوم میں نیشنلسٹ مسلم پارٹی اور جمعیۃ العلماء ہند جیسی ایک چھوڑ دو دو جماعتیں موجود ہیں جو خدمت قوم و وطن یا طلب آزادی میں کسی طرح بھی اس نئی انڈی پنڈینٹ پارٹی سے پیچھے نہیں ہیں تو پھر ان انجمنوں سے کام لینے کی بجائے خواہ مخواہ قوم کی قوت عمل کی مزید تقسیم سے کیا فائدہ ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک بالکل نئی جماعت کو قوم میں مشہور اور ہر دلعزیز بنانا ایک دن کا کام نہیں ہوتا، اور وقت اور قوت عمل کا ایک بہت بڑا حصہ صرف اسی کی نذر ہو جایا کرتا ہے کہ نئی انجمن کو قوم سے روشناس اور اس کی تجاویز کو عوام سے پاس کرایا جا سکے، اور کون نہیں جانتا کہ مسلمانوں کے پاس نہ اتنا وقت ہے اور نہ اس قدر قوت عمل کہ اسے اس طرح بیدردی سے لٹایا جا سکے۔

خدا نہ کرے کہ اس نئی انجمن کے قیام کا باعث "حب علی" کی بجائے "بغض معاویہ" ہو!! اور خدا نہ کرے کہ "عاشقان حریت" اپنی سطح بلند سے گر کر "محض طالبان شہرت" رہ جائیں!!

سوت نہ کپاس کوری سے لٹھم لٹھا مسلمانوں میں بدقسمتی سے ایک طبقہ ایسا موجود ضرور رہا کہ جسے "کھوٹا بیٹا" کہا جا سکے۔ اس "کھوٹے بیٹے" کی سرگرمیاں اکثر و بیشتر ایسی ہی ہوا کرتی تھیں کہ جو اسلام کے لئے باعث ننگ و عار ہوں، لیکن "کھوٹے پیسے" کی طرح اسے جیب سے علیحدہ نہیں کیا گیا تھا صرف اسی امید پر کہ کسی نہ کسی وقت وہ بھی کام آ ہی جائیگا۔ یہ حقیقتاً "اسلام کی چھٹی انگلی" تھی کہ جسے کاٹا جائے تو درد ہو اور رہا رکھا جائے تو ہاتھ کی خوبصورتی میں

فرق آئے۔ آہستہ آہستہ اس طبقہ کی تعداد برابر گھٹتی چلی جارہی تھی اور عام طور پر یہ تسلیم کیا جانے لگا تھا کہ مسلمانوں کے اس فرقہ کا زور کہ جس نے حق پرستی چھوڑ کر "حقوق پرستی" اختیار کرلی تھی، اور جو اپنے آپ کو خدا پرست کہنے کی بجائے "فرقہ پرست" کہنا زیادہ پسند کرتا تھا اب بہت کچھ کم ہوگیا ہے۔ محبان وطن اس صورت حال کا مسرت وشادمانی کے ساتھ مطالعہ کررہے تھے اور امیدیں ہو چلی تھیں کہ اگر بہت جلد نہیں تو جلد اس فرقہ وارانہ کشیدگی کا خاتمہ ہو جائیگا کہ جس نے ملک کو تباہ و برباد کر رکھا ہے اور جو ہر فرقہ کی ترقی کی راہ میں سب سے بڑا سنگ گراں وزن بنی ہوئی ہے۔ لیکن بدنصیبی سے ہمیں وہ مبارک وقت دیکھنے کو نہ ملا اور یکایک سکھوں کی "چھپی بگلی"، رنگ لائی اور ہمیں معلوم ہوگیا کہ کھوٹے پیسے اور کھوٹے بیٹے ہمارے ہی فرقہ تک محدود نہیں ہیں بلکہ بھارت ماتا کے فرزندوں میں شاید بیشتر تعداد ایسے ہی بیٹوں کی ہے جو اسے فارغ البال اور خوشحال دیکھنا پسند نہیں کرتے۔

کہا جاتا ہے کہ پنجاب میں اگر مسلمانوں کی اکثریت تسلیم کرلیگی تو اس کے یہ معنی ہونگے کہ وہاں "مسلم راج" قایم ہوگیا اگر یہ صحیح ہے تو اب سمجھ میں نہیں آتا کہ کسی ایسے صوبے میں کہ جہاں بدقسمتی سے ایک سے زیادہ فرقے آباد ہوں گذارے کی صورت کیا نکل سکتی ہے۔ بہرحال کسی نہ کسی فرقے کی اکثریت ضرور ہوگی اور ہر اقلیت یہ عذر پیش کردیا کرے گی کہ اکثریت کا راج گوارا نہیں ہوسکتا۔ پنجاب میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہے بالکل اسی طرح کہ جیسے صوبہ متحدہ میں یا مدراس اور بمبئی میں ہندوؤں کی تعداد بڑھی ہوئی ہے۔ ایک سب سے اچھی صورت تو تصفیہ کی یہ ہے کہ جس صوبے میں جس فرقے کی جتنی آبادی ہے اسی تناسب سے اسے کونسل میں نشستیں ملیں اور کسی کے ساتھ کسی قسم کی کوئی رعایت ملحوظ نہ رکھی جائے۔ دوسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ ہر اقلیت کو اسکے تناسب سے کچھ زیادہ نشستیں دیدیجائیں لیکن اس طرح کہ صوبہ میں جس فرقے کو حقیقتاً اکثریت حاصل ہے اسکی اکثریت بہرحال قایم رہے۔

لیکن اگر یہ دونوں صورتیں ناقابل قبول ہیں، اور اگر برادران خالصہ کی منطق قابل تسلیم ہے تو پھر صرف ایک ہی صورت رہ جاتی ہے اور وہ یہ کہ آخر تو ملک میں آرڈیننسوں کا دور دورہ ہے ہی ایک نیا آرڈیننس اس مفہوم کا بھی جاری کرادیا جائے کہ پنجاب میں کوئی مسلمان اس وقت تک شادی کرسکتا ہے اور نہ بچے پیدا کرسکتا ہے کہ جب تک صوبہ میں مسلمانوں کی آبادی گھٹ کر اور سکھوں کی آبادی بڑھکر برابری پر نہ آجائے

سب سے بڑھکر لطف یہ ہے کہ یہ تمام ہنگامہ آرائیاں، اور یہ ایک لاکھ رنگروٹوں کی بھرتی اس وقت ہورہی ہے کہ جب ابھی تک کسی کو بھی یہ معلوم نہیں کہ بارگاہ خسروی سے کیا کچھ ملنے والا ہے۔ یہ تمام الٹی میٹم اور یہ ساری اچھل کود صرف اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ شاید وزیر ہند کی زبان مبارک سے کوئی کلمہ خیر مسلمانوں کے حق میں نکل جائے، ورنہ درحقیقت ابھی تک اُن برگشتہ بختوں کو کچھ مل نہیں گیا ہے!!

"سوت نہ کپاس اور کوری سے لٹھم لٹھا" کی اس سے بہتر مثال اور کیا ہوسکتی ہے، اور کیا بلیوں کی ایک دوسرے کی طرف سے یہ بے اعتمادی دیکھکر اگر بندر سارا پنیر خود ہضم کرلے اور دونوں کو یکسر محروم رکھے تو اس پر کوئی الزام آسکتا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ سکھوں کے اس ساز کے پردے میں کوئی اور بول رہا ہو، اور ہمارے سیدھے سادھے سپاہی منش

خالصہ بھائی پنی جماعت کی خدمت کی بجائے کسی اور طاقت کی خدمت پر مامور کرلئے گئے ہیں؟

سینما کی "برکتیں"

دور حاضرہ کی "تہذیب و ترقی" نے دنیا کو اپنی "برکتوں" سے مالامال کر دیا ہے، اور شکر کا مقام ہے کہ ان "برکتوں" سے ہم جیسے نامہذب اور نیم وحشی لوگ بھی محروم نہیں رہے۔ چپے چپے پر ریل، گاؤں گاؤں ڈاکخانے اور تارگھر، گلی گلی بجلی کی روشنی اور قدم قدم پر قہوہ خانے اور شراب کی دوکانیں، یہ سب کچھ مہذب اور ترقی یافتہ دنیا ہی کی بدولت ہے ورنہ چھ چھ مہینے عزیزوں اور دوستوں کی خیریت کو ترسا کرتے تھے، اور دہلی سے کلکتہ پہونچنے میں اچھے خاصے دو دو مہینے لگ جاتے تھے کلکتہ یا بمبئی کا کوئی مریض اگر دہلی یا لکھنؤ کے کسی بڑے طبیب کو بلاتا تو اس کے پہونچتے پہونچتے مریض کا چالیسواں بھی ہوچکتا تھا، یا اب یہ حالت ہے کہ آج رات کو کلکتہ میں ڈاکہ ڈالا اور دوسرے دن میں ڈاکو نہایت اطمینان کے ساتھ پشاور کے بازاروں کی سیر کرتے پھر رہے ہیں۔ ریل کے ذریعہ سفر کرنے میں اگر کچھ اندیشہ نظر آیا تو چاہے جس اسٹیشن سے اتر کر موٹر میں بیٹھ گئے اور بعض حالتوں میں ریل سے بھی پہلے منزل مقصود پر جا پہونچے۔

چھ چھ مہینے خبر کو ترسنے کی بجائے اب یہ حالت ہے کہ ادہر بمبئی میں کسی چور اچکے کو کچھ پتا لگا اور ادہر اس نے دہلی کو تار کھڑکھڑا دیا کہ فلاں گاڑی سے اتنا روپیہ اتنے آدمیوں کی تحویل میں روانہ ہوا ہے اور ایک گھنٹے کے اندر اسکے ساتھیوں نے اس خزانے کو ختم کرنے کی تیاریاں شروع کردیں۔ ابھی چند ہی روز کا ذکر ہے کہ دہلی کے ایک متمول تاجر کلکتہ سے واپس آرہے تھے اثنا سفر میں دوسرے مسافروں سے باتیں چیتیں ہونے لگیں، اور انہوں نے اپنے بہت کچھ حالات ظاہر کردیئے۔ راستہ میں انہیں بنارس میں بھی ایک دو دن کے لئے ٹھیرنا تھا اسلئے وہ وہاں اتر گئے، انکے ساتھ کے مسافروں میں سے ایک صاحب اور بھی وہیں اترے اور اسٹیشن ہی سے ان تاجر صاحب کے گھر والوں کو دہلی میں تار دیا کہ فوراً تار کے ذریعہ سے ایک ہزار روپیہ بھیجدو، بنارس میں میں نے کچھ مال خرید لیا ہے۔ دو تین گھنٹے میں روپیہ ان حضرت کے پاس پہونچ گیا اور وہ باطمینان تمام کلکتہ کو لوٹ گئے۔

یہ تمام برکتیں تو خیر ہیں ہی، لیکن ان سب سے زیادہ "مفید" برکت سینما اور بائسکوپ کے وہ تماشے ہیں جو سرمایہ داران مغرب کی نوازشوں کی بدولت اب ہندوستان کے ہر بڑے شہر میں مستقل طور پر سال کے تین سو پینسٹھ دن برابر اپنا فیض جاری رکھتے ہیں بلکہ اتوار اور جمعہ کے مبارک دنوں میں تو دو مرتبہ کی بجائے تین مرتبہ تماشا دکھا کر فیض کو اور بھی عام کردیا جاتا ہے۔ خلق اللہ کو "فائدہ" پہونچانے کی غرض سے بنی نوع انسان کی یہ خدمت گزار کمپنیاں تعطیل کے دن بھی آرام نہیں کرتیں کہ جب کارخانے کے ذلیل سے ذلیل مزدور بھی چھ روز کے مسلسل کام کی تھکن اتار لیا کرتے ہیں آج ہندوستان کا کوئی بڑا شہر ایسا نہیں ہے کہ جس میں دو تین بلکہ پانچ چھ کمپنیاں روزانہ دو مرتبہ اپنے تماشے نہ دکھایا کرتی ہوں، اور حیرت و استعجاب کیساتھ دیکھا جاتا ہے کہ اسی مفلس اور نادار ہندوستان کے فرزند کہ جس کی نصف سے زیادہ آبادی کو دو وقت کی روٹی بھی میسر نہیں آتی، تقریباً ہر تماشے میں اس کثرت سے جاتے ہیں کہ بعض اوقات بیٹھنے کیلئے

کافی نشستیں بھی نہیں ملتیں۔

اگر کمپنیوں کی آمدنی بدرجہ ادنیٰ فی تماشا پانچ سو ہی روپے رکھ لیجائے تو دو تماشوں کے ایک ہزار روپے ہوئے اور یہ ہر کمپنی کی روزانہ آمدنی کا اوسط ہے۔ اب اگر شہر میں زیادہ نہیں صرف چار ہی کمپنیاں تماشا دیکھا رہی ہیں تو اسکے معنی یہ ہوئے کہ اس شہر کے باشندے اپنی گاڑھی کمائی کے چار ہزار روپے روز یا ایک لاکھ بیس ہزار روپے ماہانہ اپنی اس تھوڑی سی ہنگامی تفریح پر ضائع کیا کرتے ہیں۔ ہم بیس ہزار اور چھوڑے دیتے ہیں، اور یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا ہماری موجودہ مالی حالت اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ ہم اس ذراسی تفریح کو بمقدر گراں قیمت پر خریدیں؟ کیا یہ ایک لاکھ روپیہ لٹادینے والے ایمانداری کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ خطیر رقم جو چند سرمایہ پرستوں کے خزانے میں برابر ہینے کے ہینے داخل ہورہی ہے درحقیقت انکی ضرورتوں سے زیادہ تھی؟

ہم جانتے ہیں اور مانتے ہیں کہ اس ایک لاکھ ماہانہ کی رقم میں سے تقریباً نصف ایسے لوگوں کی جیبوں سے نکلتی ہے کہ جو واقعی فارغ البال اور خوش حال ہیں اور جنکے لئے اس تفریح پر اپنا روپیہ ضائع کرنا ایک حد تک جائز خیال کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس باقی پچاس ہزار روپے ماہانہ کے متعلق کیا کہا جائیگا جو فی الحقیقت غریبوں ہی کی جیبوں سے نکل کر آتا ہے اور جو اگر انہی کی جیبوں میں رہتا تو انکے بچوں کو بہتر غذا اور بہتر تعلیم، اور انکے بیماروں کو ضروری دوا مہیا ہو سکتی۔ کیا مذہبی، اخلاقی، عقلی، اور قومی نقطہ نظر سے کسی طرح بھی یہ جائز خیال کیا جا سکتا ہے کہ ایک شخص جس کی آمدنی صرف اتنی ہے کہ کافی تنگی ترشی سے اسے اور اسکے بیوی بچوں کو پیٹ بھر لینے کے لایق روٹی اور تن ڈھک لینے کے لایق کپڑا میسر آجائے اپنی اس قلیل آمدنی کا کچھ حصہ سینما کی نذر کر دیا کرے اور جب اسکی بیوی بیمار ہو تو اس کے پاس اسکی دوا دارو کے لئے ایک پیسہ بھی نہ نکلے؟

ہم تفریحوں کو برا نہیں سمجھتے، بلکہ قیام صحت کیلئے انہیں ایک بڑی حد تک ضروری خیال کرتے ہیں لیکن سوال یہ نہیں ہے کہ آیا تفریح کیجائے یا نہ کیجائے بلکہ سوال یہ ہے کہ کیا کسی صورت میں ایک ایسی تفریح بھی ایک مفلس و نادار قوم کے لئے جائز ہو سکتی ہے جسپر صرف ایک شہر کو ہر ہینے ایک لاکھ روپے کی گراں قدر رقم خرچ کرنی پڑے۔ کیا اگر ان ایک لاکھ میں سے وہی پچاس ہزار ہر ہینے بچائے جا سکتے کہ جو غریب طبقہ کی جیب سے نکلا کرتے ہیں اور امیروں کو انکے حال پر چھوڑ دیا جاتا تب بھی ہمارے پاس ہر سال چھ لاکھ روپے کی رقم ہر ہر شہر کے تہیول اور تماشوں پر خرچ کرنے کے لئے موجود نہ ہو سکتی تھی، اور کیا اتنی بڑی رقم سالانہ صرف کر کے ہم اپنے بچوں کے لئے تعلیم و تربیت کے اعلیٰ ترین ذرائع مہیا نہ کر سکتے تھے؟

[illegible] مسئلہ کا صرف اقتصادی پہلو تھا، اور ہمیں سچے [illegible] ہے کہ جہاں تک اقتصادیات کا تعلق ہے [illegible] ہرگز ہرگز کسی مبصر یا ماہر فن کی رائے نہیں ہو سکتی لیکن سینما کی خرابیاں صرف یہیں تک محدود نہیں ہیں کہ اس پر قوم کی آمدنی کا ایک معقول حصہ برباد ہوتا رہتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ سینما کا اثر قوموں کے اخلاق پر بھی کچھ بہت اچھا نہیں پڑا کرتا [illegible] ملک کے اخبارات اٹھا کر دیکھئے اور جس ملک کی پولیس کی رپورٹیں پڑھئے یہی نظر آتا ہے کہ گذشتہ سالوں کی بہ نسبت [illegible] جرایم کی تعداد میں نمایاں اضافہ ہوتا چلا

جا رہا ہے اور حکومتوں کے زلزلہ نے اپنی وسیع دامانی کے باوجود ناخواستہ مہمانوں کی کثرت کی بدولت تنگ نظر آنے لگے ہیں۔ امریکا اور یورپ دونوں کو بہ لحاظ ترقی و تہذیب سب سے بہتر براعظم خیال کیا جاتا ہے اور اگر تہذیب ترقی کا معیار دولت کو قرار دیا جائے تو یقیناً کوئی دوسرا براعظم ان کے مقابلہ میں نہ آسکیگا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ چوری، ڈاکہ، قتل اور عصمت دری و عصمت فروشی کے واقعات سے ان دونوں براعظموں کے اخباروں کے کالم بھرے رہتے ہیں اور آئے دن کسی نہ کسی پادری، یا کسی نہ کسی جج وغیرہ کی تقریر اس مضمون کی شائع ہوتی رہتی ہے کہ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملک میں بداخلاقی اور جرم روز افزوں ترقی پر ہے۔

دوسرے ملکوں سے قطع نظر کرکے اگر ہم خود اپنے ملک کے حالات کا مطالعہ کریں۔ تو یہاں بھی ہمیں یہی کیفیت نظر آتی ہے کہ جرائم اور بداخلاقی کی تعداد برابر بڑھ رہی ہے اور اب ہمارے اخبارات بھی "بفضلہ تعالیٰ" روزانہ دس پانچ چوریوں ڈاکوں اور قتل و فحش کے واقعات کی خبریں اچھے موٹے قلم کی سرخیوں کے ساتھ خوب نمایاں طور پر اپنے کالموں میں دینے کے قابل ہو گئے ہیں، اردو، ہندی، گجراتی، مرہٹی، بنگالی اور انگریزی وغیرہ کا آج ایک اخبار بھی ایسا نہیں ہے کہ جس میں روزانہ کالم کے کالم اور صفحے کے صفحے انہی "دلچسپ" خبروں سے نہ بھرے ہوں، اور بہت سے سلیم المذاق یا یہ کہئے کہ مزاج شناس ایڈیٹر صاحبان تو خصوصیت کے ساتھ فحش و زنا کے مقدموں کی پوری کارروائی سے جس میں طرفین کے وکیلوں کی "پرلطف" جرح بھی شامل ہوتی ہے اپنے اوراق کی تزئین کیا کرتے ہیں۔ مختلف صوبوں کی جرائم کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ زیادتی کسی طرح اس سے پہلے رک جائے گی کہ جب ملک کا بچہ بچہ جرائم پیشہ بن جائے۔

کہا جا سکتا ہے کہ اس زیادتی کیلئے سینما ذمہ دار نہیں ہے۔ ہم بھی اس دعوے کو اس حد تک تسلیم کر سکتے ہیں کہ تمام ذمہ داری صرف سینما کے سر نہیں ہے، لیکن سینما کو اس الزام سے بالکل بری ہرگز نہیں کیا جا سکتا۔ اگر یہ صحیح ہو کہ جس قسم کے مناظر انسان کی نگاہوں کے سامنے رہتے ہیں، اور دوسرے انسانوں کو جو کچھ وہ کرتے دیکھتا ہے یہ سب چیزیں بالکل غیر محسوس طریقے پر اپنا اثر کرتی رہتی ہیں اور آہستہ آہستہ وہ خود بھی وہی حرکتیں کرنے لگتا ہے کہ جنکے دیکھنے کا وہ عادی ہو چکا ہے اور اسی طرح اگر یہ بھی صحیح ہے کہ غیر معمولی دلیری اور جرات کے ساتھ اگر جرائم بھی کئے جائیں تو محض اس دلیری کے اظہار کی وجہ سے عوام کی طبیعتوں کو اس جرم کے ارتکاب کرنے والے کے ساتھ ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے تو پھر یہ کہنا یقیناً صحیح ہے کہ بائسکوپ و سینما کا اثر ہمارے عوام کے دلوں پر اکثر اور بیشتر حالتوں میں برا اثر پیدا کیا کرتا ہے۔

ہمیں اس حقیقت کے تسلیم کر لینے سے انکار نہیں ہے کہ انہی سینماؤں کے ذریعہ سے ہم بہتر سے بہتر تعلیم بھی عوام کو دے سکتے ہیں اور اسکے یہ معنی ہیں کہ درحقیقت یہ ایجاد فی نفسہا کوئی بری چیز نہیں ہے۔ وہ عقل اور علم کی طرح ایک آلہ ہے جسے اچھے سے اچھے کام کے لئے بھی اسی طرح استعمال کیا جا سکتا ہے کہ جس طرح برے کام کیلئے استعمال کیا جا رہا ہے۔ ہمیں اعتراض سینما پر نہیں ہے بلکہ ان لغو او

مخرب اخلاق فلموں پر ہے کہ جو عام طور سے صرف ہندوستان میں نہیں، بلکہ تمام دنیا میں دکھائی جارہی ہیں سینما کا ٹکٹ لیکر اندر داخل ہونے کے بعد ہم کیا دیکھتے ہیں۔ یہی کہ ایک اعلیٰ درجہ کا شاطر چور، ایک نڈر اور بے باک ڈاکو، اور ایک ظالم اور بیدرد قاتل۔ اس خوبی سے مکانون کے تالے توڑنے، محلوں کی دیواریں پھاندنے، لوہے کی الماریاں توڑنے، سنگین دیواروں میں نقب لگانے، اکیلے اور نہتے ہونے کے باوجود دو دو چار مسلح آدمیوں سے مقابلہ کرنے اور صاف بچ نکلنے کے کمالات دکھا رہا ہے، پولیس اسکے پیچھے پیچھے تمام دنیا میں دھکے کھاتی پھرتی ہے اور وہ ہر مرتبہ انکے پھندے سے اسی طرح نکل جاتا ہے کہ جیسے صابون میں سے تار، کسی اونچی سے اونچی چھت سے کود پڑنے میں اسے تامل نہیں ہوتا، کسی بڑے سے بڑے دریا میں گھستے اسے خوف نہیں آتا، کسی جنگل کے درندے اسے خوفزدہ نہیں کرتے، سانپ اور اژدھے، ناکے اور گھڑیال سب اسکے سامنے معمولی کیڑے مکوڑے بنجاتے ہیں، اور وہ ہر مشکل پر اپنی جرأت اور غیر معمولی طاقت وہمت کی بدولت غالب آتا چلا جاتا ہے۔ ٹیلیفون اور تار، موٹریں اور ریلیں اور پستول اور بندوق غرضکہ دور حاضرہ کی تمام جدید ترین ایجادیں اس کی بدمعاشانہ اور سفاکانہ سرگرمیوں میں اسے مدد دیتی ہیں اور جب کبھی وہ ان ایجادوں سے کسی حیرت انگیز طریقہ پر کام لیکر پولیس کو دھوکا دیتا ہوا نظر آتا ہے تو تماشا دیکھنے والے عوام کے دل جو پہلے ہی سے اسکے محیر العقول کارنامے دیکھ دیکھ کر مبہوت، اور متحیر ہوچکے اب پورے طور پر اسکی عظمت بلکہ محبت سے بھر جاتے ہیں۔ رجل پرستی (ہیرو ورشپ) کے جذبات میں تلاطم پیدا ہوتا ہے اور ہر شخص کا دل چاہنے لگتا ہے کہ اس مافوق الانسان کے قدموں پر اپنا سر رکھدے اور ہوسکے تو خود بھی ویسا ہی بنجانے کی کوشش کرے۔

سال چھ مہینے برابر اسی قسم کا اثر قبول کرنے کے بعد اس ابتدا کی انتہا یہ ہوتی ہے کہ وہی رجل پرست دل لوگوں کو مجبور کرتا ہے کہ وہ بھی اسی طرح کے "بڑے بڑے" اور حیرت انگیز کارنامے دنیا کے سامنے پیش کریں، اور جب اس قسم کے گم کردہ راہ نوجوان ارتکاب جرم میں عملی حصہ لیتے ہیں تو انہیں معلوم ہوتا ہے کہ سینما کے پردے والے ڈاکو کی طرح ہر مرتبہ پولیس کے پنجہ سے بچ جانا آسان کام نہیں ہے۔ وہ گرفتار ہوتے ہیں، ان پر مقدمے قایم ہوتے ہیں، اور انہیں سزائیں ملتی ہیں اور اس طرح ملک کے روزانہ اخبارات کو اپنے کالم سیاہ کرنے کے لئے برابر تازہ مواد فراہم ہوتا رہتا ہے۔

ارتکاب جرم کے پہلو بہ پہلو جو دوسری چیز سینما میں ہماری نگاہ سے گزرا کرتی ہے وہ عشق ومحبت کی داستان ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ بدقسمتی سے اس قسم کے مناظر کو بھی نوجوانوں کے سامنے پیش کرتے وقت کوئی خاص احتیاط نہیں برتی جاتی، اور یہ فرض کرلیا جاتا ہے کہ عوام کا جو مجمع مصروف تماشا ہے وہ فرشتوں کا مجمع ہے کہ جنکے دل تمام انسانی جذبات سے خالی ہیں، ایک مرد کا ایک عورت کو اور ایک عورت کا ایک مرد کو اپنی زندگیوں کی شرکت کیلئے منتخب کرلینا نہ معیوب ہے اور نہ خلاف اخلاق اور اگر سینما کی تصویریں سرگذشت عشق کو صرف اسی حد تک ہمارے سامنے پیش کیا کریں تو اسکا کوئی برا اثر ہم پر نہیں پڑسکتا لیکن اگر اسی جوڑے کی تخلیئے کی ملاقاتوں کے نظارے ہماری نگاہوں کے سامنے آئیں تو ایسے نوجوان ابھی ملک میں بہت ہی کم ہیں

جوان سے اثر پذیر نہو اور جو غنڈے دل سے کسی قسم کا ہیجان جذبات میں پیدا ہوئے بغیر ان تماشوں کو دیکھ سکے [illegible] نوجوانوں کے صنفی جذبات کو اس طرح [illegible] آگ کے ساتھ کھیلنے کا مترادف ہے [illegible] کے مناظر کا مشاہدہ کر چکنے کے بعد ان [illegible] کہ جو ہمارے قانون اخلاق کے خلاف [illegible] طور پر سینما کے سر عائد ہوگی۔

ان دونوں چیزوں کے علاوہ ہم ایک تیسری چیز بھی سینما کے پردوں پر دیکھا کرتے ہیں اور وہ ان حسین و جمیل دوشیزہ لڑکیوں کا ناچ ہے جو فن رقص میں اپنے اپنے ملکوں میں کافی نام پیدا کر چکی ہیں، اور جو رقص کرتے وقت اگر اپنے جسم کا کوئی حصہ ڈھکتی ہیں تو صرف اسلئے کہ انکی عریانیاں اور بھی زیادہ نمایاں ہوجائیں۔ فن رقص کی [illegible] کاملات انسانی نفسیات سے بھی اچھی طرح واقف ہوتی ہیں، اور وہ خوب جانتی ہیں کہ کسی انسان کیلئے کامل عریانی ہرگز ہرگز اسقدر دلکش اور جاذب نظر نہیں ہوا کرتی جتنی کہ نیم برہنگی۔ انہیں معلوم ہے کہ نقاب اور پردہ کی آڑ سے حسن کی ایک جھلک حسن بے پردہ کی بہ نسبت بہت زیادہ خطرناک ہوا کرتی ہے، [illegible] کے نام سے اپنے جسم پر کہیں کہیں کچھ برائے نام لباس [illegible] کو دو آتشہ کرنے کی کوشش کیا کرتی ہیں۔ اور دنیا کی کوئی پرہیزگار سے پرہیزگار قوم بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتی کہ اسکے نوجوانوں کو اس شراب کا نشہ ہوا ہی نہیں کرتا۔ امریکا و انگلستان کے [illegible] بھی ان حیا سوز مناظر کو دیکھتے دیکھتے چیخ اٹھے ہیں۔ [illegible] حال ہی میں مسٹر ہیرس کا ایک مضمون لندن کے اخبار [illegible] ریویو میں نکلا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں کہ "موجودہ [illegible] فلمیں [illegible] کے حسن، نزاکت، اور لوچ کو تباہ کئے ڈالتی ہیں [illegible] احساس سامعہ کیلئے بہت ہی تکلیف دہ ہوتی ہیں۔ انسانی دماغ کو یہ فلمیں بالکل تاریک، وحشی، ادنی اور ذلیل بنارہی ہیں"

اخلاقی پہلو، نیز فنی پہلو سے بھی انگریزی اخبارات میں سینما پر [illegible] الزامات عائد کئے جارہے ہیں اور سینما کے حامیوں کی طرف سے جو جوابات شائع ہو رہے ہیں انکا ماحصل یہ ہے کہ فلموں کا انتخاب کرنا ہمارا اپنا کام ہے، اور اگر خراب فلمیں ملک میں عام ہوگئی ہیں، تو اس میں سینما کے فن کا کیا قصور ہے۔

ہم نے اس شذرہ کے شروع ہی میں یہ کہدیا ہے کہ سینما کا فن فی نفسہ کوئی بری چیز نہیں ہے اور ہمیں جو کچھ اعتراض ہے وہ ان فلموں پر ہے کہ جو آجکل عام طور پر ہندوستان کے طول و عرض میں دکھائی جارہی ہیں اور جنکا اثر ہماری قوم کے نوجوانوں پر بہت برا پڑا ہے اور پڑ رہا ہے کہ ان میں سے اکثر بدراہ ہوگئے ہیں اور ہوتے جارہے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ فلموں پر سنسر قایم ہے اور اس محکمہ سے پاس ہوئے بغیر کوئی فلم پردے پر نہیں دکھائی جاسکتی، لیکن ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس محکمہ احتساب کے افسر نفسیات انسانی سے اس قدر بے خبر کیوں ہیں اور کیوں روز مرہ کے اخبارات پڑھنے کے بعد انکا خیال اس طرف نہیں جاتا کہ قتل وغارت اور فحش واغوا کے جرایم کی اسقدر روز افزوں کثرت کا ایک بہت بڑا سبب سینما کی وہی فلمیں ہیں کہ جو ان کے محکمہ سے پاس ہو چکی ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ملک اور قوم کے ہمدرد اس خرابی کی طرف جلد سے جلد توجہ کریں گے، اور کوئی صورت ایسی نکالیں گے کہ فلموں کا انتخاب اس سے بہتر طریقہ پر ہو سکے۔

تعارف جاہلانہ

انہ کان ظلوماً جہولا

ہر خاص و عام کو بذریعہ نوٹس ہذا کہ جسے عام زبان میں اشتہار واجب الاظہار یا اعلان واجب الاذعان بھی کہتے ہیں مطلع کیا جاتا ہے کہ جو جانتا ہو وہ جانے اور جو نہ جانتا ہو وہ پہچانے کہ منم حاجی ابن حاجی ابن کئی پشت تک حاجی بلغ العلیٰ المعروف بہ حاجی بغلول ساکن کوچہ غلیدازان کہ جہاں اللہ بخشے منشی کامریٹ رہتے تھے۔ کیا نام کہ اب جبکہ انسداد عصمت فروشی کا بل کہ جسے مسودہ قانون بھی کہتے ہیں۔ یو پی کونسل یا شاید وی پی کونسل سے کہ جسے صوبہ متحدہ کی آسام بلی کہہ سکتے ہیں اسکی پچھلی نشست گاہ میں بر سر جلوس یا بر سر اجلاس مردود و مسترد ہو چکا ہے اور اس امر کا کوئی اندیشہ باقی نہیں ہے کہ آئندہ مستقبل قریب میں اس قسم کا کوئی مجموعہ قوانین فوجداری یا دیوانی بن سکیگا کہ جس کے ذریعہ سے ہندوستان کی ان ہزار ہا بیٹیوں کو کہ جنہیں۔

سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے شوہر کے سوا

اور جو بہزار دقت و خرابی حلال کی بھی نہیں حرام کی روٹیوں سے اپنا پیٹ پالتی ہیں، انکے آبائی نہیں، بلکہ آبائی پیشے سے محروم کیا جا سکیگا، تو اب اس اطمینان کے بعد ہم یعنی کیا نام کہ حاجی بلغ العلیٰ صاحب ایک ریزہ لوشن یا بل اس مضمون کا مشتمل بر مضمون ہذا کونسل مذکورۃ الصدر یعنی آسام بلی نامبردہ میں بھائی کیا نام کہ شیخ محمد خدا دوست اور بھائی خان بہادر مولوی فضل اللہ خاں، اور بھائی کنہیا جی پال سنگھا اور بھائی خان بہادر محمد ابدال بہاری اور بھائی رائے بہادر لکھنو بہاری سرخ، اور بھائی چودھری گس دیوا اور بھائی چودھری کھینچا، اور بھائی خان بہادر حافظ رشید حسین و دیگر ممبران ہیچ قسم کہ مجموعی تعداد جنکی سی و پنج تن تک پہونچتی تھی اور جنکی متفقہ اور متحدہ کوششوں سے خدا خدا کرکے کہیں دو سال کی مدت مدید میں عصمت فروشی کی لاج رہ گئی اور قانون نامنظور ہوا غرضکہ ان تمام ممبران کی طرف سے کہ جن میں سے ہر ایک جداگانہ انتخاب کے طریقے سے کرسی نشینی تک پہونچا ہے ایک ریزہ لوشن پیش کرنیوالے ہیں جو چند در چند دفعات پر مشتمل ہوگا جن کی تفصیل حسب ذیل ہے وہوا ہذا۔ بینو و توجروا۔

نقل مطابق اصل دفعات ہائے مسودہ قانون یعنی ریزہ لوشن جسے حاجی صاحب بر اجلاس آئندہ یو پی یا وی پی کونسل میں پیش کرکے پاس فیل کرانا چاہتے ہیں۔

دفعہ ۱۔ اس قانون کا نام قانون تحفظ آثار حسینہ ہوگا کیونکہ کیا نام کہ اسکے ذریعہ سے ملک کے حسن کا تحفظ کیا جا سکیگا تاکہ بازوں میں اسکی گرانی نہو جائے اور عام خلق اللہ کو تکلیف نہ ہو۔

دفعہ ۲۔ ہر گاہ کہ یہ امر یقین ہو کہ افلاس ناداری کے باعث عوام کی توجہ اس جنس لطیف کی جانب سے ہٹتی جاتی ہے اور بازار میں مانگ کم ہو جانیکی وجہ سے جنس کی پیداوار میں کمی آچلی ہے فلہذا ایک برو باعند اکمیٹی مقرر کیجائے جسمیں فی الحال سات ممبران سے زیادہ نہ ہوں اور جنہیں اختیار ہو کہ حسب ضرورت و بہ مقتضائے مصلحت اپنی تعداد کو پندرہ تک بڑھا سکیں۔ اس کمیٹی کے سپرد یہ کام ہوگا کہ وہ ہر قسم کے چھوٹے اور موٹے بڑے اور ننھے اشتہارات از قسم ہینڈ بیگ بو سطر کہ جس میں صرف دو تین سطریں لگتی ہیں یا بم فلاٹ و تریکیت ہائے، و ماچس کی لالٹین، و جملہ دیگر ذرائع مثل آں سے کام لیکر عوام پر اس فن شریف کی کہ جسے کسب حلال یا شاید صرف کسب کہا جاتا ہے خوبیاں ہویدا اور روز روشن کی طرح آشکار کیجائیں اور لیڈران و بلیڈران و ممبران کونسل و بڑے بڑے دیگر حکام بالا دست کو ان ولدالولد بچوں کی سرپرستی پر آمادہ کیا جائے کہ جو فن رقص و دیگر فنون مشترک فیہ کے احیاء کی خاطر اپنی زندگیاں وقف کر چکی ہیں تاکہ انکی ہمت افزائی ہو اور شام کیوقت کی بازاروں کی رونق کم نہونے پاسے۔

دفعہ ۳۔ ہر گاہ کہ یو پی یا وی پی کونسل میں اس طبقہ لطیف کا نمایندہ کوئی نہیں ہے اور اگر خدا بر وقت مدد نہ کرتا اور یہی وہ پنج مردان ست شکن و پیل تن اپنے ہاتھ نہ بڑھاتے تو بھائی ایڈشا کا قانون انسداد عصمت فروشی ضرور پاس فیل ہو جاتا فلہذا اوس مسودۂ قانون کے ذریعہ سے وی پی کونسل میں و نیز دیگر جملہ کاؤنسلہائے ہیچ قسم میں کم از کم تین فیصدی نشستیں اس کمزور طبقہ کو دیجائیں کہ جو بڑی زبردست اقلیت میں ہے اور نشستہائے مذکورۃ الصدر کے لیے جو انتخابات عمل میں آئیں انکے لئے حلقہ انتخاب بھی پینتیس ممبران کونسل تک محدود رہے کہ جنہوں نے عصمت فروشی کے احیاء میں نمایاں حصہ لیکر اپنا مستقل حق قایم کر لیا ہے، اور جنکے متعلق یہ خیال کرنے کے وجوہ ہو سکتے ہیں کہ وہ بصیرت تامہ رکھتے ہیں اور ہمیشہ بہتر سے بہتر نمایندوں کو منتخب کرکے کونسل میں بھیجا کرینگے تاکہ آیندہ سے آسام بلی اور کونسل کی خشک اور غیر دلچسپ بحثوں سے اکتا کر فاضل ممبران اپنا وقت سو سو کر گذار دینے یا جماہیاں لے لیکر نیند کا خمار اتارنے پر مجبور نہوں بلکہ خود کونسل کی کرسیوں پر انکی دلچسپی کے زندہ سامانوں کی موجودگی انکے دلوں میں گرمی اور جسموں میں جوش عمل پیدا کرتی رہے۔

پس کیا نام کہ ابھی اور بہت سی دفعات ہائے ریزہ لوشن باقی ہیں۔ لیکن ہمیں اس وقت ایک ضروری کام یاد آ گیا۔ فلہذا پھر کبھی لکھا جائیگا۔



دولت اور بندگانِ دولت

از جناب سید مغنی الدین صاحب شمسی دہلوی

دولت ایک ایسی چیز ہے جو جاذب التفات اور ایک قوت منفرد ہے جس کے اثرات کا مشاہدہ رات دن ہماری آنکھیں کرتی ہیں۔ ہر لحظہ اور ہر دم۔ دولت! دولت!! دولت!!! کی پکار ہمارے کانوں میں گونج رہی ہے

ہر زمانہ ساز کی جد و جہد اسی مرکز کی طرف مبذول ہے یہاں تک کہ اسکی زندگی کا نصب العین صرف دولت ہی کا جمع کرنا ہے۔ وہ اپنے ہمکیشوں سے کسی طرح دولت کے معاملہ میں پست رہنا گوارا نہیں کرسکتا۔ بلکہ انکو قعر ناداری میں دیکھ کر اپنے حلوے مانڈے سے کام رکھنا اپنا پیدائشی حق تصور کرتا ہے۔ کیا مجال جو دل میں کبھی یہ خیال بھی گذرے کہ آیا انسانی زندگی کا کوئی دوسرا بھی مقصد ہو سکتا ہے یا نہیں۔ تجارت کی یہ معراج ہے۔

آیئے ذرا تجارتی شہروں کی بہبود اور ترقی کی دیوی کے کارہائے نمایاں بھی دیکھیں۔ بمبئی۔ کلکتہ بڑے بڑے متمول شہروں کی فہرست میں مندرج ہیں۔ چنانچہ جو وہاں لوگوں کی بھیڑ بھاڑ۔ ٹراموں کی آؤ جاؤ۔ اور موٹروں کی قطار کو سطحی نظر سے دیکھتا ہے۔ اسکی نظر میں وہ نہایت عظیم الشان اور دلکش شہر معلوم ہوتے ہیں۔ شام کو چوپاٹی پر سیر کرنے سے روح کو عجیب فرحت حاصل ہوتی ہے۔ سمندر کے کنارے جہازوں پر مال لدتے اترتے اور امرا کی عالیشان محلسراؤں کا منظر دیکھ کر لامحالہ یہ خیال ہوتا ہے کہ تمام دنیا کی دولت شاید یہیں ٹوٹ پڑی ہے۔ فورٹ کی بجلی اور دلکش دوکانیں شام کے وقت آنکھوں میں کھبی جاتی ہیں ایک مرتبہ پھر الف لیلہ کی یاد دلوں میں تازہ ہوجاتی ہے۔ لیکن خیریت اسی میں ہے کہ وہ یہ دیکھتے ہی بمبئی سے روانہ ہوجائے اور آنکھوں پر پٹی باندھ لے۔ بس اب اس نے کیمیائے زندگی کو پالیا۔ اسے معلوم ہوگیا کہ دنیا میں زندگی کس طرح بسر کرنی چاہئے۔ بمبئی کی تجارت کا اسوۂ حسنہ اسکا مطمح نظر ہے۔

دولت! دولت ہی کی یہ ساری گل کاریاں ہیں۔ اسی دیوی کی پوجا پاٹ کرنا ہماری زندگی۔ ہمارا ایمان اور ہمارا مذہب ہے۔ اندھا دھند جیسے بن پڑے اس شکار کی گھات میں بیٹھ جانا چاہئے۔ دنیا کی اور تمام اشیا اس کے آگے ہیچ ہیں ہمیں اپنی نشانہ بازی سے کام ہے۔ جس طرح انسان کے ظاہری لباس سے صرف اسکے عادات واطوار کا پتہ چل جاتا ہے اور اسکے باطن کا کچھ حال نہیں معلوم ہوتا۔ اسی طرح بمبئی یا کسی اور بڑے شہر کی تصویر کا بھی ایک دوسرا رخ ہے۔ چلئے ذرا۔ مزدوروں اور غریبوں کے محلوں کا مشاہدہ کیجئے۔ دیکھئے وہ کس طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہ عوام کی نظروں سے پوشیدہ ہیں۔ کوئی انکا پرسان حال نہیں۔ یہ بھی خبر نہیں کہ وہ کہاں بستے ہیں۔ اور کس کھیت کے بتھوے ہیں۔ مردم آزار دولتمند جماعت نے انکو کچل ڈالا ہے۔ دولت ہی نے انکا ایک ایک قطرۂ خون چوس لیا ہے۔ لیکن افسوس کہ اس کی پیاس اور آتش انتقام اب بھی نہ بجھی۔ اب وہ گمنامی کے گڑھے میں پڑے ہیں۔ کیا انصاف پسند۔ خدا ترس طبیعت اور عقل سلیم۔ اسکو دولت کے صحیح استعمال کے نام سے موسوم کریگی؟ کیا یہ جور وظلم یہ غضب۔ یہ ستم۔ دولت کے مذہب میں روا ہے؟ حقیقی تقسیم کو جانے دیجیے۔ یہاں تو مصنوعی تقسیم کے بھی لالے پڑے ہیں اسی بہیمیت پر اہل شہر اور رؤسا مغرور ہیں۔ یہی باعث فخر ہے۔ لہذا ہمیں تو بمبئی یا کسی اور بڑے شہر میں متمول دیکھ کر کچھ بھی تعجب نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ ناہموار تقسیم دولت، ہمارے تو ہوش اڑائے دیتی ہے جو افراط وتفریط کا کامل مظاہرہ ہے۔ فی الحقیقت دیکھا جائے تو لوگ قومی دولت میں اضافہ کرنے کے زرین اصول کو آلہ کار بنا کر اپنے پیٹ کے دوزخ کو غریبوں کی آہوں کی آتش سے ناکوں ناک بھر رہے ہیں۔ بلکہ آج کل تو تجارت نام ہی اسی شئے کا رہ گیا ہے کہ بنیوں کی جماعت میں اپنا حصہ بند کا سا رکھیں چت بھی ہماری پٹ بھی ہماری۔ یعنی دوسروں کے گلے کاٹ کر کسی نہ کسی طرح ہم دولتمند بن جائیں۔ پھر دیکھا جائیگا چنانچہ اسی اصول پر تجارت کا دار ومدار ہے۔

میرے خیال میں شاید یہی آج کل کے نوجوانوں کی قصوی الغایتہ ہے۔ ہمیں تو اس نصب العین کی راہ میں تسلی بخش آثار نظر نہیں آتے۔ اور نہ اس طرح لوگوں کی خوشحالی وآرام میں اضافہ ہونے کا کوئی امکان معلوم ہوتا ہے۔

اب ذرا عہد عتیق کی دلچسپیوں کا حال بھی معلوم کریں اور دیکھیں کہ انکا نصب العین زندگی کیا تھا۔ ناظرین اسے اکثر فیصلہ خود کر سکتے ہیں۔ لیکن پھر بھی مجملاً تحریر کرتا ہوں۔ پہلے لوگ اشیائے عالم کی حقیقت معلوم کرتے تھے۔ فلسفہ کے مسائل پر بحث ومباحثہ ہوتا تھا جدید عہد کا نوجوان یہ سنکر پکار اٹھے گا کہ اوہو!! مَا هٰذَا اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ وہ لوگ بھی کیسے بیوقوف تھے۔ فضول باتوں میں وقت گنواتے تھے۔ اس قسم کا پیشہ تو آجکل نادر الوجود ہے لیکن نہیں!! ہم دیکھتے ہیں کہ انکی تصنیفات اور کارنامے ہر حیثیت سے اب بھی بڑھے چڑھے ہوئے ہیں۔ گویا انکو چشمہ آب حیات میں غسل دیدیا گیا ہے۔ ان کی قدر ومنزلت تا عمر آدم قایم رہیگی۔

ان کے کارنامے۔ ان کے تخیل۔ انکی مشقت ودماغ ریزی کے ثمرات بذات خود بنی نوع انسان کے لئے ایک مستقل کان سیم وزر ہیں وہ تاثرات اب صدیاں گذرنے پر بھی

وہی منناطیسی قوت رکھتے ہیں۔ انکے خیالات حد درجہ جذبہ انگیز ہیں اور ہمارا تو ایمان یہ ہے کہ آیندہ نسلیں ان پاکیزہ خیالات کو کبھی بھی اپنے دل و دماغ سے نہیں دھو سکیں گی یہ ہیں وہ دیرپا اور قیمتی خزانے۔ لوگ شاید آجکل کی دولت کے مقابلہ میں انکو خزانوں کے نام سے یاد کرنے پر ہنسیں گے کیوں! کیا آپ کے خیال میں وہ خزانے نہیں۔ اگر ہم بنظر عمیق انکا مطالعہ کریں۔ تو صاف معلوم ہو جائے کہ انہوں نے وقت اور عمر ضائع نہیں کی۔ بلکہ ایسے ایسے کارنامے چھوڑ گئے جواب بھی ہماری زندگی کے بہترین قائد و راہبر بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ انکا لائحہ عمل زندگی سے پورے طور پر لطف اندوز ہونا۔ اپنی اور دوسرے کی بہبود کی خاطر ہر وقت مستعد و مشغول رہنا۔ دنیا کی سیر و سیاحت کرنا اور لوگوں کے سامنے زندگی کا بہترین پہلو پیش کرنا تھا۔ وہ کھلی فضا کا اور مناظر قدرت کا لطف اٹھاتے تھے۔ انکے دلوں میں امنگوں کے دریا موجزن تھے۔ ان کے رگ و ریشے میں زندگی کی برق دوڑی ہوئی تھی۔ نئی نئی معلومات اور ایجادیں۔ ان کے دلوں کو بڑھاتی تھیں۔ زندگی انکے نزدیک لطف اندوز ہونے کی چیز تھی۔ انکی پوری سعی و کوشش اسی بات پر مرکوز تھی کہ جہاں تک ہو سکے ہنسی خوشی زندگی کے دن کٹ جائیں۔ یہی انکا نصب العین تھا۔ اس کا بین ثبوت یہ ہے۔ کہ ان کے خیالات میں بلند پردازی ہے۔ شعرا کا کلام اسکی روشن دلیل ہے۔ ساتھ ہی بہادری۔ حمیت اور آزادی۔ انکے رگ و خون میں دوڑ رہی تھی کیا سعدی۔ غالب۔ حالی۔ شبلی۔ اقبال۔ ٹگور۔ ہندوستان کے لئے دولت نہیں ہیں۔ اگر آپ کے نزدیک دولت کا معیار صرف سامان عیش و نشاط۔ یا چاندی سونے کے ٹکڑے ہی ہیں۔ تو معاف کیجئے۔ آپ لفظ دولت کو صحیح معنوں میں استعمال ہی نہیں کر رہے ہیں۔

دولت کیا ہے؟ اس سوال کے جواب پر کچھ روشنی ڈالتا ہوں۔ باقی آپ کے ہی غور و خوض پر چھوڑتا ہوں۔

سب سے پہلے دولت کے لفظ کے اس تصور سے قطع نظر کرنی چاہیے۔ جو اس کے سنتے ہی روپے پیسے یا امارت کے لوازمات کے متعلق ہمارے ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔ اکثر الفاظ ایسے ہیں جو مترادف معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ لیکن بقول صاحب "دبیر عجم" وہ در اصل مترادف نہیں ہوتے۔ بلکہ ہر لفظ بقید تمام اپنے اپنے موقعہ و محل کے مناسب استعمال ہونا چاہیئے۔ چنانچہ مختلف علوم میں وہی الفاظ بحیثیت ایک اصطلاح کے استعمال ہوتے ہیں اور خاص معنی رکھتے ہیں۔ مثلاً لفظ طاقت کے عام استعمال اور بحیثیت علم طبعی کی اصطلاح کے معنی میں بہت بڑا فرق ہے لفظ امارت کے معنی بیگانہ دولت کی ناہموار تقسیم ہے۔ یہ ایک محض اضافی اصطلاح ہے۔ امیر کا وجود اسی وقت ممکن ہے۔ جبکہ دوسرے غریب ہوں۔ حقیقت میں امارت کچھ نہیں ہے۔ چونکہ غریب روپیہ کا محتاج ہوتا ہے۔ اس وجہ سے امیروں کو ان پر غلبہ یا طاقت حاصل ہے۔ مفلس و نادار کے لئے ایک مٹھی بھر روپیہ بڑی چیز ہے۔ امیروں کو یہ بہانہ رسم یوسفی رائج کرنے کو کافی ہے۔ اپنے روپے کے بدلے بہت سے غلام مزدوروں کی ہڈیوں کو کام میں لا سکتے ہیں۔ لیکن مشکل تو یہ ہے کہ ابناء الوقت پوست بھی باقی نہیں چھوڑتے۔ انسان دو ہی طریقوں سے امیر بن سکتا ہے

یعنی یہ کہ وہ اپنی دولت میں اضافہ کرے اور دوسروں کی دولت کو گھٹانے کی کوشش کرے۔ یہی فرق و تفریق ملکیت و امارت کی روح رواں ہے۔ دولت کا تعلق تمام بنی نوع انسان سے ہے، لیکن امارت محض ایک انفرادی چیز ہے۔ جو ہیر پھیر یا جوئے کے ذریعہ بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ کیا یہ دولت کہلائے جانے کے قابل ہے؟ امارت کا نام و نشان صرف حد درجہ کی غربت کی موجودگی میں ہی پایا جاتا ہے۔ لیکن دولت کیا ہے؟ دولت ان تمام اشیا کا نام ہے۔ جو ہر دلعزیز ہوں۔ اور انسانی زندگی کو مکمل بنانے میں مدد دیں۔ اب آپ خود غور کریں کہ وہ ایسی کونسی چیزیں ہیں۔ جو حقیقی خوشحالی کو بڑھا سکیں انہی کا نام دولت ہے۔ انسانوں کی اکثر تعداد صرف نقد مبلغ کو یا کسی اور ایسی چیز کو جسکی بدلہ میں نقد روپیہ حاصل ہو سکے خوشحالی کی جڑ بنیاد سمجھتی ہے۔ اسی لئے اسکا نام بھی نہایت شاندار رکھا ہے۔ یعنی دولت۔ اس میں شک نہیں کہ یہ بھی دولت کی ایک شاخ ہے۔ لیکن بدرجہ ثانی۔ اس قسم کی دولت زندگی کو وسعت دینے اور دولت کی دیگر اقسام کی بہبود و ارتقا میں صرف کی جا سکتی ہے۔ لہذا یہ بھی انسانی زندگی کا ایک اہم و ضروری جزو ہے۔ لیکن اسکے مرکزی جزو ہونے میں مجھے شبہ ہے۔ وقت۔ صحت۔ عام انسانوں سے ہمدردی و دلچسپی وغیرہ وہ چیزیں ہیں۔ جو جماعتی اور انفرادی دونوں قسم کی خوشحالی میں اضافہ کرتی ہیں۔ یہ چیزیں سونے چاندی، جائداد۔ اور زمین سے کہیں زیادہ تسکین قلوب اور عام خوشحالی کا باعث بن سکتی ہیں۔ لیکن وہی خوشحالی کو پا سکے گا۔ جو انکے استعمال سے واقف ہوگا۔

دولت کی دو شکلیں ہیں۔ ایک صوری اور دوسری معنوی کسی چیز کی خوبی یہی نہیں ہے کہ وہ فقط قیمت ہی رکھتی ہو بلکہ خوبی تو یہ ہے کہ اس میں ہر دلعزیز ہونے کی صفت پائی جائے تبھی وہ دولت کہیں گے۔ رسکن (RUSKIN) نے بھی یہی خیال و دولت کے متعلق ظاہر کیا ہے۔

ایک دوکاندار کے لئے ایک تصویر حقیقی نہیں بلکہ صرف ایک پوشیدہ دولت ہے۔ دیکھا جائے تو دراصل وہ تصویر اسکے لئے ایک آلہ تبادلہ ہے اس روپے کا جو کہ خریدار تصویر کے مالک کو خوشی سے دے سکے۔ لہذا ان اشیا کا مالک جبکہ انکو زیادہ قیمت پر فروخت کر سکنے کیلئے رکھتا ہے۔ تو خواہ وہ اپنے کو کچھ ہی کیوں نہ کہے وہ ایک دوکاندار ہی کہلائے گا۔

ہمیں وہ چیزیں اپنی ملکیت میں رکھنی چاہئیں۔ جنکی کہ ہم قدر کر سکیں اور استعمال کر سکیں۔ نہ کہ فروخت کر دیا کتاب والے کی دوکان کی الماریوں میں۔ افلاطون، ارسطو ابو نصر فارابی۔ اور شبلی کی تصنیفات۔ غالب۔ اقبال ٹیگور۔ کالیداس کے دیوان وغیرہ کسی کام کے نہیں۔ جب تک کہ ہم انکا مطالعہ نہ کریں۔ اور انکی قدر نہ کریں۔ اگر کوئی شخص کوئی قلمی نسخہ ۲۰ روپے کا اس خیال سے خریدتا ہے کہ آیندہ اسکو ۸۰ روپے کو بیچ سکیگا۔ اور اسکے علاوہ اسکی نگاہ میں اس نسخہ کی کوئی قدر نہیں۔ تو بے شک وہ عالم نہیں بلکہ ایک کباڑی ہے۔ اس کے لئے وہ کتاب بالکل فضول لکھی گئی۔

دولت حقیقتاً صرف تعداد پر ہی منحصر نہیں۔ ایک بہت چھوٹی سی رقم بعض اوقات خاص ماحول و مکانیت کے

اعتبار سے انمول ہوتی ہے ایک آنہ ایک غریب آدمی کے لئے جسکا بچہ بیمار ہو بنزلہ آپکی دولت کے ہو سکتا ہے کیونکہ وہ اسی ایک آنہ کا نسخہ بنواکر اپنے بچہ کے صحت مند ہونے کی کوشش کر لیگا لیکن ایک شخص کے لئے جبکہ وہ ڈوب رہا ہو۔ سو روپے بھی کسی کام کے نہیں۔ اگر وہ روپے اس وقت اسکی جیب میں چاندی کے سکوں کی شکل میں ہوں تو اسکو اور بھی جلد ڈبو دیں گے۔ ایسے شخص کے متعلق یہ نہیں کہا جائیگا کہ اسکے پاس روپیہ نہیں۔ نہیں! بلکہ دولت نے اسکو ڈبو یا یہ مثالیں شاذ تو نہیں ہیں۔ بلکہ اکثر تھوڑا سے اختلاف حال کے ساتھ روزانہ سننے میں آتی ہیں۔

بمبئی یا کلکتہ کی سب سے بڑی دولت کیا ہے۔

یقینًا۔ اول وہاں کے باشندوں کی اندرونی عملی قوت وجذبہ جس کے بغیر سب کچھ ویران ہی ویران نظر آتا۔ دوسرے اسکا ساحل یعنی بندرگاہ کا ہونا۔ پھر شاید اسکی لائبریری۔ عجائب خانہ وغیرہ یا شاید اسکے کالج اور سکول۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہی قابل قدر دولت ہے۔ خصوصًا۔ عمدہ عمدہ کتابیں نئی نئی ایجادات اور قدرتی مناظر قابل ذکر ہیں پہاڑ۔ جھیل۔ ندیاں۔ انسان کی دولت ہیں۔ روح وبصیرت اسکی خوبصورتیوں سے لطف اندوز ہوتی ہے۔ گو دیکھنے والے کو معلوم ہے کہ میں لے کے بیچ کر نفع نہیں کما سکتا اور نہ میرے پاس اس کی ملکیت کا قانونی پٹہ ہے۔ لیکن وہ لوگ جو قوت بینائی سے بے بہرہ ہیں۔ جنکے کانوں پہ پردے پڑے ہوئے ہیں جنکے دلوں پر جمود وخمود طاری ہے انکے لئے دنیا کی خوبصورت سے خوبصورت چیز کی بھی تخلیق بے کار ہے۔ ایسا شخص خواہ دن بھر روپیہ ہی کیوں نہ رولتا پھرے لیکن پھر بھی بقول مسٹر (RUSKIN) وہ اپنے مضبوط صندوقوں کے قفلوں سے زیادہ دولتمند نہیں۔ وہ شوریدہ بخت تو ابدالآباد تک صحیح معنی میں دولتمند ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ تو سکوں کو اس طرح جمع کرتا ہے۔ جیسے بچے سنگریزوں کو یا مختلف ممالک کے ٹکٹوں کو جمع کرتے ہیں۔ اسکا کوئی صحیح مذاق نہیں ہوتا ہر چیز کو جس کا وہ مالک ہوتا ہے۔ وہ یہی سمجھتا ہے کہ میں اسکو بھی جب جی چاہے سکوں میں تبدیل کر سکتا ہوں۔ اسکی نگاہ میں عالم کی چیزوں کی قیمت یہی ہے۔

ایک اعلیٰ نظم یا علم ہندسہ کا کوئی مسئلہ اکثر لوگوں کے نزدیک محض بیکار چیزیں ہیں لیکن جس شخص کے دماغ نے صحیح نشوونما پائی ہو۔ اسکے لئے وہ بہترین خوشی کا باعث بن سکتی ہیں۔ لہذا ان چیزوں کی تعداد جو دنیا میں دولت بننے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ تقریبًا لامحدود ہے صرف اس پوشیدہ دولت کو وجود میں لانے کے لئے چشم بصیرت اور فہیم دل کی ضرورت ہے۔ انہی دولتوں کے انکشاف کے لئے اعلیٰ تعلیم کی ضرورت ہے۔ کیونکہ صرف یہی ایک اُن تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔

اب سوال یہ درپیش ہے کہ ہم پھر چیزوں کی قیمت کا اندازہ کس طریقہ پر لگائیں۔ اگر اسکا پیمانہ روپیہ نہیں تو اور کیا چیز ہے۔

دنیا میں بہت سی ایسی چیزیں ہیں کہ جنکی کوئی قیمت نہیں۔ چنانچہ وہ انمول ہیں۔ فرض کرو ہندوستان اپنے تمام چھاپے خانے بیچ ڈالے۔ اور اسکے ساتھ ساتھ تین صدیوں کے لئے چھاپنے کا حق بھی کئی کروڑ روپے

یں فروخت کر دے۔ تو اس کے نزدیک یہ کوئی اچھا سودا تصور ہو سکتا ہے؟ یا اگر بمبئی اپنا ساحل کراچی کے ہاتھ فروخت کر دے تو آپ کیا اسے نفع رساں تجارت شمار کریں گے؟ ان چیزوں کی قیمت کا اندازہ روپے کی شکل میں نہیں لگایا جا سکتا۔ دولت کی اعلیٰ اقسام کی بعینہ یہی حالت ہے۔ کوہ ہمالیہ ہندوستان کی دولت نہیں بلکہ اس کے کل میں شامل ہے۔ اسکے بغیر ہندوستان ہندوستان نہیں رہ سکتا۔ اٹلی کے خیال میں DANTE اور ANGELO-MICHAEL کی یونان کے دماغوں میں ارسطو و افلاطون کی ایران کی نظروں میں بو علی سینا و سعدی کی اور ہندوستان کے موجودہ زمانے میں اقبال۔ ٹیگور و ڈاکٹر ذاکر حسین کی کیا۔ کوئی قیمت ہو سکتی ہے

آپ اب اسکو مان گئے کہ دولت کے لئے یہ ضروری نہیں۔ کہ روپے ہی کی شکل میں اسکی قیمت کا اندازہ ہو سکے۔ دولت وہ سب ہے جو انسانی انفرادی اور جماعتی زندگی کے مکمل ارتقا میں کام آئے۔ اور ان میں سے بعض تو قطعی انمول ہیں۔ صاف ہوا اور سورج کی کرنیں۔ بھی دولت ہیں۔ عمدہ دیہات۔ پہاڑ اور سرسبز وادیاں بھی اپنے دامنوں میں دولت پھیلائے بیٹھی ہیں۔ عمدہ عمدہ کتابیں۔ تصویریں۔ اور کارآمد اشیا بھی ان لوگوں کے لئے جو انکے صحیح استعمال سے واقف ہیں۔ اور قدر کرتے ہیں۔ چشمۂ دولت ہیں۔ انسان خواہ کتنی ہی مصنوعی خوبصورت دنیا میں رہتا ہو۔ اسکے گرد اگرد تمام آرام و آسایش کے سامان اور ہندسوں سے بھرے ہوئے کھاتے موجود ہوں۔ لیکن وہ پھر بھی صحیح معنی میں دولت حاصل نہیں کر سکتا۔ دولت ایک پوشیدہ چیز ہے جس کے دیکھنے کے لئے بصیرت والی آنکھ اور فہیم دل کی ضرورت ہے۔ لوگوں کو ایسی تربیت ملنی چاہئے کہ وہ صحیح معنی میں دولت حاصل کرنے کے قابل ہوں۔ اس تربیت یا قدرتی ملکہ کے بغیر کوئی شخص اصلی دولت حاصل نہیں کر سکتا۔ اگر آپ اسے مانتے ہیں۔ تو آپ کے دل میں بھی وہی احساس پیدا ہوگا جو میرے دل میں ہے۔ بلکہ دولت کی اصل حقیقت کا انکشاف اور سمجھنا۔ انسان کی زندگی کے لئے ضروری ہے۔ خاصکر کالج اور یونیورسٹیوں کے فرائض بہت کچھ اس سے وابستہ ہیں

آخر یہ کالج کی جماعتیں کس مقصد کے لئے ہیں؟ اور طلبا ادب۔ فلسفہ۔ علم الاقتصاد۔ ہندسہ۔ تاریخ۔ سائنس وغیرہ آخر کیوں پڑھتے ہیں؟

کیا یہ اس لئے نہیں ہے کہ ممکن ہو وہ بھی حقیقی دولت پر قابض ہو سکیں۔ اپنے دل۔ دماغ اور روح میں سائنس کی ایجادات کی قدر کرنے کا جذبہ پیدا کریں۔ انسانی جد و جہد سے ہمدردی رکھیں۔ قدرت کی نیرنگیوں اور ترکیب و تربیت کا مطالعہ کریں اپنے ماحول کی زندگی میں قابل قدر حصہ لیں۔ اور انسانی اعلیٰ خواہشات میں شریک و سہیم بن سکیں۔

آپ فارسی۔ عربی۔ انگریزی اس لئے سیکھتے ہیں۔ کہ پچھلے زمانے کی معلومات و علوم آپ پر آشکارا ہو جائیں اپنی مادری زبان کو اچھی طرح سمجھ سکیں اور صحیح استعمال کر سکیں۔ کیونکہ زبان صرف بات چیت کرنے ہی کا آلہ نہیں ہے بلکہ میرا تو خیال یہ ہے کہ آپ اسکے بغیر نہ تو پوری طرح اپنے خیالات کا اظہار کر سکتے ہیں۔ اور نہ قوت متخیلہ سے کام لے سکتے ہیں۔

آپ ادب اور تاریخ کا مطالعہ اس لئے کرتے ہیں کہ پچھلے بڑے بڑے مشاہیر کو سمجھیں۔ اس زمانہ کی تحریکوں پر ہمدردی کا

اٹھایا کریں۔ اوران کی مدد سے موجودہ زمانہ کی زیادہ پیچیدہ تجربوں کو خوب سمجھ کر ترقی کی راہ میں قدم بڑھائیں۔ اس طرح آپ کا تجربہ صرف اپنی ذاتی زندگی تک ہی محدود نہیں بلکہ تمام دنیا کے تجربوں کا ذخیرہ آپکے سامنے موجود ہے۔ ورق الٹیے اور ایک ایک تفصیل پڑھ لیجئے۔ یہ ایک ایسی عظیم دولت ہے۔ کہ جس پر قبضہ کرنا ہمارا فرض ہے۔

پہلے کیا بات تھی کہ غربا کام کرتے تھے اور امرا اسکی قدر کرتے تھے۔ پہلے جیسا امن چین اب نظر نہیں آتا۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم شاید امارت اور دولت میں فرق نہیں کرتے؟ ہم زر و دولت کو لوگوں میں غلط طور پر تقسیم کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ قومیں زیادہ تر صحیح عقل و دولت کی بہت کم پرواہ کرتی ہیں۔ اور نہ انہیں اسکے لئے پوری طرح کوشش کرنی آتی ہے۔ یہ علم و ہنر کے زوال کے اسباب ہیں اور اب کالجوں اور یونیورسٹیوں کا فرض ہے کہ وہ ذرائع اور طریقے معلوم کریں۔ جن کے ذریعہ علم و ہنر پھر اوج کمال کو پہنچے۔

طالبعلم یونیورسٹیوں اور کالجوں میں سائنس اور فلسفہ پڑھنے جاتا ہے۔ تاکہ اسکو سائنس کی موجودہ نئی نئی معلومات و ایجادات کے متعلق کچھ معلوم ہوسکے۔ اور وہ دنیا میں بغیر ان باتوں کے معلوم کئے۔ کہ انسان نے کونسی راہ اختیار کررکھی ہے اور وہ اب تک کس مقام تک پہنچا ہے داخل نہ ہوں۔ سائنس کا زاویہ عمل درجہ بدرجہ بڑھ رہا ہے۔ یورپ کے طلبا مین اس ماحول میں گذر کرتے ہیں اسلئے انکا حق ہے کہ وہ ان معلومات کو حاصل کریں۔ اور خود بھی آگے بڑھنے کی کوشش کریں بغیر محنت و مشقت کے ہر دماغ اسکو نہیں پہنچ سکتا۔ جب وہ وقت آپہونچیگا۔ جبکہ

ایک عام تبلیغ کے قابل تمام عالم میں امن و سکون کے رشتہ کو مستحکم کردینے والا قانون معلوم ہوجائیگا۔ اسوقت یہ تمہاری ساری مشقت سالہا سال کی جد و جہد کے بعد سعی مشکور ثابت ہوگی۔ اسوقت اگر تم سے کوئی پوچھنے والا۔ جیسے کہ عام پوچھنے والے ہوتے ہیں۔ پوچھے کہ کیا یہ فوائد یا وہ اعلیٰ قانون جو تم نے دریافت کیا ہے۔ ایک لاکھ۔ دس لاکھ۔ یا پچاس لاکھ روپے کی مالیت رکھتا ہے۔ تم لامحالا اس شخص کو نفرت کی نگاہ سے دیکھوگے اور محسوس کروگے۔ کہ گویا۔ کوئی شخص تم کو تمہاری آنکھوں کے۔ تمہاری زندگی کے یا تمہارے سب سے پیارے دوست کے عوض پچاس لاکھ روپے دینے چاہتا ہے۔ دنیا کو ابھی اسپر پورا یقین نہیں ہے کہ عقل و دانش کی خواہش لعل و گہر کی کان سے بھی زیادہ کرنی چاہئے۔

سینکڑوں باشندے سالہا سال سے ایک ملک میں محنت و مزدوری کرتے ہیں لیکن رحم کے قابل غریب مفلسی و ناداری کے گڑھوں میں پڑے زندگی کے دن گن گن کر گذار رہے ہیں۔ دوسرے لوگ انہی کی مفلسی سے فائدہ اٹھاکر امیر بن بیٹھے ہیں اور ان غریبوں کے جسم و روح پر تسلط کئے ہوئے ہیں۔ ان کو اپنے آرام کی مناسبت سے اور مرضی کے مطابق جب جی چاہے نکال دیتے ہیں۔ جب جی چاہے نوکر رکھ لیتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ دولت کے انبار اکٹھے کرتے جاتے ہیں۔ عیش و عشرت میں مصروف ہیں۔ لیکن دنیا کی اصلی دولت انکے پاس نام کو بھی نہیں بعض کے تو خواب و خیال میں بھی نہیں۔ انکی آنکھیں بند ہیں کان بہرے ہیں۔ قدرت کی نیرنگی اور لطافت کی مناسبت

سے بے بہرہ ہیں۔ صرف سکے جمع کرنا۔ حساب کی کتابوں میں ہندسوں سے کھیلنا ان کا وظیفہ زندگی ہے یہی امیر لوگ کہلاتے ہیں۔ انکی نظر میں ہر چیز کی قیمت روپیہ ہے لیکن دنیا کی نظروں میں بھی انکی قیمت آدھے کروڑ سے زیادہ زیادہ نہیں۔

رسکن کہتا ہے۔

"کہنہ مشق تاجر۔ اور بیدار مغز اقتصادیات کے ماہرین اس کی تلقین کرتے ہیں کہ وقت بمنزلہ زر کے ہے"۔ میرے خیال میں جب انکی موت کا وقت قریب ہوتا ہے۔ ہر وقت انکا اعتقاد اس کے برعکس ہوتا ہے۔ اور خود ہی اس مذہب پر قایم نہیں رہتے۔ بلکہ ان کو یقین ہو جاتا ہے کہ زر دراصل بمنزلہ وقت کے ہے نہ کہ وقت بمنزلہ زر کے۔ اور انجام پر نظر ڈالتے ہوئے یہی سوچتے ہیں کہ کاش وہ اتنا وقت صرف روپیہ کے پیچھے ضائع نہ کرتے تو بہتر ہوتا۔ اسی طرح اور دوسری چیزیں بھی بمنزلہ زر کے ہیں۔ جنکا وقت کی طرح زر کے ساتھ تبادلہ ہو سکتا ہے۔ صحت عقل سلیم۔ علم زر ہے اپنی تمام صحت کے بدلے۔ اپنی تمام عقل کے بدلے اپنے تمام علم کے بدلے آپ زر حاصل کر سکتے ہیں۔ یہانتک کہ آپ اپنے مقصد پر پہنچکر بیمار۔ پاگل۔ اندھے بڈھے ہو جائینگے لیکن پھر زر کے ذریعہ اپنی صحت و عقل واپس نہیں خرید سکو۔ تاجروں کا یہ فقرہ میری طبیعت کو گراں گزرتا ہے۔ یہانتک کہ میں آگے اس کے متعلق لکھنے سے قاصر ہوں۔ کیا وقت کی قیمت زر سے بہتر اور کچھ حاصل نہیں ہو سکتی۔ اگر وہ یہ سمجھ سکتے ہیں کہ وقت بھی بذات خود کوئی چیز ہے تو کیا یہ بہتر صورت نہیں ہوگی کہ اگر صحت اور علم روپے سے خریدے جا سکتے ہیں تو عقلمندی اسی میں ہے کہ انکو زر سے خریدیں نہ کہ ان کے بدلے زر مول لیں"۔

ہم بعض اوقات اس امر کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے۔ کہ جو کچھ کہ ہم کر رہے ہیں۔ وہ بنی نوع انسان کو کس طرح کس درجہ تک اور کب فائدہ پہنچائے گا۔ دوسرے یہ معلوم ہونا ضروری بھی نہیں ہے۔ ہمارا کام کسی بلند درجہ ہی کا کیوں نہ ہو۔ لیکن انسان اپنے ان کارناموں کے اثرات سے جو آیندہ نخل کی صورت میں زمین پر پھلے پھولیں گے ناواقف ہی ہوتا ہے۔ (HAMLET) ڈرامہ لکھتے وقت SHAKESPEAR کے سامنے صرف GLOBE THEATRE کی پبلک تھی۔ نہ کہ یہ بیسویں صدی کی پبلک۔ اسی طرح بو علی سینا۔ نیوٹن۔ ڈارون۔ ابونصر فارابی وغیرہ نے جو مہمات صبر و استقلال سے انجام دیں۔ انکے متعلق کس کے خواب خیال میں تھا۔ کہ انسے کیا کیا فوائد یا انقلاب دنیا میں حاصل و برپا ہونگے بیشک ایسے کارناموں کے لئے ایڑی چوٹی کی محنت درکار ہے نتیجہ سے سب بے خبر ہوتے ہیں۔ ہمیں تو صرف بڑے صبر کے ساتھ کام کرنا چاہیئے۔ اور جو نتائج کہ برآمد ہونگے ان سے قطع نظر کریں۔ بلا تکلف و ہراس اپنے آپکو اچھے کاموں میں ڈالکر صبر و استقلال کے سہارے سے ہمت باندھے ہوئے آہستگی کے ساتھ بڑھتے رہیں۔ چاہے۔ کبھی کبھی آنکھ اٹھا کر پیچھے بھی دیکھ لینا چاہیے کہ ہم نے کتنا رستہ طے کر لیا اور پھر آگے کتنا باقی ہے۔ ملک کی حالت سے بھی بے خبر نہیں ایک نظر کے بعد پھر اسی استقلال اور انہماک کے ساتھ اپنے کام مشغول ہو جانا چاہیئے۔

یہ بہت ممکن ہے کہ طلبا کالج میں علم کی تحصیل میں
زیادہ روپیہ صرف کرنے کی علت غائی آمدنی کا اضافہ سمجھتے ہیں
لیکن میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ اولین مقصد ہرگز نہیں ہونا
چاہئے اور نہ ہے۔ بلکہ یہ تو ایک متمدن قوم کی جدوجہد
[illegible] کا فرض ہونا چاہئے۔ اگر اسکو تعلیم کا اولین مقصد سمجھا جاتا
[illegible] زیادہ علم کی [illegible] قدر کیا ہو سکتی ہے۔ ایک شخص
اس بات کی کوشش کر سکتا ہے کہ وہ [illegible] لئے زیادہ
[illegible] لیکن یقیناً اس بات کی نہیں کہ وہ تعلیم حاصل
[illegible] کہ اگر تعلیم کا نصب العین تو نہیں ہونا
چاہئے [illegible]

مثلاً جب ہم کسی [illegible] اور بہترین طریقہ پر
[illegible] کا حق [illegible] تو اپنا قیمتی [illegible]
[illegible] میں ضائع کرنا کہ تنخواہ [illegible] اور [illegible]
کس طرح اضافہ کیا جائے محض فضول ہے۔ اگر ہم اپنا
فرض اچھی طرح ادا کر رہے ہیں۔ تو اس کے نتائج ولوازمات
خود بخود ظاہر ہو جائیں گے۔ یہ اصول مجھے نہایت ٹھیک
اور نہایت درجہ کا صحیح نظر آتا ہے۔ بہ نسبت اور اصولوں کے
کہ جن پر پستی سے [illegible] پہنچانے والے اعتقاد رکھتے ہیں۔
یہ سب سے زیادہ قابل عمل و تقلید ہے۔

سب سے پہلے ہم کو یہ دیکھنا چاہئے کہ ہم حقیقی طور پر
کیا چاہتے ہیں۔ اور زندگی کے دراصل کیا معنی ہیں کس
چیز کو ہمیں اپنا مقصد اولیٰ بنانا چاہئے۔ اور کسکو ثانی۔ اگر
[illegible] ترقی کرنا ہمارا مقصد ہے تو یقیناً زمانہ حال کے سیاست
دانوں سے بہتر کوئی نہیں بتا سکیگا۔ کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے
اور پھر ہمیں اسکا پھل کیا ملیگا۔

موجودہ زمانے کے تجارتی ممالک کا سب سے ضروری
مقصد مارکیٹ کی تلاش ہے۔ اسی کے لئے تمام دنیا میں
مارے مارے پھرتے ہیں۔ گویا یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ مال
جو وہ اپنے ملک میں تیار کرتے ہیں۔ ایسا بیکار اور فضول
ہے کہ [illegible] ملک [illegible] کام میں نہیں لایا جاسکتا۔ اسواسطے
[illegible] دنیا میں بیچتے پھرتے ہیں۔ حالانکہ انکے ہی ملک میں
ہزاروں لاکھوں خستہ حال۔ بغیر معاش اور گھر کے پڑے
ہوئے ہیں۔ یہاں کچھ نہ کچھ دال میں کالا ضرور ہے۔ اور وہ
کیا ہے۔ تجارت خود ہنوز یہ عقیدہ لاینحل ہے۔ جس کے معنی
یہ ہیں کہ وہ ایک غلط مقصد ہے۔

ہم اپنی تجارت کو بڑھانا چاہتے ہیں۔ فرض کیجئے۔ جرمنی
کی تجارت اب سے چوگنی ہو جائے فیکٹریوں سے بادل
کے بادل دھوئیں کے اٹھکر آسمان کو تیرہ و تاریک کر ڈالیں
چپہ چپہ پر فیکٹریاں قایم ہو جائیں۔ اور اتنا کام ہو کہ دن رات
بنانے سے فرصت نہ ملے۔ لوہے پیٹنے کی وجہ سے کان
پڑی آواز بھی سنائی نہ دے۔ جب بنانے سے فارغ ہوں
تو تمام تیار شدہ مال واسباب باہر ملکوں میں چلا جاتے
چین [illegible] میں نکاسی ہو جائے۔ اسکے عوض غیر ممالک
سے کھانے پینے کی چیزیں عیش و عشرت کے سامان
امراء کے لئے مہیا ہو جائیں۔ فرض کیجئے کہ غیر ممالک کو
سامان بہم پہنچانے کا اتنا کام ہو کہ نہ فرصت ملے اور نہ کھلی
ہوا۔ بلکہ اچھی مزدوری۔ بہت سا کھانے کو اور بیر پینے کو ملتی
رہے تو بلا شبہ امراء بغیر کسی غیر معمولی احساس کے مزدوروں
کی محنت سے فائدہ اٹھائیں گے۔ لیکن جرمنی کو رہنے کے قابل
نہ سمجھ کر آب و ہوا تبدیل کرنے دوسرے شہروں میں جائینگے

کبھی کبھی اپنے زرخرید غلاموں یعنی مزدوروں کی کارروائی اور اپنی دولت کی کان کا ملاحظہ کرنے گیس کی نقاب چڑھا کر اور کانوں میں روئی کی بتیاں دیکر آیا کرینگے۔ پھر جسقدر جلد ممکن ہوگا۔ اپنی امن وسکون والی جگہ اس مصروف ملک سے واپس چلے جایا کرینگے۔

فرض کیجئے کہ یہ سب کچھ حاصل ہوگیا۔ اسی کو تاجر لوگ تجارتی معراج تصور کرتے ہیں۔ لوگوں کی طرز گفتگو سے بھی عموماً یہی پایا جاتا ہے۔ کہ ان کی اقصٰی الغایتہ یہی ہے۔ چنانچہ ان کا جھینکنا یہی ہے کہ ہم اس منزل مقصود کی طرف بہت آہستہ آہستہ قدم بڑھا رہے ہیں اسی میں انکے نزدیک ملک کی بہبود ہے۔ وہاں کے رہنے والے بھی اسے بہبود سمجھتے ہیں۔ یہ بھی عجیب نصب العین ہے۔

میں نے کوئی غلط ترجمانی نہیں کی۔ کیونکہ لوگوں کی خواہش بظاہر تو یہی ہے۔ شاید اس درجہ نہیں تو کم سے کم موجودہ حالت سے تو زیادہ ترقی کرنی چاہتے ہیں۔ ان کی کوئی کوشش اس بات پر صرف نہیں ہوتی۔ کہ وہ قدرتی مناظر۔ تازہ ہوا نیلے آسمان سے لطف اندوز ہوں اور غربا کی زندگی کے لئے عمدہ ذرائع بہم پہنچائیں۔ یہ انکے نزدیک ناقابل عمل اور ناقص جذبہ ہے۔

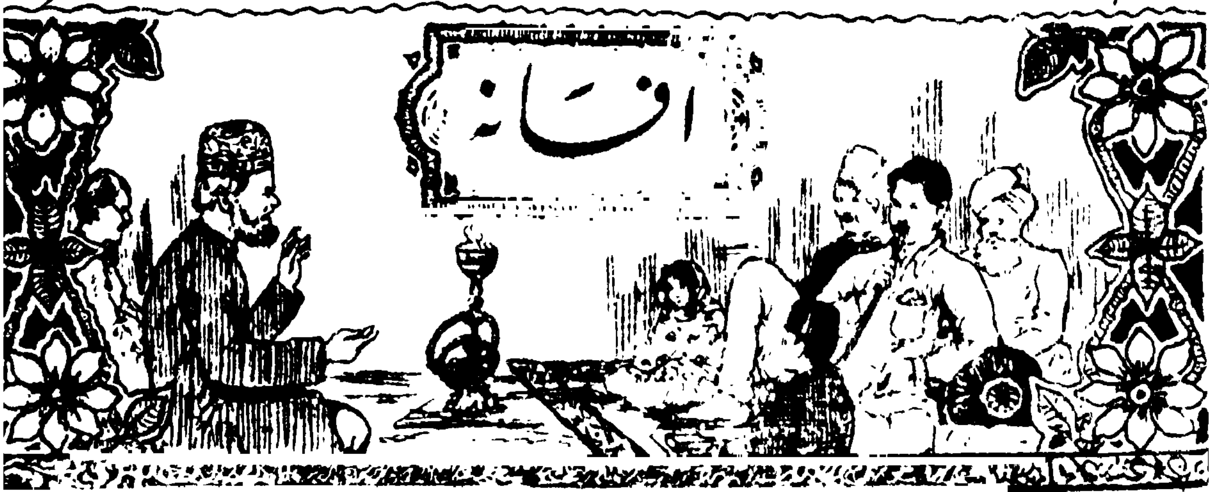
دیکھا جائے تو محض چمنیوں فیکٹریوں اور مزدوروں کی تعداد بڑھا کر زندگی کو دشوار تر بنانے کی کوشش کیجاتی ہے۔ آخر یہ سب کس لئے۔ یہی سمجھنا ایک دشوار امر ہے۔ جبکہ میں ان امراء کا خیال کرتا ہوں۔ جنکی جیب میں تمام نفع یا روپیہ جاتا ہے۔ جو کشمیر یا کسی اور اچھے مقام پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ (اگر وہ کافی خود غرض ہیں۔ تو بہت اچھی طرح اپنی زندگی گذارتے ہیں) اگر یہی لوگ اس قسم کی ترقی کی خواہش کریں تو بات سمجھ میں آتی ہے۔ لیکن مشکل تو یہ ہے کہ صرف وہی نہیں بلکہ انکے ساتھ غربا اوسط درجے کے تاجر۔ چنانچہ ملک کی اکثریت بھی یہی چاہتی ہے۔ یا کم از کم انکا عمل یا گفتگو اسی طرح کی ہوتی ہے۔

میرا تو یہ خیال ہے کہ ان لوگوں کا ان معاملات میں سوچنے کا طریقہ ہی غلط ہے۔ ہم زندگی کی اصلی روح اور معنی کو بھول گئے ہیں۔ چند مصنوعی اور غیر ضروری باتوں کو حقیقت سمجھ کر اور اہمیت دیکر۔ انکی پیروی کر رہے ہیں۔ اسکے لئے تمام قربانیاں کرنے کو تیار ہیں۔ میرا خیال ہے کہ لوگوں کی آنکھیں اعلٰی تعلیم وتلقین کے ذریعہ کھولنی چاہئیں۔ انکو دولت کا ایک علیحدہ معیار قایم کرنا سکھانا چاہئے۔ تب دنیا اب سے زیادہ عقلمند اور بہتر حالت پر ہوگی۔ اور کائنات کے نامتناہی راز ہمارے سامنے اصلی شکل میں ظاہر ہونگے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ آپ ان میرے خیالات کو جوں کا توں مان لیں بلکہ میں آپسے درخواست کرتا ہوں کہ آپ بھی غور وفکر کو کام میں لائیں۔ پھر آپکے ذہن میں بھی دولت کا تصور موجودہ تصور کے خلاف پیدا ہوگا۔ اور معلوم ہوگا کہ جو کچھ آپ اب تک سمجھ رہے تھے اصلیت اسکی ضد تھی۔ پھر یقیناً آپ چیزوں کی اضافی قیمت کا اندازہ لگا نا جان جائیں گے۔ اور دولت کے اصلی معنی سے بھی واقف ہو جائینگے۔ اس اطمینان کے بعد کہ ہمارا نصب العین قابل قدر وسعی ہے آپ اسکو درجہ کمال تک پہنچانے میں پوری تندہی اور قوت سے کوشش کریں گے۔

نوٹ

(اس مضمون میں زیادہ تر SIR OLIVER LOUGE کے خیالات کی ترجمانی کی گئی ہے)



۵۷ء کی دُکھیا

(گذشتہ سے پیوستہ)

دسواں باب

عام گڑبڑ

محمد کی زبانی یہ حالات سنکر ہمارے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے ۔ اور دل بیٹھ گئے اور ہم لوگ بڑے سخت کشمکش میں مبتلا ہو گئے جس نے ہماری کمر توڑ دی ۔ ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا کہ ہم اس مکان میں رات گذاریں یا یہاں سے نکل جانا ہمارے حق میں بہتر ہوگا ۔ محمد یہی کہتا تھا کہ رات کی تاریکی کو غنیمت سمجھو اور اس ہولناک مقام سے کہیں اور منتقل ہو جاؤ میں آپ لوگوں کے یہاں قیام کرنیسے موافقت نہیں کرسکتا ۔ مگر مشکل یہ تھی کہ جائیں تو کہاں جائیں ۔ اگر بارود خانہ کا ارادہ کرتے ہیں تب اپنے آپ کو مصیبت میں ڈالتے ہیں اور اگر اسی جگہ قیام کرتے ہیں تو صبح ہونے پر کسی دوسری بلا میں پھنس جانے کیطرف سے کوئی اطمینان نہیں ہوسکتا یہ مکان مفسدوں کے مراکز اور مساجد سے قریب تھا ۔ محمد نے ہماری پریشانی دیکھی تو اس نے تھوڑی دیر غور کر کے کہا اچھا آپ لوگ گھبرائیں نہیں ۔ میں آپ کو اپنے ایک دوست کے پاس لئے چلتا ہوں جو میری طرح ایک مسلمان ہے ۔ بڑا خوش خلق اور پاک طینت ہے اسکے دل میں بدنیتی کا شائبہ بھی نہیں آسکتا ۔ مفسدوں پر اسکو قیاس نہیں کرنا چاہئے ۔ مگر مجھکو یہ خوف ضرور ہے کہ اوروں کی دیکھا دیکھی جذبۂ قومیت و وطنیت ممکن ہے اسے آپکی مدد نہ کرنے دے ۔ لیکن ایک مرتبہ اسکے گھر پہونچ جانے کے بعد آپ ایک نہایت مضبوط قلعہ میں محفوظ ہو جائینگے ۔ مجھے اُس کا خوب تجربہ ہے اور میں اپنے ابناء وطن کو آپ لوگوں سے زیادہ جانتا ہوں کہ اگر کوئی مصیبت زدہ انکی پناہ میں آجائے تو وہ لوگ اسکے ساتھ انتہائی سلوک و رواداری سے

پیش آتے ہیں اور ایسے طرز عمل کو انسانیت اور اسلام کا فریضہ سمجھتے ہیں۔ مذہبی و قومی اختلاف کی کوئی پرواہ نہیں کرتے۔ اور امداد کرتے ہوئے خود اپنی جان کی بھی کوئی پرواہ نہیں کرتے بہر حال اگر وہ لوگ کسی شخص کو پناہ دیتے ہیں تو اچھی طرح دیتے ہیں اور جو کچھ انکے امکان میں ہوتا ہے اسکے کرنے میں انہیں کسی وقت ادنیٰ تامل نہیں ہوتا اور جب تک پناہ گیر خود چلا نہ جائے وہ اسکی ہر ممکن عزت اور خدمت کرتے ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ ہم لوگ اس جگہ کو فوراً چھوڑ کر اُس شخص کے یہاں چلیں اور مجھے خوب اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ اپنے ابنائے وطن کے ساتھ جنگ میں شریک ہے اور یہ بھی آپ کی خوش قسمتی ہے۔

انہوں نے کچھ دیر تامل کیا اور کہا کہ مفسد اسلحہ خانہ پر جو بہت مستحکم جگہ تھی کیونکر مسلط ہو گئے۔ اور وہاں جو فوجیں تھیں اونہوں نے آخر کیا کیا۔ سچ کہتے ہو یا مذاق تو نہیں کر رہے ہو۔ کیا جو لوگ وہاں محصور تھے وہ سب قتل کر دیئے گئے اور یوں ان لوگوں نے قبضہ کر لیا۔ محمد نے کہا کہ اسوقت جبکہ میں آپکے سامنے حاضر اور آپکی ہر ممکن خدمت کے لئے تیار ہوں۔ انگریزوں کی اس شہر میں اگر کوئی پناہ باقی ہے تو صرف بارودخانہ ہے اس کے علاوہ تمام قلعہ بندیوں اور استحکامات پر مخالفین قابض ہو چکے ہیں اور تمام قلعہ جات و استحکامات محلات و عمارات، باغات و چمنستان اب مٹی کا ڈھیر اور میدان ہو چکے ہیں۔ ایلن نے یہ سنا تو سرداب میں سے جلدی سے نکل آئی اور زور سے کہنے لگی کہ پھر آپ سب لوگ بارودخانہ چلنے میں کیوں دیر کرتے ہیں۔ مگر رستہ مشکلات غریب کے ذہن سے اتر گئیں۔ اسکی غرض تو صرف یہ تھی کہ اپنے سرتاج کے پاس کسی طرح پہونچ جائے اسکی پرواہ نہیں کہ رستہ میں کیا گذریگی اسکے تو گویا حواس اور عقل بے کار ہو چکی تھی۔ ایلن کا سوال سنکر محمد نے اسکے پاس جاکر کہا کہ نہ تم وہاں تک پہونچ سکتی ہو اور نہ میں تمکو وہاں جانے دے سکتا ہوں۔ کیونکہ تمام افسران نے یہ عزم کر لیا ہے کہ اگر خدانخواستہ رسائی اور کامیابی کی کوئی صورت نہ نکل سکی اور یہ خوف محسوس کئے جانے لگا کہ مخالف بارودخانہ پر بھی قبضہ پالیں گے تو بارودخانہ کو اڑا دینگے کہ مغلوب فوج کا یہی آخری حربہ ہے۔ ایک سپاہی کے لئے دشمنوں کے ہاتھ میں گرفتار ہو کر ذلیل و خوار ہو کر مقتول ہونے سے یہ بدرجہا بہتر ہے کہ اس طرح اپنی قوم اور اپنی حکومت کی عزت و ناموس پر فدا ہو جائے اسلئے تمہارے اور تم جیسوں کے لئے وہاں پہونچ سکنا ناممکن ہے۔ ایلن محمد کا جواب سنتے ہی تھرتھرا کر بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ میں نے اسکو اٹھا کر اس کا سر اپنے زانوں پر رکھا اور سہلانا شروع کیا تھوڑی دیر میں اُسنے آنکھ کھولکر تین مرتبہ بارودخانہ کا نام لیا اور چپ ہو گئی۔ پھر اپنا سر پکڑ کر ایک لمبی سی ٹھنڈی سانس بھری اسکے بعد سے اس کی حرکات و سکنات پر رنج و غم کے آثار طاری ہو گئے اور اس کا چہرہ مرجھا کر رہ گیا۔

سرداب میں جو بچہ ملا تھا وہ چونکہ ایلن سے بے طرح مانوس ہو گیا تھا۔ اسلئے اسکے پاس کھڑا ہوا رو رہا تھا اور محمد چلنے کی جلدی مچا رہا تھا۔ میں نے کہا کہ کیا تمہاری اُس مروت و اخلاق کا جسکا تم کو دعویٰ ہے یہی تقاضا ہے کہ ان دونوں کمزوروں کو ہم یہیں چھوڑ دیں۔ کونسا آدمی

جس میں ذرا سی بھی آدمیت ہوگی اسکو گوارا کریگا کہ اپنے ہی جیسے دوسرے آدمی کو مصیبت میں چھوڑ کر خود بھاگ جائے۔ محمد نے جب اُن دونوں عورتوں کی رہائی پر بضد پایا تو اُردو میں وہ کچھ بڑبڑایا اور کہا کہ اللہ ہی کی مرضی معلوم ہوتی ہے کہ انگریز ختم ہو جائیں اور اُن کا نام و نشان مٹ جائے اور تقدیر کے سامنے تدبیر کارگر نہیں ہو سکتی نہ مشیت الٰہی کو کوئی روک سکتا ہے اور نہ اسکے احکام کو کوئی ٹال سکتا ہے۔ پھر اس نے تھوڑی دیر سر جھکا کر غور کیا اسکے بعد مجھ سے بات کئے بغیر ان دونوں عورتوں کو لینے کے لئے سرداب میں اتر گیا اور ان میں سے ایک کو لاکر اس نے عماری میں بٹھلا دیا۔ یہ عورت جو وقت سے اُس نے ہمکو دیکھا تھا برابر چیخ رہی تھی اور ہلکوں ... اس خیال تھا کہ ہم بھی دشمن ہیں جب اس کو معلوم ہوا کہ ہم اسکو کوئی نقصان پہونچانا نہیں چاہتے تو خاموش ہو گئی۔ دوسری جس کی کلائی کٹی ہوئی تھی اسکی کلائی ہمنے باندھ دی تا کہ خون زیادہ نہ نکلے۔ یہ اُن پر سہارا دیکر سیڑھی پر چڑھی اور ہم سب نے ملکر اسکو عماری میں لٹا دیا۔ لڑکا ایلین کو کسی طرح چھوڑ کر عماری میں بیٹھنا نہیں چاہتا تھا زبردستی اسکو چھڑایا اور ہم نے ارادہ کیا کہ ہاتھی کے پیچھے چلیں گے۔

گیارھواں باب
گم شدہ کی تلاش

ابھی اس بدنصیب و شوم قافلہ نے کوچ کیا بھی نہیں تھا کہ میری بدقسمتی کا ایک اور مظاہرہ سامنے آیا اور ایک نئی مصیبت سے واسطہ پڑا جس سے ہمارے دلوں کی بے چینی میں اضافہ اور پریشانیوں میں زیادتی ہوگئی۔ ایلین کو اور انہیں باہر چھوڑ کر میں اُس کوٹھری میں جہاں ویلی کو سلا رکھا تھا گئی کہ اسکو اور اسکی انا کو بھی ساتھ لے لوں۔ مگر بستر دیں سے خالی اور انا کو غائب پایا۔ آنکھیں ملکر اور نظر جما کر دیکھا جب بھی کوئی نظر نہ آیا۔ گھر کا کونا کونا چھان مارا مگر دونوں کا کہیں پتہ نہ چلا۔ سناٹا سا ہو گیا اور بے اختیار منہ سے چیخ نکل گئی ان لوگوں نے میری چیخ سنکر یہی خیال ہوا کہ مفسدوں نے مجھکو پکڑ لیا ہے۔ محمد کے ساتھ وہ کمرہ میں آئے مگر ڈرتے ڈرتے اور پستول ہاتھوں میں لیکر کہ جہاں تک ممکن ہو سکے ہاتھ پاؤں ہلا کر جان دیں لیکن جب مجھکو تنہا پایا تو انھوں نے پوچھا کہ تم چیختی چلاتی کیوں ہو؟ بشدت غم کی وجہ سے میرے منہ سے بات نہیں نکلتی تھی مگر میں اپنے کپڑے پھاڑنے بال نوچنے اور منہ پیٹنے لگی اور پاگلوں کی طرح چیختی جاتی تھی۔ اور کہتی جاتی ہو کہ "وہ اسے لیگئے انھوں نے اسکو قتل کر دیا"۔ انھوں نے پوچھا کہ کسے لے گئے، کس کو قتل کر دیا۔ میں نے کہا میرے بچے کو لیگئے۔ انھوں نے پوچھا کہ اسکی انا کہاں ہو۔ میں نے کہا وہ بھی غائب ہو۔ پھر میں نے کہا بار الہا اگر تیری یہی مرضی ہے کہ میرا بچہ کھو جائے اور میں دنیا میں اب دوبارہ اسکے دیدار سے آنکھیں ٹھنڈی نہ کر پاؤں تو اے میرے مالک میری تجھ سے دعا ہے کہ مجھکو بھی جلدی سے موت دیدے کہ اس طرح شاید میں اسکو دیکھ سکوں ورنہ اب مجھ میں مزید سختیاں برداشت کرنے کی سکت نہیں ہے اور اسکی مفارقت میرے لئے ناقابل برداشت ہے اسکے بعد انھوں نے اپنے ہاتھ میں موم بتی لیکر کوٹھریوں کو ڈھونڈھنا شروع کیا اور جب سب کو ڈھونڈھ چکے اور اسکے ملنے سے

مایوسی ہوگئی تو میرے ساتھ رونے پیٹنے میں شریک ہوگئے اور ہجوم غم سے نڈھال ہوکر بے ہوش ہوگئے۔ ان کو اس حال میں دیکھکر میں اپنا رونا پیٹنا بھول گئی اور دیلن کا خیال بھی میرے ذہن سے نکل گیا۔ میں انکے سرہانے گئی تو دیکھا کہ رنگ بالکل پیلا ہوگیا ہے پلک سے پلک ملگئی ہے اور مکمل بے حسی طاری ہے حس وحرکت بھی قطعًا نہیں ہے۔ یہ حال دیکھکر مجکو ڈر لگا کہ خدانخواستہ کہیں سکتہ نہوجائے یا دل کی حرکت بند ہوکر موت نہوجائے کیونکہ موذی حادثات کے وقت اکثر ایسا ہوجاتا ہے۔ اس خیال سے مجھے وحشت اور پریشانی اور زیادہ تھی کہ اگر خدانخواستہ وہ چل دیئے تو میں اکیلی لیسے وقت میں کیا کرونگی۔ باپوں کی نسبت مائیں کسیقدر رقیق القلب بھی ہوتی ہیں اور مامتا بھی بہت ہوتی ہے اور ایسا ہونا بھی چاہیئے ماں اگر رقیق القلب اور مامتا کی ماری نہو تو بچوں کی پرورش مشکل ہوجائے۔ اسلئے بظاہر یہ حالت میری ہونی چاہیئے تھی مگر میں نے دل کو روکا اور انکو تسلی وتشفی دینے کی ترکیبیں کرنا شروع کیں۔ کرتے کے بٹن کھول دیئے کہ دل پر صاف ہوا لگے۔ پھر کان کے پاس منہ لے جاکر میں کہنے لگی:۔

ہماری مسلسل پریشانیوں اور صدموں کو دیکھکر انا کو ایک گونہ تشویش ہوتی اسلئے وہ دیلن کو ایک محفوظ جگہ لیکر چلی گئی ہے ذرا ہمت سے کام لو۔ ابھی تو تمھارا لخت جگر تمکو ملا جاتا ہے۔ بہت ممکن ہے راستہ ہی میں مل جائے۔ مگر آہ میری طفل تسلیاں انپر کارگر نہوتیں۔ اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ جیسے دشمنوں میں دم ہی نہیں ہے۔ اور یہ یقین ہوگیا کہ جان نکل چکی ہے۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ اب میں کیا کروں۔ محمد کو کئی بار آواز دی مگر اُسنے بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ مگر تھوڑی دیر بعد وہ پانی سے بھرا ایک طشت لایا۔ اور زمین پر رکھکر اس نے مجھ سے کہا کہ تھوڑا تھوڑا انکے چہرہ اور سینہ پر چھڑکو۔ میں چھڑکنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد کسی قدر افاقہ معلوم ہوا اور بہت ہلکی ہلکی کراہ نکلنے لگی جس سے ہمکو یہ امید پڑی کہ بحمد اللہ انکی جان کی خیر ہے۔ کچھ دیر بعد انھوں نے آنکھیں کھولیں مگر سب سے پہلا سوال یہی تھا کہ دیلن کہاں ہے۔ کیونکہ دیلن کے متعلق تو ان کو اب دوبارہ ملنے کی کوئی امید باقی نہ رہی تھی اسلئے دیلن سے تعلق کا بڑھ جانا طبعی اور لازمی امر تھا۔ پھر میں نے ہاتھ پکڑکر ان کو اٹھایا اور وہ مجھ پر زور دیکر بیٹھ گئے اور ہم دونوں اپنی جوانی کی کمائی دیلن پر رونے لگے۔ ہماری دونوں کی یہ حالت دیکھکر محمد کا دل بھی بھر آیا اور اس نے کہا:۔ بیگم ذرا تسلی کرو اور دل مضبوط کرو۔ بہت نہ رو۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کا بچہ اسوقت انا کے پاس ہے۔ کوٹھری میں نہ کہیں خون کا کوئی نشان ہے نہ کوئی اور ایسی علامت ہے جس سے یہ خیال کیا جاسکے کہ کوئی قتل کیا گیا ہے۔ کمرہ کا فرش صاف ستھرا ہے اور اس پر کوئی داغ دھبا نہیں ہے۔ پھر یہ چیز بھی ذہن میں رکھنے کی ہے کہ لڑائی ہو رہی ہے۔ لوٹ مار کا بازار گرم ہے اسلئے موقع کو غنیمت سمجھنا چاہیئے اور اپنے میاں اور بیٹی کی ساتھ جھٹ پٹ یہاں سے نکل جانا چاہیئے اللہ کی ذات سے امید ہے کہ ہم لوگوں کو اس تباہی سے بچا دیگا اور یقین رکھو کہ انا آپ لوگوں کی اس پریشان حال کو دیکھکر اُس انمول جوہر کو لیکر کسی دوسری جگہ چلی گئی ہے۔

مجھے زمانہ کی سرد وگرم حالت کا خوب تجربہ ہے اور بارہا حوادث ومصیبات سے مجکو واسطہ پڑ چکا ہے۔ مگر کبھی اور کسیوقت میں اس پاک بے نیاز کی ذات سے مایوس نہیں ہوا۔ اور پھر ہر دفعہ میں نے یہی دیکھا کہ مصیبتوں کے وہ پہاڑ جو میرے سامنے تھے اور بلاؤں کی گھٹائیں جو میرے سر پر چھائی ہوئی تھیں سب چھٹ اور ہٹ گئیں۔ خدا میں بڑی قدرت ہے بچھڑوں کا

ملا دینا اس کی قدرت کے آگے کچھ مشکل نہیں ہے۔ اور دنیا میں تو رنج و راحت، شادی و غم ساتھ ساتھ ہیں۔ نہ یہاں کی خوشی کو قیام ہے اور نہ یہاں کے غم کو بقا ہے۔ یہ وقت بھی نہ رہیگا۔ بہرحال وہل کی تلاش محض ناکام اور جستجو لاحاصل رہی اور ہمکو محمد کی باتوں ہی سے جی کو تھامنا پڑا اور روتے ہوئے اس گھر کو ہمنے خیرباد کہا۔ جب گھر سے ہم لوگ چند قدم نکل گئے تو محمد نے دوبارہ وہی لفظ دہرائے اور کہا کہ میں تم سے بہت پختہ وعدہ کرتا ہوں کہ شہر دہلی اگر اتنی بڑی جگہ بھی ہو جہاں ساری دنیا کی کھپت ہو جائے جب بھی میں تمھارے بچے اور اسکی آنا کو ڈھونڈ کر تمکو اس غم فرقت سے آزاد کراؤنگا۔ انشاءاللہ۔

رات کے اس وقت چار بج چکے تھے۔ اُن ممالک میں جو خط استوا پر واقع ہیں عموماً آفتاب تقریباً چھ بجے نکل آتا ہے۔ اور اس بنا پر رات کی اندھیری ہمارے لئے بیش از بیش دو گھنٹہ تک اور ستر کا کام دے سکتی تھی۔ اس کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ ہم پر کیا گذرے گی۔ اور ہمکو پناہ مل سکے گی یا نہیں۔ مگر اس سب کے باوجود کاش آیندہ کی راتیں اسی رات جیسی ہوتیں۔ کیونکہ ایسی ہولناک اور ایسی دل شگاف راتیں اگر کوئی اور میری نظر سے نہ گذرتیں تو بیشک میں اسی ایک رات کو سب سے منحوس سب سے بدتر اور سب سے زیادہ ہولناک اور دل شگاف رات کہتی اور سمجھتی مگر قسمت میں تو نہ معلوم کیا کیا کچھ لکھا تھا جو اس سے بدرجہا بدتر اور دل شکن تھا۔ یہ رات تو حقیقتاً مصیبتوں کی ابتدا اور رنج و غم کی پہلی منزل تھی۔ اسکے بعد سے تو خدا جانے آجتک مصیبت کے وہ کونسے گھونٹ تھے جو خواستہ یا ناخواستہ میں نے حلق سے نیچے نہیں کئے۔ اور وہ ایسی کونسی بلا ہے جسکو اُس رات کے بعد سے میں نے روز برداشت نہیں کیا ہے۔ ذلت و خواری تباہی۔ زیر باری کی کوئی صورت اور کوئی شکل ایسی باقی نہیں رہی جس میں دو چار نہیں ہوئی اور رنج و غم کا وہ کون سا طریقہ ایسا باقی رہ گیا ہے جس سے مجھکو سابقہ نہیں پڑا۔ اسلئے میں کہہ سکتی ہوں کہ یہ رات سب سے اچھی سب سے زیادہ خوشگوار اور سب سے زیادہ مزیدار رات تھی۔

تقریباً پچاس قدم چلکر ہم لوگ ایک چھوٹے سے میدان کے پاس پہنچ گئے جسکے چاروں طرف چار محلے آباد تھے محمد سیدھا سامنے کو چلا جارہا تھا اور دائیں اور بائیں مڑتا نہ تھا۔ مگر ایلن چلتے چلتے اپنے والد کا ہاتھ پکڑ کر بائیں کو مڑنے لگی کہ اس طرف سے جاکر ہمارے قبضہ سے نکل جائے۔ انھوں نے پوچھا کہ کہاں جانا چاہتی ہے تو اس نے کہا کہ بارود خانہ جانا چاہتی ہوں کہ میرا سرتاج وہیں ہے اور مجکو یقین ہے کہ وہ ہم لوگوں کے انتظار میں ہونگے ایلن کا یہ جواب ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ میرے لئے کسقدر رنج دہ تھا کہ وہ اب ایسی از خود رفتہ اور حواس باختہ ہو رہی تھی کہ نہ ہمارے کہنے سننے کا اس پر کوئی اثر تھا اور نہ راستہ کی مشکلات کا کوئی خیال تھا۔ تھا تو صرف یہ خیال تھا کہ کسی طرح اپنے مالک و سرتاج کے پاس پہونچ جائے۔ اور پھر اس کی صورت رنج و غم کا مجسمہ اور حرکات و سکنات وارفتگی و خود فراموشی کی مظہر تھیں۔ کیوں نہو دل کی لگی بری ہوتی ہے

دل بُری شے ہے کہ اغیار سے میں کہتا ہوں
تمہیں للہ نکالو کوئی صورت میری

اطلاع جو صاحب شروع سے "سعید" کے خریدار رہیں! چندہ ختم ہوگیا۔ ازراہ کرم فوراً اپنا چندہ ارسال فرماویں۔ وی پی میں انہی کا نقصان ہے۔

مینیجر

فاقہ کش

(از جناب عبداللطیف صاحب بنارسی)

میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جبکہ میں نے دیکھا کہ اشرف چیتھڑے لگائے پھر رہا ہو۔ سر کے بال بے ترتیبی سے بڑھے ہوئے ہیں۔ اور پان کی پیک کچھ اس طرح بہ رہی ہے کہ ڈاڑھی مونچھیں اور گریبان سب رنگ گئے ہیں۔ میری یادداشت مجھے یقین دلا رہی تھی کہ میں نے اسے کہیں دیکھا ضرور ہے۔ لیکن پھر بھی مجبوراً دو چار بار آنکھیں مل ملکر دیکھنا ہی پڑا۔ آخر مجھے یاد آگیا کہ دو ماہ قبل کلکتہ میں مجھ کو جمیل نے اس منچلے کا تعارف کرایا تھا مجھے یاد ہے کہ وہ اُس وقت ایک نہایت خوش پوش جوان تھا اور ایک سال قبل ایف۔ اے کا امتحان پاس کر چکا تھا۔ لیکن اس کی مالی حالت اجازت نہ دے سکی کہ وہ آگے تعلیم حاصل کرے کیونکہ اس کے والد نے تین سال قبل اس کی شادی کر کے اپنی سرپرستی سے ہاتھ کھینچ لیا تھا حالانکہ وہ تلاش معاش میں متواتر ناکام ہوتا رہا لیکن اسکا منچلا پن اسے پریشان نہ کر سکا۔

میں اسے کچھ دیر تک دور سے کھڑا تکتا رہا اس نے سڑک پر سے سگریٹ کا جلا ہوا ٹکڑا اٹھایا اور جلاتے بغیر ہی اسے پیتا رہا۔ پھر جو کچھ جی میں آئی تو بھاگ کر چوپاٹی کی ریت پر جا بیٹھا۔ میں بھی اسکے قریب ہی بیٹھکر اسکی حرکتیں سمجھنے لگا مجھے یاد تھا کہ اسکی ایک چھوٹی بچی تھی جسکا نام نجمہ تھا وہ مجھے اس وقت کہیں نظر نہ آئی۔

روشنی ہونے کے بعد اشرف اٹھا اور دہی بڑے والوں کی دو کانوں کے سامنے جا کھڑا ہوا کسی نے دو چار دانے چنے کے دیدیئے تو کسی نے دھتکار دیا میں یہ تماشا کھڑا دیکھتا رہا جب مجھ سے ضبط نہ ہو سکا تو میں نے دو آنے کی پوریاں خریدیں اور اس کے پاس لے گیا اشرف نے پوریاں لے لیں اور مجھ پر ایک نظر ڈالی میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا کہ نجمہ کہاں ہے۔ لیکن اس نے بجائے جواب دینے کے زور سے دانت پیسکر مجھے گھور گھور کر دیکھا اور پوریاں پھینک کر میری ٹائی پکڑ لی اور اس زور سے کھینچا کہ مجھے بھی مدافعت کرنی پڑی کچھ لوگوں نے بمشکل مجھے چھڑایا اور وہ گالیاں دیتا ہوا ایک طرف کو چل دیا۔

رات کے آٹھ بج چکے ہیں لیکن خلاف معمول میرے خالہ زاد بھائی ڈاکٹر امتیاز علی جن کا میں چار روز سے مہمان تھا ابھی تک دواخانہ سے واپس نہیں آئے آدھ گھنٹے بعد وہ آئے لیکن عجیب حالت میں کہ کپڑے تمام بھیگے ہوئے تھے اور ڈرائیور کی مدد سے ایک دوسرے شخص کو اٹھائے ہوئے تھے۔

میں نے دوسرے شخص کو فوراً پہچان لیا کہ وہ اشرف ہے۔

میں نے اور بھائی صاحب نے مل کر اس کے کپڑے اتارے اور کچھ دوا اسے پلائی پھر کمبل میں لپیٹ کر اسے سلا دیا۔ بھائی صاحب بھی کپڑے بدلکر آگئے اور کہنے لگے۔ میں ایک مریض کو دیکھنے تاج محل ہوٹل گیا تھا واپسی میں یہ شخص سمندر میں غوطے کھاتا ہوا نظر آیا میں نے کود کر اس کو بچایا

[illegible] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پاگل ہے لیکن پھر خودکشی کی وجہ؟ میں نے کہا۔

میں اس شخص کو جانتا ہوں اس کا نام اشرف ہے تعلیم یافتہ ہے لیکن نہ معلوم کس صدمے کی وجہ سے اس نے اپنی یہ حالت بنا رکھی ہے اس کی بیوی اور ایک لڑکی بھی تھی لیکن ان کا کہیں پتہ نہیں اور پھر تین روز قبل کی ملاقات [illegible] سنایا۔

[illegible] اشرف کو نہلا کر دوسرے کپڑے پہنائے گئے بال ترشوائے گئے اور ضروری دوائیں پلائی گئیں مسلسل چند روز کے علاج کے بعد اسکی حالت میں قدرے سکون پیدا ہوا اور اب ایسا ہونے لگا کہ [illegible] چہرہ بالکل اچھا رہتا اور ہوش کی باتیں کیا کرتا آہستہ آہستہ اسنے اپنی زندگی میں دلچسپی لینی شروع کر دی اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ اسکا دماغ صحیح ہو گیا ہے۔ آہ! میں اپنی اس غلطی کو کبھی نہیں بھول سکتا کہ ایک روز ذوق تجسس سے مجبور ہو کر میں نے باتوں باتوں میں اشرف سے اسکے حالات دریافت کئے۔ بہت دیر تک وہ اپنے دماغ پر زور دیکر سوچتا رہا۔ انداز سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ رہ رہ کر اسے واقعات یاد آتے جا رہے ہیں۔ کبھی کبھی اسکے چہرہ پر محبت کی نرمی کے آثار پیدا ہو جاتے اور اس وقت وہ بہت ہی [illegible] نظر آنے لگتا۔ اور کبھی چہرہ پر خشونت اور سختی [illegible] کو غور سے دیکھ رہا تھا کہ یکایک [illegible]۔

ناصر علی صاحب شاید دو ڈھائی ماہ قبل جمیل صاحب نے کلکتہ میں مجھ سے آپ کا تعارف کرایا تھا مجھے اس وقت ایف۔ اے پاس کئے ہوئے ایک سال ہو چکا تھا۔ لیکن ملازمت نہ ملنے کی وجہ سے میں پریشان رہتا تھا میں اپنی تعلیمی حالت اور آشناؤں کی وجہ سے کلکتہ میں کوئی معمولی ملازمت بھی نہ کر سکتا تھا اسی اثنا میں میری رفیقہ حیات انہیں فکروں میں گھل گھل کر بخار کے بہانے مجھ سے ہمیشہ کیلئے جدا ہو گئی اب مجھے بچہ کی پرورش اور اپنی ملازمت کی تلاش نے پاگل سا بنا دیا تھا آخر اسی فکر نے اپنے استقلال کو خیرباد کہنے پر مجبور کیا میں نے ایک دن جمیل صاحب سے اپنی ناکامی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ میں بمبئی جانا چاہتا ہوں انہوں نے از راہ ہمدردی بچہ کو اپنی سرپرستی میں لینا چاہا لیکن مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ جمیل صاحب کی محدود آمدنی اس کی متحمل نہیں ہو سکتی اس لئے میں نے انکار کر دیا لیکن انہوں نے بہت اصرار کیا تب میں نے ٹالنے کیلئے کہدیا کہ خیر فی الحال تو میں نہیں جاتا ہوں البتہ جاتے وقت آپکی سپردگی میں بچہ کو دے جاؤنگا لیکن گھر آتے ہی بمبئی جانیکی تیاری کر دی اور روانہ ہو گیا۔ اٹارسی کے اسٹیشن سے آگے ٹکٹ چیکر آیا اور مجھ سے ٹکٹ طلب کیا چونکہ میرے پاس ٹکٹ نہیں تھا اس لئے اس نے ہمیں اٹارسی پر اتار دیا اور ساتھ لے چلا میں نے راستے میں اس سے اپنی مصیبت بیان کی نہ جانے اس کے دل میں کیوں رحم آگیا اور اس نے ہم کو گاڑی میں بٹھا دیا اور کچھ دیر بعد ڈیوڑھ ٹکٹ لیکر آیا ٹکٹ کے ساتھ ہمیں چار روپے بھی دیئے جن کا میں شکریہ بھی ادا نہ کر سکا آخر ہم بمبئی پہنچے اور مسافر خانے میں ٹھیرے دوسرے دن سے میں ملازمت کی تلاش میں جانے لگا لیکن ہر جگہ ناکامی ہوتی رہی آخر کار میں نے چند سرمایہ داروں سے بچہ کی سرپرستی کیلئے التجا کی لیکن وہ بھی رد کر دی گئی

اب روپے بھی ختم ہو چکے تھے میں نے خیال کیا کہ نجمہ کو مشن میں داخل کر دوں اور پھر اپنا خدا مالک ہے لیکن اول تو میرے ضمیر نے گوارا نہ کیا دوسرے فیس نہ ادا ہونیکے خیال نے مجبور کر دیا تین روز کے فاقہ کے بعد میں نے سوچا کہ دستِ سوال دراز کرنا چاہیئے لیکن ضمیر ملامت کرنے لگا میں ہر صاحب اثر و دولت کے پاس گڑگڑا کر ملازمت کا ملتجی ہوا لیکن آہ !

میری التجائیں کسی کو بھی مجھ پر اور معصوم نجمہ پر مہربان نہ کر سکیں چوتھے روز رات کو نجمہ کو بہت بھوک لگی ہوئی تھی کل تک تو میں نجمہ کیلئے کچھ نہ کچھ کھانے کیلئے لا دیتا تھا لیکن اس روز وہ صبح سے بھوکی تھی دن میں اس نے کئی بار کھانیکا تقاضا کیا آخر شام کو مجبور ہو کر اس ارادے سے نکلا کہ دروازے دروازے بھیک مانگوں اور کسی طرح اپنا اور اپنی بچی کا پیٹ بھروں .... (دیر تک سوچتے رہنے کے بعد) مجھی اچھی طرح یاد نہیں آتا میرا حافظہ خراب ہو گیا ہے۔ کچھ دھندلا دھندلا سا خیال ہے کہ میں نے کسی دروازے پر جا کر سوال کیا تھا اور وہاں سے کھانے کی بجائے کچھ بہت ہی سخت جواب ملا تھا.......... اب اسکے بعد مجھے کچھ یاد نہیں آتا کہ کیا ہوا۔ کچھ یونہی سا خیال ہے مجھے بیحد غصہ آیا تھا اسکے بعد کے جو حالات مجھے یاد ہیں خدا نہ کرے کہ وہ صحیح ہوں !

(دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر) نہیں میں انہیں بیان نہیں کر سکتا !.......... انکے تو صرف تصور ہی سے میری روح کانپ اٹھتی ہے !.......... نہیں میں نے ایسا ہرگز نہیں کیا ! کوئی انسان ایسا کر سکتا ہے ! یہ سب دھوکا ہے۔ میرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ وہی مجھے دھوکا دے رہا ہے۔ ناصر صاحب میں نے ہرگز ایسا نہ کیا ہوگا !......

میں نے کسی قدر تسلی اور تشفی کی باتیں کیں اور یہ معلوم کرنے پر اصرار کیا کہ اسکے بعد کے وہ کیا حالات تھے جو اسے یاد آ رہے تھے۔

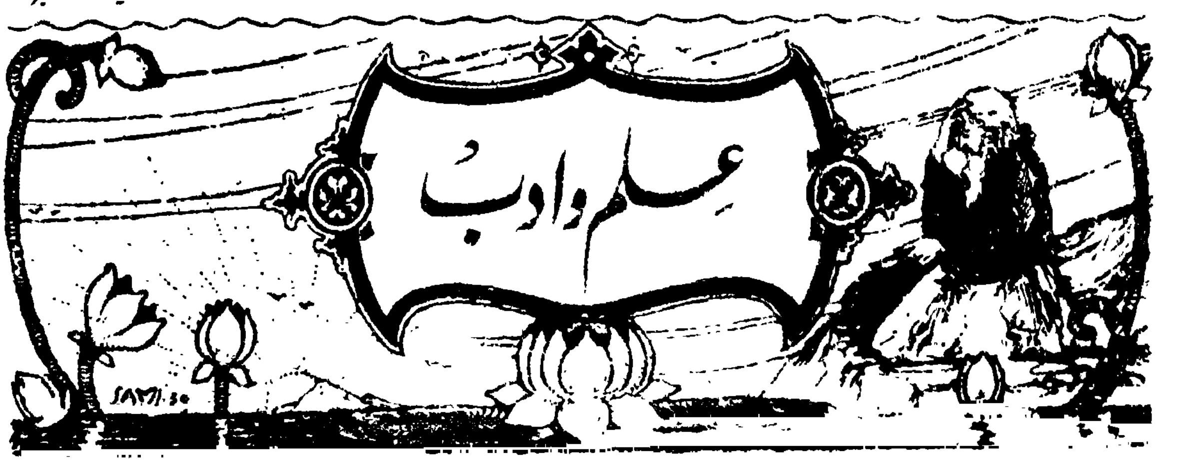
اسکا لہجہ اب کسی قدر سخت ہو چلا تھا، آنکھوں میں غیر معمولی سرخی آ گئی تھی، اور چہرہ کچھ ڈراؤنا سا معلوم ہونے لگا تھا۔ کڑک کر اسنے کہا:۔ بتا دوں ؟ سنو گے ؟ اچھا تو لو سنو ! (میرے کان کے قریب منہ لا کر آہستہ سے) میں نے نجمہ سے کہا کہ بیٹی یہاں تو کہیں روٹی نہیں ملتی، چلو باغ سے کیلے توڑ کر تمہیں کھلا دوں۔ وہ خوش ہو کر میرے سینے سے چمٹ گئی۔ (چہرہ پر پھر کچھ نرمی کے آثار پیدا ہوئے) وہ بیچاری بھوکی تھی تین برس کی بچی کی بساط ہی کیا !........ کم بخت کے تین فاقے گذر چکے تھے ! بڑی پیاری اور نیک بچی تھی، روئی بالکل نہیں ! بھوک کے مارے نڈھال ہو گئی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سو رہی ہے !........

اسکا چہرہ پھر بھیانک ہو گیا۔ لہجہ میں پھر سختی آ گئی۔ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر اسنے کہا۔

میں اسے ایک بالکل سنسان اور غیر آباد مقام پر لیگیا کیلے کھانے کے بہانے !...... کیلے کہاں رکھے تھے !...... زمین پر لٹا کر میں نے دونوں ہاتھوں سے اسکا گلا دبا دیا...... دانت بھینچ کر اور دونوں ہاتھوں سے میرا گلا دبا کر اسنے زور دیا تھا...... ایک چیخ اسکے منہ سے نکلی تھی، بس ایک چیخ ! پھر کچھ بھی نہ تھا......

.... ارے یہ کون ؟ ہائیں ! یہ نجمہ کہاں سے آ گئی ؟ کھڑی تو رہ مردار کھڑی تو رہ...... کھڑی تو رہ....... کھڑی تو رہ۔

میرا گلا اسنے چھوڑ دیا اور کھڑی تو رہ کھڑی تو رہ کہتا ہوا اس قدر تیز بھاگا کہ انتہائی کوششوں کے باوجود ہم میں سے کوئی اسے نہ پکڑ سکا۔ اس دن سے پھر اسے کسی نے نہیں دیکھا ہے۔ شاید سمندر کی مچھلیوں کے پیٹ میں آرام کر رہا ہو !!



کوئل

از جناب پنڈت اندرجیت صاحب شرما

(۱)

افسوں کوئی چھپا ہوا کوکو میں ہے تری
کیا ہے تری ادا سے عیاں شان دلبری
جو غمزدوں کے دل پہ گراتی ہے بجلیاں
برباد کرنے والی ہے جو خرمن اماں

(۲)

آموں کے وصل سے تجھے حاصل ہو وہ نشاط
لبریز شوق سے ہے ترا جام انبساط
میری نظر میں جس کی کوئی انتہا نہیں!
تیرے لبوں پہ شکوۂ جور و جفا نہیں

(۳)

بے چین تھی تو جن کے لئے کوہسار پر
سو سو ہیں ناز اب تجھے ان کی بہار پر
فرقت میں جنکی ہو گئی جل جل کے یوں سیاہ
ہے ایسی محو دید کہ اٹھتی نہیں نگاہ

(۴)

اپنا تو ہائے تجھ سا بھی کوئل نہیں نصیب
جو بات جانور کی ہے تقدیر سے قریب
تا زیست وصل یار کی مجھکو نہیں امید
انسان کی مگر وہی قسمت سے ہے بعید

افسانہ نگاری

(از سعید بریلوی)

یہ مضمون فی الحقیقت رسالہ "نیرنگ" کے لئے لکھا گیا تھا اور اس کا ایک حصہ اسکے افسانہ نمبر میں شائع بھی ہو چکا ہے۔ لیکن وقت کی کمی نے اس وقت تک مضمون کو پورا ہونے دیا اب جبکہ مکمل ہو گیا ہے تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سے قارئین "سعید" کی ضیافت طبع کا کام بھی لیلیا جائے

ایڈیٹر

نسل انسانی کو ہمیشہ ترقی کی جانب مائل رکھنے کیلئے فیاض اور مہربان قدرت نے یہ انتظام کیا ہے کہ اس کے دل میں دو عجیب شوق پیدا کر دیئے ہیں پیدائشی مجنونوں کے سوا اور کوئی انسانی بچہ ایسا پیدا نہیں ہوتا جس کے دل میں ہر چیز کی اصلیت معلوم کرنے اور دوسرے انسانوں کے کارنامے سننے کا شوق موجود نہ ہو تحقیق اور تجسس کا شوق برابر اسکے علم میں اضافہ کرتا رہتا ہے شفیق والدین مہربان استاد اور دلسوز رفیقوں کی مدد سے روزمرہ اسے دنیا کی کسی نہ کسی چیز سے متعلق نئی واقفیت بہم پہنچ جاتی ہے۔ دوسروں کے حالات اور دوسروں کے کارنامے سن سن کر اسکے قوائے عمل میں ہیجان پیدا ہوتا ہے اور ایک نامعلوم خواہش اندر سے اسے اس بات پر ابھارتی ہے کہ دوسروں کے جو حالات سنے ہیں انہی کے مطابق اپنی زندگی کو بھی ڈھال لے اور دنیا میں رہ کر خود بھی کچھ ایسے کام کرے کہ جنہیں دوسرے اسی قدر حیرت اور استعجاب سے سنیں کہ جس طرح وہ دوسروں کے قصے سنتا رہا ہے۔

ممکن ہے کہ اس قسم کے شوق ہماری طبیعتوں میں ودیعت کرنے سے قدرت کا کچھ اور ہی منشا ہو۔ لیکن بظاہر جو فائدہ ہمیں نظر آتا ہے وہ یہی ہے کہ ایک کے ذریعہ سے ہماری معلومات میں ترقی ہوتی رہتی ہے، اور دوسرا شوق ہمیں ہر وقت اچھے اور بڑے بڑے کام کرنے پر ابھارتا رہتا ہے اور اکثر اس وقت تک ہمیں چین سے نہیں بیٹھنے دیتا جب تک کہ اپنے علم اور اپنی استعداد کے لایق ہم کوئی بڑا کام نہ کر گذریں۔

یہ قدرت کا عطا کیا ہوا وہ شوق ہے جو رات کو سونے سے پہلے ہر بچے کو اس وقت تک بیقرار رکھتا ہے کہ جبتک ماں بہن یا انا کوئی کہانی شروع نہ کر دے۔ اور بچوں کی نفسیات کے ماہر یہ دیکھکر کس قدر حیرت میں رہ جاتے ہیں کہ ادھر ماں کی زبان سے یہ فقرہ نکلا کہ "ایک بادشاہ تھا اسکے اولاد نہیں ہوتی تھی" اور ادھر وہی ضدی اور سکون ناآشنا بچہ کہ جو برابر روئے اور مچلے چلا جا رہا تھا ایکدم سے ساکت و صامت ہو کر انتہائی غور و توجہ کے ساتھ اس کہانی کو سننے لگتا ہے کہ جو ماں نے شروع کی ہے۔

قصے کہانیاں سننے کا شوق بچپن کی عمر تک محدود نہیں رہتا بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ عمر کے ساتھ ساتھ اسوقت تک برابر ترقی کرتا رہتا ہے کہ جبتک جسم میں قوت عمل باقی ہے

اور شاید یہی وجہ ہے کہ نوجوانی میں ہر شخص کو افسانے سننے کی خواہش سب سے زیادہ ہوتی ہے جبکہ قوت عمل جسم میں پورے جوش پر ہوتی ہے اور جبکہ انسان گھنٹوں اور پہروں مسلسل کام کرنے کے باوجود تکان محسوس نہیں کرتا۔

افسانوں کو ایک لغو اور بیکار چیز خیال کرنیوالے اور اس قسم کے ادب لطیف کے مطالعہ کو تضیع اوقات سمجھنے والے درحقیقت افسانے کی صحیح قدر و قیمت سے واقف ہی نہیں ہیں ورنہ انہیں معلوم ہوتا کہ قوموں اور قوموں کی سیرت کی تعمیر میں افسانوں کو بہت ہی بڑا دخل ہے۔ تاریخ آخر اور کیا چیز ہے وہ بھی تو واقعات کا قصہ یا افسانہ ہی ہے جس میں کسی ایک بڑے آدمی کے یا چند بڑے بڑے آدمیوں کے واقعات زندگی ایک مجموعی صورت میں مرتب کر دیئے گئے ہیں۔ ایک عادل بادشاہ کے عدل، ایک جنگجو فرمانروا کی خونریزی، ایک بہادر شجاع حکمران کی فتح اور ایک ظالم و جابر شہنشاہ کے ظلم و ستم کی داستان کا نام تاریخ ہے اور کیا ہوتا ہے اور اگر اسے ہم مفید اور کارآمد علوم کی فہرست میں داخل کرتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ افسانوں کو اس فہرست سے خارج کر دیا جائے تاریخ اور افسانے میں اگر کوئی فرق ہے تو صرف یہی ہے کہ تاریخ اکثر و بیشتر بادشاہوں اور بادشاہوں کے امیروں کے حالات زندگی تک محدود ہوتی ہے اور خواہ فی الحقیقت وہ صحیح اور سچے ہوں یا نہ ہوں لیکن انکے متعلق یہ خیال ضرور ہے کہ وہ صحیح ہوتے ہیں افسانے کیلئے شہریاری اور جہانداری کی کوئی حد نہیں ہے اس میں عام شہریوں کے حالات زندگی بیان کئے جاتے ہیں لیکن حقیقت اور واقعیت سے انہیں کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ بادشاہوں اور ان کے امراء سلطنت کی زندگیاں ہمارے لئے نمونہ کا کام نہیں دے سکتیں کیونکہ ہم میں فی لاکھ ایک آدمی بھی اتنا خوش قسمت نہیں ہوتا کہ ایسے مناصب و مراتب جلیلہ تک پہنچ سکے اس لئے بلا اندیشہ تردید کہا جا سکتا ہے کہ ہماری زندگیوں پر تاریخ سے بھی زیادہ جس چیز کا اثر پڑ سکتا ہے وہ تمثیل یعنی ڈرامہ اور افسانے ہیں۔

یہ تسلیم کر لینے کے بعد کہ افسانے ہماری زندگیوں کی تعمیر میں اس قدر اہم حصہ لیتے ہیں۔ ہمیں مجبوراً یہ ماننا پڑے گا کہ افسانہ نگار اگر افسانہ لکھتے وقت کوئی اچھا مقصد پیش نظر رکھے تو اسکا افسانہ ان افسانوں سے ضرور بہتر ہوگا کہ جن کا کوئی خاص مقصد نہ ہو۔ حسن اور عشق کی داستانیں بیحد دلکش اور بہت ہی دلچسپ ہوا کرتی ہیں لیکن اگر ہم اپنے افسانوں کو صرف ایک نوجوان لڑکے اور ایک نوخیز لڑکی کی باہمی محبت کے تذکرے پر ختم کر دیں تو ظاہر ہے کہ پڑھنے والے کو اس سے تھوڑی سی ہنگامی تفریح یا جذبات جوانی میں خفیف سے ہیجان کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ لیکن۔ ایک مجنوں اور ایک لیلیٰ کے اسی قصے میں اگر ہم اخلاق کی بلندی اور سیرت کی مضبوطی کے بھی چند واقعات خوبصورتی کے ساتھ بیان کر جائیں تو پڑھنے والوں کو اس سے بہت کچھ فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ انسانی طبیعت کا یہ خاصہ ہے کہ کوئی قصہ سنتے یا پڑھتے وقت ہمیں لازمی طور پر اس کے ہیرو سے محبت اور ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے اسکی ہر کامیابی اور فتحمندی سے ہم خوش ہوتے ہیں اور اسکی ہر مصیبت اور تکلیف ہمیں بے چین کر دیتی ہے انسانی طبیعت کے اس خاصہ سے یا یوں کہہ لیجئے کہ ہمارے قلب کی اس کمزوری سے افسانہ نگار بہت کچھ فائدہ اٹھا سکتا ہے اور تلقین و وعظ کے ناخوشگوار طریقے اختیار کئے بغیر اپنے ہیرو کے ذریعہ سے ہمارے اخلاق میں عظیم الشان تبدیلیاں پیدا کر سکتا ہے۔

افسانے کیلئے "مقصد افسانہ" لازمی سمجھ لینے کے بعد، اب ایک نظر ان اجزا پر بھی ڈال لینے کی ضرورت ہو کہ جن سے افسانے کی عمارت تعمیر ہوا کرتی ہو۔ ظاہر ہے کہ ایک افسانہ لکھنے کیلئے سب سے پہلے جس چیز کی ضرورت ہے وہ کسی نہ کسی قسم کے واقعات اور حادثات ہیں تاوقتیکہ ہمارے پاس کچھ واقعات بیان کرنے کیلئے موجود نہ ہوں ہم کسی طرح بھی کوئی ایسی چیز نہیں لکھ سکتے کہ جسے افسانہ کہا جا سکے۔ حادثات اور واقعات کا ذکر کرنے کے لئے یہ بھی لازمی اور ضروری ہو کہ ہم چند آدمیوں کا بھی ذکر کریں کیونکہ بہرحال واقعات اور حادثات انسانی افعال و اعمال ہی کا نتیجہ ہوتے ہیں، اور اگر وہ ارضی وسماوی آفات بھی ہوں تب بھی ایسے چند انسانوں کی ضرورت باقی رہتی ہے کہ جن پر یہ آفات نازل ہوئی ہوں اس کے یہ معنی ہیں کہ افسانے کیلئے دوسری لازمی چیز چند ایسے انسان ہیں کہ جنکا ذکر افسانے میں ہو اور جنہیں "رجال افسانہ" کہا جاتا ہو۔ حادثات اور واقعات کے پیش آنے کیلئے یہ بھی ضروری ہو کہ وہ کسی خاص وقت میں اور کسی خاص مقام پر پیش آئیں اس لئے موسم اور مناظر کی ضرورت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا اور جس طرح کسی افسانے کی تکمیل کیلئے یہ اجزائے ترکیبی ضروری ہیں اسی طرح بلکہ اس سے بھی کسی قدر زیادہ ضروری وہ سلیقہ یا اسلوب بیان ہو۔ کہ جو ان مفرد اجزا کو باہم ترکیب دیکر ایک خوش ذائقہ اور مفید معجون تیار کیا کرتا ہو

میں اوپر یہ کہہ چکا ہوں کہ ہر افسانے کا کچھ نہ کچھ مقصد ضرور ہونا چاہئے لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اگر کوئی عمدہ افسانہ کسی خاص مقصد کو پیش نظر رکھے بغیر لکھا گیا ہو تو اسے صرف اسی ایک کمی کی وجہ سے مسترد کر دیا جائے کیونکہ افسانوں کی ایک بہت ہی بڑی غرض تفریح طبع ہوتی ہو۔ اور جس وقت کہ دنیا کے دھندوں سے تھک کر ہم اپنے دماغ کو آرام اور سکون دینے کی خاطر لیٹیں اس وقت اگر کوئی ایسا دلچسپ افسانہ ہماری نظر سے گزرے کہ جو ہماری تمام تر توجہ اپنی طرف منعطف کرلے اور واقعات کی دلاویزی یا اسلوب بیان کی شگفتگی وظرافت کے ذریعہ سے ہمارے دماغ کیلئے راحت ومسرت کا کافی سامان مہیا کرے تو یقیناً یہ بھی ایک بہت ہی بڑی خدمت ہے اور ایسے مونس ورفیق کو کسی طرح بھی برا نہیں کہا جا سکتا اس کے علاوہ یہ بھی ہو کہ اس قسم کے افسانوں میں بھی کہ جو کسی خاص مقصد کو پیش نظر رکھے بغیر لکھے گئے ہوں ضمناً بہت سی ایسی باتیں آجاتی ہیں جو بڑی کافی حد تک سبق آموز ہوتی ہیں اور اس طرح مصنف کے ارادہ کے بغیر بھی افسانہ سے وہی غرض پوری ہو جاتی ہو۔

اردو کے مشہور افسانوں میں بیشتر اسی قسم کے افسانے ہیں کہ جنکا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو کہ تھکے ہوئے دماغوں کیلئے تھوڑی سی ہنگامی تفریح کا سامان مہیا کرکے انہیں پھر تروتازہ کردیں، اور شاہی درباروں، اور امرا کی مجلسوں میں تو ماہر فن داستان گو رکھے ہی اس لئے جاتے تھے کہ دلچسپ قصوں اور کہانیوں کے ذریعہ سے امرا کا دل بہلائیں اور ان کے دماغوں کو افکار کے بوجھ سے اس حد تک ہلکا کردیں کہ انہیں بہ آسانی نیند آجائے۔ بوستان خیال اور داستان امیر حمزہ۔ یا چہار درویش اور فسانہ عجائب گو بظاہر ہمیں خرافات وہزلیات کا ایک انبار عظیم نظر آئیں لیکن ان کی افادیت سے کسی طرح انکار نہیں کیا جا سکتا اور جہاں ہمیں انہیں دیو اور پری اور جادو اور طلسم کی لایعنی اور مہمل داستانیں ملتی ہیں وہیں کچھ باتیں ایسی بھی ضرور معلوم ہو جاتی ہیں کہ جنہیں ہم اپنی معلومات میں مفید اضافہ خیال کرنے پر مجبور ہیں۔

آہستہ آہستہ اب اردو کی افسانہ نگاری کا طرز بدل رہا ہے
اور مولانا عبدالحلیم شرر، حکیم محمد علی خاں، پنڈت رتن ناتھ سرشار
اور انہی کی طرز کے دوسرے افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں
میں اس امر کا کافی لحاظ رکھا ہے کہ جو کچھ لکھیں کسی نہ کسی مقصد
کو سامنے رکھ کر لکھیں، اور مولانا نذیر احمد اور علامہ راشد الخیری
تو بنات النعش، مراۃ العروس، اور صبح زندگی اور شام زندگی
وغیرہ لکھ کر قوم پر ایک بہت ہی بڑا احسان کیا ہے

دور حاضرہ کے مصنفین عام طور پر مختصر افسانہ نگاری کی طرف
زیادہ مائل ہیں، اور منشی پریم چند، سدرشن، سید سجاد حیدر
یلدرم، سید سلطان حیدر، جوش اور بعض دیگر مصنفین نے اس
صنف خاص میں نہایت ہی عمدہ اور گرانقدر نمونے ہمارے
سامنے پیش کئے ہیں انداز بتا رہے ہیں کہ اگر اسی طرح کوشش
جاری رہی اور اخبارات و رسائل نے ہر رطب و یابس کو کہ
جو ان کے پاس افسانے کے نام سے بھیجا جائے اشاعت
دینے سے احتراز کیا تو شاید جلد وہ وقت آجائے کہ کم از کم مختصر
افسانوں کا ایک قابل فخر ذخیرہ اردو میں جمع ہو جائیگا۔

افسانے کے اجزائے ترکیبی کا ذکر کرتے وقت میں نے سب سے
پہلے "واقعات" کا ذکر کیا تھا کسی افسانے کے واقعات سے
مراد ایسے واقعات نہیں ہوتے کہ جو فی الحقیقت کہیں رونما
ہوئے ہوں، بلکہ اُن سے مراد صرف وہ فرضی اور قیاسی
حالات ہیں کہ جنہیں ایک افسانہ نگار خوبصورتی کے ساتھ
ترتیب دیکر ہمارے سامنے اس طرح پیش کرتا ہے کہ گویا وہ
سچ مچ کے واقعات ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ فرضی واقعات ہیں
صرف اسی صورت میں حقیقی معلوم ہو سکتے ہیں، اور اُن کے
پڑھنے میں ہمیں صرف اسی حالت میں لطف آسکتا ہے کہ
جب وہ حقیقت سے بالکل قریب ہوں۔ نقل کی سب سے
بڑی خوبی یہی ہوتی ہے کہ وہ مطابق اصل ہو، اور کسی افسانے
کا پلاٹ صرف اسی وقت اچھا کہا جاسکتا ہے کہ جب تمام
واقعات بالکل اسی طرح ظہور پذیر ہوتے چلے جائیں کہ جس طرح
روزمرہ دنیا میں ہماری آنکھوں کے سامنے ہوا کرتے ہیں۔
افسانے میں ہم ایسے واقعات بھی بیان کرسکتے ہیں کہ جو بالکل
ہی اور ایک حد تک پست اور ادنیٰ درجہ کے ہوں، اور
ایسے واقعات کا تذکرہ بھی ممکن ہے کہ جنکا تعلق اعلیٰ جذبات، اعلیٰ
خیالات، اور اعلیٰ اخلاق سے ہو، اور ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ
ادنیٰ درجہ کے واقعات کے مقابلے میں ہمیشہ وہی واقعات
زیادہ پسندیدہ اور مرغوب ہونگے کہ جنکا تعلق اعلیٰ جذبات
انسانی سے ہے، اگرچہ یہ ممکن ہے کہ بعض سطحی اور ادنیٰ درجہ
کے واقعات بھی دلآویزی اور دلچسپی میں ارفع اور اعلیٰ واقعات
سے بڑھ جائیں۔ اور اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جہاں تک کسی
افسانے کے واقعات کا تعلق ہے ہم انکی دلچسپی کو نظر انداز
نہیں کرسکتے، اور ایک ایسے افسانے کو کہ جس کے واقعات
بلند تر ہوں ایک ایسے افسانے پر کہ جسکے واقعات ادنیٰ مگر زیادہ دلچسپ ہیں صرف اسی
بنا پر ترجیح نہیں دے سکتے۔ قابل ترجیح اور قابل تعریف وہی افسانہ ہوسکتا ہے
کہ جس کا پلاٹ بلند بھی ہو اور دلچسپ بھی۔

افسانے کے واقعات کے ضمن میں اس قدر اور بھی عرض
کردینا ضروری ہے کہ وہی واقعات اگر حسن و خوبی کے ساتھ ترتیب
دیئے جائیں تو ان کی دلکشی بہت زیادہ ہو جاتی ہے اور انہی
واقعات کو اگر بھوہڑپن کے ساتھ یکجا کر دیا جائے تو انکا سارا
لطف جاتا رہتا ہے، اسلئے کہا جاسکتا ہے کہ ایک پلاٹ کی
عمدگی بہت کچھ اسلوب بیان اور حسن ترتیب پر منحصر ہے اور

ایں سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

افسانے کے اجزائے ترکیبی میں دوسرا ضروری جزو "رجال افسانہ" ہوتے ہیں یعنی وہ لوگ کہ جو اس افسانے میں کچھ کام کریں یا جن پر کچھ افتادیں پڑیں، یا بہ الفاظ دیگر یوں سمجھ لیجئے کہ وہ لوگ کہ جنکا ذکر افسانے میں کیا جائے۔ ایک افسانہ نگار کے لئے اس سے زیادہ دشوار اور دقت طلب اور کوئی کام نہیں ہے کہ وہ اپنے رجال کو ٹھیک اسی صورت میں ہمارے سامنے پیش کرے کہ جس صورت میں معمولاً ہم انہیں روزمرہ کی زندگی میں دیکھنے کے عادی ہیں فی صدی ستر اور اسی افسانوں میں یہ نقص موجود ہوتا ہے کہ رجال افسانہ کو پیش کرتے وقت مصنف اس بات کو بالکل بھول جاتا ہے کہ جو حالات یا واقعات جس شخص سے متعلق وہ لکھ رہا ہے وہ اسکی حیثیت، لیاقت، عمر، اور قومیت کے مطابق و مناسب ہیں بھی یا نہیں۔ ایک مغربی دوشیزہ میں ہندوستانی شرم و حیا کی ادائیں، ایک دہقانی انسان میں شہری تکلفات، ایک میر کبیر کی اپنے ملازموں یا اور کم مرتبہ لوگوں سے گھلی ملی باتیں، اور اسی نوعیت کی اور صدہا باتیں ہیں جو عام طور پر افسانوں میں دیکھنے میں آتی رہتی ہیں اور جنسے افسانہ کا تمام لطف جاتا رہتا ہے

"رجال افسانہ" کو ٹھیک حالت اور صورت میں پیش کرنے کے لئے جہاں فطرت سلیم اور ذوق صحیح کی ضرورت ہے وہاں دنیا اور دنیا کے لوگوں کے حالات سے کافی واقفیت بھی اسی قدر ضروری ہے اور اس علم کے بغیر کوئی افسانہ نگار سلیقہ مندی کے ساتھ اپنے رجال کو پیش نہیں کرسکتا۔

ایک مصنف جو کبھی افریقہ نہیں گیا ہے اور نہ وہاں کے لوگوں کی بود و باش کے طریقوں سے واقف ہے اگر اپنے افسانہ میں افریقیوں کے حالات لکھیگا تو ناممکن کہ اس سے چھوٹی موٹی صدہا فروگذاشتیں نہ ہوجائیں جنہیں پڑھکر واقف حالات لوگوں کو ہنسی آجائے اور افسانہ کا سارا لطف ہی جاتا رہے۔ صحرائے افریقہ میں کسی دریا کی روانی کا ذکر، انگلستان اور فرانس کے نوابوں کے دروازوں پر ہاتھیوں کا جھومنا، چینی یا جاپانی دولہا کا سہرا باندھکر اور گھوڑے پر چڑھکر دولہن کے گھر جانا، امریکا میں بادشاہ کا کسی جلاد کو کسی مجرم کے قتل کا حکم دینا، یہ اور اسی قسم کی ہزارہا اور باتیں ہیں جو بظاہر بالکل غیر اہم اور اصل افسانہ سے غیر متعلق معلوم ہوتی ہوں لیکن انکی اہمیت افسانے .. کا تمام لطف کو کھو دیتی ہے۔ حال ہی میں ایک افسانہ میری نظر سے گذرا جو انگریزی سے ترجمہ کیا گیا تھا۔ اس میں خدا جانے اصل مصنف نے یہ غلطی کی تھی یا مترجم صاحب نے اصلاح دی تھی، بہرحال اس میں لکھا تھا کہ "مادام وکٹوریا لافرکیڈ ایک نوجوان فرانسیسی دوشیزہ تھی"

مترجم کا لفظ "(MADAME)" کو "مادام" لکھنا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ فرانسیسی زبان سے کچھ نہ کچھ واقفیت ضرور رکھتے ہیں ورنہ وہ اسے "مادام" لکھنے کی بجائے "میڈم" لکھتے جیسا کہ انگریزی قاعدہ کے مطابق اسکا تلفظ ہوسکتا ہے، لیکن اسکے بعد فوراً ہی جب یہ الفاظ نظر سے گذرتے ہیں کہ وہ "ایک نوجوان فرانسیسی دوشیزہ تھی" تو سارا مزہ کرکرا ہوجاتا ہے اور مصنف یا مترجم کی اس ناواقفیت پر ہنسی آجاتی ہے کہ اس نے ایک دوشیزہ کے نام کے ساتھ "مادام" کا لفظ

استعمال کیا ہے کیونکہ فرانسیسی زبان میں یہ لفظ صرف شادی شدہ عورتوں کے لئے مخصوص ہے اور کنواری لڑکیوں کے نام کیساتھ "مادموازیل" (MADEMOISELLE) استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ ایک بہت ہی حقیر سی فروگذاشت ہے لیکن پڑھنے والا اگر خود فرانسیسی زبان کے آداب تخاطب سے واقف ہو تو اسکے لئے باقی ماندہ افسانہ کو پڑھنا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ یہ بالکل اسی قسم کی غلطی ہے کہ جیسے کوئی یہ لکھے کہ "مس براؤن کی شادی کو اب پانچ سال گذر چکے تھے" یا "مسز احمد کی عمر اگرچہ چھبیس سال کی ہو چکی تھی لیکن ابھی تک کنواری تھی۔"

افسانے کے اہم اجزائے ترکیبی میں تیسرا جزو مناظر اور موسم ہیں، اور انکے متعلق بھی بعض بہت ہی دلچسپ غلطیاں نظر سے گذرتی رہتی ہیں۔ کمزور حافظہ والے مصنف دسمبر کے مہینے یا سردی کے موسم کا ذکر کر چکنے کے بعد تھوڑی ہی سی دور آگے چلکر بلاتکلف پنکھوں کا باریک لباس کا برفاب کا یا ایسے پھلوں کا کہ جو گرمی کے موسم کے ساتھ مخصوص ہیں تذکرہ فرما دیتے ہیں، لیکن بدقسمتی سے افسانہ پڑھنے والوں کا حافظہ اس قدر کمزور نہیں ہوتا خواہ وہ کسی یونیورسٹی کے طالبعلم ہی کیوں نہوں، اسلئے اس فروگذاشت پر ان کی نظر پڑتی ہے اور وہ کسی قدر کراہت اور نفرت کے ساتھ اس کتاب یا افسانے کو اگر ردی کی ٹوکری میں نہیں تو کم از کم میز کے بعید ترین گوشے تک ضرور پھینک دیتے ہیں۔ وقت کے متعلق اس قسم کی غلطیاں بھی کوئی بہت عجیب چیز نہیں ہیں کہ ابھی ابھی مصنف صاحب نے کسی ضرورت سے ہمیں یہ بتایا ہے کہ آدھی رات کا وقت تھا اور ابھی ذرا دیر میں جب انہیں یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ افسانے کے ہیرو کی جفاکشی اور مصیبت دکھانے کیلئے اس کا چلچلاتی دھوپ میں سفر کرنا، اور اسکی ہر بن مو سے پسینہ جاری ہونے کا ذکر کریں تو وہ بلاتکلف لکھ مارتے ہیں کہ "آسمان کسی مومن کے دل کی طرح بالکل صاف اور شفاف تھا اور دوپہر کے سورج کی تیز کرنیں جلتی ہوئی لوہے کی سلاخوں کی طرح دماغ کے اندر گھسی جا رہی تھیں۔"

مناظر کے متعلق بھی بدمذاقیوں کے بہت سے ثبوت رات دن ملتے رہتے ہیں، اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک نہایت ہی دلچسپ اور اچھا افسانہ صرف اتنی سی بات کی وجہ سے پھیکا اور بدمزہ ہو جاتا ہے کہ مصنف نے اپنی تشبیہات کی جدت اور استعارات کی ندرت دکھانے کیلئے مناظر کا ذکر اس قدر طویل کر دیا کہ پڑھنے والے کو اس میں الجھ کر اصل افسانہ کا سلسلہ ہی یاد نہ رہا۔ بوستان خیال، داستان امیر حمزہ، اور نئے افسانوں میں حکیم محمد علی خاں مرحوم کے ناول اس قسم کی افراط کی بہترین مثالیں ہیں۔ اگر قصہ دلچسپ ہے تو کوئی پڑھنے والا اسے گوارا نہیں کر سکتا کہ مصنف صاحب کا زور قلم دیکھنے کیلئے وہ اپنا تمام لطف کھودے، اسلئے وہ باطمینان تمام اس ایک صفحے یا ایک ورق کو ایک قلم چھوڑ دیتا ہے جو مصنف نے صرف اتنی سی بات کے بتانے میں سیاہ کیا ہے کہ صبح کا سہانا سماں تھا، چڑیاں چہچہا رہی تھیں، اور باد نسیم کے خوشگوار جھونکے دل و دماغ کو تازہ کئے دیتے تھے۔

اردو افسانوں میں مناظر کا تذکرہ ایک حد تک نئی چیز ہے اور آجکل کے ناولوں میں جس طریق پر ان چیزوں کو بیان کیا جاتا ہے وہ خالصتہً مغربی ہے۔ پرانے زمانہ کے افسانوں میں بھی مناظر کا ذکر ہوتا تھا لیکن بالعموم قدرتی اشیاء سے کوئی واسطہ نہ رکھا جاتا تھا کہیں بادشاہوں کی سواری کے جلوس کے

تذکرے ہوتے تھے، کہیں شہر کے چراغاں کئے جانے کا حال ہوتا تھا، کہیں صحن باغ میں شہزادیوں اور انکی حسین وخوش رو کنیزوں کی گل گشت کا اور کہیں شاہی دسترخوان کا کہ جس پر کھانوں کی مختلف قسموں کی تعداد بسااوقات سو سے بھی اوپر پہونچ جاتی تھی۔

افراط خواہ قدرتی مناظر کی ہو یا غیر قدرتی کی بہرصورت وبہرحال ذوق سلیم کیلئے ایک ناخوشگوار بوجھ ہے اور کسی ایسے مقام پر کہ جہاں قصہ کی دلچسپی ہمیں مجبور کر رہی ہو کہ جلد سے جلد انجام معلوم کریں اگر اس قسم کے طویل تذکروں سے سابقہ پڑ جاتا ہے تو وہ فی الحقیقت ایک ناخوشگوار بوجھ ہی نہیں بلکہ سخت ترین مصیبت ہی معلوم ہوتے ہیں۔ بالکل اسی طرح کسی افسانے کا مناظر کے ذکر سے بالکل خالی ہونا بھی کوئی پسندیدہ بات نہیں ہے۔ مناظر کے متعلق کچھ کہے بغیر بھی ایک افسانہ مکمل ہو سکتا ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک بڑی حد تک اسکی دلکشی اور دلاویزی میں فرق نہ آنے لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ مناسب موقعوں پر ایک مناسب حد تک مناظر کا ذکر کرکے ہم افسانوں کی دلچسپی میں کئی گنا اضافہ کر سکتے ہیں۔

افسانے میں بہت سے موقعہ ایسے آتے ہیں کہ جہاں ہم مناظر کا ذکر کئے بغیر وہ اثر کسی طرح پیدا کر ہی نہیں سکتے جو ہم چاہتے ہیں اور یہی وہ موقع ہوتے ہیں کہ جہاں ہم صرف منظر کی تاریکی یا خوشنائی اور اسی یا دل آویزی اور ڈراونا پن یا شگفتگی وغیرہ کا ذرا سا ذکر کرکے اپنے افسانے کے پڑھنے والے کی طبیعت میں نامعلوم طریقہ پر رنج وغم، شگفتگی وانبساط، یا خوف وہراس کے جذبات پیدا کر دیتے ہیں تاکہ اسکا دل اُن اثرات کو زیادہ سے زیادہ قبول کر سکے جواب ہم کسی دردانگیز یا فرحت بخش واقعہ کا ذکر کرکے پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ افسانہ پڑھنے والوں کے تخیل اور احساسات کو اپنے ساتھ ساتھ لے چلنے کا یہ بہترین طریقہ ہے اور ایک افسانہ کی اثر اندازی بہت کچھ اسی پر منحصر ہے۔

اس سے پہلے بھی میں افسانہ کے مختلف اجزاء کے ذکر میں یہ لکھ چکا ہوں کہ افسانے کے ہر جزو کو سلیقہ مندی کے ساتھ افسانے کے اندر شامل کرنا تمامہ اس استعداد اور قابلیت پر منحصر ہے جو خداداد ہوتی ہے اور جسے ہم عام طور پر ذوق سلیم یا مذاق صحیح کہا کرتے ہیں، اور اب پھر اس مضمون کو ختم کرنے سے پہلے کہنا چاہتا ہوں کہ ایک صحیح المذاق شخص کو افسانہ نگاری کے قواعد وغیرہ معلوم کرنے کی بہت ہی کم ضرورت ہوتی ہے۔ اسکے مذاق کی صحت اس سے بالعموم وہی چیزیں لکھواتی ہے کہ جو مناسب اور درست ہیں، اور ایک بدمذاق شخص صدہا قاعدے اور ضابطے جان لینے کے باوجود بھی کبھی ایک کامیاب افسانہ نگار نہیں بن سکتا۔

مرے ولولوں میں کمی نہ ہو، مری شوخیوں کو سکون نہ ہو!

(از حضرت مولانا وحید الدین صاحب سلیم پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ)

مرے دل میں اٹھتے ہیں ولولے کہ ہوں کاش یاد بہار میں
کبھی غنچے پر ہو مرا گذر، کبھی پھول سے ہوں دوچار میں
کبھی گلشنوں کو بتاؤں میں وہ جو ضابطے ہیں سنگھار کے
کبھی بلبلوں کو سکھاؤں میں وہ جو مزے ہیں بہار کے
کبھی بادلوں کو اڑاؤں میں کبھی پانیوں کو نچاؤں میں
کبھی راگ عیش کے گاؤں میں کبھی آپے سے جدمیں آؤں میں
کبھی جاؤں دامن کوہ میں کبھی وادیوں میں مگن پھروں
کبھی گشت دشت میں ہو مرا کبھی سوئے صحن چمن پھروں
جو کسی علاج سے دب سکے مجھے ایسا جوش جنوں نہ ہو
مرے ولولوں میں کمی نہ ہو، مری شوخیوں کو سکوں نہ ہو
ہے خلاف طبع مرے لئے کہ رہوں حجاب میں بند میں
کروں کیوں نہ نغمہ حریت سر رہگزر پہ بلند میں

جنگجو ہندوستان کو آخری پیام

از حضرت محمود اسرائیلی

تجھکو غرض ہی کیا کہ تو انس کا اب پیام لے رسم وفا کو ترک کر، جور و جفا سے کام لے
دشمن صلح و امن ہے، درس فنا مدام لے تجھکو قسم ہے اب کہ تو میرا زبان سے نام لے
ہوتا ہوں میں کنارہ کش، ہند میرا سلام لے

کیوں نہ کہوں میں صاف صاف، فائدہ عذر لنگ سے کچھ تری تشنگی فزوں ہوگئی آب گنگ سے
تشنۂ خوں ہوا ہے تو، ذوق ہی تجھکو جنگ سے تیغ برہنہ کو اٹھا، خنجر بے نیام لے
ہوتا ہوں میں کنارہ کش ہند میرا سلام لے

اپنے چراغ بزم کو تو نے ہی خود بجھا دیا! اپنا وہ باغ جانفزا خاک میں خود ملا دیا
میکدۂ نشاط کو تو نے ہی خود مٹا دیا اب یہ بتا کہ بادہ کش تیرا کہاں ہو جام لے
ہوتا ہوں میں کنارہ کش ہند میرا سلام لے

دامن گل تھے جسقدر کشتوں کے وہ کفن بنے اب وہ بہار ہی کہاں جس سے کوئی چمن بنے
اب وہ خصوصیت کہاں جس سے کہ تو وطن بنے اپنے نیاز مند کا آخری یہ پیام لے
ہوتا ہوں میں کنارہ کش، ہند میرا سلام لے

ہائے کیا پیغام دیتا ہے سکونِ دل مجھے!

(از جناب پروفیسر اکبر حیدری)

پھر سرِ دامن نظر آتا ہے اپنا دل مجھے
سر اٹھانے دے ذرا اے سعیِ لاحاصل مجھے

اک نگاہِ مست کو دلجوئی کی تکلیف دی
واہ کس انداز سے بخشا ہے تم نے دل مجھے

خضر سے نا آشنا ہے جادۂ مرگ و عدم
آہ طے کرنی پڑی ہے کونسی منزل مجھے

کیا خبر ہوتا ہوں میں کس ہوشیاری میں مگر
دیکھنے والے سمجھ لیتے ہیں جب غافل مجھے

چھوڑ دیتا ہوں میں ہر تکلیف کو تقدیر پہ
کس قدر آساں ہے ہر عقدۂ مشکل مجھے

تشنۂ تکمیل ہمت اور طوفان بلا!
کیا قیامت ہے نظر آتا ہے کیوں ساحل مجھے

دوستوں نے دشمنوں کے جور کی تائید کی
کردیا تدبیر نے تقدیر کا قائل مجھے

جنبشیں ہلکی سی ہیں کچھ نبض کی رفتار میں
ہائے کیا پیغام دیتا ہے سکونِ دل مجھے

یہ اولوالعزمی، یہ استقلال، یہ ہمت یہ جوش
کیا دیا تقدیر نے اکبر بہ شکلِ دل مجھے

"تسکین کا پیغام"

از حضرت صفر شاہجہاں پوری

دل کی رگ رگ کھنچ رہی تھی نزع کا ہنگام تھا
صورت شمع سحر لرزاں چراغ شام تھا

دم نکلنا تھا کہ بس آرام ہی آرام تھا
آخری ہچکی نہ تھی تسکین کا پیغام تھا

ہم تو اڑتے ہی نشیمن سے اسیر دام تھا
ہمت پرواز کا آغاز ہی انجام تھا

بزم تھی بزم ازل کیف آفریں ہنگام تھا
انجمن گو خاص تھی لیکن وہ جلوہ عام تھا

اس طرف وہ ہنس رہے تھے سادگیٔ عشق پر
اس طرف میں شکوہ سنج گردش ایام تھا

ناشناس کیف ہوں اے ہم صفیران چمن
میں بہار آنے سے کچھ پہلے اسیر دام تھا

شکوۂ گردوں عبث ہے رنج ناکامی فضول
مل گیا جو تیری قسمت میں دل ناکام تھا

تھا دم آخر خیال پردہ داری اس قدر
دل میں اسکی یاد تھی لب پر خدا کا نام تھا

اے تغافل آشنا وہ نزع کی ہچکی نہ تھی
نامراد آرزو کا آخری پیغام تھا

عمر بھر کمبخت محو سعی بے حاصل رہا
بے خبر انجام الفت سے دل ناکام تھا

لطف ساقی دیکھکر بیہوش تھے بادہ پرست
ہر نگاہ کیف زا ئین نشۂ صد جام تھا

ہر نگاہ شوق یہی آئینہ دار یاس و غم
رونما آغاز ہی میں عشق کا انجام تھا

کعبۂ مقصود تک پہنچے جو ہم وحشت پسند
سو جگہ سے چاک صغر جامہ احرام تھا



تفتیش جرم کے پرانے طریقے

ہندوستان میں آگ اور پانی کے ذریعے جرایم کی تحقیقات کا رواج اٹھارہویں صدی کے آخر تک جاری تھا اس موضوع پر اسٹیٹسمین کے تازہ پرچہ میں مسٹر بل مارلنگ (BILLMARLING) کا ایک مقالہ آیا ہے اس کی تلخیص ذیل میں درج کی جاتی ہے جو امید ہے دلچسپی سے پڑھی جائے گی وہ لکھتے ہیں۔

رسالہ ایشیاٹک رسرچز کی پہلی جلد میں ہندوستان کے پہلے گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز نے ایک واقعہ نقل کیا ہے یہ واقعہ ۱۷۸۳ء میں بنارس میں پیش آیا، ملزم پر صرف چوری کا الزام تھا اس جرم کی تحقیق کا طریقہ دستور قدیم کے مطابق آگ کے ذریعہ سے تھا بنارس کے عامل علی ابراہیم خاں خود اس موقع پر موجود تھے انھوں نے لوگوں کو اس طریق آزمایش سے باز رکھنا چاہا لیکن مقدمہ کے دونوں فریقوں اور نیز پنڈتوں نے کسی دوسرے طریقہ کو پسند نہیں کیا صرف آگ سے جرم کی تحقیق پر زور دیتے رہے علی ابراہیم کو مجبورًا اس طریق آزمایش کی اجازت دینی پڑی اس اجازت کے لئے وہ اپنی برأت یوں پیش کرتے ہیں کہ ملزم کو جرم سے بری کرنے کا یہی واحد طریقہ تھا۔ فریقین ہندو تھے دھرم شاستر میں اسی طریق آزمایش کا حکم تھا اور ہندو ریاستوں اور سلطنتوں میں یہی طریقہ عام طور پر رائج تھا بحیثیت عامل شہر کے علی ابراہیم خاں اپنے تمام مشیروں اور افسروں کو لیکر متعینہ مقام پر پہونچے اور مستغیث کو ایک بار اور اس طریق آزمایش سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن وہ اپنے اصرار پر برابر قایم رہا اور بالآخر آزمایش کی رسم شروع ہوئی علی الصباح وہ مقام دھوکر پاک وصاف کر دیا گیا اس کے بعد پنڈتوں نے گنیش کی جو ان کے نزدیک خدائے دانش ہے پوجا کی اور پھر سات ہم مرکز دائرے سولہ انگشت کے فاصلہ سے کھینچے مرکزی دائرے میں خشک گھاس رکھ دی گئی۔ ملزم نے غسل کرکے بھیگے ہوئے کپڑے پہنے اور مشرق کی طرف رخ کرکے خارجی دائرہ میں

کھڑا ہو گیا اس کے بعد عامل شہر اور پنڈتوں نے اُسے حکم دیا کہ اپنے ہاتھوں پر چاول اور بھوسی لیکر ملے اس کے ہاتھوں کا معائنہ کیا گیا۔ اور زخم کا جو نشان اُن میں پہلے سے موجود تھا اسے رنگ دیا گیا پھر اس کے ہاتھوں میں سات پیپل کی پتیاں سات گھاسیں، نو دانے جو اور چند پھول رکھدیئے گئے پنڈتوں نے موقع کے مناسب کچھ شلوک پڑھے اور روداد مقدمہ کو وید کے ایک منتر کے ساتھ تاڑ کے پتے پر لکھ کر ملزم کے ہاتھوں میں باندھ دیا اس کے بعد لوہے کی ایک گیند جس کا وزن ڈھائی سیر تھا آگ میں ڈال دی گئی۔ یہاں تک کہ وہ سرخ ہو گئی۔ پھر اُسے نکال کر پانی میں ٹھنڈا کیا پھر گرم کیا اور پھر ٹھنڈا کیا اور پھر تیسری بار وہ خوب گرم ہو کر سرخ ہو گئی تو اسے چمٹے سے اٹھا کر ملزم کے ہاتھوں میں رکھدیا احکام شاستر کے مطابق ملزم ہر دائرہ میں قدم رکھتا ہوا مرکزی دائرہ میں پہونچا اور وہاں پہونچکر اس جلتی ہوئی گیند کو گھاس کے ڈھیر پر پھینک دیا گھاس میں آگ لگ گئی اس کے بعد ملزم کے ہاتھ کھولدیئے گئے اور دیکھا گیا تو جلنے کا کوئی نشان اُن میں موجود نہ تھا چنانچہ وہ جرم سے بری کر دیا گیا اور مستغیث کو ایک ہفتہ قید کی سزا دی گئی تاکہ آئندہ بے قصوروں کے خلاف اس قسم کے غلط الزامات نہ لائے جائیں۔

ہندو دھرم شاستر میں اس طریقہ کے علاوہ ملزم کی آزمایش کے آٹھ طریقے تھے ایک طریقہ میزان کے ذریعہ سے تحقیق جرم کا تھا بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ طریقہ صرف برہمنوں کے لئے مخصوص تھا لیکن کچھ لوگوں کے نزدیک اس میں برہمن اور غیر برہمن کی تخصیص نہ تھی ملزم کسی برہمن کی معیت میں ایک دن کا روزہ رکھنے کے بعد غسل اور پوجا وغیرہ سے فارغ ہو کر ایک ترازو میں جس کے دونوں پلے بالکل برابر ہوتے بٹھایا جاتا اور وزن کیا جاتا اس کے بعد وہ ترازو سے نکال لیا جاتا پھر پنڈت ایک پرچہ پر اس کے جرم کا خلاصہ لکھتے اور اس پر کچھ منتر پڑھکر اس پرچہ کو ملزم کے ابرو پر باندھ دیتے چھ منٹ کے بعد وہ دوبارہ وزن کیا جاتا اگر اب اس کا وزن بہ نسبت پہلے کے زیادہ ہوتا تو وہ مجرم تصور کیا جاتا اور اگر کم ٹھہرتا تو بیقصور سمجھا جاتا۔ اگر بالفرض اب کی بار بھی دونوں پلوں کا وزن برابر ہوتا تو اسے تیسری بار وزن کرتے اور اس مرتبہ ہندو دھرم شاستر کے مطابق وزن میں فرق ہونا لازمی ہوتا

آج بھی ہندوستان کے بعض حصوں میں تماشاگر سرخ انگاروں پر چلکر اپنے کرتب دکھاتے ہیں اس قسم کے کرتبوں کی ابتدا برہمنوں کے طریق آزمایش میں پائی جاتی ہے اسی طرح قرون وسطیٰ میں ہندوستان میں ملزم کی بے گناہی ثابت کرنے کا یہ طریقہ بھی تھا کہ اُسے پیپل کی لکڑی کے دہکتے ہوئے انگاروں پر چلنا پڑتا تھا یہ انگارے نو ہاتھ لمبی، ایک بالشت گہری اور دو بالشت چوڑی زمین کھود کر اس میں بچھا دیئے جاتے تھے اگر ان انگاروں پر چلنے سے ملزم کے پیر محفوظ رہتے تو وہ جرم سے بری کر دیا جاتا، یہ کارنامہ اس قوم کے لئے زیادہ مشکل نہیں ہے جو ہمیشہ برہنہ پیر چلکر اپنے تلوے کے چمڑے کو سخت بنا لیتی ہے۔ نو ہاتھ ساڑھے تین گز کے برابر ہوتے ہیں اور یہ فاصلہ زیادہ سے زیادہ تین قدم میں طے کیا جا سکتا ہے اس طریق آزمایش کا رواج قدیم ہندو روایات میں ملتا ہے۔ سیتا جی نے اپنے شوہر رام کے سامنے اپنی عصمت کا ثبوت اسی طرح آگ پر چلکر دیا

تھا یورپ میں چالس فرہا (CHARLS.T.HEFAT) شہنشاہ روما کو بھی اپنی ملکہ رچرڈس (RICHARDIS) کی بے گناہی کا ثبوت اسی طریق سے ملا تھا۔

پانی کے ذریعہ سے آزمایش کا طریقہ یہ تھا کہ ملزم کو پانی کے اندر اتنی دیر تک غرق رہنا پڑتا جتنی دیر میں ایک آدمی آہستہ آہستہ پچاس قدم چل لیتا ہے۔ بعض مقامات میں اس مدت کا اندازہ اس وقت سے کیا جاتا تھا جو تیر پھینکنے اور اسے اٹھا لانے میں صرف ہوتا ہے

آزمایش کے دو طریقے زہر کے ذریعہ سے بھی تھے لیکن ان میں سے کوئی بھی کسی عورت یا برہمن پر استعمال نہیں کیا جاتا تھا ان میں سے ایک طریقہ یہ تھا کہ کسی مٹی کے برتن سے جسمیں پہلے سے ایک سانپ بند رہتا۔ ملزم سے کوئی سکہ، انگوٹھی یا مہر نکالنے کو کہا جاتا دوسرا طریقہ یہ تھا کہ ایک برہمن ملزم کو سفید سنکھیا سات دانہ جو کے ہم وزن چون دانہ جو کے برابر مکھن میں گھلاتا، ان صورتوں میں اگر ملزم بے قصور ہوتا تو اس پر زہر کا کوئی اثر ظاہر نہ ہوتا۔

آزمایش کا ایک اور طریقہ اُبلتے ہوئے تیل سے تھا۔ علی ابراہیم خاں نے ۱۷۸۳ء میں اس کا مشاہدہ خود کیا تھا ملزم کا ہاتھ جل گیا تھا اور وہ مجرم قرار پایا تھا۔

ایک اور طریقہ یہ تھا کہ ایک برتن میں مختلف تصویریں یا تصویر کپڑے رکھ دیئے جاتے اور ملزم کو اس سے کوئی خاص تصویر یا کپڑا نکالنا پڑتا تھا کامیاب ہونے پر اسکی بے گناہی ثابت ہو جاتی۔

دس اشرفیوں سے لیکر تیس اشرفیوں تک کی چوری میں بعض اوقات یہ طریقہ استعمال کیا جاتا کہ ایک برتن میں پانی رکھکر اس میں دیوتاؤں کی مورتیوں کو غسل دیتے اور اسی پانی میں تین گھونٹ ملزم کو پینا پڑتا اگر دو ہفتے کے اندر وہ کچھ بیمار ہوتا تو مجرم تصور کیا جاتا۔

چاولوں کے ذریعہ سے آزمایش کا طریقہ بیچی قوموں میں زمانہ حال تک رائج تھا یہ طریقہ دوسری صدی عیسوی میں اسکندریہ میں بھی پایا جاتا تھا پہلے منتر اور اشلوک پڑھے جاتے اس کے بعد ملزم چاول چبا کر مخصوص پتوں یا درخت کی چھال پر انھیں تھوک دیتا جس کے چاول خشک رہ جاتے یا جس کے چاول میں خون کے نشانات پائے جاتے وہ مجرم قرار پاتا۔ (معارف)

یاد نہیں

اب رہائی کی تمنا دل ناشاد نہیں !
رستہ اپنے نشیمن کا مجھے یاد نہیں !

زندگی تھی وہی یا اور کوئی عالم تھا !
کیا کہیں اس سے زیادہ ہمیں کچھ یاد نہیں

جب کوئی ظلم نیا کرتے ہیں فرماتے ہیں
اگلے وقتوں کے ہمیں طرز ستم یاد نہیں

چکبست لکھنوی

دل لگانے کی جگہ عالم ایجاد نہیں
خواب آنکھوں نے بہت دیکھے مگر یاد نہیں

آج اسیروں میں وہ ہنگامۂ فریاد نہیں
شاید اب کوئی گلستاں کا سبق یاد نہیں !

تو بہ بھی بھول گئے عشق میں وہ مار پڑی
ایسے اوسان گئے ہیں کہ خدا یاد نہیں !

فکر امروز نہ اندیشۂ فردا کی خلش
زندگی اسکی جسے موت کا دن یاد نہیں

(چنداں) یاس لکھنوی

یہ تو ممکن ہی نہیں

کہ تعلیم یافتہ ہونیکے باوجود آپ کو کسی کتاب کی ضرورت ہی نہ ہو۔ آپکو ضرورت تو ضرور ہوتی ہے، لیکن کبھی تو آپ یہ سوچ کر ٹال جاتے ہیں کہ خدا جانے یہ کتاب کہاں سے ملیگی، اب کون تلاش کرتا پھرے، اور کبھی یہ فکر دامن گیر ہوتی ہے کہ خدا جانے کیسی ہے کیسی نہ ہو لمبی چوڑی تعریفیں اپنی کتابوں کی سبھی لکھ دیا کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ کتابوں کی بہم رسانی میں جو سہولتیں ہونی چاہئیں وہ ہم لوگ مہیا نہیں کرتے

رسالہ "سعید" کے دفتر میں اب یہ انتظام کر لیا گیا ہے کہ آپ خواہ کسی مطبع یا کسی مصنف اور مکتبہ کی کتاب منگائیں ہم قیمت میں کوئی اضافہ کئے بغیر وہ آپ کی خدمت میں جلد سے جلد پہنچا دیں گے، اور یہ التزام بھی ہو گیا ہے کہ "سعید" بک ایجنسی میں صرف وہی کتابیں رکھی جائیں گی جو درحقیقت اچھی اور قابل تعریف ہیں۔ اب اس سے زیادہ سہولت اور کیا ہو سکتی ہے؟ صرف فرمایش کا ایک پوسٹ کارڈ لکھدینا بھی کیا کوئی محنت یا زحمت ہے؟ کوئی سی فہرست اٹھا کر اس میں سے کتابیں چھانٹ لیجئے اور ہمیں لکھ بھیجیے پھر دیکھئے کہ کس قدر جلد فرمایش کی تعمیل ہوتی ہے۔

منیجر رسالہ "سعید" کوچہ چیلان دہلی

دولت خرچ کرنیکا طریقہ

مسلمانوں کی موجودہ حالت کا آئینہ

(از جناب محمد الیاس صاحب برنی ایم اے ایل ایل بی مصنف علم المعیشت وغیرہ)

واضح ہو کہ خرچ چلانے کے چار ذریعے ہو سکتے ہیں۔ یا تو انسان خود اپنے بازو سے کافی روپیہ کمائے یا اس کے پاس بزرگوں کا کچھ اندوختہ ہو یا وہ چوری کیا کرے یا بھیک مانگے۔ ہونہار اور ترقی پذیر قومیں، خاندان یا افراد خود پیدا کر کے زندگی کا لطف اٹھاتے ہیں ایسی حالت میں وہ عام ترقی کا بھی باعث ہوتے ہیں اور اعلیٰ معیار زندگی ہی انکے واسطے ہر طرح مناسب اور موزوں ہے۔ پست ہمت ناعاقبت اندیش خود تو کماتے نہیں ہے جو کچھ بزرگوں کا اندوختہ ملتا ہے اُسکو بھی دوسروں کی دیکھا دیکھی چند روزہ عیش و عشرت کی خاطر خاک میں ملا کر مدت العمر کے واسطے افلاس و نکبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں بہت سے لوگ جو یہ نہیں سمجھتے کہ جتنی چادر ہو اتنے ہی پیر پھیلانے چاہئیں خواہ آمدنی کم ہو لیکن انکے دل میں ہر چیز کا شوق موجزن رہتا ہے۔ ایسے لوگ بالآخر چوری پر اتر آتے ہیں خواہ وہ دھوکوں سے قرض لیں۔ یا رات کو نقب زنی کریں۔ یا دن دہاڑے عہدوں کی کرسیوں پر بیٹھکر رشوت لیں۔ اگر اپنی خواہشات کے غلام بننے کی بجائے اپنے نفس کو قابو میں رکھتے تو نہ دنیا میں اسکی رسوائی ہوتی اور نہ عاقبت میں انکو عذاب بھگتنا پڑتا۔ ایسی پر لطف زندگی سے جو چوری کے سہارے بسر ہو ایمانداری کی سیدھی سادی غریبانہ زندگی ہزار درجہ بہتر ہے۔ گلی کوچوں میں بھیک مانگنا تو بہتوں کو عار ہوتا ہے۔ لیکن امرا و حکام کے خوشامدی مصاحب و متوسلین اس غریب فقیر سے زیادہ ذلیل ہیں جو افلاس سے تنگ آکر بھیک سے اپنا پیٹ پالتا ہو۔ وہ تو لاچار ہے اور اپنی بقا کی خاطر بھیک کی ذلت گوارا کرتا ہے لیکن اول الذکر اکثر ہٹے کٹے بسنڈے مسٹنڈے مگر بے غیرت ہوتے ہیں۔ چاہتے تو اپنی قوت بازو سے آبرو کے ساتھ روزی کماتے لیکن تن آسانی کے ہاتھوں ان کی غیرت سپر انداز ہو جاتی ہے اور خودداری کا بے بہا جوہر لذائذ نفسانی کی زد سے پاش پاش ہو کر ہمیشہ کیواسطے آبرو خاک میں ملا دیتا ہے حضرت شیخ سعدی کی ہدایت جو کہ غیرت سے لبریز ہے اس زمانہ میں بہتوں کو عجیب معلوم ہوگی ؎

بدست آہک تفتہ کردن خمیر
بہ از دست بر سینہ پیش امیر

حاصل کلام یہ کہ لذت دنیا سے لطف اٹھانے میں مضائقہ نہیں بلکہ زندگی کا معاشی معیار اعلیٰ ہونا بھی ترقی کا خاص باعث اور اس کا لازمی نتیجہ ہے بشرطیکہ تن پروری زندگی کے دیگر اعلیٰ مقاصد کو دل سے محو نہ کرے عیش و عشرت مخرب اخلاق و صحت نہوں۔ سب احتیاجات حسب مراتب رفع ہوتے رہیں۔ یہ نہیں کہ چند احتیاجات تو بدرجہ اعلیٰ

پوری ہوں اور دیگر بدرجہ ادنیٰ جیسا کہ ہندوستان کے سفید پوشوں کا حال ہے اور سب سے بڑی شرط یہ بھی ہے کہ انسان جسقدر خرچ کرے اس سے زیادہ کمائے کبھی حقیقی خوش حالی کی علامت یہ ہے کہ زندگی کا معیار اعلیٰ رکھنے پر بھی لوگ اپنی آمدنی میں سے پس انداز کرتے رہیں ورنہ بزرگوں کا اندوختہ خاک میں ملاکر یا کسی مہذب یا غیر مہذب طور پر چوری کرکے یا بھیک مانگ کر اگر چند روزہ لطف اٹھایا تو سمجھدار اور غیرت مندوں کی نظر میں وہ فاقہ کشی سے بدتر ہے اور ایسے لوگوں کا انجام اکثر عبرت ناک ہوتا ہے جناب مولوی محمد اسمٰعیل صاحب کی نصیحت کسقدر سادہ مگر پرمعنی ہے

ملے خشک روٹی جو آزادرہ کر
تو وہ خوف وذلت کے حلوے سے بہتر

اکثر لوگ ہندوستان میں ولایتی عطر۔ صابون ٹائی کالر فینسی جراب وچھڑی۔ رومال۔ عینک۔ سگریٹ۔ جیسی تعیشات کی فروخت بڑھتی دیکھکر خوش اور مطمئن ہوتے ہیں ایسے معیار زندگی کے ہاتھوں ملک جائداد قرق و نیلام ہو رہی ہیں۔ چوری اور بھیک عجب عجب بھیس بدلکر ہر طرف رواج پارہے ہیں۔ اخلاق مائل بہ پستی اور ترقی کے سرچشمے اسلئے مسدود ہوتے جاتے ہیں ہمارا خیال ہے کہ ہندوستان کا معیار زندگی باوجود دیگر ممالک سے مقابلۃً ادنیٰ ہونے کے یہاں کی مالی حالت پر بڑا بار ہے اس کی مثال بعینہ اس جام شراب کی سی ہے جو چند لمحوں کے سرور کی خاطر کوئی جیب خالی کرکے خریدے اور جس کا خمار بالآخر اس کو بدرجہا مضمحل کردے ممکن ہے کہ خدا وہ دن بھی لائے جبکہ ہمکو صحیح مفہوم کے مطابق خوش حالی نصیب ہو

اور تب ہی معیار زندگی بلند کرنیکا لطف ہے ابھی ہم کو بہت کچھ محنت اور صرف کرکے ملک میں تعلیم پھیلانی ہے صنعت وحرفت سنبھالنی ہے ایسے عظیم الشان کام پیش ہوتے ہوئے ہم کو تن آسانی کا موقع کیونکر مل سکتا ہے ابھی ہمکو ترقی کا کھیت بونا ہے فصل کاٹنے کا کیا ذکر ہے۔ اس وقت ہر کسی کو لازم ہے کہ مآل اندیشی سے کام لیکر اپنی احتیاج کے مراتب پر غور کرے اور اپنے خرچ کی مدوں کو جانچے اور فرد حساب میں اکثر بیجا اور خلاف مصلحت اخراجات نظر پڑینگے ضبط سے کام لیکر ان کو جلد سے جلد ترک کردے۔ اور جو کچھ پس انداز ہو اسکو بہتر احتیاجات کے رفع کرنے میں صرف کرے۔ ایک دن آئیگا کہ دولت ملک میں اس طرح بڑھے گی جیسے کھیت میں غلہ اگتا ہے درخت میں پھل آتے ہیں۔ سب ترقی یافتہ ملک اسی راہ پر چلکر منزل مقصود تک پہنچے ہیں جاپان کی مثال ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہے اور جب خدا ہندوستان کو بھی یہ دن دکھائے گا۔ تو ہم یا ہماری آیندہ نسلیں دوسرے ملک والوں کی طرح زندگی کا لطف اٹھائیں گی

ہماری قطعی رائے ہے کہ ہندوستان میں بہت سی تعیشات کا استعمال قبل از وقت اور بربادکن ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ دوسرے ملکوں کے مانند ہم محنت کرکے ذرائع پیداوار بڑھائے بغیر ان کا لطف اٹھالیں یعنی کاشت کیے بغیر فصل کاٹیں۔ درخت لگائے بغیر پھل پالیں۔ ابھی ہم کو ازحد محنت وخرچ طلب اہتمام درپیش ہے۔ تعلیم پھیلانی ہے صنعت وحرفت میں دوبارہ جان ڈالنی ہے اور تہذیب زندگی کے دیگر شعبوں کو صلاح اور ترقی دینا ہے تعیشات سے لطف اٹھانے کے واسطے اسوقت نہ ہمارے پہلو میں

دل ہونا چاہیے۔ اور نہ ہمارے پاس وقت اور روپیہ ہے ہمکو تو ایثار اور جفاکشی کی کٹھن منزل درپیش ہے۔ اور منزل مقصود تک پہنچنے کا صرف یہی ایک راستہ بھی ہے۔

المختصر یہ وقت ملک میں علم و ہنر، صنعت و حرفت پیدا کرنے اور آزادی پھیلانے کا ہے اور ان کاموں میں جسقدر بھی صرف کیا جاوے کم ہے۔ تن پروری اور عشرت پرستی ہمارے حق میں سم قاتل کا حکم رکھتی ہے البتہ جب خدا یہ سب کام پورے کر دیگا تو ہمارا ملک بھی رشک جنان بن جائیگا اور سوقت معیار زندگی بلند کرنیکا موقع اور لطف ہوگا۔ بالفعل ہم پر لازم ہو کہ نہایت ایثار کیساتھ از حد سادہ طور پر زندگی بسر کرکے جو کچھ بن پڑے ملک کی خدمت میں بے دریغ صرف کریں۔ خدا کا شکر ہے کہ کچھ روز فیشن کا بھوت سر پر سوار رہنے کے بعد برادران وطن میں سادہ زندگی اور عالی حوصلگی کا مبارک رجحان پیدا ہو چلا ہے الہم زد فزد۔

(ملت)

ڈاکٹر سعید احمد صاحب کی نئی تصنیف

ڈاکٹر صاحب کے مقبول عام اور حد سے زیادہ دلچسپ افسانوں کا مجموعہ "دامن باغباں" کے نام سے چھپکر تیار ہوگیا ہے۔ قصہ کی دلاویزی اور سلاست بیان کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کے افسانوں کی یہ خصوصیت ہو کہ وہ بیحد سبق آموز ہوتے ہیں۔ بچوں، جوانوں، مردوں اور عورتوں سب کے لئے یکساں مفید ہونے میں شاید ہی کوئی مجموعہ اسکا مقابلہ کرسکے۔ کتاب نہایت عمدہ آرٹ پیپر پر چھپی ہو اور کتابت اور طباعت بیحد دیدہ زیب اور نظر فریب ہو۔ عزیزوں اور دوستوں کو دینے کیلئے تحفہ کا کام دیسکتی ہو۔ ایکسو چھیتر صفحوں کی خوب ضخیم کتاب ہے، لیکن ان تمام خوبیوں کے باوجود قیمت صرف ایک روپیہ رکھی گئی ہے ابھی سے فرمائشوں کی اسقدر کثرت ہو کہ اگر آپ نے منگوانے میں دیر کی تو اندیشہ ہو کہ شاید دوسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا پڑے۔ اسی وقت فرمایش بھیجدیجئے۔

منیجر رسالہ "سعید" دہلی

ڈاکٹر سعید احمد صاحب کی معرکۃ الآرا تصانیف

اگر اب تک نہیں پڑھی ہیں تو جلد منگا کر پڑھئے اردو زبان اس موضوع پر ان سے بہتر کتابیں پیش نہیں کرسکتی۔ یہ سب کتابیں ڈاکٹر سعید احمد صاحب کے زور قلم کا نتیجہ ہیں اور غالباً ڈاکٹر صاحب کا نام ان کی عمدگی کیلئے کافی ضمانت ہو۔

پتھر سے ہیرا۔ عورت کی دنیا محبت ہو اور اس دنیا میں وہ عجیب غریب معجزے دکھایا کرتی ہو قیمت ۸ر اسلام اور مدنیت۔ دنیا میں زندگی بسر کرنے کا کیا طریقہ سکھایا ہو قیمت عہ

اسلام اور عبادت۔ اسلامی عبادات میں کیا کیا خوبیاں ہیں قیمت ۸ر حمل سے وضع حمل تک ۸ر پیدایش سے چار سال تک ۸ر پانچ سال سے جوانی تک ۸ر

اسلام اور عورت۔ اس مظلوم اور بیکس فرقے کی اسلام نے کس قدر اور کس طرح حمایت کی ہو ۸ر دور جوانی ۸ر عمر بڑھانے کے طریقے ۸ر مکمل سٹ ۶ عہ

ملنے کا پتہ۔ منیجر رسالہ "سعید" دہلی (محصولڈاک بذمہ خریدار)

جوہر ذاتی

از ابو الاثر جناب حفیظ جالندھری

مدتوں سے اشک کے سیلاب میں بہتا ہے دل   سختیاں ہر موج طوفاں خیز کی سہتا ہے دل
دل میں سب کچھ ہے مگر منہ سے نہیں کہتا ہے دل   التجا کیسی دعا سے محترز رہتا ہے دل

حاجتیں لاکھوں ہیں لیکن مانگنے سے عار ہے
شکر کرتا ہوں۔ کہ دل میرا بہت خود دار ہے

اپنے دامن میں لیا ہے بارگاہوں نے مجھے   اپنے پہلو میں بٹھایا بادشاہوں نے مجھے
بارہا تاکا ہے بخشش کی نگاہوں نے مجھے   اور پناہیں پیش کیں عالم پناہوں نے مجھے

رعب دولت کا مگر دل پر میرے چھایا نہیں
کچھ طلب کرنے کو میں نے ہاتھ پھیلایا نہیں

عرش کی رفعت لئے بیٹھا ہوں فرش خاک پر   سر مرا آسودہ ہے پائے رسولؐ پاک پر
اہل زر ہنستے ہیں میرے دامن صد چاک پر   اور میں نازاں ہوں اپنی فطرت بے باک پر

میری فطرت نے دیا ہے جوہر ذاتی مجھے
دنیوی شاہوں کی مداحی نہیں آتی مجھے

(کارزار)



یہ افسانہ ... کے ... منشی پریم چند صاحب نے "سعید" کیلئے ایک بہت ہی بیش قیمت
... مضمون ... کے ... وقت نکال دیا۔ اپنے مختصر افسانوں کے ذریعہ سے منشی صاحب موصوف
... تعلیم یافتہ حضرات سے پوشیدہ نہیں ہے۔ "سعید" کو دلی فخر ہے کہ
... نگاروں کی فہرست ... ایسے چوٹی کے ... کا نام شامل کر سکنے کے قابل ہو گیا۔ خدا کرے
کہ آپ اسی طرح آئندہ "سعید" کو سرفراز فرماتے رہا کریں۔ (ایڈیٹر)

کچھ

(از جناب منشی پریم چند صاحب بی۔ اے)

بابو کندن لال کچہری سے لوٹے تو دیکھا کہ اہلیہ صاحبہ ایک کنجڑن سے کچھ ساگ خرید رہی ہیں۔ کنجڑن پالک کے ٹکے سیر کہتی ہے وہ ڈیڑھ پیسے دے رہی ہیں۔ اسی پر کئی منٹ تک بحث ہوتی رہی۔ آخر کنجڑن ڈیڑھ ہی پیسے پر دینے کو راضی ہو گئی۔ اب ترازو اور باٹ کے متعلق بحث چلی۔ دونوں پلڑے برابر نہ تھے۔ ایک میں پاسنگ تھا۔ باٹ بھی پورے نہ اترے تھے۔ پڑوسن کے گھر سے سیر آیا۔ ساگ تل جانے پر اب گھاٹے کا سوال اٹھا۔ اہلیہ صاحبہ اور مانگتی تھیں۔ کنجڑن کہتی تھی، اب کیا سیر دو سیر گھاٹتے ہی میں لیلوگی، بہو جی؟ خیر آدھ گھنٹے میں یہ سودا چکا اور کنجڑن پھر بھی نہ آنے کی دھمکی دیکر رخصت ہوئی۔ کندن لال کھڑے کھڑے یہ سب تماشا دیکھتے رہے۔ کنجڑن کے چلے جانے کے بعد اہلیہ صاحبہ پانی لائیں تو آپ نے فرمایا۔ آج تو تم نے ذرا سا ساگ لینے میں پورا آدھ گھنٹہ لگا دیا۔ اتنی دیر میں تو ہزار پانچسو کا سودا ہو جاتا۔ ذرا ذرا سے ساگ کیلئے اتنی دیر بک بک کرتے تمہارا سر بھی نہیں دکھتا؟

اہلیہ صاحبہ نے کچھ خجل ہو کر کہا۔ پیسے مفت تو نہیں آتے!

"یہ ٹھیک ہے مگر وقت کی بھی کچھ قیمت ہے اتنی دیر سر کھپا کر تم نے بڑی مشکل سے دھیلے کی بچت کی! کنجڑن نے بھی دل میں

کہا ہوگا، کہاں کے گنوارن ہے۔ اب شاید بھول کر بھی ادہر نہ آئے۔"

"تو پھر مجھ سے تو یہ نہیں ہوسکتا کہ پیسے کی جگہ دھیلے کا سودا لیکر بیٹھ جاؤں۔"

"اتنی دیر میں تو تم نے کم از کم بیس ورق پڑھے ہوتے! کل مہری سے گھنٹوں سر مارا، پرسوں دودھ والے کیساتھ گھنٹوں بحث کی۔ زندگی کیا انہیں باتوں میں گزارنے کو دی گئی ہے؟"

کندن لال عموماً روز ہی بیوی کو نصیحت کرتے رہتے یہ اُنکا دوسرا بیاہ تھا۔ رامیشوری کو آئے ابھی دو تین ہی مہینے ہوئے تھے۔ ابتک تو بڑی نندجی اوپر کے کام کیا کرتی تھیں، مگر رامیشوری کی ان سے نہ پٹ سکی اوسکو معلوم ہوتا تھا کہ یہ تو میرا سبھی کچھ لٹائے دیتی ہیں۔ آخر وہ چلی گئی، تب ہی سے رامیشوری گھر کی مالک ہے وہ بہت چاہتی ہے کہ شوہر کو خوش رکھے۔ اوس کے اشاروں پر چلتی ہے، بار بار جو بات سنتی ہی گانٹھ میں باندھ لیتی ہی مگر روز ہی تو کوئی نہ کوئی نئی بات ہو جاتی ہے اور کندن لال کو اوسے نصیحت دینے کا موقع مل جاتا ہے۔

(۲)

ایک روز بلی دودھ پی گئی۔ رامیشوری دودھ گرم کرکے لائی اور شوہر کے سرہانے رکھکر پان بنا رہی تھی کہ بلی نے دودھ پر اپنے خدا داد حق کو عمداً ثابت کر دیا۔ رامیشوری یہ برداشت نہ کرسکی، رول لیکر بلی کو اتنے زور سے مارا کہ وہ دو تین لڑھکنیاں کھا گئی۔

کندن لال لیٹے لیٹے اخبار پڑھ رہے تھے۔ بولے۔ اور رجوم جاتی؟

رامیشوری نے ڈھٹائی سے کہا۔ تو وہ میرا دودھ کیوں پی گئی؟

"ارے مارنے سے دودھ مل تو نہیں گیا؟"

"جب کوئی نقصان کرتا ہے تو اوپر غصہ آتا ہی ہے،"

"نہ آنا چاہئے۔ حیوان کے ساتھ انسان بھی کیوں حیوان بنجائے؟ انسان اور حیوان میں اسکے سوا اور فرق ہی کیا ہے؟"

کندن لال کئی منٹ تک رحم، دانائی اور تحمل کا سبق دیتے رہے، یہاں تک کہ بیچاری رامیشوری بنچ سر ڈ پڑی۔

اسی طرح ایک دن رامیشوری نے ایک بھکاری کو دھتکار دیا تو بابو صاحب نے پھر اوپدیش دینا شروع کیا۔ تم سے نہ اوٹھا جاتا ہو تو لاؤ میں دے آؤں غریب کو یوں نہ دھتکارنا چاہئے۔

رامیشوری نے تیوریاں چڑھا کے کہا۔ کوئی کہاں تک دوڑے، سارا دیس بھکاریوں ہی سے بھر گیا ہے شاید؟

کندن لال نے حقارت سے مسکرا کر کہا۔ اسی دیس میں تو تم بھی رہتی ہو!

"اتنے بھیک منگے آ کہاں سے جاتے ہیں؟ یہ سب کوئی کام کیوں نہیں کرتے؟"

"کوئی آدمی اتنا کمینہ نہیں ہوتا جو کام ملنے پر بھی بھیک مانگے۔ ہاں اپاہج ہو تو اور بات ہے۔ اپاہجوں کا بھیک کے سوا اور کیا سہارا ہوسکتا ہے؟"

"سرکار انکے لئے اناتھالیہ (یتیم خانہ) کیوں نہیں کھلواتی؟"

"جب سوراج ہو جائے گا تو شاید کھلجائیں ابھی تو کوئی امید نہیں ہے۔ مگر سوراج بھی تو دھرم ہی سے آئیگا۔"

"لاکھوں سادھو سنیاسی، پنڈت، پجاری مفت کا مال اڑاتے ہیں، کیا اتنا دھرم باقی نہیں ہے؟ اگر ایسے دھرم سے سوراج ملتا تو کب کا مل گیا ہوتا!"

"اسی دھرم کا نتیجہ ہے کہ ہندو ذات ابھی تک زندہ ہے ورنہ کب کی تباہ ہو گئی ہوتی۔ روم، یونان، ایران، اسیریا کسی کا اب نشان تک باقی نہیں۔ یہ ہندو ذات ہے جو آج تک زمانہ کی زد کا مقابلہ کرتی چلی آتی ہے۔"

"آپ سمجھتے ہونگے، ہندو ذات زندہ ہے، میں تو اوسکو اسی دن سے مردہ سمجھتی ہوں جس دن سے یہ غلام بنگئی۔ زندگی آزادی ہی کا نام ہے، غلامی تو موت ہے!"

کندن لال نے بیوی کو حیرت بھری نگاہوں سے دیکھا ایسے انقلاب انگیز خیالات، کہاں سے آگئے؟ دیکھنے میں تو وہ بالکل بھولی بھالی ہے، سنے کہیں کچھ سن سنا لیا ہوگا۔ ذرا سخت لہجہ میں بولے:۔ کیا بیفائدہ بکواس کرتی ہو؟ لاج تو نہیں آتی، اوپر سے مفت بحث کر رہی ہو!"

رامیشوری یہ ڈانٹ پاکر چپ ہو گئی۔ ایک لمحہ وہاں کھڑی رہی، پھر آہستہ آہستہ کمرہ سے چل دی۔

(۳)

ایک روز کندن لال نے کئی دوستوں کو دعوت دی۔ رامیشوری صبح سے رسوئی خانہ میں گھسی تو شام تک سر نہ اوٹھا سکی۔ اوسے یہ بیگار بری معلوم ہو رہی تھی۔ اگر دوستوں کی دعوت کرنی تھی تو کھانا پکوانے کا کوئی بندوبست کیوں نہیں کیا؟ سارا بوجھ اوس کے سر کیوں ڈالدیا؟ اس سے ایک بار پوچھ تو لیا ہوتا کہ دعوت کروں یا نہ کروں۔ ہوتا تب بھی یہی جواب ہو رہا ہے، مگر تب وہ دعوت کی تجویز کا بڑی خوشی سے خیر مقدم کرتی، تب وہ سمجھتی کہ دعوت وہ خود کر رہی ہے۔ اب سمجھ رہی تھی، اوس سے بیگار لیجا رہی ہے! خیر کھانا تیار ہوا، لوگوں نے کھانا کھایا اور چلے گئے۔ مگر منشی جی منہ پھلائے بیٹھے ہوئے تھے، رامیشوری نے کہا۔ تم کیوں نہیں کھا لیتے یا ابھی سویرا ہے؟

بابو صاحب نے آنکھیں نکال کر کہا۔ کیا کھاؤں، یہ کھانا ہے یا بیلوں کی سانی؟

رامیشوری کے تن بدن میں آگ لگ گئی سارا دن چولھے کے آگے جلی، اوسکا یہ انعام! بولی مجھ سے جیسا ہو سکا، بنایا جو بات اپنے بس کی نہیں ہو اسکے لئے کیا کرتی!

"پوریاں سب سیوڑی ہیں۔"

"ہونگی"

"کچوریوں میں اتنا نمک تھا کہ کسی نے چھوا بھی نہیں"

"ہوگا"

"حلوا خوب بھنا نہیں تھا۔ کچاپن دہ آ رہی تھی۔"

"آتی ہو گی۔"

"شوربا اتنا پتلا تھا جیسے چاء۔"

"استری کا پہلا دھرم یہ ہے کہ وہ رسوئی کے کام میں ہوشیار ہو۔"

پھر اپدیشوں کا تانتا لگا، حتی کہ رامیشوری اکتا کر چلی گئی۔

(۴)

پانچ چھ مہینے گزر گئے۔ ایک روز کندن لال کے ایک دور کے رشتہ دار ان سے ملنے آئے۔ رامیشوری کو جیونہی اطلاع ملی، ناشتہ کے لئے شیرینی بھیجی اور مہری سے کہلا بھیجا کہ آج یہیں کھانا کھائیگا۔ وہ صاحب پھولے نہ سمائے

بوریا بستر لیکر پہونچ گئے، اور وہیں ڈیرا ڈالدیا۔ ایک ہفتہ گذر گیا مگر آپ ٹلنے کا نام نہیں لیتے۔ آؤ بھگت میں خامی ہوتی تو شاید وہ فکرمند ہوتے۔ مگر رامیشوری انکی خاطر داریوں میں دل وجان سے لگی ہوئی تھی پھر بھلا وہ کیوں ٹلنے لگے۔

ایک روز کندن لال نے کہا۔ تمنے یہ بُرا روگ پالا۔

رامیشوری نے چونک کر پوچھا۔ کیسا روگ؟

"انہیں ٹہلا کیوں نہیں دیتیں؟"

"میرا کیا بگاڑ رہے ہیں؟"

"کم سے کم روپیہ روز کی چپت پڑ رہی ہے اور اگر یہی خاطر داری رہی تو شاید جیتے جی ٹلیں گے بھی نہیں۔"

"مجھ سے تو یہ نہیں ہوسکتا کہ کوئی دو چار دن کیلئے آجائے تو اسکے سر ہوجاؤں جب تک اونکی مرضی ہو رہیں۔"

"ایسے مفت خوروں کی خاطر داری کرنا گناہ ہے۔ اگر تم نے اسکو اتنا سر نہ چڑھایا ہوتا تو اتبک یہاں سے چلتا ہوا ہوتا۔ جب دن میں تین مرتبہ ناشتہ، تین مرتبہ کھانا اور پچاسوں مرتبہ پان ملتا ہے تو اُسے کتے نے کاٹا ہے جو اپنے گھر جائے!"

"روٹی کا چور بننا تو اچھا نہیں۔"

"مستحق اور غیر مستحق کا لحاظ تو ہونا ہی چاہئے۔ ایسے کاہلوں کو کھلانا پلانا انہیں اصل میں زہر دینا ہے۔ زہر سے تو صرف جان نکل جاتی ہے مگر یہ خاطر داری تو روح کو ہلاک کر دیتی ہے! اگر یہ حضرت مہینہ بھر بھی یہاں رہ گئے تو پھر تمام عمر کیلئے بیکار ہوجائیں گے۔ پھر ان سے کچھ نہ ہوسکے گا اور اس کا سارا الزام تم پر ہوگا۔

دلائل کا سلسلہ جاری رہا ثبوتوں کے ڈھیر لگ گئے۔ رامیشوری کھسیا کر چلی گئی۔ کندن لال کبھی اس سے مطمئن بھی ہوسکتے ہیں، اونکے اندیشوں کی برکھا کبھی بند بھی ہوسکتی ہے، یہ سوال اسکے دل میں بار بار پیدا ہونے لگا۔

(۵)

ایک روز دیہات سے بھینس کا تازہ گھی آیا۔ ادھر مہینوں سے بازار کا گھی کھاتے کھاتے ناک میں دم تھا۔ رامیشوری نے اوسے تایا، اوسمیں لونگ ڈالی اور اوسے کڑھائی پر نکالکر ایک مٹکی میں رکھدیا۔ اوسکی سوندھی سوندھی مہک سے سارا گھر بسا ہوا تھا۔ مہری چوکا برتن کرنے آئی تو اوسنے چاہا کہ مٹکی کو چوکے سے اوٹھاکر کسی طاق وغیرہ پہ رکھدے۔ مگر جونہی اوس نے مٹکی اٹھائی کہ اتفاقاً وہ اسکے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی کل گھی بہ گیا گرنے کی آواز سنکر رامیشوری دوڑی تو دیکھا کہ مہری کھڑی رو رہی ہے اور مٹکی چور چور ہوگئی ہے۔ تڑپ کر بولی مٹکی کیسے ٹوٹ گئی؟ تیری تنخواہ سے دام کاٹ لوں گی۔ رانڈ سارا گھی مٹی میں ملادیا۔ تیری آنکھیں پھوٹ گئی تھیں کیا یا ہاتھوں میں سکت نہ تھی؟ اتنی دور سے منگایا، اتنی محنت سے گرم کیا مگر ایک بوند بھی گلے کے نیچے نہ گیا۔ اب کھڑی بسور کیا رہی ہے؟ جا، اپنا کام کر!

مہری نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ بہو جی، اب تو چوک ہوگئی، چاہے طلب کاٹو، چاہے جان مارو۔ میں نے تو سوچا، اٹھاکر آلیے (طاق) پر رکھدوں۔ کیا جانتی تھی کہ بھاگ میں یہ لکھا ہے نجانے کس ابھاگے کا منہ دیکھکر اٹھی تھی!

رامیشوری میں کچھ نہیں جانتی۔ سب روپے تیری تنخواہ سے وصول کرلوں گی، اوپر سے ایک روپیہ جرمانہ نہ کیا تو کہنا

مہری رو دوں گی سرکار کہیں ایک پیسے کا ٹھکانا نہیں۔

رامیشوری مر جا یا جی جا، میں کچھ نہیں جانتی۔

مہری نے ایک منٹ تک کچھ سوچا اور پھر کہا۔ اچھا، کاٹ لینا سرکار! آپ سے صبر نہیں ہوتا۔ میں صبر کر لونگی۔ یہی نہ ہوگا۔ بھوکوں مر جاؤنگی۔ جی کر ہی کونسا سکھ بھوگ رہی ہوں کہ مرنیکو ڈروں؟ سمجھ لونگی، ایک مہینہ کوئی کام نہیں کیا۔ آدمی سے بڑا بڑا نقصان ہو جاتا ہے، یہ تو تھوڑا ہی تھا۔

رامیشوری کو ایک ہی لمحہ میں مہری پر رحم آگیا۔ بولی۔ تو بھوکوں مر جائے گی تو میرا کام کون کرے گا؟

مہری کام کرنا ہوگا، کھلائے گا، نہ کام کرنا ہوگا بھوکوں مارئیے گا۔ آج سے اگر آپ ہی کے دوارے سویا کرونگی۔

رامیشوری۔ سچ کہتی ہوں، آج تو نے بڑا نقصان کر ڈالا۔

مہری۔ میں تو آپ ہی پچھتا رہی ہوں، سرکار۔

رامیشوری۔ جا، گوبر سے چوکا لیپ دے، مٹکی کے ٹکڑے دور پھینک دے، اور بازار سے گھی لیتی آ۔

مہری نے خوش ہو کر چوکے کو گوبر سے لیپ دیا اور مٹکی کے ٹکڑے سمیٹ ہی رہی تھی کہ کندن لال آگئے اور مٹکی کو ٹوٹا ہوا دیکھکر بولے۔ یہ ہانڈی کیسے ٹوٹ گئی؟

رامیشوری نے کہا مہری اوٹھا کر اوپر رکھ رہی تھی کہ اسکے ہاتھ سے چھوٹ پڑی۔

کندن لال نے چلا کر کہا۔ تو سب گھی بہ گیا؟

"اور کیا کچھ بچ بھی رہا"

"تم نے مہری سے کچھ کہا نہیں؟"

"کیا کہتی؟ اس نے جان بوجھکر تو گرا نہیں دیا"

"یہ نقصان کون اوٹھائے گا؟"

"ہم اٹھائیں گے اور کون اٹھائے گا؟ اگر میرے ہی ہاتھ سے چھوٹ پڑتی تو کیا ہاتھ کاٹ ڈالتی؟"

کندن لال نے ہونٹ چبا کر کہا۔ تمھاری کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ جس نے نقصان کیا ہے، اوس سے وصول ہونا چاہئے۔ یہی قدرتی اصول ہے آنکھ کی عوض آنکھ، جان کی عوض جان، یہ عیسیٰ جیسے رحمدل انسان کا قول ہے۔ اگر سزا کا رواج دنیا سے اٹھ جائے تو یہاں رہے کون؟ ساری زمین خون سے سرخ ہو جائے ہتیارے دن دہاڑے لوگوں کا گلا کاٹنے لگیں۔ سزا ہی سے سوسائٹی کا وجود قایم ہے۔ جسدن سزا نہ رہے گی، دنیا نہ رہے گی۔ سمرتیوں کے بنانے والے منو مہاراج وغیرہ بیوقوف نہیں تھے کہ سزا کے اصول کو اسقدر اہمیت دے گئے۔ اور کسی خیال سے نہیں تو مرجاد کی حفاظت کے لئے سزا ضرور دینی چاہئے یہ روپے مہری کو دینے پڑیں گے، ورنہ آج اُسنے گھی کی ہانڈی توڑ ڈالی ہے، کل کوئی اور نقصان کر گزرے گی

رامیشوری نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ میں نے تو اُسے معاف کر دیا ہے۔

کندن لال نے آنکھیں نکال کر کہا۔ لیکن میں نہیں معاف کر سکتا

مہری دروازہ پر کھڑی یہ باتیں سن رہی تھی۔ جب اس نے دیکھا کہ کندن لال کا غصہ بڑھتا ہی جاتا ہے اور میرے سبب رامیشوری کو جھڑکیاں سننی پڑ رہی ہیں تو سامنے جاکر بولی۔ بابوجی! اب تو کسور ہو گیا، آپ سب روپے میری طلب سے کاٹ لیجئے۔ روپے نہیں ہیں، نہیں تو ابھی لاکر آپکے ہاتھ میں رکھ دیتی۔

رامیشوری نے اُسے جھڑک کر کہا۔ جا بھاگ یہاں سے، تو کیا کرنے آئی؟ بڑی روپے والی بنی ہے!

کندن لال نے بیوی کی طرف تیز نگاہوں سے دیکھکر کہا۔ تم کیوں اسکی وکالت کر رہی ہو؟ یہ موٹی سی بات ہے اور ایسے ایک بچہ بھی سمجھتا ہے کہ جو نقصان کرتا ہے اسے اسکی سزا بھگتنی

پڑتی ہو تیسا کیوں پانچ روپے کا نقصان اٹھاؤں؟ کوئی وجہ؟ کیوں نہیں اسنے ہانڈی کو سنبھالکر پکڑا کیوں اتنی جلد بازی کی کیوں تمہیں بلاکر مدد نہیں لی؟ یہ صاف اسکی لاپرواہی ہو۔

یہ کہتے ہوئے کندن لال باہر چلے گئے۔

(۶)

رامیشوری اس توہین سے آزردہ خاطر ہوگئی۔ ڈانٹنا ہی تھا تو کمرہ میں بلاکر تنہائی میں ڈانٹتے۔ مہری کے سامنے اُسے کپاس کی طرح اوٹ ڈالا۔ اس کی سمجھ ہی میں نہ آتا تھا کہ یہ کس طبیعت کے آدمی ہیں۔ آج ایک بات کہتے ہیں، کل اسی کو کاٹتے ہیں، اب جیسے کوئی خبطی ہو۔ کل تو رحم وفیاضی کے اوتار بنتے تھے، کہاں آج پانچ روپے کے لئے جان دینے لگے۔ بڑا مزہ آجائے جو کل مہری بیٹھ رہے۔ کبھی تو انکے منہ سے خوشی کا ایک لفظ نکلا ہوتا! اب مجھے بھی اپنا رویہ بدلنا پڑے گا۔ یہ سب میرے سیدھے ہونے کا نتیجہ ہے۔ جیوں جیوں میں طرح دیتی ہوں، آپ جامہ سے باہر ہوتے جاتے ہیں۔ اس کا علاج یہی ہے کہ ایک کہیں تو دس سناؤں۔ آخر کہاں تک اور کہاں تک برداشت کروں کوئی حد بھی ہو! جب دیکھو تب ڈانٹ رہے ہیں۔ جس کے مزاج کا کچھ پتہ ہی نہ ہو اُسے کون خوش رکھ سکتا ہے؟ اس دن ذرا سا بلی کو مار دیا تو آپ دیا کا اپدیش دینے لگے۔ آج وہ دیا کہاں گئی؟ انہیں ٹھیک کرنے کی تدبیر یہی ہے کہ سمجھ لوں، کوئی کتا بھونک رہا ہے انہیں، ایسا کیوں کروں؟ اپنی طبیعت سے کوئی کام ہی نہ کروں۔ وہ جو کہیں وہی کروں، نہ جو بھر کم نہ زیادہ۔ جب انہیں میرا کوئی کام پسند ہی نہیں آتا تو کیا مجھے کتے نے کاٹا ہے جو خواہ مخواہ اپنی ٹانگ اڑاؤں؟ بس یہی ٹھیک ہے!

وہ تمام رات اسی اُدھیڑبن میں پڑی رہی۔ سویرے کندن لال دریا نہانے گئے۔ لوٹے تو نو بج گئے تھے۔ گھر میں جاکر دیکھا تو چوکا برتن نہوا تھا۔ روح خشک ہوگئی۔ پوچھا کیا مہری نہیں آئی؟

رامیشوری۔ نہیں۔

کندن۔ تو پھر؟

"جو آپ کا حکم۔"

"یہ تو بڑی مشکل ہے"

"ہاں، ہے تو"

"پڑوس کی مہری کو کیوں نہ بلا لیا؟"

"کس کے حکم سے بلاتی؟ اب حکم ہوا ہے بلائے لیتی ہوں"

"اب بلاؤ گی تو کھانا کب پکے گا؟ نو بج گئے ہیں اتنا تو تمہیں اپنی عقل سے کام لینا چاہئے تھا کہ مہری نہیں آئی تو پڑوس والی ہی کو بلالیں۔"

"اگر اسوقت سرکار پوچھتے کہ کیوں دوسری مہری بلائی تو کیا جواب دیتی؟ اپنی عقل سے کام لینا چھوڑ دیا، اب تمہاری ہی عقل سے کام لوں گی۔ میں یہ نہیں چاہتی کہ کوئی مجھے آنکھ دکھلائے۔"

"اچھا تو اسوقت کیا ہونا ہے؟"

"جو حضور کا حکم ہو"

"تم مجھے بناتی ہو۔"

"میری اتنی مجال کہ آپ کو بناؤں۔ میں حضور کی لونڈی ہوں جو کہئے وہ کروں"

"میں جاتا ہوں، تمہارا جو جی چاہے کرو"

"جائیے، میرا جی کچھ نہ چاہے گا اور نہ کچھ کروں گی"

"آخر تم کیا کھاؤ گی؟"

"جو آپ دیدیںگے وہ کھالونگی"

"لاؤ بازار سے پوریاں لادوں"

"رامیشوری روپے نکال لائی۔ کندن لال پوریاں لائے اسوقت کا کام چلا۔ دفتر گئے۔ لوٹے تو دیر ہوگئی تھی آتے ہی پوچھا۔ مہری آئی؟

رامیشوری۔ نہ

"میں نے تو کہا تھا، پڑوس والی کو بلا لینا"

"بلایا تھا، وہ پانچ روپے مانگتی ہے"

"تو ایک ہی روپیہ کا تو فرق تھا، کیوں نہیں رکھ لیا؟"

"مجھے یہ حکم نہ ملا تھا۔ مجھ سے جواب طلب ہوتا کہ ایک رُپیہ زیادہ کیوں دیدیا، کفایت کا' پدیش دیا جانے لگتا تو کیا کرتی؟

"تم بالکل جاہل ہو"

"بالکل"

"تو اس وقت بھی کھانا نہ پکے گا؟"

"مجبوری ہے"

کندن لال سر پکڑ کر پلنگ پر بیٹھ گئے، یہ تو نئی مصیبت سر پڑی۔ پوریاں انہیں پسند نہ تھیں۔ دل میں بہت جھنجھلائے رامیشوری کو دو چار کھری کھوٹی سنائیں لیکن اسنے گویا سنا ہی نہیں۔ کچھ بس نہ چلا تو مہری کی تلاش میں نکلے مگر جس کے یہاں گئے، معلوم ہوا کہ مہری کام کر کے چلی گئی۔ آخر ایک کہار ملا، اوسے بلا لائے۔ کہار نے دو آنہ لئے اور برتن صاف کر کے چلتا بنا

رامیشوری نے کہا۔ کھانا کیا بنے گا؟

کندن۔ روٹی ترکاری بنا لو یا اسمیں بھی کچھ عذر ہے؟

"ترکاری گھر میں نہیں ہے"

"دن بھر بیٹھی رہیں، ترکاری بھی نہ لیتے بنی اب اتنی رات گئے ترکاری کہاں ملے گی؟"

"مجھے ترکاری لے رکھنے کا حکم نہ ملا تھا۔ میں پیسہ دھیلا زیادہ دیدیتی تو؟

کندن لال نے بے بسی سے دانت پیسکر کہا آخر تم چاہتی کیا ہو؟ رامیشوری نے اطمینان کے لہجہ میں جواب دیا۔ کچھ نہیں صرف ذلت نہیں چاہتی۔

"تمہیں ذلیل کون کرتا ہے؟

"آپ کرتے ہیں"

"تو میں گھر کے معاملہ میں کچھ نہ بولوں؟"

"آپ نہ بولیں گے تو کون بولے گا؟ میں تو صرف حکم کی تعمیل کرنے والی ہوں"

رات کو روٹی دال پر قناعت کرنی پڑی۔ دونوں لیٹے رامیشوری کو تو فوراً نیند آگئی۔ کندن لال بڑی دیر تک کروٹیں بدلتے رہے اگر رامیشوری اس طرح اسہیوگ کرے گی تو ایک دن بھی کام نہ چلے گا۔ آج ہی بڑی مشکل سے کھانا ملا۔ اسکی سمجھ ہی الٹی ہے۔ میں تو سمجھاتا ہوں اور یہ سمجھتی ہے کہ ڈانٹ رہا ہوں۔ مجھ سے بغیر بولے رہا بھی تو نہیں جاتا۔ لیکن جب بولنے کا یہ نتیجہ ہے تو بولنا ہی فضول ہے۔ نقصان ہوگا۔ بلا سے یہ تو نہ ہوگا کہ دفتر سے آکر بازار بھاگوں۔ مہری سے روپے وصول کرنے کی بات اسے بُری لگی اور تھی بھی بیجا۔ روپے نہ ملے، الٹا مہری نے کام چھوڑ دیا

رامیشوری کو جگا کر بولے۔ کتنا سوتی ہو تم؟

رامیشوری۔ مزدوروں کو نیند بہت آتی ہے

"بگڑا ہو مت۔ مہری سے روپے نہ وصول کرنا"

"وہ تو لئے کھڑی ہے شاید"

"اسے معلوم ہو جائیگا تو کام کرنے آئے گی"

"اچھی بات ہے، کہلا بھیجونگی"

"آج سے میں کان پکڑتا ہوں تمہارے بیچ میں نہ بولونگا"

"اور جو میں گھر لٹا دوں تو ؟"

"لٹا دو چاہے مٹا دو مگر رو ٹھو مت۔ اگر تم کسی بات میں مجھ سے صلاح لو گی تو دیدوں گا ورنہ منہ نہ کھولوں گا۔"

"میں بے عزتی نہیں برداشت کر سکتی"

"اس غلطی کو معاف کرو"

"سچے دل سے کہتے ہو نہ ؟"

"سچے دل سے !"

بزم سعید

منیجر صاحب کچھ فرماتے ہیں | انجوری کی مختصر و جامع بارگاہ سے مجھے ہدایت ہوئی ہے کہ چونکہ اس پرچہ کے ساتھ "سعید" کی اشاعت کا پہلا سال ختم ہوتا ہے اسلئے میں قدردانان "سعید" کو مطلع کردوں کہ ان میں سے جو صاحب شروع سے خریدار ہوئے تھے انکا چندہ ختم ہوگیا۔ اور چونکہ وی پی کرنے کی صورت میں ہر خریدار کی جیب سے تین آنے بیوجہ و بےسبب نکلکر ڈاکخانے کے محکمہ میں پہونچ جاتے ہیں اسلئے مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ سب صاحبان اپنے چندہ کا روپیہ منی آرڈر کے ذریعہ سے ارسال فرماکر رقم کو بچالیں اور خواہ مخواہ محکمہ ڈاک کے خزانوں میں اتنے بوجھ کا اضافہ نکریں۔ میرا خیال ہے کہ اگر کسی طرح بھی الٹ پھیر کرکے یہی پیسے دفتر "سعید" کو مل سکنے کا امکان ہوتا تو منیجر صاحب کا مشورہ اس سے مختلف ہوتا اور وہ اسی کو پسند کرتے کہ صبح سے شام تک بیٹھے ہوئے وی پی کے فارم بھرا کریں اور رسالہ ہمیشہ وی پی کے ذریعہ سے بھیجا کریں۔ لیکن چونکہ ایسا نہیں ہے اور کسی طریقہ سے بھی ان پیسوں تک منیجر صاحب کی رسائی نہیں ہوسکتی اسلئے انہیں یہ مفت کی دردسری اور کئی روز کی مسلسل محنت شاقہ ناگوار ہے اور وہ یہی چاہتے ہیں کہ لوگ انکی آسانی کو نہیں بلکہ "اپنے فائدہ" کو مدنظر رکھکر چندہ منی آرڈر کے ذریعہ سے ارسال کردیں۔

بادی النظر میں خیال یہی ہوتا ہے کہ اس درخواست میں منیجر صاحب کی آسان پسندی کو ہمدردی خریداران کی بہ نسبت زیادہ دخل ہے، لیکن اگر کسی کی کوئی ایسی درخواست ہو کہ جس سے ہمیں فائدہ پہونچے اور ساتھ ہی ساتھ اسے بھی کچھ آرام مل جائے تو میرے خیال میں اسے صرف اس شک پر مسترد نہ کردینا چاہئے کہ وہ خودغرضی کی بنا پر کی گئی ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ منی آرڈر کے ذریعہ چندہ بھیجنے میں خود آپ ہی کا فائدہ ہے۔ اور جبکہ بہرصورت تین روپے "پھینکنے" ہی ہیں تو انکے ساتھ تین آنے اور بھی کیوں پھینکے مجھے امید ہے کہ اس رسالہ کے پہونچتے ہی وہ تمام اصحاب کہ جو اگست ۱۹۲۸ء سے رسالہ کے خریدار ہوتے تھے جلد سے جلد اپنا چندۂ سال آیندہ کیلئے ارسال فرماکر مجھے ممنونیت کا اور منیجر صاحب کو دوپہر کے وقت دو گھنٹے روزانہ سو رہنے کا موقع عنایت فرمائینگے۔

چند سطریں "سعید" کے متعلق | "سعید" کے متعلق میرے پاس خریداروں اور "دیدار بازوں" دونوں کے بہ کثرت خطوط آئے ہیں۔ انمیں بہت بڑی زبردست اکثریت تو ان خطوط کی ہے جن میں "سعید" کو پسند کیا گیا ہے، اور اسکی کسی بات پر کوئی اعتراض، اور اس کی پالیسی اور طرز اشاعت کے متعلق کوئی شکایت نہیں ہے ایک معقول تعداد ایسے خطوط کی ہے جن میں اسکے مضامین اور عام ترتیب تدوین پر تو اظہار اطمینان کیا گیا ہے لیکن اس بات کی شکایت کی گئی ہے کہ اسکی اشاعت بروقت نہیں ہوتی۔ ایک بہت ہی مختصر اقلیت ان خطوط کی ہے کہ جن میں تعریف کسی بات کی نہیں کیگئی ہے، اور بے قاعدہ اشاعت کے متعلق شکایت بھری پڑی ہے۔

ان تمام خطوط کو پڑھکر نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ "سعید" سے اگر اسکے قدردانوں کو کچھ شکایت ہے تو صرف یہ کہ وہ باقاعدہ ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع نہیں ہوتا رہا ہے مجھے اپنے قصور کا اعتراف ہے اور یہ شکایت میرے سر آنکھوں پر لیکن میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ کیا ایسی اتفاقی مجبوریاں بھی قابل معافی نہیں ہیں کہ جیسی مجھے لاحق رہی ہیں؟ میں نے صحت کی جس خرابی کے باوجود پرچہ نکالا ہے اسے میں ہی جانتا ہوں اور اگر میں ایسا نہ کرتا تو ناممکن تھا کہ سال بھر میں آپکو "سعید" کے پورے بارہ پرچے مل سکتے۔ میں آپکو یقین دلاتا ہوں کہ اس بیقاعدگی کا باعث نہ میری سستی تھی اور نہ بے پروائی اور یہ واقعہ ہے کہ بستر علالت پر پڑے پڑے بھی مجھے غالباً سب سے زیادہ فکر اسی بات کی رہتی تھی کہ پرچہ نہ نکل سکے گا۔

یہ عذر لنگ یا معقول پیش کردینے کے بعد اب میں پھر یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگرچہ "سعید" نے آپ کی کوئی حق تلفی نہیں کی ہے پھر بھی میں نادم ہوں کہ میری مسلسل علالت کیوجہ سے ہر مہینے آپکو اسی مہینے کا پرچہ نہ ملا لیکن وہ وقت گذر چکا، اور اب خدا نے چاہا تو تا حد امکان آپ کو اتنی سی شکایت کا بھی موقع نہ ملیگا جن اصحاب کے دل میں رفتار زمانہ کو دیکھکر یہ شکوک پیدا ہوسکتے تھے کہ شاید "سعید" بند ہو جائیگا ان سے بھی میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ "سعید" کی زندگی سعید کے ساتھ ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ سالہا سال تک مستقل ماہانہ خسارہ کو برداشت کرنا میری حیثیت اور میری استعداد سے باہر ہے اسلئے اگر آپ "سعید" کی زندگی کے خواہاں ہیں تو نئے نئے خریدار دیکر اسے زندہ رکھنے کی کوششوں میں میرا ہاتھ بٹائیے۔ میں ہی اسکے لئے مضامین لکھوں میں ہی اسے ترتیب دوں، میں ہی اسکے لئے خریدار فراہم کرنیکی خاطر دورے کروں اور پھر میں ہی بال بچوں کے لئے آب و دانہ مہیا کروں، یہ سب کام اس قدر زیادہ ہیں کہ اندیشہ ہے کہ کہیں میں گھبرا نہ جاؤں۔ اگر فراہمی خریداران کی طرف سے مجھے اطمینان ہوجاتے تو ظاہر ہے کہ اتنا بہت سا وقت مجھے پرچے کی ترقی اور اصلاح کیلئے اور بھی مل سکتا ہے جسکے دوسرے معنی یہ ہیں کہ میں اس سے بھی بہتر طریقے پر آپ کی خدمت کرسکتا ہوں، اور جلد سے جلد "سعید" کو وہ چیز بنا سکتا ہوں کہ جو بنانا چاہتا ہوں۔

مجبوب المطابع برقی پریس دہلی میں چھپوا کر سعید احمد پرنٹر و پبلشر نے کوچہ چیلان دہلی سے شائع کیا۔

جلد ۲
نمبر

باتصویر
ماہوار رسالہ

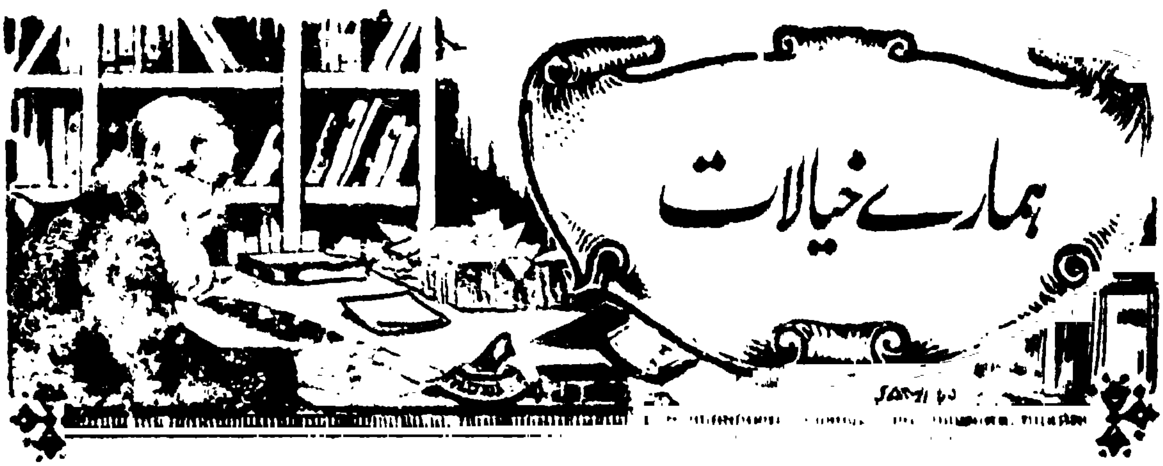
اگست
۱۹۳۲ء

ایڈیٹر
سعید احمد
بریلوی

سعید دہلی

قیمت
سالانہ تین روپے ... سے
ششماہی ..... ۱؎۲
فی پرچہ ۴

فہرست مضامین



کچھ پایا؟ یا کچھ کھویا؟

سرکار برطانیہ کے دربار سے بالآخروہ فرقہ دارانہ فیصلہ صادر ہوگیا کہ جس کا مدتوں سے انتظار کیا جارہا تھا، اور جس کے متعلق ہمارے بہت سے خودساختہ لیڈروں نے ہمیں یہ امیدیں دلائی تھیں کہ اس میں اگر ہمارے چودہ کے چودہ نہیں تو کم سے کم دس بارہ مطالبات تو ضرور ہی منظور کرلئے جائیں گے، اور یہ یقینی طور پر ہمارے لئے ان تمام فیصلوں سے بہتر ہوگا کہ جو اس سے پہلے ملک کی مختلف انجمنوں کی طرف سے پیش اور ہمارے ان "بہی خواہانِ قوم" کی "مبارک" کوششوں کی بدولت مسترد کئے جاچکے تھے۔

ہمیں کیا کچھ ملا ہے؟ اس کا جواب اگر خود ڈاکٹر سر محمد اقبال صاحب کی زبان سے سنا جائے تو بہت مناسب ہوگا جو نام نہاد آل مسلم پارٹیز کانفرنس کے صدر تھے اور جنہیں "بندہ و خواجہ" کی داستانیں لکھتے لکھتے خواجہ برطانیہ پر ضرورت سے زیادہ اعتماد پیدا ہوگیا تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے اس فیصلہ پر اچھی طرح غور کرنے کے بعد جو رائے قائم کی ہے اور جس کا اعلان بھی وہ اخبارات کے ذریعہ سے کرچکے ہیں۔ یہ ہے کہ اس فیصلہ نے سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں کو پہونچایا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے جو کچھ کہا ہے بالکل صحیح کہا ہے اور اسی دن کو ڈر کر قوم پرور مسلمان انکی خدمت میں یہ عرض کیا کرتے تھے کہ ہمیں بطور خود ہندؤں کے ساتھ سمجھوتا کرلینا چاہئے دنیا کی کوئی قوم بھی ایسے مطالبات کے آگے سر نہیں جھکایا کرتی کہ جسکے پس پشت کوئی طاقت موجود نہو۔ برطانوی قوم اس سے بہت زیادہ عقلمند ہے کہ جیسا ہمارے "حقوق پرست" دوستوں نے اسے سمجھ رکھا تھا۔ اسے مسلمانوں کے مطالبات کی قوت اور طاقت کا پورے طور پر علم تھا اور وہ ان مسلم رہنماؤں کے خلوص اور جذبات ہمدردی سے بھی اچھی طرح واقف تھی کہ جو ان مطالبات کے منوانے پر مصر تھے۔ ایسی صورت اور ایسی حالت میں ہمیں یہی کچھ مل سکتا تھا کہ جو ملا، یا یوں کہہ لیجئے کہ ہم سے اسی قدر چھینا جانا چاہئے تھا کہ جس قدر چھین لیا گیا۔

سندھ بدستور صوبہ بمبئی کا ایک حصہ ہے، بلوچستان کی حالت اسی طرح تغیر ناپذیر ہے کہ جیسی تھی، صوبہ سرحد ابھی تک

دوسرے صوبوں کے برابر کی حیثیت حاصل نہیں کر سکا ہے، اور پنجاب و بنگال کہ جن کی اکثریت کا تذکرہ ہر وقت ہماری زبانوں پر رہتا تھا اور جہاں ہماری سب سے بڑی اور سب سے مقدم خواہش تھی کہ ہماری اکثریت کو آئینی طور پر تسلیم کر لیا جائے وہاں ہماری آئینی اقلیت تسلیم کر لیگئی ہے اور ہمیں اپنی تجویز کو پاس کرانے کے لئے عیسائیوں اور دیسی انگریزوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ گویا جن دو صوبوں میں ہمیں واقعی اور حقیقی اکثریت حاصل تھی وہاں بھی اس عجیب و غریب فیصلہ کی بدولت یا یہ کہیئے کہ اپنے "عقلمند" رہنماؤں کے ہاتھوں ہم اقلیت میں آ گئے، اب سمجھ میں نہیں آتا کہ "ہندو پرست" اور "ہندوؤں کے نمک خوار"، جیسے خطابات ان بزرگوں کے لئے زیادہ موزوں ہیں کہ جنہوں نے پنجاب اور بنگال میں بھی ہماری حقیقی اکثریت کو آئینی اقلیت میں تبدیل کرا دیا یا ان تھوڑے سے حق پرست مسلمانوں کے لئے کہ جو یہ سمجھایا کرتے تھے کہ اگر ہندو ہمارے چودہ مطالبات تسلیم کر رہے ہیں تو ہمیں مخلوط انتخاب منظور کر کے ان سے سمجھوتا کر لینا چاہئے۔ کیا مخلوط انتخاب کا نتیجہ کسی طرح اس سے بھی زیادہ برا نکل سکتا تھا کہ پنجاب اور بنگال میں پچاس پچاس نشستیں بھی مسلمانوں کو نہ ملیں؟ لیکن مخلوط انتخاب ہمارے ان نمایندوں کو کیسے گوارا ہو سکتا تھا کہ جو یقین کے ساتھ جانتے ہیں کہ جداگانہ انتخاب کے ساتھ ساتھ انکی بھی کرسی نشینی کا خاتمہ ہے اور مخلوط انتخابات کی صورت میں ایسے ممبروں کو ایک ووٹ بھی نہیں مل سکتا کہ جنہیں کرسیوں پر بیٹھکر اونگھنے کے سوا اور کچھ آتا ہی نہیں، اور جن کی قابلیتیں اگر ظاہر ہوتی ہیں تو اس صورت میں کہ بدکاری اور فحش کے انسداد کے لئے جو تجویز کونسل میں پیش ہو اسے اپنی کوششوں سے مسترد کرا دیں

کیا اپنا سب کچھ کھو کر بھی مسلمانوں کو ہوش نہ آئیگا؟

اور کیا اب بھی وہ اسی طرح آنکھیں بند کئے اپنے انہی خود غرض اور گمکردہ راہ رہنماؤں کے پیچھے پیچھے چلے جائیں گے؟ کیا ذلت و رسوائی کا ابھی کوئی اور درجہ باقی ہے کہ جسکے بغیر رعایت طے کرانے کے لئے ان کرسی پرست پیشواؤں کی قیادت کی ضرورت ہے؟

خدا نہ کرے!! افغانستان کے پر مصلحت سفر سے واپس آکر اگلے وقتوں کے "ضیغم اسلام" اور "رئیس الاحرار" مولانا شوکت علی صاحب نے اپنے ایک بیان میں جہاں اور بہت سی باتیں کہی ہیں وہیں یہ بھی فرمایا ہے کہ "ہندو مجھے اپنا دشمن خیال کرتے ہیں انکا یہ خیال غلط ہے۔ میں ہندوؤں کا دشمن نہیں ہوں"

ہمیں مولانا کے ساتھ دلی ہمدردی ہے۔ اصل یہ ہے کہ یہ ہندوؤں کی قوم کچھ ہے ہی بڑی "احسان فراموش" مولانا ایک عرصہ سے مسلمانوں کے ساتھ کھلی ہوئی دشمنی کر رہے ہیں اور وہ پھر بھی انہیں ہندوؤں کا دشمن خیال کرتی ہے۔

خدا نہ کرے جو مولانا ہندوؤں کے دشمن ہوں، ان کی دشمنی کے لئے دس کروڑ مسلمان ہی کیا تھوڑے ہیں!

نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت
سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

روحانی قوت کے کرشمے بیس ستمبر کو مہاتما گاندھی کے برت کا اعلان ہوتے ہی ہندوستان کے طول و عرض میں ایک کہرام مچ گیا۔ ہر شخص اپنی جگہ پر مضطرب اور بے چین تھا کہ دیکھئے اس فاقہ کشی کا

انجام کیا ہو۔ ہر شہر اور ہر قصبہ میں جلسے کئے گئے، جلوس نکالے گئے تقریریں ہوئیں اور ہزارہا کی تعداد میں لوگوں نے انکی تقلید میں اس دن روزہ رکھا اور برابر چوبیس گھنٹے بھوکے رہے۔ عورتیں اس طرح رو رہی تھیں کہ جیسے انکا کوئی قریبی عزیز مرگیا ہو، بوڑھے اس طرح بے چین تھے کہ گویا انکا اپنا جوان بیٹا دم توڑ رہا ہے، بچے اس طرح پریشان اور بدحواس تھے کہ جیسے انکا باپ ان سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوتا ہو اور جوانوں کے چہروں پر ایسی مردنی چھائی ہوئی تھی کہ گویا انکا قوت بازو ان سے جدا ہو کر انہیں دائمی مفارقت کا داغ دے گیا ہے۔ جسے دیکھو پریشان، جسے دیکھو سراسیمہ اور حیران، غرضکہ ہر طرف ایک عجیب بے بسی اور بدحواسی چھائی ہوئی تھی۔ لوگوں کو حقیقتاً اپنے سر پا کا ہوش نہ تھا، اور کچھ ایسی کیفیت ہوگئی تھی کہ جیسے کوئی آتش فشاں پہاڑ پھٹ پڑا ہو، زمین ہل رہی ہو، جھٹکے پر جھٹکے آرہے ہوں، اور لوگ گھبرائے ہوئے بدحواس ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر مارے مارے پھرتے ہوں کہ اب کیا کریں۔

ہفتاد سالہ بوریا نشین کے پاس نہ بندوقیں تھیں نہ توپیں، نہ ہوائی جہاز تھے نہ مسلح موٹر کاریں، نہ تارپیڈو کشتیاں تھیں نہ زہریلے گیس، لیکن ان مادی قوتوں میں سے ایک چیز بھی موجود نہونے کے باوجود اسکے پاس کوئی ایسی قوت ضرور تھی کہ جس نے اسکے اعلان میں صور محشر کی طاقت بھر دی اور اسکی زبان سے دو لفظ نکلتے ہی صرف ہندوستان میں نہیں بلکہ تمام دنیا میں، اس دنیا میں بھی کہ جہاں حقارت کے ساتھ سے "لنگوٹی بند فقیر" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ہلچل مچ گئی۔ ہندوستان کی حکومت نے اسکی مشروط رہائی کا اعلان کردیا، انگلستان کے پادریوں نے گرجاؤں میں جاکر اسکی زندگی اور اسکی کامیابی کے لئے دعائیں مانگیں، اور لندن کے ہوٹل کی خادمہ نے چوبیس گھنٹہ کا برت اسکی تقلید اور پیروی میں رکھکر اپنی عقیدت کا نذرانہ پیش کیا۔

خود ہندوستان کے اندر کیا ہوا۔ بڑے بڑے مقدس اور متبرک مندر کہ جنکے پچاس گز کے اندر بھی کسی اچھوت کا پہنچ جانا گوارا نہ ہو سکتا تھا اچھوتوں اور دلت جاتیوں کے لئے کھولدیئے گئے۔ کٹر سے کٹر ہندوؤں کے کنوؤں پر اچھوتوں کی عورتوں کو پانی بھرنے کی اجازت مل گئی۔ اونچی سے اونچی ذات کے برہمنوں نے کہ جو کل تک کسی اچھوت کا سایہ بھی اپنے اوپر پڑنا برا سمجھتے تھے اور اگر کسی اتفاق سے یہ سایہ پڑ ہی جائے تو گھنٹوں بدن کو رگڑ رگڑ کر دھوتے اور نہاتے تھے اور پھر بھی یہ شک ہی رہتا تھا کہ نجاست خدا جانے دور ہوئی یا نہیں ہوئی ان برہمنوں نے کھلے دل سے چوہڑوں اور چماروں کو انہی چوہڑوں اور چماروں کو کہ جنکا سایہ تک نجس اور ناپاک تھا بلا تکلف گلے سے لگالیا۔ بڑے بڑے ودیاوان پنڈت کہ جو خود اپنے بھائی کے ہاتھ کے پکے ہوئے کھانے کو بھی ناپاک خیال کیا کرتے تھے اور ہمیشہ اپنی رسوئی اپنے ہاتھ سے بناتے تھے اس حد تک نیچے اتر آئے کہ اچھوتوں کے ہاتھ کی بنی ہوئی رسوئی سے بھی انہیں کوئی پرہیز نہ رہا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہندو مہا سبھا کی صدارت کے لئے اچھوت ذات کے ایک لیڈر کا نام پیش کردیا گیا۔

کیا دنیا کی تاریخ اس سے بڑے کسی انقلاب کی مثال پیش کرسکتی ہے؟ اور کیا کبھی کسی بڑے سے بڑے طاقتور اور عظیم المرتبت شہنشاہ کو بھی یہ عزت اور یہ ہردلعزیزی حاصل

ہوتی ہے کہ اس کے ایک اشارہ پر کروروں کی تعداد میں لوگ اپنے باپ دادا کے معتقدات، اور اپنی ہزار ہا سال کی پڑی ہوئی ایسی رسوم کہ جو مذہب کا درجہ حاصل کر چکی تھیں سب کچھ چھوڑ بیٹھیں۔ یہی نہیں بلکہ اسے آمادۂ مرگ دیکھکر سینکڑوں اس کے ساتھ فاقہ کشی کر کے مرنے کے لئے تیار ہو جائیں؟

کیا دنیا کی کسی مادی قوت کے ذریعہ سے کروروں انسانوں کی ایسی عدیم النظیر عقیدتمندی حاصل ہو سکتی ہے؟ اگر نہیں تو کیا اب بھی مادی قوتوں کے پجاری - اور دولت و قوت کے آستانوں کے بھکاری یہی کہے جائیں گے کہ روحانی قوت کوئی چیز نہیں ہوتی اور حق و صداقت کی طاقتیں محض فرضی افسانے ہیں؟

کیا اب بھی ان لوگوں کو کہ جنکے دل توپ و تفنگ کی ہیبت صداؤں سے مرعوب ہو چکے ہیں اس بات کا یقین نہ آئیگا کہ دنیا میں حق و صداقت سے بڑھکر کوئی طاقت نہیں ہے، اور انسانی دلوں پر اگر حکومت کی جا سکتی ہے تو صرف اسی ایک طاقت کے ذریعہ سے کیجا سکتی ہے؟

دنیا ہمارے سامنے بڑی بڑی طاقتور اور ہیبت ناک شخصیتیں پیش کر چکی ہے۔ روما پر نیرو کی خدائی کی داستانیں ابھی لوگوں کو یاد ہیں، اور چنگیز خان اور ہلاکو کے ناموں سے اب بھی بہت سے دل کانپ جاتے ہیں۔ لیکن کیا نیرو کی فرعونیت کبھی حق پر غالب آ سکی، اور کیا چنگیز یا ہلاکو ممالک اسلامی کو تباہ و برباد کر کے اسلام کو دنیا سے مٹانے میں کامیاب ہو سکے؟

اس کے بالمقابل تاریخ ہمارے سامنے بہت سی ایسی مثالیں پیش کرتی ہے کہ جن میں محض بے نوا فقیروں نے تن تنہا بڑے بڑے قبیلوں، اور قوموں کو اپنا مسخر کر لیا، اور اچھے اچھے شاہان ذی اقتدار کہ جنکے ایک اشارہ پر ہزار ہا سر تن سے جدا کئے جا سکتے تھے ادنیٰ غلاموں کی طرح ان درویشوں کے حضور میں جاتے اور انکے آستانے پر اپنا سر نیاز جھکاتے تھے کیا ان دلق پوش فقیروں کے پاس حق و صداقت اور خلوص و روحانیت کے علاوہ کوئی اور قوت تھی؟ اگر نہیں، تو کیسے کہا جا سکتا ہے کہ ذی طاقتوں کے سوا اور کوئی طاقت حقیقی اور قابل تسلیم نہیں ہے

اسکندر اعظم، نپولین، محمود غزنوی، نادر شاہ سب دنیا کی طاقتور ہستیاں اور عظیم الشان ہستیاں تھیں۔ بڑی بڑی قوموں نے انکی طاقت کے سامنے سر جھکائے، اور دنیا کے ایک بڑے حصہ نے انکی قوت کا لوہا مانا، لیکن انکے نام اگر آج ہمیں معلوم نہیں تو صرف تاریخ کی بدولت اگر تاریخ نہوتی تو دنیا بھر میں انکا نام لیوا آج ایک بھی نہ ہوتا انکے بالمقابل خواجہ اجمیری، سلطان نظام الدین اولیاء، کبیر، سورداس، اور بابا نانک ایسی شخصیتیں تھیں کہ جو دنیا کی ہر قسم کی ظاہری اور مادی قوت سے محروم تھیں پھر بھی انہوں نے محض اپنی صداقت اور روحانیت کی بدولت اپنے اپنے زمانے میں کروروں انسانوں کے دلوں پر حکمرانی کی، اور گو انہیں اس دنیا سے سدھارے صدہا سال گذر چکے ہیں لیکن آج بھی بچہ بچہ کے دل میں انکی یاد تازہ ہے اور لاکھوں انسانوں کے سر انکا نام سنتے ہی ادب و تعظیم سے جھک جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں اگر کوئی اصلی اور حقیقی طاقت ہے تو وہ صداقت اور خلوص ہی ہے، اور دنیا کی قوت خواہ وہ بظاہر کتنی ہی مہیب اور دہشتناک کیوں نہو

اس طاقت کے مقابلے میں نہیں آ سکتی۔ اسمبلی کی کرسیاں کونسلوں کی نشستیں، کانفرنسوں کی نمایندگی اور دھواں دھار تقریریں سب اپنی اپنی جگہ پر اچھی اور کارآمد چیزیں ہیں لیکن اسی وقت کہ جب دل میں حق و صداقت کا نور ہو اور دماغ میں خلوص و ہمدردی کا سرور۔ اور یہ چیزیں اگر موجود ہوں تو اکثریت اور اقلیت کا فرق کوئی معنی نہیں رکھتا حق کی حمایت میں اٹھنے والا ایک ہاتھ، اور حق کے اعلان میں کھلنے والی ایک زبان سینکڑوں ہاتوں اور ہزاروں زبانوں پر بھاری ہوا کرتی ہے۔

نقد و تبصرہ

نیرنگ دہلی کا افسانہ نمبر

ہم اس سے پہلے بھی "نیرنگ" کے متعلق یہ رائے ظاہر کر چکے ہیں کہ اسکی ترتیب باسلیقہ اور ہنرمند ہاتھوں سے عمل میں آتی ہے، اور اب اس افسانہ نمبر کے دیکھنے کے بعد ہمیں دلی مسرت ہے کہ ہمیں اپنی اس رائے کی صحت کا ایک مزید ثبوت مل گیا۔ ماہوار پرچوں کی دنیا میں خاص نمبر اور خاص نمبروں میں بھی خصوصیت کے ساتھ افسانہ نمبر ایک بہت ہی عام چیز ہو گئی ہے۔ روز مرہ کسی نہ کسی پرچے کا افسانہ نمبر نکلتا رہتا ہے اور بسا اوقات یہ دیکھکر افسوس ہوتا ہے کہ ان نمبروں میں جنکی ظاہری آب تاب آنکھوں کو خیرہ، اور جنکے متعلق پروپگنڈے کا شہرہ کانوں کو گنگ کر دیتا ہے، اس سے زیادہ اور کچھ بھی نہیں ہوتا کہ کہیں نہ کہیں سے چند افسانے جن میں شاید طبع زاد ایک بھی مشکل سے ہوتا ہے جمع کر کے خریداروں کے سامنے پیش کر دیئے جاتے ہیں، اور پھر اس "طبل بلند بانگ و در باطن ہیچ"، کی فرضی خوبیوں کا خود ہی ڈھول بجا بجا کر اعلان کیا جاتا ہے۔

"نیرنگ" دہلی کا افسانہ نمبر ان لغویات سے بالاتر ہے اور اسے دیکھکر ماننا پڑتا ہے کہ اسے ترتیب دینے والا ایک فن کے حسن و قبح سے بھی واقف ہے، اور اس بات کو بھی سمجھتا ہے کہ خاص نمبروں میں کیا ہونا چاہئے۔

اس افسانہ نمبر کی قیمت آٹھ آنے ہے اور مینیجر رسالہ "نیرنگ" پھیلی والان دہلی سے مل سکتا ہے۔

نیرنگ کا ادبی مرقع

نیرنگ میں ماہ بماہ جو تصاویر نکلتی رہی ہیں انہی کو مجموعی صورت میں ترتیب دیکر ایک حسین اور دل کش مرقع کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ "نیرنگ" میں جو تصویریں چھپتی رہتی ہیں وہ بالعموم اچھی ہوتی ہیں اسلئے ظاہر ہے کہ انہی تصویروں کا مجموعہ کسی طرح بھی کوئی معمولی چیز نہیں ہو سکتا۔ اس مرقع کی یہ ایک خصوصیت ہے کہ ہر تصویر کے ساتھ جو نظم یا مضمون نیرنگ میں شائع ہو چکا ہے وہ بھی اسکے مقابل کے صفحے پر موجود ہے، اور اس طرح گویا ضیافت نظر کے ساتھ ساتھ ضیافت طبع کا سامان بھی مہیا کر دیا گیا ہے۔

قیمت آٹھ آنے (۸) مینیجر رسالہ نیرنگ پھیلی والان دہلی سے مل سکتا ہے



بی ہمسائی

(از سعید احمد)

"توبہ! کیا کھڑکی کے کواڑ توڑ ڈالو گی؟ ذرا ہاتھ دھولوں ابھی آتی ہوں۔ یا تو دو دن سے بالکل ہی غائب ہیں یا اب آئیں تو ایسے کہ جیسے بھونچال آگیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔ لو کہو اب کیا کہتی ہو میں آگئی۔"

حمیدہ۔ اوہ! آپا آپ کو تو دالان سے کھڑکی تک آنے میں بھی گھنٹہ بھر لگ جاتا ہے۔

فہمیدہ۔ بہن میں نے کہہ تو دیا تھا کہ میرے ہاتھ سنے ہوئے ہیں ہاتھ دھولوں تو آؤں۔ تم نے اتنی دیر میں کنڈی کواڑ سب توڑ ڈالے

حمیدہ۔ (ہنسکر) میں نے تو دو دن سے آپ کو دیکھا نہیں تھا اسلئے جلدی لگی ہوئی تھی کہ کسی طرح آپکو دیکھ لوں۔

فہمیدہ۔ مجھے دیکھنے کی جلدی لگی تھی یا ڈاکٹرنی کی باتیں سنانے کیلئے پیٹ میں درد ہو رہا تھا؟

حمیدہ۔ آپا سچ مچ وہ باتیں ہی ایسی ہیں کہ آپ کو سنائے بغیر مجھے چین ہی نہیں آسکتا۔

فہمیدہ۔ میں تو پہلے ہی جانتی تھی۔ کہو کیا کیا دیکھا، کیا کیا سنا؟ ڈاکٹرنی کیسی آدمی ہیں؟

حمیدہ۔ میں سچ کہدوں کہ انکے گھر جا کے مجھے تو ایسا معلوم ہوا کہ میں جنت میں پہونچ گئی؟

فہمیدہ۔ وہ کیوں؟

حمیدہ۔ میں نے اپنی عمر میں کبھی کاہے کو ایسا گھر دیکھا تھا۔ اول تو مکان ہی بڑا عالیشان ہے۔ بڑے بڑے اور خوب ہوادار دالان خوب اونچی اونچی چھتیں، لمبی چوڑی الگنائی، پکا فرش ہر ایک کمرے میں روشنی اور ہوا کے لئے کھڑکیاں، جا بجا قرینے سے گملوں میں پھولوں کے پیڑ، ایک چیز ہو تو بتاؤں، وہ تو سچ مچ کی بہشت ہے۔۔۔۔۔۔ اور ہاں خوب یاد آیا، آپا انکے گھر کا پاخانہ دیکھ کے تو آپ بھی دنگ رہ جائیں گی۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔۔ لے ہے ایسا روشن اور ہوادار کمرہ ہو کہ میں سچ کہدوں دوپہر کے وقت میرا تو یہی دل چاہا کہ وہیں چارپائی بچھا کے خوب مزے سے سو جاؤں۔

فہمیدہ۔ لے ہے بہن تمہاری بھی کیسی باتیں ہیں!

بیدہ۔ آپا وہ تو سارے گھر سے زیادہ خوبصورت بنا ہوا ہے ٹائلوں کا تو فرش ہے اور دیواروں پر آدھی آدھی دور تک ام ٹائل لگے ہوئے ہیں پھر خوبی یہ کہ کہیں نام کو بھی کسی قسم کی بو نہیں (قہقہہ لگا کر) آپا ایک بڑا تماشا ہوا کل دو تین بیویاں اور بھی انکے گھر مہمان آئی ہوئی تھیں۔ ایک بیچاری کوئی میری ہی طرح سیدھی سادھی تھیں انہیں پاخانے کی ضرورت ہوئی لوٹا لیکے پاخانہ کے کمرہ میں جو گھسیں تو بیچاری حیرت میں رہ گئیں۔ انہوں نے کاہے کو اس قسم کا کوئی پاخانہ دیکھا تھا چھوٹے چھوٹے لکڑی کے بکس سے رکھے تھے اور انکے اندر اعلیٰ درجہ کے نفیس اور خوبصورت چینی کے برتن۔ اب بھلا وہ کیسے یہ سمجھ لیتیں کہ ایسی غلیظ چیز کے لئے ایسے عمدہ برتن رکھے گئے ہونگے۔ بہت دیر تک تو انہیں یہی شک رہا کہ وہ پاخانے کی بجائے کسی اور کمرے میں تو نہیں آگئی ہیں جس میں ڈاکٹرنی صاحبہ کے دواخانے کا کچھ سامان رکھا ہے، مگر چونکہ خود ڈاکٹرنی صاحبہ انہیں پہنچا گئی تھیں اسلئے وہ وہیں ٹھیری رہیں ورنہ ضرور باہر نکل آتیں۔ اتنے میں اتفاق سے انکی نظر آبدست کے قدمچہ پر پڑ گئی اور چونکہ یہ ایسی چیز تھی کہ جس سے انکی نگاہیں مانوس تھیں اسلئے انہیں یقین آگیا کہ وہ کمرہ تھا تو پاخانہ ہی۔ کچھ دیر تک غور کرنے کے بعد انہوں نے یہ سمجھ بھی لیا کہ صفائی کے خیال سے شاید ایسا ہو کہ ایسے عمدہ برتن چوکیوں میں لگا کر رکھدیئے ہوں مگر پھر بھی انکی ہمت کسی طرح نہ پڑی کہ چوکی پر بیٹھیں اور بیچاری اسی آبدست کے قدمچے میں فراغت کر کے چلی آئیں۔ اب اتفاق کی بات کہ ذرا ہی سی دیر کے بعد ڈاکٹرنی صاحبہ بھی پیشاب یا پاخانے کی ضرورت سے وہاں گئیں۔ انہوں نے جو یہ دیکھا کہ قدمچے کے اندر نفیس اور خوبصورت ٹائلوں پر تمام غلاظت پڑی ہوئی ہے۔ تو انکا جی متلانے لگا اور وہ وہاں سے الٹے پاوں بھاگیں آتے ہی خادمہ کو بھیکر حلال خوری کو بلوایا اور اسی وقت اپنے سامنے سارا پاخانہ دھلوایا۔ ان بیگم صاحبہ سے کسی نے کچھ کہا تو نہیں مگر اب وہ ایسی بیوقوف بھی نہ تھیں کہ یہ نہ سمجھ جاتیں کہ یہ ساری دقت انہی کی وجہ سے اٹھانی پڑی تھی بیچاری پر گھڑوں پانی پڑ گیا، اور جب آخر اُن سے کسی طرح نہ رہا گیا تو انہوں نے بڑی لجاجت سے ڈاکٹرنی صاحبہ سے معافی مانگی۔

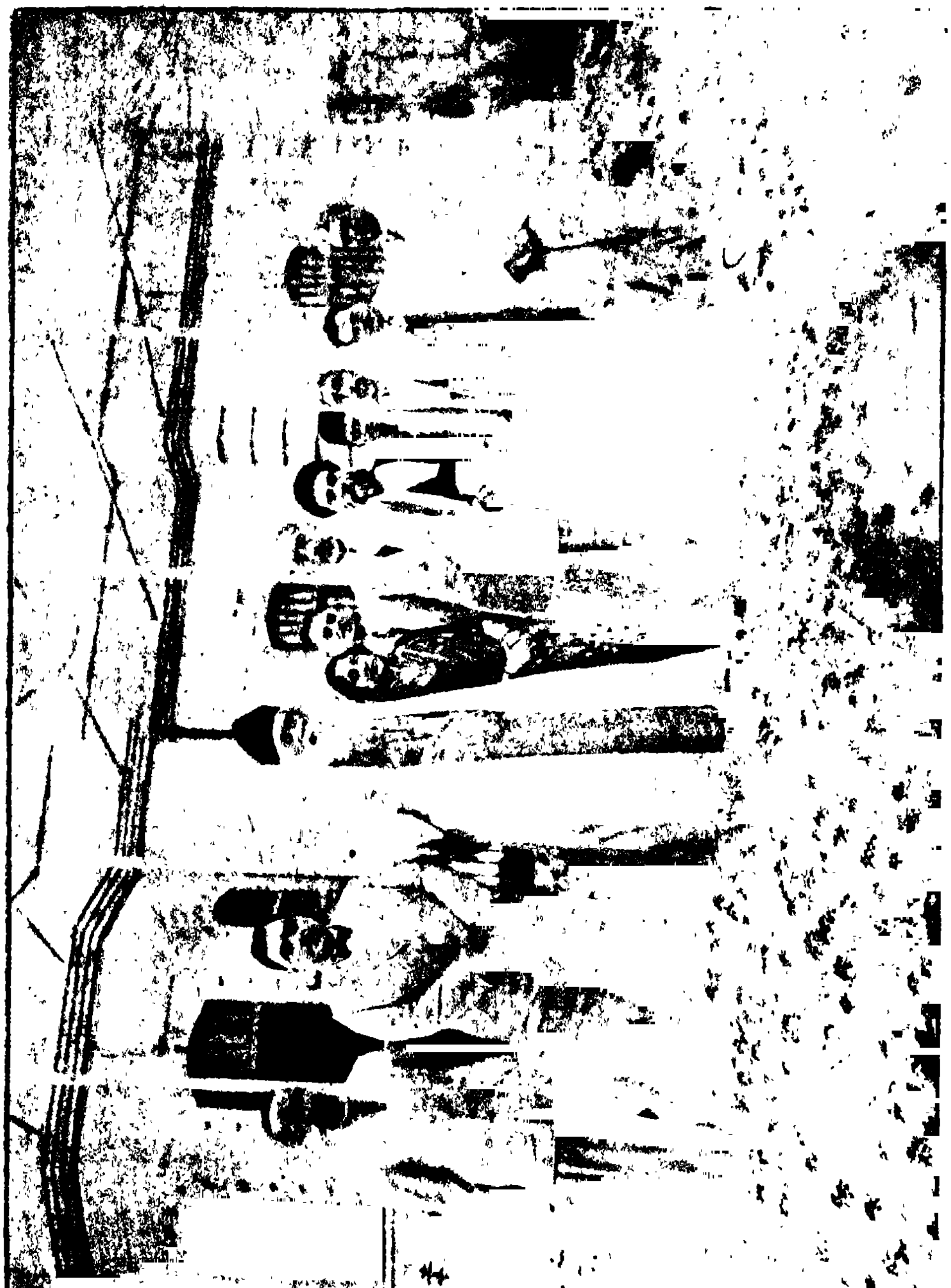
ڈاکٹرنی کو ناگوار تو بہت گذرا تھا مگر ہیں آدمی بڑی خوش خلق فوراً کہنے لگیں۔

"بہن مجھے اس میں تکلیف ہی کیا ہوئی۔ روزمرہ پاخانہ اسی طرح دھلا کرتا ہے، اور بالفرض اگر مجھے کچھ تکلیف بھی ہوتی تو قصور بھی تو میرا اپنا ہی تھا۔ مجھے چاہئے تھا کہ میں آپ کو بتا دیتی۔ آپکے لئے تو یہ نیا گھر ہے آپکو کیا معلوم کہ اس میں کیا کیا چیزیں ہیں کہاں کہاں ہیں، اور کس قسم کے انتظام ہیں۔ آپ ذرا بھی خیال نہ کریں اس میں بات ہی کیا تھی"

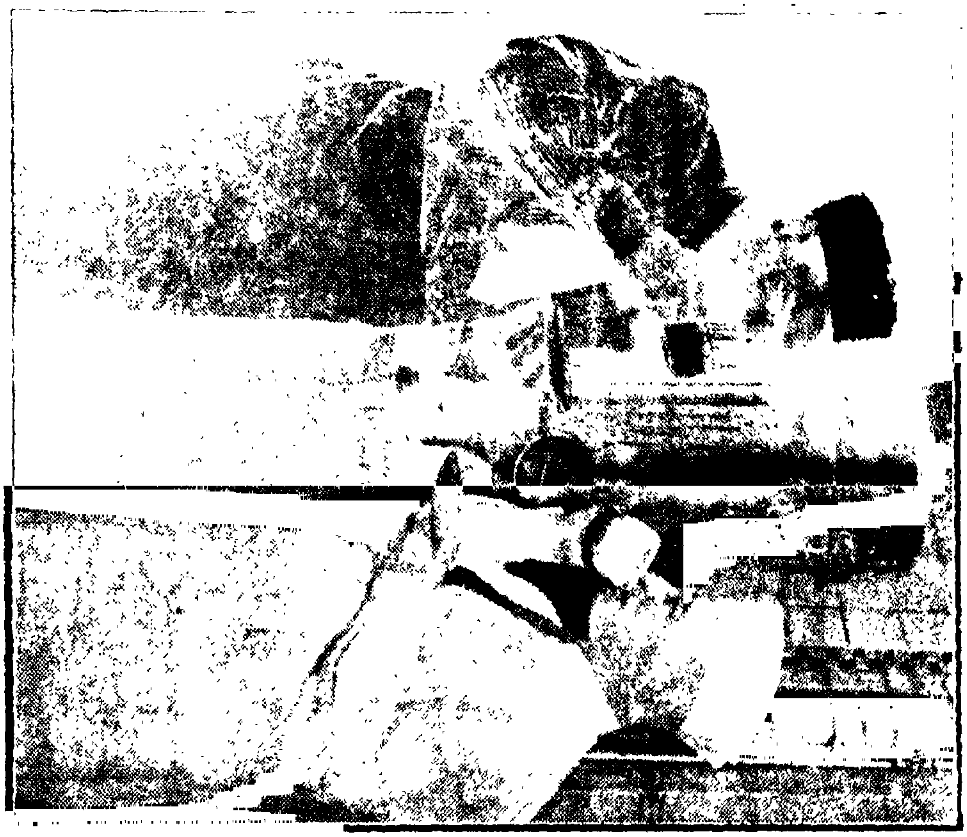
فہمیدہ۔ آدمی عقلمند معلوم ہوتی ہیں۔

حمیدہ۔ آپا صرف عقلمندی نہیں بلکہ بڑی سلیقہ ور اور منتظم بھی ہیں۔ میں تو ایک ہی دن میں انکے قاعدوں اور قانونوں کو دیکھ کے گھبرا گئی، کیا مجال جو ذرا سی کوئی چیز بھی ادھر سے ادھر ہو جائے۔ کسی نے کوئی چیز چھوئی یا اٹھائی تو وہ چاہے باتیں ہم سے کرتی رہیں مگر نگاہ اسی پر رہیگی اور اگر اسنے سے صحیح جگہ پر نہیں رکھا ہے تو فوراً بھاگی ہوئی پہونچیں گی اور اسی کے سامنے اس چیز کو اٹھا کر اسکی صحیح جگہ پر رکھدیں گی۔

لے لو آج تو وہ ابھی سے کچہری سے آگئے! اچھا آپا پھر کسی وقت



ہندوستان کے ملک الشعراء ڈاکٹر ٹیگور عروس البلاد بغداد میں



مہاتما گاندھی کے معتقد امریکن ہندوستانی کھدر کے لباس میں



ابی سینیا (ملک حبش) کے ولیعہد کی شادی



ہندوستان اور قومیت

(ڈاکٹر ٹیگور کی وہ معرکۃ الآرا تقریر جو ۲۰ء میں انہوں نے امریکہ میں کی تھی)

(ترجمہ از جناب سید ابن حسن صاحب شارق دہلوی)

ہندوستان کا حقیقی مسئلہ سیاسی نہیں بلکہ سماجی ہے یہ امر ہندوستان ہی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ دنیا کے جملہ ممالک کا بھی سچ پوچھو تو یہی حال ہے۔ محض سیاسی مسائل ہندوستان کی حالت درست نہیں کر سکتے۔

چونکہ مغرب میں سیاست ہی کو مقصد اصلی سمجھا جاتا ہے اسلئے ہم ہندوستانی بھی اس بارے میں یورپ کی کورانہ تقلید کرنے پر تلے ہوتے ہیں اور سیاست ہی کو تمام مشکلات کا واحد حل سمجھے ہوئے ہیں حالانکہ حقیقت کچھ اور ہی ہے یورپ میں مختلف اقوام وملل کی ذات ایک ہی ہے اس وجہ سے وہاں کی تہذیب نے سیاسی اور تجارتی صورت اختیار کرلی ہے۔ زمانہ ماسبق سے ابتک اول تو یورپ کے باشندوں کے مابین آپس میں اسقدر پیچیدگیاں ہی پیدا نہیں ہوئیں دوسرے یورپ والوں کو ازمنہ وسطیٰ میں طاقتور ہمسایوں کا مقابلہ کرنا پڑا لہذا ان میں کامل اتحاد پیدا ہو جانا ایک فطری امر تھا۔ حالات ہی اس بات کے مقتضی تھے کہ ایک قوم دوسری قوم کے حرکات وسکنات کا بغور مطالعہ کرتی رہے۔ قدیم زمانہ میں یورپ کے باشندے منظم ومتحد ہوکر ڈاکے ڈالتے رہتے تھے۔ آجکل بھی یہی جذبہ موجود ہے اور یورپ کے باشندے زیادہ بڑے پیمانہ پر منظم ہوکر ساری دنیا کو لوٹ رہے ہیں۔

ابتدائے آفرینش سے لیکر آجتک ہندوستان کے سامنے صرف ہندوستان ہی کے مسائل زیر بحث رہے ان میں سب سے اہم اور مہتم بالشان مسئلہ ذات کا مسئلہ تھا۔ ہر قوم کا علیحدہ ایک خاص مشن ہوتا ہے چنانچہ باوجود گوناگوں مصائب کے ہندوستان سے فطرت نے ایک خاص کام لیا۔

ہندوستان نے مختلف ذاتوں کو علیٰ قدر مراتب درجے دیئے اور انکے حقیقی اختلافات کو تسلیم کر لیا ہندوستان نے یہ انضباط مدارج اس لئے کیا کہ وہ کسی طرح مختلف فرقوں میں "ایک" اساس اتحاد قایم کرسکے۔ یہ اساس اتحاد ہند کے رشیوں مہنتوں اور ولیوں نے پیدا کیا۔ ہم دیکھتے ہیں نانک۔ کبیر۔ چیتنیہ وغیرہ مذہبی پیشواؤں نے جملہ اقوام ہند کے سامنے "ایک" درس دیا اور وہ توحید الٰہی کا درس تھا۔

ہر شخص میں کچھ نہ کچھ خود غرضی ضرور موجود ہوتی ہے اور اسکی فطرت بہ پاس اسکے ذاتی مفاد کے تحفظ کیلئے اسے جنگ و جدال پر آمادہ کرتی ہے۔ لیکن باوجود اس وحشیانہ جذبہ کے انسانی فطرت میں ہمدردی اور امداد باہمی کا پاک جذبہ بھی ودیعت کیا گیا ہے اور وہ اقوام جن میں اس بلند اخلاقی معیار کی کمی ہے اور جو باہم متفق و متحد ہو کر زندگی نہیں گزار سکیں یا تو صفحہ ہستی سے مٹ جاتی ہیں یا غلامی کی زندگی بسر کرتی ہیں جو در حقیقت موت ہی کا مترادف ہے دنیا میں صرف وہی لوگ زندہ رہتے ہیں اور وہی مہذب کہلاتے ہیں جو آپس میں اشتراک اور تعاون کرتے ہیں ابتدائی تاریخ سے انسان کے سامنے صرف دو ہی لائحہ عمل رہے یا تو اس نے جنگ کرنا پسند کیا یعنی اپنے ذاتی اغراض و مقاصد کو مقدم رکھا یا سب لوگوں کے مفاد کا ابتدائی زمانہ میں جبکہ ہر ملک کی جغرافیائی حدود اور ذرائع آمد و رفت کی آسانیاں محدود تھیں یہ مسئلہ بھی خفیف سا تھا۔ اپنے اپنے علاقوں میں لوگ متحد و منظم ہو جانا کافی سمجھتے تھے۔ یہ اتحاد اکثر دوسروں کے خلاف ہوتا تھا لیکن بایں ہمہ اس سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اتحاد و تعاون کا اخلاقی جذبہ انہیں موجود تھا اور اسی جذبہ کا اثر انکے علوم و فنون۔ سائنس و مذہب پر پڑتا تھا۔

موجودہ زمانہ کا سب سے اہم واقعہ یہی ہے کہ انسان کی تمام مختلف نسلوں۔ قوموں اور فرقوں کے مابین ایک دوسرے کے ساتھ بہت قرب ہو گیا ہے۔ تاہم اب بھی انسان کے سامنے وہی دو سوال درپیش ہیں یا تو وہ مختلف گروہ بنا کر ایک دوسرے کے ساتھ لڑتے جائیں یا باہمی صلح و آشتی کا حال معلوم کرلیں۔ آیا مسابقت جاری رکھی جائے یا اشتراک معاونت پر عمل کیا جائے میں یہ کہتے ہوئے ذرہ بھر متذبذب نہیں کہ وہ لوگ جنہیں پریم اور روحانی اتحاد کی اخلاقی قوت موجود ہے اور جنہیں اجنبیوں کے خلاف جذبہ حقد و عناد موجود نہیں اور جو اس قدر ہمدرد اور وسیع النظر ہیں کہ دوسروں کے حالات و واقعات کا اندازہ کرنے کے لئے اپنے تئیں خود اُن کی جگہ تصور کرلیتے ہیں۔ یقیناً آیندہ آنے والے زمانہ میں مستقل اور پائیدار جگہ حاصل کرنے کی بہترین اہلیت رکھتے ہیں اور وہ لوگ جو اجانب سے جنگ و عدم رواداری کے جذبہ کی مسلسل پرورش کرتے رہتے ہیں بے شک فنا ہو جائینگے یہی مسئلہ ہے جو اس وقت ہمارے سامنے ہے اور جسے حل کرنا ہمارا فرض ہے۔

بڑے بڑے عظیم الشان نظام جو دوسروں کو ستانے کے لئے قایم کئے گئے ہیں اور جو کمزوروں کو محض اپنے ذاتی مفاد کے لئے ترقی کرنے سے روکتے ہیں ہمارے لئے مفید ثابت نہیں ہونگے۔ برعکس اسکے اپنی مہیب جسامت د

وزن کے اور انتہائی گراں اور قیمتی ہونے کے یہ نظام ہماری بڑھتی ہوئی سچی تہذیب و آزادی کے راستہ میں سد باب بن گئے۔

قوموں کے دوران ارتقاء میں اخوت و مساوات میں سے اخلاقی جذبات کو جغرافیائی حدود نے محدود و مسدود کر دیا تھا اسلئے کہ پہلے زمانہ میں جغرافیائی حدود بیشک حقیقی حدود تھیں لیکن آجکل یہ حدود قدیم روایات کے خیالی خطوط ہیں اب وقت آگیا ہے یا تو انسان اپنی اخلاقی فطرت کو کام میں لاکر اس اہم مسئلہ کو نہایت سنجیدگی و ایثار سے حل کر دے یا خود فنا ہو جائے۔ جغرافیائی حدود کے مٹ جانے سے جہاں بہت سے فائدے ہوتے ہیں وہاں ایک نقصان بھی ہوا ہے یعنی اس سے دنیا میں حرص و ہوا۔ بغض و نفرت جیسے کمینے جذبات کی اشاعت ہوگئی اگر ان کمینے جذبات کی پرورش و اشاعت کا سلسلہ برابر جاری رہا اور اقوام موجودہ اسلحہ جات دن دونی رات چوگنی بڑھاتی رہیں اور خوبصورت زمین کو کارخانوں کی گندگی اور غلیظ و کثیف دھواں اپنی لپیٹ میں لیتا چلا گیا تو وہ دن یقیناً دور نہیں جسے لوگ قیامت کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔

اسلئے ضرورت ہے کہ انسان اپنی تمام قوتیں محبت اور رواداری جیسے مقدس جذبات کی اشاعت میں صرف کر دے تاکہ جمہور کے اخلاق بھی سنور جائیں اور ان کی آنکھوں میں وہ نور پیدا ہو جائے جس سے وہ قوموں کے مختلف گروہوں کی بجائے ساری دنیا کے باشندوں کو مجموعی طور پر ایک نظر دیکھ سکیں۔

ہندوستان کے باشندے ہمیشہ سے کسی ایسی شئے کے متلاشی رہے ہیں جو مختلف اقوام و ملل میں عام و مشترک ہو اور جو اُن اقوام کے درمیان حقیقی رشتہ الفت و اتحاد پیدا کر سکے۔ دنیا کی کوئی قوم جس کی بنیاد محض سیاسی اور تجارتی اتحاد پر ہو مذکورہ بالا اصول اتحاد کو بہتر نہیں سمجھ سکتی۔

ہندوستان نے "قومیت" کا مفہوم صحیح معنوں میں کبھی معلوم نہیں کیا۔

اگرچہ بچپن ہی سے مجھے اس امر کی تلقین کی گئی ہے کہ قوم کی پرستش کرنا خدا اور انسانیت کی تعظیم سے بھی زیادہ اہم ہے لیکن یہ تلقین میرے واسطے اب بے معنی ہو چکی ہے میرا اعتقاد ہے کہ میرے وطنی بھائی اس خطرناک تلقین کے خلاف جہاد کر کے ہی اپنی آزاد کر سکیں گے۔

تعلیم یافتہ ہندوستانی مغربی تواریخ سے سبق حاصل کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں اور واقعات کے اسباب نتائج کا تعلق ہندوستان سے کرتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم ہندوستانی غیر ممالک کی تواریخ مستعار نہیں لے سکتے یہ اندھی تقلید تو خودکشی کا مرادف ہو۔ ہمیں مغربی تہذیب کے کورانہ اتباع سے فائدہ تو درکنار سخت نقصان پہونچنے کا قوی امکان ہے۔ ہر قوم کو اپنا رستہ خود بنانا چاہئے ہمارے سامنے ہمارا مستقبل ہے جو یقیناً اعلیٰ اور ارفع اخلاقی مقاصد کا منتظر ہے۔ انسان کے لئے یہ بھی ایک امتیازی شرف ہے کہ وہ ایسے کام کرے جنکا پھل اسکو اپنی زندگی میں نہ مل سکے۔ ہمارے مقاصد اعلیٰ ہونگے تو ہماری آیندہ آنے والی نسلیں اُس سے فائدہ اٹھائیں گی۔ ہم مغربی تہذیب کی من وعن تقلید کیوں کریں جبکہ مغربی تہذیب بذات خود مشرق میں ناخواندہ مہمان کی حیثیت سے وارد ہوئی ہے

ہمیں دکھانا چاہئے یہ کہ مغرب نے مشرق میں آکر مشرق سے کیا سبق حاصل کیا اور اس طرح مشرق نے دنیا کی تاریخ میں کس چیز کا اضافہ کیا۔ ہندوستان مغرب کا بھکاری تو نہیں ہے اور اگرچہ مغرب اسے بھکاری سمجھے تو بھی اسکے یہ معنی نہیں کہ مغربی تہذیب زبردستی ہندوستان کے سر منڈھی جائے اس سے میرا مقصد ہرگز یہ نہیں کہ ہندوستانی مغربی تہذیب سے قطعاً متاثر نہ ہوں۔ محبت اور رواداری جیسے زرین اصولوں کو کسی حالت میں بھی بھلانا نہ چاہئے۔ ہاں اتنا ضرور کہونگا کہ مغرب کو اپنے مفاد کے حصول کی خاطر دنیا بھر کے لئے مصیبت اور لعنت کی پوٹ نہ بن جانا چاہئے۔ مغرب کا تو فرض یہ ہے کہ وہ مشرقی جہالت کے اندھیروں کو علم کی روشنی سے منور کرے اور کمزور ممالک کی حتی الامکان مدد کرے اور اس حقیقی خطرے سے باخبر رہے کہ طاقتور کمزور کو حد سے زیادہ مجبور کرکے اسکو مقابلہ کرنے کی جرأت اور طاقت دیدیتا ہے اور تنگ آمد بجنگ آمد کا مضمون ہوتا ہے مغرب کو غور کرلینا چاہئے کہ "مادیت" ہی کو منتہائے کمال سمجھنا زبردست غلطی ہے۔ مقصد اصلی تو مادیت کی قیود سے روحانیت کو آزاد کرانا ہے۔ میں کسی ایک مخصوص قوم کے خلاف نہیں ہوں۔ بلکہ لفظ قوم کے اس عام تخیل کے خلاف ہوں جو آجکل جملہ اقوام عالم میں جاری و ساری ہے

آخر قوم کیا ہے؟

جملہ افراد کا ایک منظم قوت کی حیثیت میں منضبط ہونا!

اس تنظیم کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ افراد قوم حصول قوت کی پیہم سعی کرتے رہیں لیکن اس سعی پیہم سے قوم کی وہ قوت سلب ہوتی رہتی ہے۔ جو اسے اعلیٰ فطرت انسانی کی طرف رجوع کرتی ہے۔ قوت عمل۔ قربانی۔ تخلیق جیسے اعلیٰ جذبات فی الحقیقت اسی اعلیٰ فطرت انسانی کا نتیجہ ہیں۔ ہر فرد قوم قیام تنظیم کے لئے اسقدر جدوجہد کرتا ہے کہ اسے اصول اخلاق کو بھی نظر انداز کر دینے میں باک نہیں ہوتا اور اسی لئے وہ انسانیت کے لئے سب سے زیادہ خطرناک شے بنجاتا ہے۔

یہ اسی بدترین جذبہ کا اثر ہے کہ اُن لوگوں نے جو آزادی کے عاشق ہیں دنیا کے بڑے حصہ کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔ وہ لوگ جو منصف اور دیانتدار کہلاتے ہیں اسی ناپاک جذبہ کی وجہ سے اندھے بن گئے ہیں اور بے دردی اور سفاکی سے اپنے ذاتی اغراض و مقاصد کیخاطر دوسروں کے حقوق غصب کر رہے ہیں اور پھر بھی یہی کہے جاتے ہیں کہ مظلوم اس سے زیادہ بہتر سلوک کا مستحق ہی نہ تھا ایسے لوگوں کی ضمیر کی آنکھ بند ہے اور انکو سوائے اپنے مفاد کے اور کچھ نہیں سوجھتا۔

قومیت دنیا میں ایک بدترین لعنت ہے۔

میرا عقیدہ ہے کہ ہندستان کو اسوقت ایسے تعمیری کام کی ضرورت ہے جو اس کے بطن سے خود بخود پیدا ہو اس تعمیر کے سلسلہ میں ہمکو بڑی سے بڑی مصیبت کا سامنا کرنا چاہئے اور نہایت بامردی اور مستقل مزاجی سے اپنا فرض انجام دینا چاہئے خواہ ادائیگی فرض کے سلسلہ میں ہمکو جیلوں ہی میں کیوں نہ جانا پڑے اس طرح ہم اپنی ناکامیوں اور اذیتوں سے ہر قدم پر اخلاقی فتح حاصل کرینگے۔ ہمیں ان لوگوں پر ثابت کرنا ہے جو آجکل ہم پر مسلط ہیں کہ ہم میں اخلاقی قوت موجود ہے یعنی سچائی کی خاطر اذیتیں اٹھانے کی قوت۔

ہمارا مقصد بھیک مانگنا نہیں ہے بلکہ بے نفس ہو کر قربانیاں کرنے کے لئے متحد ہو جاتا ہے۔

میں سامعین کی توجہ ایک بار پھر ہندوستان کے گوشتہ مصائب کی طرف منعطف کرنا چاہتا ہوں۔ ہندستان کا مسئلہ ایک محدود مسئلہ نہیں ہے جو صرف ہندوستان ہی سے وابستہ ہو۔ ہندوستان ایک بر اعظم ہے اس کا رقبہ وسیع ہے اور اس میں مختلف نسلوں کے لوگ آباد ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مختلف ممالک کے مجموعے کا نام ہندوستان رکھدیا گیا ہے۔ اسکے برعکس یورپ فی الاصل ایک ملک ہے جسے مختلف غیر قدرتی حصوں میں کر دیا گیا ہے۔ یورپ اپنے ارتقاء تہذیب و تمدن کے ضمن میں متعدد ممالک کی مجموعی قوت بھی رکھتا ہے اور بہ ہیئت مجموعی "ایک" کی بھی۔ برخلاف اسکے ہندوستان کئی ممالک کا نام ہے جسے محض اتفاق نے ایک کر دیا ہے اسلئے اختلافات اقوام اور فقدان اتحاد (اتنے بڑے براعظم میں ایسا ہونا غیر فطری نہیں) کی وجہ سے سخت خسارے میں رہا۔ ہندوستان کی حمایت میں کہا جا سکتا ہے کہ اختلاف اقوام ہندوستان کی پیدا کی ہوئی شے نہیں یہ اسکی ابتدا تاریخ ہی سے پائی جاتی ہے یورپ نے امریکہ اور آسٹریلیا میں اختلافات اقوام کے مسئلہ کو اس طرح حل کر دیا کہ وہاں کے اصلی باشندوں کو قطعی طور پر جلا وطن کر دیا۔ یا نابود کر دیا۔ مغرب آج بھی اسی جبر و استبداد پر عمل کر رہا ہے اجنبی لوگ کسی ملک میں آباد نہیں ہو سکتے غور سے دیکھا جائے تو خود وہی لوگ جنہوں نے اجنبیوں کے لئے یہ امتناعی قوانین منظور کئے ہیں خود اس ملک میں اجنبی ہی کی حیثیت رکھتے ہیں

لیکن ہندوستان اس قسم کی مہمان نوازی اپنے مہمانوں کے ساتھ نہیں گوارا کر سکتا تھا۔ اس نے مختلف نسلوں اور قوموں کے اختلافات بجنسہ تسلیم کر لئے اور ابتدا ہی سے اس بے نظیر جذبہ رواداری کا عملی ثبوت دیا جس کی مثال تاریخ عالم میں ڈھونڈھے سے بھی نہیں مل سکتی۔ ذات پات کا مسئلہ بھی اسی پاک جذبہ رواداری ہی کا نتیجہ ہے ہندوستان ہمیشہ سے اس قسم کے تجربہ کر رہا ہے جسنے کسی طرح مختلف ذاتوں اور فرقوں میں سماجی رشتہ اتحاد پیدا ہو سکے اور یہ فرقے اپنے لئے اختلافات بدستور قائم کر سکیں اور اپنے مخصوص معاشرتی رسم و رواج سے برابر لطف اندوز ہوتے رہیں۔ ہندوستان جانتا تھا کہ نسلی اور قومی اختلافات یقیناً باقی رہتے ہیں اور سہولتوں کی محدود چار دیواری کے اندر فطرت کو ہرگز قید نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ایسا کیا گیا تو اس کا سخت خمیازہ اٹھانا پڑے گا۔ ہندوستان کا یہ نظریہ درست تو تھا لیکن عارضی تھا۔ ہندوستان یہ نہ سمجھ سکا کہ انسانوں کے اختلافات پہاڑوں کی حدود فاصل کی طرح اٹل نہیں ہوتے کہ ہمیشہ ہمیشہ ایک ہی جگہ قائم رہیں انسانی اختلافات دریائے ہستی کے مد و جزر کے ساتھ اپنی جگہ بدلتے رہتے ہیں اور انکی ہیئت و جسامت بھی اسی طرح تغیر پذیر ہوتی ہے۔ ذات پات کی تمیز قائم کرنے میں ہندوستان نے اختلافات تو تسلیم کر لئے لیکن اصول تلون کو نظر انداز کر دیا جو انسانی زندگی کی اساس ہے۔

تصادم دور کرنے کے لئے انہوں نے مہیب دیواروں کی حدود قائم کر دیں۔ اس سے مختلف ذاتوں اور فرقوں کو مضرت آمیز فائدہ ہوا۔ انکی معاشرت میں

اطمینان وامن پیدا ہوگیا لیکن ترقی محدود ومسدود ہوگئی اسی وجہ سے ہندوستان کے سماجی نظام میں زندگی باقی نہیں رہی اور اسکی بجائے آجکل ہندوستان اُس خوبصورت پنجرے کی پرستش کر رہا ہے جسمیں لاتعداد شانے ہیں اور وہ خود ہندوستان ہی کے بنائے ہوئے ہیں۔ تجارتی تصادم دور کرنے کے لئے ہندوستان نے مختلف تجارتیں اور پیشے مختلف ذاتوں سے مختص کردیئے اس طرح وہ نفرت وتعصب جو مسابقت سے پیدا ہوتا ہے رُک گیا لیکن اس ضمن میں بھی ہندوستان نے قانون وراثت پر ضرورت سے زائد زور دیا اور اصول تلون کو پس پشت ڈالدیا۔ چنانچہ رفتہ رفتہ فنون دستکاری بیکار رہ گئے اور خداداد ذہانت۔ ہنر اور پیشے میں تبدیل ہوگئی۔

ہندوستان نے نسلی نظام قایم کرکے ہر فرقے کو اتنی آزادی تو دی کہ وہ اپنے مجوزہ اصولوں پر کاربند رہ کر ہندوستان سے مادّی طور پر متمتع ہوں لیکن افسوس ہے مغرب کی موجودہ تہذیب پر جو ایشیائیوں کے خلاف برسر پیکار ہے کہ ایشیا کے باشندے مغربی ساحلوں پر ایمانداری سے بھی اپنی روزی نہ کما سکیں محنت کرکے روزی کمانا ہر شخص کا جائز اور فطری حق ہے۔ اور اس حق سے ایشیا والے زبردستی محروم کردیئے گئے ہیں یہ ہے وہ مغرب جو یا تو اجنبیوں کے خلاف اپنے دروازے بند کرلیتی ہے یا انکے گھروں میں زبردستی گھسکر ان کو غلام بنالیتی ہے۔ یہ افعال حرص اور نفرت جیسے کمینہ جذبات کا نتیجہ نہیں تو اور کیا ہیں شاید آپ کہیں جسکی لاٹھی اسی کی بھینس کا اصول عین فطرت انسانی کے مطابق ہے۔ لیکن میں آپکو بتانا چاہتا ہوں کہ نادان انسان نے صدہا سال کے مضرت رساں عملی تجربات کرکے اور خود ہزارہا غلط فہمیوں میں مبتلا رہ کر یہ حقیقت دریافت کرلی ہے کہ انسانی فطرت فی الحقیقت وہ نہیں جو بظاہر ہمیں معلوم ہوتی ہے۔

"انسانیت کی تذلیل خدا کی تذلیل ہے اور خدا کی تذلیل فطرت انسانی نہیں ہوسکتی"

مغرب کا اجانب کے ساتھ بدسلوکی کرنا افسوس ناک ہے لیکن اس سے بھی زیادہ افسوس ناک یہ واقعہ ہے کہ خود مغرب کی اپنی معاشرت میں امن واطمینان پریم اور ایثار موجود نہیں۔ مسابقت کا خونی اور جنگی جذبہ اپنے پورے شباب پر ہے۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ مسابقت کی اصل دولت وقوت کی ہوس نہیں اس ہوس کا انجام سوائے موت کے اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ ہندوستان کے زمانہ ماسبق میں پیدائش اشیاء اور ان کی کیفیت سماجی نظام کے ماتحت اچھے اور اسکی بنیاد اشتراک عمل پر تھی اور مقصد اصلی سماجی ضروریات کو پورا کرنا تھا۔ لیکن مغرب میں اسکی روح رواں مسابقت ہے اور مقصد معدودے چند سرمایہ دار افراد کے لئے فراہمی دولت ہے لیکن فرد واحد کا اقلیدس کے خط مستقیم کی طرح صرف طول ہوتا ہے عرض نہیں ہوتا اس لئے مغربی حرص وطمع کی انتہا ہو ہی نہیں سکتی یہ خط بڑھتے بڑھتے اور بہت سے خطوط کو منقطع کرسکتا ہے۔ لیکن منتہٰی کو نہیں پہونچ سکتا۔ ہم میں سے ہر شخص جانتا ہے کہ بھوک کی ایک حد معین ہے اگر ہم

اس حد معین سے زیادہ کھالیں گے تو ہماری صحت معرض خطر میں ہوگی۔ کیا دولت اور قوت کی طمع کی حد ہی معین نہیں ہے اور ضرور ہے لیکن اس حد کے آگے فنا کی مملکت ہے۔

کیا مادہ پرست مغربی قومیں اپنی قابل قدر قوت پیدائش اشیاء میں صرف نہیں کر رہی ہیں اور انہوں نے اعلیٰ مقاصد حیات کی تخلیق و ترویج کو نظر انداز نہیں کر دیا ہے؟

مگر بات یہ ہے کہ اقتصادی اور معاشی معاملات میں حد کا سوال ہی باقی نہیں رہتا اسمیں تو اشیاء ساختہ کی مانگ اور انکی کھپت دو ہی باتیں نظر آتی ہیں۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔

پہلے زمانہ میں ہندوستان نے ہماری معاشرتی ضروریات وخواہشات پر پابندیاں عائد کر رکھی تھیں اور معاشرت میں دو مقاصد ایسے ہیں جنکو حاصل کرنا ازبس ضروری ہے اول تو انسانی جذبات وخواہشات کو قابو میں رکھنا تاکہ یہ خواہشات انسانی ارتقاء کی راہ میں حائل نہ ہوں دوم دیگر بنی نوع انسان سے محبت اور رواداری کا سلوک کرنے کی ترغیب دینا اسی لئے معاشرت نام ہے ان اخلاقی اور روحانی جذبات کے اظہار کا جو انسان کی اعلیٰ فطرت سے متعلق ہوتے ہیں۔ لیکن اگر ہمارے ذہن میں ہر وقت دولت اور طاقت کی ہوس موجود ہو تو اخلاقی اور روحانی جذبات پیدا ہی نہیں ہو سکتے۔ بدیں وجہ میرا یہ خیال یقین سے بدل گیا ہے کہ اگر ہمیں ذہنی اور روحانی آزادی میسر نہ ہو تو محض سیاسی آزادی ہمیں ہرگز ہرگز آزاد نہیں کر سکتی۔

جن لوگوں کو سیاسی آزادی میسر ہے وہ بھی حقیقتاً آزاد نہیں۔ ہاں طاقتور ضرور ہیں۔ جن لوگوں کا مقصد صرف روپیہ کمانا ہے وہ اپنی زندگی یعنی اپنی روح سرمایہ داروں کے ہاتھ فروخت کر دیتے ہیں اور انکو اس غلطی کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ جو قومیں سیاسی قوت واقتدار حاصل کرنے کے لئے بیتاب ہیں اور کمزور قوموں کے ملک جان اور مال پر قبضہ کرنا چاہتی ہیں۔ انہیں مجبوراً اپنی انسانیت اور حریت کو مختصر سے سیاسی نظام کے ماتحت کرنا پڑتا ہے جو خود انہوں نے کمزور قوموں کو غلام بنانیکے لئے قایم کیا ہے۔ جو ممالک آزاد کہلاتے ہیں انہیں بھی لوگوں کی اکثریت آزاد نہیں ایک معمولی سی اقلیت انہیں ایک نامعلوم منزل مقصود کی طرف کھینچے لئے جا رہی ہے۔ یہ سب باتیں محض اسی لئے موجود ہیں کہ اقوام عالم اخلاقی اور روحانی آزادی کے حصول کو اپنا نصب العین نہیں بناتیں آج ہندوستان کے قوم پرور لیڈران کی اکثریت کی عام رائے یہی ہے کہ ہماری معاشرت میں کسی قسم کی خامی نہیں اور اس کا جملہ تعمیری کام آج سے ہزاروں سال قبل مکمل اور مرتب کیا جا چکا ہے۔ لہٰذا ہماری تمام قوتیں سیاست ہی کی طرف مرکوز ہونی چاہئیں۔ عوام کا بھی یہی خیال ہے کہ ہماری موجودہ لاچاری اور بے بسی کا سبب سماجی خرابی نہیں ہے معلوم کیوں انکے دلوں میں یہ بات راسخ ہوگئی ہے کہ ہماری معاشرت کی تکمیل ہمارے اجداد نے بطریق احسن کر دی ہے اور مستقبل بعید تک اس میں کسی قسم کی تخفیف کی

ترمیم و تنسیخ کی گنجایش نہیں۔

میں پوچھتا ہوں کیا ہمارے اجداد مافوق العادت قوتیں رکھتے تھے کہ ان کا قایم کردہ نظام عمل آیندہ زمانہ میں ہمیشہ درست اور مکمل ثابت ہو انکی پیش بینی میں غلطی کا امکان نہیں؟

افسوس اس غلط اور گمراہ کن اعتقاد نے ہمیں تباہ کردیا جن ہندوستانیوں کو یقین ہے کہ صرف سیاسی آزادی ہماری موجودہ معاشرتی غلامی کو دور کر دیگی اور ہمارے ہر دُکھ کی دوا ثابت ہوگی انکی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی ہے انہیں نہیں سوجھتا کہ سیاسی آزادی ہمارے معاشرتی پیچیدہ مسائل کا واحد حل نہیں ہوسکتی۔

وہ دن دور نہیں جب یہ حقیقت آشکارا ہو جائے کہ معاشرت کی ہلکی سے ہلکی کمزوری ہماری آیندہ سیاست کے لئے ایک معقول خطرہ ہوگی۔ قوت عمل کا فقدان جسکی وجہ سے ہماری معاشرتی رسوم ظواہر پرستی کا بے جان مظاہرہ بن کر رہ گئی ہیں ہماری سیاست میں زبردست رُکاوٹیں بن جائیں گی۔

ہماری محدود ہمدردی کی وجہ سے جسے بے انصافی اور ظلم کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ ہم جیسے انسانوں کی اچھی خاصی تعداد ادنیٰ اور اسفل سمجھی جاتی ہے۔ کیا یہ لعنت ہماری مستقبل سیاست کی ترقی میں حائل نہ ہوگی قوم پرور زعماء ہند اپنے مقاصد کا تو بہ بانگ دہل اعلان کرتے ہیں لیکن ان کو اس حقیقت کا علم نہیں کہ انکی قومیت کی سرے سے بنیاد ہی نہیں سب سے اہم اور پہلا فرض بنیاد قایم کرنا ہے۔ اُن لوگوں کے معاشرتی افعال جو قوم قوم کے نعرے لگاتے ہیں سخت قدامت پسندانہ ہیں۔

قوم پرور رکھتے ہیں نمونہ کے طور پر سوئٹزرلینڈ ہی کی مثال لے لیجئے جہاں باوجود مختلف نسلوں اور ذاتوں کے قوم ایک ہی ہے۔ لیکن واضح ہو کہ سوئٹزرلینڈ میں مختلف اقوام ایک دوسرے میں خلط ملط ہو کر شیر و شکر ہو جاتی ہیں شادی بیاہوں میں قومیت حائل نہیں ہوتی۔ انکی رگوں میں ایک ہی آباؤ اجداد کا خون موجود ہے لیکن سارے ہندوستانیوں کا کوئی ایک مشترکہ پیدائشی حق بھی نہیں۔

مغربی قومیت کا تذکرہ کرتے ہوئے ہم یہ حقیقت بالکل فراموش کر دیتے ہیں کہ وہاں اسقدر اجنبیت اور اجانب سے تنفر موجود نہیں جسقدر ہندوستان میں مختلف ذاتوں کے مابین ہے۔

کیا دنیا بھر کی تاریخ میں ایک مثال بھی ایسی مل سکتی ہے جس کی رُو سے اُن لوگوں نے جو ایک دوسرے کے ساتھ شادی بیاہ تک نہ کر سکتے کبھی کسی زمانہ میں بھی ایک دوسرے کی خاطر جانیں قربان کیں (بجز ان حالات کے جن میں یا تو اُنہیں مجبور کیا گیا ہو یا تنخواہ دار ملازم کی حیثیت سے جنگ میں شامل کیا گیا ہو)

کیا ہم کبھی امید کر سکتے ہیں کہ نسلی اختلاط اور میل جول کے خلاف جو اخلاقی پابندیاں آج موجود ہیں وہ ہمارے سیاسی اتحاد کی راہ میں حائل نہ ہونگی؟ ہمیں اس مسلمہ حقیقت کے ماننے میں ذرا عار نہیں کہ ہماری معاشرتی قیود سخت جابرانہ اور غیر مہذب ہیں۔

ایک شخص میرے پاس آتا ہے۔ میں آزاد خیال آدمی ہوں لیکن برادری سے خارج کر دیئے جانے کے خوف سے

اپنے خیالات کو عملی جامہ نہیں پہنا سکتا۔ میرے نزدیک وہ معذور ہے۔ بزدلی سے سچے اصولوں پر کاربند نہ ہونا ہر معمولی انسان کے لئے اپنی معاشرتی زندگی کا خاتمہ کر دینے سے بہتر ہے۔

ہم نے محض اپنی سماجی عادات کی بنا پر اپنے وطنی بھائیوں کی زندگی تلخ کر رکھی ہے اور پھر وہ بھی "انتخاب غذا" کے معمولی سے اختلاف پر۔ یہ سب خرابیاں ہماری سیاسی تنظیم میں ضرور باقی رہیں گی اور انکی وجہ سے سیاست جبر و تعدی کی ایسی مہیب مشین بنجائیگی جو ہر معقول اختلاف کو کچلنے کیلئے ہمہ وقت تیار رہیگی درحالیکہ معقول اختلاف ہی زندگی کی علامت ہے جبر و تعدی سے ہماری سیاسی زندگی میں ناقابل گزیر کذب و افترا۔ مغائرت و منافقت کا پیدا ہو جانا ازبس ضروری ہے۔ کیا صرف آزادی کا نام ہی اسقدر دلفریب اور قابل قدر ہے کہ ہم اسکی خاطر اخلاقی آزادی تک قربان کر دیں؟ عادات و اطوار کی بے اعتدالی اپنا اثر فوراً ظاہر نہیں کرتی بلکہ انسان پر آہستہ آہستہ قبضہ کرتی چلی جاتی ہے اور ایک دن وہ آہی جاتا ہے جبکہ انسان کو اپنی بے اعتدالیوں کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے ہندوستان نے عہد جوانی کی ترنگ میں اپنے اعضائے رئیسہ میں معاشرتی خرابیوں کے مہلک جراثیم کی نشو و نما کا سلسلہ قایم کر دیا ہے۔ یہ جراثیم یقیناً ہندوستان کی موت کا سامان مہیا کر دینگے رفتہ رفتہ اسکی زندہ فطرت مفلوج ہوتی جائیگی۔ آخر تعلیم یافتہ ہندوستانی سماجی اصلاحات، اور ضروریات کی طرف سے بے اعتنائی کیوں برت رہا ہے؟ میں سمجھتا ہوں انتہائی کرب کیوجہ سے ہندوستانی معاشرت سے درد کا احساس ہی جاتا رہا ہے۔

مجھ سے میرے احباب نے اکثر سوال کیا ہے کہ آیا ہندوستان میں حکومت برطانیہ کی وجہ سے صنعتی نشاۃ الثانیہ کی علامات بھی پائی جاتی ہیں؟ میرا خیال ہے برطانوی حکومت نے ہندوستانی صنعت و حرفت کو ابتدا ہی میں فنا کر دیا اور جب سے اب تک تو حکومت نے کوئی حقیقی امداد یا ہمت افزائی کی نہیں۔ ہندوستانی بیچارے دنیا کے عظیم الشان نظام ہائے تجارت کا کس طرح مقابلہ کر سکتے ہیں۔ دنیا بھر کی اقوام نے متفقہ فیصلہ کر دیا ہے کہ ہم ہندوستانیوں کو کاشتکار رہنے پر قناعت کرنی چاہئے اسلحہ کے استعمال سے ہمیشہ ہمیشہ احتراز کرنا ہمارے لئے لازمی ہے اسکے معنی تو یہی ہوئے کہ ہندوستان کے کسان اپنا خون سینچ سینچ کر اناج پیدا کریں اور ہر وہ قوم جسکے منہ میں تیز دانت ہوں جس وقت چاہے اس ترنوالے پر منہ مارے حقیقت میں دولت کی طمع وقت۔ جگہ اور حد کی قیود سے بالاتر ہے اس کا تو صرف ایک ہی مطمح نظر ہے اشیا کی پیدایش اور انکی کھپت نہ حسین فطرت پر اسے رحم آتا ہے نہ ضعیف بنی نوع انسان پر حسن اور زندگی کو پامال کرنے میں اسے لطف آتا ہے اور ان دونوں کو دولت کی صورت میں تبدیل کرتے وقت اسے ترس نہیں آتا۔

موجودہ زمانے کی تجارتی تہذیب نہ صرف بہت سا وقت اور جگہ لے رہی ہے بلکہ انہیں تباہ بھی کر

رہی ہے اسکی خوفناک حرکتیں اضطراری ہیں۔ اسکی سامعہ شکن مہیب آواز صدائے صُور سے کہیں زیادہ سخت ہی وہ شے ہے جس نے مسرت کی قیمت پر دولت کو خرید لیا ہے۔

اے کاش ہماری ہندوستانی تہذیب کا ظاہر سادہ اور باطن پاکیزہ ہو۔ اسکی بنیاد اقتصادی جنگ و جدال کی بجائے معاشرتی اشتراک عمل پر ہو میرا عقیدہ ہے انسان میں اتحاد و اتفاق کے جذبہ کی تکمیل کا مادہ خدا نے ودیعت کیا ہی اس پاک جذبہ کی وجہ سے غریب انسان ہمیشہ غنی رہتا ہی۔ اس کی بدولت شکست فتح میں تبدیل ہوجاتی ہی اور فنا بقا میں اسی کی برکت "ازلی انصاف" ان لوگوں کو جو سب سے آخر ہیں صف اول میں جگہ دیگا۔

(رابندر ناتھ ٹیگور) سید ابن حسن شاد

آغوش جُرم میں

از جناب مظہر انصاری بی۔ اے۔ آنرز دھلوی!

(۱)

عطیہ فطرت

رات کی سیاہی اردگرد فضا پر چھائی ہوئی ہی۔ کھلی کھڑکیوں میں سے برقی روشنی کی شعاعیں زرّین تیروں کی طرح پر جھاڑتی ہوئی نکلتی ہیں اور کچھ دور تک ظلمت کے سینے کو چھیدنے کے بعد خود بھی اُسی میں گم ہوجاتی ہیں کمرے کے اندر برقی لیمپ کی تیز تیز روشنی میں مصور مبہوت بیٹھا ہی۔ اس کے ہاتھوں میں ایک حسین بچے کی تصویر ہے۔ دیکھتا ہے اور خوش ہوتا ہے اپنے کارنامے پر اسکا رُواں رُواں مسرور ہے۔ دل کی محفل سے خوشی کی پری اڑ چلتی ہے اور لپک کر اس کی آنکھوں میں آبیٹھتی ہے اور ناچنے لگتی ہی..........

بچہ کتنا حسین ہی! پہلی نظر میں دِل کو موہ لیتا ہے مصور اپنے اعجاز قلم سے زیادہ اس کمہار کی کاریگری پر حیران ہے جس کی آدم کی گھڑاون سونے چاندی تو کیا لعل و جواہر سے بھی کروڑ گنا مہنگی ہے.......

کیا چیز ہے! معلوم ہوتا ہے آبنوس کا بُت بنا کر گلاب کی لالی اُس پر بکھیر دی ہے۔ کیا بال ہیں! معلوم ہوتا ہی ریشم کے دھاگوں کو نور کے سفوف سے گذار کر چاند کی شعاعوں سے البیٹ دی ہے چہرہ مہرہ، ناک نقشہ قد قامت، غرض کیا ہے جسے قدرت کا فیض نہ کہا جائے۔ سچ مچ بچہ "عطیہ فطرت" ہے.....

مصور نے کچھ سوچا اور سوچکر تصویر کے نیچے لکھ دیا۔

"عطیہ فطرت"

اسے امید ہی کہ اس تصویر کی بکری میں مالا مال ہو جاؤں گا۔

(۲)

بیس برس بعد

بادشاہ کا دربار ہے۔ شان و شوکت کی دیوی دربار کی رونق کو اپنی دامن میں کھلا رہی ہے۔ عجز و انکسار امرائے دربار کے جھکے ہوئے سروں کی صورت میں بادشاہ وقت کے اقبال کی گواہی دے رہے ہیں۔ یکایک حکم ہوتا ہے....

"مصور کو حاضر کرو"

کورنش بجا لاتے ہوئے مصور تخت کی جانب بڑھتا ہے اور مودب کھڑا ہو جاتا ہے۔

شاہ۔ اے مصور....

مصور۔ حضور قبلۂ عالم جہاں پناہ سلامت

شاہ۔ دیکھو آج سے بیس برس پہلے تمنے ایک دو سالہ بچے کی جو تصویر عطیۂ فطرت کے نام سے حضور میں پیش کی تھی وہ آج بھی رنگ محل میں آویزاں ہے۔ بیس برس میں کوئی سال ایسا نہیں گیا جس میں کسی نہ کسی شاہی مہمان نے اس کی تعریف نہ کی ہو اب ہم چاہتے ہیں کہ جس طرح تمہارا قلم انسانیت کا بہترین نمونہ "عطیۂ فطرت" کی صورت میں دکھا چکا ہے اسی طرح اب تمہارا فن ایک کریہ المنظر آدمی کی شبیہ پردے پر مرتسم کرے اور ہم اسے عطیۂ فطرت کے برابر لگائیں اور دیکھنے والے کہیں کہ کس خوبی سے زندگی کے دونوں پہلو دکھائے گئے ہیں۔

(۳) انسان کے گن

بادشاہ وقت کی رضا کو پاکر مصور ایک کریہ المنظر آدمی کی تلاش میں گھر سے نکل کھڑا ہوا شاہی پروانہ اس کے پاس تھا کہ جس گھر، جس محل، جس سرائے، جس جگہ کو دیکھنا چاہے دکھائی جائے۔ دیکھتا پھرا، پھرتا پھرا۔ کہیں کہیں ایسے لوگ بھی ملے جن کی شکلیں انسانیت کا گھناؤنا نمونہ بن سکتی تھیں۔ کہیں مصور شبیہ کھینچنے کو تیار بھی ہو گیا مگر پھر یہ سوچ کر رک گیا کہ شاید کہیں اور دنیا کا سب سے زیادہ کریہ المنظر آدمی مل جائے۔ ہوتا ہواتا، ساری دنیا کے چکر لگاتا، قسمت کی بات، اسی شہر میں پہنچا جہاں اُس نے دنیا کے حسین ترین بچے کی تصویر بیس برس پہلے کھینچی تھی۔ بہت سی جگہیں دیکھیں، جیل خانے میں بھی گذر ہوا۔ ایک کوٹھری میں دیکھا ایک تیس برس کا آدمی بند ہے۔ نہایت کریہ المنظر، بہت بدصورت، بڑی گھناؤنی شکل کا......... دانت نیچے کے بالکل ٹوٹ چکے ہیں۔ اوپر کی ڈاڑھ میں صرف تین باقی ہیں اور انہیں بھی کرڑکھائے پن کے اثرات نے بڑا ہیبت ناک بنا دیا ہے۔ گال پچکے ہوئے ہیں اور چہرے پر جھریاں ہیں۔ رنگ کیچڑ کے رنگ کا اور ایسا ڈراؤنا کہ اگر انسان اندھیرے میں صورت دیکھ لے تو ڈر کے مارے چیخ اٹھے۔ بال پریشان۔ اور چیکٹ سے آلودہ۔ غرض ایسا گھناؤنا کہ حرفی تصویر میں کراہیت پوری طرح دکھائی نہیں جا سکتی.........

مصور اپنا سامان ٹھیک ٹھاک کرکے بیٹھ گیا اور چھ دن کی لگاتار محنت سے دنیا کے سب سے زیادہ کریہ المنظر آدمی کی شبیہ کھینچ ڈالی اسنے تصویر کے نیچے لکھا۔ انسان کے گن۔

(۴)

زندگی کے دو رُخ

رنگ محل میں آج جشن شاہانہ ہے۔ در و دیوار کی سجاوٹ پر رضوان کی آنکھ جھپکتی ہے۔ محل کی ہر شے دیدہ زیب ہے۔ مگر ان دو تصویروں کے گرد آج خاص طور سے ہجوم ہے جو ایک ہی مصور کے قلم سے نکلی ہیں مگر اسقدر متضاد ہیں ایک تصویر ایک حسین بچے کو پیش کرتی ہے جس کی خوبصورتی پر دل لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے اور دوسری شبیہ ایک تیس سالہ کریہ المنظر آدمی کی ہے جس کو دیکھنے سے بھی گھن آتی ہے بادشاہ نے اپنے معتمد خاص سے مخاطب ہو کر کہا۔

"تمنے دیکھا۔ یہ تصویریں ایک ہی مصور کے قلم سے نکلی ہیں۔ زندگی کے دو پہلوؤں کو کتنی عمدگی سے پیش کیا ہے"۔

معتمد خاص پرانا آدمی تھا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ بولا۔

"حضور نے بالکل درست فرمایا۔ زندگی کے دو پہلو بڑی خوبصورتی سے پیش کئے گئے ہیں۔۔۔۔۔۔۔ مگر۔۔۔ ۔۔۔ حضور۔۔۔۔۔۔۔ ایک اعجاز یہ بھی ہے کہ یہ ایک ہی زندگی کے دو پہلو ہیں۔۔۔۔۔۔"

"یعنے"؟ شاہ نے حیرانی سے پوچھا۔

"یعنے حضور"! معتمد نے جواب دیا "یہ دونوں تصویریں ایک ہی شخص کی ہیں۔ یہ ایک تباہ حال خاندان کا چشم و چراغ ہے جس کے شعلۂ عظمت کو صرصر حوادث نے مسرد کر دیا۔ حضور میں نے اس شخص کا بچپن بھی دیکھا ہے عالم طفلی میں واقعی عطیۂ فطرت تھا۔ مگر رفتہ رفتہ معصیت کی گہرائیوں میں اترتا گیا اور انجام آپکے سامنے ہے۔

بادشاہ نے حیرت سے دانتوں میں انگلی دبائی اور کہا

"اف! زمانے کے تغیرات اور گناہ کا سایہ انسان کو کیا سے کیا بنا دیتا ہے"!

(۵)

افسانے سے حقیقت کیطرف

افسانے کی حدیں ختم ہوئیں حقیقت کی قلمرو شروع ہوتی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔

ایک بچہ جو دس سال کی عمر میں اپنے خداداد حسن کی وجہ سے عطیۂ فطرت کہلانے کا مستحق ہے۔ تیس سال کی عمر میں انسان کے بُرے گنوں کی گھناونی مثال بن جاتا ہے۔۔۔۔ آخر کیوں؟

ایک انسان کا پوت جس نے حسن کے شاداب گلزاروں سے سفر زندگی شروع کیا ریگ زار بلا کے طوفان خیز صحراؤں میں آپڑتا ہے۔۔۔۔ آخر کس لئے۔۔۔؟

منجملہ ان بہت سے جوابوں کے جو اس سوال پر پیش کئے جائیں گے ایک جواب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تربیت کی خامی۔ مگر اس دکھڑے سے پہلو بچا کر مجھے ایک اور داستان زیب گوش کرنی ہے۔۔۔۔۔۔ مجھے کہنا ہے کہ تیس برس کی عمر میں بدترین اعمال کا نمونہ بننے والا اپنے پہلے برس سے دسویں برس تک کریہ المنظر نہیں تھا مجھے کہنا ہے کہ اس کی زندگی کے پہلے برس کوئی مصور اُسے

زندگی کے تاریک پہلو کی غیبہ بنانے نہیں آیا۔ مجھے کہنا
ہے کہ وہ پیدا ہوتے وقت بُرا نہیں تھا بلکہ عمر کی تیس
منزلیں طے کرنے کے بعد بُرا بنا۔ بُرا پیدا نہیں ہوا تھا
دنیا کی ٹھوکریں اٹھا کر بڑا ہو گیا۔ مجھے کہنا ہے کہ انسان
فطرتاً مجرم نہیں ہوتا۔ حالات بنا دیتے ہیں...... بات
وہی آئیگی۔ کہنا وہی پڑیگا کہ تربیت کی خامی ہے۔ مگر
لگے ہاتھوں پہلے اس چیز سے نمٹ لیں کہ آدم کی
فطرت مجرم نہیں ہے

اصول کی بات

یہ کہنا کہ جس کو تم بدی سمجھتے ہو وہ بھی بھٹکی ہوئی
نیکی ہے، یقیناً بہت شاعرانہ ہے یہ کہنا کہ جس وقت
عصیاں کی بدولت دل کثافت سے بھر جاتا ہے اس
وقت بھی انسانی سینہ لطافت سے یکسر خالی نہیں ہوتا
یہ کہنا کہ شب کے پردے میں چوری کی غرض سے آنیوالا چور
اسی جذبہ سے متاثر ہوتا ہے جو نورانی دیوتاؤں میں پایا
جاتا ہے۔ یہ کہنا کہ رہبر اور رہزن میں سوائے اس کے
اور کوئی فرق نہیں کہ پہلا قسمت سے سیدھے راستے پر
جا پڑا ہے اور دوسرا بھٹک گیا ہے۔ یہ کہنا کہ عارف
کا اشک گرانا اور قاتل کا خون بہانا دونوں فعل یکسوئی کی
تلاش میں ہیں۔ یہ کہنا کہ صوفی کو اپنے دل کے پیمانہ میں
جس چیز کی جستجو ہے، مے خوار، بھنگڑ، شرابی، ٹھیک ہی
نشے شراب کی خراباتی فضا میں ڈھونڈنے آیا ہے۔
یہ کہنا کہ شراب خوار کی خمار معصیت سے آلودہ آنکھ بھی
معصوم ترین مظاہرہ انسانی کی آماجگاہ ہو سکتی ہے یہ
کہنا کہ گمراہ انسان گمراہ نہیں ہے بلکہ حرم کے مقدس بام
کا طائر ہے اور بھولا بھٹکا معصیت کی فضاؤں میں آ نکلا
ہے۔ یہ کہنا کہ جرم کے مختصر سیہ پر نیکی کی نور افگن مہریں ثبت
ہیں، ممکن ہے کہ بالکل درست ہو، چلئے یوں ہی امکان
کے درجے سے آگے بڑھا کر یقین کے درجے میں لے آیئے
میں کہتا ہوں کہ بالکل درست اور اپنے رنگ میں قطعی غیر
مسکت، میرا ان اقوال پر ایمان لانے سے نقصان نہیں
بلکہ فائدہ ہی ہوتا ہے کیونکہ یہ باتیں جرم کی بنیاد نیکی کو بنا
رہی ہیں جو میرے مطلب کی چیز ہے۔ مگر اس شاعرانہ
راستے سے ذرا الگ ہٹکر میں ایک تازہ روش بنا کرنے
کی جرات کرتا ہوں۔ میں بدی کو "بھٹکی ہوئی نیکی" کے نام
سے تعبیر نہیں کرتا بلکہ اسے مسخ شدہ نیکی، زنگ لگی ہوئی
نیکی، کہکر پکارتا ہوں۔ گویا اصولاً میں اس چیز سے متفق
ہوں کہ بدی کا اپنا وجود کوئی نہیں ہے انسان کی فطری
نیکی سے یہ کلونس جنم لیتی ہے۔ مگر اپنے زاویۂ نگاہ کو جذبات
پرستانہ پیرائے میں نہیں بلکہ ایسے طریق سے پیش کرنا چاہتا
ہوں جو عملی ذہنیتوں کیلئے قابل قبول ہو سکے۔

آنکھوں دیکھی

یہ تو رہی اصول کی بات۔ کہ جس چیز کو تم نے اتنا گراں
سمجھ لیا ہے کہ گناہ گناہ بدی بدی کے شور سے آسمان
سر پر اٹھائے لیتے ہو وہ گراں ہونا تو کجا اپنا کوئی وجود
بھی نہیں رکھتی ویسے بھی ذرا غور کرو، تو روزمرہ کی آنکھوں
دیکھی بات ہے، دنیا میں کوئی بچہ اپنی زندگی کے آغاز
میں کسی خاص عادت کا پابند نہیں ہوتا۔ گرد و پیش کے

اثرات اور ماحول کی فضا میں ہمیشہ عادات اور خصائل کو سانچے میں ڈھالتے رہتے ہیں اور یہ بات ہے بھی دل کو لگتی ہوئی۔ اگر تم ایک پودہ لگاؤ۔ اور اُسے پانی نہ دو تو مرجھا جائیگا۔ زمین تیار نہ ہو اور بیج ڈالدو تو بیج کبھی نہ اگیگا۔ پھر اگر یہ بات پودوں اور پیڑوں کے متعلق صحیح ہے کہ بغیر نگہداشت کے انہیں پروان نہیں چڑھایا جا سکتا تو ذرا سوچنے کی بات ہے انسانی کونپلیں بغیر دیکھ بھال کے کس طرح زندگی کے سانس بھر سکیں گی۔ پہلے زمانے کے بزرگوں کے متعلق مشہور ہے کہ انہوں نے ایک بچے کو دیکھا اور کہدیا یہ لڑکا بہت صاحب اقبال ہوگا یا کسی طفل نوخیز سے گفتگو کی اور گفتگو کے بعد یہ رائے دی کہ اپنے زمانے کا مجدد ہوگا۔ اب بغیر اسباب کو مانے کہ پیشانی پڑھ لینے کا کوئی خاص علم ہوتا ہے۔ یہیں یہ بات ٹھکانے کی معلوم ہوتی ہے۔ انہوں نے کوئی بچہ ہونہار پایا اسکے ماحول کی موزونیت پر دھیان کیا اور حکم لگا دیا کہ یہ چکنے چکنے پات کا بروا ہونہار ہے۔ آج بھی جب میں کسی پس ماندہ قوم کے نونہال کو دیکھتا ہوں اور اس میں کچھ زندگی کے آثار پاتا ہوں تو دل ہی دل میں آنسو بہایا کرتا ہوں کہ نہ جانے اس لال کو کہاں کہاں خاک میں رُلنا پڑے گا اور شاہراہ ترقی پر پڑی ہوئی قوم کے بچوں کو تصور کی کامرانی کی لگام تھامے دیکھتا ہوں۔

جرم اور جرم پیشگی کا دائرہ

نیکی بدی اس وسیع تصور کو ذرا محدود کر کے جرم اور جرم پیشگی کے دائرے میں سما لیجئے۔ اور ہمارا بنیادی اصول یہ ہوگا کہ وہ لوگ جنہیں آج دنیا مجرم سمجھتی ہے حقیقتاً مجرم نہیں ہیں یہ لوگ ایسے ہی پیدا نہیں ہوئے تھے جیسے آج ہیں۔ جس شان سے آج کا بڑے سے بڑا ثقہ اور پاکباز بطن مادر سے مادر گیتی کے سپرد کیا گیا تھا بالکل اسی انداز سے ان مجرموں کا آفتاب زندگی طلوع ہوا تھا گویا زندگی کی دوڑ میں جب ایک۔ دو تین کہا جانیوالا تھا تو دونوں کے پانوں ایک ہی لکیر کو چھو رہے تھے آگے چلکر فرق پڑ گیا اور پڑا بھی تو ایسا فرق کہ اول الذکر کو دنیا پارسا (یعنے انسانیت کے اعلیٰ معیار پر) سمجھتی ہے، اور موخر الذکر کو پورا انسان بھی ماننے کیلئے تیار نہیں ہے یہ دنیا کے ماننے نہ ماننے کا رنگ ہے۔ غور سے دیکھو تو ایسا کوئی فرق نہیں جسے دور نہ کیا جا سکے مگر ابھی یہ دور کر سکنے کا سوال "ہنوز دلی دور" کی طرح بہت دور ہے۔ ابھی تغیرات پر ایک نظر ڈالنی ہے۔

ایک قدم ہٹ کر بحث

ورڈسورتھ انگلستان کا ایک مشہور شاعر گذرا ہے بعض اعتبارات سے اس نے انگریز قوم کے زاویۂ نگاہ میں ایک زبردست انقلاب کر دیا۔ لکھتا ہے۔

The child is the father of the
man. And I wish my days
to be bound each to each
with natural piety

بچہ آدمی کا معنوی باپ ہے۔
اور میں آرزو کرتا ہوں کہ میرے ایام ہوں۔
فطری پاکبازی کے سلسلے سے ایک دوسرے
سے پیوستہ۔

شاعر نے خود بھی اس چیز پر جگہ جگہ روشنی ڈالی ہو اور اس کے مخصوص تنقید نگار بھی جن میں لارڈ مارلے مسٹر لےسی۔ بریڈلے۔ اور مسٹر میتھیو آرنلڈ بہت نمایاں ہیں یہی کہتے ہیں کہ ورڈسورتھ کا مخصوص فلسفہ یہ تھا کہ انسان کو اپنی زندگی کی تعمیر میں بچپن کے تصورات سے کام لینا چاہئے۔ گویا دوسرے الفاظ میں انسان جس قدر اپنے بچپن کے خیالات وعادات سے بعید ہوتا چلا جائیگا اسی قدر اسے اطمینان قلب سے بعد ہوتا جائیگا۔ اور یہ محض شاعرانہ فلسفہ نہیں ہے میری ناچیز رائے میں اس سادہ سی بات کی بنیاد پہاڑ کی چٹان ایسے مضبوط اصول پر رکھی گئی ہے۔ بچپن میں ہمارا زاویہ نگاہ تعصبات، نفرت، حقارت، خودغرضی اور اسی طرح کی ہزار گونا آلائشوں سے پاک ہوتا ہے اور اس عالم میں جو نظریہ ہم چیزوں کے کے متعلق قایم کرتے ہیں وہ بہت زیادہ صحیح تاثرات پر مبنی ہوتا ہے۔ زیادہ تحقیق سے حاصل کیا؟ آپ روزمرہ کے واقعات پر ایک نظر ڈال لیجئے۔ افسانوں میں تو خیر اس قسم کی چیزیں نظر پڑتی ہی ہیں۔ مگر ویسے بھی گردوپیش دیکھئے ایسے لوگ ملیں گے جو پہلے سے زیادہ مالدار ہیں پہلے کی بہ نسبت بہت زیادہ صاحب عزت اور ذی وقار ہیں مگر روتے ہیں اس سادہ زندگی کے آرام کو جو پہلے ان کو سکوں کے آغوش میں چھپائے ہوئے تھا۔ یہ تمول اور سادگی کی کھینچا تانی کا ذکر ہے۔ اسی طرح دنیا میں صاحب نظر لوگ (گو وہ تعداد کے لحاظ سے بہت کم ہیں) ایسے بھی ہیں جو بچپن اور شباب کی آسودگیوں کو زندگی بھر یاد کرتے ہیں۔

آئیے سر راہ

ایک قدم ہٹ کر جو بحث کی گئی اس دکھانا یہ مقصود تھا کہ آنے والے تغیرات کے زیر اثر جو تبدیلیاں ہوتی ہیں ان سے جب کبھی ہم کو تکلیف پہنچتی ہے بچپن یاد آتا ہے جو گویا ثبوت ہے اس امر کا کہ طفلی کی دنیا اس ریاکاری سے یکسر پاک ہوتی ہے جس نے زندگی کی داستان کو پہلے حرف سے لیکر آخری صفحے کی آخری سطر تک دکھ بھرا بنا رکھا ہے۔ پھر جب تمام فطرت انسانی اس عادت کی پابند ہے تو مجرم اس کلئے سے کب بچ سکتا ہے۔۔۔۔

ہماری تمام کاوش اس ایک نکتے تک پہنچنے کیلئے تھی۔

ہر مجرم اپنے تغیرات سے باخبر ہوتا ہے اور اپنے بچپن کو یاد کرکے آنسو بہایا کرتا ہے۔۔۔۔۔ جس زمانے میں سرسید احمد خاں انگریزی زبان کی طرز نگارش کو اردو میں لانے کی بڑے زور شور سے حمایت کر رہے تھے انہوں نے ایک مضمون لکھا۔ یہ مضمون آج بھی مڈل کے اردو کورسوں میں شامل ہے۔ انہوں نے دکھایا ہے کہ برس کی اخیر رات ایک بڈھا اپنے گھر میں بیٹھا ہے اور پچھلے زمانے کو یاد کرکے رو رہا ہے اور اپنے کئے پر پچھتا رہا ہے۔ دفعتاً نور کی ایک چمک آسمانوں میں نظر پڑتی ہے جس کے ساتھ ایک نورانی دلہن نمودار

ہوتی ہے اور وہ بوڑھے کے گھر میں اتر آتی ہے بوڑھے کے یہ پوچھنے پر کہ تو کون ہے وہ جواب دیتی ہے کہ ہمیشہ زندہ رہنے والی نیکی ہوں۔ بوڑھا سوال کرتا ہے تجھ سے ملنے کا کوئی طریقہ۔ جواب میں دلہن کہتی ہے خدمت قوم و وطن گھبرا کر بڈھا اٹھ بیٹھتا ہے۔ نوروز کا دن ہے ماں باپ بہن بھائی اسکے منتظر ہیں۔ پوچھتے ہیں تم کیوں رہے تھے۔ کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے؟ بچہ اب سمجھتا ہے کہ میں نے خواب دیکھا اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کو نیک بننے کی ٹھان لیتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس مضمون میں جو الفاظ بڈھے کے منہ میں رکھے گئے اگر وہ جوں کے جوں ایک مجرم کے منہ میں رکھدیئے جائیں تو بہت ہی موزوں ہوں گے یہ واقعہ ہے کہ ایک مجرم کا دل اپنی زندگی کے تغیرات پر جتنا ملول ہوتا ہے شاید ہی کسی کا ہوتا ہو۔ وہ بچپن کی سادگی پر غور کرتا ہے۔ اوروں کی پھلتی پھولتی شاخ زندگی پر کونپلیں پھوٹتی دیکھتا ہے اپنے ساتھیوں کو جو زندگی کی دوڑ میں اس سے آگے نکل گئے ہیں۔ دیکھتا ہے اور دل ہی دل میں کڑھتا ہے یہ ہوئی تغیرات کی مختصر سی کہانی۔ اب یہ تغیرات کیا ہیں اور کیونکر ہوئے۔ ہمارا اگلا قدم یہ ہے۔

باقی باقی



پیغمبر اسلام کے اعلیٰ اخلاق کا اثر

محمد شفیع الدین نیّر ٹیچر موڈرن ہائی اسکول۔ دھلی!

دنیا میں قوت و اقتدار کا منبع جسمانی طاقت، حکومت وسلطنت، دولت و امارت، علوم وفنون، اور اعلیٰ سیر و اخلاق رہے ہیں۔ جسمانی طاقت کا نفوذ و اثر یونانی کتب علم الاصنام اور ایرانی ہندوستانی تواریخ کی گردانی سے مل سکتا ہے۔ ہرکولیس۔ پرسیلس۔ جلیسن۔ رستم سہراب۔ اسفندیار۔ بھیم اور ارجن وغیرہ کے مافوق الفطرت اور مبالغہ آمیز کارناموں سے مل سکتا ہے۔ حکومت و سلطنت کا اقتدار بھی مسلمہ ہے۔ جب سے انسان متمدن اور مہذب ہوا ہے اُسی وقت سے اہل دنیا اسکے سامنے سرتسلیم خم کرتے چلے آئے ہیں۔ اُن فرمان روایان عالم کا تو ذکر ہی کیا ہے جنکے سر پر فرمانروائی کا تاج آبائی سطوت و جلال نشان امتیاز رہا ہے۔ اس حکومت وسلطنت نے ایسے اشخاص و افراد کی شان و شوکت کو بھی چار چاند لگا دیئے ہیں جنکو یہ فخر آبائی وراثت کی شکل میں حاصل نہیں ہوا تھا نپولین بوناپارٹ۔ نادرشاہ۔ اور شیر شاہ علی الترتیب جزیرہ کارسیکا کے ایک وکیل۔ ایک گڈریے اور معمولی جاگیردار ہی کے لڑکے تو تھے لیکن ہمائے حکومت کے سایہ ڈالتے ہی یہ کیا سے کیا ہو گئے۔ لاکھوں کروڑوں انسانوں کے سر انکی عظمت کے سامنے جھکنے لگے۔ دولت و امارت کی کارفرمائی بھی اظہر من الشمس ہے دولت کی قوت بعض اوقات جسمانی طاقت اور حکومت سے بھی بڑھی نظر آتی ہے اور جو وسائل آرام و آسایش اسکی مدد سے مہیا ہو سکتے ہیں وہ ایک جری پہلوان اور ایک بادشاہ کے لئے بھی باعث رشک ہیں۔ بڑے بڑے شجاعان و سلاطین زماں بھی دولت کے طلبگار رہے ہیں۔ علوم وفنون کا درجہ بعض لحاظ سے جسمانی طاقت، حکومت وسلطنت اور دولت و امارت سے بھی بڑھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ فضلائے روزگار اور علمائے زمانہ کے سنگ آستان پر بڑے بڑے شہ زور بہادروں پر جبروت شاہنشاہوں۔ اور پر عظمت دولتمندوں کے مغرور سر جبہ سائی کرتے نظر آتے ہیں۔ کیا حکیم

دیوجانس کلبی کی خدمت میں شاہنشاہ سکندر کی باریابی اس امر کی تائید نہیں کرتی خواجہ حیدر علی آتش نے خوب فرمایا ہے۔

سلطنت ہمارے پیش فقیری سلطنت کیا مال ہے
بادشاہ آتے ہیں پابوس گدا کیوا سطے

لیکن بظاہر ایک فرد جو حکومت و سلطنت سے بعض بے بہرہ، دولت و امارت سے کوسوں دور ظاہری علم و فضل سے ناآشنا ہی کی یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اعلیٰ سیرت اخلاق کا مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پہ پہنچا قدرتی ہے کہ اعلیٰ اخلاق و عادات کی قوت کا یہ اثر ہے جسکے مقابلہ میں نہ زور جسمانی کچھ حقیقت رکھتا ہے۔ نہ سطوت شاہنشاہی دولت و امارت اور علم و فضل بھی اسکے سامنے حقیر درجہ رکھتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی ایک خصوصیت ہے جو دنیا کے عظیم ترین شجاعوں، بادشاہوں دولتمندوں اور عالموں فاضلوں سے آپ کی ذات والا صفات میں ایک وجہ امتیاز ہے۔ اور یہی وصف ہے جس کی روشنی شجاعت حکومت، اور علم و فضل سب پر غالب آئی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلیٰ اخلاق و اوصاف کا بیان ایک ایسا موضوع ہے جو آنحضرت کی قریب قریب ہر سیرت کا ایک ضروری عنوان ہے۔ اس مضمون کی کوئی تحریر اور اس موضوع پر کوئی تقریر اس سے خالی نہیں۔ اور جس کسی نے آپکے سوانح حیات کا مطالعہ کیا ہے ضرور ہے کہ وہ آپکے اوصاف حمیدہ سے بخوبی واقف ہو۔ آپکے اخلاق علم اخلاق کے جملہ شعبوں یعنی تہذیب اخلاق تدبیر منزل اور سیاست مدن پر حاوی ہیں مجھے یقین ہے کہ آپ کی زندگی کا مطالعہ کرنے والا جملہ مذکورہ شعبہ ہائے اخلاق میں کامیابی حاصل کرنے اور دنیوی زندگی کو خوشگوار بنانے کے لئے آپ کی تقلید کو خضر راہ پائیگا۔

آپ کا عزم و استقلال، آپ کی محنت جفاکشی آپ کا ایثار و قربانی آپ کی غیرت و خودداری آپ کا زہد و اتقا آپکی سادگی اور بے تکلفی۔ آپ کا صبر و قناعت آپکی شجاعت و بہادری، آپکی صداقت و راست گفتاری اگر تہذیب اخلاق میں معاون و مددگار ہے تو آپکی خانگی زندگی کی خوشگواری مستورات کے ساتھ حسن سلوک، خانگی فرائض میں شرکت، اولاد اور اعزا سے محبت، تدبیر منزل میں قدم قدم پر ہماری رہنمائی کرسکتی ہیں آپکا عدل و انصاف آپکا رحم و کرم، آپکی عام رحمت و محبت آپکی غلاموں ماتحتوں غریبوں اور ضعیفوں پر شفقت آپکا عفو و درگذر، آپکا یہود و نصاریٰ اور دیگر اقوام کے ساتھ غیر متعصبانہ اور روادارانہ برتاؤ، آپکا حلم و تحمل آپکا ایفائے عہد ایسے اوصاف ہیں جو سیاست مدن کی منزل مقصود پر پہنچنے کیلئے مشعل راہ کا کام دے سکتے ہیں۔

مذکورہ بالا تمام امور کو مختلف تصانیف میں بعض وقائع آنحضرت متعدد واقعات زندگی سے ثابت کیا گیا ہے۔ جن سے مسلمانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ واقف ہے اور اسلئے انکا اعادہ تحصیل حاصل معلوم ہوتا ہے ان حقایق سے تاریخی صفحات درخشاں ہیں جس کا جی چاہے آپکی سیرت کی مختلف کتابوں سے عموماً اور سیرۃ النبی جلد دوم مصنفہ مولانا شبلی مرحوم کا خصوصاً مطالعہ کر کے واقفیت بہم

پہنچا سکتا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ باوجود امکانی سعی کے میں ان تصنیفات سے بہتر اس موضوع پر روشنی نہیں ڈال سکتا۔ اور اس لئے میں نے نفس مضمون یہ قرار دیا ہے کہ آنحضرت کے ان اعلیٰ اخلاق کا اثر بنی نوع انسان پر کیا پڑا۔ یہ موضوع میں نے اس لئے اور بھی اختیار کیا ہے کہ جس طرح آپکے اعلیٰ اخلاق عدیم النظیر ہیں اسی طرح اثر ونتیجہ کے اعتبار سے بھی وہ عدیم المثال ہیں۔ اس موضوع کی اہمیت کا اظہار دو وجوہ سے غیر ضروری ہے۔ اول اس لئے کہ ممکن ہے کوئی ہستی چند مخصوص اور محدود یا غیر محدود اوصاف کا منبع اور اخلاق کا مجموعہ ہو یہ ضروری نہیں کہ وہ اپنی اعلیٰ زندگی اور اخلاق سے دوسروں کو بھی متاثر کرے اور جن لوگوں کو اسکی زندگی سے ذاتی تجربہ اور مشاہدہ سے واقفیت کا موقع ملے وہ بھی اسی رنگ میں رنگ جائیں یہی وہ شے ہے جسکی وجہ سے آنحضرت کو سب پر امتیاز حاصل ہے۔ دوسرے ہم آنکے اعلیٰ اخلاق کے اثرات ونتائج کا اندازہ لگاکر انکی تقلید وپیروی پر مائل ہوسکتے ہیں اور اس طرح ہماری زندگی بھی کامیاب زندگی بن سکتی ہے۔ اور ہم مذہب اسلام کیلئے باعث فخر ہوسکتے ہیں۔

اس موضوع پر صرف ایک صحبت میں پوری طرح روشنی ڈالنا دشوار نظر آتا ہے۔ تاہم قلت وقت کا تقاضا یہ ہے کہ ایسے امور تلاش کرنے چاہئیں جو اس مختصر مضمون میں بطور ایک خاکے کے ناظرین کے سامنے پیش ہوسکیں

ہم مسلمان ہیں۔ مذہب اسلام کی دولت ہمیں ورثتاً ملی ہے تاہم ہماری معمولی عقل، اور ہمارے معمولی علم اور دیگر مشہور مذاہب کے معمولی مطالع اور اُن سے اپنے مذہب کے مقابلہ کے بعد ہم دیگر مذاہب پر اسلام کو ترجیح دیتے ہیں۔ اصول اسلام توحید، رسالت، اور معاد پر مبنی ہیں اور اسکی مختصر تعلیم حقوق اللہ اور حقوق العباد پر مشتمل ہے اس مذہب کے معتقدات اور اعمال کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ انسانی ضروریات اس مذہب سے کماحقہ پوری ہوتی ہیں۔ اگر ہم بغور مطالعہ کریں تو اکثر حقوق اللہ بھی بالعموم ہماری صلاح ودرستی اور تنظیم وترتیب پر مبنی ہیں اور اس مذہب نے حقوق اللہ سے بھی زیادہ حقوق العباد پر زور دیکر اس بات کو ثابت کردیا ہے کہ دنیوی زندگی میں امن وعافیت اسی مذہب کی پیروی سے میسر آسکتی ہے۔ غالباً یہی سبب ہے کہ اس مذہب کو اسلام کا نام دیا گیا ہے۔

ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ ابتدائے آفرینش سے مذہب اسلام کسی نہ کسی شکل میں قایم رہا ہے اور جس صورت میں آنحضرت صلعم نے اسکو بنی نوع انسان کے سامنے پیش کیا ہے یہ اسکی آخری صورت ہے۔ اور اس کا اشارہ ہو۔ الیوم اکملت لکم دینکم کی قرآنی آیت میں بھی پایا جاتا ہے۔

ہم اس مذہب کو خدا کی طرف سے سمجھتے ہیں جسکی تعلیم کا منبع ہمارے عقیدے کے مطابق آسمانی کتاب قرآن مجید ہے۔ اب اگر ہم مسلمان مذہب اسلام کو ایک اعلیٰ مذہب اور منزل من اللہ یقین کرتے ہیں اور بنی نوع انسان کے لئے اسکا وجود باعث امن وسلامتی جانتے ہیں تو قدرتی طور پر ہم اُن تمام ذرائع کی تعریف وستایش کرنے پر مجبور ہیں جو اس مذہب کی عالمگیر تبلیغ واشاعت کا سبب بنے

میرا خیال ہے کہ اس ضمن میں اہم ذریعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اور بالخصوص آپ کے اعلیٰ اخلاق تھے اگر آپ اعلیٰ اخلاق کے حامل نہ ہوتے تو مذہب اسلام کی اتنی اشاعت و ترقی جیسی کہ ہم ساڑھے تیرہ سو برس کی اسلامی تاریخ سے دیکھ رہے ہیں ہرگز نہ ہوتی اور کروڑوں اور اربوں بندگان خدا جنہوں نے اس مذہب کے سایہ میں آکر پناہ لی اور سکون قلب حاصل کیا وہ کبھی ایسا نہ کر سکتے۔ مختصر طور پر یوں سمجھئے کہ مذہب اسلام کے وجود سے جو مادی اور روحانی دنیوی و دینی فوائد و منافع بنی نوع انسان کی ایک کثیر جماعت کو پہنچے وہ سب بالواسطہ آنحضرت کے اعلیٰ اخلاق ہی کا نتیجہ ہیں۔

ذرا غور فرمائیے کہ ہم معمولی معمولی خانگی یا ملی اور ملکی کام لیکر کھڑے ہوتے ہیں۔ تو وسائل کی قلت، اعتراضات کی کثرت اور راہِ عمل کی مشکلات کا اندیشہ ہماری کس قدر پریشانی کا سبب بنتا ہے۔ بعض اوقات ہم انکے خیال ہی سے کسی مفید کام کے عزم تک کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اگر آنحضرت میں جذبۂ کامل اور عزم راسخ کی صفات نہ ہوتیں، اگر ثبات و استقلال اور تحمل و برداشت کی ناقابل تسخیر قوتوں سے آپ کام نہ لیتے۔ اور انتہائی ضبط و احتیاط سے قدم نہ اٹھاتے تو کیا اس حالت میں کہ اسی جماعت نے جس کی اصلاح و درستی کا بیڑا آپ نے اٹھایا تھا۔ ہر طرح کی ایذائیں آپ کو دیں اور آزار پہنچائے آپ کسی طرح بھی اسلام جیسے مذہب کی اشاعت فرما سکتے تھے؟

جب آنحضرت کو یقین ہوگیا کہ اہل عرب اور بنی نوع انسان کو قعرِ ضلالت سے نکالنا میرا فرض ہے تو آپ نے فضائل حسنہ کی تبلیغ اور رذائل کی تردید شروع کی۔ آپ کو نظر آیا کہ لوگ "سرقہ۔ ڈاکہ۔ قتل و غارت۔ کینہ۔ عداوت سود۔ زنا۔ قمار۔ شراب" دختر کشی اور سب سے بڑھکر بت پرستی میں مبتلا ہیں، تو آپ نے ان کا استیصال کرنا ضروری سمجھا۔ یہ خرابیاں اہل عرب میں نسلاً بعد نسل چلی آ رہی تھیں اور لوگوں کی طبیعت ثانیہ بن گئی تھیں۔ انہیں ان کا چھوڑنا کیونکر گوارا ہو سکتا تھا۔ نتیجہ یہ کہ لوگ آپ کے مخالف ہو گئے اور رفتہ رفتہ یہ مخالفت عداوت میں تبدیل ہو گئی۔ کسی نے مجنون و دیوانہ کہا کسی نے شاعر، ساحر اور کاہن نام رکھا کسی نے حریص اور لالچی ٹھہرایا، کسی نے حکومت و سلطنت کا خواہشمند بتایا۔ یہ طرح طرح کی تکلیفیں پہنچانے لگے۔ اور بہت سے خون کے پیاسے ہو گئے "یہ سب کچھ تھا لیکن دعوت حق۔ نوع انسان کی ہدایت۔ اور فلاح و بہبود کی تعلیمات کا کام بلا شائبہ تزلزل جاری تھا۔"

جب خدائے تعالیٰ نے آنحضرت کو ظاہراً اشاعت دین کا حکم دیا تو آپ نے کوہ صفا پر چڑھکر اہل مکہ کو دعوت دی اور ان کو راہِ راست کی ہدایت کی۔ لیکن اہل مکہ بجائے اسکے کہ آپ کی ہدایت پر عمل کرتے ناراض ہو کر چلے گئے۔ اس کے بعد اہل مکہ بالخصوص قریش نے آنحضرت اور اسلام کے مٹھی بھر جان نثاروں کو ایذائیں دینی شروع کیں جن کی تفصیل موجب تطویل ہے۔ مکہ کی زمین مسلمانوں پر تنگ ہوگئی اور مسلمانوں کا ایک گروہ حبشہ کو ہجرت کرنے پر مجبور ہوا اور نبوت کے تیرھویں سال آنحضرت نے بھی ضروری سمجھا کہ اسلام کی ترقی کی امید میں اپنے عزیز وطن مکہ کو

بھی خیر باد کہکر عالم غربت میں قدم رکھیں اور مدینہ ہجرت کر جائیں۔ ایذاؤں کے علاوہ آپ کو ہر قسم کے لالچ بھی دیے گئے مگر آپ نے اسکی طرف سے بھی بے اعتنائی برتی۔ سیرۃ النبی جلد سوم میں مولانا سید سلیمان ندوی نے اسبات کو اس طرح بیان کیا ہے۔

"آپ کی دعوت صرف یہ تھی کہ لا الٰہ الا اللہ کہو تو نجات پاؤ گے۔ اس دعوت سے باز رکھنے میں رؤسائے قریش جب ہر قسم کی تدبیروں سے تھک گئے تو انہوں نے آپ کے سامنے حکومت کا تخت، زر و جواہر کا خزانہ، اور حسن کی دولت پیش کی۔ اور بالآخر وہ وقت آیا جب آخری ہمدم و دمساز یعنی ابو طالب نے بھی ساتھ چھوڑنا چاہا۔ جسکا جواب اولوالعزم من الرسل کی زبان سے فقط یہ ملا کہ "چچا جان! اگر قریش میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند رکھدیں تب بھی اپنے اعلان حق سے باز نہ آؤنگا"" اسی خلوص کا نتیجہ ہے جو اہم اسلام کی عدیم المثال اشاعت کیصورت میں آج بھی ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔

ہجرت کے بعد تقریباً دس سال آپ کو خدمت اسلام کا موقع ملا۔ اور اسلام کی ترقی کے جتنے مواقع تلاش کئے جاسکتے ہیں ان سب مواقع پر آنحضرت کے اعلیٰ اخلاق ہی کی وجہ سے اسلام نے ترقی کی۔ میں مختصر طور پر جستہ جستہ واقعات کی طرف ناظرین کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں تاکہ آپ کی اخلاقی خصوصیات نمایاں نظر آئیں۔

ہجرت کے بعد مدینے میں آپ کا سب سے پہلا کام مسجد قبا اور مسجد نبوی کی تعمیر تھی۔ اس موقع پر انتہائی عاجزی اور محنت کا اظہار آپ کے طرز عمل سے ہوا کیونکہ آپ بھی اور مزدوروں کے ساتھ پتھر اٹھا اٹھا کر لاتے تھے اور جو رجز مزدور پڑھتے آپ بھی انکے ساتھ آواز ملاتے تھے۔ آپ کی اس عملی مثال سے لوگوں کو آپکی ذات سے دلچسپی پیدا ہوگئی اور اہل مدینہ آپکے طرز عمل کے اسقدر گرویدہ ہوگئے کہ جب آپنے مہاجرین و انصار کے درمیان عہد مواخاۃ قایم کرنا چاہا تو تعمیل حکم کا یہ عالم تھا کہ بعض انصاریوں نے اپنی جائداد کو نصف کرنا تو کیا اپنی دو بیویوں میں سے ایک بیوی کو طلاق دیکر اپنے کسی مہاجر بھائی سے شادی کردی۔

مدینہ میں نصاریٰ اور یہود بھی تھے۔ آپنے اُن سے جب کبھی جو کچھ وعدہ کیا۔ ہمیشہ اسکو پورا کیا۔ اس کا اثر اسلام کی بہتری اور ترقی پر پڑا۔ اور آپکے ایفائے عہد کی عملی مثال سے اسلام کی تعلیم ایفائے عہد دیکھنے والوں کی سمجھ میں آگئی۔

مدنی زندگی میں فتح مکہ سے قبل اگرچہ مکی زندگی کے مقابلے میں امن تھا۔ لیکن آپ کی طاقت اہل مکہ اور قریش سے بہت کم تھی اور اگر اس مخالفت کا لحاظ کیا جائے جو قریش کی وجہ سے ملک عرب میں آپکے خلاف پھیلی ہوئی تھی اور اس بے سروسامانی کو پیش نظر رکھا جائے جو سب مسلمانوں پر مسلط تھی۔ تو غزوہ بدر اور غزوہ احد میں آنحضرت کی شرکت، یہودیوں کے ساتھ جنگ، اور دیگر اسی قسم کے جھگڑوں میں شمول آں حضرت کی انتہائی دلیری اور شجاعت کے علاوہ حق پر

شاہیت قدسی کی ایک فقید المثال یادگار ہے۔ اگر آنحضرت مصلحت کا خیال کر کے ان جنگوں سے تجنب اسلام کی ترقی کے خیال سے شرکت نہ فرماتے، ذرا بھی پہلو تہی فرماتے تو اہل عرب کے لئے اسلام کے سچی یہ ہجانہ نشانات کا مجمل دینا کچھ مشکل نہ تھا۔

آپ نے انتہائی ضبط و تحمل سے موقع شناسی و مصلحت بینی اور امن و صلح کی خواہش سے ۶ھ کی صلح حدیبیہ کی شرائط منظور کرنے سے نمایاں ہے۔ یہ شرطیں بظاہر مسلمانوں کے لئے سخت توہین آمیز تھیں حتیٰ کہ حضرت عمرؓ جیسا جان نثار اسلام بھی بغیر اعتراض کئے نہ رہ سکا۔ لیکن آپ نے انہیں شرائط کو قبول کر لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف تو خدا نے اس صلح کو "فتح مبین" تعبیر کیا۔ دوسری طرف اسلام کی ترقی کی بیشمار راہیں نکل آئیں۔ اگر آپ میں ضد غصہ اور جنگ کی جانب میلان ہوتا اور ضبط سے کام نہ لیا جاتا تو شاید اگرچہ قرآن مجید کی ایک آیت کے مطابق "کفار ہی کو شکست ہوتی" مگر مسلمانوں کو بھی سخت نقصان اٹھانا پڑتا۔ آپ کے تحمل کی وجہ سے یہ صلح نامہ اسلام کی آئندہ ترقی کا پیش خیمہ ہوا اور اسلام کو پرامن تبلیغ و دعوت کے ذریعہ دن دونی رات چوگنی ترقی ہونے لگی۔ یہاں تک کہ صلح مذکورہ کے دو ہی سال بعد یعنی ۸ھ میں اسلام نے اتنی قوت حاصل کر لی کہ فاتحانہ مکہ میں داخل ہوا۔

فتح مکہ اسلامی تاریخ کا کس قدر درخشاں واقعہ کیوں نہ ہو اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آنحضرت کے اعلیٰ اخلاق رحم و عفو کا اظہار جس طرح اس موقع پر ہوا تاریخ عالم کے صفحات اسکی نظیر سے قاصر ہیں۔

اہل مکہ نے جو ظلم و ستم آنحضرت کی ذات اور دوسرے مسلمانوں پر روا رکھے تھے۔ اُن کا تقاضا یہ تھا کہ حتی الوقت بقدر امکان اس کا انتقام لیا جاتا۔ اور مکے کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جاتی اور اہل مکہ کو غلام بنا لیا اور انکی املاک پر قبضہ کر لیا جاتا۔ یہی طرز عمل ہے جو فاتحان عالم نے بالعموم روا رکھا ہے۔ انسانی فطرت کا تقاضا بھی ان حالات میں یہی ہے۔ خود اہل مکہ کو بھی اسی قسم کی توقع تھی۔ لیکن اہل مکہ باوجود دشمن ہونے کے اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ آپ سراپا رحمت و برکت ہیں۔ محبت و الفت آپکے آئینہ قلب کا جوہر ہے۔ رحم و کرم اور عفو و درگزر آپکی گھٹی میں پڑا ہے۔ چنانچہ جب (سیرۃ النبی کے الفاظ میں) "آپ نے خوف انگیز لہجے میں پوچھا کہ:-

"تم کو کچھ معلوم ہے۔ میں تم سے کیا معاملہ کرنیوالا ہوں"
سب پکار اٹھے" تو شریف بھائی ہے اور شریف برادر زادہ ہے" ارشاد ہوا "تم پر کچھ الزام نہیں۔ جاؤ تم سب آزاد ہو"!

اس طرز عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ کفار مکہ کی عداوت اسلام محبت اسلام سے بدل گئی۔ اور جس نے سنا بدل اسلام کا گرویدہ ہو گیا۔ آن کی آن میں سارا مکہ مسلمان ہو گیا۔ کیا اس بدیہی تاریخی شہادت پر آپکے اُس اعلیٰ اخلاقی اثر سے انکار کر سکتا ہے جو اسلام کی ترقی و اشاعت پر پڑا۔ غیر قوموں کے ساتھ محبت و رافت اور ہمدردانہ اور غیر متعصبانہ برتاؤ دشمنوں تک پر رحم و کرم، نومسلموں کو سیدھے سادے اسلام کی دعوت، اصول و تعلیم اسلام پر خود عمل، یہ تمام امور ایسے تھے جو اسلام کی اشاعت، ترویج اور ترقی کے

حقیقی باعث ہوئے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سیرۃ النبی جلد سوم مصنفہ سید سلیمان ندوی اور سیرۃ الصحابہ جلد اول مصنفہ مولانا عبدالسلام ندوی کے چند اقتباسات اس رائے کی تائید میں پیش کئے جائیں۔

حضرت ابوبکر صدیق کو آپکی صداقت پر اتنا اعتماد تھا کہ دعوے نبوت سنتے ہی ایمان لے آئے۔ حضرت خدیجہ ایمان لائیں مگر یہ کہکر کہ "آپ جیسے اخلاق گرامایہ کا انسان جو غریبوں کا مولیٰ، مقروضوں کا ماویٰ اور مسافروں کا ملجا ہے کبھی شیطان کے نیچے میں گرفتار نہیں ہو سکتا۔ حضرت انیس غفاری اور حضرت عمرو عذبہ سلمی یہ دیکھکر اسلام لائے کہ آپ مکارم اخلاق کا حکم دیتے ہیں حضرت عبداللہ بن سلام چہرۂ انور کو دیکھتے ہی پکار اٹھے "یہ جھوٹے کا چہرہ نہیں" ایک پورا قبیلہ صرف آپکی فیاضی سے متاثر ہوکر کلمہ طیبہ پکار اٹھا اسی فیاضی کی تائید ایک اور واقعہ سے ہوتی ہے۔ سیرۃ الصحابہ جلد اول میں "اخلاق نبوی کا اثر" کے عنوان سے مرقوم ہے کہ ایک بار ایک شخص نے آپ سے بہت سی بکریاں مانگیں آپنے اس کا سوال پورا کیا۔ اس پر اس فیاضی کا یہ اثر پڑا کہ اپنے قبیلہ میں آکر کہا "کہ لوگو مسلمان ہو جاؤ۔ کیونکہ محمد اسقدر دیتے ہیں کہ انکو اپنے تنگ دست ہو جانیکا بھی خوف نہیں۔

سیرۃ النبی جلد سوم ثمامہ بن اثال، ہندہ زوجہ ابوسفیان، ہبار بن الاسود۔ وحشی قاتل حضرت حمزہ یہ دیکھکر مسلمان ہوگئے کہ آپ دشمنوں کے ساتھ بھی کس محبت سے پیش آتے۔ قیصر روم آپکے چند اوصاف اور اسلام کے چند مناقب سنکر اظہار حق پر مائل ہوگیا۔ حضرت عدی بن حاتم قبیلہ طے کے عیسائی رئیس تھے وہ آپ کو بادشاہ سمجھکر مدینہ آئے مگر یہاں انہوں نے دیکھا کہ مکہ کی ایک لونڈی آتی ہے اور آپ اسکی حاجت روائی کو کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ان کا دل اندر سے پکار اٹھا کہ آپ بادشاہ نہیں پیغمبر ہیں اسوۂ صحابہ جلد اول میں ایک واقعہ نقل کیا ہے

ایک یہودی نے قرض کا تقاضا اسقدر سخت کیا کہ بعض صحابہ کو ناگوار معلوم ہوا لیکن آپنے اُف تک نہ کی وہ یہودی اسقدر متاثر ہوا کہ مسلمان ہوگیا۔

ایک بار سفر میں صحابہ کرام نے ایک عورت کو پکڑ کر آپکی خدمت میں پیش کیا اس کے پاس پانی کے مشکیزے تھے صحابہ کو پانی کی ضرورت تھی۔ آپنے اس کا پانی لیا تو قیمت ادا فرمائی۔ اس کو اس حسن خلق نے گرویدہ کر لیا اور نہ صرف وہ بلکہ اس کے اثر سے سارا قبیلہ مسلمان ہوگیا

یہ تھے آپ کے اعلیٰ اخلاق جن کی وجہ سے اسلام پھیلا۔ اور اگر آج بھی ہم انہیں اخلاق کا اتباع کریں اور فقط باتیں بنانے کے شعار کو ترک کر دیں تو پھر وہی زمانہ آسکتا ہے اور مسلمان معراج ترقی پر پہنچ سکتے ہیں۔

دوسرا اثر آپ کی زندگی کا یہ ہوا کہ لاکھوں انفرادی زندگیاں با اخلاق اور فخر انسانیت بن گئیں۔ خلفائے راشدین اور دیگر صحابہ کرام اور تابعین عظام کی زندگیوں کے پاک حالات اسپر شاہد ہیں حضرت ابوبکر کا ایثار حضرت عمرؓ کا تدبر، حضرت عثمانؓ کی حیا، حضرت علیؓ کی شجاعت حضرت بلال کی حق پرستی حضرت خالد کی سرفروشی سینکڑوں انصار و مہاجرین باہمی محبت و اخوت اور قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی پختگی عزم و ایمان یہ سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ذات گرامی اور اعلیٰ اخلاق کا

تھیں۔ اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ عرب کی غیر آباد اور بنجر زمین کے بسنے والوں میں تبلیغ حق اور دنیوی ترقی کا خیال پیدا ہوا۔ اور ان کے جوش صداقت، عزم کامل اور جدوجہد کا یہ نتیجہ ہوا کہ تھوڑے ہی عرصے میں وہ خدا کی زمین کے ایک بڑے قطعہ پر قابض ہو گئے۔ اور زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی کر کے دکھلا دی حالانکہ مسلمانوں کی تعداد اس وقت نسبتاً بہت ہی کم تھی۔

آج دنیا میں چالیس کروڑ مسلمان بیان کئے جاتے ہیں ذرائع تبلیغ واشاعت کی کثرت ہے۔ آج مسلمانوں کے پاس دولت بھی ہے تعلیم بھی ہے ہر قسم کی سہولتیں بھی ہیں اسلام بھی ہے اور اسلامی قانون بھی ہے اسلامی اصول بھی ہیں اور اسلامی عقائد بھی ہیں۔ قرآن بھی ہے اور اسکی تعلیم بھی۔ مسلمان خدا کے بھی قائل ہیں۔ توحید۔ نماز۔ روزہ۔ حج زکوٰۃ کے مفہوم کو سمجھتے اور کسی نہ کسی حد تک ان پر عامل بھی ہیں۔ مگر وہ جوش اسلامی وہ اخوت ملی وہ خوف خدا، وہ صداقت واخلاص وہ حق کے لئے سینہ سپر ہونا اب کہاں ہے اسکا سبب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلیٰ اخلاق کی زندہ مثال ہمارے سامنے موجود نہیں ہے اور نہ ہم سنجیدگی اور خلوص کے ساتھ ان کی حقیقی روح کو سمجھنے اور اس پر دل وجان سے عمل کرنے کے لئے تیار ہیں۔



۵۷ء کی دکھیا

(از جناب مولوی عبدالہادی خاں صاحب شاہجہانپوری)

(گزشتہ سے پیوستہ)

بارھواں باب

علی کا گھر

یہ حال دیکھکر ہمنے ایلن کو زبردستی اپنے ساتھ رکھا۔ اس کا ہاتھ بغل میں داب لیا اور اُس سے کہہ دیا کہ ہمارے پیچھے پیچھے چلی آؤ۔ اس وقت ہم لوگ جس محلہ میں تھے وہ سب سے زیادہ امن کی جگہ تھی تاہم مارنے والوں کی آوازیں اور مار کھانے والوں کی کراہ کبھی کبھی ہمارے کانوں تک آ ہی جاتی تھی۔ مشرقی افق میں جلتے ہوئے گھروں کے شعلے بھی نظر آتے تھے۔ چلتے چلتے محمد فیلیان ایک جگہ رُکا اور اُسنے کہا کہ یہاں ٹھہرو اور جب تک میں واپس نہ آؤں یہاں سے نہ ہلنا۔ یہ کہکر وہ دیوار کے ساتھ ساتھ گیا۔ دیوار پر چونے کی استرکاری کی ہوئی تھی اسلئے اسکا سایہ برابر نظر آتا رہا۔ بیس قدم پہونچکر وہ رُکا اور میں نے غور کر کے دیکھا تو وہ ایک بہت بڑے پھاٹک کے پاس رُکا تھا دروازہ اسنے اس طرح کھٹکھٹایا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ صاحب خانہ سے اسکے پرانے تعلقات ہیں۔ دروازہ کھلا اور کچھ دیر آپس میں گفتگو ہوئی۔ آہ ان دونوں کی یہ ملاقات بھی عجیب ملاقات تھی ہمارے دم گھٹ گھٹ گئے اور ہماری جانوں پر بن آئی۔ پانچ منٹ سے زیادہ نہ لگے ہونگے مگر مجھکو پچاس برس سے زیادہ طویل معلوم ہوتے تھے اور اس دوران میں ہم سب کا عجیب حال تھا کبھی امید بندھتی تھی اور تھوڑی دیر میں ناامیدی اپنا بھیانک چہرہ دکھاتی

تھی۔ خدا خدا کر کے وہ گفتگو ختم ہوئی اور محمد نے ہمکو بلانے کیلئے سیٹی بجائی اشارہ پاکر ہم لوگ اپنی جگہ سے چلے اور دروازہ کے پاس پہونچکر اندر داخل ہوگئے اندر پہونچکر معلوم ہوا کہ بہشت میں آگئے۔ ایک کشادہ باغ میں سے ہوکر ایک بڑی سی عمارت کے پاس ہم لوگ پہونچکر ٹہرے اور اپنا سامان ہاتھی پر سے اتار کر ایک کمرہ داخل ہوگئے۔ محمد نے کمرہ کا دروازہ بند کر دیا اور خوشی میں آکر کہا اللہ کا شکر ہے کہ اسنے آپ لوگوں کے حال پر اپنا فضل وکرم کیا کہ مجکو اس مصیبت اور ہلاکی سے آپ لوگوں کو بچانے کی توفیق مرحمت فرمائی ہمنے جواب میں کہا کہ ہاں بیشک اللہ کا شکر ہے کہ اس نے تمہاری مشکور کوشش کی بدولت ہمکو نجات دی اور ہمکو ایک محفوظ حفاظت گاہ میں پہونچا دیا۔ میں نے محمد سے یہ بھی کہا کہ میری آنکھوں کا نور اور دل کا سرور ڈیل کہاں ہے۔ محمد نے کہا کہ مایوس اور پریشان نہو اللہ تعالی اسکی حفاظت کریگا اور میں تھوڑی دیر بعد اسکو ڈھونڈوں گا سردست میں چاہتا ہوں کہ تمہارے لئے کچھ کہانا مہیا کروں۔ یہ کہکر محمد چلا گیا۔ کمرہ کے وسط میں ایک گول میز بچھی ہوئی تھی میز پر ایک لمپ جل رہا تھا جس سے تمام کمرہ روشن ہو رہا تھا۔ میز کے آس پاس چند کرسیاں اور انگریزی بنچیں پڑی تھی۔ بنچوں پر ہم لوگ لیٹ گئے کہ شاید نیند آجائے۔ اور دماغوں کا بار کسی قدر ہلکا ہوجائے مگر نیند کہاں! میں اور میرے ساتھی سب بیٹھے ہوے تھے مگر نیند کا کوسوں پتہ نہ تھا صرف وہ بچہ نیند کا ماتا ہو رہا تھا جسکو ہمنے سرابہ سے نکالا تھا۔

اس وقت نہ مجھکو اپنے گھر کے جلنے اور برباد ہونے کا کوئی غم تھا نہ مال و دولت کی تباہی و بربادی کی کوئی فکر تھی نہ یہ خیال تھا کہ آیندہ کیا ہوگا اور کن کن مصائب سے دوچار ہونا پڑے گا اسوقت تو میرا دل صرف ڈیل میں پڑا تھا یاد تھی تو اسکی اور فکر تھی تو اسکی رہ رہ کے خیال آتا تھا کہ معلوم نہیں وہ کہاں ہے یا کس حال میں ہے جیتا بھی ہے یا نہیں؟ کبھی دل کہتا تھا کہ وہ ضرور ملیگا لیکن پھر فوراً خیال آتا تھا کہ اگر وہ ظالموں کے ہاتھوں مقتول ہوگیا ہو تو پھر میں کیا کرونگی۔ غرض کہ میرے وسوسے بدستور قایم رہے یہاں تک کہ صبح ہوگئی اور آفتاب نے دنیا کو اپنی سنہری کرنوں سے ایک دفعہ پھر بقعہ نور بنادیا۔

صبح کے وقت محمد پھر واپس آیا اور ہم لوگوں کے لئے روٹی اور میوہ جات وغیرہ بھی لایا اور کمرہ سے باہر نکلنے کی بہت سخت ممانعت کی اور کہا کہ کمرہ میں سے صحن میں بھی ہرگز ہرگز نہ نکلنا۔ ہندوستانی اسوقت نہ کسی پر رحم کرتے ہیں نہ کسی کو چھوڑتے ہیں جب تک شورش باقی ہے تم چھپے رہو کیونکہ اگر شریروں کو تمہارا پتہ چل گیا تو تمکو اور تمہارے ساتھ گھر والے کو بھی فوراً قتل کر دینگے اور میری طرف متوجہ ہوکر اس نے کہا خدائے پاک کی قسم جس طرح مجھ سے ہوسکیگا آج میں تمہارے بچہ کو ڈھونڈ کر لاؤنگا۔ اس مکان میں ہم چھ شخص تھے دو دو تین جگہ تقسیم ہوگئے۔ سرابے والی زخمی عورتیں ایک طرف ہوگئیں۔ بچہ ایلن کے ساتھ ہوگیا اور میں اسکے ساتھ رہی ایلن کی حالت کو دیکھتی اور اسکے سامنے رات کی مصیبتوں کا تذکرہ کرتی رہی کہ شاید اس کی آنکھ سے اسی طرح آنسوؤں کے کچھ قطرے نکلیں اور اسکے دل کا بخار کم ہو اور اسکے دل میں جو آگ

لگی ہوئی ہے وہ کسی طرح ٹھنڈی پڑے۔
مگر ایلن پر میری اس تدبیر کا کوئی اثر نہیں ہوا نہ اس نے کچھ کھایا پیا۔ ہم لوگوں نے کچھ کھایا بھی اور پانی بھی پیا۔ وہ دونوں زخمی عورتیں ضرورت سے زیادہ پانی خرچ کرنے لگیں۔ جب پیاس بجھ گئی تو اپنے زخم دھونے لگیں اس پر میں نے انکو فہمایش کے طور پر بڑی نرمی سے کہا کہ یہ پانی جسکو تم یوں ضائع کر رہی ہو اسکا ایک ایک قطرہ ہماری زندگی ہے کیونکہ اسکے بعد تو ایک قطرہ ملنے کی بھی کوئی امید نہیں ہوسکتی آخر ہم لوگ سمندر یا دریا کے کنارے تو نہیں ہیں۔ میرا خیال تھا کہ میرے اس کہنے پر وہ پانی ضائع کرنے سے باز آجائینگی لیکن ان دونوں کو غصہ آگیا اور میری طرف گھور کر کہنے لگیں کہ خوب دہلی کی گلیوں میں ہمارے ابنائے وطن کا خون بہا بہا پھرے مگر یہاں ہم کو ایک ایک پانی کے قطرہ پر لڑائی سے فرصت نہیں!!
یہاں پر یہ بتا دینے میں حرج نہیں کہ ان زخمیوں سے ہماری مصیبتوں میں کچھ اضافہ ہی ہوگیا تھا۔ انکو ہم سے کوئی دلچسپی نہ تھی بلکہ سخت بغض اور نفرت تھی۔ ہمارا گناہ اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ ہم انکے بچ جانے کے سبب بنے

یہ بالکل یقینی امر تھا کہ اگر ہم لوگ گزشتہ رات کو وہاں پہونچ گئے ہوتے اور ہمت کرکے انکو وہاں سے نہ نکالا ہوتا تو موت سے بچنے کی انکے لئے کوئی صورت نہ تھی اور آج سورج غروب ہوتے ہوتے انکی زندگی کا چراغ بھی گل ہوگیا ہوتا۔ انکا ہمارے ساتھ یہ غرور انہیں یہ معلوم ہوکر کچھ زیادہ ہوگیا کہ ہم لوگ کاشتکار ہیں۔ ایلن کے ابا کو زخم کی مرہم پٹی کرنے میں خوب مہارت تھی انہوں نے دست بریدہ کی کلائی پر پٹی باندھی جس سے وہ بڑی بے چین تھی اور اگر پٹی نہ بندھتی تو اسکا مرجانا یقینی تھا مگر خوش قسمتی سے رگ کا منہ بندھ گیا جس سے برابر خون جاری تھا۔ دوسری کی سیدھی آنکھ میں بڑا سا زخم تھا وہ اسکی وجہ سے کراہ رہی تھی۔ چند روز بعد یہ اندازہ ہوگیا کہ اس کا بھی زخم تو اچھا ہو جائیگا مگر آنکھ جاتی رہے گی +
ہم نے انکے سامنے اپنے نسب اور اپنے حال کو نہیں چھپایا اور ہمارا دل ہوتا تھا کہ ہم کو بھی انکی جانب کا علم ہوجائے کہ وہ کس طبقہ اور کس خاندان کی ہیں مگر انھوں نے ہمکو اپنا حال کسی طرح نہیں بتایا جس سے ہمارے دل کو تسکین ہوتی پھر میں نے لڑکے کو پھسلانا شروع کیا کہ شاید اسی سے کچھ علم ہو مگر اس نے کہا کہ میں نے ان دونوں کو کبھی دیکھا

بھی نہیں۔ مگر معلوم ہوا کہ وہ لڑکا ہی بچ کا تھا جس کو ہندوستانیوں نے ہماری آنکھوں کے سامنے زندہ جلا ڈالا تھا۔ مگر بچہ کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اسکا باپ قتل ہو گیا ہے اور وہ اب یتیم ہے۔ اس کا تو یہ خیال تھا کہ وہ شریروں سے لڑنے گیا ہے اور اسی لئے وہ اسکی واپسی کا منتظر تھا پھر اس نے یہ بھی کہا کہ میری ماں چھ ماہ ہوئے کہ انتقال کر گئی ہے اور اسی گھر میں جہاں آپ لوگوں نے مجکو پایا میری خالہ اپنی شفقت میں مجھکو پرورش کرتی تھی لڑکے کے اس بیان سے ہماری سمجھ میں آیا کہ اسکی خالہ نے فرنگیوں کی دعوت کی ہوگی اور اثناء دعوت میں ہندوستانی چڑھ آئے ہونگے اسلئے عورتیں اور بچے تو سرداب میں تو چلے گئے ہونگے اور مردوں نے گھر کے صحن میں شریروں سے مقابلہ کیا ہوگا۔ مگر چونکہ ہندوستانیوں کی ایک تو ویسی ہی جمعیت بڑی تھی دوسرے برابر رسد لگی تھی اسلئے انہوں نے تمام انگریزوں کو قتل کر ڈالا تھوڑی دیر میں ان دونوں زخمیوں میں نوک جھونک ہونے لگی جس سے معلوم ہوا کہ کچھ دال میں کالا ضرور ہے ایک نے دوسرے سے کہا کہ او بدقسمت اس کے بعد تو اب تو باورچی خانہ نہ جا سکے گی اور ایک ہاتھ سے کیسے پکائے گی دوسری نے جواب دیا کہ تیری ایک آنکھ پھوٹ گئی اب تو کیسے خدمت کرے گی اور اپنے محبوب کو آنکھ کا اشارہ کریگی۔ انکی اس گفتگو سے ہمکو معلوم ہو گیا کہ وہ ابتک دون کی خواہ کتنی ہی لیتی رہی ہوں ایک ان میں سے ماما اور دوسری معمولی خدمت گار ہے۔ بہرحال اسوقت ہم سب ایک حال میں تھے۔ اور ان کے اس بیجا غرور و تمکنت کے باوجود میں نے ان پر یہ ظاہر نہیں کیا کہ مجکو ان کی حالت کا علم ہو گیا ہے کیونکہ مجکو یہ امر اخلاق کے خلاف نظر آیا لیکن اس کے مقابل ان کی عادت کے برخلاف میں نے جہاں تک ہو سکا انکی ہر طرح خبر رکھی اور جتنا کچھ ہو سکا ان کو آرام پہونچانے کی کوشش کی۔ میری یہ خبرگیری آخر اپنا اثر لائے بغیر نہ رہ سکی رفتہ رفتہ ان کی وہ درشتی گرمی سے بدلتی گئی اور وہ دونوں محبت کا اظہار کرنے لگیں اور ایلن کی خدمت بھی حسب استطاعت کرنے لگیں۔

جب صبح کا اجالا اچھی طرح پھیل گیا اور آفتاب نکل آیا تو معلوم ہوا کہ ہم لوگ جس کمرہ میں مقیم تھے وہ بہت بڑا کمرہ تھا دیواروں پر استرکاری کی ہوئی تھی۔ زمین میں سنگ مرمر کا فرش اور دیواروں کے سہارے چاروں طرف نقش و نگار بنے ہوئے گاؤ تکیے رکھے ہوئے۔ اور یہ گھر ہر طرح سے امن کی جگہ تھا۔ خوب مضبوط محفوظ بنا ہوا تھا اور ہر طرف سکون و اطمینان کا دور دورہ تھا۔ ادھر شہر میں شورش بدستور نہایت شدید تھی اور شور و غل کی آوازیں برابر چلی آ رہی تھیں۔ بندوقوں کی پٹاپٹ اور توپوں کے دھماکے مسلسل چاروں طرف سے سنائی دیتے تھے مجھ پر کل سے ایسے حوادث و مصائب کا ہجوم تھا جسکو کوئی دوسرا مشکل سے برداشت کر سکتا ہے اور اسکا اندازہ کرنا بھی متعذر ہے۔ کبھی تو مجکو خیال ہوتا تھا کہ یہ تمام مصیبتیں جو مجکو پیش آئی ہیں یہ میری خواب کی تعبیر ہیں کبھی خیال ہوتا تھا کہ مجکو خلل دماغ ہو گیا ہے اور سب کچھ میرے واہمہ کا عمل ہے ورنہ جو کچھ مجکو نظر آ رہا ہے

اس کی اصلیت کچھ نہیں ہے۔کبھی خیال آتا تھا کہ کل شاید میں نے بھنگ پی لی ہے اور یہ تمام خیالات اسی کا نتیجہ ہیں مگر ان کی حالت کچھ اور ہی تھی وہ ہم لوگوں کے ساتھ چھپے بیٹھے رہنے پر پشیمان سے ہو رہے تھے نہ کچھ بولتے تھے نہ چالتے تھے بلکہ اُن کا دل ہوتا تھا کہ اپنے ابناء وطن سے جا ملتے اور سب کے ساتھ شریک ہو کر دشمنوں سے لڑتے اسی لئے کبھی تو نکل کھڑے ہونے پر آمادہ ہو جاتے تھے اور کبھی کچھ سوچنے لگتے تھے۔ اسی طرح ایک مرتبہ ذرا زیادہ دیر تک سر جھکائے رہنے کے بعد انھوں نے اپنا سر اٹھایا اور اپنا جی بہلانے کے لئے کہا کہ اب جبکہ سورج نکل آیا ہے دشمنوں کو اب شورش برپا کرنے کا موقع نہ مل سکیگا اور نہ اب انگریزی فوج کے سامنے وہ لوگ ٹھہر سکیں گے آج عصر تک ضرور قابو میں آ جائیں گے اور ہم لوگ دہلی کا از سر نو انتظام کر سکیں گے۔ بارود خانہ پر متعین فوج اور شہر بھی بہت جلد اپنی حالت کو درست کر لیں گے۔ پھر تمام فوج نے تو شورش کی بھی نہیں ہے۔ میرٹھ میں ابھی بہت بڑی جمعیت باقی ہے جو شورش میں شریک نہیں ہے۔ انگریزی حکم کے پابند ہیں اور فوجی خدمات پر تعینات ہیں اسکے منتظر ہیں کہ انگریزی مدد آئے اور وہ اسکے ساتھ اس شورش کے فرو کرنے میں معاون ہوں۔

پھر وہ ہندوستانی نظام سلطنت کے متعلق اپنی رائے ظاہر کرنے لگے کہ اگر انگریزوں کا فوجی نظام کسی ٹھوس اور مضبوط بنیاد پر قایم ہوتا اور مسلسل اس کی نگرانی رہتی تو آج یہ شورش رونما ہونے پائی۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ انکی یہ گفتگو آیا محض اس لئے تھی کہ اس سے ہماری بے چینی اور پریشانی کو کسیقدر سکون ہو یا اس لئے تھی کہ انکے نزدیک اب بھی اس شورش کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستانیوں کو کارتوسوں کے استعمال سے نفرت ہے کہ ان میں سُور یا گائے کی چربی لگی ہوئی ہے یا انکی یہ رائے اس لئے ہوگی کہ اُن کے کان بہرے اور دماغ خبط کیا ہو گا۔ کہ انکو نہ توپوں اور بندوقوں کی آواز سنائی دیتی تھی اور نہ ہندوستانیوں کی آوازیں سنائی دیتی تھیں جو کہہ رہے تھے کہ ہم مزید انگریزی اقتدار کے ماتحت نہیں رہیں گے اور بزور شمشیر اپنی آزادی حاصل کرینگے یا شاید انکو ابھی یہ خیال نہ ہوگا کہ یہ شورش میرٹھ اور دہلی ہی میں محدود نہیں ہے بلکہ تمام ہندوستان میں پھیل چکی ہے اور آپکو شاید یہ بھی معلوم نہیں کہ انگریزوں کے لئے ہندوستانیوں کے رسوم و رواج عادات و اخلاق دین و مذہب کو بدل دینا کسی طرح ممکن ہے انگریز آیندہ کسی طرح مختلف راجوں مہاراجوں نوابوں کے ماتحت ان مختلف مذاہب و آزار کے لوگوں کو چھوڑ سکتے ہیں۔

مگر نہیں! نہ وہ اندھے تھے نہ بہرے اور نہ وہ قصداً ناواقف بن رہے تھے بلکہ سب کچھ دیکھ اور سن رہے تھے اور سب کچھ اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔ دنیا کو خوب اچھی طرح دیکھ چکے تھے اور زمانہ کے سرد گرم کو برداشت کر چکے تھے عادت اور حسن ظن کا طریقہ انہوں نے صرف اسلئے اختیار کیا تھا کہ اس سے ہم لوگوں کی وحشت کسیقدر کم رہے گی۔ انکی ایک عجیب و غریب امید یہ بھی تھی کہ شور و شر عنقریب فرو ہو جائیگا اور امن و چین از سر نو قایم ہوگا اور پھر مفسدوں کے ہاتھوں ہمارے گھر کو لوٹ مار اور آگ لگانے سے جو نقصانات پہونچے ہیں اسکا حکومت سے حسب قانون ہمکو تاوان مل جائیگا دوران گفتگو میں، جبکہ میں بظاہر ان کی تصدیق کر رہی تھی،

توپوں کے دھماکے مسلسل سنائی دے رہے تھے۔ ایک دفعہ انھوں نے سر اٹھایا اور کان لگا کر سُنا پھر کہا کہ دیکھو اسوقت توپوں کی غیر معمولی آواز آرہی ہے۔ اسلئے میرا خیال ہے کہ غالباً فوج اسوقت بہت سخت گولہ باری کر رہی ہے۔ اور توپیں سر ہونے کے بعد جو آوازیں بلند ہوتی ہیں پھر تھوڑی دیر کے لئے بند ہوجاتی ہیں پھر اور توپوں کو سر کیا جاتا ہے پھر کراہنے کی آوازیں آتی ہیں یہ سب اس بات کی دلیل ہے کہ اسوقت توپوں سے ہر مرتبہ بہت سے لوگوں کا نقصان ہوتا ہے اور یہ نقصان کسقدر مفسدوں کے حملہ کو کمزور کر دیتا ہے اور وہ سامنے سے ہٹ جاتے ہیں پھر وہ جمع ہو کر حملہ کرتے ہیں میرا خیال ہے کہ شور و غل سلیم گڈھ کی طرف سے سنائی دیتا ہے۔ میرے خیال میں تو یہ لڑائی کلکتہ میدان یا بارود خانہ کے پاس ہو رہی ہے۔ اسپر انہوں نے پھر کان لگایا اور کہا میری سمجھ میں آگیا میرٹھ کے گورے جو ہمارے ساتھ شریک ہیں جمنا کے پُل کو عبور کر چکے ہیں اور شورش کنندگان کے پشت پر سے لڑائی ہونے لگی ہے اور خدا نے چاہا تو مفسد دو طرف سے دباؤ میں آجائیں گے اور اس طرح اب بہت جلد ان کے حواس درست ہوجائیں گے۔ لڑائی ختم ہوجائے گی اور یہ سب گڑبڑ فرو ہوجائے گی۔ ہملوگ اپنے گھر کو واپس ہونگے اور وہاں اپنے بچہ کو انا کے ساتھ موجود پائیں گے میں نے کہا ہاں بیشک اللہ کو سب قدرت حاصل ہے پھر تھوڑی دیر تک نہ کسی بندوق کی کوئی آواز سنائی دی اور نہ توپ کی۔ پھر اکیلی ایک توپ کی آواز آئی۔ اور اس کے بعد نعرہائے خوشی سنائی دے جیسے فتح و غلبہ حاصل ہوگیا ہو اسپر وہ کچھ متحیر سے ہوگئے اور انکے منہ سے نکل گیا کہ کیا انگریزوں نے بارود خانہ کو خالی کر دیا اور ہندوستانی اسپر بھی قابض ہوگئے۔ ہماری زبان سے بارود خانہ کا نام سنکر ایلن نے کھڑے ہو کر میرے ہاتھ کو بہت زور سے پکڑ کر کھینچا اور پوچھا کہ بارود خانہ کا نام کیوں لے رہی ہو۔ میں نے باتکو ٹالکر کہا کچھ نہیں یہ بات ہو رہی تھی کہ انگریزوں نے بارود خانہ کو جہاں وہ پناہ گزیں ہیں خوب مضبوط اور ناقابل تسخیر بنالیا ہے ایلن نے کہا کہ اگر بارود خانہ اسقدر محفوظ جگہ ہے تو پھر ہم لوگ وہیں کیوں نہیں چلتے اور ولیم سے کیوں نہیں جا ملتے۔

بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ

"کس جرم کی پاداشں میں ؟"

ازجناب پرویز بٹالوی

جاہلیت عرب میں رواج تھا کہ لوگ اپنی لڑکیوں کو اپنے ہاتھوں زندہ گاڑدیا کرتے تھے۔ اسلام دنیا میں چونکہ پیام رحمت لیکر آیا تھا۔ اسنے ظلم وستم۔ جور واستبداد۔ بربریت و سبعیت کا کما حقہ استیصال کردیا۔ بھلا ممکن تھا کہ پھر اسقدر وحشیانہ رواج دنیائے اسلام میں باقی رہجاتا۔ اسلام نے اسکی سخت ممانعت کی۔ چنانچہ قرآن حکیم نے نہایت لطیف پیرایہ میں اسکا ذکر کیا ہے کہ جب میدان حشر میں خیر وشر کے ذرہ ذرہ کی جانچ پڑتال ہوگی ایک ننھی معصومہ اپنے باپ کا دامن پکڑے داور داوار کے سامنے فریاد لیکر آئیگی۔ اس سنگدل سے سوال ہوگا کہ بتاؤ اسے کس جرم کی پاداش میں قتل کیا گیا تھا جواب کیا بن پڑیگا ظاہر ہے۔

مسلمان خوش ہیں کہ اسلام کی وسیع رحمت عامہ نے کس طرح ایسے دردناک مظالم کا خاتمہ کیا۔ بات ہے بھی قابل فخر۔ لیکن اگر نظر تعمق سے دیکھا جائے تو معلوم ہوجائے گا۔ ایسی وحشتناک رسم کا وجود آج بھی دنیا میں ہے۔ آپ شاید حیران ہوں کہ اس دور تہذیب میں کونسی سرزمین آئیں ایسی ہوگی جہاں اپنے ہاتھوں لڑکیوں کو زندہ درگور کردینے کی رسم جاری ہوگی اور آپ اور بھی زیادہ حیران ہونگے جب یہ بتایا جائے کہ یہ رسم آج ہمارے ملک میں ہماری قوم میں خود ہمارے گھروں میں جاری ہے لیکن ہم ہیں کہ بظاہر اس رسم کو وحشت و درندگی قرار دیتے رہے اپنی آنکھوں سے ایسا ہوتے دیکھتے ہیں اور کبھی خیال تک بھی نہیں کرتے۔ یوں تو اسلام نے ہر قتل بے گناہ کو مستوجب سزا قرار دیا ہے۔ لیکن خواہ اس رسم کو سب سے زیادہ وحشتناک اس لئے قرار دیا ہو کہ اسمیں ایک معصوم لڑکی کی بیکسی بے بسی۔ بے زبانی اور اسکی قوت مدافعت کے فقدان سے ناجائز فائدہ اٹھایا جاتا ہو۔ آیئے ہم دیکھیں کہ آج بھی کس طرح معاشرتی رسوم کی آڑ میں۔ بیچاری بے زبان لڑکیوں کو زندہ درگور کردیا جاتا ہے اور کوئی اسے جرم یا گناہ قرار نہیں دیتا۔ میرے سامنے اسوقت ایک ایسا ہی واقعہ ہے جسے افسانوی کردار و تمثیل سے پیش کرتا ہوں اگر آپ اپنی اپنی جگہ اپنے حالات میں نظر دوڑائیں گے تو معلوم ہوجائیگا کہ کوئی جگہ بھی ایسے واقعات سے خالی نہیں

رشید ایک اوباش اور آوارہ مزاج لڑکا تھا اگرچہ اسکا خاندان شہر میں اپنی نجابت و اصالت کیلئے مشہور تھا لیکن بدقسمتی کہ رشید کے سر سے بچپن ہی سے باپ کا سایہ اٹھ گیا۔ یتیم بچوں کے ساتھ اکثر ایسا ہی ہوا کرتا ہے یا تو وہ بھوکوں مرجایا کرتے ہیں اور اگر پرورش پاکر بڑے ہوتے ہیں تو چونکہ گھر میں کسی کا دست تادیب و تہدید سر پر نہیں ہوتا۔ باہر والے یتیم سمجھکر کچھ کہتے نہیں عام طور پر آوارہ ہوجاتے ہیں۔ یتیم ہونے کے بعد اخلاق کا اعلیٰ نمونہ پیش کرنا واقعی ایک اعلیٰ سعادت ہے۔ رشید بچپن میں ماں کا لاڈلا رہا۔ بڑا ہوا تو بری صحبتوں میں پڑ گیا۔ اسکی آوارگی کوئی

چھپی چھپائی بات نہ تھی۔ گھر کے بڑے بوڑھے پہلے تو سمجھاتے بجھاتے رہے لیکن باپ کا سایہ دیکھ کے بیٹے کے گالیاں کھاتا رہا لیکن اسکی خیر اندیشی کی فکر نہیں چھوڑتا۔ ماں ہزار کہتی لیکن اسکی سنتا کون۔

رشید ناکارہ تھا۔ آوارہ تھا کوئی اسے پسند نہیں کرتا تھا لیکن پتہ نہیں صابرہ کے ماں کے سر میں کیا سودا سمایا تھا کہ وہ صابرہ کی زندگی رشید کے بیرو کر دینے پر تلی بیٹھی تھی اسکے گھر والے مخالف۔ عزیز رشتہ دار۔ مخالف۔ شریک ہمسائے مخالف غرضیکہ جو بھی سنتا مخالفت کرتا لیکن اسنے کچھ ایسا کانوں میں تیل ڈال رکھا تھا کہ کسی کی سنتی ہی نہ تھی اور تو اور خود رشید بھی اس سے خوش نہ تھا۔ اور اگر راضی تھی تو صابرہ کی ماں یا رشید کی۔ صابرہ کی ماں سے جب بھی کبھی کوئی پوچھتا تو صاف بتا دیتی کہ میں نے تو لڑکی اپنی بہن کو اسوقت سے دے رکھی ہے جب وہ دودھ پیتی تھی اب تو یا صابرہ کی ڈولی بہن کے ہاں پہنچے گی۔ یا اسکا جنازہ اس دہلیز سے نکلیگا۔

صابرہ ایک متین۔ سنجیدہ۔ خاموش۔ سمجھدار لڑکی تھی۔ اور انتہائی بدقسمتی کہ پہلو میں ایک حساس دل رکھتی تھی۔ ایک تو معاشرتی نقطہ خیال سے لڑکی کا اپنے منہ سے اپنے رشتہ کے متعلق کچھ کہنا گویا کسی گناہ عظیم کا ارتکاب کرنا ہے اسپر صابرہ کی فطرتی خاموشی لیکن پھر بھی ہمجولیوں۔ سہیلیوں کی چھیڑ چھاڑ میں کنایتاً ظاہر ہو جاتا تھا کہ صابرہ خود بھی دل سے اسمیں راضی نہ تھی۔ اوپر رشید کی ماں کی ضد کہ بیٹیا! اگر اس معاملہ میں میری مرضی کے خلاف چلے تو یاد رکھو زہر کھا کر مر جاؤنگی نتیجہ یہ کہ دن مقرر ہو گئے۔ بارات آئی۔ نکاح خواں کو معلوم۔ گواہوں کو معلوم۔ خود دولہا دلہن کو معلوم کہ کس جبر و اکراہ سے یہ عقد ہوا۔ تاہم لیکن جہاں اور رسومات ادا ہوئیں ایجاب و قبول کی رسم بھی غیر شعوری طور پر ادا ہو گئی اور سب مطمئن ہو گئے کہ شریعت حقہ کے عین مطابق رشتہ مناکحت جوڑ دیا گیا ہے۔ شادیانے بجے۔ مبارکبادیاں ملیں۔ سو سو دعائیں مانگی دلہن گھر میں آئی۔ گھر کی رونق بڑھی۔

ممکن ہو ہمارے بعض قدامت پرست بزرگ اسے قابل قبول نہ سمجھیں ہر چند میں بھی دور جدید کی آزادیوں کا مداح نہیں ہوں لیکن جہاں تک ایجاب و قبول کی شرط کو میں سمجھا ہوں اس سے تو شریعت کا مفہوم یہی ہے کہ جنکی آیندہ زندگیوں کا فیصلہ کیا جا رہا ہے انکی دلی رضامندی معلوم کر لی جائے یہی ایجاب و قبول ہے۔ بالخصوص جبکہ اسمیں بلوغت کی شرط بھی عائد ہو۔ کہ اپنی سمجھ و شعور سے بات کا فیصلہ کریں۔ یہ کہ باندھ بندھا کر چار کلمے ان سے پڑھوا لئے۔ اور سمجھ بیٹھے کہ شریعت کا منشا پورا ہو گیا۔ کم ازکم میرے نزدیک تو شریعت سے استہزا ہے دن حسب معمول گذرتے گئے اور کوئی خاص تبدیلی رشید کے گھر میں محسوس نہ ہوئی البتہ ایک غائر نگاہ سے دیکھنے والا محسوس کر سکتا تھا کہ صابرہ کے چہرے سے بشاشت و شگفتگی آہستہ آہستہ مفقود ہوتی چلی جا رہی تھی رشید کے پاؤں کا چکر اسے کب تک اس طرح مقید رکھ سکتا تھا آہستہ آہستہ وہ اپنی پرانی روش پر آ گیا۔ ہر چند صابرہ اپنی سلیقہ شعاری فطرتی ایثار و خدمتگذاری سے رشید کو اسکی بدعنوانیوں سے روکنے کی کوشش کرتی لیکن اسکا مرض ان تیمارداریوں کی حد سے بڑھ چکا تھا۔ آہستہ آہستہ بے رخی اور بے اعتنائی شروع ہوئی۔ بے اعتنائی نفرت اور نفرت دشمنی میں تبدیل ہوتی چلی گئی۔ گھر میں ساس صابرہ کی دلجوئی کا آسرا تھی لیکن

چونکہ مصیبتیں تنہا نہیں آیا کرتیں۔ بیمار تو وہ اکثر رہا ہی کرتی تھی ایک برس بھی گذرنے نہ پایا تھا کہ بچاری چل بسی۔

اب جسقدر صابرہ بے بس تھی۔ رشید اسی قدر زیادہ آزاد رفتہ رفتہ گھر کی آمدورفت کم ہونے لگی۔ اکثر باہر رہتا۔ گھر میں اگر کوئی کشش اسکے لئے تھی تو وہ صابرہ کے چار زیور تھے۔ جب ضرورت مجبور کرتی۔ آجاتا اور کچھ نہ کچھ چھینا جھپٹی سے لے جاتا۔ صابرہ کا باپ ایک سیدھا سادھا غریب آدمی تھا۔ اگرچہ صابرہ کے لئے وہاں روٹی موجود تھی لیکن صابرہ صحیح معنوں میں صابرہ تھی۔ فاقوں پر فاقے آتے۔ لیکن کیا مجال کہ دوسرے دروازہ تک خبر ہو جائے گلی کے باہر سکا تھا۔ لیکن صابرہ نے کبھی ظاہر نہ ہونے دیا کہ اسے کوئی تکلیف ہے۔ اندر ہی اندر کچھ مزدوری کرتی لیکن ایسی مزدوری کونسی ہو سکتی تھی جس سے گھر بیٹھکر ایک معصوم لڑکی گذارہ کر سکے۔ دن رات ایک کر دیتی تو بمشکل ایک وقت کی روٹی میسر آتی۔ اللہ رکھے سارا محلہ اپنا تھا سب قریبی رشتہ دار۔ اسکے سامنے دوسرے گھروں میں ہزاروں نعمتیں آتیں۔ لیکن صابرہ نے کبھی یہ بھی معلوم نہ ہونے دیا کہ اسکے ہاں کسی چیز کی کمی ہے۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ تین تین وقت کے فاقہ کے بعد روٹی کا انتظام ہوا۔ کہ رشید دنناتا ہوا آگیا صابرہ نے خاموشی سے روٹی اسکے سامنے رکھدی اسنے روٹی بھی کھائی گالم گلوچ سے صلہ بھی دیا۔ کیا عجب کہ مار پیٹ بھی کی ہو۔ اور جو چیز گھر میں نظر آتی لیکر چلتا بنا۔

اول تو کسی کو کیا بنی کہ خواہ مخواہ رشید کے سر ہوتا۔ پھر رشید کسی کی مانتا ہی کیوں۔ صابرہ کے ماں باپ کے پاس شرافت کا آخری حربہ یہی تھا کہ انہوں نے رشید کی حد سے زیادہ خدمتگذاری کی۔ لیکن ایثار و قربانی کا اثر وہیں ہوتا ہے جہاں سرشت بد نہ ہو۔ زمین شور میں ابر نیساں کیا گل لالہ کھلائیگا۔ یہ سب کچھ تھا لیکن صابرہ کی زبان پر کبھی حرف شکایت نہ آیا۔ سلگتی ہوئی آگ نے اگرچہ اسکی ہڈیوں تک کو پھونک کے راکھ کر دیا۔ لیکن کیا مجال جو اُسنے اسکا دھواں کبھی ظاہر ہونے دیا ہو۔ اسکی آنکھوں میں کبھی آنسو نہ دیکھا گیا۔ لیکن آخر کبتک۔

دلکا خوں آنکھ میں کھینچ آئے تو کیا اس کا علاج
نالہ روکا تھا کہ یہ پردہ در راز نہ ہو

ایک دفعہ اسکی آنکھیں دکھنے آئیں۔ دو مہینے کے بعد بمشکل آرام آیا۔ دیکھا کہ بینائی بہت کم ہو گئی ہے اب بچاری اس مزدوری سے بھی معذور ہو گئی۔ گھر میں جو کچھ تھا آہستہ آہستہ رشید کی آوارگیوں کی بھینٹ چڑھ گیا۔ اب صابرہ کا روگ چھپائے چھپ نہیں سکتا تھا۔ سوکھکر ہڈیوں کا ڈھانچا رہ گئی سہیلیاں ہجولیں اکثر اسے سمجھاتیں کہ غم نہیں کھانا چاہئے۔ فکر سے کیا فائدہ۔ وہ ان سب کی سنتی ایک خفیف سے تبسم سے جو اسکے قلب کی انتہائی گہرائیوں کا آئینہ دار ہوتا۔ سنکر چپ ہو جاتی کہ ہو غم ہی جانگداز تو غمخوار کیا کرے۔

صابرہ کی حالت دن بدن قابل رحم ہوتی گئی۔ لیکن رشید کی جوتی کو بھی خبر نہیں کہ ایک قیمتی جان کس طرح تلف ہو رہی ہے۔ پتہ نہیں اسے کب سے تپ آرہا تھا۔ لیکن اس نے کسی سے ذکر ہی نہ کیا۔ اب جب وہ دن رات لازم رہنے لگا تو معلوم ہوا کہ تپ کہنہ ہے۔ ایک دن کسی نے آکر گھر میں ذکر کیا کہ رشید کو کسی آوارگی میں تھانہ والے پکڑ کر لے گئے ہیں اور دس روپے جرمانہ کی عدم ادائیگی میں حوالات میں دے رکھا ہے صابرہ کے پاس ایک گرم چادر سنبھال کر رکھی ہوئی تھی۔ چادر نکالی رشید کی چچی کو دی کہ چپکے سے بیچ دے۔ چادر قیمتی تھی۔ لیکن صابرہ کو

صرف دس روپے مطلوب تھے۔ وہ روپے لیکر رشید کے چچا کو دیئے کہ جاکر جرمانہ ادا کردیں۔ سہ ماہیاں آگئیں۔ گھر میں اب صابرہ سے بچنے کے لئے کافی کپڑا بھی نہ رہا۔ بخار لازم ہوگیا۔ اسکی ماں اب اُسے بمشکل اپنے ہاں لے آئی۔ جو کچھ بن پڑا علاج معالجہ کیا۔ لیکن مرنے والے کا کیا کرے کوئی صابرہ کو اب پہلے سے بھی زیادہ چپ لگ گئی۔ کبھی کبھی جب گھر والوں کو دوا۔ دعا کیلئے دوڑ دھوپ کرتے دیکھتی تو کسی سہیلی سے کہتی کہ انہیں سمجھادو۔ کہ

میرے دم پر جو گذرتی ہے گذر جانے دو
قصہ غم نہ بڑھاؤ مجھے مرجانے دو

رشید صابرہ کی بیماری کے دوران میں کبھی ادھر نہ آیا پتہ نہیں ایک دن کیا جی میں آئی۔ کہ چلا آیا چارپائی پر پڑی ہوئی تھی۔ رشید سرہانے آکر بیٹھ گیا صابرہ نے پلک اٹھائی۔ رشید کو دیکھا۔ وہی غیر محسوس تبسم اسکی آنکھوں میں دکھائی دیا۔ ایک موٹا سا آنسو کا قطرہ رخسارہ پر ڈھلک پڑا۔ آنکھیں میچ لیں۔ ایک ہچکی آئی جس کے جھٹکے نے ساز حیات کی آخری تاریں توڑ کے رکھدیں

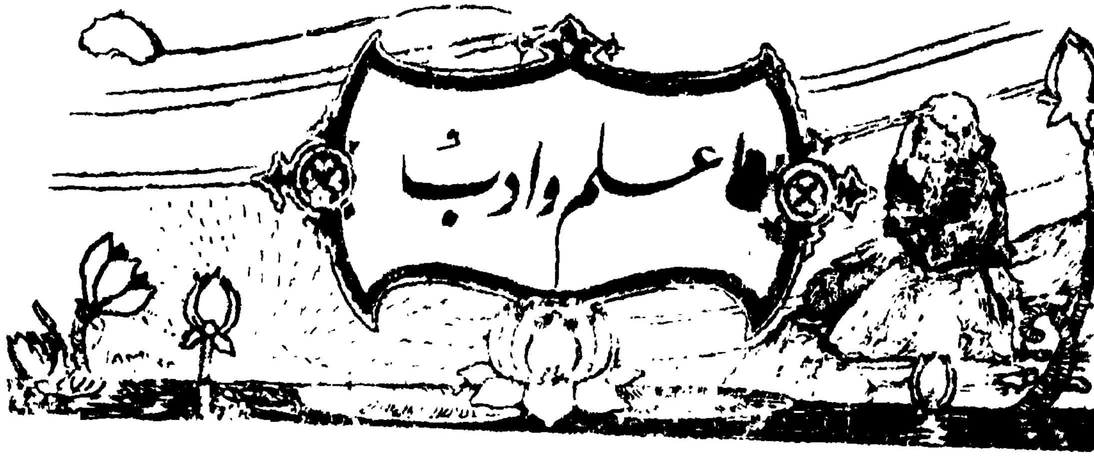
اور صابرہ! آہ۔

غم و حرماں کی داستان خموش۔ صابرہ ہمیشہ کیلئے چپ ہوگئی۔

صابرہ کا قرآن شریف۔ مرنیوالی کی نشانی اسکی ماں نے سنبھال کر رکھا تھا۔ یہیں بای ذنب قتلت کے نیچے موٹا سا خط کھنچا ہوا تھا۔ اور اس صفحہ پر جابجا آنسوؤں کے نشان نظر آتے تھے۔

کیا یہ دہ نہیں تہی! کیا یہ واقعات روز ہمارے سامنے نہیں گذرتے ہیں کیا کبھی کسی نے اسپر غور کیا ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

عورتوں کیلئے ۲ دو کتابیں



کیفِ بہار

از ابوالاحسان حضرت آزاد انصاری مدظلہٗ

سرسبز پھر بہار سے سارا چمن ہوا
معمورِ جلوۂ گل و سرو و سمن ہوا

پھر حکم میکشی مسرت کا عام ہے
پھر اذنِ چارۂ غم و رنج و محن ہوا

پھر شیخ دل سے پیرِ مغاں کا مرید ہے
پھر زاہدوں کا نشۂ تقویٰ ہرن ہوا

پھر محو سادہ زاہد شب زندہ دار ہے
پھر رہنِ بادہ خرقۂ زہدِ کہن ہوا

پھر جام لیکے ساقی رنگیں ادا اٹھا
پھر گرم نغمہ مطربِ گل پیرہن ہوا

پھر صحنِ گلستاں میں بساطِ طرب بچھی
پھر شغل میکشی لبِ نہرِ چمن ہوا

پھر جلسۂ طرب میں غزلخوانیاں چھڑیں
پھر انعقادِ محفلِ شعر و سخن ہوا

پھر چار سمت سرو قدوں کے ہجوم ہیں
پھر اجتماعِ لالہ رخانِ زمن ہوا

پھر ہمزبان ہر صنمِ گلبدن بنا
پھر ہمزبان ہر بتِ غنچہ دہن ہوا

پھر اخترِ مقدرِ عالم چمک اٹھا
پھر آفتابِ لطفِ خدا ضو فگن ہوا

پھر ایکے سال چار طرف اتنے خم لنڈھے
آزاد فاقہ مست بھی پیکر مگن ہوا

نام مشت خاک کا قدرت نے انساں رکھدیا

از جناب حاجی منشی محمد فاضل صاحب عبقری بریلوی

طاق نسیاں پہ ازل کا عہد و پیماں رکھدیا — رہن بت خانے میں جاکر دین و ایماں رکھدیا

نام مشت خاک کا قدرت نے انساں رکھدیا — سر پہ انی جاعل کا تاج ذیشان رکھدیا

عشق نے سینے میں داغ ہجر جاناں رکھدیا — اک ذرا سی کوٹھری میں مہر تاباں رکھدیا

فصل گل آتے ہی میکش ہوگئے توبہ شکن — توڑکر پیمانہ و ساغر کا پیماں رکھدیا

ایسے آنے سے جنازے پر نہ آنا خوب تھا — دو قدم چلکر ہمارے سر پہ احساں رکھدیا

زخمہائے توبہ تو سے دل بنا ہے لالہ زار — خنجر قاتل نے سینے میں گلستاں رکھدیا

ہر دہان زخم پر ہے انی ذنب کی صدا — حشر پر کیوں قصہ خون شہیداں رکھدیا

ہائے اللہ پڑ گیا پانسہ قمار عشق میں — عاشقوں نے داؤں پر سرمایہ جاں رکھدیا

تیرے ناقے کا پتہ لیلےٰ کہیں ملتا نہیں — چھان کر سب تیرے مجنوں نے بیاباں رکھدیا

مفتی دوراں نے مال مفت سمجھا تھا اسے — دیکھتے ہی دختِ رز کو نقد ایماں رکھدیا

تیغ خوں آشام پر پانی چڑھانے کے لئے — خضر نے قاتل کے آگے آب حیواں رکھدیا

نازنیں ہاتھوں سے اُس پردہ نشیں نے بعد مرگ — میری تربت پر چراغ زیر داماں رکھدیا

آسماں نے چن لیئے جب خاک سے ذرات عشق
نام اُن کا عبقری مہر درخشاں رکھدیا

اُمیّد

از جناب محمود اسرائیلی

رفعت کی فضا میں رہنے والی ہنس ہنس کے غموں کو سہنے والی
دشتِ حرماں میں دل کی دم ساز میدانِ عمل کی..... مردِ جانباز
گلشن کی بہار تیرے دم سے بسمل کو قرار تیرے دم سے
مرغانِ چمن کی نغمہ سنجی پروانہ کا جذبۂ سپندی!
یہ کشتیاں بحرِ بیکراں پر سیارے ہوں جیسے آسماں پر
تابانیٔ شمع و رونقِ بزم عریانیٔ تیغ و گرمیٔ...... رزم
ہر شے پہ ہے تیری حکمرانی روشن ہے چراغِ زندگانی
گہوارۂ طفلِ بے زباں تو پیری میں عصائے حفظِ جاں تو
تو مستیٔ چشمِ فتنہ پرور تو کیف مئے سرور آور
تو برشِ ابروے بتاں ہے تو غازۂ حسنِ دلستاں ہے
ہر غمزہ میں ہے ترا اشارہ ہر رنگ میں تو ہے آشکارہ

اے خار کو گل بنانے والی ظلمت میں ضیا دکھانے والی
ناکامیٔ دل ہے یاس افزا ماحولِ الم میں ہوں سراپا
درکار ہے تیری دستگیری مایوس ہے در پئے اسیری
محمودؔ کی کارساز بن جا دلگیر کی دل نواز بنجا!

راز افشا ہوگیا

(از حضرت اصغر شاہجہانپوری)

ہوگیا راز محبت آہ افشا ہوگیا
آپ رسوائی سے بچئے میں تو رسوا ہوگیا

دل کے ہر گوشہ میں اک ہنگامہ برپا ہوگیا
ہمنے کیا سمجھا تھا اے یاس وفا کیا ہوگیا

بنکے ہمراز حقیقت اک تماشا ہوگیا
یادگار حسن ہر داغ تمنا ہوگیا

تنگئ زنداں سے اتنا جوش پیدا ہوگیا
گوشۂ دل غیرت دامان صحرا ہوگیا

آنکھ کا ہر ایک پردہ جل گیا اے برق حسن
نذر آتش آج سامان تمنا ہوگیا

عشق کے انداز دلکش دیکھکر ذرا ست
جلوۂ حسن ازل محو تماشا ہوگیا

پھونکدی دست اجل ذا آج آزادی کی روح
موت کیا آئی مریض عشق اچھا ہوگیا

رفتہ رفتہ اشک حسرت بن گیا ذوق سکوت
یوں چھپایا راز دل ہمنے کہ افشا ہوگیا

طور پر موسیٰ ہوئے بیگانۂ ہوش و حواس
جس قدر پردہ اٹھا اتنا ہی پردہ ہوگیا

اللہ اللہ اک نگاہ ناز کے دو دو اثر
زخم اک اچھا ہوا اک زخم پیدا ہوگیا

اب نکل سکتا نہیں اے چارہ گر پیکان یار
وہ تو اک ناکام کے دل کی تمنا ہوگیا

اب نہ آہیں ہیں نہ وہ نالے نہ وہ ذوق تپش
حال دل اے سوز فرقت دیکھ تو کیا ہوگیا

مرحبا صد مرحبا اے جلوۂ بے کیف و کم
اب تو ہر محو تماشا اک تماشا ہوگیا

کوندتی پھرتی تھی اک بجلی حجاب اندر حجاب
جب نقاب الٹی کسی نے اور پردا ہوگیا

عرصۂ محشر میں سنتے ہیں وہ ہوگا بے نقاب
اک جھلک سے جس کی اصغر طور ٹھنڈا ہوگیا

"نوگرفتار محن"

از جناب محمد کامل صاحب صدیقی

غم سے کیا مطلب تجھے تو کس لئے مغموم ہے
عمر ہی کیا ہے ابھی نام خدا معصوم ہے

بال کیوں بکھرے ہوئے ہیں غمزدہ ہے کس لئے
جان کاہل جان سے اپنی خفا ہے کس لئے

اف تری آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آتے ہیں کیوں
کچھ بتا تو یہ ترے ساغر چھلک جاتے ہیں کیوں

پھول سا چہرہ ترا کملا رہا ہے کس لئے
یہ اُداسی کا سا عالم چھا رہا ہے کس لئے

تجھ کو غمگیں دیکھکر اک صرف مجھ کو غم نہیں
ذرّہ ذرّہ کہہ رہا ہے غم ہمیں بھی کم نہیں

قلب ہل جاتا ہے میرا تجھ کو روتا دیکھکر
عرش آجاتا ہے جنبش میں یہ نقشا دیکھکر

کچھ خبر بھی ہے تجھے اے "نوگرفتار محن"
تو بہار گلستاں ہے تو ہے شمع انجمن

تو ابھی امید کا ہے اک شجر بے برگ و بار
کچھ دنوں کے بعد جو اپنی دکھائیگا بہار

تو بہشت عیش کا غنچہ ہے اے غنچہ دہن
تیری ہستی ہے ازل سے ناشناسائے محن

تو شراب حسن بنکر ڈھل رہی ہے جام میں
بر سر محفل چھلک جائے گی کچھ ایام میں

حسن کی تو ایک جیتی جاگتی تصویر ہے
جس سے دنیا ہو منور وہ تری تنویر ہے

بحر اعظم میں تو وہ اک کشتئ امید ہے
یعنی خود ساحل کو جس کی آرزوئے دید ہے

نغمہائے مست ہیں جس میں وہ تیرا ساز ہے
یعنی میری زندگی کا اک طلسم راز ہے

اپنے نازک دل سے بار رنج و غم کو دور کر
کبریا کے واسطے مسرور بن مسرور کر

مجھے "تواسی" کی ضرورت ہے

بنگالی ادب کی چاشنی

ایک دن ایسا تھا — جب انسان بہت بیوقوف تھا۔ اسنے اپنی رفیقۂ حیات کو کنیز بنا رکھا تھا۔ پیروں میں لوہے کی زنجیر تھی۔ صرف اتنی لمبی کہ وہ گھر میں کام کاج کیلئے ادھر اُدھر جا سکے۔

انسانی زندگی کی یہ حسین سہیم و شریک۔ گھر کو صاف ستھرا رکھتی تھی۔ شام تلسی کی جڑ میں گھی کا چراغ جلا کر تمام بلیات کو دور رکھنے کی دعا کرتی تھی — انسان کیلئے کھانا تیار کرتی اسکی پیاس بجھانے کیلئے پانی لاتی اور پوجا کیلئے کلیاں چن چن کر لاتی — مرد اپنے دل میں سوچا کرتا کہ یہ جو میرے لئے اتنا کرتی ہے اسکا سبب یہی ہے کہ میرے بغیر اسکا کام چل ہی نہیں سکتا۔

خدا کو جب انسان کے دل کی یہ بات معلوم ہوئی تو وہ بہت ہنسا۔ اسنے ایک دن انسان کی حسین شریک زندگی کو چھپا دیا — مرد جب اپنے گھر واپس آیا تو دیکھا کہ کھانے کیلئے بھوجن نہیں ہے پینے کیلئے پانی نہیں ہے پوجا کیلئے پھول نہیں ہیں۔

یہ دیکھکر انسان قہر و غضب کا مجسمہ بن گیا، اسنے شور و غل سے سارا گھر سر پر اٹھا لیا — اتنے میں خدا آ گیا اور اسنے بالکل انجان ہو کر پوچھا — "کیوں معاملہ کیا ہے —؟" انسان نے غصہ سے جواب دیا "معاملہ کیا ہے —؟ کہاں گئی ہماری وہ —؟ کھانے کیلئے بھوجن نہیں پینے کیلئے پانی نہیں۔ پوجا کیلئے پھول نہیں — وہی تو یہ سب کچھ کرتی تھی"۔ خدا نے پوچھا — "بس یہی تو؟" انسان نے جواب دیا۔ "یہی نہیں تو اور کیا؟"

خدا نے کہا — "خیر، تمہیں سب چیزیں تیار مل جایا کریں گی — کھانے کیلئے غذا، پینے کیلئے پانی اور پوجا کیلئے پھول۔"

خدا کے حکم سے انسان کو سب چیزیں تیار ملنے لگیں۔ کھانے کے لئے بھوجن، پینے کیلئے پانی اور پوجا کیلئے پھول۔ سب ٹھیک ٹھیک پہلے ہی کی طرح — لیکن اسکی شریک زندگی نہ واپس آئی — سب چیزیں بالکل ویسی ہی تھیں، جیسی پہلے تھیں لیکن ساز ہستی کا وہ پر کیف نغمہ نہ تھا جو اشنان اور کھانے پینے — اور پوجا — پوجا اور سونے کے درمیانی وقفوں میں اسکی روح کو سکون و مسرت کی گہرائیوں میں غرق کر دیتی تھی —

باہر کا کام ختم کر کے انسان تھکا ماندہ اپنے گھر واپس آیا — اسنے دیکھا سب چیزیں ٹھیک ٹھیک سجی سجائی رکھی ہیں — کھانے کیلئے بھوجن پینے کیلئے پانی اور پوجا کیلئے پھول — اسکے تن بدن میں آگ سی لگ گئی — کون چاہتا ہے تمہاری ان چیزوں کو؟ کون چاہتا ہے تمہارے اس مذاق کو؟ کون چاہتا ہے۔ کون چاہتا ہے۔ تمہاری اس ستم ظریفی کو —؟

خدا نے پوچھا "اب کیا معاملہ ہے —؟" اسنے جھلا کر جواب دیا۔ — "معاملہ کیا ہے؟ کون چاہتا ہے تمہاری ان چیزوں کو؟ لے جاؤ — ابھی لے جاؤ۔ اپنی ستم ظریفی کے ان لوازم کو — لیکن — لیکن میری اسکو واپس کر دو —"

خدا ہنسا۔ اسنے اسکی رفیقۂ حیات کو واپس کر دیا۔

انسان نے اسی دن اسکے پیروں سے آہنی زنجیر کھول کر اسکے ہاتھوں میں سونے کے کنگن پہنا دیئے — گلے میں موتیوں کا ہار ڈالدیا اور اسے سینہ سے لگا کر بولا — تم کنیز نہیں بلکہ میری زندگی میں برابر کی شریک اور مجھے اطمینان و مسرت کا پیام سنانے والی دیوی ہو۔"



طفل سرکش بنو اور ضد سے مچلنا سیکھو!

(از حضرت مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ)

مثل پروانہ، تم اک پل میں نہ جلنا سیکھو
تا سحر شمع کی مانند پگھلنا سیکھو!

دل کو کرنا ہے اگر سوز محبت میں کباب
کروٹیں آگ کے بستر پہ بدلنا سیکھو!

زندگی نام ہے حرکت کا، تم افسردہ نہ ہو
نبض کے خون کی مانند اچھلنا سیکھو!

عزم جو دل میں ہو، پورا اُسے تم کرکے رہو
طفل سرکش بنو اور ضد سے مچلنا سیکھو!

چشمۂ آب ہو تم سوتے ہو کیوں زیر زمیں
سنگ خارا کے شگافوں سے ابلنا سیکھو!

نہ ڈرو صدمۂ طوفان سے مانند نہنگ!
ورطۂ بحر کی آغوش میں پلنا سیکھو!

آنچ سے رنج و مصیبت کی نہ کچھ خوف کرو
موم کی طرح ہر اک سانچے میں ڈھلنا سیکھو!

ہے کٹھن منزل تسلیم تو پروا کیا ہے
سر کے بل دھار پہ تلوار کی چلنا سیکھو!

کلفت دہر سے کیوں ناک چڑھاتے ہو ابھی
اس مئے تلخ کے دو گھونٹ نگلنا سیکھو!

ہو کے پامال حوادث نہ ترقی سے رکھو!
ڈوب کی طرح سے دب دب کے نکلنا سیکھو!

"طاقت"

ہندوستان میں مزدوروں کی تحریک

حکومت ہند نے ہندوستان میں مزدوروں کی تحریک کی رفتار کی سالانہ رپورٹ بابتہ ۱۹۳۰-۳۱ء حال ہی میں شائع کی ہے۔ اس رپورٹ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان میں یہ تحریک ابھی اپنے عہد طفلی ہی میں ہے اور اس میں بتدریج جو ترقی پچھلے چند سال سے ہو رہی تھی اس میں

ڈاکٹر سعید احمد پرنٹر و پبلشر نے محبوب المطابع برقی پریس میں چھپوا کر کوچہ چیلان دہلی سے شائع کیا

سال گذشتہ کمی واقع ہوئی ہے اور اس کا قدم قدرے پیچھے پڑا ہے۔

یہ رپورٹ مظہر ہے کہ ہندوستان میں مزدور انجمنوں کی کل تعداد ۱۹۳۰-۳۱ء میں ایک سو انیس (۱۱۹) تھی اور ان کے ممبروں کی تعداد دو لاکھ ۱۵ ہزار ۵۰۱ تھی۔ سال ماقبل میں یونینوں کی تعداد ۱۰۴ تھی مگر ممبروں کی تعداد ۲۴۲۳۵۵ تھی۔ گویا سال زیر رپورٹ میں یونینوں کی تعداد میں اضافہ ہوا مگر ممبروں کی تعداد میں ۲۳ ہزار کی کمی واقع ہوئی مزدوروں کی تحریک بمقابلہ ملک کے اور صوبوں کے صوبہ بمبئی میں نسبتاً زیادہ ترقی کر چکی ہے چنانچہ سال زیر رپورٹ میں صوبہ بمبئی کی یونینوں کی تعداد ۹۵ تھی اور ان کے ممبروں کی کل تعداد ایک لاکھ ۲ ہزار ۵ سو ۵ تھی ان میں سے صرف ۴۰ یونین رجسٹرڈ شدہ ہیں۔ اور ان کے ممبروں کی تعداد ۶۵۴۹۵ ہے۔

ان اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ ابھی ہندوستان میں اس تحریک کا عہد طفلی ہے۔ ہندوستان میں مزدور پیشہ طبقے کی آبادی پانچ چھ کروڑ سے کسی طرح کم نہ ہوگی مگر مزدور انجمنوں کے ممبروں کی تعداد اتنے لاکھ بھی نہیں ہے یعنی ابھی کل مزدور آبادی کا ایک فیصدی بھی اس تنظیم میں شریک نہیں ہے۔

"اجمل"

دیسی مصنوعات

تمام ممالک صرف اپنے ملک کی چیزوں کی ترویج و ترقی میں مصروف ہیں ہندوستان میں بھی اکثریت اُن ہی افراد کی ہے جو اپنے ملک کی تمام چیزوں کی ترویج میں عموماً اور کپڑوں کی ترویج میں خصوصاً مصروف ہیں۔ لیکن مسلمانوں کا ایک بڑا گروہ ہے جس کی سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ دیسی مصنوعات سے اس کے ملک اور اس کی قوم کو کتنے فوائد حاصل ہو سکتے ہیں۔ حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ آج سے ڈیڑھ سو برس قبل صنعت پارچہ بافی کلیتاً مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی اور مسلمانوں کا تمول مصنوعات ہی کا رہین احسان تھا، کیونکہ تجارت و صنعت ہی تمول کا ذریعہ ہے لیکن ان کی صنعتوں کو ظلم و جور سے برباد کر کے ان کو مفلس و نادار کر دیا گیا اور وہ افلاس و ناداری کے غار عمیق میں گرتے چلے گئے تا آنکہ اس وقت ہندوستان میں اُن کا شمار مفلس ترین اقوام میں ہے۔ مگر اس کا احساس نہ اُس طبقہ کو ہے جو عرش تمول و عزت سے فرش افلاس و ذلت پر گر گیا، نہ اس کے دوسرے بھائیوں کو اس کا کچھ احساس ہے، ہندوستان کی دوسری قومیں جس حد تک ملکی مصنوعات کے لئے کوشاں ہیں، اگر اسی قدر مسلمان بھی کوشش شروع کر دیں تو یقیناً قومی حیثیت سے ان کی بیکاری اور افلاس کا ازالہ ہو جائے۔

صوبہ بہار میں اس وقت تقریباً دو ہزار مسلمان پارچہ باف چرخہ سنگھ کی ملازمت میں ہیں اور پہلے سے بہت زیادہ فارغ البالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اگرچہ انکی حیثیت مزدور کی ہے لیکن کم سے کم اسی مزدوری ہی کے سبب ان کو بیکاری سے تو نجات مل گئی ہے۔

"امارت"

ہندوستان کی "ترقی"

سو برس پہلے

جب میں مرہٹوں کے ملک میں داخل ہوا تو میں نے خیال کیا کہ میں سادگی اور مسرت کے زمانہ میں ہوں جہاں فطرت ابتک غیر مبدل تھی اور جنگ اور مصیبت سے کوئی آشنا نہ تھا۔ باشندے محوش قومی اور بہت زیادہ تندرست

تھے۔ مہمان نوازی کے جذبات عام تھے دوستوں ہمسائیوں اور اجنبیوں کے استقبال کیلئے نئے ہر چیز بطریق مساوات تیار تھی۔ (انکٹیل ڈیوپران ۱۸۰۸ء)

سو برس بعد

اگر کوئی شخص دن رات ملک کا دورہ کرے تو اس کو سوائے ان کمزور اور نحیف جسموں کے کچھ نہیں دکھائی دیگا جو سخت سے سخت مشکل سے مشکل اور دشوار سے دشوار مشقت کر رہے ہونگے۔ ہندوستان افلاس زدہ لوگوں کا گھر ہے اور میں یہ سمجھتا ہوں، کہ ہندوستان کے افلاس نے اعلیٰ ترین برکاتِ انسانی کی صورت اختیار کر لی ہے۔ (جے ارمیزے میکڈانلڈ)

(ہندوستان ٹائمز)

مرد اور عورت کا موازنہ

عورتیں بلاشبہ صنف نازک ہیں! لیکن آج کل انہوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں مردوں کی طرح، شرکت کا جو طریقہ اختیار کیا ہے اس سے، تو انہیں صنف نازک کہنا بالکل غلط ہو جاتا ہے! کیا گذشتہ جنگ عمومی میں انہوں نے حصہ نہیں لیا ؟ کیا حکومت کے کام میں وہ دخیل نہیں ہیں ؟ کیا کاروبار اور سینکڑوں دفاتر انہی کی محنت کے مرہون نہیں ہیں اور کیا مجالس قانون ساز اور پارلیمنٹوں میں آج ان کی لسانی قوت اور سیاسی تدبر مردوں سے کچھ کم ہے ؟

نزاکت کا سوال

اب رہا ان کی نزاکت کا سوال تو یورپ کے ڈاکٹر یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ وہ طاقت میں بھی مردوں کے ہم پلہ ہیں، انکی عمریں بھی مردوں سے کم نہیں ہوتیں۔ انگلستان میں اس دعویٰ کی تحقیقات کی گئی تو ایک ولایتی اخبار مظہر ہے کہ، صرف لندن کے ضلع کی اعداد و شمار سے پتہ چلا کہ عورتوں کی حیات مردوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ صرف لندن کے ضلع میں اٹھارہ عورتیں ایسی ہیں جنکی عمریں اسوقت سو برس سے زیادہ ہوگئی ہیں۔ انگلستان میں مردوں کے مقابلہ میں دوگنی تعداد ایسی عورتوں کی ہے جنکی عمر ۹۰ برس سے زیادہ ہے صحت عامہ کے چیف میڈیکل افسر کی رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر سال لڑکیوں کی پیدائش کا اوسط ....۱۱ اور لڑکوں کے پیدائش کا اوسط ۱۰۴۵ ہے۔

بمقابلہ مردوں کے عورتیں زیادہ قوی ہوتی ہیں

مسٹر لیم آربتھ نوٹ کا خیال ہے کہ عورتیں مردوں سے زیادہ قوی اور مضبوط ہوتی ہیں اور انہیں "صنف نازک" سے تعبیر کرنا سائنس کے خلاف ہے یہ ایک حقیقت ہے کہ عورتوں کی جسمانی طاقت مردوں کے برابر نہیں ہوتی اور وہ مردوں کی طرح ورزش نہیں کر سکتیں، لیکن ہر دوسری حالت کے اعتبار سے عورت مرد سے زیادہ مضبوط ہوتی ہے چونکہ عورت کو قدرت نے بچہ پیدا کرنے کے لئے بنایا ہے اس لئے اس کو طاقت اور توانائی سے بہت زیادہ بہرہ اندوز کیا ہے۔

زندگی کی طوالت۔ معمولی حالات میں طاقت اور توانائی بچہ پیدا کرنے کے عمل سے خراب نہیں ہوتی اسلئے توقع کیجا سکتی ہے کہ عورت مرد سے زیادہ مدت تک زندہ رہیگی۔ عورتوں کا لباس بھی ایسا ہے جس سے دھوپ اور ہوا اس کے جلد تک پہنچتی ہے خانہ داری کے انتظام میں اسے کافی ورزش کرنی پڑتی ہے جو دفتروں میں کام کرنے والے مرد کو نصیب بھی نہیں ہوتی۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ عورتوں کی غذا کی مقداراً مرد سے کم ہوتی ہے۔

وزیر اعظم کے اعلان کا دوسری تجاویز سے مقابلہ

آج جو کچھ وزیر اعظم کے اعلان میں ہے اس سے کہیں زیادہ ان مختلف فارمولوں اور قراردادوں میں موجود تھا جو مختلف قوموں کے درمیان ایک مصالحانہ فضا پیدا کرنے کی غرض سے بنائے گئے تھے۔ اس سے بدرجہا بہتر وہ قرارداد بھی جو قوم پرور مسلمانوں نے پیش کی تھی اس سے کہیں درجہ مفید وہ فارمولا تھا جو جمعیۃ العلماء ہند کی جانب سے مختلف طبقوں کے سامنے بغرض منظوری رکھا گیا تھا اور اس سے تو یقیناً زیادہ اطمینان بخش وہ حل تھا جو خالص فرقہ وارانہ مسائل کے متعلق آل پارٹیز کانفرنس کی رپورٹ میں مندرج تھا ہم قارئین کرام کی آسانی کے لئے ذیل کا نقشہ پیش کرتے ہیں جس میں حکومت کے فیصلہ کا مقابلہ آل پارٹیز کانفرنس کی تجاویز، مسلم نیشنلسٹ پارٹی کی قرارداد اور جمعیۃ علماء ہند کے فارمولے سے کیا گیا ہے اور جس سے صاف ظاہر ہوجاتا ہے کہ ہر اعتبار سے یہ فیصلہ دوسرے تمام فیصلوں سے ناقص اور مسلمانوں کیلئے سم قاتل ہے۔

عنوانات	حکومت برطانیہ کا فیصلہ	آل پارٹیز کانفرنس کی رپورٹ	قوم پرور مسلم کانفرنس کی قرارداد	جمعیۃ علمائے ہند کا فارمولا
مذہبی معاشرتی اور لسانی تحفظات	×	حکومت کی جانب سے مذہب، معاشرت، اور زبان میں عدم مداخلت کا وعدہ	تہذیب، تمدن، مذہب، زبان، رسم الخط، تعلیم، اوقاف، اقتصادی مفاد اور پرسنل لاء و شخصی قوانین کا تحفظ۔	تہذیب، تمدن، مذہب، زبان، رسم الخط، تعلیم، اوقاف، اقتصادی مفاد اور پرسنل لاء کا تحفظ تمام تصریحات کے ساتھ المحکمۃ القضاء کا قیام
صوبوں کی خود مختاری	×	ایک خاص حد تک خود مختاری	مکمل خود مختاری اور اختیارات مابقی صوبوں کیلئے مخصوص	مکمل خود مختاری اور اختیارات مابقی صوبوں کے لئے مخصوص
صوبوں کی مساوات	×	کامل مساوات کا اعتراف جس میں صوبہ سرحد صوبہ بلوچستان و صوبہ سندھ شامل ہیں	کامل مساوات بشمول صوبہ سرحد، بلوچستان و سندھ	کامل مساوات بشمول صوبہ سرحد، بلوچستان و سندھ
صوبہ سرحد کا معاملہ	۱۔ دوسرے صوبوں کیساتھ مساوات پر سکوت۔ ۲۔ غیر مسلم اقلیتوں کو تین گنی نیابت جسکی وجہ سے مسلمانوں کا تناسب کم ہوگیا	۱۔ دوسرے صوبوں کیساتھ مساوات ۲۔ غیر مسلم اقلیتوں کیلئے صرف تناسب آبادی سے نشستوں کی تخصیص	۱۔ دوسرے صوبوں کیساتھ مساوات۔ ۲۔ غیر مسلم اقلیتوں کیلئے صرف تناسب آبادی سے تخصیص اور اگر وہ زائد طلب کریں تو مسلم اقلیتوں کو بھی پاسنگ کا حق	۱۔ دوسرے صوبوں کیساتھ مساوات۔ ۲۔ غیر مسلم اقلیتوں کیلئے صرف تناسب آبادی سے تخصیص اور اگر وہ زائد طلب کریں تو مسلم اقلیتوں کو بھی پاسنگ کا حق۔
صوبہ بلوچستان کا معاملہ	اصلاحات سے محرومی	مکمل اختیارات و اصلاحات جو دوسرے صوبوں کو دیجائیں	مکمل اختیارات و اصلاحات جو دوسرے صوبوں کو دی جائیں	مکمل اختیارات و اصلاحات جو دوسرے صوبوں کو دی جائیں۔
صوبہ سندھ کا معاملہ	علیحدگی اعلان سے گریز	مسلمانوں کی خواہش پر بہرصورت علیحدگی کا اعلان اور مساوی درجہ	صوبہ بمبئی سے علیحدگی کا قطع فیصلہ اور مساوی درجہ	صوبہ بمبئی سے علیحدگی کا قطع فیصلہ اور مساوی درجہ۔

عنوانات	حکومت برطانیہ کا فیصلہ	آل پارٹیز کانفرنس کی رپورٹ	قوم پرور مسلم کانفرنس کی قرارداد	جمعیۃ علمائے ہند کا فارمولا
مرکز میں نیابت	×	تناسب آبادی کے اعتبار سے نشستوں کی تخصیص اور مزید نشستیں حاصل کرنیکا استحقاق	$\frac{1}{3}$ نیابت	
وزارتوں میں نیابت	×	×	مسلم مفاد کا رواج کے ذریعہ تحفظ	مسلم مفاد کا رواج کے ذریعہ تحفظ
ملازمتوں میں حصہ	×	×	۱۔ کم سے کم معیار قابلیت ۲۔ جائز حصہ کا تحفظ	۱۔ کم سے کم معیار قابلیت ۲۔ جائز حصہ کا تحفظ
سپریم کورٹ کا قیام	×	سپریم کورٹ کے قیام کی سفارش	×	سپریم کورٹ کا قیام جو اقلیتوں اور صوبوں کے درمیان فیصلہ کا کامل اختیار رکھتا ہو
طریق انتخاب	جداگانہ انتخاب سوائے صوبہ سرحد کے ہر صوبہ میں آئینی اقلیت کے قیام کے ساتھ	مخلوط انتخاب (حق رائے دہی بالغان کیساتھ)	مخلوط انتخاب (حق رائے دہی بالغان کے ساتھ)	مخلوط انتخاب (حق رائے دہی بالغان کے ساتھ)
مسلم اقلیتوں کے صوبوں کا مسئلہ	میثاق لکھنؤ سے بھی کم پاسنگ کے ساتھ نشستوں کی تخصیص	تناسب آبادی کے حساب سے نشستوں کی تخصیص اور زائد نشستیں حاصل کرنیکا حق	تناسب آبادی کے حساب سے نشستوں کی تخصیص اور زائد نشستیں حاصل کرنیکا حق اور اگر دوسری اقلیتیں پاسنگ مانگیں تو پاسنگ	تناسب آبادی کے حساب سے نشستوں کی تخصیص اور زائد نشستیں حاصل کرنیکا حق اور اگر دوسری اقلیتیں پاسنگ مانگیں تو پاسنگ
حکومت ترکیبیہ لامرکزیہ کا مسئلہ	×	حکومت مرکزیہ احدانیہ	حکومت ترکیبیہ لامرکزیہ کا قیام	حکومت ترکیبیہ لامرکزیہ کا قیام
حق رائے دہی کا مسئلہ	×	حق رائے دہی بالغان یعنی مسلم رائے دہندگان کا تناسب مسلم آبادی کے مساوی	حق رائے دہی بالغان یا کم سے کم رائے دہندگان کا تناسب آبادی کے مطابق	حق رائے دہی بالغان یا کم سے کم رائے دہندگان کا تناسب آبادی کے مطابق
صوبہ پنجاب کا معاملہ	جداگانہ انتخاب کے ساتھ صرف ۴۹ فیصدی نشستوں کی تخصیص اور مخلوط انتخاب سے ملا کر زائد کو زائد ۵۰ فیصدی نیابت	مخلوط انتخاب و حق رائے دہی بالغان کے ساتھ ۵۶ فیصدی سے زائد نشستیں حاصل کر لینے کا حق۔	مخلوط انتخاب و حق رائے دہی بالغان کے ساتھ ۵۶ فیصدی سے زائد نشستیں حاصل کر لینے کا حق۔	مخلوط انتخاب و حق رائے دہی بالغان کے ساتھ ۵۶ فیصدی سے زائد نشستیں حاصل کر لینے کا حق
صوبہ بنگال کا معاملہ	جداگانہ انتخاب کے ساتھ صرف ۴۸ فیصدی نشستوں کی تخصیص اور مخلوط انتخاب سے ملا کر بھی اقلیت کا قیام	مخلوط انتخاب و حق رائے دہی بالغان کے ساتھ ۵۴ فیصدی سے زائد نشستیں حاصل کر لینے کا حق	مخلوط انتخاب و حق رائے دہی بالغان کے ساتھ ۵۴ فیصدی سے زائد نشستیں حاصل کر لینے کا حق	مخلوط انتخاب و حق رائے دہی بالغان کے ساتھ ۵۴ فیصدی سے زائد نشستیں حاصل کر لینے کا حق

"از الجمعیۃ"

ایام ضعیفی

(جناب بزم آفندی اکبر آبادی)

کم عقل ہیں پیری سے جو ثمر ملتے ہیں
یہ مفت کے رتبے کہیں ہاتھ آتے ہیں

اے بزم یہ شیب کی کرامت دیکھو
گو پیر نہیں ہیں پیر کہلاتے ہیں

پیری مرشد کی شان سے آتی ہے
ارکان نماز جب تو سمجھاتی ہے

دیتی ہے عبادت خدا کی تعلیم
لیکن پہلے رکوع سکھلاتی ہے

محشر میں رہیں اہل وفا کے آگے
بے وقر ہوں کیوں شاہ و گدا کے آگے

پیری نے کئے ہیں اسلئے بال سفید
جائیں نہ سیاہ رو خدا کے آگے

اس سن ہی میں آبرو بشر پاتا ہے
چہرہ براق سب کا ہو جاتا ہے

اے بزم سپید بال کب ہوتے ہیں
ملنے پیری سے نور حق آتا ہے

اک وقت بھی عیش سے گذرنے نہ دیا
رخصت بھی گلے لگا کے کرنے نہ دیا

یہ ضعف میں زور اس کی قدرت دیکھو
پیری نے جوانی کو ٹھہرنے نہ دیا

جو غم ہے بہار زیست لٹ جانے کا
کیونکر کہوں دل نہیں ہے دکھلانے کا

سر شیب میں بے وجہ نہیں ہلتا ہے
کہتا ہے شباب اب نہیں آنے کا

بزم سعید

عمر کا دوسرا سال

"سعید" اگست ۱۹۳۱ء میں عالم وجود میں قدم رکھا تھا اور اس حساب سے اگست ۱۹۳۲ء سے اسکی عمر کا دوسرا سال شروع ہوتا ہے۔ یہ پرچہ دوسرے سال کا پہلا پرچہ ہے۔ اور اگر اردو رسائل کے عام رسم و رواج کو مدنظر رکھا جائے۔ تو اسے "سعید" کا سالگرہ نمبر ہونا چاہئے تھا جسمیں کم سے کم تین یا چار سہ رنگی تصویریں ایک دو حضرت چغتائی کے یک رنگ شاہکار اور بہت سی بے رنگ یا یک رنگ تصاویر شامل ہوتیں نصف کے قریب مضامین "سعید" اور "سعید" کے ایڈیٹر کی تعریف پر مشتمل ہوتے اور بقیہ نصف میں سے اکثر میں ایڈیٹر کی تعلیاں ارباب زمانہ کی ناقدر شناسیوں کی داستان عوام میں مذاق سلیم کے فقدان کا دردانگیز تذکرہ اور کچھ کتابت وطباعت کی گوناگوں مشکلات کے افسانہ ہائے رقت آمیز بھرے ہوتے اور پھر اس خاص یا سالگرہ نمبر کی قیمت کم سے کم بارہ آنہ ورنہ ایک روپیہ فی پرچہ مقرر کیجاتی۔ ملک کے تمام بڑے بڑے اخباروں اور رسالوں میں اس شاندار ادبی شاہکار کے اشتہار دیئے جاتے تقریباً ہر ہمعصر اسکے متعلق اپنے پرچہ میں ریویو لکھتا اور اس طرح تمام دنیائے ادب میں سعید کے سالگرہ نمبر کی دھوم مچ جاتی۔

غریب اور خستہ حال سعید اپنی خوش قسمتی یا بدقسمتی سے اس نعمت عظمیٰ سے محروم رہا۔ اسلئے نہیں کہ اسے کپڑے کے تھانوں پر سے چھڑائی ہوئی یا انگریزی کے رسالوں سے اڑائی ہوئی دو چار برہنہ اور نیم برہنہ تصویریں میسر آسکتی تھیں یا مغل آرٹ کے نام سے پانچ انچ لمبی ناک اور پورے ساڑھے تین فٹ لمبے ہاتھ والی تصویریں جن کی آنکھوں کی بجائے ایک بہت بڑا بادام رکھا ہوا ہو کھینچکر دینے والا کوئی مصور دلی میں نہ مل سکتا تھا بلکہ اسلئے اور صرف اسلئے کہ اسے مغربی نمود و نمایش کے یہ طریقے نہ کبھی پہلے پسند تھے اور نہ اب ہیں۔ سعید تجارتی اغراض کی بناء پر نہیں نکالا گیا ہے اسلئے اس قسم کے تجارتی پروپیگنڈوں سے اپنے دامن کو تاحد امکان پاک رکھنا چاہتا ہے۔ انداز بتا رہے ہیں کہ غالباً اسے اپنی ترقی اشاعت کے لئے اس قسم کے وسیلے اور ذریعہ استعمال کرنے کی ضرورت بھی نہ ہوگی کیونکہ اسکے خریداروں میں ایک بڑی تعداد ایسے ہی اصحاب کی ہے کہ جو ادبی ہنگامہ خیزیوں کے بجائے مستقل اور ٹھوس علمی خدمت کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔

گذشتہ دو پرچوں میں سعید نے استدعا کی تھی کہ جو اصحاب شروع سے اسکے خریدار ہیں انکا چونکہ سال ختم ہو چکا اسلئے سال آیندہ کے لئے وہ چندہ منی آرڈر کے ذریعہ بھیج دیں اور ہمیں یہ دیکھکر بڑی مسرت ہوئی کہ انہیں سے اکثر اصحاب نے ہماری اس درخواست پر توجہ فرمائی۔

آج کل ہمارے مینجر صاحب بفضلہ تعالیٰ مسرور و خنداں اور شادان و فرحاں اپنی مسند نظامت پر بیٹھے ہوئے نہایت ہوسناک نگاہوں کے ساتھ ڈاک کا انتظار فرمایا کرتے ہیں اور اگر اتفاق سے کوئی شخص پیلے کپڑے پہنے ہوئے گذر جائے تو آپ ان کپڑوں کو خاکی وردی سمجھکر اسے ڈاکیہ فرض کر لیتے ہیں

بصد شوق اسکی آمد کے منتظر ہو جاتے ہیں ایک دو مرتبہ اس قسم کی مایوسی کے بعد بالآخر بہت و سرور کا وہ پیغام برنکل ہی آہی جاتا ہے اور اس کا چرمی بیگ کھلنے کے ساتھ ساتھ مینیجر صاحب کی باچھیں کھل جاتی ہیں۔ مصنوعی استغنا کی شان سے پاتوں کی ڈبیہ کھولی جاتی ہے بڑی احتیاط کے ساتھ آہستہ سے پان نکالکر منہ میں رکھا جاتا ہے اور پھر بہزاران نخوت و تکبر ارشاد ہوتا ہے "آج پھر یہ مصیبت لے ہی آئے لانیے کتنے منی آرڈر ہیں؟" روزانہ پانچ چھ منی آرڈر فارموں پر مجھ سے دستخط کراتے ہیں اور ہر روز فخر آمیز تبسم کے ساتھ مجھے یہ یاد دلایا جاتا ہے کہ خریداروں سے منی آرڈر بھیجنے کی درخواست کرنے کی تجویز مینیجر صاحب ہی کے نفقہ دماغ کی پیش کردہ تھی جس میں اسقدر کامیابی ہوئی اور دفتر ایک بہت بڑے غیر ضروری اور تکلیف دہ تحریری کام کے بارے بچ گیا اب لطف یہ ہے کہ دفتر نام ہو آپ ہی کی ذات مجمع الصفات کا گویا دفتر کو کام سے جسقدر سبکدوشی حاصل ہو رہی ہے اسکے معنی صرف یہ ہیں کہ ڈاکیہ سے روپیہ وصول کر لینے کے بعد مینیجر صاحب باطمینان تمام اپنی اسی مسند پر پاؤں پھیلا کر سو جاتے ہیں اور کہیں کہیں گھنٹوں کی خبر لاتے ہیں۔

بہر حال ہمارا بھی اسمیں کیا حرج ہے اس طرح مفت کرم داشتن کے طریقے پر مینیجر صاحب اگر اپنی عمر عزیز کے چند گھنٹے روزانہ خواب راحت ہی میں گنوانا پسند کرتے ہیں تو کریں اور آپ کا بھی اسمیں کچھ نقصان نہیں بلکہ فائدہ ہی ہے پھر خواہ مخواہ آپ بھی کیوں ہاتھ روک کر انکے مزاج کی اس ناخوشگوار کیفیت کا مقابلہ کریں کہ جو نیند بھری آنکھوں کو مل مل کر کھولنے کے بعد وی پی کے فارموں پر آپ کا نام اور پتہ "گھسیٹنے" کی صورت میں پیدا ہوتی لازمی ہے جن تھوڑے سے صاحبوں نے اس وقت تک اپنا چندہ ارسال نہیں فرمایا ہے ہم اگست کا پرچہ انکے نام وی پی کے ذریعہ سے نہیں بلکہ معمولی طریقے پر روانہ کر رہے ہیں اور ہمیں کیا خود مینیجر صاحب کو بھی امید ہے کہ باقی ماندہ اصحاب بھی جلد سے جلد اپنا چندہ ارسال فرما دینگے اور دفتر کو جسکے پورے معنی آپکو معلوم ہیں ایک بھی وی پی بھیجنے کی دقت نہ اٹھانی پڑیگی۔

اگلے سال کا سعید

سعید کے مستقبل کے متعلق میرے بعض احباب نے مجھ سے بہت سی باتیں دریافت فرمائی ہیں بعض مخلصوں اور ہمدردوں نے اپنی طرف سے کچھ تجاویز پیش کی ہیں۔ اور بعض مخلصوں نے اس اندیشہ سے کہ مبادا سعید بند ہو جائے مجھ سے سعید کی مالی حالت دریافت کرنے کے ضمن میں کچھ اس قسم کے اشارات بھی کئے ہیں کہ اگر ضرورت ہو تو وہ مالی امداد و اعانت پر بھی کمربستہ ہیں ان سب کرم فرماؤں کے خلوص و ہمدردی کا دلی شکریہ ادا کرنے کے بعد میں سعید کے مستقبل کے متعلق صرف اسقدر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ بفضلہ تعالیٰ فی الحال اسکے بند ہو جانے کا کوئی امکان اگر ہو تو یہی کہ خود سعید نہ رہے "سعید" کی مالی حالت جو بہ الفاظ دیگر میری اپنی مالی حالت ہے ایسی سقیم تو نہیں ہے کہ میں اپنے احباب کے آگے دست سوال پھیلاؤں لیکن یہ بھی ضرور ہے کہ اتنی اچھی بھی نہیں ہے کہ میں مدتوں تک ایک گراں قدر رقم ہر مہینے اسکی نذر کرتا رہوں جیسے کہ اب تک کرتا رہا ہوں۔ یہ کرم فرما یعنی "سعید" کے قدر دان اسکی مالی اعانت و امداد کر سکتے ہیں لیکن اس طرح نہیں کہ وہ خیرات کے طور پر کوئی رقم مجھے بھیج دیں بلکہ اس طرح کہ اپنے اثر سے کام لیکر دو دو چار چار خریدار "سعید" کیلئے مہیا کر دیں یا اپنے پاس سے چندہ ادا کر کے ایک ایک یا دو دو مستحق نوجوانوں کے نام پرچہ جاری کرا دیں۔ اس طرح نہ صرف یہ کہ "سعید" کی مالی حالت بہتر ہو جائیگی بلکہ یہ بھی ہو گا کہ وہ بہت سے ایسے ہاتھوں میں پہنچ جائیگا جہاں اسے پڑھنے کا شوق تو موجود تھا لیکن افلاس اور ناداری کی وجہ سے وہ اسے خرید نہ سکتے تھے۔

"سعید" کے متعلق میرے ذہن میں بہت سی تجویزیں ہیں، اور اگر میری طویل علالت نے تمام نظام درہم و برہم نہ کر دیا ہوتا تو ان میں سے بعض اب تک عمل جامہ پہن چکی ہوتیں۔ لیکن اسکی ترقی کے متعلق کچھ نہ کر سکنے کے باوجود میں نے بہت کچھ کیا ہے اور مجھے امید ہے کہ اب بہت جلد میری کوششوں کے نتیجے آپکے سامنے آجائیں گے۔

جن بزرگوں نے بعض نہایت مفید اور اہم تجاویز ارسال فرمائی ہیں میں سب سے زیادہ انہی کا ممنون ہوں۔ فی الحقیقت میں یہی چاہتا ہوں کہ "سعید" کا ہر خریدار اسے اپنا خاص پرچہ سمجھ کر اس میں جو نقص یا عیب ہیں ان سے مجھے آگاہ کرتا رہے اور اسکی بہتری اور فلاح کی جو صورتیں اسکی سمجھ میں آئیں مجھے بتاتا رہے۔ میں جیسا کہ پیشتر بھی عرض کر چکا ہوں اس پرچہ کے متعلق سب کچھ تن تنہا کر رہا ہوں اور یہی کیا ساتھ نہیں بلکہ اس سے مقدم اور زیادہ ضروری میری مطب کی مصروفیتیں ہیں کہ جو میرا ذریعہ معاش ہیں۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ بہت سی ایسی باتوں کا گذر میرے دماغ میں نہیں ہو سکتا۔ اور نہیں ہوتا کہ جنکے لئے اس سے زیادہ فرصت اور فارغ البالی کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں خوش ہوں کہ لوگوں نے "سعید" ...

... اور دلچسپی لینی شروع کر دی، اور اگر اسی طرح ہر طرف سے اعتراضات کی بھرمار اور تجاویز کی بوچھار ہونے لگی تو میں سمجھ لونگا کہ میری محنت ٹھکانے لگی

جلد ۲ | باتصویر | ستمبر
نمبر ۹ | ماہوار رسالہ | سنہ ۱۹۳۲ء

سعید دہلی

ایڈیٹر
سعید احمد
بریلوی

قیمت
سالانہ تین روپے سے
ششماہی ۰۰۰۰ عہ
فی پرچہ چار آنہ ۰۰۰۰ ۴ر

فہرست مضامین

ہمارے خیالات

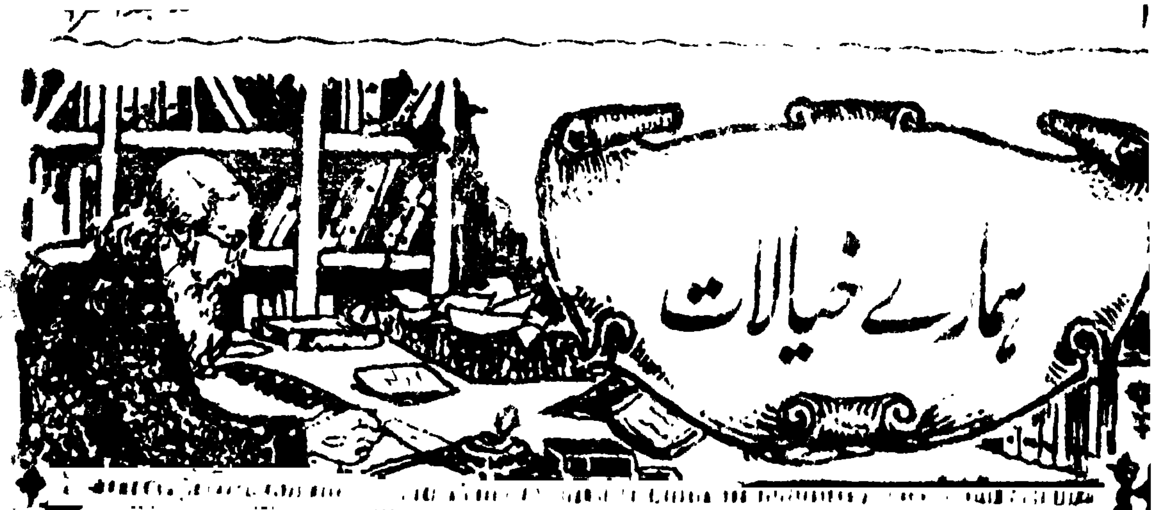
رازحیات

افسانہ

علم وادب

مذہب و اخلاق

عورتوں کے چار صفحے



ہماری مختصر حکومتیں

ہندوستان کے ہر شہر میں میونسپل بورڈ اور میونسپل کمیٹیاں قایم ہیں۔ اور جیسا کہ ہر شخص کو معلوم ہے انکے سپرد یہ کام ہے کہ وہ اہل شہر کے آرام و آسایش کا بندوبست کریں، اور اپنی خوش انتظامی اور سلیقہ مندی سے اس روپئے کو کہ جو مختلف ٹیکسوں کے نام سے اہل شہر سے وصول کیا جاتا ہے ایسے کاموں میں صرف کریں کہ جنکے ذریعہ سے شہر والوں کو اپنی زندگی گذارنے میں آسانیاں مہیا ہو جائیں وہ بہتر انسان بن سکیں اور انکی تندرستی زیادہ سے زیادہ اچھی حالت میں رہ سکے۔

ہر تیسرے سال شہر کا غریب مزدور بھی یہ تماشہ دیکھا کرتا ہے کہ اس کے محلے کے بڑے بڑے رئیس او معززین کہ جو کبھی معمولی حالات میں اسکا سلام بھی اگر قبول فرما لیتے تھے تو اس طرح کہ گویا اسکی گردن پر بڑا بھاری احسان کر رہے ہیں، اب صبح و شام دونوں وقت اسکے دروازے پر کھڑے ہیں، اور اپنی زبانی ہمدردیوں کی داستانیں اور اپنی غریب نوازیوں کے فرضی قصے سنا سنا کر اس کا دماغ چاٹے جا رہے ہیں۔ روزمرہ اسکی بیوی اور بچوں کی خیریت بھی دریافت کیجاتی ہے، اسکی مزدوری یا اسکے کاروبار کے حالات میں بھی دلچسپی لیجاتی ہے، اور ایک آدھ مرتبہ اس حد تک بھی اسکی عزت افزائی ہوتی ہے کہ میر محلہ یا رئیس اعظم صاحب اپنے دولتکدہ پر بلا کر اسے چاء پلا دیں۔ یہ تمام خاطر و تواضع، اور یہ ساری عزت افزائیاں صرف اسلئے ہوتی ہیں کہ جب میونسپل بورڈ کی ممبری کیلئے انتخابات کا وقت آئے تو وہ غریب دو ان رئیس اعظم صاحب کو فراموش نہ کردے اور اپنی طرف سے انہی کے حق میں رائے دے۔ اس طرح خوشامد تعلقات کے اثر اور روپے کی بارش اور ناجائز دباؤ غرضکہ ہر جائز و ناجائز ذریعہ استعمال کرکے جب یہ امیدوار صاحب اہل محلہ میں سے ایک بڑی تعداد کی رائیں اپنی موافقت میں حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو انہیں وہ کرسی میسر آتی ہے کہ جسپر بیٹھنے کی تمنا نے ان کے دل کو بے چین کر رکھا تھا، اور انکے نام کے آگے "میونسپل کمشنر" کا طرہ امتیاز لگ جاتا ہے، شہر کے ایک معزز رئیس ہونے کے علاوہ اب انہیں یہ عزت بھی حاصل ہو جاتی ہے کہ شہر کا انتظام بھی انکے سپرد ہو، اور انکی عقل، انکا علم، اور انکا تجربہ شہر اور اہل شہر کے حالات کو بہتر بنانے کے کام آئے۔ امیر

اور دولتمند باشندے ان سے امیدیں لگاتے ہیں کہ وہ شہر کی سڑکوں اور گذرگاہوں کو زیادہ آرام دہ بنا دیں گے تاکہ انکی موٹروں کے ٹائر جلدی جلدی نہ خراب ہوا کریں، اور ناہموار سڑکوں کے دھچکوں اور جھٹکوں سے وہ جسم محفوظ رہ سکیں جنہیں مرغن غذاؤں نے چربی کی گٹھری بنا دیا ہے اور بیچارے غریب ان سے یہ توقعات قایم کرتے ہیں کہ وہ غور و فکر کرکے کچھ ایسی تدبیریں ایجاد کرینگے کہ انہیں سستی قیمت پر بہتر غذا اور انکے بچوں کو بلا قیمت معقول تعلیم میسر آسکے۔

اہل شہر کے یہ نمایندے جنہیں بالکل صحیح طور پر اہل شہر کا دماغ کہا جاسکتا ہے جب اپنی خفیہ اور مشتہرہ کوششوں کی بدولت ممبری کی کرسی، حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو سب سے پہلے تو وہ ان غریبوں کو یک قلم فراموش کر دیتے ہیں کہ جنہوں نے انہیں اپنا نمایندہ بنا کر بھیجا ہے، اور انہیں وہ تنگ و تاریک راستے اور گلیاں یاد تک نہیں رہتیں کہ کل پرسوں تک جنکی زمین ناپتے انہیں صبح سے شام ہوجایا کرتی تھی، اور اسکے بعد انہیں اپنے وہ وعدے یاد آتے ہیں کہ جو ممبر بنجانے کی صورت میں انہوں نے اپنے حلقہ کے امرا سے کئے تھے۔ ہر ممبر اپنے اپنے حلقہ کی ایسی گلیوں کی ایک فہرست مرتب کرتا ہے کہ جن میں کسی دولتمند اور صاحب اثر رائے دہندہ کا مکان واقع ہو اور جو پچھلے ممبروں کی "غفلت شعاری" کی وجہ سے ابھی تک پختہ سڑک میں تبدیل نہیں ہو سکی ہیں یا جہاں میونسپلٹی کی تیرگی افروز لالٹین کی اندھی روشنی ابھی تک نہیں پہونچ سکی ہے۔ چونکہ تقریبًا ہر ممبر کی جیب میں ایک ایک ایسی فہرست موجود ہوتی ہے اسلئے شہر کی دس یا پندرہ گلیوں کو پختہ کرانا، اور ان میں میونسپلٹی کی لالٹینیں نصب کرانا ان تمام خدایان شہر کا مشترک مقصد بنجاتا ہے، اور بالعموم اسی مقصد کے پورا کرنے میں انکی سہ سالہ عمر اختتام کو پہونچ جاتی ہے شہر کے غریب مزدور یا صنعت پیشہ لوگ اگر کبھی اپنی کوئی شکایت یا درخواست لیکر انکے در دولت پر پہونچتے ہیں تو اکثر و بیشتر انہیں اگر وہ مسلمان ہیں تو یہ کہکر ٹالدیا جاتا ہے کہ بھائی ہم کیا کریں ہم تو تمہارے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہیں اور رات دن اسی فکر میں لگے رہتے ہیں لیکن ہندو ممبروں کے سامنے ہماری کچھ نہیں چلتی اور وہ سب کے سب ہر ایسے موقع پر ایک ہو جاتے ہیں کہ جب ہم کسی مسلمان کیلئے کچھ کرنا چاہیں اور ہمارے خلاف رائے دیتے ہیں اور اگر سائل ہندو ہے تو اسے مسلمان ممبروں کے ظلم اور زیادتی کی دو چار داستانیں سنادی جاتی ہیں اور اپنا پیچھا چھڑالیا جاتا ہے اس طرح ہندو مسلم مناقشوں کی یاد رائے دہندوں کے دلوں میں تازہ رکھنے سے ایک بہت ہی بڑا فائدہ یہ بھی پہونچتا ہے کہ عوام کو ہر وقت یہ محسوس ہوتا رہتا ہے کہ ہمارے مفاد اور ہمارے حقوق سخت خطرے میں ہیں، اور اگر کوئی شخص انکی حفاظت کرسکتا ہے تو وہ یہی رائے صاحب یا یہی خاں صاحب ہیں گویا اس طرح اگلے انتخابات کے لئے کرسی بھی محفوظ ہو جاتی ہے۔

ہمارے بھولے بھالے اور تعلیم نایافتہ عوام کو ابھی تک یہی معلوم نہیں ہے کہ ان خدایان شہر کے کہ جنہیں ہم میونسپلٹیوں میں اپنا نمایندہ بنا کر بھیجتے ہیں فرائض کیا ہیں۔ مدتہائے دراز کی کوششوں نے اب انکے ذہن میں یہ بات پختہ کر دی ہے کہ میونسپلٹی کے ممبروں کا صرف یہی ایک کام ہے کہ کہ اگر وہ مسلمان ہیں تو ہندوؤں کی ہر تجویز کی، اور اگر ہندو ہیں تو مسلمانوں کی ہر تحریک کی مخالفت کریں اور انہیں مسترد کرانے میں ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگا دیں۔ میونسپلٹی کی ممبری کے سہ سالہ دور بار بار آتے ہیں اور اسی طرح گذرتے چلے جاتے ہیں کہ شہر میں

گو بہت سی تبدیلیاں ہو جائیں لیکن اہل شہر کی حالت میں کوئی قابل ذکر تبدیلی نہو۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا فی الحقیقت ہماری میونسپلٹیوں کے فرائض ہی حد تک محدود ہیں کہ شہر کی سڑکوں کو درست حالت میں رکھیں انکی گلیوں میں ہر سال چند لالٹینوں کا اضافہ کرا دیا کریں اور فرقہ وارانہ منافرت کی آگ کو تا حد امکان بھڑکاتے رہیں شہر کے چپہ چپہ کو روشن و منور کر دینا، ہر گلی اور ہر کوچہ کو پختہ کرا دینا بڑی بڑی سڑکوں کو عمدہ اور درست حالت میں رکھنا اور ہر شاہراہ پر بجلی کے قمقمے آویزاں کرا دینا یقیناً اچھی چیزیں ہیں اور ہر میونسپلٹی کا فرض ہے کہ انکی طرف توجہ کرے لیکن جہاں تک ہمارا خیال ہے اہل شہر کی ضرورتیں ان تمام چیزوں پر مقدم ہیں کسی سڑک کے ایک حصہ پر اگر بجلی کے سو قمقمے لٹک رہے ہیں اور رات بقعہ نور بنی ہوئی ہے تو اس میں شک نہیں کہ وہ ہماری نگاہوں کو بہت ہی خوشنما اور خوبصورت نظر آئیگی لیکن ہماری زندگی کی ضروریات اس سے رفع نہیں ہو سکتیں اور ہم تھوڑی بجائے بجلی کے اس قمقموں سے بھی بخوبی کام چلا سکتے تھے۔ بجری اور کولتار کی سڑکیں بلاشبہ بہت ہی صاف ہموار، اور نظر فریب ہوا کرتی ہیں، لیکن اگر اس خرچ سے زیادہ ضروری کوئی اور خرچ موجود ہے تو ہمیں کنکر کی سڑکوں پر قناعت کرنے میں تامل نہ ہونا چاہیے۔ کچے اور تاریک راستے یقیناً بری اور بدنما چیزیں ہیں، لیکن ایک ایسے ملک میں کہ جسکی آدھی سے زیادہ آبادی فاقے کرنے پر مجبور ہو، جسکے فرزندوں میں تعلیم حاصل کرنے والوں کا اوسط بمشکل چھ سات فیصدی ہو، اور آئے دن کی وباؤں اور بیماریوں کی وجہ سے جسکے باشندوں کی عمر کا اوسط صرف تئیس سال ہو کیا کسی طرح بھی یہ جائز اور مناسب ہو سکتا ہے کہ اسکی قلیل آمدنی، سب کی سب یا بیشتر حصہ شہر کی آرائشگیوں پر صرف کر دیا جائے اور اہل شہر اسی طرح فقر و فاقہ میں مبتلا رہیں؟

سڑکوں، اور لالٹینوں، اور گیسوں اور بجلیوں سے بدرجہا زیادہ ضروری کیا یہ نہیں ہے کہ ہم کچھ صورتیں ایسی نکالیں کہ شہر کے غریب باشندوں کے پیٹ کو دو روٹیاں، مریضوں کو دوا کے چند قطرے، بچوں کو ابتدائی تعلیم، اور ہر شخص کو صاف ستھری اور قابل اعتبار غذا میسر آسکے؟ اگر ہر سڑک، ہر گلی، ہر دوکان، ہر مکان، ہر مسجد، اور ہر مندر کے سامنے بھیک مانگنے والوں کے غول کے غول نظر آتے ہیں اور ہمارے ہی بھائی ہیں جیسے انسان بجائے بیکار ایک ایک شخص کے آگے دست سوال پھیلایا کرتے ہیں تو کیا اس میں ان خدایان شہر کے لئے کوئی وجہ شرم نہیں ہے؟ اگر ہزاروں کی تعداد میں انسانی بچے ناکافی غذا، یا کمیابی دوا کی وجہ سے پھڑک پھڑک کر روزمرہ اپنی جانیں جان آفرین کے سپرد کیا کرتے ہیں اور بن کھلی کلیوں کی طرح مرجھا جاتے ہیں تو کیا اس سے منتظمین شہر کے انتظام پر کوئی دھبا نہیں آتا؟ اور کیا اگر ہر گلی کوچے اور ہر بازار میں ہزارہا کی تعداد میں آوارہ اور بداطوار بچے دن بھر خاک اڑاتے اور ڈنڈے بجاتے پھرا کرتے ہیں تو اسکے لئے میونسپلٹی قابل الزام نہیں ہے صرف اسلئے کہ اسنے سڑکوں پر بجلی کی روشنی سے رات کو بھی دن بنا دیا ہے تاکہ ان ننگ انسانیت بچوں کو رات کی تاریکی بھی انکے ذلیل اور قابل نفرت مشاغل سے باز نہ رکھ سکے؟

ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ ہندوستان بھر میں کتنی میونسپلٹیاں ایسی ہیں جنہوں نے اہل شہر کے لئے صاف دودھ خالص گھی، عمدہ آٹے، اچھی ترکاریاں، نفیس پھل، اور مکھیوں کی غلاظت سے پاک مٹھائیوں کی بہم رسانی کا کوئی

معقول انتظام کیا ہو۔ گوشت کا نام ہمنے قصداً نہیں لیا اسلئے کہ اسکے متعلق اکثر میونسپلٹیاں اگر معقول نہیں تو نامعقول انتظامات کرنے کے لئے آمادہ ہوجایا کرتی ہیں، لیکن انکی یہ نوازش بالعموم اس جذبے کے ماتحت نہیں ہوتی ہے کہ گوشت مکھیوں کی دست برد سے محفوظ اور گوشت خواروں کے لئے غیر مضرت رساں ہوجائے، بلکہ اس جذبے کے ماتحت ہوتی ہے کہ ان لوگوں کی نگاہیں اس تک نہ پہونچ سکیں کہ جو اسے دیکھنا پسند نہیں کرتے

ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ کتنی میونسپلٹیاں ایسی ہیں جنہوں نے فقیروں اور محتاجوں کے لئے کوئی ایسی تجویز سوچی ہو کہ جس سے انکے پیٹ میں روٹی بھی پڑجائے اور وہ مفت خوری کی لعنت سے بھی محفوظ رہ سکیں۔

ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ہندوستان کی کتنی میونسپلٹیوں نے اپنی حدود کے اندر ایسے زچہ گھر اور بچہ گھر قایم کئے ہیں کہ جہاں زچہ و بچہ کو وہ تمام ضروری طبی امداد مل سکے کہ جس کی دفع حمل کے موقعوں پر ضرورت ہوتی ہے، اور کتنی میونسپلٹیوں نے یہ اہتمام کیا ہے کہ شہر کے غریب مریضوں کو بھی ویسی ہی اچھی طبی امداد اور اسی قدر عمدہ غذائیں اور دوائیں میسر آجائیں کہ جیسی امیروں کو مل جاتی ہیں۔

ہم یہ بھی معلوم کرنے کے آرزومند ہیں کہ کس کس میونسپلٹی نے شہر کے بیکار اور بے روزگار لوگوں کے لئے کام، بے گھروں کیلئے گھر، اور معذور الخدمت ناداروں کے لئے ضروریات زندگی بہم پہونچانے کے انتظامات کر رکھے ہیں اگر اس قسم کے کوئی انتظامات نہیں ہیں، یا اگر ہیں تو ناکافی اور غیر اطمینان بخش تو کیا پھر بھی ہمارے خدایان شہر یہ دعوٰی کرسکتے ہیں کہ وہ ہمارے روپے کو صحیح مصرف میں استعمال کر رہے ہیں، اور جو انتظامات انہوں نے کر رکھے ہیں ان پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاسکتا؟ ہوا، پانی، اور غذا، ہماری زندگی کی ضروریات ہیں اور انکے بغیر انسانی زندگی محال ہے۔ ہم جس جماعت کو اپنی طرف سے اپنے گھر یا اپنے شہر کے انتظام پر مامور کرتے ہیں انکے بنائے ہوئے قانونوں کا احترام کرکے انکی پابندی اپنے اوپر فرض کرلیتے ہیں، اور اپنی آمدنیوں کا ایک حصہ نہایت خوشی کے ساتھ انکے ہاتھوں میں دیکر انہیں یہ اختیار دیدیتے ہیں کہ اسے جس طرح چاہیں صرف کریں اُن سے اگر ہم یہ توقع رکھیں تو کچھ بھی بیجا نہیں ہے کہ وہ سب سے پہلے ہماری زندگی کی ضرورتیں ہمارے لئے مہیا کرینگے، اسکے بعد ہمارے اخلاق و عادات کی درستی اور مناسب تعلیم کا انتظام کرینگے، اور اسکے بعد بھی اگر کچھ روپیہ بچ رہیگا تو اس سے ہمارے شہر کی توسیع تزئین، اور آرایش کیجائے گی، لیکن یہ دیکھکر کس قدر افسوس ہوتا ہے کہ ہماری مجلس منتظمہ کے کرسی نشین سب سے پہلے جس چیز کی طرف توجہ کیا کرتے ہیں وہ شہر کی آراستگی ہے، اور اس سے تھوڑا بہت روپیہ بمشکل بچا کر طبی امداد کی بہم رسانی پر صرف کردیا کرتے ہیں۔ ہماری میونسپلٹیوں کے ممبر فخر کے ساتھ گردن اونچی کرکے اپنے شاندار کارناموں کی جو داستان ہمیں سنایا کرتے ہیں وہ بالعموم یہ ہوتی ہے کہ انہوں نے فلاں فلاں سڑکیں کولتار کی بنوادیں۔ فلاں فلاں کچے راستوں کو پختہ سڑک میں تبدیل کردیا، فلاں فلاں گلی میں روشنی کا انتظام کردیا، شہر کی شاہراہوں پر مٹی کے تیل کی پرانے زمانے کی لالٹینوں کی بجائے اعلیٰ درجہ کے نفیس خوبصورت بجلی کے قمقمے آویزاں کردیئے ہیں، اور دور جہالت و بربریت کی یادگار یکوں اور بہلیوں کو نیست و نابود کرکے ٹانگوں اور موٹروں کو رواج

دیدیا، لیکن کبھی کسی کو یہ کہتے نہ سنا کہ اسکی کوششوں سے کوئی ایسا انتظام ہوا ہے کہ اہل شہر کو خالص اور غیر مضرت رساں اشیائے خوراک معمولی تو کجا، غیر معمولی نرخ پر بھی کبھی میسر آسکیں۔ یا شہر کے کسی صاف ستھرے حصہ میں عمدہ اور ہوادار کچھ مکانات ایسے تعمیر ہوگئے ہیں کہ جو ارزاں کرایہ پر ان غریب لوگوں کو مل سکیں کہ جو جنگل کے جانوروں کی طرح ان ذرا ذرا سے بھٹوں میں اپنی زندگی کے دن گذارا کرتے ہیں کہ جن میں نہ کبھی صاف ہوا کا گذر ہوتا ہے نہ دھوپ کا اور جہاں دق، ملیریا، تپ محرقہ، اور طاعون وغیرہ کے جراثیم نے بہ اطمینان تمام اپنی چھاونیاں چھارکھی ہیں،

چند سال سے میونسپلٹیوں کے قیام کے باوجود آج بھی ہمارے شہروں کے بازاروں میں جو چیزیں اشیائے خوراک کے نام سے بکتی ہیں، اور جس حالت اور جس صورت میں بکتی ہیں وہ ایسی ہی ہوتی ہیں کہ جنہیں استعمال کرنا اگر کسی مہذب اور سمجھدار آدمی کو گوارا ہوسکتا ہے تو صرف اسلئے کہ انہیں کھالینا بہرحال فاقہ کشی سے کچھ بہتر ہے۔ دودھ جو انسان کی اولین اور بہترین غذا ہے اول تو خالص ملتا ہی نہیں، اور اگر اس دشواری کا کوئی حل نکل بھی آئے تب بھی اس میں نالوں، جوہڑوں، اور تالابوں کے پانی کی بجائے خاک مٹی، گوبر اور پاخانے کے خشک ذرات، اور مکھیوں کی لائی ہوئی یا اپنے جسم سے نکالی ہوئی غلاظت اس قدر کافی مقدار میں ملی ہوئی ہوتی ہے کہ مزید آمیزشوں کی ہرگز ہرگز کوئی تمنا نہیں کی جاسکتی۔

گھی کی حالت اس سے بھی زیادہ افسوسناک ہے۔ شہر تو شہر آج دیہات سے بھی خالص گھی کا فراہم کرنا کسی طرح جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔ تہذیب جدیدہ کی آہنی اور دخانی برکتوں نے یورپ کے بنے ہوئے بناسپتی گھی کو گاؤں گاؤں اور قصبہ قصبہ میں پہونچادیا ہے، اور اب کوئی ایسا بیوقوف دیہاتی ملنا بہت ہی مشکل ہے جو اپنے گھی کی مقدار کو دوگنا کرلینے میں اس مغربی نعمت سے فائدہ نہ اٹھاتا ہو، اور اب چربی یا اسی قسم کی اور آمیزشیں اگرچہ رائج ہیں، لیکن دور جہالت کی دوسری یادگاروں کی طرح بہ نظر استحقار دیکھی جاتی ہیں

سبز ترکاریاں، پھل، اور مٹھائیاں اگر اتنی خوش ذائقہ چیزیں ہوتیں اور اگر انہیں دیکھتے ہی ہمارے منہ میں پانی نہ بھر آیا کرتا تو یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ غلاظت کے ان انباروں کو دوا کے طور پر بھی کوئی اپنے پیٹ میں ڈالنا شاید مشکل ہی سے گوارا کرسکتا تھا۔

شہر کے محلوں اور گذرگاہوں کی صفائی ان چند ہستیوں کے رحم وکرم پر منحصر ہے کہ جنہیں حلال خور کہا جاتا ہے۔ لیکن جو بالعموم

برعکس نہند نام زنگی کافور

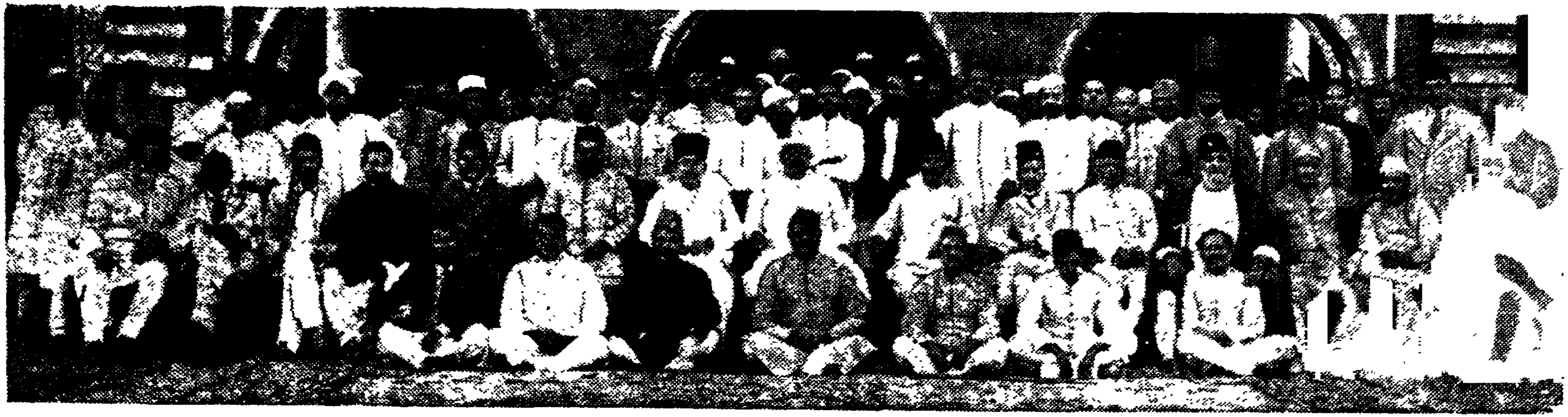
کے مصداق ہوتے ہیں اور جو میونسپلٹی کے پاخانوں سے غلاظت کی گاڑیاں بھر کر جب لے کے چلتے ہیں تو اس طریقہ پر کہ سارے راستے غلاظت کا ہلکا ہلکا چھڑکاؤ ہوتا چلا جاتا ہے اور ان کے گذر جانے کے گھنٹوں بعد تک بھی شاہراہوں کی فضا اسکی نکہتوں سے معمور رہتی ہے لیکن انہی سڑکوں پر جب ہمارے محنتی اور لایق ممبروں کی کوششوں کی بدولت رات کے وقت بجلی کے قمقمے ذرا ذرا سے فاصلے پر لٹکتے ہوئے نظر آتے ہیں تو ہم دن کی واردات کو بالکل بھول کر اپنے خدایاں شہر کی صفت وثنا میں صدق دل

سے معروف ہو جاتے ہیں۔

میونسپلیٹیوں کی بدتہاسے اور ازکی بارش کرم کے باوجود ہم اب بھی حیرت وافسوس کے ساتھ یہ دیکھتے ہیں کہ شہر کے اندر غریبوں کو رہنے کے لئے اگر کوئی مکان میسر ہے تو ایسا کہ بارش سے زیادہ ہوا اور دھوپ کو روکتا ہے اور اسکی زمین کی ہلکی ہلکی نمی فضا کی گرمی کے ساتھ ملکر دق کے جراثیم کے لئے بہترین پرورش گاہ تیار کر دیتی ہے، اور اس گھر کے باشندے حد سے زیادہ محنتی اور جفاکش ہونے کے باوجود کبھی تندرست نہیں رہنے پاتے۔ عین شباب کے عالم میں بھی انکے چہرے زرد اور ستے ہوئے ہوتے ہیں، اور اس قدر ورزش اور محنت کرنے پر بھی انکے سینے اندر کو دبے ہوئے اور انکے ہاتھ پاوں لاغر اور کمزور ہی رہتے ہیں انسانیت کے یہ بے طاقت اور ناتوان ڈھانچے مردم کے اپنی زندگی کے آٹھ دس یا پندرہ بیس سال دنیا میں گذارتے ہیں اور پھر بصد حسرت و افسوس رخصت ہو جاتے ہیں، اور اس طرح ہندوستان کا اوسط عمر کسی طرح تیئیس سال سے زیادہ نہیں بڑھنے پاتا جس پر دنیا بھر میں اگر کوئی فخر کر سکتا ہے تو وہ شاید یہی ہمارے "فرض شناس" میونسپلٹی کے ممبر ہیں۔

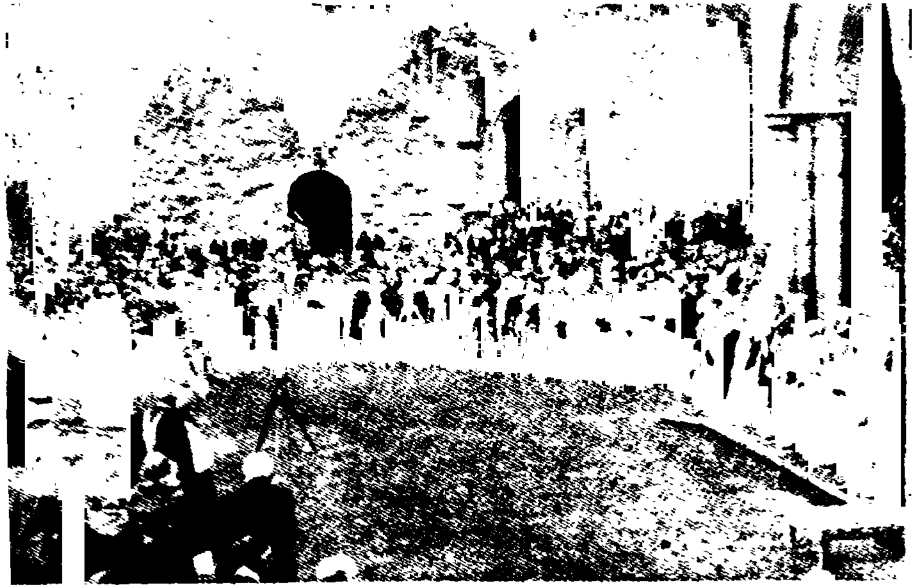
اگر یہ صحیح ہے کہ جو ماں اپنے بچے کے لئے دودھ خریدنے سے پہلے سنی کے ہوے خریدتی ہے وہ بچے کی دشمن ہے تو یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ہماری میونسپلیٹیوں کے وہ ممبر بھی ہرگز ہرگز ہمارے دوست نہیں ہیں جو ہمارے لئے ہوا، پانی اور مناسب غذا کا انتظام کرنے سے پہلے ہماری موٹروں کے لئے سڑکیں، اور ہماری سڑکوں کیلئے بجلی کی روشنی مہیا کرنے کی فکروں میں لگے رہتے ہیں۔

موٹریں اور سڑکیں اور بجلی کی روشنی سب نہایت اچھی چیزیں ہیں لیکن اسی وقت کہ جب ہماری زندگی کی ضرورتیں سب مہیا ہو جائیں اور ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ بجلی کا کارخانہ کھولنے سے پہلے ہماری میونسپلیٹیوں کو ڈیریا کھولنے کی زیادہ ضرورت ہے جہاں سے اہل شہر کو معمولی نرخ پر دودھ اور گھی بالکل خالص اور مضر صحت جراثیم کی آلودگیوں سے پاک مہیا ہو سکے۔ اور کولتار کی صاف اور ہموار سڑکیں بہت ہی خوبصورت اور آرام دہ ایجادیں ہیں لیکن اسی وقت کہ جب اُن پر دو رویہ اُن ہزارہا عورتوں، بچوں اور مردوں کی قطاریں نہ کھڑی ہوں کہ جنہیں پیٹ کی ضرورتوں نے اپنا ہاتھ، دامن، یا کشکول دوسروں کے آگے پھیلانے پر مجبور کر دیا ہے کیا ہمارے فدیان شہر اس ہذیان کی طرف توجہ کرنا پسند فرمائیں گے؟ اور کیا اب بھی کسی طرح انکی سمجھ میں یہ بات آسکے گی کہ شہر کے انتظام کی باگ انکے ہاتھ میں دیدینے کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہو کہ وہ صرف امیروں اور دولتمندوں کیلئے عیش و آرام کے سامان مہیا کیا کریں اور شہر کے غریب باشندوں کو یک قلم فراموش کر دیں۔ غریب اپنی گاڑھے پسینے کی کمائی کا روپیہ اگر انکے ہاتھ میں دیتے ہیں تو اسلئے نہیں کہ اس سے امیروں کی موٹروں کیلئے سڑکیں تیار کر دیجائیں، بلکہ اسلئے کہ انہیں کم قیمت پر عمدہ خوراک، اور بالکل بلاقیمت صاف ہوا، پاک پانی اور ضروری دوا دارو ملتی رہے اور انکے ان مفلس و نادار اور معذور و بیکار بھائیوں کو بھی دو نصیب ہو جایا کریں کہ جنہیں اتفاقات نے اپنے لئے خود روزی کمانے سے محروم کر دیا ہے۔



لکھنؤ کانفرنس میں شامل ہونے والے آل انڈیا مسلم لیڈروں کی ایک تصویر جو راجہ آف
سلیم پور کی کوٹھی پر لیگئی





سر والٹر سکاٹ کی صد سالہ برسی سکاٹ لینڈ کے تمام مشاہیر اس روز آپ کے مقبرہ پر جمع ہوئے بائیں ہاتھ کی تصویر اس موقعہ پر جمع مجمع کی
اور دائیں ہاتھ کی ایبٹ فورڈ کی ہے جس پر چراغاں کیا گیا



تقلید کا تعلق اصلاح و ترقی سے

از جناب معز الدین احمد صاحب دہلوی

فرد اور قوم کا وہ وقت سب سے زیادہ نازک ہوتا ہے جبکہ اس کو اپنی کمزوری اور پستی کا احساس شروع ہو اور وہ دیوانہ وار ہاتھ پیر مارنا شروع کر دیئے۔ اس وقت اس کے لئے دو ہی راستہ ہیں ایک یہ کہ وہ اپنی ہستی کو کسی دوسری قوم میں فنا کر دے اور مٹ جائے۔ دوسرا یہ کہ اپنا راستہ آپ تلاش کرے اور اپنے انفرادیت کو قایم رکھنے کے لئے جد و جہد شروع کرے۔ ہم آج اسی دور سے گذر رہے ہیں اس دور میں غلطیوں کا ہونا اور راستہ کی تلاش میں بھٹکتے پھرنے کا بھی احتمال ہے گو غلطی کا غور و فکر کے بعد بھی امکان ہے لیکر بلا سوچے سمجھے کوئی غلط راہ اختیار کر لینا بہت زیادہ مہلک ہے محکومیت اور پستی کا احساس اور ترقی کی دبی ہوئی خواہش افراد کو مجبور کرتی ہے کہ وہ ہاتھ پیر مار کر زندہ اور آزاد قوم کے ہم مرتبہ ہو جائے لیکن اس گھبراہٹ میں جو سب سے

پہلی غلطی ایک مردہ قوم سے ہوتی ہے وہ یہ خیال ہے کہ ان تمام رسم و رواج کا اختیار کرنا ہی اس کی نجات کا باعث ہوگا جو ایک حاکم قوم نے اختیار کی ہوئی ہیں اپنی پستی کے باعث اپنا ہر بہتر سے بہتر فعل قبیح اور دوسروں کا ہر مہمل سے مہمل اور لغو سے لغو عمل مستحسن معلوم ہوتا ہے۔ بس پستی اور غلامی، ذہنی اور دماغی توازن خراب کر دیتی ہے یہاں تک کہ اچھے برے کا فرق اٹھ جاتا ہے مسلمان اسی نازک دور سے گذر رہے ہیں۔ اس وقت تقلید بطور وبا کے پھیلی ہوئی ہے اور رہبر متجسس کی نگاہیں نیک و بد مستحسن اور غیر مستحسن، ضروری غیر ضروری باموقع اور بلا موقع گویا ہر قسم کے فرق کو معلوم کرنے سے قاصر ہیں۔ دماغ ماؤف ہو چکا ہے قوت فیصلہ نے ساتھ دینا ترک کر دیا۔ قوت عمل فنا ہو گئی اگر کوشش ہے تو صرف تقلید کی اور عمل ہے تو صرف نقل پر حالانکہ زید کا بکر کی

اتباع کرنا در اصل زندگی حیات کا ثبوت نہیں بلکہ بکری کی عظمت کا اقرار ہے۔

یہ کون نہیں جانتا کہ ہر ملک کی آب و ہوا مختلف ہوتی ہے مذہبی اور قومی روایات کا اختلاف ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ سب سے بڑا اختلاف اس ذہنیت اور ان عادات کا ہے جو آب و ہوا کے اختلاف سے مختلف ہوتی ہیں۔ اور پھر ایک تربیت یافتہ قوم کی نقل ایک مردہ جسم کی حیثیت کیلئے کیا ایسی ہی نہ ہوگی جیسا کہ دق کے مریض کا کسی تندرست آدمی کی طرح جینے پھرنے اور کھانے پینے کی خواہش کرنا ایسے افراد جو اپنی قومی روایات کو نظر انداز کرکے کسی دوسرے کی تقلید کریں گے انکی نہ صرف دماغی اور ذہنی ترقی کا خاتمہ ہو جائیگا۔ بلکہ ان میں اخلاقی جرائم بھی پیدا ہو جائیں گے۔ وہ صرف اسلئے کہ ان افراد کے سامنے نہ کوئی قومی نصب العین ہوگا اور نہ قومی کرکٹر بنانے کے کوئی معیار ان کے تمام تر تقلیدی افعال بلا کسی غور و فکر کے عمل میں آئیں گے ایسی صورت میں بھلا اصلاح کیسے ممکن ہو سکتی ہے؟ بلکہ ترقی کے خواب دیکھنا بھی در اصل اپنے نفس کو دھوکے میں ڈالنے کا مترادف ہوگا۔

جہاں مسلم خوابیدہ آج مختلف مذہبی اور سیاسی عقائد کے اعتبار سے سینکڑوں گروہوں میں منقسم ہے وہاں تقلید کے اعتبار سے وہ پھر دو بڑے گروہوں میں تقسیم ہو گیا ہے۔

ایک وہ گروہ ہے جسے ہمارے "تجدد پسند" حضرات ننگ منظر لکیر کا فقیر اور بطور گالی کے قدامت پسند کہتے ہیں۔

دوسرا گروہ وہ ہے جو کبھی نیچری اور آج کل نئی روشنی کے لوگوں کے نام سے مشہور ہے۔

خلافت راشدہ کے زمانہ میں حضرت عمرؓ کے دور حکومت میں مسلمانوں کو اطمینان سے سانس لینے کا موقعہ ملا۔ اس وقت مسلمانوں نے میدان عمل میں قدم رکھے اور جد و جہد شروع کی خلافت عباسیہ کے دور اسلامی تہذیب پر عجمی اثر پڑنا شروع ہوا۔

عباسیہ کے زمانہ میں مسلمان دنیا کی متمدن ترین اور مہذب ترین قوم گنے جانے لگے۔

گو چنگیزی حملہ نے مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچایا اور ان کے تمام علمی ذخائر تباہ و برباد کر دیئے تاہم وہ دنیا میں عرصہ تک باعزت قوم مانے جاتے رہے۔

اسلامی تہذیب میں عجمی تہذیب کی آمیزش اور اسپر ثروت و نصرت کا اضافہ ان سب چیزوں نے ملکر مسلمانوں کا معیار معیشت STANDARD OF LIFE بہت بڑھا دیا مسلمان تعیشات میں پڑ گئے ادائیگی فرض میں کوتاہی شروع ہوئی طبیعت آسان پسند ہو گئی بس پھر کیا تھا انحطاط شروع ہو گیا دولت کی فراوانی اور تعیشات نے وہ جراثیم پیدا کر دیئے جو جسم قوم کو کھا گئے اور روح قوم کو فنا کر دیا۔

ایک طرف آمدنی میں کمی ہوئی لیکن دوسری طرف تعیشات میں دلچسپی کا عالم وہی رہا نتیجہ جو کچھ ہوا آج وہ ظاہر ہے۔ ایسی صورت میں ہمکو جو ذہن ہمارے موجودہ سوسائٹی کے نظام ہی کی پابندیوں میں جکڑے

رکھنا چاہتا ہے وہ ہمکو کہاں تک اصلاح و ترقی کیطرف دعوت دے رہا ہے ؟

یہی حالت اس تہذیب اور اس تمدن کی ہے جسکو "تعلیم یافتہ" نوجوان آیۂ رحمت سمجھے ہوئے ہیں آج یورپ اور امریکہ کی حالت قابل تقلید نہیں بلکہ قابل رحم ہے۔ گذشتہ چھ سات سو برس کی بتدریج ترقی اپر دولت کی کامیابی و کامرانی کا نشہ، جنگ عظیم کی مصائب کے بعد سکون و اطمینان کی تلاش، یہ سب چیزیں ایسی پیدا ہو گئی ہیں کہ سوسائٹی کی کایا پلٹ گئی اطمینان اور سکون کے متلاشی ہر قسم کی اخلاقی قیود سے بے نیاز ہو گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف آج مذہبی گروہ بلکہ ہر وہ شخص جو حالت کی نزاکت سے واقفیت رکھتا ہے نوحہ خوانی کرتا نظر آرہا ہے۔ پھر جس حالت پر خود دانایان فرنگ خون کے آنسو بہا رہے ہوں وہ ہمارے لئے کب مفید ہوسکتی ہے۔ اور ہماری مشکلات کا کس طرح علاج کرسکتی ہے ہم تک مغربی تہذیب و تمدن جن ذرائع سے پہنچا ہے ان میں صرف انگریزی ادبیات کے علاوہ ہمارے پاس دوسرا کوئی ایسا ذریعہ نہیں جس سے ہم یورپی ممالک کے سوسائٹی کے نظام کا صحیح طریق پر پتہ چلا سکیں، اور پھر ادبیات کا مطالعہ بھی کون بنظر غور کرتا ہے؟ اب دیکھنا یہ ہے کہ مغربی نظام تہذیب و تمدن کی اس دھندلی سی تصویر کو ہمنے کیا تصور کیا ہوا ہے۔

ہماری پستی اور دوسروں کی سرفرازی سے ہم میں یہ پر فریب عقیدہ پیدا ہو گیا ہے کہ اس تہذیب و تمدن کی نقالی سے وہی مادی عروج ہمکو بھی حاصل ہو جائیگا۔ ہم میں سے ایک گروہ اپنی تمام کوشش اسکی نقالی پر صرف کر رہا ہے گویا وہی اسکا سرمایہ حیات ہے۔

اس تقلید کا سب سے برا اثر جو پڑا وہ یہ کہ ہمنے بلا سوچے سمجھے اپنا معیار معیشت STANDARD OF LIFE بڑھا لیا اور روز بروز بڑھاتے چلے جا رہے ہیں۔ حالانکہ ہمتوں کی پستی اور ذرائع آمدنی کی کمی بدستور سابق موجود ہے اگر ذرائع آمدنی بھی ہوں تب بھی ہماری آسان پسندی اور کام کرنے میں عار ہماری ترقی میں اور بھی بڑی رکاوٹ ہے جس نے سینکڑوں خاندانوں کو مشکلات میں ڈالا ہوا ہے۔

اسکے علاوہ چھ پنس والی ادبیات اور عامیانہ ڈرامے جنکو ہماری نگاہیں سینما کے پردے پر دیکھتی ہیں ہماری اخلاقی حالت کو بد سے بدتر بنا رہے ہیں اور ہماری بد ذوقی انتہا کو پہنچ گئی گو ایک ایسی جماعت بھی ہے جو اس بد ذوقی سے پاک ہے اور اس نے ادبیات مغرب سے فائدہ بھی اٹھایا ہے لیکن پھر بھی وہ مغربی سوسائٹی کے نظام سے مرعوب ہے جس کا برا اثر اسکی اخلاقی حالت پر برابر پڑ رہا ہے اس اندھی تقلید میں صنف نازک بھی حصہ لیتی نظر آرہی ہے اگر ہماری اپنی ہستی اور اپنے وجود سے یہی بے نیازی رہی تو یہ تمام رہی سہی اخلاقی عمارت جلد از جلد منہدم ہو جائے گی۔

یہ ظاہر ہے کہ آج یورپ اور امریکہ میں جرائم کی کثرت ہے شراب خواری، زنا، خودکشی، چوری، ڈاکہ، طلاق کی کثرت، عیاری، دغابازی، مکاری، یہ سب چیزیں ایسی ہیں کہ جب ہم انکو دیکھتے اور پڑھتے ہیں اور پھر انکا ذکر اس قسم کے گرے ہوئے افسانوں میں مطالعہ کرتے ہیں

جن کے مصنفین نے ان جرائم کو کوئی اہمیت نہ دی ہو بلکہ انکا ذکر بھی فخریہ لب و لہجہ میں کیا ہو تو پھر فرمائیے کہ ان لوگوں کی اخلاقی پستی کا کیا حال ہوگا جو اس تہذیب سے مرعوب بھی ہیں اسمیں دلچسپی بھی لیتے ہیں اور اس معاشرت کی نقالی کے خواہش مند بھی ہیں۔

ہماری طبیعتوں میں آسان پسندی، کاہلی، عیش پرستی اور اسی قسم کی دیگر عادتیں ورانۃً آئی ہیں یہ انہی کا نتیجہ ہے کہ ہمکو اپنی پرانی تہذیب اور جدید مغربی تمدن میں وہی رسم و رواج وہی عادات و خصائل اور زندگی کا وہی پہلو مرغوب تر اور قابل تقلید نظر آتا ہے جو ہماری آسان پسندی اور عیش پرستی کے جذبات کو حرکت میں لاسکے

ہماری اصلی اسلامی تہذیب تو آج عملی حیثیت سے بالکل تاریکی میں ہے لیکن جدید تہذیب و تمدن کے بعض روشن پہلو بالکل نمایاں ہیں لیکن جس قوم کو محنت و جفاکشی کی عادت نہ ہو وہ کس طرح سے انکی طرف توجہ کرسکتی ہے۔ مغربی تہذیب کا وہ پہلو جس کے ہم آج اتباع کے خواہاں ہیں اس قدر مسخ صورت میں نقل کیا جارہا ہے کہ اسکا کوئی نمایاں سے نمایاں فائدہ بھی ہم حاصل نہیں کرسکتے بلکہ اپنی بد ذوقی سے اپنے لئے اسکو مہلک ترین بنالیتے ہیں۔

ہماری پرانی تہذیب گو آج تاریکی میں ہے لیکن تاریخ کے صفحات پر اسکا روشن ترین نقش موجود ہے اس میں زندگی کے اور بھی مختلف پہلو نظر آئینگے۔ جنپر ہمارا عمل رہا اور جبتک رہا اسوقت تک دولت و ثروت ہمارے گھر کی لونڈی رہی اور کامیابی و کامرانی نے ہمارا ساتھ دیا آج جس قوم کی تقلید کی آرزو کرنا بھی ہم فخر سمجھتے ہیں اس کے سوسائٹی کے نظام کو اگر ایک سرسری نظر سے بھی دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس قوم کے افراد تعیشات سے دلچسپی رکھنے کے علاوہ کچھ اور بھی کیا کرتے ہیں انکا معیار معیشت کی بلندی کے ساتھ جوش عمل تلاش و جستجو کا جذبہ اور اپنی قومی خصوصیات کے ماتحت تربیت و تعلیم کا نظام آج اوج ثریا پر ہے۔

ظاہر ہے کہ کوشش اور جدوجہد ہی میں ہر فرد اور ہر قوم کی ترقی کا راز مضمر ہے لیکن اگر جدوجہد اور کوشش غیروں کی تقلید میں کیجائے خواہ تقلید انکی بہترین عادتوں ہی کی کیوں نہ ہو تو بھی قومی سیرت کا ترتیب پانا ممکن نہیں قوم کی اخلاقی تربیت کے لئے ضروری ہے کہ افراد قوم کے پیش نظر اپنی ماضی کی تاریخ ہو جس سے وہ اپنی قومی خصوصیات کے ماتحت قومی کیرکٹر بنانے کیلئے ایک معیار تجویز کریں اور تمام تر توجہ اس کیرکٹر کے بنانے پر صرف ہو دوسری قوموں اور دوسری تہذیب و تمدن سے ہر وقت فائدہ حاصل کیا جاسکتا ہے بشرطیکہ خصوصیات قومی اسکی اجازت دیں۔

ترقی چند یا "کل" افراد کے دولتمند ہوجانے یا مخصوص قسم کا طریق رہائش اختیار کرلینے کا نام نہیں بلکہ قوم کی مجموعی حالت پر اسکی عظمت اور پستی کا انحصار ہوتا ہے جب تک کسی فرد کا مطمح نظر اور نصب العین موٹر اور بنگلہ یا حصول دولت ہوگا۔ وہ کبھی سوسائٹی کا ایک مفید قابل بھروسہ باوقار رکن نہیں شمار کیا جاسکتا اس کا وقار اور اسکی اہمیت سب کی سب اسکی سیرت پر منحصر ہے ایک دولتمند سے شخص بھی اگر کسی سیرت کا مالک نہیں ہے تو بھی سوسائٹی میں اطمینان اور بھروسہ

کی نظروں اس پر نہ پڑیں گی۔ کوئی قوم سوقت تک مجموعی
حیثیت سے بھی دولتمند نہیں ہوسکتی جب تک کہ کسی
سیرت کی مالک نہ ہو بس ضرورت کیرکٹر کے بنانے کی
ہے جو کبھی غیروں کی نقالی سے نہیں بنتا۔

گر مگ ناداں طواف شمع سے آزاد ہو!
اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہو!

روشنی ضمیر میں عقل سے اجتہاد کر

از جناب مولوی محمد شفیع الدین صاحب نیّر

بنی نوع انسان کی طبائع، اس کے خیالات وجذبات، اسکی خواہشیں اور آرزوئیں، اسکی تمنائیں اور حسرتیں مختلف ہیں۔ اُس کے رجحانات اسکی رغبتیں اسکی پسند۔ غرض ہر شے اختلاف رکھتی ہے۔ ایک شخص ملاحت کا شیدا ہے تو دوسرا صباحت کا۔ ایک شخص میں ذوقِ آرایش ہو تو دوسرے میں شوق سادگی۔ ایک شخص خلوت پسند ہو تو دوسرا جلوت کا آرزومند۔ ایک شخص کسی خیال کے دل میں آتے ہی اسکو عملی صورت دیدیتا ہے۔ دوسرا مدت تک اس کے آغاز وانجام کو پیش نظر رکھکر سوچتا غور کرتا اور نہایت خرم واحتیاط کے ساتھ گردوپیش کے حالات کو دیکھتا ہوا قدم اٹھاتا ہے۔ ایک شخص فطرتاً مشکلات کا مقابلہ کرنے کیلئے تیار ہوجاتا ہے دوسرا طبعاً دشواریوں کے اندیشے ہی سے گھبرا جاتا ہے۔ اختلاف طبائع ہی کا نتیجہ یہ بھی ہے کہ ایک شخص قدامت کا شیفتہ ہے تو دوسرا جدت کا فریفتہ۔ یہ اختلاف انسان کی روزانہ زندگی اسکی غذا، اسکے لباس، اسکے مکان، اور دیگر ضروریاتِ معاشرت اور لوازم تمدن میں نمایاں ہے اور ہر قسم کی زندگی خواہ مذہبی ہو خواہ اخلاقی، خواہ معاشرتی زندگی ہو خواہ تمدنی، و سیاسی زندگی ہو خواہ عمرانی۔ مختصر یہ ہے کہ انسانی زندگی کے ہر شعبے میں جاری و ساری نظر آتا ہے۔

اگر مذہبی زندگی میں اختلاف نہ ہوتا تو آج دنیا میں صرف ایک مذہب ہوتا۔ اسلام۔ عیسائیت۔ بدھ مذہب ہندو دھرم اور دہریت وغیرہ مذاہب مختلفہ کے نام سننے میں نہ آتے۔ اگر سب انسان نیکی بدی اور ہر شے کے ایک ہی خالق پر متفق ہوجاتے تو آج دنیا میں توحید پرستوں کے سوا کسی اور فرقے کا وجود بھی نظر نہ آتا۔ اگر نیکی اور بدی کے دو خدا تسلیم کرلئے جاتے تو ساری خدائی میں یزدان اور اہرمن کی کارفرمائی نظر آتی۔ اگر تثلیث پرستی کو انسانی طبائع یک جہتی کے ساتھ قبول کرلیتیں تو آج خدا، اسکے مقدس فرزند، اور روح القدس کا ڈنکا اقصائے عالم میں بج رہا ہوتا۔ اگر انسانی طبائع مختلف اور متعدد خداؤں کے وجود کو مان لیتیں تو صرف ایسی ہی جماعتوں کا دور دورہ ہر طرف دکھائی دیتا جو ہر فوق العادۃ قوت کو ایک دیوی یا دیوتا تسلیم کرلیتی ہیں۔ اگر دہریت ہی پر سب اتفاق کرلیتے تو آج لامذہبی کا سکہ چل رہا ہوتا اور کسی کو خدائے تعالیٰ کے وجود وعدم وجود سے بحث ہی نہیں ہوتی۔ اگرچہ یہ کہنا دشوار ہے

[redacted]

کہ ذات باری کا کسی نہ کسی صورت میں عقیدہ رکھے بغیر دنیا کی حالت کیا ہوتی۔ تاہم ہوتے سب متفق۔

اخلاقی زندگی کے اختلاف کا بھی یہی حال ہے مختلف ممالک اور مختلف اقوام میں ملکی اور قومی خصوصیات کی بنا پر اخلاق کا معیار مختلف ہے۔ رسم و رواج نے ایک بات کو براعظم ایشیا میں قابل اعتراض قرار دیا ہے وہی بات براعظم یورپ میں نہ صرف ناقابل اعتراض بلکہ پسندیدہ اور مرغوب ہے شرم و حیا عفت و عصمت صبر و استقلال ہمت و جرأت [illegible] دشمنی توکل قناعت خودداری اور خود غرضی رحم و کرم عفو و راحت، ظلم و تعدی کا معیار مختلف نظریوں میں مختلف ہے اور اس اختلاف کے اسباب ملی خصوصیات۔ تاریخی اثرات اور آب و ہوا کے اختلاف پر مبنی ہیں۔

معاشرتی اور تمدنی زندگی کا اختلاف ظاہر ہے۔ بعض لوگ [illegible] پسند کرتے ہیں بعض لوگ تنگ [illegible] حالانکہ [illegible] کسی قسم کی افادیت مدنظر نہیں ہوتی۔ بعض لوگ میز پر کھانا پسند کرتے ہیں بعض لوگ فرش پر۔ بعض لوگوں کو مٹھائیوں سے رغبت ہے بعض کو پھلوں اور ترکاریوں سے بعض کوٹ پتلون پہننا پسند کرتے ہیں اور بعض شیروانی اور پاجامہ بعض لوگ دھوتی ہی پر قناعت کرتے ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ ہمارے کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے، سوتے جاگنے، ملنے جلنے، لین دین، شادی و غمی اور دیگر امور روزمرہ میں اختلاف صاف نظر آتا ہے۔

سیاسی زندگی کا اختلاف بھی کچھ کم اہم نہیں ہر مختلف ملک میں حکومت کے علاوہ بھی مختلف جماعتیں ہوتی ہیں ہر جماعت کا ایک خاص مقصد اور طریق کار ہوتا ہے اسکی جدوجہد اپنے مخصوص ذرائع کے ساتھ اس مقصد کے حصول تک محدود رہتی ہے۔ ہر جماعت چاہتی ہے کہ اسکی سرگرمیاں دیگر جماعتوں کی سرگرمیوں پر فوقیت لیجائیں اور وہ جماعت دوسری جماعتوں کو کمزور کرکے اپنی قوت کو بڑھائے۔ انگلستان میں تمام متعدد جماعتوں کی حکمت عملی ماتحت ممالک کے متعلق اگرچہ بظاہر متحد معلوم ہوتی ہے تاہم خانگی اور باہمی معاملات میں وہاں بھی اختلاف ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو قدامت پسند، معتدلین، اور مزدور جماعت وغیرہ کے نام سننے میں آتے ہیں اپنے ملک ہندوستان ہی کی حالت پر نظر ڈالئے دوسری قوم کے زیر اثر حکومت ہونے کی وجہ سے عقل کا تقاضا یہ تھا کہ یہاں صرف ایک جماعت ہوتی جو تمام ملک اور مجموعی قوم کی بھلائی کی تدابیر سوچتی اور میدان عمل میں سرگرم ہوکر قوم کو ترقی کے مدارج طے کرنے میں مصروف نظر آتی لیکن یہاں بھی کئی جماعتیں ہیں۔ کوئی جماعت انتہا پسند کہلاتی ہے کوئی اعتدال پسند ایک کی سرگرمیوں میں بلا کی گرمی نظر آتی ہے دوسری اس قدر ٹھنڈی ہے کہ عمل کے نام سے اُن کے ہاتھ پاؤں سن ہوجاتے ہیں۔ اس ملک میں اختلاف جماعت کا ایک سبب مختلف مذاہب کے مقلدین کا وجود بھی ہے کوئی جماعت اپنے آپکو صرف ہندوؤں کا خیرخواہ ظاہر کرتی ہے کوئی مسلمانوں کی خیرخواہی کی مدعی ہوتی ہے علی ہذالقیاس۔ یہ اختلاف مختلف مذاہب کے ماننے والوں ہی میں نہیں بلکہ ہر مذہب کے ماننے والوں کے درمیان باہمی اختلاف بھی ہے مذہبی فرقوں کا تو ذکر ہی نہیں سیاسی نقطۂ نظر سے بھی اُن کے نظریئے

نہ صرف مختلف بلکہ متضاد ہیں کوئی حکومت پرستی پر
زور دیتا ہے۔ کوئی وطن پرستی پر۔ ایک جماعت قوت بازو
پر بھروسہ رکھنے پر زور دیتی ہے دوسری جماعت آئینی سعی کی آڑ میں
پناہ لیتی ہے۔ ایک جماعت کا خیال ہے کہ مختلف ملتوں کی
باہمی نااتفاقی کے باوجود اس ملک کو نجات مل سکتی ہے اور
دوسری جماعت کا یقین واثق ہے کہ ملک کا مفاد سب قوموں
کی یکجہتی، باہمی رواداری اور اتفاق و اتحاد اور مجموعی ترقی میں
مضمر ہے۔ بس اختلاف کے علاوہ طریق کار کا اسقدر شدید
اختلاف ہے کہ ہمکو مختصر طور پر بھی بیان کرنے کے لئے ایک
دوسرے مضمون کی ضرورت ہے۔ یہاں صرف یہ دکھانا
مقصود ہے کہ اختلاف کی کارفرمائی کس کس صورت میں
کہاں کہاں نظر آتی ہے۔

مذکورہ بالا امور اور مندرجہ بالا سطور سے یہ حقیقت
واضح ہوجاتی ہے کہ دنیا مجموعۂ اختلاف ہے یہ اختلاف بھی کوئی
جدید شے نہیں ہے بلکہ اسپر قدامت کی مہر لگی ہوئی ہے۔ بلکہ
یوں کہنا چاہئے کہ روز ازل سے یہ اختلاف چلا آتا ہے اور
قرائن اس امر کی تائید کرتے ہیں کہ یہ اختلاف ابدالآباد تک
یہی طرح قایم رہیگا۔ اب سوال یہ ہے کہ اس ہمہ جہتی اختلاف
کی فضا میں انسان کو رستہ کیونکر معلوم ہو اور وہ کس طرح
ایسی رائے قایم کرے کہ اسکی زندگی بہیئت مجموعی سکون
و اطمینان کی زندگی ہو۔ بس مسئلہ کے تصفیہ میں بھی اختلاف
کا امکان ہی نہیں بلکہ کافی گنجایش ہے۔ لیکن اگر مولانا
فضل الحسن صاحب حسرت موہانی کے اس مصرعے پر غور
کیا جائے جسکو راقم مضمون نے زیب عنوان قرار دیا ہے
تو یقین ہے کہ یہ مسئلہ ایک بڑی حد تک حل ہو سکتا ہے

اس مصرعے پر غور کرنے اور کسی نتیجے پر پہنچنے کے لئے اس
کے تجربے کی ضرورت ہے۔ اس مصرعے میں دو لفظ "ضمیر" اور
"عقل" قابل توجہ ہیں ضرورت صرف اسقدر ہے کہ ضمیر کی
روشنی اور عقل کے اجتہاد کو سمجھا جائے کیونکہ اسی پر اس
مسئلہ کے حل کا انحصار ہے۔

ضمیر ایک باطنی قوت کا نام ہے۔ حکمار کا قول ہے کہ
یہ قوت انسان میں قدرت کی طرف سے ودیعت کی
گئی ہے۔ اس کا فرض یہ ہے کہ انسان کو صراط مستقیم سے
نہ ہٹنے دے۔ ہمارے دل میں بہت سی خواہشیں پیدا ہوتی
ہیں۔ ہمارا نفس ہمکو بہت سے افعال کردنی و ناکردنی پر
آمادہ کرتا ہے۔ ہمارے دماغ میں بکثرت مناسب و غیر
مناسب خیالات آتے ہیں۔ یہ قوت دراصل انکے حسن و قبح
کو پرکھنے کا معیار ہے خدا جانے کیوں کسی اچھے کام اچھی
بات اور اچھے خیال پر ہمارا دل آپ ہی آپ مطمئن ہوجاتا
ہے۔ اور اسی طرح نہ معلوم کس لئے برے کام بری بات اور
برے خیال سے آپ ہی آپ اس سے پرہیز کرنے کی خواہش
پیدا ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ خواہ اپنی ضد، سخن پروری یا ذاتی منفعت
کیوجہ سے تاویل کرکے اپنے آپ کو کسیقدر اطمینان دلانے
کی سعی کیوں نہ کریں پھر بھی ایک کھٹکا سا دل میں ضرور باقی رہ
جاتا ہے جو ہماری حقیقی آسایش اور مسرت کو غم و رنج سے
بدل دیتا ہے۔ یہ قوت ہم کو راہ راست سے آگاہ کرتی
ہے اور افعال مضر اور شنیعہ پر ملامت کرتی ہے۔ اگر ہم
کوئی واقعی اچھا کام کرتے ہیں تو ہمیں مسرت اور تسکین بخشتی
ہے۔ برخلاف اس کے اگر ہم اسکی ہدایت سے روگردانی
کریں تو ہمارا دل غیر مطمئن اور ہمارے خیالات پراگندہ رہتے

ہیں۔ اس قوت کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ اسی وقت تک ہماری صحیح رہنمائی کرتی ہے جس وقت تک ہم اسکی رہنمائی سے فائدہ اٹھائیں اگر اس قوت کی آواز ہم نہ سنیں یا اسکی حکم عدولی کریں تو آہستہ آہستہ یہ کنارہ کش ہو جاتی ہے اور ہم فضائے تاریکی میں ڈگمگانے لگتے ہیں۔ اسمیں شک نہیں کہ یہ قوت اُن امور پر متنبہ نہیں کرتی جنکا ہمکو علم نہ ہو۔ اسلئے اسکو ترقی دینے کا ذریعہ یہ ہے کہ علم کا ذخیرہ وسیع کیا جائے تاکہ اسکی رہبری کا دائرہ بھی وسیع ہو جائے۔ اس حقیقت سے واقف ہو جانے کے بعد یہ نتیجہ نکلنا قدرتی ہے کہ اعمال و افعال دینی و دنیوی کے اختلاف میں اگر ہمیں کسی راہ کو سکونِ قلب کے ساتھ اختیار کرنے کی خواہش ہو تو ہم ضمیر کی رہبری کو تسلیم کریں۔ اور جن امور کی خوبی پر ہمارا ضمیر مطمئن ہو جائے اور کسی قسم کا شک و شبہ باقی نہ رہے انکو بلا تامل اختیار کر لیں۔ اور جن امور پر ہمارا ضمیر مطمئن نہ ہو اور کسی قسم کا شک یا بے اطمینانی باقی رہے اس سے بلا پس و پیش احتراز کریں۔ اگر ہم اس بات کے پابند ہو گئے تو اختلاف کی تاریکی میں راہِ راست معلوم کر لینے کے لئے "روشنی ضمیر" ہمارے لئے کافی ہوگی۔

دوسری شے جو اس اختلاف کی کشمکش میں ہماری رہنمائی کر سکتی ہے وہ عقل ہے۔ عقل کی کارفرمائی سے شاید ہی کوئی سلیم الفطرت انسان انکار کر سکے عقل ہی نے انسان کو جمیع مخلوقات پر ترجیح دی ہے اور یہی دنیوی وسائل و اسباب ترقی سمجھاتی ہے عقل ہی نے انسان کو خلافت الٰہی کا حقدار ٹھیرایا اور اسی کی بدولت بلا شرکت غیرے یہ تختِ خلافت پر قابض ہو گیا عقل ہی نے حیوانات جمادات اور نباتات اور دیگر مافوق العادۃ قوتوں پر اسکو فوقیت دی ہے اور آسایش دنیوی کی بیشمار راہیں اُس کے لئے کھولدی ہیں عقل ہی نے انسان کو کرہ ہوائی میں اڑایا ہے اسی نے سطح آب پر تیرایا ہے۔ اور اسی نے پہاڑوں کی سر بفلک چوٹیوں پر چڑھایا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ انسان کو حقیقی انسان بنانے والی شے عقل ہی ہے۔ عقل کیا ہے عقل ایک دماغی قوت کا نام ہے۔ تجربہ، مشاہدہ، تحقیق و تلاش، اور تجسس اور تفحص سے اسکی نشو و نما اور ترقی ہوتی ہے۔ ہم جسقدر ذاتی تجربوں ذاتی تحقیق اور غور و تامل کے بعد نتائج نکالکر عمل کرینگے اُسی قدر گویا ہم عقل سے کام لینگے۔ اگر ہم ان باتوں پر چلیں اور جس کا جی چاہے ہمیں جانوروں کی طرح ہنکائے تو یہ بات فقدانِ عقل کا نتیجہ ہوگی۔ ہم عقل سے کام لیکر کبھی گمراہ نہ ہونگے اور ہر قسم کے اختلافات میں عقل ایک مناسب نتیجہ نکال کر کسی فیصلے پر پہنچنے میں ہمیشہ ہماری مدد کریگی۔ عقل ہم کو آمادہ کریگی کہ ہم بذریعہ تجربہ و مشاہدہ اور مطالعہ کتب و اخبارات اپنی معلومات میں اضافہ کریں دنیا کی برائی بھلائی سے واقف ہوں اپنے اعمال و افعال کے نتائج سے قبل از وقت واقف ہو کر مفید مطلب بنا سکیں۔

عقل ہمکو سکھائیگی کہ اختلاف مذہب کے باوجود مذہبی اختلافات فضول ہیں۔ مذہب کسی حالت میں بیر رکھنا نہیں سکھاتا۔ ہر شخص اپنے مذہب کی صداقت کا قائل ہو کر ہی اس کا پیرو بنتا ہے۔ اور خواہ یہ پیروی آبائی دستور ہی پر مبنی کیوں نہو کوئی شخص مذہبی دل آزاری کو کسی حالت میں بھی پسند نہیں کر سکتا۔ ہمکو معلوم ہوگا کہ عیسٰی بدین خود و موسٰی بدین خود کے ہوتے ہوئے بھی انفرادی زندگی کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا

پھر کیوں نہ ہر شخص جو مذہب چاہے اختیار کرے؟ کیوں نہ وہ مخصوص معتقدات کا پابند ہو؟ اس کے جائز افعال و عبادات اور فرائض میں کیوں مداخلت کیجائے؟ جب یہ اختلافِ مذہب کسی طرح مٹ ہی نہیں سکتا تو کیوں نہ ہم باہمی رواداری اور تحمل پر عامل ہوں اور دوسرے مذاہب کی ایسی رسوم کو بھی ہم کیوں نہ برداشت کریں جو ہمارے اپنے معتقدات کے خلاف ہیں؟ ذاتی اغراض سے مذہبی تڑ کو آلۂ کار بنانے والوں کے فریب میں ہم نہ آئیں۔ اور خدا کی زمین کو اپنے ہم جنسوں کے خون سے لالہ زار بنانے سے احتراز کریں۔ یہ سب کچھ ممکن ہے بشرطیکہ ہم عقل سے کام لیں۔

عقل ہم کو سکھائیگی کہ اخلاقی زندگی کا تضاد ہی باعث نزاع نہ ہونا چاہئے۔ بعض اوقات یہ تضاد ہماری ناواقفیت پر مبنی ہوتا ہے اور بعض اوقات اثر آب ہوا اور رسم و رواج کا یہ تقاضا ہوتا ہے کہ کوئی مخصوص اخلاقی زندگی اس طرح ہو اخلاقی زندگی کو سمجھنے کی کوشش کرنے اور کشادہ دلی کے ساتھ اس کے عیب و صواب پر تبادلۂ خیالات کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن عقل کا مقتضا یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ ہم اس قسم کی بحث کو باہمی کشمکش کا ایک آلہ بنالیں۔

عقل ہمکو آمادہ کرے گی کہ ہم معاشرتی زندگی کے اختلاف کو بھی اپنی توجہ کا مرکز قرار دیں اور اس کے اسباب پر غور کریں۔ ہم کو برہنہ جسموں، ناصاف گلی کوچوں، اور تنگ مکانوں سے نفرت نہیں کرنی چاہئے۔ بلکہ یہ تمام چیزیں ہماری ہمدردی کی مستحق ہیں۔ ہمکو عقل کی مدد سے کہیں ان باتوں کا سبب عدم تعلیم، کہیں عدم تربیت، کہیں عدم دولت نظر آئیگا۔ ہم کو اعتراض و نفرت کی بجائے اپنے قویٰ کو انکی اصلاح اور درستی میں صرف کرنا چاہئے۔ حقارت کی بجائے محبت سے کام لیکر ایسی سوسائٹی کی مدد کو اپنا فرض خیال کرنا چاہئے۔

عقل سیاسی اختلاف میں ہماری رہنمائی کریگی۔ اور مختلف ممالک کے حالات اور ضروریات کا اقتضا دیکھکر اس ملک کے باشندوں کے طرزِ عمل کو تجویز کریگی۔ عقل آزاد اور غلام ممالک کی ذہنیت کو نمایاں کر دیگی۔ عقل قومی اور ملکی جماعتوں اور حقیقی اور غیر حقیقی۔ خود غرض اور بے غرض رہنماؤں کی حقیقت سے آگاہ کریگی۔ اور ان کی تقلید و پیروی کے جواز میں چند اصول وضع کر دیگی۔ عقل اس بات کو ثابت کر دیگی کہ اصلی قوت اور حقیقی آزادی افرادِ قوم کے عزمِ راسخ کا نام ہے۔ قوت اور آزادی ایسی مادی چیزیں نہیں جو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں یا ایک جیب سے دوسری جیب میں منتقل ہو جائیں۔ یہ قوم کے مشترکہ اعلیٰ خصائص کا نتیجہ ہوتی ہے۔ جب تک کسی قوم میں عزمِ راسخ، حصولِ آزادی کے لئے جذبۂ صادق، اور سعیِ کامل، مقتدایان اور رہنمایان قوم میں بے غرضی اور قوم کے مختلف فرقوں میں حقیقی اتحاد، رواداری اور باہمی اعتماد نہ ہوگا اسوقت تک انفرادی طور پر خواہ بعض ہمدردانِ قوم کسی قدر مصائب کیوں نہ برداشت کریں۔ قوت آزادی سے ہمکنار ہونا دشوار ہی نہیں بلکہ محال ہے۔

آیئے ہم اور آپ سب اپنے ضمیر کی روشنی میں عقل سے اجتہاد کرنا سیکھیں۔ نمائشی الفاظ ہمارے قلوب کو مسخر

نہ کرسکیں ۔ ہمارا مطلب اور خود غرض اپنی چکنی چپڑی باتوں سے
ہم کو راہ راست سے نہ بھٹکا دیں ۔ غرضیکہ مولوی اور پنڈت
اور صنعتی مفاد والے پیر، فقیر، بھگت، ہم کو زیرِ بحث پھنسائیں
ذاتی مفاد ۔ کی تکمیل کیلئے جاری کی ہوئی انجمنیں اور سبھائیں
اور نئے ظاہری دلکش اور دلفریب اغراض و مقاصد ہماری
عقل پر غلبہ نہ پائیں اور اشتہاری شہرت ناموری کے دیوانہ
ہم کو اپنے پنگل میں نہ پھنسالیں ۔ ہر عربی کی عبارت کو ہم
قرآن ۔ ۔ ۔ یت کا درجہ نہ دیں ۔ ہر سنسکرت کا جملہ ہماری نظر
میں وید اور گیتا کا رتبہ نہ پائے ۔ ہر تحریر و تقریر، ہر تصنیف و
تالیف اور ہر مضمون کو ہم غور سے پڑھیں ۔ اگر ہمارا ضمیر
واقعی مطمئن ہو جائے اور ہماری عقل بھی تائید کرے تو ہم کو
تسلیم کرلیں ورنہ اُسکو تسلیم کرنے سے قطعی طور پر انکار کردیں
اس طرح ہم

روشنی ضمیر میں عقل سے اجتہاد کرنیکی
عادت ڈالیں ۔ اگر ہم نے ایسا کیا تو یہ عادت ہماری اپنی
زندگی پر ایک مفید اثر ڈالیں گی اور ہم نہ صرف سوسائٹی
بلکہ قوم کے ایک مفید رکن متصور ہونے کے مستحق
ہوں گے فقط۔

فائدہ مند تجارت !

اگر آپ موسم سرما میں امریکن استعمال شدہ گرم کوٹوں
کی سر بند گانٹھیں یا ولائتی امریکن ۔ جاپانی کٹ پیس
کے لئے مال کے نمونہ کی گانٹھ مالیتی دو صد یا یکصد روپیہ
بغرض تجارت تھوک نرخ پر ہم سے منگوا کر فروخت کرینگے تو یقیناً
معقول فائدہ اٹھائیں گے ۔ ذاتی ضروریات کے لئے
پچاس روپیہ کا بنڈل منگائیے ۔ چہارم رقم ہمراہ آرڈر
بہرحال آنی چاہئے ، مفصل لسٹ طلب کرکے دوسروں
سے مال اور قیمت کا مقابلہ کریں ۔ اخبار کا حوالہ ضرور دیں

ایس رفیق بھائی جنرل سپلائرز
جیکب سرکل بمبئی

تجارت کرو اور فائدہ اٹھاؤ

گرم کوٹ و کٹ پیس فروخت کیجئے

سردی کی موسم آرہی ہے ۔ اگر آپ چند ماہ میں قلیل سرمایہ سے آسان تجارت
کرکے سال بھر کی روزی پیدا کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے امریکن سیکنڈ ہینڈ مستعمل
گرم کوٹوں کی سربند گانٹھیں منگوا کر تجارت کریں ۔ ہمارا مال امریکہ سے
خاص انتظام کے تحت عمدہ صاف آتا ہے قلیل منافع لیتے ، مال
ارزاں دیتے ہیں اور ملک بھر میں سپلائی کرتے ہیں۔

کٹ پیس

ہمارا امریکن ۔ ولایتی ۔ جاپانی کٹ پیس ہر جگہ مقبول ہو رہا ہے ۔ پردہ نشین
مستورات تک تجارت کرکے فائدہ اٹھا رہی ہیں ۔ خوشنودی اور پسندیدگی
کے خطوط موصول ہوئے ہیں ۔ دو صد روپیہ یا ایک صد روپیہ کی نمونہ کی
گانٹھیں بغرض تجارت منگوائیے ذاتی ضرورت کے لئے پچاس روپیہ
کا بنڈل منگوا لیجئے ۔ چہارم رقم ہمراہ آرڈر آنی چاہئے ۔ مفصل لسٹ
طلب کیجئے ۔ اخبار کا حوالہ دیجئے۔

امریکن کمرشیل کمپنی (گورنمنٹ سے رجسٹری شدہ)
بمبئی نمبر ۱۱



۵۷ء کی دکھیا

(گذشتہ سے پیوستہ)

تیرھواں باب
بارودخانہ کا اڑنا

ایلن ابھی اپنی بات اچھی طرح ختم بھی نہ کر چکی تھی کہ ایک نہایت زبردست دھماکے کی آواز ہمارے کانوں میں آئی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پہاڑ پھٹ پڑے اور زمین شق گئی ڈر کے مارے ہماری جان نکل گئی۔ اور مطلع غبار سے اٹ گیا اُف کیسی مہیب آواز تھی جس سے کانوں کے پردے پھٹ گئے اور کمریں دہری ہوگئیں۔ اس ہولناک آواز کے ہوتے ہی ہمارے سروں میں چکر آنے لگا۔ اور ہم لوگ گر پڑے اور ہمکو معلوم ہوگیا کہ بارودخانہ اڑ گیا۔ نہیں معلوم کتنی دیر ہم لوگ اسی حال میں پڑے رہے مگر جب میں ہوشیار ہوئی تو میں نے دیکھا کہ دھماکے کیوجہ سے چونا مٹی اور کنکریاں اسقدر چھت سے جھڑی ہیں کہ ہم لوگ انکے نیچے دبے پڑے ہیں۔ پھر رفتہ رفتہ ہمارے حواس بھی درست ہوئے تو ایلن زمین پر ابھی بدستور پڑی ہوئی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اسکا دم نکل چکا ہے ہم نے اسکو اٹھا کر چارپائی پر لٹایا اور ہماری آنکھوں سے آنسو جاری تھے کہ ذراسی دیر میں ہماری تمام مال و دولت برباد ہوگئی۔ لڑکا کھویا گیا اور لڑکی دم توڑ رہی ہے۔

مورخین نے ان لوگوں کے نام نہایت تفصیل اور عزت کے ساتھ لکھے ہیں جو بارودخانہ کے ساتھ قومی عزت و وقار کی حفاظت کرتے ہوئے اڑ گئے اسلئے مجھے انکے ناموں کی تفصیل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں میں تو صرف اسیقدر اس واقعہ کا ذکر کرتی ہوں جو مجھے ایک

عینی شاہد سے معلوم ہوا۔ اس شاہد نے کہا کہ جس روز
تم نے یہ زبردست دھماکا سنا تھا اس روز دہلی شورش
کنندگان کے زیر اثر تھی اور تمام انگریزی فوجیں جو سب
طرف سے گھر گھٹ کر کابلی دروازہ کے قریب شہریوں سے لڑ
رہی تھیں مغلوب ہو چکی تھیں۔ بہادر شاہ بادشاہ بن چکے
تھے مگر مار دھاڑ لوٹ کھسوٹ بدستور جاری تھی۔ یہ حالت
دیکھکر سب طرف سے جمع ہو کر بڑے بڑے افسران توپخانہ
کا حصہ اور پلٹن کی ایک ٹولی بارودخانہ میں جمع ہو گئے اور
قلعہ بندی کر لی اور یہ عہد کر لیا کہ آخر دم تک اس استحکام کی
حفاظت کریں گے اور خوشی سے اسے دشمن کے حوالہ نہ کرینگے
وہ لوگ ایک انگریزی ٹولی کی منتظر تھے اور اسی میں میرا
دل اماد ولیم بھی تھا۔ پھر انھوں نے آپس میں سے ایک
بوڑھے افسر کو اس مصیبت عظمیٰ کیلئے اپنا افسر منتخب کر لیا
اور زندگی سے مایوس ہو گئے۔

انگریزوں کو ہندوستان کے دوران اقامت میں
یہ تجربہ ہوا تھا کہ ہندوستانی ویسے تو بڑے دلیر اور بڑے
جری ہوتے ہیں۔ خوب دل کھولکر لڑتے ہیں۔ اور پہلا حملہ تو
اس زور سے کرتے ہیں کہ اگر دشمن اس کی تاب نہ لاسکا تو انکی
فتح بھی یقینی ہوتی ہے لیکن اگر کوئی قوی مانع انکے راستہ
میں حائل ہو جائے اور مقابلہ برابر کا آپڑے تو پھر انکا حملہ
سست پڑجاتا ہے اور پیش قدمی رُک جاتی ہے اس لئے
انگریزوں کا خیال تھا کہ اگر وہ بارودخانہ میں چوبیس گھنٹہ
قلعہ بند رہ سکے اور اس امر کی اطراف دہلی کی فوج اور افسروں
کو اطلاع ہو گئی تو وہ ہر چہار طرف سے دہلی پر چڑھ دوڑینگے
اور دہلی کو دشمنوں کے ہاتھوں میں نہ رہنے دینگے۔ تسلط
کے زمانہ میں ہندوستانیوں کی اطاعت و انقیاد اور
کامل امن وسکون کو دیکھتے ہوئے انگریزوں نے اسکی بھی کبھی کوئی
ضرورت محسوس نہیں کی کہ بارودخانہ کی شکست و ریخت
کی مرمت کرادی جائے عقلمند اور محتاط آدمی کیلئے تو یہی
مناسب ہے کہ وقتی حالات پر کبھی مطمئن نہ ہو۔ ارباب حکومت
امراء سلطنت اور افسران تجربہ کار کے لئے ضروری ہے کہ آیندہ
حالات کو ہمیشہ اپنے پیش نظر رکھیں اور پیش آسکنے والے
خطرات سے ایک لحظہ کے لئے بھی غافل نہ ہوں۔ بہت
سے بڑے بڑے حوادث اور عظیم لڑائیاں ایسی اچانک اور
دفعتاً ہو پڑتی ہیں جس کا شان وگمان بھی نہیں ہوتا اور پھر
انکے لیے بڑے بڑے نقصانات برداشت کرنے پڑتے
ہیں جنکی تلافی کسی طرح نہیں ہوسکتی۔ بارودخانہ کی مرمت
میں کوتاہی نے بعینہٖ یہی صورت دکھائی بہرحال ان لوگوں
نے چھ انچ دہانے کی دو توپیں مورچہ سے باہر نصب
کیں اور حکم دیدیا کہ جبتک کارتوس باقی رہیں مسلسل وہ سر
کیجاتی رہیں۔ اور جب کارتوس ختم ہو گئے تو دونوں توپوں
کو زمین میں کھونٹوں سے جڑ دیا اور خود بارودخانہ میں گھسکر
لڑنے لگے۔ اور یہ فیصلہ کر لیا کہ اگر یہ دیکھا جائے کہ دشمن اب
بارودخانہ پر قابض ہی ہوا چاہتا ہے تو بارود کو اڑا دیا جائے
تاکہ دشمن اس سے فائدہ نہ اٹھا سکے اسلئے انھوں نے بارودخانے
سے لیکر وہاں تک جہاں یہ سب لوگ جمع تھے بارود کی
ایک لکیر ڈالدی اور سرلشکر بوڑھے افسر نے اپنے ہاتھ
میں ایک جلتا ہوا فتیلہ لے لیا اور لکیر کے سرے پر کھڑا
ہو گیا کہ ضرورت پڑتے ہی وہ فوراً اسکو بتی دکھادے۔ یہ
لوگ اپنی ان تیاریوں میں تھے کہ بہادر شاہ سلطان دہلی

کا ایک خاص آدمی ان لوگوں کے پاس آیا اور اس نے کہا کہ اگر آپ لوگ بارودخانہ کو خالی کر کے اپنے آپ کو حوالہ کر دینگے تو آپ کو امن دیجائے گی۔ بوڑھے افسر نے بادشاہ کے قاصد کو اسپر بہت بُرا بھلا کہا کہ وہ فوراً واپس ہوگیا اسکے واپس ہوتے ہوئے ان لوگوں نے اپنا قومی نعرہ لگایا کہ ملکہ وکٹوریا زندہ باد دولت انگلستان زندہ باد بادشاہ کو جب ان لوگوں کی طرف سے مایوسی ہوگئی تو انہوں نے فوج کو حکم دیا کہ پے درپے حملے کئے جائیں چاروں طرف سے حملہ شروع ہوگیا کچھ لوگ احاطہ کے اندر بھی گھس آئے دونوں توپیں ان کے حملہ کو کسی طرح نہ روک سکیں۔ دست بدست لڑائی تک نوبت پہونچ گئی۔ انگریزوں نے جب دیکھا کہ اب وہ کسی طرح مقابلہ نہیں کرسکتے تو ایک دوسرے کو رخصت کرنے لگا اور بوڑھے افسر نے بارود کی لکیر کو فتیلہ دکھا دیا تمام بارودخانہ اڑگیا اسکی دیواریں وغیرہ پاش پاش ہوگئیں اور جتنے لوگ اس میں پناہ گزیں تھے انکا ساتھ ان کا بھی پتہ نہ چلا کہ کہاں گئے صرف دو شخص بچ رہے جنکا بچ رہنا بھی معجزے سے کم نہیں۔

دوپہر کو محمد فیلبان پھر آیا۔ ہاتھی بھی اسقدر مشقت سے چور ہو رہا تھا۔ ہم لوگ سخت بھوکے ہو رہے تھے اُسے دیکھتے ہی ہماری باچھیں کھل گئیں اور کھڑے ہو کر ہاتھوں ہاتھ ہمنے اسکو لیا۔ مگر آہ کہ یہ خوشی طرفۃ العین سے زیادہ دیر پا نہوئی کیونکہ اس کے پاس کھانے کا کوئی سامان نہ تھا ہماری تمام خوشی خاک میں مل گئی۔ اور اسکے چہرہ پر ہمکو گھبراہٹ اور پریشانی کے آثار نظر آئے اس سے انہوں نے پوچھا بھی کہ اب کیا حال ہے؟ بارودخانہ کے متعلق تمکو کچھ معلوم ہے

مگر اُس نے کوئی جواب نہیں دیا مگر وہ تختوں اور کرسیوں کے قریب گیا ایک دو کو توڑ ڈالا اور اُن پر دریاں اور بوریئے ڈالدیئے اور ہم سے کہا کہ فوراً بلا کسی حیص بیص اور تاخیر کے ان کے نیچے چھپ جاؤ۔ ہم لوگ چھُپ جانے کے لئے تیار ہوگئے مگر محمد کھڑکی کے پاس جاکر آہٹ لینے لگا۔ پھر اُس نے کہا جلدی کرو جلدی کرو لوگ گھسا ہی چاہتے ہیں۔ ایلن برابر کراہ رہی تھی اور بار بار بارودخانہ کا نام لے رہی تھی اسلیئے میں نے اُس کا منہ زبردستی بند کیا اور ہم سب تختوں کے نیچے چھپ گئے۔ تخت زمین سے بالشت بھر اونچے ہونگے اسلیئے ہم لوگ پیٹ کے بل انکے نیچے لیٹ گئے اور محمد نے کمرہ کا تمام ساز و سامان اسکے اوپر لادیا تاکہ مفسدوں کو اُسے دیکھکر ہمارے نیچے ہونے کا خیال نہ آسکے۔ پلک جھپکاتے شورش کنندگان بھی اس کمرہ میں گھس آئے اور ہم لوگوں کو انکے ہتھیاروں کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دینے لگی۔ وہ لوگ زور زور سے کہہ رہے کہ انگریزوں کو چھوڑ دینا حرام ہے۔ ان لوگوں نے جب کمرہ کو خالی پایا تو بہت چپ ہوئے انکو چپ دیکھکر محمد اُن سے کہہ رہا تھا آپنے میرا کہنا نہ مانا ورنہ اس پریشانی سے بچ جاتے میں تو کہہ رہا تھا کہ خبیث انگریزوں میں سے ایک فرد بھی یہاں موجود نہیں ہے مگر آپنے خیال کیا کہ اس میں میری کوئی چال ہے اور میری بات کو صحیح نہیں سمجھا۔ کیا اب بھی آپ کو میرے مسلمان ہونے میں شک ہے۔ میں نے تو جو کچھ کیا تھا صدق عقیدت کیساتھ کیا۔ اور کیا اچھا ہوتا اگر وہ ہمکو مل جاتے اور میں بھی آپکے ساتھ انکے قتل میں شریک ہوتا۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ نے یہاں خود دیکھ لیا ہے کہ میری بات سچ تھی اور مجھے امید ہے

کہ آیندہ آپ کو مسلمانوں ہند کی طرف سے یہ اطمینان ہو جا سکتا کہ دیگر مذاہب والوں کی طرح وہ کذب و فریب کی بات زبان سے نہیں نکالتے اور خاصکر تم تو کبھی جھوٹی نہیں کھاتے اور اگر کسی وقت کسی مصلحت سے وہ جھوٹ بول بھی دیتے ہیں تو خطرہ کے وقت کبھی جھوٹ نہیں بولتے۔

محمد کو کوئی شخص نہ ملازم کہہ سکتا ہے اور نہ اسکو بدنام کر سکتا ہے۔ وہ بالکل سچا اور اسکی قسم بالکل درست تھی کیونکہ ہم لوگ پوشیدہ تھے اور ہم کو کوئی دیکھ نہیں رہا تھا مگر مفسدوں کو پھر بھی اسکی بات پر اعتبار نہیں ہوا اور انہوں نے تلواریں سونت کر بندوق کے سنگینوں سے ساحلی چونگی کے کارکنوں کی طرح ہر چیز کو ٹٹولنا شروع کیا اس تلاش میں میری کلائی میں تلوار کی نوک لگ گئی جس سے ذرا سی کھال چھل گئی مگر میں نے خوف کے مارے دم نہیں مارا۔ محمد کو شریروں کی اس حرکت سے بڑی فکر ہوئی کہ مبادا کسی کی آواز نکل جائے اسلئے اس نے چلا کر کہا کہ لینا یہ کتے صحن میں ابھی مجکو معلوم ہوئے ہیں۔ یہ سنتے ہی وہ سب اُس طرف کو دوڑ پڑے اور محمد بھی انکے پیچھے ہو گیا جاتے ہوئے اس نے دروازہ بند کر دیا۔ اور وہ کہتا جا رہا کہ ہاں ذرا ہوشیار! خبردار جانے نہ پائیں تاکہ انہیں قتل کر کے ذرا جی کو ٹھنڈک تو پہونچے۔ غرض کہ اس بہانہ اُس نے ان سب کو گھر سے نکالا۔ پھر واپس آکر اس نے ہم کو اس دقتی محبس سے نکالا۔

چودھواں باب
بھوک

:۔جب ذرا اطمینان اور سکون ہوا تو بھوک نے پھر غلبہ کیا۔ محمد سے ہم لوگوں نے کہا کہ شورش و فساد کی مصیبتوں سے تو خدا نے نجات دی مگر اب بھوک ہلاک کر دیگی کیونکہ بھوک کے مارے آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی ہیں اور ہم لوگوں کا بُرا حال ہو رہا ہے۔ اگر تم کوئی سالن نہیں لا سکتے ہو تو ذرا سے چاول ہی لے آؤ ہمارا تو دم نکلا جا رہا ہے۔ محمد نے کہا کہ رات کے اندھیرے سے پہلے میں آپکے لئے کھانے کا کوئی بندوبست نہیں کر سکتا۔ محکمہ خفیہ کے پاس آج صبح سے دو مرتبہ طلب کیا جا چکا ہوں بڑی سختی سے مجھ سے دریافت کیا گیا کہ تیرے وہ آقا کیا ہوئے جن کے پاس تو ملازم تھا اور اگر تم نے صحیح صحیح نہ بتایا تو پھانسی دیدی جائے گی۔ میں نے جواب دیا کہ مجھے انکی جائے پناہ کا کوئی علم نہیں۔ شورش کی ابتدا میں دہلی دروازہ تک میں انکے ساتھ تھا پھر وہاں سے میں اُن سے علیحدہ ہو گیا اور اب مجھے بالکل نہیں معلوم کہ وہ زندہ بھی ہیں یا مر چکے ہیں۔ بادشاہ کی طرف سے یہ منادی کرا دی گئی ہے کہ شہر کا گلی کوچہ اور چپہ چپہ تلاش کیا جائے اور کوئی آباد وغیر آباد گھر یا جنگل اور باغ ایسا نہ چھوڑا جائے جہاں تلاش و جستجو نہ کی جائے۔ اور جہاں کہیں کوئی انگریز مرد عورت بوڑھا بچہ ملے فوراً قتل کر دیا جائے اور اس کا سر حاضر خدمت کیا جائے جس کا انعام مل جائیگا۔ مرد کے سر کا تین سو روپیہ عورتوں کے سر کا ڈھائی سو روپے اور بچوں کے سر کا دو سو روپیہ انعام ہے۔

اس خبر کو سنکر ہم لوگوں کو خوف معلوم ہوا۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور بدن پر رعشہ پڑ گیا۔ محمد کو ہماری یہ حالت دیکھکر افسوس ہوا اسلئے ہماری تسکین کے خیال

سے ہی نے کہا کہ آپ لوگ مایوس نہ ہوں ہندوستانی دہلی پر گو قابض ہو گئے ہیں اور تمام دہلی کے انگریزوں کو قتل بھی کر دیا ہے مگر بقیہ فوج پر کسی طرح تسلط حاصل نہ کر سکیں گے۔ اور یہ بالکل یقینی ہے کہ انگریز مجتمع ہو کر دہلی پر دوبارہ ضرور داخل ہونگے اور خوب دل کھولکر بدلا لیں گے۔ اور اس طرف سے آپ بالکل مطمئن رہیں کہ میں جب تک زندہ ہوں آپ لوگوں کو چھوڑوں گا نہیں۔ صاحب خانہ علی میرا دوست ہے اسکو معلوم ہے کہ آپ لوگ اس گھر میں موجود ہیں لیکن وہ حسب وعدہ اس چیز کو ظاہر کرنا بھی نہیں چاہتا اور بظاہر اپنے آپکو وہ ناواقف بنائے ہوئے ہے۔ آپ کی خاطر مدارات اسکے نزدیک انسانی فرض ہے۔ آج صبح میری اس سے ملاقات ہوئی تھی تو اس نے کہا تھا کہ میں نے آپس کے تعلقات و مراسم کی بنا پر تمہارے دوستوں کو اتنک اپنے مکان میں پوشیدہ رکھا اور اڑتالیس گھنٹے تک ٹھیرنے کی اجازت دیدی لیکن اس سے زیادہ میں انکو نہیں ٹھیرا سکتا اسلئے اب تم ان کے واسطے کوئی اور ٹھکانا تلاش کر لو۔ لیکن میں آپ کو اطمینان دلاتا ہوں کہ آپ کچھ پریشان نہوں مجکو قوی امید ہے کہ انشاء اللہ میں آپکے لئے اس سے زیادہ قابل اطمینان جگہ تلاش کر سکوں گا۔ اس گفتگو کے بعد محمد چلا گیا دن غروب ہوتے آ گیا اور اندھیرا چھانے لگا۔ مگر ہماری پریشانی و بےچینی کی کوئی حد و حساب نہ تھا۔

ایلن صبح سے اتنک بےحس و حرکت ساکت و صامت پڑی ہوئی مگر زبان سے کمزور اور ضعیف کراہ میں یہ آواز کبھی کبھی نکلتی تھی "بارود خانہ اڑ گیا" لڑکا نیند میں مستغرق تھا اور وہ دونوں زخمی بخار کیوجہ سے کراہ رہی تھیں میں اور وہ بڑی بری حالت میں تھے۔ وہ کمرہ میں برابر چہل قدمی کر رہے تھے اور شاید وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ اطمینان اور فارغ البالی کے زمانہ میں یہ حرکت جس طرح بھوک لگنے کا باعث ہوتی تھی آج اس کور بختی اور تیرہ روزی کے عالم میں شاید یہ بھوک کو روک دے۔

میں اُن کی طرح فلسفی نہ تھی پھر میرا پیٹ غذا سے اور دماغ خیالات سے خالی تھا اسلئے کبھی میں لیٹتی تھی اور کبھی سونے کا ارادہ کرتی تھی اور ویل کو یاد کرکے اس کے کھو جانے پر افسوس کرتی تھی مگر بھوک نے میرے حواس بھی بیکار کر دیئے تھے ویل کے خط و خال اور صورت شکل میرے دماغ سے محو ہو گئی تھی اور کتنا ہی میں اسکا تصور کرنا چاہتی تھی مگر دماغ ساتھ نہ دیتا تھا۔ سچ ہے انسان کی قوتیں اور خصلتیں ایک خاص حد تک اس کا ساتھ دیتی ہیں یعنی جب تک اسکی حوائج ضروریہ پوری ہوتی رہتی ہیں اور اگر کبھی اسکو کوئی مصیبت اور تکلیف پیش آ جاتی ہے تو پھر اسکے حواس باطنی ماند ہو جاتے ہیں اور اس سے وہ وہ کم مائیگی اور تنگ ظرفی کی حرکات سرزد ہوتی ہیں کہ جیسے وہ کوئی اور ہی شخصیت ہے۔ اگر ایک دن غذا نہ ملے یا رات کو سونا نہ ہو سکے تو بیوی بچوں اور رشتہ کنبہ کو بھی بھول جاتا ہے اور یہ لوگ اسکے لئے شادمانی و مسرت کا ذریعہ ہونے کی بجائے وبال و پریشانی کا باعث بن جاتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ مرتے وقت آدمی روتا ہے اور ان کے نزدیک اسکا یہ رونا اسلئے ہوتا ہے کہ احباب اور دنیاوی تعلقات سے علیحدہ ہو رہا ہے مگر میرے نزدیک لوگوں کا یہ خیال صحیح نہیں ہے گو کوئی واپس آ کر یہ نہیں بتاتا کہ مرتے وقت کیا کچھ گذرتی ہے اور اسوقت کا رونا

دھونا کیوں ہوتا ہے تا وقتیکہ میرا عقیدہ یہ ہے کہ انسان کا مرتے وقت رونا اسلئے نہیں ہوتا کہ اسکے نفسانی تعلقات منقطع ہو رہے ہیں بلکہ وہ اسلئے روتا ہوتا ہے کہ وہ اس نورانی دنیا سے جدا ہوکر ظلمانی عالم میں جا رہا ہے جہاں کی اُسے کچھ خبر نہیں ہوتی اور اسے کچھ نہیں معلوم کہ وہاں اس پر کیا بیتنے والا ہے۔

مجھے ایسا خیال پڑتا ہے کہ اسوقت میں اپنی جگہ سے اٹھی اور زنجیر کھولکر بیہوش ہوکر گر پڑی میرا خیال ہے کہ شاید میں نے اٹھنے کا ارادہ کیا تھا مگر میرے پاؤں تھرانے لگے اور سر میں چکر آگیا اور میں گر پڑی میری یہ حالت دیکھکر وہ میرے پاس آکر بیٹھ گئے اور میرا سر اپنے گھٹنے پر رکھکر حسرت و یاس سے مجھے دیکھنے لگے اور آنکھوں سے قطرات اشک جاری تھے انکے آنسو میرے چہرہ پر پڑے تو کچھ دیر بعد مجھے ہوش آگیا۔ بھوک کا بدستور وہی عالم تھا مگر انکی اس ہمدردی سے ذرا دل قوی ہوگیا۔ مجھے ہوش میں دیکھکر زور سے محمد کو پکار کر کہا کہ تم کہاں ہو آتے کیوں نہیں؟ پھر اپنے دونوں جیبوں سے مٹھی بھر کر کچھ روپیہ اپنے ہاتھ میں نکال لئے اور کھڑے ہوکر کمرہ میں ٹہلنے لگے۔ انکی ایسی بے کسی اور بے بسی کی حالت ہو رہی تھی جیسے بھوکا معذور شیر کہ نہ اسکے پاس کچھ کھانے کو ہے اور نہ اپنی جھاڑی سے باہر نکل کر شکار کر سکتا ہے۔ ٹہلتے ہوئے وہ یہ کہتے جا رہے تھے کہ اگر کوئی مٹھی بھر چاول مجھکو لادے تو میں اسکو یہ سب روپیہ دیدوں۔ لیکن مجبور ہوکر دروازہ کھولا اور صحن میں چلے گئے۔ . . . . میں نے آواز بھی دی کہ کہاں جاتے ہو اور میں نے چاہا بھی کہ جاکر باہر جانے سے روکوں مگر ضعف کیوجہ سے میں کھڑی ہوتے ہی گر پڑی۔ زیادہ سے زیادہ وہ چھ منٹ باہر رہے ہونگے مگر مجکو یہ چھ منٹ چھ سال معلوم ہوئے جب وہ واپس آئے تو کچھ ہندوستانی پھل انکے دامن میں تھے جو مجھے دیئے اور کہا کہ لو انہیں کھاؤ اسلئے بھی کچھ نہ کچھ ضرور تسکین ہوگی۔ مگر حقیقتاً صرف میں اس ضیافت کی مستحق نہ تھی دوسرے بھی مستحق تھے چنانچہ میں نے دونوں زخمیوں کو بلایا اور وہ آگئیں مگر ایلن نے کچھ کھانا گوارا نہ کیا۔ بچہ سو رہا تھا اس کا حصہ نکال کر الگ رکھ دیا اور اپنا اپنا حصہ کھاکر خدا کا شکر کیا۔ رات اسی طرح گذاری یہاں تک صبح ہوگئی مگر محمد آج اپنے وقت پر نہیں آیا۔

محمد کیوں نہیں آیا؟ کہاں رہ گیا؟ قید ہوگیا یا ہماری وجہ سے کوئی اور واقعہ پیش آگیا؟ یا کیا ایسی بات ہوگئی جس نے اسے روک دیا؟ غرض اسی قسم کے وساوس و توہمات دن بھر آتے رہے اور جوں جوں دیر ہوتی گئی بڑھتے گئے حتی کہ اندھیرا ہوگیا رات ہوگئی تو وہ پھر باہر گئے اور بہت سے پھل اور کسیقدر غلہ لائے۔ ہم نے کھائے اور بھوک کو تسلی دی لیکن اس لڑکے نے پھل کھانے سے انکار کر دیا بلکہ چاول مانگے۔ میں نے کہا اچھا کل چاول دینگے یہ سنکر وہ چپ ہوگیا اور پھر سو گیا۔ کھانا کھاکر وہ بھی سو گئے اور وہ دونوں عورتیں بھی سو گئیں میں نے بھی سونا چاہا مگر مجھے کسی طرح نیند نہ آئی۔ کروٹیں بدلتی رہی۔ ایلن بھی بار بار کروٹیں بدلتی تھی جس سے معلوم ہوا کہ میری طرح وہ بھی جاگ رہی ہو۔

میں اور ایلن خیالات سے مستغرق تھے وہ موجودہ حالت میں مستغرق تھی اور میں یہ سوچ رہی تھی کہ دیکھئے کیا ہوتا ہے اور اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے؟ اپنے دل میں یہ خیال کرتی تھی کہ انگریزوں نے دہلی فتح کر لی۔ سابق انتظام

بحال ہوگیا۔ ہملوگ اپنے گھر کی مرمت اور اسکی آبادی کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔ ولیم کو بہادری و دلاوری کیوجہ سے انعامات اور تمغہ جات ملے ہیں۔ ایلن کی رخصت بڑے دھوم دھام سے ہوگئی ہے۔ میں ایلن ویل اور ان کے ابا کسی انگریزی جہاز میں سوار ہوکر لندن جانے کو تیار ہیں۔ وہاں پہونچکر ارادہ ہے کہ ویل کو کسی ابتدائی اسکول میں داخل کرادیں گے اور وہاں سے فراغت کے بعد کسی فنی کالج میں داخل کردینگے کہ وہ کوئی صنعت سیکھے۔ غرض کہ یہ اور اسی طرح کے سپادنس میں پھنسی ہوئی تھی اور اسی میں رات بھیگ گئی۔

میں اسی طرح اپنے خیالات میں مستغرق تھی کہ صحن میں سے ایک بہت ہلکی سی آواز سنائی دی کان لگایا تو معلوم ہوا کہ دروازہ سے آرہی ہے مگر جواب دینے کی میری ہمت نہیں پڑی۔ دوبارہ پھر دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز معلوم ہوئی پھر تھوڑی دیر کے بعد معلوم ہوا کہ دروازہ کھولا گیا۔ آہٹ بقدر صاف تھی کہ آنے والوں کی تعداد کا اندازہ آسانی سے ہوسکتا تھا۔ آتے آتے وہ لوگ ہماری کوٹھری سے قریب آگئے اور اسکے کواڑ آہستہ سے کھٹکھٹائے۔ میں نے کہا کہ اب کیا کرنا چاہئے۔ انہوں نے کہا کواڑ ضرور کھولنا چاہئے کیونکہ اگر یہ لوگ مخالفین میں سے ہوتے تو اسقدر پوشیدہ طور پر آنے کی انکو کیا ضرورت تھی۔ دروازہ کھولدیا۔ دیکھا تو دو ہندوستانی عورتیں ہیں سر سے پاؤں تک سفید برقع میں چھپی ہوئی ہیں۔ دونوں اندر آگئیں۔ ایک سطکمرہ میں آکر بیٹھ گئی اور بغل میں سے پٹاری نکالکر اسمیں سے ایک برقع نکالکر ہمکو دیا اور کہا کہ لو یہ برقع پہن لو اور ہمارے ساتھ چلو۔ انہوں نے

کہا کہ کہاں چلیں تو اس نے کہا جہاں محمد فیلبان تمہارا منتظر ہے۔ محمد کا نام سنتے ہی ہماری سب پریشانی دور ہوگئی اور جھٹ پٹ برقع اوڑھکر ہم ان کے پیچھے ہوگئے۔ چلتے چلتے وسط دہلی کی سب سے بڑی سڑک پر پہونچ گئے۔ سڑک پر پہونچکر معلوم ہوا کہ اسکی زمین پر اسقدر خون بہا پڑا ہے کہ کتنے ہی جھکڑ چلیں اسکا ایک ذرہ بھی اڑ نہیں سکتا۔ تمام راستہ گدھ اور کوّے لاشوں پر جٹے ہوئے تھے، احشا و امعا کو نوچ کر کھا رہے تھے۔ کتوں کا یہ حال تھا کہ لاشوں کی کثرت کی وجہ سے آپس کی لڑائی بالکل بھول گئے تھے آپس کی غرفش کا کہیں پتہ بھی نہ تھا بڑے اطمینان اور فراخ دلی سے لاشوں کی تقسیم میں مشغول تھے۔ ہر طرف انگریزوں کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں جنکا نہ کوئی خبرگیراں تھا نہ کفن دفن کی فکر کرنے والا تھا۔

ہم لوگ اسی طرح چلتے رہے کہ صبح کے آثار نمودار ہوگئے اور ہندوستانی لوگ نماز پڑھنے اور پوجا پاٹ کرنے کے لئے گھروں میں سے نکلنے لگے۔ ہندو مسلمان سب جمنا پر نہانے جارہے تھے اور ہماری طرف اسلئے کوئی متوجہ نہ ہوتا تھا۔ کہ فرائض سے فارغ ہوکر از سر نو ہتھیار باندھیں، مکانات، معابد اور ہر ممکن جگہ تلاش کرکے جو کوئی انگریز مل جائے اسکو قتل کردیں۔

گل چلا جاسوس

جون کا مہینہ تھا، اور شام کی ہلکی ہلکی شفق آہستہ آہستہ رات کی تاریکی میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی۔ شہر ڈبلن پر ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا اور چاند کی اس زردی مائل ہلکی روشنی کے سوائے کہ جو بدقت و دشواری روئی کے گالے جیسے بادلوں میں سے چھن چھن کر زمین پر اور دریائے لفی کی خاموش سطح پر پڑ رہی تھی اور کہیں روشنی کا کوئی نشان نہ تھا۔ اس ہلکی ہلکی روشنی کی وجہ سے بالکل ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ صبح کا سہانا سماں ہے اور آفتاب بس اب نکلنے ہی والا ہے۔

تمام شہر پر کامل خاموشی طاری تھی، اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد توپوں کی گرج، اور بندوقوں اور مشین گنوں کے فیروں کی آوازیں بالکل اس طرح سنائی دیتی تھیں کہ جیسے رات کے سناٹے میں چوکیداروں کی "جاگتے رہو" کی بھیانک آواز آیا کرتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ جمہوریت پسندوں اور شاہی طرفداروں میں باہم خانہ جنگی ہو رہی تھی اور دونوں طرف کے جانباز ایک قوم اور ایک ملک کے افراد ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے تھے اور جان دینے اور جان لینے پر تلے ہوئے تھے۔

روڈ کانیل کے پل کے قریب جمہوریت پسندوں کی فوج کا ایک جاسوس ایک مکان کی چھت پر چھپا بیٹھا تھا۔ اسکی بندوق اسکے پاس رکھی ہوئی تھی اور گلے میں دوربین ایک فیتے کے ذریعہ سے لٹک رہی تھی، چہرہ کسی قدر ستا ہوا سا تھا لیکن پھر بھی پہلے آدمیوں کا سا معلوم ہوتا تھا اسکی آنکھیں بالکل اس طرح چمک رہی تھیں کہ جیسے دیوانوں کی آنکھیں چمکنے لگتی ہیں۔ خاموشی، سکون دل، عزم اور استقلال ان میں کوٹ کوٹ کر بھر دیا گیا تھا، اور بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ رات دن موت کے خوفناک نظارے دیکھنے کا عادی ہے۔

اسے تمام دن فاقے سے گذر چکا تھا اور اب بھوک سے بیتاب ہو کر اس نے جھولے میں سے بسکٹ نکال کر کنگلوں اور کال کے مارے ہوؤں کی طرح سے چبانا شروع کیا۔ بسکٹ ختم کر کے اس نے شراب کی بوتل نکالی اور اسکا ایک گھونٹ پیا۔ اس طرح جب ذرا ہوش و حواس درست ہوئے تو اب اسے سگریٹ کی یاد آئی اور اس خوف سے کہ مبادا دیا سلائی کی روشنی کسی دشمن کو نظر آ جائے اس نے بہت دیر تک اس خواہش کو ٹالا، سگریٹ سلگانے میں جان کا خطرہ تھا لیکن بالآخر تمباکو کی طلب غالب آئی اور اس نے سگریٹ منہ میں دبا کر دیا سلائی جلا ہی لی۔ سگریٹ بمشکل سلگنے پایا تھا کہ ایک گولی آ کر اسکے سامنے کی منڈیر میں لگی۔ دیا سلائی پر پھونک مار کر اس نے جلدی جلدی سگریٹ کی دو یا تین کش لئے اور اسے بھی بجھا دیا اور لیٹے لیٹے گھسٹ کر بائیں جانب کو ہٹ گیا۔

یہاں سے پھر اس نے بڑی احتیاط کے ساتھ اپنا سر ذرا اونچا کیا اور منڈیر کے اوپر سے جھانکا، اسے معاً بندوق کے فیر کا شعلہ نظر آیا اور ساتھ ہی ساتھ ایک گولی، اسکے سر کے برابر سے ایک خوفناک زناٹے کے ساتھ نکل گئی

شعلہ اسے نظر آگیا تھا اور وہ اتنا سمجھ گیا تھا کہ گولی سڑک کے پار سامنے والے مکان کی چھت سے آئی تھی۔

جس چھت پر وہ چھپا ہوا تھا اسکے بیچوں بیچ میں دودکش بنا ہوا تھا اور یہ سوچ کر کہ اس کی آڑ زیادہ مناسب ہے گی وہ رینگتا رینگتا اسکے قریب پہونچا اور اسکی آڑ لیلی۔ اب اس دودکش کی آڑ میں کھڑے ہوکر اسنے سامنے والی چھت پر نگاہ ڈالی مگر کچھ بھی نظر نہ آیا۔ اس کا دشمن بھی ضرور کسی چیز کی آڑ میں پوشیدہ تھا۔

یہ اس طرح ابھی نظر جما جما کر اپنے دشمن کو دیکھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ اتنے میں ایک مسلح موٹر کار رتوکا نل کے پل کو عبور کرکے آئی، اور انہی مکانوں کی طرف آتے آتے اسکے مکان سے کوئی پچاس قدم کے فاصلہ پر مقابل کی سمت میں سڑک پر رک گئی۔ موٹر کا انجن دھک دھک کر رہا تھا اور اسی کے ساتھ اس جاسوس کا دل۔ موٹر دشمنوں کی تھی اور اسکا دل بے اختیار ہو رہا تھا کہ کسی طرح اس پر فیر کرے۔ لیکن اسے معلوم تھا کہ ایسا کرنا انتہائی حماقت ہوگی کیونکہ موٹر پر لوہے کی چادر چڑھی ہوئی تھی اور اسکی گولی کسی طرح بھی اس چادر کے پار نہیں جاسکتی۔

اتنے میں موٹر کے برابر والی گلی میں سے ایک بڑھیا سر پر ایک پھٹی پرانی سی شال ڈالے ہوئے نکلی اور موٹر میں جو آدمی بیٹھا تھا اس سے باتیں کرنے لگی۔ باتیں کرتے کرتے اس نے اسی چھت کی طرف اشارہ کیا کہ جس پر یہ جاسوس چھپا ہوا تھا عورت مخبر تھی اور دشمنوں کو اسکی موجودگی کا پتہ دے رہی تھی۔

موٹر کی کھڑکی آہستگی کے ساتھ کھلی۔ ایک آدمی کا سر اور کندھے باہر کو نکلے اور اس شخص نے اسی جاسوس کی طرف کو دیکھنا شروع کیا۔ اب جاسوس سے ضبط نہ ہو سکا آہستہ سے اس نے اپنی بندوق اٹھاکر کندھے سے لگائی اور فیر کر دیا۔ گولی ٹھیک نشانے پر لگی۔ کھڑکی سے باہر نکلا ہوا سر نیچے کو جھکا اور دھڑ کھڑکی کی دیوار پر لٹک گیا۔ عورت اپنی جان لیکر گلی کی طرف بھاگی لیکن جاسوس نے ایک فیر اور کیا اور وہ عورت بھی چکر کھاکر نالی میں گر پڑی۔

اس عرصہ میں سامنے کی چھت سے بھی ایک فیر ہوا اور ایک آہ کے ساتھ بندوق جاسوس کے ہاتھ سے گر پڑی ہمت کرکے وہ بندوق اٹھانے کے لئے جھکا، لیکن وہ اس سے نہ اٹھ سکی اسکا ہاتھ بیکار ہو گیا تھا۔

"ہائے اب کیا ہوگا! میں تو زخمی ہو گیا" اس نے کسی قدر آواز سے کہا۔

آہستہ سے زمین پر گر کر وہ پھر رینگتا رینگتا اپنے اسی منڈیر کے پاس پہونچا اور اب اس نے اپنے بائیں ہاتھ سے دہنے ہاتھ کو جو زخمی ہوا تھا ٹٹولنا شروع کیا۔ خون برابر برس رہا تھا، اور اسکے کوٹ کی آستین تمام تر ہو چکی تھی۔ اس کے ہاتھ میں درد نہ تھا، البتہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے ہاتھ کا فالج ہو گیا ہو، یا یہ کہ ہاتھ جسم سے بالکل الگ کر دیا گیا ہو۔

اسنے اپنی جیب سے اپنا چاقو نکالا، اور منڈیر کے کنارے میں اسکی نوک اٹکاکر اسے کھولا، اور پھر اس سے کوٹ کی آستین پھاڑ ڈالی جس جگہ گولی لگی تھی وہاں ایک چھوٹا سا سوراخ موجود تھا۔ ہاتھ کے دوسری طرف کوئی سوراخ نہ تھا گولی پار نہیں ہوئی تھی بلکہ کلائی ہی میں موجود تھی۔ اس نے خیال کیا کہ ہڈی ضرور چورا چورا ہو گئی ہوگی۔ زخم سے ذرا نیچے کلائی کو پکڑ کر اس نے پیچھے کی طرف موڑا۔ وہ بہ آسانی مڑ گئی

[redacted]

مگر درد سے اسکی جان نکلنے لگی، اور بمشکل دانتوں کو زور سے بھینچ کر اسنے ضبط کیا۔

اب اس نے اپنے ایک ہاتھ سے وہ پٹی نکالی جو اس قسم کی ضرورتوں کے لئے ہر سپاہی کے پاس رہتی ہے، چاقو سے پلندے کو پھاڑا اور آیوڈین کی شیشی توڑکر زخم کے اندر انڈیل دی۔ ایک لمحہ کے لئے درد کی وجہ سے اسپر سکرات کا عالم طاری ہوگیا غرض جیسے بھی بنا اسنے کپڑا اور روئی وغیرہ رکھکر پٹی لپیٹی اور بمشکل دانتوں کی مدد سے پٹی کے سروں میں گرہ لگائی۔

اب وہ منڈیر سے لگا ہوا خاموش لیٹا تھا، اور درد کو برداشت کرنے کے لئے دل کو مضبوط کر رہا تھا۔

نیچے سڑک پر کامل سناٹا تھا۔ موٹر کار مشین گن چلانے والے کی لاش کو لیکر واپس جاچکی تھی۔

جاسوس بہت دیر تک خاموش پڑے پڑے اپنے زخمی ہاتھ کو دباتا اور اس جگہ سے اپنے بھاگنے کی تدبیریں سوچتا رہا اگر وہ نہ بھاگ سکا اور صبح ہی پر صبح ہو گئی تو اسکی موت یقینی ہے سامنے والی چھت پر دشمن کا جاسوس موجود ہے، اور رات کے اندھیرے میں بھی اسکی نظروں سے بچنا دشوار معلوم ہوتا ہے۔ کمبخت کا نشانہ کتنا سچا ہے ضرور کوئی اچھا گولی چلانے والا ہے۔ کوئی صورت ایسی ہونی چاہئے کہ میں اسے مار لوں مگر مصیبت تو یہ ہے کہ میں بندوق چلانے سے معذور ہوگیا بدقسمتی سے سیدھے ہی ہاتھ میں گولی لگی اسکے پاس ایک پستول بھی تھا۔ اس کا خیال آتے ہی ایک ترکیب اس کے ذہن میں آئی۔

اپنی ٹوپی اتار کر اس نے اپنی بندوق کی نالی کے اوپر رکھی اور پھر آہستہ آہستہ سرکاکر بندوق کو منڈیر سے اونچا کرنا شروع کیا اس حد تک کہ سامنے کی چھت سے وہ نظر آسکے ٹوپی منڈیر سے کچھ ذرا ہی سی اونچی ہوتی تھی کہ فوراً ایک گولی آئی اور ٹوپی میں چھید کرتی نکل گئی۔ جاسوس نے بندوق کو اس طرح ٹیڑھا کیا کہ ٹوپی آگے کی یعنی منڈیر کی طرف کو جھکی اور نیچے سڑک پر گرگئی۔ پھر اس نے بندوق کو درمیان سے پکڑکر اپنا بایاں ہاتھ منڈیر کے اوپر سے نیچے کو لٹکا دیا اور چند لمحوں کے بعد بندوق کو چھوڑ دیا رات کے سناٹے میں بندوق بڑے شور کے ساتھ نیچے گری اور سڑک پر خوب زور کا دھماکا ہوا۔ جاسوس نے اپنا لٹکا ہوا ہاتھ آہستہ سے کھینچ لیا اور چھت پر چت لیٹ گیا۔

گھسٹتا اور رینگتا ہوا وہ اب پھر کسی قدر بائیں جانب کو ہٹ گیا، اور چھت کے کونے کے پاس سے آہستہ سے ذرا سر اٹھاکر اس نے سامنے کی چھت کی طرف دیکھا تاکہ یہ معلوم کرسکے کہ اسکی تدبیر کا کیا نتیجہ نکلا۔ اسکی ترکیب چل گئی تھی، اور دشمن کا جاسوس پورے طور پر دھوکے میں آگیا تھا۔ ٹوپی اور بندوق کو سڑک پر گرتے دیکھکر اس نے یقین کر لیا تھا کہ اسکی گولی صحیح لگی اور اسنے اپنے دشمن کو ہلاک کر دیا۔ اب وہ باطمینان تمام دودکش کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا تھا اور پیچھے کی طرف آسمان ہونے کی وجہ سے اسکا سر صاف نظر آرہا تھا جمہوریت پسندوں کا جاسوس مسکرایا۔ اسنے دھوکا دیکر دشمن کو اسکی کمینگاہ سے باہر نکال لیا تھا، اور اب وہ اس سے بمشکل کوئی چالیس گز کے فاصلہ پر بالکل سامنے کھڑا تھا۔ اس نے اپنا پستول نکالا۔ اسکے سیدھے ہاتھ میں اس قدر درد تھا کہ تمام جسم کانپ رہا تھا۔ بدن کو

خوب سادھ کر اسنے نشانہ باندھا لیکن اسکا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ بہزار دقت و خرابی اسنے سانس روک کر اور ہونٹوں کو زور سے بھینچ کر ہاتھ کو قایم کیا، اور لبلبی دبا دی، فیر ہوا، اور فیر کیساتھ اتنا شور کہ اسکے کان پھوٹ گئے۔

دھواں صاف ہوا، اور اب پھر اسنے ڈرتے ڈرتے جھانکا اسکے منہ سے بے اختیار خوشی کی چیخ نکل گئی۔ اسنے دشمن کو مار لیا تھا۔ سامنے منڈیر پر پڑا ہوا وہ دم توڑ رہا تھا۔ بندوق اسکے ہاتھ سے چھوٹی اور نیچے دو کان کے چھجے سے ٹکراتی ہوئی بڑے زور سے سڑک پر گری۔ تھوڑی دیر تک مرنے والے نے ہاتھ پاؤں مارے اور اسکے بعد ٹھنڈا ہو گیا۔

جمہوریت پسند جاسوس نے جانکنی کا یہ مہیب نظارا دیکھا اور اسکا دل کانپ گیا۔ لڑائی کا جوش اسکے دل سے نکل چکا تھا۔ لیکن انسان کی لاش اسکے سامنے پڑی تھی جسے اس نے عالم نزع میں موت سے جھگڑتے۔ اور ہاتھ پاؤں ٹپکتے دیکھا تھا۔ اسکا دل نادم تھا۔ اسکی پیشانی پر ٹھنڈا پسینا آگیا تھا۔ کچھ تو دن بھر کی بھوک پیاس سے اور کچھ بہت سا خون نکل جانے سے وہ بہت کمزور ہو گیا تھا۔ اسکا سر چکرانے لگا، سردی کی وجہ سے دانت بجنے لگے، اور وہ اپنے آپ کو موجودہ جنگ کو اور تمام انسانوں کو گالیاں دیتا ہوا اس طرف سے ہٹ آیا۔

پستول کو اس نے غور سے دیکھا۔ اس سے ابھی ذرا ذرا سا دھواں نکل رہا تھا۔ نفرت اور انتہائی غصہ کے ساتھ اسنے کچھ گالی سی دیکر اس پستول کو زمین پر مارا اور وہ بڑے زور سے اسکے قدموں کے پاس گرا۔ پستول بھرا ہوا تھا اس صدمہ سے وہ چل گیا، اور ایک گولی سنسناتی ہوئی اسکے کان کے پاس سے نکل گئی۔ اس حادثہ نے اسے خوف زدہ کر دیا اور ندامت و پشیمانی کے تمام خیالات اسکے دل سے نکل گئے اور اب خوف دور ہونے پر وہ پھر وہی جاسوس تھا اپنی عارضی کمزوری پر سے ہنسی آئی، اور اب دل مضبوط کرنیکے لئے اس نے شراب کی بوتل نکالی اور سب کی سب غٹا غٹ چڑھا گیا شراب نے اس میں پھر دلیری پیدا کر دی، اور اب وہ اس چھت سے اترکے اور اپنے افسر کے پاس جاکر اپنے کارہائے نمایاں کی اطلاع دینے پر آمادہ ہو گیا۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا گلیوں اور سڑکوں پر گذرنے میں چنداں زیادہ خطرہ نہ تھا اپنا پستول اٹھا کر اسنے جیب میں رکھا، اور پھر روشندان کے راستہ سے نیچے مکان میں اتر گیا۔

سڑک پر پہونچکر اسے یکایک دشمن کے اس جاسوس کا خیال آیا کہ جسے وہ ابھی ابھی ٹھکانے لگا چکا تھا۔ خود بخود اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ جاکر قریب سے اسے دیکھے اور اگر ممکن ہو تو پہچانے۔ بالکل ممکن ہے کہ وہ اسکی اپنی ہی پلٹن کا کوئی سپاہی ہو۔ آخر دشمن بھی تو کوئی غیر لوگ نہیں ہیں جو کوئی بھی تھا، تھا بڑا قادر انداز۔ میرے ہاتھ پر ٹل گئی نہیں اس نے تو لے ہی لیا تھا۔ دیکھنا ضرور چاہیے کہ کون تھا۔

سامنے کے مکان میں گھسنا خطرات سے خالی نہ تھا لیکن اسکا شوق غالب آیا۔ اس نے مڑکر روکانیل کے پل پر نظر ڈالی۔ دور سے گھمسان کی لڑائی کی آوازیں آرہی تھیں توپوں کی گرج کان اڑائے دیتی تھی اس سڑک پر بالکل سناٹا تھا۔ جاسوس دبے پاؤں سڑک پر آیا۔ ایک مشین گن نے اسکی سمت میں سینکڑوں گولیاں برسا دیں جن سے ساری سڑک کھد گئی۔ لیکن وہ محفوظ رہا۔ بھاگ کر وہ مردہ دشمن کی لاش کے برابر اوندھا لیٹ گیا مشین گن کے فیر رکے۔ اسنے آہستہ سے لاش کو گھما کر اسکا منہ اپنی طرف کیا۔ آہ! یہ اسکے حقیقی بھائی کی لاش تھی!

علم و ادب

مطائبات آزاد

از حضرت حکیم آزاد انصاری مدظلہ

کیا توقع کہ توجہ سے سُنے گا کوئی
کیا نتیجہ کہ کرے عرض تمنا کوئی

بے نیازی سے کبھی بات نہ پوچھی نہ سہی
مہربانی سے اِدھر دیکھ تو لیتا کوئی

یہی غفلت ہے تو امید عنایت بیسود
یہی حالت ہے تو کیا صبر کرے گا کوئی

رحم فرماؤ تو کیوں شکوہ زبان تک آئے
حال سن لو تو نہ قصہ ہو نہ جھگڑا کوئی

آس کہتی ہے کہ درماں سے شفا ممکن ہو
یاس کہتی ہے کہ امید نہ رکھنا کوئی

کچھ یہ ارمان نہیں ہے کہ تمنا نکلے
اتنی حسرت ہے کہ دیجائے دلاسا کوئی

نگہ لطف کی تکلیف گوارا فرما
ناشکیبا ہے ضرورت سے زیادہ کوئی

آہ! مجھ سے مرے ارمان بھرے دل کے سلوک
وہ بھی دن ہونگے کہ ارماں نہ ہوگا کوئی

ہاں ضرورت ہے، خدا کے لئے نادم ہو جا
کر رہا ہے ترے اغماض کا شکوا کوئی

ہم نے جس روز سے دنیا کو بہ عبرت دیکھا
دل میں باقی نہ رہی حسرت دنیا کوئی

کاش! آزاد تری دھن میں بھٹکتا نہ پھرے
کاش! منزل کا بتا دے اسے رستا کوئی

سراب اور حقیقت

(از جناب پرویز بٹالوی)

تھوڑا سا دیسی صابن خریدنے کے لئے میں ایک دکان پر ٹھیرا۔ سامنے صابن کی ایک بڑی سی ٹکیا دھری رکھی تھی کاندار نے لوہے کا ایک باریک سا تار اٹھایا۔ تار بلا دقت ٹکیا کے آر پار ہوگیا اور غیر محسوس طور پر ٹکیا کے دو ٹکڑے ہوگئے۔

میں نے دل میں سوچا بعض آدمی اس دنیا میں اپنی زندگی کے دن بالکل ایسی ہی سہولیت سے گذار دیتے ہیں جیسے یہ تار ٹکیا میں سے گذر گیا۔ ایک مسرت زا گہوارہ سے لیکر اطمینان بخش گوشہ لحد تک کوئی روڑا انکے راستہ میں نہیں اٹکتا جو انکے لئے باعث تکلیف ہو۔ پیدا ہوئے تو ایک ایسے گھرانے میں جہاں خوش بختی اور اقبال کمر بستہ خدام بارگاہ تھے۔ مولود کیا حسین و جمیل گویا جنت کا ایک حسین چشمہ ہے کہ بیساختہ اس دنیا کے آب و گل میں ابل پڑا ہے۔ بچپن کا زمانہ اس طرح گذرا گویا ایک بلبل ہے کہ موسم بہار میں گلہائے رنگا رنگ کے تختوں میں چہکتا پھرتا ہے۔ کبھی کسی نے رونے کی آواز نہیں سنی۔

مکتب میں پہنچے تو وہ جوہر دکھائے کہ ذہانت و فطانت ضرب المثل ہوگئی۔ ہم مکتب ایسے سنجیدہ و خلیق کی دوستی پر نازاں اور معلم ایسے مودب و مہذب شاگرد کی تعلیم پر خوش۔

جوانی آئی تو اس انداز سے کہ ؎

پھر ہوئے مہر و مہ تماشائی

صحت۔ تندرستی۔ حسن و جمال۔ جاہ و ثروت۔ حشمت و اقبال سایہ کی طرح ساتھ ساتھ ہر چیز سے مسرت ٹپکتی تھی

ہر بات میں رنگینئے بہار کا لطف تھا گویا

ہر چیز پہ بہار تھی ہر شے میں حسن تھا
دنیا حسین تھی میرے عہد شباب میں

ادبی مجلات کے مدیر ہزار ہزار منتوں خوشامدوں سے مضامین لکھواتے۔ ذوق سلیم رکھنے والوں کی نگاہیں ان ادبی شہ پاروں کے متجسس رہتیں شعر لکھتے تو ایسی عذوبت و لطافت لئے ہوئے کہ جو سنتا سر دھنتا۔ سیاسی میدان میں اترتے تو قائد اعظم اور بطل حریت کہلاتے۔ جمہور انام خون بہانے پر آمادہ۔ اور قوم انکے ایک اشارہ پر قربانی کیلئے تیار

شادی ہوتی تو بیوی حقیقی معنوں میں رفیقۂ حیات۔ گھر جنت کا نمونہ بن گیا

اولاد ملی تو ایسی جیسے خود بچپن میں تھے۔

بوڑھے ہوئے تو دنیا بھر کا تجربہ ساتھ لئے ہوئے۔ کوئی بچہ نہ بیمار پڑا نہ آنکھوں کے سامنے مرا۔ بڑے بوڑھے اپنے اپنے وقت میں جدا ہوئے۔ بڑھاپے میں اپنا سے دوام کی شہرت اپنی آنکھوں سے دیکھ لی۔ اولاد سعید اور خدمتگذار قوی مضبوط۔ دولت کی فراوانی۔ مخلص احباب کی دسائٹی علمی تجر۔ ادبی پختہ کاری۔ غرضیکہ ہر شعبہ حیات میں استعداد اپنے انتہائی کمال کو پہنچاتی ہوئی اور زندگی ہر لحاظ سے کامیاب و کامران۔

جی بھر کے جئے۔ اور خندہ پیشانی۔ بغیر ایڑیاں رگڑے آغوش لحد میں جا سوئے ہزاروں گھرانوں میں انکا دست گا

سوگ منایا گیا۔ یہ تھی وہ زندگی جس کی سنجیدہ مضامین کے
اس تار نے یاد دلائی
لیکن میں تو کم از کم اسکا خواب بھی نہیں دیکھ سکا۔
اور میرا خیال ہے نہ آپ میں سے کسی کے نصیب میں
ایسی زندگی آئی ہوگی۔
اور حقیقت یہ ہے کہ ایسی زندگی کی مثال کسی افسانہ
کے ہیرو میں ملے تو ملے عملی دنیا میں تو خواب سے زیادہ اسکی
حقیقت نہیں۔ اور جب حقیقت یہ ہے تو پھر دوسروں کے

متعلق اندازہ لگا کہ انکی زندگی بلا رنج و کرب بسر ہو رہی ہے
اپنے آپ کو محروم تمنا خیال کرکے سوگوار حیات بنے بیٹھنا کہاں
کی دانشمندی تھی۔ یاد رکھئے۔ اس دنیا میں رہتے ہوئے آپ
جس کسی کے دل کی گہرائیوں تک کوئی نہ کوئی خلش وہاں ضرور پائینگے
صرف اتنا ہے کہ جو مصائب آلام سے خوف زدہ ہو کر
ان سے مغلوب ہو جاتے ہیں انہیں بدترین نتائج کا سامنا ہوتا ہے
اور جو جوانمردی، ہمت و استقلال فراخ دلی سے انکا مقابلہ کرتے ہیں وہ انہیں
معمولی واقعات سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے اور یہی انکی کامیابی کا راز ہے۔

ڈاکٹر سعید احمد صاحب کی معرکۃ الآرا تصانیف

اگر اب تک نہیں پڑھی ہیں تو جلد منگا کر پڑھئے اردو زبان اس موضوع پر ان سے بہتر کتابیں پیش نہیں کر سکتی۔ یہ سب کتابیں ڈاکٹر سعید احمد صاحب کے زور قلم کا نتیجہ ہیں اور غالباً ڈاکٹر صاحب کا نام انکی عمدگی کے لئے کافی ضمانت ہے!

پتھر سی ہیرا عورت کی دنیا محبت ہو اور اس دنیا میں وہ عجیب غریب معجزے دکھایا کرتی ہے قیمت آٹھ آنہ ۸/

اسلام اور عبادت اسلامی عبادات میں کیا کیا خوبیاں ہیں قیمت آٹھ آنہ ۸/

اسلام اور عورت اس مظلوم او بیکس فرقے کی اسلام نے کسقدر اور کس طرح حمایت کی ہے قیمت ۱۰/

اسلام اور مدنیت۔ دنیا میں زندگی بسر کرنے کا کیا طریقہ سکھایا ہے۔ قیمت ایک روپیہ چار آنہ ۱۴/

حمل سے وضع حمل تک قیمت ۸/ پیدائش سے چار سال تک پانچ سال سے جوانی تک ۸/ دور جوانی ۸/ عمر بڑھانے کے طریقے ۸/ مکمل سٹ ۲۲/ محصولڈاک بذمہ خریدار۔

ملنے کا پتہ: **منیجر رسالہ "سعید" دہلی**

ابرِ خراماں آ گیا!

از جناب شبیر حسن خانصاحب جوش ملیح آبادی

میرے دیرینہ کرم فرما اور ملک کے مایۂ صد ناز شاعر جناب جوش ملیح آبادی کو بھی بالآخر "سعید" کا خیال آ ہی گیا اور آپ نے بھی ازراہ کرم مندرجہ ذیل نظم بغرض اشاعت مرحمت فرما کر اسے مرہون منت بنا ہی دیا۔ میں اس اخلاق کریمانہ کے لئے بدل ممنون ہوں، اور مجھے امید ہے کہ حضرت جوش کا یہ کرم محض ایک عارضی جوش نہ ہوگا بلکہ آپ مستقلاً "سعید" پر اسی طرح لطف فرماتے رہیں گے۔

ایڈیٹر

مژدہ اے رندو کہ سر مستی کا ساماں آ گیا
وہ ہوا سنکی، وہ پیکِ برق و باراں آ گیا

مل کے ہاں اک نعرہ اے رندو کہ وہ رنگیں جمال
رخ پہ بکھرائے ہوئے زلفِ پریشاں آ گیا

دیکھئے اب کیوں دریچوں سے خرامِ ابر کو
صحنِ میخانے میں خود ابرِ خراماں آ گیا

دیکھئے مطرب کو کیوں زحمت کہ نغمے چھڑ گئے
جائیے اب کیوں گلستاں میں گلستاں آ گیا

مستیِ دوشینہ میں ڈوبا ہوا وقتِ سحر
یار، وہ خورشید سے دست و گریباں آ گیا

عشق! رقصاں ہو، کہ تیری کاوشیں کام آ گئیں
جوش! سجدے کر کہ تیرا دین و ایماں آ گیا

محبانِ وطن کا جذبۂ آزادی

از حضرت محمود اسرائیلی

لوگ کہتے ہیں کہ یہ امر مسلّم ہے کہ کچھ
ہٹ گئے جادۂ مقصد سے محبانِ وطن

گر ہوا یوں ہی چلی تفرقہ اندازی کی
تو بدل جائیگا دو روز ہی میں رنگ چمن

پھر اسی سازِ شکستہ کی سُروں میں دھن ہے
صفحہ دل سے نہیں محو ہوئی بزم کہن

ایسے گم گشتہ منزل کا ٹھکانا کیا جو
رہبری کیلئے کرتا ہو تلاشِ رہزن

الغرض ایسی شکایات سنی جاتی ہیں
انکے، جو دوست نہیں پھر بھی ہیں دانا دشمن

اس حقیقت سے تو ہمکو بھی نہیں ہے انکار
کہ یہ تفریق خیالات نہیں مستحسن

ان اڑائی ہوئی باتوں کا یقین کون کرے
کہ صبا کی طرح بلبل بھی ہے غمّازِ چمن

جن کی بابت یہ گلے آج کئے جاتے ہیں
مایۂ فخرِ ملل ہیں وہ فدایانِ وطن

مردِ میدانِ عمل ایسے ہیں ماشاءاللہ
کہ اسیری میں بھی پیشانی پر آئی نہ شکن

منتشر ہوگا نہ یوں مجمع احرار کبھی
دانے دانے سے ہوا ہے یہ مہیا خرمن

دنیا نئے سرے سے پھر آباد ہو گئی!

از حضرت صفیؔ شاہجہاں پوری

وقف ہوائے گلشن ایجاد ہو گئی — جان عزیز نکہت برباد ہو گئی
وہ چشم شوق مائل بیداد ہو گئی — شکل تسلی دل ناشاد ہو گئی
جوش الم سے طبع حزیں شاد ہو گئی — دنیا نئے سرے سے پھر آباد ہو گئی
وہ مست ناز بزم میں یوں آئے بے نقاب — اے چشم شوق غیب سے امداد ہو گئی
خود رفتگی نے آج بہت غم غلط کیا — راحت رسان خاطر ناشاد ہو گئی
اے چشم یار لذت زخم جگر نہ پوچھ — مرہم پئے جگر تری بیداد ہو گئی
پرسان حال مدت قید قفس نہ پوچھ — یہ دیکھ لے کہ الفت صیاد ہو گئی
آنکھوں کا نور حسن کے جلووں میں مل گیا — تکمیل شان حسن خداداد ہو گئی
اے دل چراغ دیر و حرم کیوں نہ جھلملائیں — روشن وہ شمع حسن خداداد ہو گئی
وہ اٹھ کے اپنے گھر کو چلے ہم سوئے عدم — یوں ختم حسن و عشق کی روداد ہو گئی
اے چارہ ساز گرمئ سوز جگر نہ پوچھ — بیچین بزم عالم ایجاد ہو گئی
کچھ کہہ دیا ہے اس نگہ دلفریب نے — تسکین خاطر دل ناشاد ہو گئی۔

صفیؔ نگاہ یاس پہ تھا ہم کو اعتماد
وہ بھی تو جانب رخ جلاد ہو گئی

پارہائے جگر

از حضرت جگر بریلوی!

اپنے عالم میں عجب عالم پنہاں نکلا — ہم نے جس ذرے کو دیکھا وہ درخشاں نکلا
جس پہ رنگینیِ عالم کی بنا قائم تھی — غور سے کی جو نظر خون شہیداں نکلا
یوں تو ہر ذرے کو دعوائے تجلی ہے مگر — کی نگہ آپ نے جس پر وہی تاباں نکلا
پردۂ عشق سے باہر نہ ہوئی گرمیِ حسن — دل کا ہر قطرۂ خوں شعلۂ عریاں نکلا
ہستیاں یوں تو بہت عالم ارواح میں تھیں — کام آیا جو محبت میں وہ انساں نکلا
مانعِ وسعتِ توحید ہوئی قیدِ رسوم — جسکو ہم دین سمجھتے تھے وہ انساں نکلا
ہم سے کیا خرمنِ ہستی کی حفاظت ہوتی — دانہ دانہ طپشِ برق بداماں نکلا
تیرے دیدار نے بھی روح نہ پھونکی اس میں — ہائے کیا کہکے دلِ زار سے ارماں نکلا
حسن کی آئینہ بندی کا تحیر ہے مآل — نقشِ تصویر مرا دیدۂ حیراں نکلا
ختم ہوتا ہی نہیں زندگی و موت کا دور — یہ بھی اک سلسلۂ زلفِ پریشاں نکلا

کون ہوتا ہے مصیبت میں جگر آہ شریک
خون بھی اپنا جراحت سے گریزاں نکلا



ہوتی بات اور انہوتی رائے

جرم کا جدید نظریہ

از جناب مظہر انصاری دھلوی بی اے (آنرز)

(بسلسلۂ گذشتہ)

جدید نظریہ جرم کا قصہ چھیڑنے سے پہلے دو باتوں کا معلوم کرنا ضروری ہے۔

(۱) جرم کا قدیم نظریہ کیا ہے؟ اور

(۲) جرم کی تعریف کیا ہے؟

مضمون ذرا خشک لب ولہجے سے شروع ہو رہا ہے۔ مگر اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ سلسلۂ خیال کی ساری کڑیاں ایسی ہیں زبان قلم سے بعض باتیں ایسی نکلیں گی جنہیں دلچسپی کی جان کہنا چاہیئے اسلئے پڑھنے والوں کو مضمون آخر تک پڑھکر مطالعہ کا حق ادا کرنا چاہیئے۔

ہاں تو ہمارے سامنے دو چیزیں ہیں جرم کا قدیم نظریہ اور جرم کی تعریف۔

تو پہلے جرم کی تعریف سنئے

بہت کم چیزیں دنیا کے پردے پر ایسی ہونگی جن کے متعلق ایک ہی قوم اور ایک ہی ملک کی افراد ایک ہی وقت میں اس قدر مختلف الرائے ہوں جتنے جرم کی تعریف کے متعلق دیکھے جاتے ہیں۔ موٹر کی تیز خرامی پر رجو ذرا دور کی مثال تو ضرور ہے مگر بعید از فہم نہیں ہے) غور کیجیئے متعدد لوگ ایسے نکلیں گے جنکے نزدیک اس مغربی گھوڑے کی سبک خرامی جرم ہوگی۔ برخلاف اُن کے ایسے خدا کے بندے بھی ہونگے جو اپنی دانست میں تیز موٹر چلانے کو "مظاہرہ ثروت" خیال کرتے ہونگے۔

یہ تو ہوئی ایک ہی قوم ایک ہی ملک اور ایک ہی وقت کی بات۔ اگر آپ مختلف زمانوں اور مختلف ملکوں کی معاشرتی تاریخ پر نظر ڈالیں تو یہ عقدہ کھلیگا۔ اس میدان میں تعریف جرم کا فرق اور بھی زیادہ ہے۔ جس طرح "ہر ملکے وہر پوشاکے" اور "ہر زمانے وہر رسمے" مشہور ہے اسی طرح ہر ملک اور ہر دور

کی اپنی تعریف جرم الگ ہے دو ماضی کے سمجھے ہوئے مزاج کے لوگ جن حرکتوں کو جرم سمجھتے تھے وہ آج جرائم میں داخل نہیں ہیں اور بہت ممکن ہے کہ لمحہ امروز ہ کے "فطرتی انسان" جن افعال و جرم کرڈالنے بیٹھے ہیں مستقبل کا انسان انہیں بالکل خلاف قانون نہ سمجھے۔ یہی حال مختلف ممالک کا ہے۔ ایک ملک کے لوگ جس عادت کو جرم خیال کرتے ہیں دوسرے ملک والے اسی کو صفاتِ حسنہ میں شمار کرتے ہیں اور مشرق اور مغرب کا معیار تہذیب بھی اس سلسلے میں ایک معنی رکھتا ہے مگر ہم اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتے مختلف ممالک کی طرح مختلف اوقات میں بھی جرم کی تعریف تغیر پذیر ہوتی رہتی ہے یعنی ایک ملک میں ایک وقت میں جو فعل جرم قرار نہیں دیا جا سکتا ممکن ہے کہ اسی ملک میں کسی دوسرے وقت وہ فعل جرم بن جائے۔ مثلاً امن اور سلامتی کے دنوں میں ایک شخص اپنی ٹانگوں کو آزار پہنچاتا ہے اور لنجا بن جاتا ہے اور قوم اسے جرم نہیں سمجھتی لیکن اُسی قوم کے نزدیک اس شخص کی یہ حرکت ایام جنگ میں جبکہ قوم کو اپنے وقار کے تحفظ کے لئے آدمیوں کی ضرورت ہے جرم قرار پائے گی چنانچہ انگلستان کے قانون جرم میں جہاں افعال مجرمانہ کی ماہیت پر بڑی جامع بحث کی گئی ہے وہیں جرائم کی دو قسموں کے درمیان جنمیں سے ایک بذات خود مضر ہے اور دوسری قانون کی بندشوں میں آکر جرم بن جاتی ہے، ایک بیّن خط تفریق کھینچ دیا ہے۔

مگر یہ فرق اور اختلاف کی حکایت کہاں تک دراز ہوگی۔ جرم کی ایسی تعریف بھی تو ہونی چاہیئے جسے سب مان لیں۔

موجودہ ماہرین قانون کے نقطہ نگاہ سے دیکھئے ایڈ ہون از ٹہلر، جرم ایک بیماری ہے اور یہ بیماری دو صورتوں میں نمودار ہوتی ہے۔ جسمانی بیماری کی صورت میں اور دماغی بیماری کی صورت میں۔ مگر یہ صحیح تعریف نہیں ہوتی۔ پہیتی ہوگی جرم کی صحیح تعریف کم و بیش ان الفاظ میں ہوگی۔

"جرم ایک لفظ ہے جو ان افعال پر حاوی ہو جو سوسائٹی کے مفاد کے لئے مضر ہوں اور قابل سزا ہوں"

لفظ "گناہ" پر یہ تعریف عائد نہیں ہو سکتی کیونکہ گناہ صرف اخلاقی قوانین کی خلاف ورزی کا نام ہے بعض مکروہ ترین گناہ ایسے ہونگے کہ باوجود "گناہ" ہونے کے اور "مکروہ ترین" ہونے کے قانون انہیں جرم نہیں سمجھتا۔ اسی طرح بہت سے جرم ایسے ہیں جنہیں گناہ نہیں کہا جا سکتا۔ سینکا نے اب سے ۱۹ سو برس پہلے ایک بات کہی تھی اور کتنی سچی بات کہی تھی کہ جرم اگر اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے تو صرف یہی نہیں کہ وہ جرم نہیں رہتا بلکہ سوسائٹی کی نگاہوں میں قابل تقلید بھی بن جاتا ہے۔ اسی طرح کی ایک بات ایک مرتبہ سالون نے کہی تھی "ہمارے قوانین مکڑی کے جالے کی طرح ہیں کہ اگر کوئی بے کس اور ناتوان چیز اسمیں پھنس جائے تو جان چھڑانا دوبھر کر دیتا ہے اور اگر کوئی وزنی چیز ہو تو ایک منٹ میں سارے بندھنوں کو توڑ تاڑ کر نکل جاتی ہے۔

ذرا زیادہ وسیع معنوں میں جرم کہتے ہیں مروجہ قانون کی خلاف ورزی کو۔ مگر اب قانون کیا چیز ہے؟ ایک طرف تو غیر مہذب اور وحشی قبائل کی وہ توہم پرستیاں اور رسم و رواج کی جکڑ بندیاں ہیں جنہیں وہ لوگ قانون سمجھتے ہیں دوسری طرف متمدن قوموں کے وہ الجھن میں ڈالنے والے دستاویزوں کے پلندے ہیں جنہیں عدالتوں میں

قانون کہکر پکارا جاتا ہے۔ ان دونوں میں سے کسے قانون سمجھا جائے اور کسے نہیں۔ مگر اس بحث میں پڑکر خود کو پریشان کرنے کی ہماری رائے میں ضرورت ہی نہیں ہے۔ قانون کو آپ سمجھ لیجے ایک نظام معاشرت،، اور پھر نہایت آسانی کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مروجہ نظامِ معاشرت ہمیں جن مضر افعال کے ارتکاب سے روکتا ہے انہیں "جرم" کہتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ عقل انسانی کیلئے ہر قدم پر ٹھوکر کھانے کا احتمال ہے اور بالکل ممکن ہے کہ قانون کے واضعین ایسے اصول گھڑ بیٹھیں جو ناانصافی پر مبنی ہوں تاہم ان کی نیت یہی ہوتی ہے کہ نظام معاشرت کی خلاف ورزی کو سزا کے ذریعے سے روکا جائے۔

تو گویا

جرم کا فعل متعلق ہوا سوسائٹی سے یعنے آدمی اپنی انفرادی حیثیت میں جرم نہیں کرسکتا۔ اور ہے بھی ٹھیک ارتکاب جرم کے لئے سوسائٹی کا وجود سب سے زیادہ ضروری ہے اگر ایک آدمی کو تنہا لق ودق صحرا میں چھوڑ دیا جائے تو گو اور کتنے ہی نقصانوں کے وقتے وہ اپنے لئے پیدا کرے ارتکاب جرم سے بہرکیف محفوظ رہیگا۔ ہے نہ ایک عجیب سی بات۔ آپ میں سے بہت کم لوگوں نے اسپر غور کیا ہوگا۔ سوچئے تو جب لق ودق صحرا میں کسی دوسرے کا وجود ہی نہیں تو وہ شخص جرم کریگا کیسے اور اگر کریگا بھی تو آخر کیا جرم کریگا۔ نہ تو وہ کہیں چوری کرسکتا ہے، نہ کسی کے ہاں ڈاکہ ڈال سکتا ہے، نہ کسی پر قتل کا اقدام کرسکتا ہے، نہ بلوہ کرسکتا ہے۔ نہ بغاوت کرسکتا ہے نہ کسی ٹرین پر بم پھینک سکتا ہے نہ چلتی گاڑیوں پر ڈاکہ ڈال سکتا ہے یعنی جہاں تک ارتکاب جرم کا تعلق ہے اس کی ساری صلاحیتیں سلب ہوگئیں ہیں اور جب تک وہ اس تجرد کی زندگی میں الجھا رہیگا کوئی قانونی جالا اسے پھنسانے کی جرأت نہیں کرسکتا۔

یہ تو ہوئی جرم کی تعریف۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ جرم کا قدیم نظریہ کیا ہے۔

لق ودق صحرا میں چھوڑے ہوئے آدمی کے متعلق جسکا ذکر خیر ابھی ہوا ہے۔ کہا یہ جا رہا تھا کہ آدمی اپنی انفرادی حیثیت میں جرم نہیں کرسکتا۔ انفرادی حیثیت کی دوسری سیڑھی ہے خاندان یا کنبہ یا قبیلہ کیا وہی شخص جو انفرادی حیثیت میں مجرم نہیں بن سکا اپنے خاندان کا مجرم ہو سکتا ہے؟ یقیناً دنیا کے سب سے پہلے مجرم کی مثال لیجئے قابیل ہابیل کی جان لیتا ہے۔ خاندان کے مفاد کو نقصان پہنچتا ہے اسے سزا ملتی ہے۔ دیکھا آپ نے سوسائٹی یا خاندان سے متعلق نہ ہوتے ہوئے ایک شخص اگر جرم کرے تو وہ مجرم نہیں۔ لیکن اگر سوسائٹی یا خاندان میں زندگی گذارتے ہوئے اس سے کوئی فعل خاندان کے مفاد کے خلاف سرزد ہو تو وہ پکا مجرم اور یقینی طور پر مستوجب سزا ہے پہلی حالت تو یہ ہے کہ از اوست کہ بر اوست، مگر دوسری حالت میں از اوست کہ بر ماست۔

ذرا اسی شخص مثال پھر اپنے سامنے لائیے جسے لق ودق صحرا میں چھوڑا گیا ہے۔ اگر وہ دوبارہ خاندان یا سوسائٹی میں داخل ہو جائے تو جرم کی وہی صلاحیتیں جو مردہ ہوگئی تھیں دوبارہ جی اٹھیں گی اور اس کے وہ افعال (خواہ وہ کچھ بھی

ہوں اچھے یا برے، جو پہلے جرم نہیں تھے اور جن پر کوئی احتساب نہیں ہوتا تھا اب اگر وہ سوسائٹی کے مفاد کے خلاف ہوں تو جرم بن جاتے ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اگر سوسائٹی میں رہتے ہوئے بھی ہر شخص کو من مانے اصولوں پر عمل کرنے دیا جائے تو سوسائٹی ایک جماعت کی حیثیت سے پارہ پارہ ہو جائے گی اور بحیثیت سوسائٹی اس کا کوئی وجود نہیں رہے گا۔

ہاں تو ذرا اس بات کا کہ جرم سے متعلق پرانے زمانے والوں کا نظریہ کیا تھا۔ شاید قدیم تعریف جرم کی یہ ہوگی۔

جرم وہ فعل ہے یا وہ بات ہے جس سے اس خاص قبیلے کے خدا کی توہین ہوتی ہو

گویا ایک فعل یا ایک قول کو پرکھنے کا معیار یہ تھا کہ اس خاص قبیلے کے مذہبی ضابطے کہاں تک اس پر مہر تصدیق ثبت کرنے کے لئے تیار ہیں۔ مثال کے طور پر اس قانون کو لیجئے کہ:

"جان لینا جرم ہے"

ہر قوم ہر زمانے میں اس قانون کو مانتی آئی ہے۔ مگر مزے کی بات یہ ہے کہ ماننے کے ساتھ ہی ہر قوم نے ہر زمانے میں اسے مختلف معنی پہنائے ہیں۔

بعض قوموں نے تو اس سے یہ مطلب نکالا کہ جانداروں کو اپنے ذاتی مصرف کے لئے نہیں مارنا چاہئے۔ بعض یہ سمجھیں کہ اس قانون میں رحمدلی کی تعلیم دی گئی اور بعض نے اس رحمدلی کی اسپرٹ کو سمجھے کے ساتھ ساتھ اپنے معبود پر جانداروں کی بھینٹ چڑھانا یا اپنے معبود کی خوشنودی کے لئے قربانی کرنا بھی مباح رکھا۔ چیز ایک ہی ہے۔ دیکھنے والے گو مختلف النوع سہی مگر بہر حال دیکھ رہے ہیں اسی ایک چیز کو مگر آپ نے دیکھا کہ کس کس پہلو سے دیکھ رہے ہیں اور اس دیکھنے میں کتنا کتنا فرق دکھائی دیتا ہے کم از کم اتنا ہر شخص جانتا ہے کہ جاندار کی جان لینا جرم ہے۔ مگر آج دنیا کے پردے پر کتنی قومیں ایسی ہیں جو اپنے دشمن کی جان لینے پر فخر نہیں کرتیں۔ کون نہیں جانتا کہ اپنے سر اسنے یا کسی اور انسان کو جان سے مار دینے کی سزا پھانسی ہے مگر ہم دیکھ رہے ہیں کہ بعض قومیں اپنی دیویوں اور اپنے دیوتاؤں پر اپنے جیسے انسانوں کی بھینٹ چڑھانا جائز سمجھتی ہیں۔ قانون ایک ہی ہے مگر سمجھ اپنی اپنی ہے اور اسی انداز سے اپنا اپنا فعل ایک دوسرا نظریہ جرم کا یہ ہے کہ جرم وہ فعل ہے جو ضمیر کے خلاف ہو مگر

یہ ضمیر کیا بلا ہے

اگر آپ کا "یہ ضمیر" انسانی دماغ کا کوئی شعبہ ہے تو اس سے بھی غلطی کا ایسا ہی امکان ہے جیسا اس دفتر کے دوسرے ڈپارٹمنٹ سے ہو سکتا ہے۔ اگر یہ کوئی ایسی چیز ہے جو ہمارے جسم کی مشین میں نہیں ہوتی بلکہ خدا کی طرف سے بخشی جاتی ہو تو پھر ہر شخص کو اس سے فائدہ اٹھانے کے یکساں موقع کیوں نہیں دیئے گئے آپ کہیں گے "ہمیں قوت تمیز" جو بخشی گئی ہے ہمیں "احساس" جو بخشا گیا ہے۔ خوب! ایک لمحے کے لئے مانے لیتے ہیں کہ ہر انسان کو صحیح اور غلط میں تمیز کرنے کا احساس دیا گیا ہے مگر اس بدقسمتی کو کیا کیا جائے کہ احساسات ہمیشہ یکساں نہیں رہتے اور ان کا معیار ہمیشہ ایک نہیں۔ پھر اب یہ کس طرح سمجھ لیں کہ تنہا "ضمیر" ہی انسان

کی صحیح رہنمائی کر سکتا ہے۔ ذرا غور کیجئے۔ آپ کو ایک دو نہیں لاکھوں ایسے "مردانِ خدا" ملیں گے جو شراب پینا بمنزلہ گناہ کے سمجھتے ہیں اور گوشت پر کوئی پابندی عائد نہیں کرتے۔ پھر اسی بستی میں جہاں یہ لوگ بستے ہیں ایسے بھی ہیں جو گوشت کھانا تو در کنار گوشت کے نام ہی سے گھن کھاتے ہیں۔ تو پھر ضمیر کیا بلا ہوئی؟ ماحول کے اثرات! بے شک!! ہماری سمجھ میں تو سوائے اس کے اور کچھ آتا نہیں کہ ضمیر بذاتِ خود کوئی چیز نہیں ہے اور جس چیز کو ہم ضمیر کے نام سے پکارتے ہیں وہ حالات، تعلیم، مزاج، عادات اور عقائد کے امتزاج کا نام ہے۔

مضمون نگار خوب سمجھتا ہے کہ اس کے مخاطب کون لوگ ہیں مگر مجبور ہے اپنی نوخیز ذہنیت سے جو صرف اسی چیز کو قبول کرتی ہے اور اس کے مخالف کسی چیز کو نہیں ممکن ہے کہ اس وطیرہ کو اکھڑپن سمجھا جائے لیکن میرے ساتھ تاریخ کی وہ طول طویل کہانی ہے جو ہمیشہ اپنے آپ کو دہرایا کرتی ہے۔

اس دراز حکایت کی کتاب کے جتنے چاہے ورق الٹکر دیکھئے کہیں بھی جو آپ یہ لکھا دیکھیں کہ مروجہ معاشرت کی مخالفت کرنے والوں کی روش کو بہ نظرِ استحسان دیکھا گیا ہے۔ ہوا یہی ہے، ہو یہی رہا ہے اور ہوتا یہی رہیگا کہ جو لوگ ہمارے پھیلائے ہوئے پاکھنڈ کو توڑنا چاہیں نہیں نہ پنپنے دو۔ حالانکہ ایسے لوگوں کے ساتھ ظلم کر کے دنیا ہمیشہ اپنے آپ ہی کو نقصان پہنچاتی رہی ہے مگر پھر بھی دنیا والوں کی یہ ذہنیت اب تک جی القایم ہے کہ ہر وہ فعل جو مروجہ سوسائٹی کی عادات پر اثر انداز ہونا چاہے جرم ہے عام اس سے

کہ اس کی نیت اچھی ہو یا بری۔ گویا باوجود یہ ماننے کے کہ سوسائٹی کی بعض عادات اور روایات ہماری ترقیوں میں رکاوٹ پیدا کر رہی ہیں ہم انکا احترام کرنے پر مجبور ہیں مگر جرم کی یہ صورت جسمیں وہ صرف "معاشرتی گناہ" تھا، بہت پرانی ہے حیوانی زندگی (آدمی بھی اس میں شامل ہیں) گروہ بندی چاہتی ہے۔ خاندان بنے، پھر قبیلے بنے، پھر قومیں بنیں اور پھر تمدنی دور شروع ہو گیا۔ قوانین بھی آہستہ آہستہ بنتے چلے آئے۔ اُدھر جرم بھی اپنے کام سے غافل نہیں تھا۔ نئے نئے روپ بھر رہا تھا۔ جب انسانی قبیلے (قوموں اور مذہبوں کی صورت میں) تمدن کے قریب ہوتے گئے تو انسانوں کی پیچیدہ زندگی کے ساتھ ساتھ ان کی املاک اور جائدادیں بھی وجود میں آنے لگیں۔ چنانچہ وہ جرائم جو پہلے کسی دور میں مکروہ سمجھے جاتے تھے کم گھناؤنے رہ گئے مثلاً جادوگری دھوکہ دہی وغیرہ اور دین لین اور املاک اور جائدادوں کے جرائم زیادہ اہمیت پکڑ گئے۔

اور اب تو

ان جرایم کی ہیئت میں بھی بہت زیادہ تبدیلی ہو چکی ہے۔ مثلاً اب سے دو سو برس پہلے انسانی برادری لین دین کے جن جرموں پر بڑی بڑی سخت سزائیں دیا کرتی تھی آج ان پر صرف انتباہ کافی سمجھا جاتا ہے اور کسے خبر ہے کہ جن افعال کو آج ہم جرم سمجھتے ہیں کل ہماری نسلیں انہی کو "کچھ نہیں یونہی ہیں" کہکر نظر انداز کر دیں اور برخلاف اس کے آج جن حرکتوں کی بنا پر آدمی کو زجر و توبیخ نہیں

ہوتی کل وہی اس کو تختہ دار تک پہنچا دیں۔

ان دو

نظریوں کے علاوہ ایک قدیم نظریہ اور بھی ہے اور وہ ان دو سے کہیں زیادہ پرانا ہے۔ یعنی یہ کہ جرم وہ فعل ہے جو انصاف کے منافی ہو۔ مگر اس پہ ہم آگے بحث کرینگے۔

نمبر (۱) اور نمبر (۲) جو دو سلسلے ہم نے شروع کئے تھے یعنی جرم کی تعریف اور جرم کا پرانا نظریہ ۔ وہ دونوں یہاں ختم ہو گئے اور ہماری تمام بحث کا نچوڑ یہ ہوا کہ:۔

(۱) جرم کہتے ہیں نظام معاشرت کی خلاف ورزی کو

(۲) جس سے سوسائٹی کے مفاد کو نقصان پہنچتا ہے۔

اب سوال یہ ہے

کہ اس مضر معاشرت فعل کا تدارک بھی کسی طرح ممکن ہے؟ کیا عجیب سوال ہے؟ ارے بھئی سرکاری قانون، پولیس کا محکمہ، عدالت کی سرگرمیاں۔ یہ سب جرم کے تدارک کیلئے تو ہیں۔ اب اور کیا تدارک چاہتے ہو؟

مگر اس عجیب سوال سے بھی زیادہ یہ جواب عجیب معلوم ہوگا کہ جرم کا وجود پھر بھی باقی ہے بلکہ روز بروز مستحکم ہوتا جاتا ہے۔

تو پھر کیا ان چیزوں کے علاوہ بھی کوئی چیز ایسی ہے جو جرم کو مٹا سکے؟

اس کا جواب دینے کے لئے ذرا غور و فکر کی ضرورت ہوگی۔

تدارک کے طریقے

فی الحقیقت یہی وہ چیز ہے جسمیں جدید نظریہ جرم اپنی چاشنی دیگا۔ مگر ہم چاہتے ہیں (ہم کیا چاہتے ہیں ہمارا مضمون چاہتا ہے) کہ نئے زمانے کی بات بتانے سے پہلے "پرانی تصویر" کا ایک رُخ آپ کو اور دکھائیں اور وہ یہ ہے

قدیم نظریہ جرم کی روشنی میں ہمیں یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ ارتکاب جرم سے غصے اور انتقام کے جذبات بھڑکتے تھے اگر آپ ایک سانپ کو ماریں تو وہ پلٹ کر کاٹیگا! اگر آپ ایک کتے کے لکڑی مارنے کی جرأت کریں تو وہ اس کے بدلے میں آپ کی ٹانگ میں دانت گڑو دیگا۔ اگر آپ ایک بڑے جانور کو تکلیف پہنچا میں تو وہ آپ کو ہلاک کر دینے کی کوشش کریگا۔ ٹھیک اسی طرح قدیم الایام کا انسان اس "فرد" کے خلاف جو جرم کرکے سوسائٹی کے قانون کو توڑتا تھا، غصے اور نفرت کا اظہار کرتا تھا۔ اور اس کی جان لیکر اپنے انتقام کی پیاس بجھاتا تھا۔ اگر ایک قبیلے کے ایک فرد کو کسی دوسرے قبیلے کے ایک فرد کے ہاتھوں تکلیف پہنچ جاتی تو اول الذکر کا سارا کا سارا قبیلہ دوسرے قبیلے کے خلاف جنگ آزما ہوتا اور اسی طرح تنازعات کا ایک ایسا ہنگامہ برپا ہو جاتا جو نسلاً بعد نسلاً صدیوں تک چلا جاتا۔ آپ ذرا غور سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ ان تمام تنازعات کی تہ میں انتقام کا جذبہ کام کرتا تھا۔ افراد، خاندان، کنبے، قبیلے قرئیے، اصلی یا نقلی بگاڑ کی آڑ لیکر کمربستہ ہو جاتے تھے اور اپنے دشمنوں کو مار کر پار اتارنے کیلئے کمریں کس لیتے

تھے۔ گویا قدیم زمانے میں جرم کا تدارک انتقام سے کیا جاتا تھا حضرت موسیٰ کے مشہور قانون۔

"آنکھ کے بدلے آنکھ
اور دانت کے بدلے دانت"

میں انسانی طبیعت کے اس جذبۂ انتقام کو ایک معینہ شکل دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ جوں جوں وقت گذرتا گیا اس انتقامی جذبے کی طاقت افراد کے ہاتھوں سے نکلکر سوسائٹی کے ہاتھوں میں آتی گئی اور اس صورت سے قانون بنے۔

"انتقام" کے علاوہ ایک اور بنیادی اصول بھی تھا جو مجرم کو سزا دلواتا تھا اور وہ تھا۔

سوسائٹی کی حفاظت

اس کے دو طریقے تھے:۔

(۱) مجرم کو دوبارہ جرم کرنے سے باز رکھا جائے قتل کر دینے سے، ہاتھ پیر کاٹ ڈالنے سے دیس نکالا دیدینے سے، قید میں ڈال دینے سے (مجرم کی اصلاح کے خیال سے ان لوگوں کے دماغ بالکل خالی تھے)

(۲) دوسروں کو مجرم کے نقش قدم پر نہ چلنے دیا جائے عبرت دلانے سے یا مجرم کو اس قدر سخت سزا دینے سے کہ اس کی موت مثال بن جائے اور دوسروں کو خوف زدہ کردے۔

تاریخ کھولکر دیکھئے۔ اس نوع کے ہزاروں حربے آپ کی نظر پڑینگے۔ مثلاً کوڑے لگوا دینا۔ گھوڑے کی دُم سے بندھوا دینا۔ کوئیں میں ڈلوا دینا۔ ہاتھ پیر کٹوا دینا ہاتھی کے پاؤں کے نیچے روندوا دینا۔ دیوار میں زندہ چن دینا۔ وغیرہ وغیرہ۔

مگر آپ جانتے ہیں دنیا کی اندھیر نگری میں ہر چیز ادلتی بدلتی رہتی ہے۔

تغیرات کا دور شروع ہوا

اور انتقام کے جذبہ کی بنا پر سزا دینے کا اصول اپنی اہمیت کھو بیٹھا سزا ہی صرف سزا دینے کے لئے ـــــ لیکن یہ بات بھی نہ چلی اور ضابطے اور قانون کے ماہروں کے دماغ پر جب زمانے نے حالات کے چھینٹے دیئے تو انہوں نے محسوس کرنا شروع کیا کہ جرم کا تدارک کرنے میں۔

سزا دینا، روکنا، اور اصلاح کرنا

ان تینوں چیزوں کا یکساں خیال رکھنا چاہیئے یہ تبدیلی بہت اہم تھی اور اس سے بڑے بڑے نتیجے نکلے گذشتہ زمانے کے اور اب کے جیل خانوں میں ایک صاف فرق یہ نظر آتا ہے کہ اس زمانے میں قیدیوں کو بھیڑ بکری کی طرح ایک ہی کوٹھڑی میں ٹھونس دیا جاتا تھا اب وہ مریں یا جئیں ذمہ دار افسروں کی بلا سے انگلینڈ میں (اب سے دو سو برس پہلے کی بات ہے) ایسے آدمی اٹھے جنہوں نے جیل خانوں کے اس انتظام کے خلاف آواز بلند کی اور وہ کامیاب بھی ہوئے۔ مگر وہ اصلاح کی دھن میں بہت آگے نکل گئے اور قیدیوں کو دن رات علیحدہ علیحدہ

کوٹھڑیوں میں بند رکھنے کا طریقہ جاری ہوگیا۔ گذشتہ چالیس برس سے اور اس سفر طریقے کے نقصان کی طرف بھی لوگوں کی توجہ منعطف ہوئی اور ماہرین یہ نتیجے نکالنے پر مجبور ہوئے ہیں کہ انہی لوگوں میں سے (جن کو ہم کوٹھڑیوں میں ڈالکر سزا دیتے ہیں، ایسے افراد بھی نکل سکتے ہیں جنہیں قدرے قلیل کوشش سے سیدھی راہ پر لگایا جا سکتا ہے۔ اور اس احساس کے ساتھ ہی وہ زاویہ نگاہ بھی تبدیل ہو رہا ہے جسکے ماتحت خلاف معاشرت افعال کو قابل انتقام گردان کر سزا کا مستحق سمجھا جاتا ہے اب یہ ایک مسلم امر ہے کہ

"ایسی سزا دہی کسی صورت میں بھی کامیاب نہیں کہی جا سکتی کہ جس کے ہاتھے پر سزا یافتہ آدمی سوسائٹی میں جگہ لینے کے قابل نہ ہو گا۔"

میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور آج پھر کہتا ہوں کہ ایک ایسے شخص کی معاشرتی حالت، جو کسی جرم کی وجہ سے سزا پاکر جیل جاتا ہے، یقیناً کمزور ہوگی اور اگر اسے اُس کی کمزوری دور کئے بغیر جیل کی چار دیواری سے باہر کر دیا گیا تو لاکھ سر پٹکنے کے بعد بھی وہ معاشرتی کشمکش میں دوسروں کے دوش بدوش کھڑا نہ ہو سکیگا ہر وہ ضابطہ یا قانون جو سزا پائے ہوئے فرد کو ذمہ داری، خودداری اور عملی جذبہ سے محروم کرتا ہے اور جو فطری قابلیتوں کو جلا دینے کی بجائے انہیں ماخذ کر دیتا ہے، اسے تباہی کے غار کی طرف لیجا رہا ہے اور اسکی اخلاقی حالت کو بہتر بنانے کی بجائے عملی زندگی کی دنیا میں سے اپاہج بنا رہا ہے ایسے قانون کا ڈسا ہوا مرتے مر جائے سوسائٹی کا زندہ فرد نہ بن سکیگا۔

ان ہی وجوہات کی بنا پر آجکل اس ردّ و کدّ کا ہنگامہ برپا ہے کہ جیلخانوں کے نظام میں قیدیوں کی اخلاقی، دماغی جسمانی اور صنعتی تربیت کی گنجائشیں نکالنی چاہیں۔ تاکہ وہ آزاد ہونے کے بعد آزاد زندگی بسر کر سکیں

ممکن ہے یہ طول طویل وقفہ آپ کو بہت گراں گزر رہا ہو اس لئے میں سمجھتا ہوں اب وقت ہے کہ میں آپ کو مژدہ سنا دوں کہ ہم اپنے اصلی مقصود سے بہت قریب آگئے ہیں یعنے ہمارا اگلا قدم ہے۔

جدید نظریۂ جرم

جدید نظریہ جرم کیا ہے اور اسکی شکل صورت کیسی ہے۔ اب تو غالباً ان چیزوں کے کہنے کی کوئی ضرورت ہی باقی نہیں رہی اسلئے کہ پرانے نظریئے کے خلاف جو کچھ قریبی سطور میں بیان کیا ہے وہی جرم کا جدید نظریہ ہے۔

دور تغیرات کے بعد ہمیشہ وہ زمانہ آیا کرتا ہے جب ہمارے اجتماعی زاویہ نگاہ میں ایک زبردست انقلاب پیدا ہو جاتا ہے اور ہم بیک زبان پکار اٹھتے ہیں کہ

یہ ہے صحیح چیز! ہاں یہی ہے

چنانچہ آج سائنس اور علم اخلاق دونوں پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ مجرم کو جذبۂ انتقام کی بنا پر سزا دینے کا اصول بالکل غلط ہے انسانی کردار کی پیچیدگیاں روشنی میں آکر کہہ رہی ہیں کہ یہ طریقہ مکروہ ہے اور اسکی کراہیت سے تم جتنی جلدی چھٹکارا پالو اچھا ہے **انصاف کی خاطر سزا دینا**——— یہ کلیہ بھی اب ٹوٹ چکا ہے۔ انصاف۔!

(باقی آیندہ)

ایک راستہ

از جناب سید نصیر احمد صاحب

تشریف ینگ اینڈ کمپنی کا ایک کلرک گرمی اور تھکن سے گھبرایا ہوا کاندھے پر بندوق رکھے جنگل میں سے باہر نکلا اس کا کتا موتی بھی اسکے پیچھے دم دبائے آہستہ آہستہ آرہا تھا۔ سامنے کچھ درخت تھے اور انکے پیچھے کوئی دنیا و مافیہا سے بے خبر بانسری بجا رہا تھا۔ بانسری کی سریلی مگر درد و غم سے بھری ہوئی آواز جنگل کے سرے تک پہنچ رہی تھی۔

تشریف جب ان درختوں کے قریب پہنچا تو اس نے تھوڑے ہی فاصلہ پر ایک دیکھا۔ گائیں، بکریاں اور بھیڑیں ہزاروں کی تعداد میں ادھر اُدھر چر رہی تھیں۔ کچھ بیٹھی اونگھ رہی تھیں اور بعض شاید سر جھکائے کچھ سوچ رہی تھیں ایک دبلا پتلا بوڑھا گڈریا ننگے سر ایک درخت کے سہارے کھڑا بانسری بجا رہا تھا۔ کبھی وہ زمین کی طرف دیکھنا شروع کرتا اور ذرا ٹھیر کر پھر بانسری بجانے لگتا۔

تشریف نے چند قدم اٹھائے اور وہاں جا پہنچا "اچھے تو ہو میاں گڈریئے"۔ اس نے بھاری آواز میں کہا "اس جگہ کا مالک کون ہے"۔

"جو سلیم پورہ کے زمیندار ہیں" گڈریئے نے جواب دیا اور اپنی بانسری کو منہ میں لگا لیا۔

"ہاں میرا بھی یہی خیال تھا" یہ کہکر تشریف زمین پر بیٹھ گیا اور جیب سے سگریٹ کی ڈبیہ نکالی "کیا خراب موسم ہے" اس نے ٹھیر کر کہا "خدا رحم کرے۔ اب کے فصلوں کا بس خدا حافظ ہے۔ معلوم ہوتا ہے بارش کبھی نہیں ہوگی"۔

گڈریئے نے بادلوں کو دیکھا جو آسمان پر موجود تھے لیکن منہ سے کچھ نہیں کہا۔

"تمام گرمیوں میں یہی حالت رہی" تشریف نے ایک آہ بھری "کسانوں اور زمینداروں کیلئے تو یہ مصیبت ہے لیکن دوسرے لوگوں کے لئے بھی نقصان کا باعث ہے"۔

گڈریئے نے پھر آسمان کی طرف دیکھا اور کچھ سوچ کر جواب دیا "ہاں سب چیزیں ایک ہی راستہ پر جا رہی ہیں۔ دنیا میں کوئی اچھائی دکھائی نہیں دیتی"۔

"بھائی تم تو یہاں روزانہ آتے ہو کیا اس جنگل میں پرندے نہیں ہیں۔ کیا تم نے کبھی نہیں دیکھے"۔

"نہیں کبھی نہیں" گڈریئے نے جواب دیا "کل پرسوں ایک شکاری کہہ رہا تھا کہ جنگل میں نہ معلوم پرندوں کا نام و نشان کیوں مٹ رہا ہے مجھے بھی یقین ہے کہ پرندے بہت کم ہیں"۔

"ہاں بہت کم۔ شکار کا تو یہاں لطف ہی نہیں ہے وقت ضائع کرنا ہے۔ اور اگر پرندے ہیں بھی تو اتنے چھوٹے کہ ان کے خون سے ہاتھ رنگنا شرم کی بات ہے"۔ کچھ مسکرا کر کہا "دنیا میں کبھی ایسا عجیب و غریب تغیر ہوتا ہے کہ ہنسنے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں"۔

"سب چیزیں ایک ہی راستہ پر جا رہی ہیں" گڈریئے نے اوپر دیکھتے ہوئے کہا "گذشتہ سال بھی شکار بہت کم تھا۔ اس سال تو پرندے بہت ہی کم ہیں۔ اور میری بات یاد رکھنا چار پانچ سال میں ان کا نام و نشان ہی مٹ جائیگا"۔

"ہاں" تشریف نے اس کی تائید کی "بالکل ٹھیک ہے۔"
گڈریے نے ذرا جھنجھلا کر کہا۔ "عجیب۔ جب ان سب کو ہوا کیا
مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ تیس سال پہلے یہاں جنگل بطخوں، مرغابیوں
اور دوسرے آبی جانوروں کی بھرمار تھی۔ سب لوگ شکار کرتے
تھے اور سوائے بندوقوں کی آواز کے کچھ سنائی نہیں دیتا
تھا۔ لیکن یہ کہنے کہاں۔ چالیس سال سے میں خدا کے کام
دیکھ رہا ہوں اور میری رائے ہے کہ ہر چیز ایک ہی راستہ پر
جا رہی ہے"

"کس راستہ پر"

"تنزل کے راستہ پر جناب، تباہی کی طرف۔ اب خدا
کی دنیا کا خاتمہ قریب ہے"

بوڑھے گڈریے نے سر پر ٹوپی پہنی اور آسمان کی طرف
دیکھتے ہوئے کہا "کیسی قابل افسوس بات ہے لیکن خدا کی مرضی
کے سامنے کون بول سکتا ہے۔ اگر ایک پھول مرجھا جائے یا
یوں کہنے کہ ایک گائے مر جائے تو کتنا افسوس ہوتا ہے لیکن اس
وقت رنج و غم کی انتہا کا خیال کرو جب ساری دنیا فنا ہو جائیگی
آفتاب آسمان دریا جنگل۔ جانور اور انسان سارے خدا کے
پیدا کئے ہوئے ہیں اور ہر ایک کا دوسرے سے قریبی تعلق ہے
لیکن ایک دن سب کو فنا ہونا ہے"

"تم کہتے ہو کہ دنیا فنا ہونے والی ہے" تشریف نے کچھ
سوچ کر کہا "ممکن ہے ایسا ہی ہو لیکن تم پرندوں سے اس کا
اندازہ نہیں کر سکتے۔ پرندے اسکی تباہی کا نشان نہیں ہو سکتے"

"صرف پرندے ہی نہیں" گڈریے نے فوراً جواب دیا"
بلکہ جنگلی جانور بھی، مویشی بھی، شہد کی مکھیاں اور مچھلیاں..
سب کچھ۔ اگر آپ میری بات کا یقین نہیں کرتے بوڑھے
آدمیوں سے پوچھیے۔ ہر ایک یہی کہیگا کہ مچھلیاں اب ایسی
نہیں رہیں جیسی کہ پہلے ہوتی تھیں۔ دریاؤں سمندروں اور
جھیلوں میں دن بدن مچھلیاں کم ہو رہی ہیں۔ جب میں
جوان تھا تو اسی سلیم پور والی چھوٹی سی جھیل میں سے
ایک گھنٹہ میں کئی کئی مچھلیاں پکڑ لیتا تھا اور بعض تو ایک
ایک گز کی ہوتی تھیں لیکن اس زمانہ میں دو انگلی مچھلی بھی ہاتھ
آجائے تو غنیمت ہے۔ حالات بد سے بدتر ہو رہے ہیں ایک
دن ایسا آئیگا کہ مچھلیاں بالکل نہیں رہیں گی۔ اور دریاؤں
کو لو۔ دریا اب خشک ہو رہے ہیں اور......"

"ہاں دریا تو یقیناً خشک ہو رہے ہیں" تشریف نے بات
کاٹ کر جواب دیا۔

"یہی تو میں کہتا ہوں۔ آپ وہ جھاڑیاں جو درختوں
کے پاس ہیں دیکھ رہے ہیں، پرانے زمانہ میں یہاں ایک
دریا تھا۔ لیکن دریا نے اپنا راستہ بدل دیا اور خدا جانے اب
تک کتنے بدل چکا ہے اسی طرح بدلتے بدلتے ایک دن خشک
ہو جائیگا۔ سلیم پور سے کے مغرب میں جو جھیلیں اور تالاب تھے
وہ کیا ہوئے۔ اسی جنگل میں ایک ندی بہتی تھی لڑکے یہاں
نہانے آتے تھے۔ لوگ مچھلیاں پکڑتے تھے اور شکار بھی ہوتا
تھا۔ لیکن اب اس میں پانی کا ایک قطرہ نہیں۔ برسات
کے زمانہ میں بھی تو اب اسمیں پانی نہیں آتا جس چیز کو دیکھو
بد سے بدتر ہو رہی ہے۔ ہر چیز"

دونوں خاموش ہو گئے۔ تشریف کچھ سوچنے لگا وہ ایسی
چیز یاد کرنا چاہتا تھا جو تباہی سے بچ رہی ہو۔ آسمان پر سورج
بادلوں سے نکلنے کی کوشش میں مصروف تھا۔

"اور جنگل بھی" تشریف نے کہا۔

"ہاں جنگل بھی۔ لوگ ان کو کاٹ ڈالتے ہیں۔ ان میں آگ لگ جاتی ہے۔ اس طرح سے درختوں میں کمی ہو جاتی ہے لیکن نئے پیدا نہیں ہوتے۔ اگر ایک درخت زمین سے نکلتا بھی ہے تو دوسرے دن کٹ جاتا ہے۔ میں پچاس برس سے یہ تبدیلیاں دیکھ رہا ہوں اور میرا ایمان ہے کہ ہر چیز تنزل کی طرف جا رہی ہے"۔

"لیکن انسان اب بہتر ہوتے جاتے ہیں" تشریف نے ذرا ڈرتے ہوئے کہا۔

"بہتر کس حیثیت سے"

"ہوشیار اور چالاک"۔

"ممکن ہے وہ ہوشیار ہوں لیکن اس سے فائدہ کیا۔ ایک شکاری ہوشیاری سے کیا فائدہ حاصل کر سکتا ہے اگر شکار کے لئے کچھ باقی نہ رہا ہو۔ میرا خیال ہے کہ خدا نے انسانوں کو دماغ تو دے دیا ہے لیکن ان سے قوت چھین لی ہے۔ لوگ کمزور ہو گئے ہیں۔ بہت ہی کمزور۔ مجھے دیکھو۔ میں کتنا غریب ہوں۔ لیکن مجھ میں قوت ہے۔ میری عمر ستر برس کی ہے۔ دن بھر گلہ کی رکھوالی کرتا ہوں۔ رات کو چوکیداری کا کام میرے ذمہ ہے۔ لیکن بالکل نہیں تھکتا اور نہ مجھے نیند آتی ہے۔ میرا بیٹا مجھ سے زیادہ ہوشیار ہے۔ اسکو میرا کام کرنے کیلئے دو۔ پھر دیکھو کیا ہوتا ہے۔ پہلے ہی دن وہ دیر سے اٹھا اور دوسرے دن بھاگا بھاگا کسی وید یا حکیم کے پاس جائیگا۔ وجہ کیا ہے۔ بس یہی کہ وہ کمزور ہے۔ اسمیں برداشت کی طاقت اور ہمت نہیں"۔

"یہ بھی ٹھیک ہے"۔ تشریف نے کہا "آجکل کے کسان محض بیکار نہیں"۔

"ہاں چھپانے سے کیا فائدہ! آپ دوسرے لوگوں کو دیکھئے۔ شریفوں کو۔ وہ تو کسانوں سے بھی نکمے ہیں۔ یونہی نے ہر چیز پر قابو پالیا ہے۔ وہ دنیا کا ہر علم جانتے ہیں لیکن ان کی حالت قابل رحم ہے۔ دبلے پتلے کمزور۔ یا تو سارا دن شکار میں گذار دیتے ہیں یا کتابیں پڑھتے رہتے ہیں۔ لیکن اس سے فائدہ۔ وہ پڑھنے سے کچھ فائدہ نہیں اٹھاتے دن بدن کمزور اور ڈرپوک ہوتے جاتے ہیں۔ اس طرح ان کی زندگی گذرتی ہے"۔

"آجکل سب غریب بھی تو ہیں" تشریف نے کہا۔

"ہاں بیشک غریب ہیں۔ اسوجہ سے کہ خدا نے ان کی قوت چھین لی ہے۔ اسکی مرضی کے خلاف تم کچھ نہیں کر سکتے"۔

تشریف نے سر جھکا کر ایک سرد آہ بھری اور کہا "وجہ یہ ہے کہ ہم گنہگار ہیں ہم نے خدا کو بھلا دیا ہے اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ہمارا خاتمہ قریب ہے۔ اور دنیا ہمیشہ تو رہ نہیں سکتی"

گڈریے نے بھی ایک سرد آہ بھری اور اس رنج و غم سے پر داستان کو ختم کرنے کے لئے اٹھا اور بکریوں کو جو دور تھیں قریب لانا شروع کیا۔

تشریف بھی اٹھا اور گاڑی کی طرف چلنے لگا۔ وہ زمین کی طرف دیکھ کر کچھ سوچ رہا تھا وہ اب بھی کسی ایسی چیز کا خیال کر رہا تھا جو تباہی اور موت سے بچ رہی ہو۔ بھیڑ بکریوں کو یکجا کر کے گڈریا پھر درخت کے سہارے لگ کر کھڑا ہو گیا اور بانسری بجانے لگا۔ تشریف ٹھہر گیا۔ اسکو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بانسری میں سے تنزل تباہی اور موت کی آوازیں آ رہی ہیں وہ پھر گڈریے کے پاس واپس گیا اور اسکے چہرے اور بانسری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "زندگی کا سارا

لطف جاتا رہا اب زندہ رہنا ناممکن ہے مخراب فیلس دبائیں سب سے بڑھکر افلاس نے ہمارا خاتمہ کر دیا ہے" اس نے اپنی انگلیوں کو مروڑنا شروع کیا اور پھر کہا "آٹھ بچے اور میری بیوی ... میری والدہ بھی ابھی تک بقید حیات ہیں۔ اور میری کل تنخواہ ساٹھ روپے ماہوار۔ افلاس سے میرا گھر دوزخ بن گیا ہے بیوی بچے کاٹنے کو دوڑتے ہیں۔ مجھے ہر چیز سے نفرت ہی اگر دنیا کا خاتمہ ہو رہا ہے تو میں چاہتا ہوں کہ جلد سے جلد ہو جائے۔

گڈریئے نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپالیا اور تھوڑی دیر کے بعد ہاتھوں کو ہٹا کر کہا "زمین جانور، آسمان سب فنا ہوجائیں گے"

اب دیر ہو رہی تھی۔ تشریف نے اپنے کوٹ کا کالر اونچا کیا اور وہاں سے چلدیا۔ بانسری کی آواز اسے پھر سنائی دینے لگی۔ ہر چیز پر ایک اداسی برس رہی تھی۔ معلوم ہوتا ہی سب چیزوں نے ماتمی لباس پہن رہا ہے۔ تشریف کو گڈریئے کی باتیں یاد آگئیں اور رنج وغم کی وجہ سے وہ رونے لگا۔



بی ہمسائی

از سعید احمد

" اے ہے بہن! اب یہ پھر تمہارے گھر میں روز وہی قیامت رہنے لگی۔ دو چار مہینے تو چین سے گذارے ہوتے "۔

حمیدہ نے کچھ جواب نہ دیا اور خاموش کھڑی رہی۔

فہمیدہ۔ تم آج اس قدر چپ چپ کیوں ہو؟

حمیدہ۔ پھر بھی کچھ نہ بولی اور اسی طرح خاموش سر جھکائے کھڑی رہی۔ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے ہوئے تھے۔

فہمیدہ۔ (انتہائی ہمدردی کے ساتھ) میری بہن! تم خدا کے لئے منہ سے کچھ تو کہو، کیا بات ہوئی۔ کل ناصر میاں کے خفا ہونے اور چلانے کی آواز تو میں سن رہی تھی، اور میں نے اپنے دل میں خیال بھی کیا تھا کہ اب پھر لڑائی جھگڑے شروع ہوگئے۔ مگر اس وقت کی تمہاری حالت سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا نخواستہ بات کچھ زیادہ بڑھ گئی ہے۔ مجھ سے آخر کیوں چھپاتی ہو۔ تم جانتی ہو کہ میں کسی وقت میں بھی تمہاری بدخواہ نہیں ہوں۔

حمیدہ (بھرائی ہوئی آواز میں) آپا آپ کیسی باتیں کرتی ہیں میں بھلا آپ سے کوئی بات کیا چھپاؤنگی۔ آپ تو ماں سے بھی زیادہ مجھ سے محبت کرتی ہیں۔ اصل یہ ہے کہ میری کچھ تقدیر ہی پھوٹی ہوئی ہے۔ جتنا جتنا میں چاہتی ہوں کہ انہیں خوش رکھوں اور ناراض ہونے کا کوئی موقع نہ دوں اتنا ہی کام بگڑتا جاتا ہے اور روز روز کوئی نہ کوئی نئی بات ایسی نکل آتی ہے کہ جس پر انہیں غصہ آجائے۔

فہمیدہ۔ میری بہن! تم اس قدر رنج نہ کرو۔ خدا پر بھروسا رکھو وہ سب مشکلوں کو آسان کردے گا۔ اب تم پہلے مجھے بتاؤ کہ وہ بات کیا تھی جس پر وہ کل اس قدر آپے سے باہر ہورہے تھے۔

حمیدہ۔ کوئی بات ہو تو میں بتاؤں۔ اصل یہ ہے کہ شروع ہی سے انکی یہ تمنا تھی کہ کسی اچھی تعلیم یافتہ لڑکی سے شادی کریں جو ایف اے یا بی اے پاس ہو، خوب اچھی طرح انگریزی بولتی ہو، انکے ساتھ کلب میں جایا کرے۔ انکے دوستوں سے بے تکلف ملے جلے، اور دنیا بھر کی باتوں پر اُن سے بحث اور گفتگو کر سکے بدقسمتی سے انکی شادی ہوگئی میرے ساتھ نہ میں نے انگریزی

پڑھی تھی ورنہ انگریزی طور طریقوں سے واقف تھی اس لئے شروع ہی سے انہیں مجھ سے چڑ سی ہو گئی تھی اور اب حالانکہ میں بہت کچھ بدل گئی ہوں پھر بھی جب کوئی بات کل آتی ہے تو ان کے سارے وہی پرانے خیالات پھر تازہ ہو جاتے ہیں۔ اب آپا آپ ہی بتائیے کہ مجھ نگوڑی پردے کی بیٹھنے والیوں کو کیا معلوم کہ کونسل کسے کہتے ہیں اور اسمبلی کیا بلا ہوتی ہے کل کہیں اخبار میں کچھ ذکر تھا عورتوں کو بھی کچھ ووٹ ملے ہیں انہیں کیا سوجھی کہ سنتے ہیں بس گھر پہ کہتے ہی کہنے لگے کہ لو اب تو عورتوں کو بھی ووٹ مل گیا میں کچھ بھی نہیں سمجھی تو میں نے پوچھا کیا ہوا۔ بولے تم نے اخبار نہیں دیکھا نہیں اخبار سے کچھ دلچسپی نہیں ہے تم کبھی ... بھی نہیں ہو میں اردو کا اخبار صرف تمہاری وجہ سے خریدتا ہوں اور تمہیں ان خبروں سے یا ہمسایوں کے ساتھ فضول اور بیہودہ باتیں بنانے سے اتنی فرصت ہی نہیں کہ اسے اٹھا کر پڑھ لو۔ بھلا ایسی عورت کو بھی کسی طرح انسان کہا جاسکتا ہے کہ جسے اپنے ملک کے حالات کی کچھ خبر ہی نہ ہو اور جو خود اپنے فرقے کی ترقی سے بھی کوئی دلچسپی نہ رکھتی ہو۔ اسی طرح خدا جانے کیا کیا کہتے رہے۔ جو جو کچھ منہ میں آیا وہ کہا میری قسمت پھوٹ گئی۔ اماں جان نے مخمل میں یہ ٹاٹ کا پیوند لگا کر میری زندگی تباہ کر دی بھلا کوئی شریف آدمی ایک ایسی جاہل عورت کے ساتھ کیسے زندگی بسر کر سکتا ہے۔ دن بھر تو میں دفتر کے کام سے سر مارا کروں اور پھر رات کو بیٹھ کے بیگم صاحبہ کو کریما مقیماں پڑھایا کروں۔ میرے دماغ میں اتنی طاقت نہیں ہے میں نے تو جب سے آپ نے مجھے سمجھا دیا ہے جواب دینا بالکل چھوڑ دیا ہے میں تو کچھ بولی نہیں۔ آپ ہی آپ کوئی گھنٹہ بھر تک چلاتے رہے اور پھر صبح تک منہ پھولا رہا۔ صبح جب کچہری گئے ہیں تو اس وقت تک کسی قدر سوجے ہوئے تھے۔ اب بتائیے بھلا ایسی حالت میں کیا کروں

فہمیدہ (مسکرا کر) میں تو یہی کہوں گی کہ جیسا وہ بنانا چاہتے ہیں ویسی ہی بن جاؤ۔

حمیدہ آپا آپ جانتی ہیں کہ مجھے تو خود اس بات کی ایک پشیمانی سی رہتی کہ میری جہالت کی وجہ سے انہیں تکلیف ہوتی ہے اور ان کی زندگی خوشی میں نہیں گذرتی مگر میں کروں تو کیا کروں۔ اب یہ اسمبلی اور کونسل کے جھگڑے اور یہ ممبر اور انتخاب کے قصے مجھے کون سمجھائے اگر ان سے پوچھتی ہوں تو انہیں غصہ آجاتا ہے اور نہ پوچھوں تو پھر معلوم کیسے ہوں

فہمیدہ۔ یہ تو ان کی زیادتی اور ہٹ دھرمی ہے کہ تمہارے پوچھنے پر وہ ناراض ہو جائیں۔ انہیں چاہئے کہ جو بات بھی تمہیں نہیں معلوم ہے وہ تمہیں بتائیں۔ منہ دیکھی نہیں ہے میں بالکل

سچ کہتی ہوں کہ اگر وہ چراغ لیکر ڈھونڈیں گے تب بھی ایسی بیوی نہ ملے گی لیکن خبر نہیں، اب ظلم ہے یا زیادتی، بہرحال اسے برداشت ہی کرنا ہے۔ عقلمند عورتیں اپنے خاوندوں کی اصلاح بھی بالکل ویسے ہی صبر اور تحمل کے ساتھ کیا کرتی ہیں کہ جیسے بچوں کی۔ عورت کو خدا نے بڑا عجیب و غریب دل دیا ہے اور اسی لئے دیا ہے کہ وہ ضدی سے ضدی اور سرکش سے سرکش بچوں کی زیادتیاں دیکھے اور کبھی غصہ کا خیال بھی دل میں نہ لائے ایسی نئی زندگی میں خاوند بھی بالکل بچہ ہی ہوا کرتا ہے۔ وہ ضد بھی کرتا ہے مچلتا بھی ہے، جائز اور ناجائز کو بھی نہیں دیکھتا، اور ہر حال میں اپنا حکم منوانا اور اپنی بات بالا رکھنی چاہتا ہے بیوقوف عورتیں اس کیفیت کا مقابلہ کرنے کو کھڑی ہو جاتی ہیں اور اسی طرح اپنی اور اسکی دونوں کی زندگیاں تباہ کر لیتی ہیں عقلمند عورتیں صبر اور خاموشی سے کام لیکر ان ضدی اور سرکش بچوں کو چند روز میں ایسا مطیع اور فرماں بردار بنا لیتی ہیں کہ پھر ان سے بہتر خاوند ڈھونڈے نہیں مل سکتا۔ میں بہت خوش ہوں کہ تم اپنا کام نہایت اچھی طرح کر رہی ہو، اور میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ تمنے بہت کچھ کر لیا ہے اور بہت ہی تھوڑا باقی رہ گیا ہے صرف چند روز کی بات اور ہے اسکے بعد تم دیکھو گی کہ یہی ناصر میاں جو ذرا ذرا سی بات پر زمین اور آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں تمہارے پاؤں دھو دھو کر پیا کریں گے۔ کبھی کبھی اس طرح انکے خفا ہونے اور غصہ کرنے کا مطلب یہ نہ سمجھو کہ تمہاری محنت رائیگاں جا رہی ہے۔ نئے گھوڑے کو جب گاڑی میں نکالتے ہیں تو وہ بھی اسی طرح تھوڑی دور چلکر مچلا کرتا ہے۔

حمیدہ۔ جی ہاں آپا! آپ ٹھیک کہتی ہیں اب تو جو کچھ پڑی ہے اسے بھگتنا ہی ہے۔ میری اچھی آپا! ذرا مجھے آپ یہ کونسل اور اسمبلی کا مطلب تو بتا دیجئے۔ یہ کیا بلا ہوتی ہے اور اسمیں ممبر کیسے ہوتے ہیں۔

فہمیدہ۔ (مسکرا کر) بہت زیادہ تفصیل کے ساتھ تو میں سچ کہدوں مجھے بھی معلوم نہیں ہے۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ میں اخبار روز کا روز پڑھ لیا کرتی ہوں اور اسی کے ذریعہ سے کچھ تھوڑا بہت معلوم ہو گیا ہے۔

حمیدہ۔ آپ جانتی سب کچھ ہیں مگر ہر بات کے متعلق کہا یہی کرتی ہے کہ مجھے بھی کچھ زیادہ معلوم نہیں ہے

فہمیدہ۔ بہن یہ بالکل سچی بات ہے۔ میری کوشش یہ ہوتی ہے کہ جہاں سے بھی جو بات مل جائے اسے حاصل کر لوں اس لئے تھوڑی تھوڑی واقفیت ہر ایک بات کے متعلق ہو گئی ہے ورنہ تم جانتی ہو کہ میں نے کسی علم کی بھی باقاعدہ تعلیم نہیں پائی۔

حمیدہ۔ نہ جاننے پر تو آپ کا یہ حال ہے، جانتی ہوتیں تو خدا جانے کیا کرتیں۔ اچھا اب آپ مجھے وہ سمجھا دیجئے۔

فہمیدہ۔ بہن بات یہ ہے کہ ہر قوم اپنے ملک کا کسی نہ کسی طریقہ پر انتظام کیا کرتی ہے اور اب چونکہ ملک کا انتظام ایک باقاعدہ علم ہو گیا ہے اسلئے اسکا نام سیاسیات یا پولیٹکس رکھدیا گیا ہے

حمیدہ۔ میری سمجھ میں نہیں آیا ذرا صاف صاف کہئے۔

فہمیدہ۔ بہن فرض کرو کہ تمہارا کنبہ خوب بڑا سا ہو، کچھ آدمی اس میں نوکری کے ذریعہ سے روٹی کماتے ہوں، کچھ تجارت کرتے ہوں، کچھ کھیتی باڑی کیا کرتے ہوں، اور کچھ مختلف چیزیں بنا بنا کر بیچا کرتے ہوں، اور یہ سب الگ الگ اپنا خرچ نہ اٹھاتے ہوں بلکہ سب کی آمدنی ایک جگہ جمع ہو جاتی ہو اور گھر کے چند بڑے بوڑھے سارے گھر کا ایک سا انتظام کر دیا کرتے ہوں، سب کو وقت پر کھانا ملجاتا ہو، جوتی کپڑا ضرورت کے

مطابق ملتا رہتا ہو۔ بچوں کی تعلیم کا مناسب انتظام ہو، شادی بیاہ یا بیاری و درمیان اتفاق نہ پڑتوں کے لئے بھی ایک رقم ہمیشہ بچاکر رکھی جاتی ہو، اور گھر کے تمام کاج اور حفاظت کے لئے نوکر بیاکر موجود ہوں تو ان تمام باتوں کو ہم گھر کا انتظام کہتے ہیں۔ اب فرض کرو کہ یہی کنبہ بڑا ہوتے ہوتے اتنا بڑا ہوگیا کہ اس میں کروڑوں آدمی ہو گئے اور ایک گھر یا ایک گاؤں کی بجائے انہوں نے پورا ایک ملک اپنی آبادی سے بھر دیا تو اب ہم اس اتنے بڑے خاندان کو ایک گھر تو کسی طرح نہیں کہہ سکتے اسلئے اس کا نام ایک ملک رکھدیا جاتا ہے، اور اس پورے ملک کا انتظام جس جماعت کے سپرد ہوتا ہے اسے حکومت یا سلطنت کہتے ہیں۔ گھر کا انتظام تو ایک چھوٹی سی چیز ہوتا، اور اگر اس میں انتظام کرنے والوں سے غلطیاں بھی ہو جائیں تو بہت سے بہت یہی ہوگا کہ اس ایک خاندان کے کچھ آدمیوں کو نقصان پہونچ جائے، لیکن حکومت یا سلطنت کا انتظام اگر بری طرح کیا جائے، تو اس سے پوری قوم کی قوم تباہ اور برباد ہو سکتی ہے اسلئے حکومت کے انتظام کو ایک بہت بڑی چیز خیال کیا جاتا ہے اور اسے ایک باقاعدہ علم یا فن بنا دیا گیا ہے۔ بڑے بڑے عقلمند لوگوں نے اس فن پر خوب موٹی موٹی کتابیں لکھی ہیں جن میں یہ بتایا ہے کہ کس قسم کے حالات میں کس قسم کی تدبیریں اختیار کرنی چاہئیں، اور ملک کے اندر امن و امان قایم رکھنے اور ملک کی آمدنی بڑھا کر اسکی خوشحالی کو ترقی دینے کے لئے کیا کیا باتیں ضروری ہیں۔ اسی علم کا نام پالیٹکس ہے۔

سیدہ۔ اچھا یہ تو اس میں کونسل اور اسمبلی کہاں آگئی اور ممبر کہاں سے بنے؟

فہمیدہ۔ حکومتوں اور سلطنتوں کے انتظام کا ایک طریقہ تو یہی تھا کہ پوری قوم کی مرضی سے کسی ایک آدمی کے ہاتھ میں سیاہ اور سفید کا تمام اختیار دیدیا جاتا تھا اور وہ اپنی مرضی سے جو کچھ چاہتا تھا کرتا تھا، لیکن اس قسم کے انتظام کرنے والے کچھ دنوں کے بعد اپنی اصلی حیثیت کو بھول گئے اور جب انہوں نے دیکھا کہ قوم کا تمام روپیہ اور فوج سب انکے اختیار میں ہے تو انہوں نے تمام ملک کو اپنی ذاتی ملکیت اور ساری قوم کو اپنا غلام سمجھنا شروع کر دیا۔ اور اب بادشاہت قوم کی مرضی سے کسی ایک لایق شخص کو ملنے کی بجائے باپ سے بیٹے کو ورثہ میں ملنے لگی ایسی حکومتوں کو شخصی حکومت کہا جاتا تھا، لیکن چونکہ اس میں اکثر یہ ہوتا رہتا تھا کہ ایک اچھے اور لایق بادشاہ کے مرنے پر اسکا بیٹا جو تخت نشین ہوا وہ نہایت بیدرد بے وقوف اور ظالم نکلا اور قوم کو اسکے ہاتھ سے طرح طرح کی تکلیفیں پہونچیں اسلئے لوگ اس طریقے سے اکتا گئے اور بہت سی قوموں نے بغاوت کرکے ایسے بادشاہوں کو تخت سے اتار دیا اور انتظام اپنے ہاتھ میں لیلیا۔

قوموں نے اپنے ہاتھ میں انتظام لیکر حکومت کرنے کا جو طریقہ نکالا وہ یہ تھا کہ ہر ہر شہر سے دو دو چار چار بہترین آدمیوں کو چھانٹا جنکی قابلیت ہر شخص کو تسلیم تھی، اور اس طرح دو ڈھائی سو لایق آدمیوں کی جو جماعت بن گئی اس سے درخواست کی کہ وہ مل جل کر سب کے مشورے سے ملک کا انتظام کرے ان لوگوں نے اچھی طرح غور و فکر کرنے کے بعد یہ رائے قایم کی کہ ملک کے انتظامات کو کئی حصوں میں تقسیم کر دیا اور ہر حصہ یا شعبہ کا انتظام کرنے کیلئے اپنے میں سے ایک ایک لایق آدمی چنکر اس شعبے یا اس محکمے کا وزیر مقرر کر دیا۔

ہر چیز کے متعلق قاعدے اور قانون بنا دینے اور ان وزیروں کے ذمہ یہ فرض کر دیا گیا کہ مقررہ اصولوں کے مطابق اپنے اپنے محکمے کا انتظام کریں اور اگر کسی وقت کوئی دشواری پیش آجائے، نئے قاعدے بنانے کی ضرورت ہو، یا پرانے قاعدے میں کوئی تبدیلی کرنی پڑ جائے تو وہ قابل آدمیوں کی اس جماعت کے مشورے سے ہو کہ جو قوم میں سے چھانٹ لئے گئے تھے۔

اس طرح گویا یہ انتظام ہو گیا کہ اس بڑے خاندان یا ملک کی آمدنی پر کسی ایک شخص کو کوئی اختیار نہ رہا کہ جس طرح چاہے اسے خرچ کر دے بلکہ اب اختیارات اس دو ڈھائی سو آدمیوں کی جماعت کے ہاتھ میں چلے گئے کہ جو قوم میں سب سے زیادہ لایق تھے اور جن پر قوم کو بھی پورا پورا اعتبار تھا۔ ان لوگوں کے بنائے ہوئے قانون چونکہ درحقیقت پوری قوم کے بنائے ہوئے قانون تھے اسلئے کسی شخص کو ان سے انکار کرنے کی بھی مجال نہ تھی۔

یہ دو ڈھائی سو آدمیوں کی مجلس یا انجمن کسی ملک میں پارلیمنٹ کہلاتی ہے، کہیں سنیٹ، کہیں اسمبلی، کہیں کونسل غرضکہ ہر ملک میں مختلف ناموں سے مشہور ہے۔ ہمارے ملک میں انتظامات کی صورت یہ ہے کہ چونکہ یہ بہت بڑا ملک ہے اسلئے اسے چھوٹے چھوٹے کئی حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ہر حصہ کو ایک صوبہ کہتے ہیں جیسے تم نے پنجاب بنگال، بمبئی، مدراس، سرحد، اور ممالک متحدہ آگرہ و اودھ وغیرہ کا نام سنا ہوگا۔ ہر ایک صوبے میں انتظام کرنے والوں کی ایک مجلس ہے اسے اُس صوبے کی کونسل کہتے ہیں اور چونکہ یہ قانون بناتی ہے اسلئے اردو میں اسکا نام مجلس قانون ساز یا مجلس مقننہ رکھدیا گیا ہے۔ جس طرح ہر صوبے کی الگ الگ یہ مجلسیں ہیں اسطرح ہمارے ہندوستان کے انتظام کیلئے بھی ایک مجلس ہے جسمیں ہر صوبے سے قابل قابل آدمی چھانٹ کر مقرر کئے جاتے ہیں اور اس کا نام اسمبلی یا جمعیتہ مقننہ ہے۔ اپنے اپنے صوبوں کے لئے جو قانون بنانے ہوتے ہیں وہ تو صوبوں کی مجلسیں بنا لیتی ہیں، لیکن جن چیزوں کا تعلق سارے ہندوستان سے ہوتا ہے انکے متعلق قاعدے اور قانون بنانا جمعیتہ مقننہ کے سپرد ہے۔ ان مجلسوں میں خواہ وہ صوبے کی ہوں یا مرکزی جو قابل لوگ چھانٹ کر بھیجے جاتے ہیں وہ ان مجلسوں کے ممبر کہلاتے ہیں۔

حمیدہ (تعجب سے) لے ہے! تو یہ ممبر آدمی ہوتے ہیں؟

فہمیدہ (ہنسکر) اور نہیں تو کیا گدھے ہوتے ہیں!

حمیدہ۔ توبہ توبہ! میں تو یہ سمجھتی تھی کہ جیسے مسجدوں میں منبر ہوا کرتے ہیں ایسے ہی اینٹ پتھر کے بنے ہوئے ہوتے ہونگے۔

فہمیدہ۔ (ہنسکر) نہیں سب تو پتھر کے بنے ہوئے نہیں ہوتے بعض بعض تو حقیقتاً بڑے ہی قابل اور لایق لوگ ہوتے ہیں مگر ہاں بہت سے ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جنہیں اگر پتھر کی مورتیں کہا جائے تو کچھ غلط بھی نہیں ہے۔

حمیدہ۔ یہ کیوں؟ آپ تو کہتی ہیں کہ وہ ملک کے چھنٹے ہوئے لایق اور عقلمند لوگ ہوتے ہیں۔

فہمیدہ۔ ہاں قاعدے کے مطابق ہونا تو یہی چاہئے تھا کہ وہ قوم کے بہترین اور منتخب افراد ہوتے، لیکن بدقسمتی سے ہر ملک میں کچھ ایسا ہی دستور پڑ گیا ہے کہ ان لوگوں کو قوم کے لوگ اپنے آپ سے منتخب نہیں کرتے بلکہ ایسے لوگ کہ جنہیں حکومت کی کرسیوں پر بیٹھنے کی تمنا ہوتی ہے اور جو اس قسم کی عزت کے بھوکے ہوتے ہیں وہ انتخاب کے موقعوں پر خود اپنے

شہر کے لوگوں کے سامنے آ آ کر اپنی خوبیاں بیان کیا کرتے ہیں بڑے بڑے اشتہار چھپوا کر جا بجا دیواروں پر لگوا دیتے ہیں جن میں لکھا ہوتا ہے کہ فلاں صاحب کی ممبری کیلئے رائے دیجئے وہ آپ کے حقوق کی سب سے زیادہ حفاظت کرینگے۔ کوئی اپنے پچھلے کارنامے لوگوں کو سناتا پھرتا ہے جن میں سے آدھے سے زیادہ فرضی ہوتے ہیں کہ میں نے قوم کیلئے یہ کیا اور یہ تکلیف اٹھائی کوئی اپنے چندے سب کے سامنے گناتا پھرتا ہے کہ میں نے فلاں موقعہ پر خیرات کے ضمن میں اتنا چندہ دیا۔ بعض لوگ اپنے گرگے مقرر کر دیتے ہیں وہ غریب لوگوں کو دو دو چار چار روپے دیکر انہیں راضی کر لیتے ہیں کہ جو نام انہیں بتا دیا گیا ہے اسی کی ممبری کے لئے رائے دیں غرض یہ ہے کہ قوم اپنے نمائندوں کا انتخاب خود نہیں کرتی ہے وہ اکثر حالتوں میں وہی لوگ منتخب ہو جاتے ہیں کہ جو اپنے حق میں اپنے روپے کے ذریعے سے زیادہ رائیں حاصل کر سکیں اور وہ لوگ رہجاتے ہیں کہ جو فی الحقیقت قابل ہیں لیکن روپیہ خرچ کرنیکی استعداد نہیں رکھتے اسی طرح ان مجلسوں میں بہت سے ایسے لوگ پہنچ جاتے ہیں کہ جنکی جیبیں تو روپیوں سے بھری ہوئی ہیں لیکن دماغ عقل سے خالی ہیں۔ ایسے لوگ وہاں پہنچکر ظاہر ہے کہ کچھ بھی کام نہیں کر سکتے اور انہیں پتھر کی مورتیں کہنا بالکل صحیح ہے۔

حمیدہ۔ اچھا آپا کل وہ یہ کیا کہہ رہے تھے کہ عورتوں کو سوراج ملگیا؟

فہمیدہ۔ یہ تو انہوں نے مذاق سے کہا تھا، لیکن غالبًا انکا مطلب اس خبر سے ہوگا جو کل اخباروں میں چھپی تھی اور جس میں یہ لکھا تھا کہ انگریزی حکومت کے وزیر اعظم نے اعلان کیا ہے کہ عورتوں کو بھی ہر ایک صوبے کی مجلس مقننہ میں جگہیں دیجائیں گی۔ گویا ہر صوبے سے چند عورتیں بھی منتخب ہو کر مجلسوں میں اور جمعیتہ مقننہ میں جایا کریں گی اور مردوں کے ساتھ ملکر ملک کے انتظامات میں حصہ لیں گی۔

حمیدہ۔ کیا مسلمان عورتیں بھی جایا کریں گی؟

فہمیدہ۔ ہاں ہر صوبے سے کچھ مسلمان عورتیں منتخب ہوا کریں گی۔

حمیدہ۔ آپا یہ تو اچھا۔ عورتوں کے بھی شاید اب کچھ دن پھرے ہیں۔

فہمیدہ (مسکرا کر) اب یہ بہت طول طویل قصہ ہے کھڑے کھڑے میرے پانوں دکھ گئے۔ اسکے متعلق میں کل باتیں کرونگی۔



"سعید" کے متعلق ایک تجویز

"سعید" کی اشاعت کو بروقت لانے کے متعلق مجھے افسوس ہے کہ میری "مریضانہ" کوششیں اس وقت تک ناکام رہیں۔ دنیا میں اکثر ایسا ہوا کرتا ہے، اور یہی میرے ساتھ بھی ہوا کہ اپنے خیال میں میں نے تمام انتظامات مکمل کر لئے اور اپنی اس تکمیل اسباب کی بنا پر مجھے یہ یقین ہو گیا کہ بس اب "سعید" کی اشاعت وقت پر آ جائیگی اور اسکے ماتھے سے یہ کلنک کا ٹیکا دور ہو جائیگا، لیکن ہر مرتبہ یہی ہوا کہ وہ نہ ہوا جو میں چاہتا تھا، اور اگر "عرفت ربی بفسخ العزائم" (میں نے اپنے رب کو اپنے ارادوں کے فسخ ہونے سے پہچانا) صحیح ہے تو مجھے "سعید" کی اشاعت کے سلسلہ میں کئی مرتبہ معرفت ربانی حاصل ہو چکی ہے لوگوں کو مشکل سے یقین آئیگا، لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ کئی مرتبہ محض اس خیال سے کہ مبادا اسکی اشاعت میں اور بھی زیادہ تاخیر ہو جائے میں نے بستر علالت پر پڑے پڑے اسکے لئے مضامین لکھوائے ہیں، لیکن اس سے صرف اتنا ہی ہو سکا کہ مزید تاخیر کی آفت سے تو وہ بچ گیا۔ لیکن جو تاخیر ہو چکی تھی وہ بدستور قایم رہی "سعید" کے ایک سے زیادہ قدردانوں نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ "سعید" کی اشاعت کو بروقت لانے کا ایک بہت ہی آسان اور غیر ضرر رساں طریقہ یہ ہے کہ میں اگلے مہینے کا جو پرچہ شائع کروں وہ اگرچہ درحقیقت تو اکتوبر کا پرچہ ہوگا لیکن اسپر دسمبر کا مہر ڈالدیا جائے اور اسے دسمبر کا پرچہ فرض کر لیا جائے ایسا کرنے سے پرچے پر تو کوئی اثر پڑیگا ہی نہیں بجز اسکے کہ اسکی اشاعت صحیح وقت پر آ جائے، البتہ خریداروں پر یہ ناخوشگوار اثر پڑیگا کہ ان کے پورے دو پرچے غائب ہو جائیں اور سال بھر میں انہیں صرف دس ہی پرچے ملیں۔ اس کا تدارک یہ بتایا گیا ہے کہ میں ان تمام خریداروں کا چندہ جو اکتوبر سے پہلے خریدار بنے تھے اپنے یہاں دو دو مہینے بعد سے جمع کروں اور اس طرح دو مہینے بعد تک انہیں پرچہ دیکر انکے پورے بارہ پرچے کر دوں مثلاً کوئی صاحب اگست ۳۲ء میں خریدار بنے تھے تو اس حساب سے انکا چندہ جولائی ۳۳ء میں ختم ہو جانا چاہئے، لیکن اگر اکتوبر کے پرچے کو دسمبر کا پرچہ کر دیا جائیگا تو انہیں جولائی تک صرف دس ہی پرچے ملینگے اب اگر "سعید" کے دفتر میں انکا چندہ اگست کی بجائے اکتوبر سے جمع کیا جائے تو پھر انکا چندہ ستمبر ۳۳ء میں ختم ہوگا گویا انہیں پورے بارہ پرچے مل سکیں گے اور انہیں کوئی نقصان نہ پہونچ سکیگا۔

تجویز بہت معقول ہے اور اس قدر آسان کہ ہمارے مختصر منیجر صاحب بھی کہ جنکی ریاضی دانی حساب کے ابتدائی چار

قاعدوں تک محدود ہو کے رہ گئے۔ یہی نہیں بلکہ اسکی بہت کچھ داد دی۔ مجھے دلی مسرت ہو گی اگر "سعید" کے سب خریدار جلد سے جلد اس تجویز کے متعلق اپنی رائے سے مجھے مطلع فرمائینگے۔ اگر اسے عام طور پر پسند کیا گیا تو میں ایسا کرنے کے لئے تیار رہوں، اگرچہ ظاہر ہے کہ اسکے معنی اعتراف شکست کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتے۔

سالانہ چندہ میری متواتر درخواستوں، اور مختصر مینجر صاحب کی پیہم دعاؤں کے باوجود "سعید" کے کچھ خریدار ایسے باقی رہ ہی گئے کہ جنھیں کسی طرح یہ تکلیف گوارا نہ ہوئی کہ ایک منی آرڈر فارم لکھکر اپنا چندہ خود بھیجدیتے، اور ہمارے مینجر صاحب کا وقت اور اپنے تین آنے پیسے بچا لیتے۔ مجبوراً ستمبر کا یہ پرچہ انکی خدمت میں وی پی کے ذریعہ سے بھیجا جا رہا ہے، اور آپ یقین کیجئے کہ ہمارے "مختصر" صاحب یعنی کہ "مختصر مینجر صاحب" کا حلیہ قابل دید ہے۔ ہر مرتبہ وی پی کا فارم لکھنے کیلئے اٹھاتے وقت ایک ذرا باریک سی غصہ میں بھری ہوئی آواز سنائی دیتی ہے اور اگر کافی غور سے کان لگا کر سنا جائے تو کچھ اس قسم کے بے ربط سے جملے سمجھ میں بھی آ جاتے ہیں

"بھلا اس میں ان حضرات کا کیا حرج تھا۔ یہ مفت کی بیگار بھگتنے کیلئے ہم رہ گئے ہیں۔ منی آرڈر بھیجدیتے تو انہی کے تین آنے بچتے۔ اب تین روپے کی بجائے تین روپے تین آنہ دینگے تو خوش رہیں گے۔ (ایک جمائی لیکر) ذرا سی دیر لیٹنے کی بھی تو مہلت نہیں ملتی۔ خریداروں کے پتے لکھو، وی پی کے فارم بھرو، نئے خریداروں کے نام رجسٹر میں لکھو، کتابوں کے پارسل بناؤ، انکے وی پی لکھو، رجسٹر میں چڑھاؤ، حساب کی کتاب میں چندے جمع کرو ایک ایک پائی کا خرچ لکھو، آدمی نہ ہوا گھن چکر ہو گیا۔ (پھر جمائی) لاحول ولاقوۃ! کام کے وقت نیند بھی کس قدر ستاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا کوئی وقت ہی نہیں ہے جب چاہا دفتر میں آ کھڑے ہوئے نہیں تو ذرا دیر سو ہی لیتے (جمائی، توبہ توبہ!) آنکھیں بند ہوئی جا رہی ہیں (پانوں کی ڈبیا پر ہاتھ جاتا ہے۔ پان منہ میں رکھکر ذرا گاؤ تکیہ کی مدد سے کمر سیدھی کی جاتی ہے) کتنے فارم اور رہ گئے ہیں۔ ابھی تو بہتیرے ہونگے۔ (آنکھیں بند ہونے لگتی ہیں، اور اٹھنے کا خیال کرتے کرتے نیند آ جاتی ہے)۔

اب یہ محض اتفاق ہے کہ اکثر ٹھیک اسی وقت میرے پاس والا کاغذ ختم ہو جاتا ہے یا خود نویس قلم کی سیاہی، اور مجھے ان چیزوں کے لئے دفتر میں جانا پڑتا ہے۔ ایک ہلکی سی زیر لب مسکراہٹ کے ساتھ میں قلم دوات اور وی پی کے فارم لیکر خود لکھنے بیٹھ جاتا ہوں اور اب جو مینجر صاحب کی آنکھ کھلتی ہے، اور مجھے کام کرتے دیکھکر جس گھبراہٹ اور بدحواسی کے ساتھ وہ اٹھتے ہیں وہ منظر بہت ہی قابل دید ہوتا ہے۔ شرم، غصہ اور پریشانی کے ملے جلے آثار چہرہ پر کچھ اس قدر عجیب ہوتے ہیں کہ میری سب محنت وصول ہو جاتی ہے اور میں نہایت آہستگی سے یہ کہکر کہ "مینجر صاحب یہ چند فارم میں نے لکھدیئے ہیں" وہاں سے چپکے سے اٹھ آتا ہوں۔ اب اپنے غصہ کے عالم میں خریداروں کو وہ جو کچھ کہتے ہوں اسکی مجھے خبر نہیں۔

جلد ۳ — باتصویر — جنوری سنہ ۱۹۳۳ء

نمبر ۱ — ماہوار رسالہ — قیمت

ایڈیٹر سعید احمد بریلوی — سالانہ تین روپے (سے)

ششماہی ..... (۱۲ آنے)

فی پرچہ چار آنہ (۴/)

سعید دہلی

فہرست مضامین

ہمارے خیالات

مذہب و اخلاق

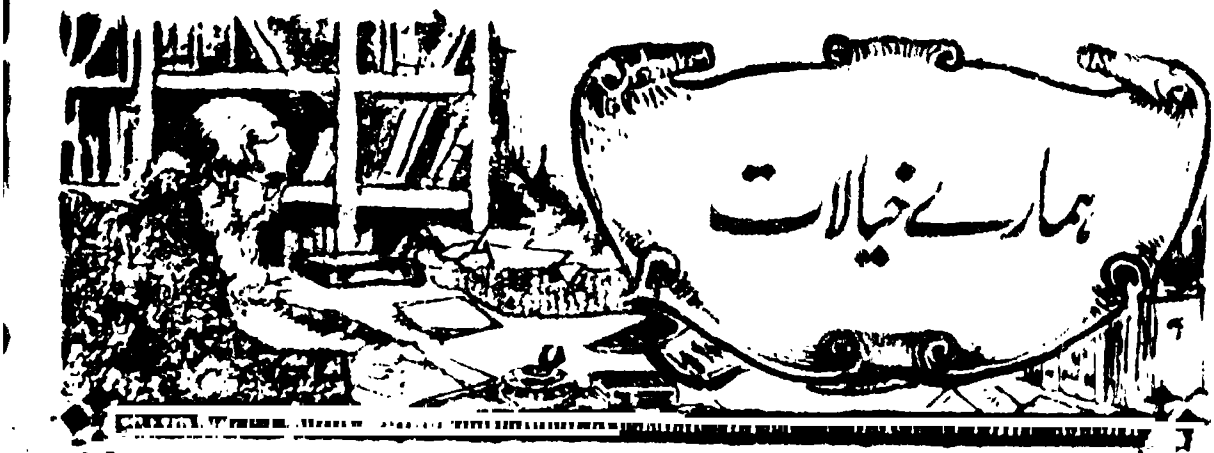
علم و ادب

افسانہ

اخذ ما صفا

عورتوں کے چار صفحے

راز حیات



جامعہ ملیہ دہلی کا یوم تاسیس جامعہ ملیہ ہر سال ۲۹ اکتوبر کو اپنا یوم تاسیس منایا کرتی ہے۔ یوم تاسیس سے مراد وہ دن ہے کہ جب اسکی بنیاد رکھی گئی تھی گذشتہ سال اپنی ناداری کے باعث جامعہ اس دن کی یادگار نہ منا سکی تھی یہ معلوم ہو جانے کے بعد ہر شخص کا ذہن خواہ نخواہ اس طرف منتقل ہو جاتا ہے کہ اس سال اسکی مالی حالت میں بہت کچھ فرق آگیا ہوگا۔ اور اب حالات اس قدر بہتر ہو گئے ہونگے کہ جامعہ اپنی سالگرہ منانے کے سلسلے میں تھوڑا بہت روپیہ خرچ کر سکے۔ جامعہ اور کارکنان جامعہ کے حالات سے پوری پوری واقفیت نہونے کی صورت میں ضرور یہی خیال ہونا چاہیے۔ لیکن افسوس کہ حقیقت حال یہ نہیں ہے۔ جامعہ کی مالی حالت میں اب بھی کچھ بہت فرق نہیں پڑا ہے اور اب بھی صورت حال یہ ہے کہ اساتذہ کی کئی مہینے کی تنخواہیں چڑھی ہوئی ہیں، لیکن ان شیدائیان ملت کی ہمت بلند نے انہیں مجبور کر دیا کہ وہ شیخ الجامعہ سے درخواست کریں کہ جو تھوڑا سا روپیہ آگیا ہے۔ اسے انکی تنخواہیں دینے کی بجائے سالگرہ منانے پر صرف کیا جائے تاکہ جامعہ کی سالگرہ منانے کی رسم موقوف نہو جائے۔

ناواقف حالات اصحاب کو یہاں پھر یہ شبہ ہوگا کہ یوم تاسیس منانے پر ہزاروں روپے صرف کئے جاتے ہونگے، لیکن ایسا نہیں ہے۔ جامعہ ملیہ کے سارے کام سادگی و پرکاری کے بہترین نمونے ہوتے ہیں۔ نمود و نمائش کو اس ادارے میں وہ درجہ حاصل نہیں ہے جو بالعموم دوسری یونیورسٹیوں میں ہوتا ہے اسلئے اس کے کاموں میں مسلمانانہ خودنمائی سے زیادہ اسلامی سادگی کی جھلک نظر آیا کرتی ہے۔

انتہا سے زیادہ ناموافق حالات میں زندہ رہنا اور صرف زندہ ہی نہ رہنا، بلکہ برابر ترقی کرنا جامعہ کا ایک ایسا کام نمایاں ہے کہ جس پر وہ جس قدر فخر کرے کم ہے، لیکن فخر و مباہات ارکان جامعہ کا مقصد زندگی نہیں ہے۔ انہوں نے جو مقصد اپنے پیش نظر رکھا ہے وہ اس سے کہیں رفیع و اعلیٰ ہے۔ انہوں نے اپنی زندگیاں قوم کی خدمت گزاری کیلئے وقف کر دی ہیں، اور اتنی بلند سطح پر پہونچ جانے والے انسان تعریف و ستائش سے بے نیاز ہو جایا کرتے ہیں۔ ظاہری دکھاوے کا انکے کاموں میں شائبہ نہیں رہتا، اور شہرت و عزت کا

خیال اگر دل میں آتا بھی ہے تو اسلئے کہ انکا اثر واقتدار قوم میں زیادہ ہو جائے اور وہ اپنے کام کو اور بھی زیادہ اچھی طرح انجام دے سکیں۔

اس سے پہلے کسی صحبت میں ہم یہ بتا چکے ہیں کہ جامعہ نے قرول باغ میں ایک مختصر اور خوبصورت عمارت اپنی ذاتی بنوالی ہے۔ یہ عمارت عوام کے روپے سے نہیں بنی ہو بلکہ جامعہ ہی کے استادوں اور طالب علموں نے تھوڑا تھوڑا کرکے اسکے لئے آپس میں چندہ کیا تھا اور یہ عمارت بنوا کر انھوں نے فی الحقیقت اپنے ایک عزیز طالب علم کی یادگار قایم کی تھی کہ جسے موت نے ہمیشہ کیلئے ان سے جدا کر دیا اب جامعہ نے اپنے لئے اوکھلے کے قریب ایک بہت بڑا قطعہ اراضی کا خریدا ہے، اور بد خواہوں کی درانداز یوں کے باوجود بالآخر اسکے بیع نامہ کی تکمیل اب ہو چکی ہے اور سال آیندہ اسی تاریخ کو اگر خدا نے چاہا تو جامعہ کی عمارت کا سنگ بنیاد وہاں رکھا جائیگا۔ خدائے پاک ان جواں ہمت بزرگوں کی ہمتوں میں برکت دے جو ایک آہن پوش جہاز کی طرح سخت سے سخت طوفانوں کا مقابلہ کر رہے ہیں، اور جنھوں نے اپنی کامیابیوں سے ثابت کر دیا ہو کہ جو لوگ زندہ رہنا جانتے ہیں انہیں کوئی فنا نہیں کر سکتا۔

یوم تاسیس حسب معمول بڑے زور وشور سے منایا گیا۔ ۲۸ر اکتوبر کو جامعہ کے بچوں نے چھوٹے چھوٹے تین ڈرامے دکھائے جن میں سے ایک ڈرامہ منشی پریم چند صاحب کے ایک افسانے سے تیار کیا گیا تھا جسکا نام "ستیا گرہ" ہے۔ یوں تو پورا ڈراما ہی بہت خوب کیا گیا تھا، لیکن بوڑھے رام کا پارٹ جس خوبی سے ادا کیا گیا اسکی داد نہیں دیجا سکتی۔ بہت سے مبصرین کا یہ خیال ہے کہ کوئی بہتر سے بہتر مشاق اور ماہر فن ایکٹر بھی اس سے زیادہ اچھا پارٹ نہ کر سکتا تھا۔ جو لوگ آئے ہیں کہ پریوں کا ناچ شہزادوں اور شہزادیوں کے عشق اور مسخروں کی خوش فعلیاں ڈراما میں دیکھنے کی عادی ہیں انہیں ضرور مایوسی ہوئی کیونکہ کسی ڈرامے میں ناچ گانے کا یا عشق و محبت کی داستان کا کوئی حصہ نہ تھا۔

۲۹ر اکتوبر کی شام کو شیخ الجامعہ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی نے جامعہ کے حالات لوگوں کو سنائے، ایک چھوٹے بچے نے جامعہ کی ابتدائی تعلیم کے متعلق رپورٹ پڑھکر سنائی، اور پھر ایک مختصر مگر بیحد دلچسپ بزم مشاعرہ منعقد ہوئی جس میں جناب جگر مرادآبادی، جناب ثاقب لکھنوی، جناب صفی لکھنوی، اور جناب حسرت موہانی جیسے بلند پایہ شعراء نے اپنے اپنے کلام سے حاضرین کو محظوظ کیا۔

جامعہ کی شائع کردہ کتابیں

ہم اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ لکھ چکے ہیں کہ جامعہ ملیہ نے اردو ادبستان (اکیڈیمی) قایم کرکے ادب اردو کی نہایت ہی مفید خدمت انجام دی ہے اس وقت تک جامعہ کا شعبہ تصنیف و تالیف کئی ایک نہایت ہی اچھی اور کارآمد کتابیں شائع کر چکا ہے۔ حال میں جو کتابیں جامعہ سے شائع ہوئی ہیں ان میں سے "آزادی"، "کیمیاگر" اور "سیرت محمد علی"، خاص طور پر قابل ذکر اور قابل قدر ہیں۔

"آزادی"، فی الحقیقت جان سٹوارٹ مل کی مشہور و معروف کتاب "لبرٹی" کا سلیس و بامحاورہ ترجمہ ہے جسکے ساتھ ڈاکٹر محمد مجیب صاحب بی اے (آکسن) کا مقدمہ شامل ہے یہ ترجمہ جناب سعید انصاری نے کیا ہو اور حق یہ ہے کہ اس

ترجمہ کے ذریعہ سے انہوں نے ثابت کردیا ہے کہ وہ جس قدر اچھے انشا پرداز ہیں اسی قدر اچھے مترجم بھی ہیں۔ ترجمہ کی یہ خوبی کہ اصل مصنف کا مفہوم دوسری زبان میں پورے طور پر ادا ہوجائے، اور کسی جگہ ایسا نہ ہو کہ الفاظ کی پابندی کی وجہ سے مطلب خبط یا بعید از فہم ہوجائے اس کتاب میں پورے طور پر موجود ہے، اور ایسے تمام موقعوں پر کہ جہاں تغلق پیدا ہوجانی قریب قریب یقینی تھی فاضل مترجم نے بڑی قابلیت سے مضمون کو صاف اور مطلب کو اچھی طرح واضح کردیا ہے

کتاب کے شروع میں ڈاکٹر مجیب صاحب کا جو مقدمہ ہے وہ بجائے خود مضمون "آزادی" پر ایک مبسوط اور تقریباً سیر حاصل بحث ہے، اور اسکے پڑھ لینے کے بعد اصل کتاب کے سمجھنے میں ذرا سی بھی دقت باقی نہیں رہتی۔ آج جبکہ ہندوستان جنگ آزادی میں مصروف ہے، اور حکومت اور رعایا کی تمام تر توجہ دستور سیاسی کی تشکیل و تکمیل پر مرکوز ہے، ایک ایسی کتاب کا مطالعہ ہر شخص کیلئے بدرجہ غایت ضروری اور مفید ثابت ہوگا کہ جو انہیں اس لفظ کے حقیقی مفہوم سے آگاہ کرسکے، اور انہیں ایسے اصول تعلیم کرسکے کہ جنکا جاننا قیام آزادی کیلئے لازمی ہے۔ اس قدر مدت دراز گذر جانے کے بعد بھی مل کی تعلیمات دنیائے سیاست میں اسی قدر وقیع سمجھی جاتی ہیں اور اسی سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ یہ کتاب کس درجہ مستند اور مفید ہوگی۔

کتاب اپنی ظاہری خوبیوں کے لحاظ سے بھی کافی نظر فریب ہے کاغذ کتابت، اور طباعت نہایت اچھی ہے ضخامت ۱۹۶ صفحے قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ۔ عہ/

کیمیاگر جناب پروفیسر محمد مجیب صاحب بی اے (آکسن) کے مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے۔ مجیب صاحب روسی ادب سے پوری پوری واقفیت رکھتے ہیں اور آپ کے افسانوں میں اکثر و بیشتر روسی ادب کا رنگ ہوتا ہے۔ افسانہ نویسی کی دنیا میں یہ بات عام طور پر مسلمہ ہے کہ روسی زبان سے زیادہ اچھے افسانے کسی زبان میں موجود نہیں ہیں یہی وجہ ہے کہ مجیب صاحب کے مختصر افسانے اس قدر دلکش اور پر لطف ہوتے ہیں کہ بے اختیار دل سے داد نکلتی ہے "کیمیاگر" میں جو افسانے شایع ہوئے ہیں وہ سب ڈاکٹر مجیب صاحب کے شاہکار ہیں، اور کسی افسانے کو شروع کرنے کے بعد ختم کئے بغیر کتاب کا ہاتھ سے چھوٹنا تقریباً ناممکن ہے۔

کتاب کی ظاہری شکل و صورت بھی بہت ہی پسندیدہ اور دل فریب ہے۔ قیمت۔ ایک روپیہ (عہ/)

سیرت محمد علی مولانا محمد علی مرحوم کی سوانح حیات اس سے پیشتر بھی مختصر سے پیمانے پر اردو میں شائع ہوچکی ہے، لیکن وہ بہت مختصر ہے، مسلمانان ہند کے اس قائد اعظم کی زندگی جس طریقے پر اور جن حالات میں بسر ہوئی ہے وہ درحقیقت اس قابل ہے کہ اسے جس قدر شرح و بسط کے ساتھ قوم کے سامنے پیش کیا جائے اسی قدر مفید ہے۔ انکی زندگی کے ہر ہر واقعہ میں نوجوانان قوم کیلئے عمدہ ایسے سبق موجود ہیں کہ جو شاید کسی مدرسہ اور کسی یونیورسٹی میں نہیں مل سکتے۔ مولانا کی مذہبی، قومی، اور ادبی سرگرمیاں ہمیں بتاتی ہیں کہ انسان خواہ کسی ماحول میں رہے، اور خواہ کسی قسم کی درسگاہوں میں تعلیم حاصل کرے، اسکی طبیعت میں جو جوہر قابل موجود ہے وہ ہمیشہ برائیوں میں سے بھی بھلائیاں اخذ کرتا رہتا ہے، اور حب قوم اور حب وطن کی

آگ اگر دل میں بھری ہوئی ہے تو خواہ ناموافق حالات کی راکھ کتنی ہی اس پر پڑ جائے پھر بھی وہ اندر ہی اندر برابر سلگتی رہتی ہے اور ایک ذراسی ہوا لگنے پر بھڑک اٹھتی ہے مولانا مرحوم کی زندگی فی الحقیقت اس قابل ہے کہ ارباب قوم بالخصوص اور نوجوان بالعموم اسکا بغور مطالعہ کریں، اور جامعہ ملیہ نے اس زندگی کو ایک کتابی صورت میں شائع کرکے درحقیقت قوم کی ایک بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔ اصل کتاب لکھی ہوئی تو مولنا عبدالماجد دریابادی کی نہیں ہے، لیکن انکی نظر ثانی کے بعد شائع کیگئی ہے اسلئے اس میں ادبی خوبیاں بھی کافی پیدا ہوگئی ہیں۔ مولنا عبدالماجد صاحب دریابادی کا ایک طویل و مبسوط مقدمہ بھی شامل کتاب جو بجائے خود ایک مستقل تصنیف ہے۔

کتاب کا سرورق سادگی و پرکاری کا بہترین نمونہ ہے اور کاغذ، کتابت، اور طباعت ہر چیز نہایت نفیس اور دیدہ زیب ہے۔ ضخامت پانچ سو صفحے قیمت تین روپے۔ یہ تینوں کتابیں منیجر مکتبہ جامعہ ملیہ قرول باغ دہلی سے مل سکتی ہیں۔

انجمن اتحاد الہ آباد

دنیا میں بہت سی انہونی باتیں بھی ہوجایا کرتی ہیں، اور چشم فلک نے اکثر ایسے تماشے دیکھے ہیں کہ انتہائی مایوسی کے بعد یکایک امید کے کچھ آثار پیدا ہوئے اور جس کام کے کرنے سے ابتک انسانی کوششیں عاجز رہی تھیں وہ چشم زدن میں پورا ہوگیا۔ مہاتما جی کا تاریخی برت اور پونہ کا میثاق اسکی ایک نہایت اچھی مثال ہے وہ ہندو کہ جن میں بعض نہ تو اپنے سگے بھائی اور اپنی بیوی کے ہاتھ کا کھانا کھانے سے بھی پرہیز کیا کرتے تھے اور جنہیں بظاہر دنیا کی کوئی طاقت اس بات پر مجبور نہ کرسکتی تھی کہ اچھوت ذاتوں کو اپنے برابر بٹھائیں اور اپنے جیسا انسان خیال کریں، یکایک اس قدر "گر گئے"، یا زیادہ صحیح الفاظ میں یوں کہہ لیجئے کہ اس قدر بلند ہو گئے کہ تمام چھوت چھات کے خیال کو بالائے طاق رکھدیا اور اس طرح اچھوتوں کو گلے لگا لیا کہ گویا ان سے کبھی کوئی پرہیز نہ تھا۔

بالکل اسی قدر عجیب نہ سہی، لیکن قریب قریب اتنا ہی عجیب نظارہ الہ آباد کی اتحاد کانفرنس نے پیش کیا ہے ہندو مسلم اتحاد کی اس سے پیشتر بہت سی کوششیں ہوچکی تھیں، اور ہر مرتبہ کی ناکامی لوگوں کے اس خیال کو مضبوط تر کرتی چلی جارہی تھی کہ خواہ "مشرق اور مغرب آپس میں مل جائیں" لیکن ہندو اور مسلمان جو دونوں مشرقی ہیں کبھی باہم متحد نہیں ہوسکتے۔ خود الہ آباد میں بھی قدم قدم پر مخالفتوں کے پہاڑ اٹھتے رہے، اور کبھی کونسل کی کرسیاں سد راہ بنیں اور کبھی سرکاری ملازمتیں، لیکن بالآخر وہ انہونی بات ہوکر رہی اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے وہی نمائندے کہ جو اس وقت تک ایک دوسرے سے دست و گریباں تھے سنگم پر گنگا اور جمنا کی طرح باہم بغلگیر ہوگئے۔ پنڈتوں نے سیدوں سے مصافحہ کیا، اور مولویوں نے مالویوں کو بڑھکر گلے لگایا۔ بہی خواہوں اور ہمدردوں کے گھر گھی کے چراغ جلے، اور اس وقت تک جو بدخواہ ہم پر ہنس رہے تھے انہیں سر پکڑ کر رونا پڑا۔ مسلمانوں کے مشہور و معروف چودہ مطالبات کہ جنہیں پریزیڈنٹ ولسن کے چودہ نکات کی سی اہمیت حاصل ہوگئی تھی اور جنہیں گذشتہ گول میز کانفرنس کے موقع پر وزیر ہند نے بلاتے استحقار

سے ٹھکرادیا تھا، ان میں سے ایک دو نہیں، بلکہ اکٹھے تیرہ ہندوؤں نے منظور کر لئے، اور مسلمانوں نے اس مخلوط انتخاب کو قبول کرایا کہ جسے ہمارے بہت سے گم کردہ راہ رہنماؤں نے ہماری نظروں میں ہوا بنا رکھا تھا۔

گلتی کے دو ایک اسلامی اخبار، اور معدودے چند خود ساختہ مسلمان زعما آج بھی اس معاہدہ کی مخالفت میں سرگرم ہیں، اور ایک بہت ہی کمزور اور ناتواں سی آواز اختلاف اب بھی ہمارے کانوں میں آرہی ہے، لیکن یہ آواز اس قدر بے طاقت اور ایسی دھیمی ہے کہ مسٹر سیموئل ہور اور انکے رفقا کار کے سوا شاید ہی کسی کی توجہ اسکی طرف منعطف ہوسکے۔

اللہ اللہ! ایک وہ زمانہ تھا کہ بھی اسلام تھا اور یہی مسلمان لیکن پاس عہد کا یہ عالم تھا کہ ایک مسلمان غلام کفار کی ایک جماعت سے کوئی معاہدہ کرآتا تھا تو مسلمانوں کی پوری جماعت اور خود امیرالمسلمین اس عہد کا پورا کرنا اپنے اوپر فرض خیال کر لیتے تھے اور اس معاہدہ کے ایک ایک لفظ کی پابندی کیجاتی تھی، یا آج یہ حالت ہے کہ کوئی غلام یا معمولی شخص نہیں بلکہ علمائے اسلام کی سب سے بڑی جماعت اور زعمائے اسلام کا ایک بہت ہی بڑا گروہ اپنی متفقہ رائے سے ہندوؤں کے ساتھ ایک معاہدہ کرتا ہے اور معاہدہ کی شرطیں بھی وہی ہوتی ہیں کہ جن پر مسلمانوں کی تمام جماعتوں کا اتفاق ہو چکا ہے، لیکن خود مسلمانوں ہی کے اندر سے کچھ لوگ اٹھتے ہیں اسلئے نہیں کہ تمام اہل اسلام سے اس معاہدہ کی پابندی کرائیں بلکہ اسلئے کہ اپنی زہر بھری تحریر و تقریر کے ذریعہ سے اگر ہو سکے تو کچھ لوگوں کو اسکی مخالفت پر آمادہ کریں اور اپنی ان گمراہانہ رہنمائیوں کا نام ان لوگوں نے "خدمت اسلام" اور "مسلمانوں کی ہواخواہی" رکھ چھوڑا ہے، کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کونسا اسلام ہے کہ جس کی خدمت کیلئے یہ لوگ اٹھے ہیں، اور مسلمانوں کی وہ کونسی جماعت ہے کہ جسکی ہواخواہی کے دعوے انکی زبانوں پر ہیں۔

سکھوں اور ہندوؤں کی جماعت میں بھی کچھ دشمنان ملک و قوم ایسے موجود ہیں جو اس معاہدہ کے راستے میں روڑے اٹکا رہے ہیں، اور قدم قدم پر نئے نئے جھگڑے اور عجیب عجیب مسئلے پیدا کر کے کام کرنے والوں کی دشواریوں میں برابر اضافہ کر رہے ہیں، لیکن ہمارا خیال ہے کہ ہمیں ان سے کچھ کہنے کا زیادہ حق حاصل نہیں ہے۔ یہ معاہدہ فی الحقیقت ترقی کے میدان میں ایک دوڑ ہے جس میں ہندوستان کی تمام مختلف قومیں دوڑ رہی ہیں، اور گھوڑ دوڑ میں ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ اپنے گھوڑے کو چھوڑ کر سوار دوسروں کے گھوڑوں کو ایڑ لگائیں یا چابک پر چابک جمائیں۔ انکی جماعتوں میں انکو مہمیز لگانے والے بہتیرے موجود ہیں اور وہ حسب ضرورت اپنی کوششوں سے اپنے گھوڑوں کو تیز کر سکتے ہیں۔ ہمیں جو کچھ کہنا ہے وہ اپنے ہم قوموں سے کہنا ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں کہنا ہے کہ "یہ میرا وہ تیرا" یا "یہ بھی میرا اور وہ بھی میرا" اسلامی سیاست کے اصول نہیں ہیں۔ اسلام نے جو سیاست ہمیں سکھائی ہے وہ اس "من و تو" کے جھگڑوں سے بہت زیادہ بلند ہے اور وہ یہ ہے کہ "سب کچھ تیرا مگر تو میرا" ہم اپنا سب کچھ دیکر بھی ہندوؤں اور عیسائیوں کو اپنا، یا اپنا نہ سہی کم از کم اسلام کا مداح اور بہی خواہ بنا سکیں تو یہ انتہائی سیاسی کامیابی اور حقیقی معنوں میں ہماری فتح ہے۔ کونسل کی کرسیاں تحفظات سی

نہیں ہیں کہ ان پر بیٹھتے ہی ہندوستان کی زمام حکومت ہمارے ہاتھوں میں آجائیگی پھر ایک ایک کرسی کیلئے لڑنا اور جھگڑنا آخر کیا معنی رکھتا ہے۔ حقیقی قوت نہ تلوار و تفنگ میں ہے اور نہ اسمبلی اور کونسل کے اندر اٹھتے ہوئے ہاتھوں میں اصلی قوت کا سرچشمہ ہمارا دل ہے اگر وہ حق و صداقت سے لبریز ہو۔ دنیا میں آج تک کوئی جابر سے جابر اور ظالم سے ظالم حکومت بھی اپنی تمام مادی قوتوں کے باوجود حق و صداقت پر غالب نہیں آسکی ہے اور صفحۂ دنیا سے حق کو نہیں مٹا سکی ہے۔ آج بھی قوانین الٰہی بالکل وہی ہیں جو آج سے ہزاروں سال پیشتر تھے۔ نہ خدا بدلا ہے اور نہ اسکے قانون۔ اگر اس پر ہمارا ایمان ہو، اور اگر حقیقی معنوں میں ہم مسلمان ہوں تو پھر نہ ہمیں انگریزوں کی حکومت سے کوئی خوف ہو سکتا ہے اور نہ ہندو راج سے کوئی اندیشہ۔ ہر حکومت اور ہر راج کو "رام راج" یا "اسلام راج" بننا پڑیگا اگر اسے اپنے قیام و استحکام کی تمنا ہے اور کوئی حکومت ہرگز ہرگز قائم نہیں رہ سکتی اگر اسکی بنیاد حق و انصاف پر نہ ہو۔ ہمیں فی الحقیقت، ہندوؤں، یا سکھوں، یا انگریزوں سے اپنی حفاظت کرنے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ اپنے دلوں کی ان شیطانی وسوسوں سے حفاظت کرنے کی ضرورت ہے کہ ہندو یا سکھ یا انگریز یا کوئی غیر اللہ طاقت ہمیں کوئی نقصان پہونچا سکتی ہے۔ ہمیں اپنے اس ایمان اور اس اعتقاد کو مضبوط کرنے کی ضرورت ہے کہ "حق کو کوئی طاقت فنا نہیں کر سکتی اور اسلام عین صداقت ہے"۔ ہم سے خدائے پاک کا وعدہ ہے کہ" لا تھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین "۔ (تم ڈرو نہیں اور رنجیدہ نہ ہو تمہیں سب پر فائق رہوگے اگر تم ایماندار رہو) کونسل اور اسمبلی کی کرسی، یا سرکاری دفتروں کی ملازمت منفعت بخش اور آرام دہ چیزیں ہوں لیکن یہ "بڑی چیزیں" نہیں ہیں۔ بڑی چیز ایمان کی قوت ہے" اور اگر ہم اس دنیا میں معزز و سربلند بنکر زندہ رہنا چاہتے ہیں تو جس طرح بھی ہو سکے اس قوت کو حاصل کرنا چاہئے۔ اس سے پہلے صرف کونسل کی کرسیاں نہیں، بلکہ شاہی مسند و تخت ہمارے قبضہ میں مدتوں رہ چکے ہیں، لیکن دنیا نے یہ تماشا دیکھ لیا کہ قوت ایمانی کے بغیر نہ سلطان محمود "غازی" تخت و تاج کی حفاظت کر سکے اور نہ اورنگ زیب "علیہ الرحمہ"۔ اللہ کا قانون ہمارے لئے بدل نہیں سکتا، اور وہ یہ ہے کہ اللہ کی زمین کے وارث دفتر اور کرسی والے نہیں، بلکہ اسکے نیک بندے ہوا کرتے ہیں جو اسکی زمین کو فتنہ و فساد سے پاک کریں، جو ظلم و عدوان کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دیں، اور جو اسکے بندوں کی خدمت میں بلا امتیاز مذہب و ملت زیادہ سے زیادہ مصروف و منہمک رہیں۔ ہم بھائی پرمانند اور ڈاکٹر منجے کے دستخطی ردی کے پرزے پر بھروسا کرنے کے لئے تیار ہیں، اور تمام تر کوشش اس پر صرف کر رہے ہیں کہ کسی طرح وہ یہ لکھدیں کہ بنگال اور پنجاب میں ہمیں اکیاون کرسیاں مل جائیں گی، لیکن افسوس کہ ہمیں خدائے قادر و توانا کی اس تحریر پر کوئی بھروسا اور کوئی اعتماد نہیں ہے کہ "اگر ہم ایماندار رہیں تو ہمیں سب پر فائق رہیں گے"۔ کیا یہی ہمارا وہ اسلام ہے جس کے بلند بانگ دعووں سے ہمنے چیخ چیخ کر دنیا کو سر پر اٹھا رکھا ہے؟ اور کیا اللہ کے کلام اور اللہ کے وعدوں کی اس سے زیادہ کوئی اور توہین ہو سکتی ہے؟

طلب حقوق کی لعنت اسلام کی تعلیم نہیں ہے۔ یہ سبق ہمنے مغرب سے سیکھا ہے کس قدر عجیب بات ہے کہ ہم دوسروں سے حق مانگتے پھرتے ہیں۔ کیا اسکے صاف اور صریح معنی یہ نہیں ہیں کہ "ہمارے پاس حق نہیں ہے"۔ ہم تو تمام دنیا کو حق دینے اور ظالموں اور غاصبوں سے لوگوں کے حق دلانے کے لئے نکلے تھے۔ یہ کیا ہوا کہ آج خود ہمارے اپنے خزانے خالی ہوگئے اور ہم دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلا رہے ہیں کہ وہ ہمیں "حق" دیدیں۔ آخر اسلام سے بہتر و برتر وہ کونسا "حق" ہے کہ جس کی ہمیں تلاش و جستجو ہے، اور جس کے لئے ہم کبھی مالوی جی کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہیں اور کبھی سر سیموئل ہور کی خدمت میں آداب بجالاتے ہیں؟

حقوق طلبی کا نتیجہ کبھی باہمی نفرت و عناد کے سوا اور کچھ

نہیں نکلا کرتا، اور ایسے میثاق ناموں کی عمر کہ جن پر فریقین نے ایک ایک حق پر لڑنے اور جھگڑنے کے بعد دستخط کئے ہوں بہت ہی تھوڑی ہوا کرتی ہے۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ ہم سے ہماری مصیبت کے وقت جو چیز دباؤ ڈالکر حاصل کر لی گئی ہے اسکے واپس لینے کے لئے ہم ہر وقت مضطرب و بیقرار رہیں، اور یہی انسانی فطرت ہے کہ ہمیں ہر اس شخص سے نفرت ہو جائے کہ جو کسی نازک موقع پر دباؤ ڈالکر ہم سے کوئی چیز لے لے۔ ہندو ہوں یا مسلمان اور عیسائی ہوں یا سکھ، بہر حال انسان ہیں، اور معاہدہ کی تکمیل کے بعد ہر زخم خوردہ فرقے کو رات دن یہی فکر لگی رہیگی کہ جس قدر جلد ممکن ہو کھوئی ہوئی چیز واپس لے لے۔ یہی نہیں بلکہ یہ فکر بھی ہوگی کہ صرف اپنے اسی "حق" کی بازیافت پر قناعت نہ کی جائے بلکہ ممکن ہو تو اس سے کچھ زیادہ حاصل کر لیا جائے اور ظاہر ہے کہ اس طرح کشمکش اور فساد کی بنا بدستور موجود رہتی ہے۔ حقیقی اتحاد صرف ایسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ جب ہر فرقہ زیادہ سے زیادہ لینے کی نہیں، بلکہ زیادہ سے زیادہ دینے کی کوشش کرے۔ تاریخ ہمیں بتا رہی ہے کہ مسلمان اس وقت میں بھی کہ جب انکے پاس نہ تعداد کی قوت تھی، اور نہ دولت و مال کی ایسا کر چکے ہیں۔ کاش وہ پھر اسی آموختہ کو آج بھی دہراتے اور سادہ کاغذ ہندوؤں اور سکھوں کے سامنے رکھکر کہدیتے کہ "لو جو تمہارا جی چاہے وہ لکھ لو ہمیں امن و صلح کی خاطر ہر شرط منظور ہے"! لیکن ایسا تو وہی لوگ کر سکتے ہیں کہ جنکے پاس ایمان و یقین کی قوت موجود ہو!

نو مہینے کا سال

"سعید" کے گذشتہ پرچے میں یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ چونکہ ایڈیٹر کی طویل علالت کے باعث "سعید" کی اشاعت تقریباً تین مہینے پیچھے رہ گئی ہے اور باوجود کوشش ابتک نہ اسے صحیح وقت پر لایا جا سکا ہے اور نہ مستقبل قریب میں ایسی امید ہی پڑتی ہے کہ اسے صحیح وقت پر لایا جا سکیگا اسلئے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آیندہ پرچے پر اکتوبر کی بجائے دسمبر کا مہینہ ڈالدیا جائے اور خریداروں کا چندہ دو مہینے بعد سے جمع کیا جائے تاکہ انہیں نقصان نہو اور پورے بارہ پرچے انہیں مل جائیں۔ اس تجویز کو عام طور پر بہت پسند کیا گیا ہے اور اکتالیس میں سے صرف تین خط ایسے ہیں کہ جن میں اسکی مخالفت کی گئی ہے۔ ان میں سے بھی دو خطوں میں مخالفت کا باعث یہ لکھا گیا ہے کہ اس طرح خریداروں کو تین روپے میں صرف دس پرچے ملیں گے۔ ہمیں افسوس ہے کہ ان دونوں صاحبوں نے "سعید" کی تجویز کو غور سے نہیں پڑھا ورنہ وہ ایسا نہ لکھتے۔ فرض کیجئے کہ کوئی صاحب اگست ۳۲ء میں "سعید" کے خریدار ہوئے تو انکا سال بھر کا چندہ جولائی ۳۳ء میں ختم ہو جائیگا۔ اگر ہم انکا چندہ اگست ہی کے مہینے میں جمع کریں تو اس صورت میں کہ اکتوبر کے "سعید" کو دسمبر کا پرچہ بنا دیا جائے یقیناً انکا نقصان ہے کیونکہ جولائی ۳۳ء تک انہیں صرف دس ہی پرچے ملیں گے، لیکن اگر دفتر میں انکا چندہ اگست کی بجائے اکتوبر ۳۲ء سے جمع کر لیا جائے تو انکا سال جولائی کی بجائے ستمبر ۳۳ء میں ختم ہوگا اور انہیں پورے بارہ پرچے مل جائینگے "سعید" کا ہرگز ہرگز یہ منشا نہیں ہے کہ وہ خریداروں کے دو پرچے ہضم کر جائے۔ وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ اسکے ماتھے سے یہ کلنک کا ٹیکا دور ہو جائے کہ اسکی اشاعت صحیح وقت پر نہیں ہوتی۔

تجویز کی موافقت میں اتنی بہت سی رائیں وصول ہونیکے بعد اب ہمیں اس کو عملی جامہ پہنانے میں تامل ہونیکی کوئی وجہ نہ تھی اسلئے دفتر نے کہ جس میں ایک عدد ایڈیٹر اور ایک نفر منیجر شامل ہیں یہ فیصلہ کیا ہے کہ ستمبر ۳۲ء کے پرچے پر کہ جو پچھلے مہینے میں شائع ہو چکا ہے اس سال کو ختم کر دیا جائے اور یکم جنوری ۳۳ء کو جنوری کا پرچہ شائع کرکے "سعید" کی اشاعت کو بالکل صحیح وقت پر لے آیا جائے اس طرح ہمارا پچھلا سال صرف نو مہینے کا رہجائیگا لیکن ہم جنوری سے پیشتر کے اپنے تمام خریداروں کا چندہ انکی تاریخ خریداری سے تین ماہ بعد سے اپنے یہاں جمع کرینگے تاکہ "سعید" کا سال نو مہینے کا ہو جانے کے باوجود خریداروں کا سال پورے بارہ ہی مہینے کا رہے اور انہیں کسی قسم کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا نقصان بھی نہ اٹھانا پڑے۔ خدا کرے کہ اس مرتبہ یہ تفصیل سب کی سمجھ میں آجائے اور اب کوئی صاحب یہ نہ لکھ بھیجیں کہ اس میں تو ہمارا تین پرچوں کا نقصان ہو گیا۔



دنیا بھر میں سب سے زیادہ دیر تک پانی میں تیرنے والا





ہندوستان کے دیہات میں انڈیا لیگ کے وفد کا دورہ مس ولکنسن اور مسٹر مینن دیہاتی لوگوں کے ہمراہ کھڑے ہوئے۔



آئینہ میں کیا دیکھا؟

(از سعید بریلوی!)

توبہ توبہ! اللہ کی پناہ!

ارے یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں کس قدر دل ہلا دینے والے منظر ہیں! یہ میں کس دنیا میں آگیا؟ —— میں تو آئینہ کے سامنے صابون اور استرے سے اپنی ڈاڑھی مونچھوں کی تواضع کرنے کھڑا ہوا تھا۔ روزمرہ صبح کو اسی طرح کھڑا ہوتا رہا ہوں۔ برسیں گذر چکی ہیں اس میں کبھی فرق نہیں آیا۔ ہمیشہ اسی آئینہ میں اپنی صورت دیکھی ہے اچھا کھلتا ہوا سا رنگ، خوب چوڑی پیشانی، بڑی بڑی اور سیاہ آنکھیں، چھوٹا سا خوشنما دہانہ، غرض یہ کہ ایک اچھی خاصی خوشنما صورت نظر آیا کرتی تھی۔ دیکھ کے جی خوش ہو جاتا تھا۔ اکثر بڑی بڑی دیر تک میں فخر اور مسرت کی ان لہروں کے ساتھ کھیلتا رہتا تھا جو اپنے حسن اور اپنی جوانی اور اپنی تندرستی کی نشانیوں کو آئینہ میں دیکھ دیکھ کر میرے دل میں اٹھا کرتی تھیں۔ بالوں کی قدرتی سیاہی اور چمک غیر اختیاری طور پر ہاتھوں کو مجبور کر دیا کرتی تھی کہ اٹھیں اور پیشانی کی طرف سے شروع کر کے سر کے تمام بالوں پر سے گذرتے اور ان کی نرمی کی لذت محسوس کرتے پیچھے تک چلے جائیں۔ استرے کی تیز دھار کا گالوں اور نو بالیدہ بالوں پر پھسلنا ایک دل خوش کن آواز پیدا کیا کرتا تھا، اور مجھے یاد ہے کہ اس ہلکی ہلکی سرسراہٹ سے میری طبیعت کو ایک کیف انگیز سرور حاصل ہوا کرتا تھا۔

آج بھی میں اپنی آئینہ کے سامنے آکر کھڑا ہوا تھا روز ہی صبح کو بستر سے اٹھکر میں اسی جگہ کھڑا ہوتا تھا۔ پھر یہ آج کیا ہوا کہ آئینہ میں میری صورت کہیں نظر نہیں آتی —— یہ عجیب غریب دنیا کونسی ہے —— یہ تو اچھا خاصہ سینما کا پردہ ہے۔ سینکڑوں عمارتیں! ہزاروں انسان!

توبہ توبہ! افوہ! کیسا بھیانک منظر ہے؟ دیکھا نہیں جاتا۔ آنکھیں بند کر لیں تب بھی وہ اسی طرح نظر آرہا ہے۔ خدایا تیری پناہ —— دنیا میں لیسے بیدرد انسان

بھی موجود ہیں۔ ایک غریب اور بیکس عورت پر اس قدر ظلم! مگر ہائیں!۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ تو میری اپنی سی صورت ہے! یقیناً میری ہی تصویر ہے اور یہ عورت بھی تو میری بیوی ہی ہے!۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ یا اللہ! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں سب مجھے یاد آیا۔۔۔۔۔ یہ تو میری اپنی زندگی کا ایک واقعہ ہے۔ مجھے یاد ہے اور خوب اچھی طرح یاد ہے یہ تمام حرکتیں میں نے کی تھیں۔ افوہ! اس وقت تو میرے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہ گذری تھی کہ میں کوئی ظلم کر رہا ہوں۔ میں اسے اپنا جائز حق تصور کرتا تھا۔ بیوی کو تمام دنیا ایسا ہی سمجھتی ہے، اور میں بھی یہی سمجھتا تھا کہ وہ میری ایک لونڈی یا باندی ہے جسے میں نے روٹی کپڑے پر رکھ چھوڑا ہے۔ جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں ان میں سے ایک ایک بات بالکل سچ ہے۔ میں واقعی یہی سمجھا کرتا تھا، اور میں کیا ساری دنیا یہی سمجھتی ہے کہ مرد پر عورت کا کوئی حق نہیں ہے بجز اسکے کہ اسے برا بھلا کھانا کھلادے اور کچھ موٹا جھوٹا کپڑا پہننے کو دیدے لیکن عورت پر مرد کے بے شمار اور بے تعداد حقوق ہیں۔ دن رات کے چوبیسوں گھنٹے برابر خاوند کی خدمت میں لگے رہنا، جس چیز کو وہ دن کہے اسے دن اور جسے وہ رات کہے اسے رات سمجھنا، خود برا کھا کر اسے اچھا کھلانا اور خود برا پہنکر اسے اچھا پہننے کا موقع دینا، خاوند کے اگر سر میں ذرا سا درد ہو جائے تو ساری ساری رات اسکے سرہانے بیٹھکر بسر کرنا اور اگر خود بیمار ہو تو تاوقتیکہ بیماری کی شدت حد سے نہ بڑھ جائے اسکا ذکر کرکے کبھی خاوند کی خوشیوں میں خلل نہ ڈالنا اور پھر اس قدر اطاعت شعاری اور خدمت گذاری کے باوجود ہر وقت نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ ان لات اور جوتوں کیلئے بھی تیار رہنا کہ جو وقتاً فوقتاً خاوند کی متبرک اور مقدس بارگاہ سے اسکے حصہ میں آتے رہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہاں ہاں مجھے خوب یاد ہے، میں نے ایک مرتبہ اسے صرف اس بات پر مارا تھا کہ اسکے دوپٹوں کے لئے جو تنزیب میں لایا تھا وہ اُسے پسند نہ تھی اور اسکی زبان سے صرف اتنا لفظ نکل گیا تھا کہ "تمہارے گھر آکے مجھے کبھی ایک کپڑا بھی اپنی پسند کا پہننے کو نہ ملا!" یہ بالکل صحیح تصویر ہے غصہ سے میری حالت اس وقت بالکل یہی تھی۔

افوہ! کتنی بری صورت ہے! اگر مجھے معلوم ہو جاتا کہ غصہ میں آدمی کی صورت اس قدر بری اور نادیدنی ہو جاتی ہے تو شاید میں کبھی ہرگز غصہ نہ کرتا۔ اس وقت تو مجھے یہی معلوم ہوا تھا کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں یہی بالکل جائز اور درست ہے۔ ایک بیکس اور مظلوم عورت کو مارتے میرے دل نے ذرا سی بھی شرم محسوس نہ کی تھی لیکن اس آئینے میں اپنی اس حرکت کی تصویر دیکھکر تو میں شرم سے پانی پانی ہوا جاتا ہوں۔ یا اللہ! کیا میں سچ مچ ایسا ہی سنگدل اور ظالم انسان ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

ایں! یہ کیا! یہ تو میری اپنی بچی ہے۔ وہ کیا، وہ سامنے سلیمہ ہی تو کھڑی ہے یہ اس کے بدن پر نیل کیسے؟ ارے میں نے اسے بھی تو بیچاری کو مرتبہ مارا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

اف! یہ میں نے کیا کیا تھا؟ اس ننھی سی جان پر ایسے ظلم! خدا کی پناہ! ہاں میں تو فخر کے ساتھ کہا کرتا تھا کہ "میرا غصہ بہت خراب ہے" وہ تھا بھی واقعی خراب میں اندھا ہو جاتا تھا، بالکل اندھا!۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہائے!

اس چھ برس کی بچی پر کیا گذری ہوگی جب اسکے پھول سے بدن پر میرے موٹے موٹے اور طاقتور ہاتھوں کے گھونسے اور تھپیڑ پڑ رہے ہونگے! بیدردی کی انتہا ہوگئی! یا اللہ یہ تصویریں کہاں سے میرے سامنے آگئیں؟ مجھ سے نہیں دیکھا جاتا۔ مارتے وقت تو مجھے کچھ بھی خیال نہیں ہوا تھا۔ اس وقت تو میرے دماغ نے یہ عذر گھڑ لیا تھا کہ میں انہی کی صلاح کی خاطر اسے سزا دے رہا ہوں۔ یہ اب معلوم ہو رہا ہے کہ میرے دماغ نے مجھے فریب میں مبتلا کر رکھا تھا، اور میں درحقیقت بچوں کی صلاح کے لئے نہیں، بلکہ اپنے غصہ کی آگ کو بجھانے کی خاطر انتقام کے طور پر بچوں کو مارا کرتا تھا۔

الٰہی تیری پناہ! یہ سب میری اپنی زندگی کی تصویریں اور میرے اپنے اعمال کی تفسیریں ہیں! یا رب خدا! میرے ظاہر اور باطن میں اتنا فرق! میرا نماز روزہ سب وسروں کو فریب دینے کے لئے ہوتا تھا۔ میری لمبی ڈاڑھی فی الحقیقت صرف ایک بڑی سی ٹٹی تھی جس کی آڑ میں شکار کھیلا کرتا تھا۔ لوگ، سادہ لوح اور بے وقوف لوگ آتے تھے اور آآکر انتہائی تعظیم کے ساتھ میرے ہاتھ چوما کرتے تھے۔ وہ تو میں نے خود اس زندگی سے عاجز آکر ڈاڑھی منڈا دی ورنہ آج بھی یہی حالت ہوتی۔

یہ کون؟ ——— ارے یہ بھی تو میری ہی زندگی کا ایک رخ ہے۔ یہ میں ہی تو کھڑا ہوا آزادی وطن پر لوگوں کے سامنے تقریر کر رہا ہوں۔ مجمع میری تقریر کو سنکر جوش کی وجہ سے بیتاب ہوا جا رہا ہے۔ ہزار ہا جوشیلے نوجوان بیتاب ہیں کہ کب انہیں موقع ملے اور وہ مادر وطن کے قدموں پر اپنی جانیں فدا کردیں۔ لیکن میرے اپنے دل میں کہیں حب وطن کا نام و نشان تک نہیں ہے۔

اس تمام زبانی ہنگامہ آرائی سے میرا مطلب اسکے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ میں عوام کا رہنما اور پیشوا بنجاؤں، اور حکومت وقت یہ دیکھکر کہ عوام کی باگ میرے ہاتھ میں ہے خوب اچھی طرح میری قدر افزائی کرے۔ ایسی عزت و مرتبت کے حصول کے لئے میں نے کیا کچھ نہیں کیا ہے۔ میں نے انتہائی کوشش کر کے قوم کو دو حصوں میں منقسم کر دیا اور ان میں اس قسم کے خیالات پھیلا دیئے کہ وہ ہمیشہ آپس میں برسر پیکار اور مصروف کارزار رہیں۔ میں نے اپنی چرب زبانی سے ایک فرقہ کے دل میں یہ بات بٹھا دی کہ اگر میں موجود نہ ہوتا تو دوسرا فرقہ انہیں پیس ڈالتا، اور تباہ و برباد کر دیتا۔ یہ سب کچھ اسلئے تھا کہ یہ فرقہ کبھی کسی وقت میں بھی میری گرفت سے آزاد نہونے پائے اور ہمیشہ مجھی کو سر اور آنکھوں پر بٹھائے رکھے۔ ظاہر میں اس فرقے سے اپنی محبت جتانے اور ہر وقت حب قوم کے راگ گانے کے باوجود دل میں میری یہ حالت تھی کہ میں ہر وقت خود ہی اس فرقے کی بیوقوفیوں پر ہنستا، اور اسکی حماقتوں پر اسے گالیاں دیا کرتا تھا۔

میری ان سرگرمیوں کی بدولت کیسے کیسے خراب نتیجے پیدا ہوئے!! اُفوہ! ——— یہ تمام خون کی ندیاں انہی لوگوں کے خون کی تو بہ رہی ہیں، جنہیں میں نے بھڑکا اور شہادت کا شوق دلایا تھا۔ کیسے کیسے کڑیل نوجوان! ——— اُف بیسیوں بیگناہ بوڑھے! ——— بہت سے بے قصور بچے اور سینکڑوں معصوم عورتیں میری

[redacted]

ان ہنگامہ خیزیوں کی بھینٹ چڑھ گئیں! ——— الٰہی تو یہ دیکھا نہیں جاتا، کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ یہ سینکڑوں بیوائیں اور ہزاروں یتیم جنہیں کہیں پیٹ کو ٹکڑا اور تن کو کپڑا میسر نہیں آتا میری ہی جادو بھری تقریروں کی بدولت تو پیدا ہوئے ہیں۔ ہائے! یہ تازہ تازہ اور رنگین خون جو سڑکوں پر بہتا نظر آتا ہے انہی لوگوں کا تو ہے جنکے سینوں کے اندر مجھ سے زیادہ شریف ایماندار اور بہادر دل تھے، اور جو مجھ سے اس قدر محبت کرتے تھے کہ میرے ادنیٰ سے اشارہ پر انہیں اپنی جانیں دیدینے میں بھی تامل نہ ہوا افسوس! ——— میں نے قوم کے کیسے کیسے لائق اور ہونہار فرزندوں کو اپنی خودغرضی اور خودپرستی پر قربان کر ڈالا ———

میں دیکھتا ہوں کہ میری سیاہ کاریاں یہیں تک محدود نہیں ہیں دنیا میری بداعمالیوں کی تصویروں سے بھری پڑی ہے اس سے پہلے تو مجھے کبھی ایسا معلوم نہ ہوا تھا کہ میں برا کر رہا ہوں۔ ہمیشہ ہر کام کے لئے کوئی نہ کوئی معقول عذر میرے پاس موجود ہوتا تھا اور اس عذر سے مجھے کامل اطمینان بھی ہو جاتا تھا۔ آج یہ کیا ہو گیا کہ مجھے اپنے سارے کام اپنے اصلی رنگ میں نظر آ رہے ہیں؟ اب وہ کریم اللہ والی زمین ہی کا معاملہ ہے۔ جس وقت میں نے اپنی بیٹھک بنوانے کے لئے یہ زمین اس سے لی تھی تو اس میں شک نہیں کہ وہ کسی طرح بھی اسے علیحدہ کرنا نہ چاہتا تھا اور میں نے اسے فریب دیکر اور اس پر مختلف قسم کے ناجائز دباؤ ڈالکر یہ اس سے حاصل کی تھی لیکن میں نے یہ سوچکر اپنا اطمینان کر لیا تھا کہ میں نے اس سے مفت میں زبردستی اسکی زمین نہیں چھینی ہے بلکہ اس کا معاوضہ دیکر اپنے کام کے لئے اسے حاصل کیا ہے۔ آج مجھے نظر آ رہا ہے کہ وہ اور اسکے بچے سب بے در بے گھر مارے مارے پھر رہے ہیں اور انہیں اتنا ٹھکانا انکے پاس نہیں ہے کہ ذرا اپنا سر چھپا لیں اور برسات کے مینہ، جاڑوں کی ہوا، اور گرمی کی دھوپ سے پناہ لے سکیں۔ آج مجھے یہ بھی محسوس ہو رہا ہے کہ جو معاوضہ میں نے اسے دیا تھا وہ بالکل ناکافی تھا۔ میں نے اسکا مکان لیا تھا اور صرف زمین کے دام دیئے تھے۔ میری فریب کاریوں، اور میرے ظلم وستم کے اور بھی بہت سے واقعات اس وقت میری نظر کے سامنے ہیں۔

اس وقت مجھے نظر آ رہا ہے کہ میں نے غریبوں کو لوٹ لوٹ کر اپنا گھر بھرنا ہمیشہ اپنا شعار رکھا ہے۔ مزدوروں سے زیادہ سے زیادہ کام لیکر انہیں کم سے کم اجرت دینا، چونکہ وہ حساب نہیں جانتے اسلئے حساب کتاب میں دھوکا دیکر انکی کچھ رقم اینٹھ لینا، بیماری یا اسی قسم کی اور ضرورتوں کے لئے اگر ان میں سے کسی کو روپیہ کی ضرورت ہو تو انتہائی بے دردی اختیار کر کے بڑی سے بڑی شرح سود پر انہیں روپیہ قرض دینا، اپنے قرضے اور سود کی وصولیابی کے لئے انکا گھر بار اور انکا ساز و سامان سب قرق کرا کے انہیں بھیک مانگنے کے سوا اور کسی قابل نہ رکھنا۔ غرض یہ کہ اپنی خواہش اور اپنے ارادے کے پورا کرنے کے لئے ہر قسم کے مظالم روا رکھنا میرا روزمرہ کا معمول ہے اور حیرت یہ ہے کہ ان میں سے کسی ایک کام کے کرتے وقت بھی میرا دل نہیں جھجکتا، اور میرا ضمیر مجھے ملامت نہیں کرتا۔ میں نے کیسے کیسے جعل اور

فریب کرکے اپنے بھائیوں کی جائداد پر قبضہ کیا، اور بھانجے کو ایک فرضی مقدمہ میں پھنسوا کر حبس دوام کی سزا دلانا اور اس طرح اسکی تمام جائداد پر قابض و متصرف ہو جانا تو ایسا کارنامہ تھا کہ جس پر اکثر میں اپنے دل میں فخر کیا کرتا تھا، لیکن آج اسکے خیال سے میری روح کانپ رہی ہے۔ کالے پانی کی مختصر اور تنگ انسانیت آبادی میں مجھے اپنا بھانجا خراب وخستہ اور آوارہ وسرگرداں نظر آرہا ہے۔ رنج وغم نے اسکی حالت تباہ کر دی ہے۔ اسکا سرخ وسفید رنگ اب سیاہی مائل زردی میں تبدیل ہو گیا ہے۔ دق کا مہلک بخار اسکی ہڈی ہڈی میں رچ گیا ہے، اور اسکا ہاتھی سا ڈیل اب ایسا لاغر ونزار ہو گیا ہے کہ گویا ہڈی اور کھال کے سوا اس میں کچھ بھی نہیں ہے ——— آہ اسکی حالت تو بہت ہی نا دیدنی ہے۔ کاش میں نے ایسا نہ کیا ہوتا! ——— میری بھتیجی ذکیہ بھی تو سامنے کھڑی ہے۔ رنج والم کی مجسم تصویر ——— حسرت ویاس کا مرین پیکر ——— سفید جیسے دھلا کپڑا ——— ہر وقت کے رونے سے آنکھیں سوجی ہوئی۔ میں نے اسکی شادی ایک ساٹھ برس کے بڈھے سے کر دی تھی صرف اس امید میں کہ بڈھا پانچ سات برس میں مرجائیگا اور اسکی ساری جائداد میرے تصرف میں آجائے گی۔ ایسا ہی ہوا وہ مرگیا، اور اب نظام پور کی زرخیز زمین اور ربھورے والا مشہور آموں کا باغ میری ملکیت ہے۔ لیکن ذکیہ پر کیا گذرگئی؟ یہ مجھے آج معلوم ہو رہا ہے۔ اُف! اسکی صورت تو کسی طرح نہیں دیکھی جاتی ——— میرے دل پر اس وقت چھریاں چل رہی ہیں ———

ارے یہ قطار کی قطار وہ بدنصیب لڑکیاں ہیں جنہیں فریب دے کر اور شادی کے جھوٹے وعدے کرکے میں نے اپنی ہوسناکی کی آگ بجھائی تھی انکے دلفریب حسن کیا ہو گئے؟ ان سب کی صورتوں پر کیسی مردنی چھائی ہوئی ہے! اُف توبہ توبہ! الٰہی تیری پناہ! ———

اور اپنی ان تمام شیطانی حرکتوں کے باوجود میں اپنی قوم میں ایک شریف اور ایک معزز آدمی خیال کیا جاتا ہوں! ——— کیا یہ میری دولت ہے جسنے میرے تمام عیوب پر پردہ ڈال رکھا ہے؟ خدا نہ کرے کہ اس آئینہ پر کسی اور کی نظر پڑے! ——— ایں یہ کیا؟ وہ تمام صورتیں غائب! ——— وہی میرا اپنا روزمرہ کا آئینہ، وہی استرا، وہی صابون اور وہی گرم پانی! یہ آخر میں نے آج کیا دیکھا تھا؟

اب میں یہ سمجھا کسی طرح اتفاقیہ طور پر میری نظر اپنے دل کے آئینہ پر پڑ گئی تھی ———

آغوش جرم میں

نا انصافی اور انصاف دنیا میں کوئی چیز نہیں

(گذشتہ سے پیوستہ)

از جناب مظہر انصاری بی اے (آنرز)

ہماری رائے میں اس چیز کا کوئی وجود ہی نہیں۔ موجودہ حالات بتا رہے ہیں کہ جس چیز کو آپ "انصاف" کہتے ہیں اسے ذمہ داری سے متعلق کرکے وجود میں لایا جا سکتا ہے۔ مگر مشکل تو یہ ہے کہ ذمہ داری خود اپنے وجود کے لئے دوسری چیزوں کی شرمندۂ منت ہے ہم سب کم و بیش وہی ہوتے ہیں جو حالات یا فضائیں ہمیں بنا دیں اس لئے حالات اور فضا کو دیکھے بغیر کردار کا جائزہ لینا

انصاف تو کیا قطعی نا انصافی ہے

قیدوں اور سزاؤں کے لئے ہمارے انسداد جرم کے نئے پروگرام میں کوئی گنجائش نہیں ہے اور ہمارے آئندہ قوانین ذیل کے دو امور تک محدود ہونگے۔

(۱) سوسائٹی کا تحفظ اور (۲) مجرم کا سدھار یعنی انسداد جرم کا مطلب یہ ہوگا کہ مجرم کو سوسائٹی میں دوبارہ داخل کر لیا جائے۔

اس اصول پر عمل کرنے کیلئے ان وجوہات اور رجحانات کا تجزیہ کرنے کی ضرورت پڑے گی جو مجرم کی ذہنیت پر مستولی ہوتی ہیں۔

مختلف قوموں میں وجوہات اور رجحانات مختلف ہونگے۔ کہیں تو جرم کی تہ میں سرمایہ داری ہوگی کہیں مفلسی اور کہیں دولت کی غیر مساوی تقسیم اور مذہبی اختلافات اس سلسلے میں ناگزیر ہونگے۔ معاشرت، اقتصادیات، شخصی حیثیت، ماحول وغیرہ کا بھی ارتکاب جرم میں ہاتھ پایا جائیگا۔

آخری دو چیزیں یعنی شخصی حیثیت اور ماحول بہت اہم ہیں مثال کے طور پر مندرجہ ذیل واقعات کو دیکھئے۔

حامد کا خاندان: ۱۵۰ برس کے عرصے میں ۵ بہنوں نے ۲۰۹۴ ورثار پیدا کئے۔ ان میں سے نصف کے قریب دماغی حیثیت سے کودن تھے۔ باقی نصف زندگی کی دوڑ میں کچھ زیادہ آگے نکل سکے اسی خاندان میں ۱۴۵ عورتیں تھیں جن میں سے ۱۲۷ نے پیشہ کمانے کی طرف رجوع کیا

سوال پیدا ہوتا ہے کہ مجرم کی ذہنیت کو جانچنے کا معیار کیا ہوگا؟

جسمانی نظام کو دیکھنا کیا معنے اگر آپ ٹکڑے ٹکڑے بھی کر ڈالیں تو اخلاقی کمزوری کا پتہ نہیں لگا سکتے۔ اخلاقی بودے پن کا سراغ تو دماغی کمزوری ہی سے مل سکتا ہے اور اس بودے پن کی صورت عموماً یہ ہوتی ہے کہ یا تو آدمی پر کوئی غیر معمولی دباؤ پڑ گیا یا خود غرضی اور خلوص کی باہم آویزش میں خلوص کا جذبہ شکست کھا کر دب گیا۔ تو گویا انسداد جرم کا طریقہ سزا دہی نہیں ہوا۔ اخلاقی حالت کے سدھار سے یہ مشکل حل ہو سکتی ہے۔

لاعلاج افتادگی کی نسل

مجرم کے سدھار کا سوال سامنے آئیگا تو ہمیں جرم کی تہ میں کام کرتی ہوئی چیزوں کی جستجو ہوگی۔ ہمیں ان وجوہات کی جستجو ہوگی جنہیں جرم کی بنا کہا جاسکے۔ منجملہ او رجوہات سے ایک وجہ ہے نسلی خرابی۔ یہ خراب نسل لوگ نہ صرف خود انسانیت کیلئے بمنزلہ ایک زخم کے ہیں بلکہ اس لحاظ سے کہ یہ لوگ اپنی مجرمانہ صلاحیتیں اپنے ورثا کو سونپ جاتے ہیں، ایک مستقل مرض ہیں۔ ایسے لوگوں کا تنہا علاج یہ ہے کہ انہیں باقی قیدیوں سے الگ رکھا جائے۔

قتل کی سزا

کیا قتل کی سزا ہمیشہ موت ہونی چاہیئے؟

ہر زمانہ میں قتل کی سزا موت تجویز کی گئی ہے اور اب بھی صدہا اشخاص ایسے نکلیں گے جو اس طرز عمل کو سراہیں گے۔ غالباً ان کے پاس دو دلیلیں ہونگی۔

(۱) قاتل کی موت سوسائٹی کے تحفظ کیلئے لازمی ہے۔

(۲) اگر قاتل کو زندہ چھوڑ دیا جائے تو اور لوگوں کی، جنہیں یہ مادہ موجود ہے، ہمتیں بڑھ جائینگی۔

مگر کیا یہ دلائل اس قدر مضبوط ہیں کہ ہم ان کی سچائی پر شبہ نہ کر سکیں؟

یہ صحیح ہے کہ قاتل کی جان لیکر ہم سوسائٹی کو اس آفت سے بچا لیتے ہیں جو کسی وقت اسکے ہاتھوں سے ٹوٹ سکتی ہے۔ مگر قاتل کی جان کے لاگو اتنا تو سوچیں کہ ہم انسانی سرمائے کے ایک جز کو خواہ مخواہ ضائع کر رہے ہیں اور بغیر اس خیال کے کہ ممکن ہے کہ اس میں کسی مفید کام کی صلاحیتیں ہوں۔ ہماری رائے میں قتل کی سزا میں جان لینا نہ صرف قابل اعتراض ہے بلکہ تکلیف دہ بھی ہے۔ پنجاب کی پولیس ہر سال دو سو قاتلوں کی گردنوں کو پھانسی کے پھندے سے لا ملاتی ہے۔ مگر اس وقت بھی پنجاب کے جیلوں میں ۲۸۲۷ قیدی ایسے موجود ہیں جنپر قتل یا اقدام قتل کا الزام ہے۔ آپ کہیں گے اس سے تو یہ معلوم ہوا کہ موت کا ڈر بھوکے ہندوستانی کو قتل سے نہیں روک سکتا۔ مگر میں کہتا ہوں آپ صرف ہندوستان تک نگاہ کو کیوں محدود رکھیں متمول دنیا کے فرسٹ کلاس براعظم امریکہ کو دیکھیے۔ وہاں بھی تو یہی حال ہے۔ موت کا ڈر اس شخص کو تو ڈرا سکتا ہے جسنے جذبات کی رو میں یا گھبراہٹ میں کسی کو قتل کر ڈالا ہو۔ لیکن ان قاتلوں کے دل پر یہ "ڈر" کچھ اثر نہیں کرتا جو جان بوجھ کر اس گرداب بلا میں پڑتے اور جو اپنے سینے کو اس امید سے بھرپور رکھتے ہیں کہ ہماری قسمت قانون سے سلٹ لیگی۔

تاریخ کہیں نہیں بتاتی کہ موت کا ڈر قتل کی وارداتوں میں کوئی نمایاں کمی کر سکا ہے۔ برخلاف اس کے مختلف ملکوں میں موجودہ حالات کی رفتار بتا رہی ہے کہ پھانسی کی سزا اڑا دینے کے بعد ان جرایم میں کوئی نمایاں زیادتی نہیں دیکھی گئی جنکے لئے بطور سزا پھانسی کا تختہ مقرر تھا

میں جانتا ہوں کہ اپنے اس قول سے میں بڑے بڑے لایق ججوں اور بڑے بڑے قابل بیرسٹروں کی مخالفت کر رہا ہوں مگر جو چیز اپنی دانست میں صحیح سمجھتا ہوں اسے بلند آہنگی سے کہنے پر مجبور ہوں اور ایک بار پھر اس

اصول کو دہراتا ہوں کہ اگر قتل کی سزا پھانسی کو اڑا دیا جائے اور مناسب تبدیلیاں کردی جائیں تو قتل کی وارداتیں نمایاں کمی ہوسکتی ہے۔

آپ پوچھیں دلیل؟

میں کہوں گا ایک دلیل تو ہمارے پاس یعنی سزا کے مخالفین کے پاس یہی ہے کہ ہمارے مخالفین کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ یا ہے کوئی جواز ان کے پاس اس طریقہ کا کہ قاتل کو پھانسی کی سزا ضرور ہی دیجائے۔

آج اگر ہندوستان میں کوئی عورت اپنے نوزائیدہ بچے کو لیکر کنوئیں میں جا گرے اور پھر کسی نہ کسی طرح بچا بھی لیجائے تو رائج الوقت قانون کے مطابق یعنی عمر قید کی سزا دیگا اور بیک وقت اس پر دو الزام لگائے جائیں گے۔ اول خودکشی دوسرے اپنے بچے کا اقدام قتل۔

مگر ہم پوچھتے ہیں کہ آخر کیوں ایک نئی زچہ کو عمر قید کی سزا دینے والے اس حقیقت کو فراموش کرجاتے ہیں کہ اس عورت نے ابھی زچگی سے فراغت پائی ہے اور ممکن ہے کہ اسکا توازن دماغ زچگی کی تکلیفوں کی وجہ سے قایم نہ رہ سکا ہو (ہندوستان میں کھانے کو ملتا ہی کیا ہے) ایسے کیس قانون بجائے ڈاکٹری کو کیوں نہ دیئے جائیں۔ اور ماہرین علم النفس کے کیوں نہ سپرد کئے جائیں کہ وہ دیکھیں کہ آیا ہندوستان کی ایک بیٹی تکلیفوں سے مجبور ہوکر اپنے وطن کو اپنی صلاحیتوں سے محروم کررہی تھی یا کیا؟

پھر یہ بھی تو یاد رکھنا چاہیئے کہ ہر نوع کے قاتلوں کو ظلم کی ایک ہی چھری کے نیچے رکھ لینا انصاف نہیں ناانصافی ہے۔ ممکن ہے کہ ان ہی قاتلوں میں جنہیں ہم حلال کردیتے ہوتے ہیں کوئی غریب ایسا بھی ہو جسنے جذبات کے ہاتھوں سے لاچار ہوکر یہ حرکت کرڈالی ہو یا جسکا دماغ حالات کی پیچیدگیوں میں الجھ کر رہ گیا ہو اور جو اپنی محدود سمجھ بوجھ کی وجہ سے ان سے نبرد آزما نہ ہوسکا ہو۔ یا ممکن ہے کہ وہ اپنے تحفظ کیلئے ایسا کرنے پر مجبور رہا ہو۔

زمانہ مستقبل میں جرم کے بیج کا ناس مارنے کی کوشش کیجائے گی اور جرم کے مریض کی دماغی حالت کا مطالعہ کیا جائیگا۔ اسے جسمانی آزار نہیں پہنچایا جائیگا۔

آپ ذرا غور کریں تو معلوم ہوگا جرم کا باعث ہی زیادہ تر یہ دماغی خرابی ہوتی ہے یا پھر ماحول کے اثرات یا مفلسی یا خرابی نسل ہمیں دماغوں کی تربیت کرنی چاہیئے ماحول کو بہتر بنانے کی کوشش کرنی چاہیئے مفلسی سے چھٹکارا پانے کی فکر کرنی چاہیئے اور ابتر نسل کے لوگوں کو سوسائٹی کے اعلیٰ سیاہیہ لا کھڑا کرنے کی تدبیریں سوچنی چاہئیں۔ مرض کی جڑ کو پاجانا اور اسکی فکر کرنا بس یہ ہے ہمارا کام۔

(باقی آیندہ)



مطائبات آزاد

(از حضرت آزاد انصاری مدظلہ)

جہاں تک ہو، مذاق آرزوے یار پیدا کر
جہاں تک ہو، خیال ماسوا سے عار پیدا کر

نظر کیفی، طبیعت مست، دل سرشار پیدا کر
جو پیدا کر سکے، یہ حال صہبا بار پیدا کر

یہ مانا، الفت دلدار کے جذبات سب صادق
مگر پہلو میں دل توقابل دلدار پیدا کر

نگاہ لطف کی جائیگی، اس کی فکر لاحاصل
مگر حالت نگاہ لطف کی حقدار پیدا کر

زباں تک شکوۂ محرومی دیدار آنا تھا
خطاب آیا، کہ جا اور طاقت دیدار پیدا کر

ابھی سے غایت فدویت و ایثار کے دعوی؟
ابھی تو عادت فدویت و ایثار پیدا کر

اگر دیر و حرم کی خاک چھانی بھی تو کیا حاصل
جہاں تک ہو، خرابات مغاں میں بار پیدا کر

اگر دنیا میں خود کو زندہ ثابت کر دکھانا ہی
تو اٹھ اور زیست کے کامل تریں آثار پیدا کر

مثال جسم بے جاں زندگی کاٹی تو کیا کاٹی
ثبوت زندگی ناقابل انکار پیدا کر

تجھے آزاد! یوں درویش کامل کون مانیگا
جہاں سے ہو اجر جبہ و دستار پیدا کر

سروش بیداری

از جناب محمود اسرائیلی

مکدر ہے فضائے امن جب تک دل مکدر ہیں
بہت نزدیک ہے وہ دن کہ سب شیر و شکر ہونگے

قدم اپنے اٹھا غافل ہے منزل تیری قدموں میں
جواب تک سو رہے ہیں وہ بھی تیری ہمسفر ہونگے

چمن تیرا نہیں تو پھونک برق آہ سے بلبل
بجائے گل یہی ہوگا کہ مٹھی بھر شرر ہونگے

تو اس حیرت کدہ میں پھونک بھی دے صور بیداری
بدل جائیگا عالم منقلب یہ بحر و بر ہونگے

غلامی سے رہائی کیا ہو لب کھلتے نہیں تیرے
جو نالے دل سے نکلیں گے کہاں تک بے اثر ہونگے

تری ہستی ہے ناکارہ تو اچھا ہے کہ مٹ جائے
تری مٹی سے پیدا تجھ سے بہتر کچھ بشر ہونگے

طلسم خیال

اندرجیت شرما ماچھرہ ضلع میرٹھ

اگر دل آپ کے قابل نہیں ہے
تو کوئی اور شے ہے دل نہیں ہے

مجھے بزم فلک سے کیا تعلق!
یہ دنیا کیا تری محفل نہیں ہے

تبسم گریہ بلبل پہ اے گل!
ترے پہلو میں شاید دل نہیں ہے

بھروسہ چاہیئے مشکلکشا پر
مری مشکل کوئی مشکل نہیں ہے

زمانہ ہو رہا ہے تجھ سے غافل
کسی سے تو مگر غافل نہین ہے

وہ کس قابل رہا دونوں جہاں میں
تری رحمت کے جو قابل نہیں ہے

نظر آتا نہیں آنکھوں سے لیکن
ترے جلوہ سے خالی دل نہیں ہے

کسی کے دل پہ قبضہ کیا کروں گا
مرے قابو ہی میں جب دل نہیں ہے

جواہر پارے

(۱) خَيْرُ الْخَيْرَانِ يَعِيْشَ الْمَرْءُ حُرًّا اَوْ يَمُوْتَ۔
سب سے بڑی بھلائی یہ ہے کہ انسان یا تو آزاد زندہ رہے یا پھر مرجائے۔

(۲) غُبَارُ الْعَمَلِ خَيْرٌ مِّنْ زَعْفَرَانِ الْعَزَلِ۔
محنت ومشقت کا گرد وغبار بیکاری کے زعفران سے اچھا ہے۔

(۳) اَلْحَرَكَةُ بَرَكَةٌ وَالتَّوَانِيْ هَلَكَةٌ وَالْكَسَلُ شُؤْمٌ۔
حرکت میں برکت ہے سستی بربادی کا باعث ہے اور کاہلی پوری نحوست ہے۔

(۴) حِرْفَةُ الْمَرْءِ كَنْزُهٗ۔
آدمی کا کام ہی اس کا خزانہ ہے۔

(۵) لَا يَكُوْنُ مُحِبُّ الْاَوْطَانِ مَنْ لَّا يَخْرُجُ عَنِ الْحِيْطَانِ۔
"وہ شخص محب وطن نہیں ہوسکتا جو چہار دیواری سے باہر نہ نکلے" (سیر وسیاحت نہ کرے)

(۶) اَلْعَاقِلُ يَسْتَفِيْدُ مِنَ الْاَبْرَارِ الْفَضِيْلَةَ وَمِنَ الْاَشْرَارِ تَجَنُّبَ الرَّذِيْلَةِ۔
"عقلمند اچھوں سے خوبیاں حاصل کرتا ہے اور بروں سے برائیوں سے بچنا سیکھتا ہے۔

(۷) مُحَرِّضٌ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ مُقَاتِلٍ۔
ایک ابھارنے والا ہزار لڑنے والوں سے بہتر ہے۔

(۸) اِذَا اسْتَرْذَلَ اللّٰهُ عَبْدًا حَظَرَ عَلَيْهِ الْعِلْمَ۔
اللہ جس بندے کو ذلیل کرنا چاہتا ہے اسکو تحصیل علم سے روک دیتا ہے۔

(۹) اِنْ يَّكُنِ الشُّغْلُ مَجْهَدَةً فَالْفَرَاغُ مَفْسَدَةٌ۔
کام سے بھی تکلیف ضرور ہوتی ہے لیکن بیکاری تو بربادی کا باعث ہے۔

(۱۰) كَفٰى بِالْمَرْءِ فِتْنَةً اَنْ يُّشَارَ اِلَيْهِ بِالْبَنَانِ۔
آدمی کو فتنہ میں مبتلا کرنے کے لئے یہ کافی ہے کہ اسکی طرف انگلیاں اٹھنے لگیں۔

(۱۱) اَلْاُمَمُ بِالرِّجَالِ وَالرِّجَالُ بِالْاُمَّهَاتِ۔
قوم کیلئے مردوں کی ضرورت ہے اور مرد مائیں پیدا کرتی ہیں۔

(۱۲) يَجِبُ اَنْ تَتَلَاشٰى حُبُّ الذَّاتِ، وَتَتَوَارَى الْحَزَازَاتُ وَتَخْتَفِي الْعَدَاوَاتُ اِذَا جَاءَتِ السَّاعَةُ الَّتِيْ تُصْبِحُ فِيْهَا الْاُمَّةُ اَنْ حَيَاتُهَا فِيْ خَطَرٍ۔
واجب ہے کہ حب ذات معدوم ہوجائے اکاوشیں گم ہوجائیں اور عداوتیں مٹ جائیں جب کبھی ایسا وقت آجائے کہ قوم کی زندگی خطرہ میں ہو۔

(۱۳) تَعَاشَرُوْا كَالْاِخْوَانِ وَتَعَامَلُوْا كَالْاَجَانِبِ۔
بھائیوں کی طرح رہو مگر معاملہ غیروں کی طرح کرو۔

(۱۴) اِعْمَلْ لِدُنْيَاكَ كَاَنَّكَ تَعِيْشُ اَبَدًا وَاعْمَلْ لِاٰخِرَتِكَ
اپنی دنیا کیلئے اس قدر انہماک سے کام کرو جیسے تمکو ہمیشہ زندہ

كَأَنَّكَ تَمُوْتُ غَدًا۔
رہنا ہے اور اپنی آخرت کیلئے اس طرح کرو جیسے کل ہی مر جاؤ گے۔

(۱۵) اَلْعَالِمُ سِرَاجُ زَمَانِہٖ يَسْتَضِيْءُ بِہٖ اَهْلُ عَصْرِہٖ۔
عالم اپنے اہل زمانہ کیلئے چراغ ہوتا ہے جس سے لوگ اکتساب نور کرتے ہیں

(۱۶) اَللّٰہُ فِيْ عَوْنِ الْعَبْدِ مَا دَامَ الْعَبْدُ فِيْ عَوْنِ اَخِيْہِ۔
بندہ جبتک اپنے بھائی کی دھن میں لگا رہتا ہے اس وقت تک اللہ اللہ اس کی مدد کرتا رہتا ہے۔

(۱۷) اَلْعَظَمَۃُ لَيْسَتْ اِلَّا ضَرْبًا مِّنْ ضُرُوْبِ الْاِحْسَاسِ بِالضِّعَۃِ
بڑا بننا بھی حقیقت میں احساس ذلت ہی کی ایک صورت ہے۔

(۱۸) مَنْ طَلَبَ شَيْئًا وَجَدَہٗ وَاِنْ لَّمْ يَجِدْ يُوْشِكُ اَنْ يَّقَعَ قَرِيْبًا مِّنْہُ۔
جو کوئی تلاش کرتا ہے وہ پالیتا ہے، اگر کسی وقت نہ پائے تو کامیابی کے قریب ضرور پہونچ جاتا ہے۔

(۱۹) مَنْ لَا يَصْبِرُ عَلٰى كَلِمَۃٍ يَسْمَعُ كَلِمَاتٍ۔
جو ایک بات پر صبر نہیں کرسکتا اسکو بہت سی باتیں سننی پڑتی ہیں۔

(۲۰) اَشَرُّ حَالَاتِ الْاِنْسَانِ اَنْ يَّكُوْنَ فَقِيْرًا وَّمُسْتَعْبَدًا۔
انسان کی بدترین حالت یہ ہے کہ وہ مفلس محکوم اور غلام ہو۔

نذرِ غالبؔ

از جناب کوکبؔ شاہجہانپوری

غالبؔ جو آج آپ کے قابل نہیں رہا
اب میرے کام کا بھی مرا دل نہیں رہا

ہنگامہ زار گوشۂ خلوت بھی تھا کبھی
اور اب دماغ گرمیٔ محفل نہیں رہا

شاداں ہوں قربِ ساعتِ انجامِ عشق سے
اب قتلِ عام شیوۂ قاتل نہیں رہا

وہ اور ہم سے ترکِ تعلق نہیں نہیں
اپنے ہی دل میں جذبہ کامل نہیں رہا

ہے پرتوِ جمال ضیا بخشِ اہلِ دل
اب پردۂ نگاہ بھی حائل نہیں رہا

میں کیا رہا اسیرِ وفا — محوِ آرزو
وہ بھی مرے خیال سے غافل نہیں رہا؟

اٹھتی تھی دل میں موجِ طلب ہر نفس کیساتھ
حاصل تو کیا ہوا غمِ حاصل نہیں رہا

کوکبؔ قصورِ ضبط کا الزام اور ہم
کیا کیجیے کہ عشق میں دل، دل نہیں رہا

تابِ نالۂ پیہم نہیں

از محترمہ مسز بدر الحسن صاحبہ

محترمہ مسز بدر الحسن صاحبہ کی ایک غزل اس سے پیشتر بھی "سعید" میں شائع ہو چکی ہے لیکن کاتب صاحب کی غلطی اور میری غفلت کی وجہ سے اس میں نام مسز نور الحسن شائع ہو گیا تھا جس کا مجھے بیحد افسوس ہے۔ مسز بدر الحسن صاحبہ ان خواتین میں سے ہیں کہ جنکے ادبی اور علمی کمالات پر دنیائے حرم جس قدر فخر کرے کم ہے۔ (ایڈیٹر)

احتیاجِ چارہ فرمائی مجھے ہمدم نہیں
شکر ہے زخمِ جگر منت کشِ مرہم نہیں

کشتیٔ صبر و سکوں تو غرقِ بحرِ غم ہوئی
جوش میں اب بھی کمی اے گریۂ پیہم نہیں

آپ کا ذوقِ ستم لمحہ بہ لمحہ ہو فزوں
جادۂ تسلیم سے منظور مجھکو رم نہیں

کس مزے سے دیکھتا ہے رقصِ بسمل کا سماں
چشمِ بے باک اس ستمگر کی ذرا پرنم نہیں

تھا دمِ آخر نہ خوفِ مرگ وجہِ اضطراب
تھی یہی الجھن کہ وہ بے مہر تو برہم نہیں

اس چمن میں رات گذری ہے کسی مجبور کی
آپ کو دھوکا ہوا! یہ اشک ہیں شبنم نہیں

ایک آہِ سرد باقی ہے مآلِ زندگی!
اب دلِ خستہ میں تابِ نالۂ پیہم نہیں

"دورِ نشاط"

(از جناب محمد کامل صاحب کامل صدیقی بریلوی)

وہ زمانہ یاد آتا ہے کہ جب میں شاد تھا! — ناشناسِ رنج تھا ناواقفِ افتاد تھا
کس قدر دلچسپ تھا دورِ نشاطِ زندگی — حسن کی رنگینیاں، کامل مری دلبستگی
پتہ پتہ میرے گلشن کا تھا فردوسِ نظر — غنچہ غنچہ بے محابا دل میں کر لیتا تھا گھر
مری ہستی بوستاں میں مایۂ صد ناز تھی — سحر تھا نغموں میں میرے مست کن آواز تھی
قابلِ صد رشک اک دن زندگانی تھی مری — اہلِ گلشن کی زباں پر مدح خوانی تھی مری
آشکارا مجھ پہ تھا جو کچھ چمن کا راز تھا! — سچ تو یہ ہے بوٹا بوٹا مایۂ صد ناز تھا
چہچہوں سے میرے گلشن گونج اٹھتا تھا کبھی — مختصر یہ ہے کہ میرا دور دورہ تھا کبھی
وہ بھی کیا دن تھے کہ جب میں فکر سے آزاد تھا — مہرباں مجھ پر خدا رکھے مرا صیاد تھا
وجد میں آتے تھے الغرض طائران خوشنوا — جب کبھی گلشن میں ہو جاتا تھا میں نغمہ سرا
کوئی دشمن تھا نہ کوئی برسرِ بیداد تھا — میں فضائے مست میں مدہوش تھا دلشاد تھا
ہو رہا تھا آمدِ دورِ خزاں سے بے خبر — تھی مآلِ عیش پر مطلق نہ کچھ میری نظر
تھا مخالف آسماں، برہم نہ کچھ صیاد تھا — تنکا تنکا آشیانے کا نہ یوں برباد تھا
میری ہستی باعثِ زینت تھی گلشن کیلئے — سینکڑوں تھے پھول میرے ایک دامن کیلئے
میری کشتی کو نہ تھا بادِ مخالف کا خطر — مجھ سے میرا ساحلِ مقصود تھا نزدیک تر
میں رہینِ کیف ہائے بادۂ سرجوش تھا! — ہوش اتنا ہے کہ بس میں نیاز ہوش تھا
ذرے ذرے سے پتہ منزل کا چلتا تھا مجھے — بحرِ بے پایاں کا قطرہ قطرہ دریا تھا مجھے
مایۂ صد ناز حوروں کے لئے تھا میرا دم — باعثِ شادابیٔ باغ ارم تھا ہر قدم
الغرض پلٹا لیا کچھ گردشِ ایام نے — ہر طرف سے آ دبایا رنج نے، آلام نے
خواب گویا ہو گئی سب داستانِ زندگی — لٹ چلا منزل پہ آ کر کاروانِ زندگی

ہائے اب وہ دن کہاں وہ خوبیٔ قسمت کہاں
عیش کی دنیا کہاں، کاشانۂ جنت کہاں

آشیاں میں ہم تلاشِ آشیاں کرتے رہے

از جناب محمد میاں صاحب سلیم شاہجہانپوری

حالِ دل اس دشمنِ دل سے بیاں کرتے رہے
اشکِ پیہم رازِ پوشیدہ عیاں کرتے رہے

سر کو صرفِ سجدۂ ہر آستاں کرتے رہے
جو نہ کرنا تھا وہ تیرے ناتواں کرتے رہے

اشکِ خوں سے اپنے دامن پر نشاں کرتے رہے
اس طرح ہم رازِ الفت کو عیاں کرتے رہے

جو کوئی سمجھا ہوا پامالِ اندازِ خرام
ہر قدم پر وہ اشارات نہاں کرتے رہے

اُف ری غفلت برق کا آیا نہ ہم کو کچھ خیال
ہاں خیالِ آشیاں در آشیاں کرتے رہے

مختصر یہ ہے کہ گذری عمر اسی تشویش میں
زندگی بھر وہ ہمارا امتحاں کرتے رہے

آڑے آتی ہی رہی امیدِ چشمِ التفات!
گو تمہارے تیر پیہم نیم جاں کرتے رہے

سامنے آنکھوں کے تھی رعنائی حسنِ ازل
ہم تصور ہی میں سیرِ لامکاں کرتے رہے!

اس قدر بیخود کیا وارفتگی نے اے سلیم
آشیاں میں ہم تلاشِ آشیاں کرتے رہے

عرضِ تمنّا

(از جناب محمد ادریس صاحب بریلوی)

تجھکو۔ اپنی نرگسی کٹورییوں کا صدقہ۔ میرے دل رنجور پر اپنے لطف و کرم کا پھاہا رکھدے۔

تجھکو۔ اپنی حشر بپا کرنیوالی چال کا صدقہ۔ کبھی تصور ہی میں اپنے پاکیزہ روئے روشن کی جھلک سے مست و بیخود بنا دے۔

تجھکو۔ اپنی عصمت مآب جوانی کا صدقہ۔ میری کمزور اور ناتوان حالت پر اپنی چشم فیض سے لطف و کرم کی بارش کردے۔

تجھکو۔ اپنے دراز و پیچیدہ گیسوؤں کا صدقہ میرے ننھے اور شیدائی دل کا ارمان ترا دیدار ہے تو اسکو پورا کردے۔

تجھکو اپنے حسن بے مثال کا صدقہ۔ ترا عاشق نیم جان تجھے بغیر نزع جیسی تکلیف میں مبتلا ہے تو اپنی مسیحائی دکھا اور ایک فانی ہستی کو دیدار کی نعمت سے محروم نہ کر

تجھکو اپنی سب سے زیادہ عزیز چیز کا صدقہ میں نے ابتک ترے اور صرف ترے دیدار کی امید پہ اپنے دل ناتوان کو تسلی دی ہے میرا چراغ زندگی خاموش ہوا چاہتا ہے مجھے نہ سہی میری بے بسی ہی کو دیکھ جاتا کہ میں اطمینان سے ......



سنہ ۵۷ کی دکھیا

(گذشتہ سے پیوستہ)

پندرھواں باب

مسجد کے سامنے

ہماری راہنما بڑھیا بڑی جلدی کر رہی تھی یہاں تک کہ چلتے چلتے ہم سب ایک بہت بڑے درخت کے پاس پہونچے اس درخت کے نیچے بیچ میں ایک عمارت بنی ہوئی تھی عمارت کو درخت چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھا اور ہر چیز اسکے سایہ میں تھی۔ مسجد کے پاس بہت سے ہندوستانی اور چوکیدار درخت کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ راستہ چونکہ یہی تھا۔ ہمکو اس مجمع کے عین وسط میں سے گذرنا تھا اور ہزاروں آدمیوں کے درمیان میں سے اس طرح نکل سکنا کہ وہ ہمکو شناخت نہ کرسکیں ناممکن تھا اسلئے ہمنے چاہا کہ ہم لوگ اتنا ٹھہر جائیں کہ یہ فوج یہاں سے چلی جائے مگر اس پر ہماری راہنما نے کہا کل یہاں چند انگریز مسجد میں پناہ گزیں ہوئے تھے ان کا ارادہ تھا کہ صبح صبح کابلی دروازہ دیگر انگریزوں سے جا ملیں مگر ان لوگوں نے انکو گھیر لیا اور عصر تک گھیرے رہے آخر انکو گرفتار کرکے ایک ایک کو قتل کردیا۔

بدقسمتی سے رات ختم ہوتی جارہی تھی۔ اور ہمارے برقعے اسقدر مختصر تھے کہ ہمارے پاؤں اننے کسی طرح پوشیدہ نہیں ہوسکتے تھے اور انگریزی لباس کو دیکھکر ہماری شناخت یقینی تھی تاہم ہم مجبور تھے کہ اسی درخت کے نیچے جائیں چند منٹ بعد میرا خیال منتقل ہوا تو میں نے دیکھا کہ میرا سفید برقعہ خون کی چھینٹوں سے لالہ گوں ہورہا ہے۔ مگر یہ خوں کہاں سے آیا! میرے تو کوئی زخم تھا نہیں۔ پھر مجھکو خیال ہوا کہ ہو نہ ہو یہ خون اوپر سے ٹپک رہا ہے نظر اٹھا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ شاخوں سے انگریزوں کے سر لٹک رہے ہیں اور خون ٹپک رہا ہے۔ یہ دیکھکر چند قدم میں پیچھے

ہٹ گئی کہ شاید یہاں پر خون کی چھینٹیں نہ گریں گی مگر بیکار تقریباً ہر شاخ میں کوئی نہ کوئی سر آویزاں تھا۔ بعد میں مجکو معلوم ہوا کہ نادر شاہ نے بھی جب دہلی کا قتل عام کیا تھا تو مقتولین کے سر اسی درخت پر لٹکائے تھے۔

یہ ہولناک منظر دیکھکر ہمارے حواس مختل ہو گئے پاؤں لڑکھڑانے لگے اور بدن میں رعشہ پڑ گیا مگر ابھی ہم اپنے اسی حال میں مبتلا تھے کہ بوق وطبل کی آواز آئی اور ساری فوج کابلی دروازہ کی طرف روانہ ہو گئی اور آیندہ و روندہ کے لئے رستہ صاف ہو گیا جب راستہ صاف ہو گیا تو ہمنے بھی اپنی راہ لی۔ تھوڑی ہی دیر بعد خاموش گلیوں میں پہونچ گئے کچھ دور چلکر لکڑی کی ٹالوں کے پاس پہونچ گئے ایلن کے ابا نے راہ نما سے دریافت کیا کہ ہملوگوں کو کیا یہاں قیام کرنا ہوگا مگر اسنے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ جھکگر ایک لکڑیوں کے گھٹے کو اٹھایا جو وہاں پڑا تھا گٹھا اٹھتے ہی اور گلیاں نظر آئیں اور اس نے ہمکو اشارہ کیا کہ اس میں داخل ہو جایئے۔ ہملوگ داخل ہو گئے اور دیر تک چلتے رہے رستہ بہت برا اور تکلیف دہ تھا جگہ بہ جگہ گڈھے تھے اندھیرے میں چلنا اور بھی مشکل تھا۔ چلتے چلتے ایک سائبان میں جا پہونچے جسمیں دیودار کی لکڑی کی مشعلیں روشن تھیں۔ دھواں اسقدر گھٹ رہا تھا کہ جسقدر ان لکڑیوں سے روشنی حاصل ہوتی تھی دھوئیں نے اس سے زیادہ تاریک کر رکھا تھا۔ ہمارا سائبان کے نیچے پہونچنا ان لوگوں کو جو پہلے سے وہاں مقیم تھے اول اول کچھ اچھا نہیں معلوم ہوا بلکہ کسیقدر ناگوار ہی ہوا ہمکو دیکھکر وہ لوگ کراہنے لگے مگر جب آپس میں انگریزی زبان کے ذریعہ تبادلہ خیالات ہوا تو فریقین کو ایک گونہ سکون ہوا اور وحشت جاتی رہی۔ ان لوگوں کی زبانی ہمکو معلوم ہوا کہ وہ بھی ہماری طرح مصیبت زدہ ہیں۔ اور ہمارے متعلق ان کو معلوم ہوا کہ ہم بھی تلوار کے خوف سے یہاں آئے ہیں۔ انگریزوں کی اس جماعت کو کسی ہندو نے اس جگہ پناہ دے رکھی تھی ہمکو خوب معلوم تھا کہ اگر شورش کنندگان کو ان لوگوں کی پناہ دہی کا علم ہو گیا تو اسکے ساتھ کیا معاملہ ہوگا مگر محض بربنائے انسانیت ان ٹالوں میں انکو اسنے پناہ دی۔ یہ ٹال اس کے مکان کے عقب میں واقع تھی۔ جو بدقسمت انگریز اس جگہ چھپے ہوئے تھے ننگے سر اور ننگے بدن تھے اور بیس سے اوپر آدمی تھے عورتوں میں سے ایک عورت کی گود میں ایک ننھا سا بچہ تھا جسکو وہ دودھ پلا رہی تھی میں اسکے پاس بیٹھ گئی اور بچہ کو دیکھکر مجھے اپنا ویل یاد آ گیا اور میں نے انتہائی حسرت و یاس سے ایک بہت بڑی ٹھنڈی سانس لی اور جی میں کہا دیکھو زمانہ میرے لخت جگر کو مجھے پھر دلاتا ہے یا نہیں۔ میری اس حالت کو دیکھکر اس عورت نے میری طرف متوجہ ہو کر پوچھا کہ یہ ٹھنڈی سانسیں کیوں ہیں؟ کیا تمہارا بچہ کھو گیا ہے یا مقتول ہو گیا ہے؟ میرے بچہ کو تم اسقدر حسرت بھری نظروں سے کیوں دیکھتی ہو؟ اسکے اس سوال پر میرا جی بھر آیا اور میں اسکو کوئی جواب نہ دے سکی۔ پھر ایلس بھی ہمراہی بچہ کے ساتھ میرے پاس بیٹھ گئی وہ دونوں ہمارے مریض ہمراہی عورتیں بھی ایک طرف کو بیٹھ گئیں غرضکہ ہم سب کسی قدر آرام سے بیٹھ گئے مگر ایلن کے ابا بدستور کھڑے رہے انکا سر زمین کیطرف جھکا ہوا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے انکو یہاں آنے اور ہم لوگوں کے ساتھ چھپ رہنے سے

بڑی ندامت اور سخت پشیمانی تھی کیونکہ انکا اپنا دل ہی چاہتا تھا کہ انگریزوں کے ساتھ شریک ہو دماغ میں حصہ لیں۔ ادھر ہمیں سارے سامان کو ڈھونڈنے کی پڑی تھی اور دونے بچوں کو دکھا رہی تھی کہ شاید ویل انہیں میں ہو مگر ایک ایک بچہ کو دیکھنے کے بعد بھی ویل کا کوئی پتہ نہ ملا ان لوگوں میں ہمکو ایک ایسی فرنگن بھی مل گئی جو تھا ۔ ہماری بچہ کی کچھ رشتہ دار تھی یہ معلوم کرکے بچہ کو تو میں نے اس فرنگن نے حوالہ کیا ان دونوں مریضوں کو اپنی کچھ ساتھ والیاں مل گئیں وہ دونو انکو اطلاع کئے بغیر انکے ساتھ نہیں۔

عقلمندوں کا یہ مقولہ بالکل صحیح ہے کہ انسان کبرہ خرہ میں دو وقت مبتلا ہوتا ہے ایک تو جب دولت و ثروت کی اسکے پاس فراوانی ہو دوسرے جب مصائب و حوادث میں مبتلا ہو مجکو بھی اس جدائی سے ایک گونہ راحت اور اس تنہائی میں سکون سا محسوس ہوا کیونکہ آیندہ ہماری تمام تر توجہ صرف اپنی ذات اور اپنی مشکلات تک محدود ہو گی اور ہماری تمام تر کوشش صرف اسلئے ہوگی کہ ہم اپنی موجودہ شومی قسمت کے اثرات سے محفوظ رہ سکیں اور کسی دوسرے کی تکلیف و مصیبت ہمارے لئے مزید کلفت کا باعث نہو۔

ایک کونے میں گھاس پڑی تھی میں اسی سے کمر لگاکر لیٹ گئی مگر یہ گھاس بھی اسوقت گذشتہ رات کے ہمارے میزبان علی سے مکان کے گدیلوں اور چارپائیوں سے بدرجہا زائد نرم و آرام دہ معلوم ہو رہی تھی یہ فرصت و سکون ہو قت نہایت خوش آیندہ معلوم ہو رہا تھا کاش دیر پا بھی ہوتا۔ مگر کہاں وہ تو ذرا سی دیر کی بات تھی محمد کا الگ بار بار خیال آتا تھا اور اسکے نہ آسکنے کے مختلف اسباب ذہن میں آنے جاتے تھے کیونکہ سرد ست تو ہمارے تمام تر ارادے صرف اسی کی رائے پر موقوف اور اسی کی مرضی پر منحصر تھے ہماری حسرت میں اس امر سے اور اضافہ ہو گیا تھا کہ ویل کھو گیا تھا اور اب تک کسی طرح اسکو تلاش بھی نہ کیا جا سکا تھا۔ میں نے اپنے خیالات ویل کے ابا سے بھی ظاہر کئے انہوں نے اسلئے کہ مجکو تسلی ہو کہا کہ یہ دونوں عورتیں خیریت سے ہمکو یہاں پہونچا گئی ہیں اب جاکر انہوں نے محکمہ اطلاع کی ہو گی اور انشاءاللہ وہ بھی عنقریب آتا ہی ہوگا۔

سولھواں باب

ترتیب ہر عمل میں ضروری ہے۔

انسان کے لئے اپنے اس محسن کا شکریہ

جو مصیبت میں خبر گیری اور مشکل میں امداد کرے نہایت ضروری ہے یہ ہندو جس نے ہم لوگوں کو محض برہنائے انسانیت اس مصیبت سے بچانیکے لئے اس جگہ پناہ دی تھی اپنے مہمانوں کو دو وقت کھانا دیا کرتا تھا۔ اس کے نوکر دونوں وقت برتنوں میں چاول اور قلیہ اور تین مشکوں میں پانی لایا کرتے۔ ادہر ان اکثروں پر بھوک کا بھوک کی وجہ سے یہ حال ہوچکا ہوتا تھا کہ اُدہر انہوں نے دیگچے زمین پر اتارے اور ادہر یہ لوگ ان پر جھٹ پڑے جس سے جو کچھ ہاتھ لگا اسنے قبضہ کرلیا کھیلیوں تک دیگچیوں میں ہاتھ گھسیڑ گھسیڑ کر ہڈی بوٹی غرضکہ جو کچھ جسکو مل جاتا فوراً حلق سے اتار لیتا اور ظاہر ہے کہ یہ حرکت سخت ناانصافی اور نامساوات پر مبنی تھی۔ ایلین کے ابا نے جب یہ بدتمیزی دیکھی تو انہوں نے کھڑے ہو کر مجمع کو مخاطب کیا اور کہا کہ ترتیب جس طرح طمینان و فارغ البالی میں ضروری ہے مصیبت اور پریشانی کے وقت میں بھی اسیقدر لازمی ہے۔ نرمی و گرمی، عافیت و مصیبت غرضکہ ہر حال میں انسان کو اس کی ضرورت ہے۔ اور مہذب و متمدن لوگ تو کسی حال میں بھی آداب اخلاق کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے خواہ زمانہ انکے موافق اور انکے حسب مراد ہو یا ناموافق اور خلاف ہو۔ ایک دوسرے کی ہمدردی اور امداد انکے نزدیک بہرحال ضروری ہے اس کھانے اور پانی میں آپ اب لوگوں کا حصہ رسد حق ہے لہذا ایک شخص ذمہ دار بن جائے کہ وہ سب کو کھانا تقسیم کر دیا کرے اسطرح ہر شخص کو اسکا حصہ مل جائے گا اور کوئی بے عنوانی نہ ہوسکے۔

ان کی اس تجویز پر ہر ایک نے اپنی اپنی جگہ تو ان کو خوب جی کھول کر بُرا بھلا کہا مگر اجتماعی طور سے اس تجویز کی کسی نے مخالفت نہیں کی بلکہ انہیں کو تقسیم کا ذمہ دار بنا دیا انہوں نے درخت میں سے دو لکڑیاں توڑ کر چھری سے ایک کا کانٹا اور دوسری کا چمچہ بنالیا اور اس کانٹے اور چمچے سے اپنا کام نکالا۔ دیگچے میں سے اول چاول نکالکر سب کی ہتھیلی پر دہر دیتے تھے نہ کوئی برتن تھا اور دوسری مرتبہ گوشت نکالکر چاولوں کے اوپر رکھدیتے تھے اس طرح تین دن کٹے اور انہوں نے اپنے حسب منشا تقسیم کی۔ شروع شروع میں تو کسی کو اس سے اتفاق نہ تھا مگر دوسرے اور تیسرے دن سب کو یہ طریقہ پسند آیا۔ ہر قانون کا یہی طریقہ ہے کہ اول اول اسکا نفاذ مشکل ہوتا ہے لوگ ابتدا میں اسکو گوارا نہیں کرتے لیکن جب نفاذ ہوجاتا ہے اور اسکے مطابق عملدرآمد کیا جانے لگتا ہے تو تھوڑے عرصہ میں اسکے مفید نتائج سامنے آنے لگتے ہیں۔ لوگوں کو فائدہ پہونچنے لگتا ہے طبیعتیں بھی نہایت خاموشی سے اسکو قبول کرلیتی ہیں قانون ہی قوموں کا مصلح اور انسانی عقل کے لئے مشعل ہدایت ہے۔
اس طریقہ سے ایک یہ فائدہ بھی ہوا کہ ہمارے آپس میں ایک گونہ اُنسیت بھی پیدا ہوگئی اور ایک دوسرے سے تعلق پیدا ہونے لگا دلوں کا بار بھی کسیقدر ہلکا ہوگیا اور اب ہر ایک نے رنج و تکلیف کے ساتھ اپنا اپنا قصہ بیان کیا جس سے معلوم ہوا کہ اس مجمع میں کوئی مرد اور کوئی عورت ایسی نہ تھی جسکو کوئی نہ کوئی حادثہ پیش نہ آیا ہو۔ کیونکہ شورش کے گیارہویں دن یہ لوگ بھی اسکے اثر سے محفوظ نہ رہ سکے اور کسی کا باپ کسی کا بیٹا کسی کی بیوی کسی کا خاوند مقتول ہوگیا اور خود انکو خدا جانے کیا کیا کچھ جھیلنا اور برداشت کرنا پڑا اس مجمع میں یہ بھی ایک عجیب بات تھی کہ اکثریت عورتوں

کی تھی مرد معدودے چند تھے۔ ہمنے پوچھا آخر اس کا کیا سبب ہے، تو ان لوگوں نے بتایا کہ تمہاری جماعت کے داخل ہونے سے دو گھنٹہ پہلے دہلی کا محتسب یہاں آیا تھا مردوں کو نکالکر اسنے قتل کر دیا اور ہم عورتوں کو چھوڑ دیا۔ مگر محتسب کا ان عورتوں کو قتل نہ کرنا کچھ رحم و مروت کیوجہ سے نہ تھا حاکم بڑا سمجھدار شخص تھا اسنے سوچا کہ اگر کبھی مصالحت ہوئی تو ان عورتوں کے ذریعہ معقول رقم حاصل کیجا سکیگی۔

ان عورتوں کے اس بیان سے ہمکو معلوم ہوا کہ پندرہویں سولھویں روز شورش میں کمی آچلی ہے۔ ہندوستانی عورتوں کو قتل نہیں کرتے ہیں اور نہ انسے کسی قسم کا تعرض کرتے ہیں۔ ان عورتوں میں سے بیشتر وہ تھیں جنکے شوہر مقتول ہو چکے تھے اور خود انکو ہندوستانیوں نے بلا کسی ضرر کے چھوڑ دیا تھا۔ اور میرا خیال تو یہ ہے کہ ایسی زندگی سے تو موت بدرجہا بہتر ہے۔ عورتوں سے یہ درگذر تو حقیقتاً مصیبت کی تکمیل ہے کہ مدت العمر ردلی جھینکتی رہیں اگر مردوں کے ساتھ عورتیں بھی قتل کر دی جائیں تو یہ ان کے لئے زیادہ راحت کا باعث ہو۔

جن مردوں کو محتسب نے اس جگہ سے نکالکر قتل کر دیا تھا اسکا قصہ اس طرح ہے کہ پہلے وہ انکو شاہی محلات میں سے ایک بہت بڑی عمارت میں لے گیا اور وہاں فوجی عدالت کے سامنے انکا مقدمہ پیش ہوا۔ نہایت مختصر سوالات و جوابات ہوے۔ پھر انکو قتل کرنے کا حکم دیدیا۔ اسکے بعد ہم کو ایک اعلان کی اطلاع ہوئی جس کا مضمون یہ تھا "جلیل القدر آباؤ اجداد کے تخت طاؤس پر جلوہ گر ہونے اور بدبخت انگریزوں کو نکال دینے کے بعد شاہی فرمان اس طرح ہے کہ آیندہ سے کوئی شخص شاہی رعایا میں سے کسی انگریز کو قتل نہ کرے اور نہ اسکے مال و دولت کو لوٹے۔ بلکہ ان کی جان و مال کی حفاظت کرے آج کی تاریخ سے جو کچھ فیصلہ ہوگا وہ عدالت سے ہوگا جسمیں کسی قسم کی کوئی زیادتی اور کوئی جبر و ظلم نہوگا۔ آج کے واقعات میں سے ایک یہ واقعہ ہے کہ چند بڑے بڑے انگریز جو بارھویں دن شاہی عمارت میں پناہ گزیں ہوئے تھے فوراً قتل نہیں کئے گئے تاکہ بدانتظامی کا شبہ نہ کیا جاسکے بلکہ ایک فوجی عدالت قایم کی گئی اور اسکے سامنے وہ لوگ پیش کئے گئے عدالت میں انسے بہت سخت جرح کی گئی اور پھر آخر میں سب کے قتل کا حکم دیدیا گیا۔ یہ وقتی بادشاہ جسکی عمر اسوقت بانوے سال سے بھی کچھ اوپر ہے شاہ شطرنج سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ تمام تر احکامات کا صدور و نفاذ بادشاہ کے لڑکے مرزا مغل پر موقوف ہے اور مرزا مغل نہایت نڈر خونریز اور جنگ آزما شخص ہے۔ اس محتسب کو اول اول انگریزی حکومت نے مقرر کیا تھا لیکن جب فساد و شورش پھیل پڑی تو وہ بھی اپنے ابناء وطن کے ساتھ شریک ہو گیا یہ محتسب مرزا مغل کے حکم سے ادھر اُدھر چھپے ہوئے انگریزوں کے پاس جاتا تھا۔ اور انکے سامنے اسلام پیش کیا کرتا تھا اگر وہ لوگ اسلام لے آتے تو چھوڑ دیا ورنہ قتل کر دیا اور افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے بہت سے ہموطن اس طرح دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے اور اپنے آبائی دین کو ترک کر دیا لیکن اگر یہ لوگ موت سے خوف نہ کرکے اپنے مذہب پر قایم رہتے تو اہل نظر کے نزدیک اس سے زیادہ عزت کی نظر سے دیکھے جاتے۔

اس جائے پناہ میں ہمکو مسلسل پانچ روز رہنا پڑا

مگراس تنگ وتاریک غار میں رہتے ہوئے ہماری مصیبتوں میں کچھ اور اضافہ ہوگیا۔ ہوا کی عفونت اور دھوئیں کی وجہ سے ہر وقت دم گھٹتا تھا بدن پر میل کچیل کی تہیں جم گئی تھیں اور کپڑے اسقدر بوسیدہ اور بیکار ہوگئے تھے کہ تار تار ہوتے جاتے تھے۔ آہ! کسقدر ناخوشگوار مقام تھا! اور کیا کیا مصائب و تکالیف کا سامنا تھا! ہمارے پاس نقدی بہت تھی اسلئے ہمنے چاہا کہ نال کے ملازمیں کی معرفت تن پوشی کے کپڑے مہیا کریں مگر خوف بھی معلوم ہوتا تھا کہیں لالچ میں آکر وہ ہمکو قتل نہ کردیں۔ اتنے دنوں بعد اب مجکو اس بات کی خوشی تھی کہ ایلن کو جو تنگ بالکل خاموش اور راز خود رفتگی کے عالم میں تھی اس حال سے افاقہ ہوا اور اسنے اپنے شوہر کو یاد کرکے رونا شروع کیا۔ ایلن کا رونا دیکھکر میں نے خدا کا شکرانہ ادا کیا کہ خود غم کے باعث اتفاقی موت کے خطرہ سے اب وہ باہر تھی اور اب ہم تینوں نے اس جائے پناہ سے خلاصی کی تدبیریں سوچنا شروع کیں۔ ایلن کی فہم و فراست اور عقل و دانش کے متعلق میں جو کچھ کہنا چاہتی ہوں وہ اس بنا پر ہرگز نہیں ہے کہ انسان کو جس سے محبت ہوتی ہے اسکی ہر بات اچھی اور ہر ادا پیاری معلوم ہوتی ہے اور نہ سوا سال تک اکلوتی بیٹی ہونے کی وجہ سے مجکو اسکے ساتھ جو تعلق خاطر تھا وہ اسکا باعث ہے بلکہ اگر نظر انصاف سے ہم معاملہ کو دیکھنا چاہیں تو آسانی سے معلوم ہوسکتا ہو کہ اپنی کم عمری کے باوجود وہ نہایت زود فہم دور بین و صائب الرائے تھی مشکلات و مصائب میں مبتلا ہوکر اسکا دماغ جلد ہی سے خلاصی کی کوئی معقول تدبیر پیش کردیا کرتا تھا۔ اس موقعہ پر اگر وہ اپنے رنج و الم میں اسقدر مستغرق نہوتی تو ضرور تھا کہ وہ کوئی نہ کوئی تدبیر سوچتی۔ اب جوں ہی اُسکے حواس کسیقدر بجا اور اسکا دماغی توازن کسیقدر درست ہوا اسنے اپنے والد کے اور میرے ساتھ اس امر میں رائے زنی شروع کردی۔ مگر چونکہ معاملہ نہایت نازک اور مشکل تھا اسلئے جلدی سے کوئی مفید صورت کیونکر نکل سکتی تھی۔

ایلن کی رائے تھی کہ اس جائے پناہ سے جسقدر جلد ممکن ہو نکلنا چاہیے کیونکہ یہاں رہتے ہوئے اس قسم کا ہر وقت خطرہ ہے کہ محتسب پھر آئے اور اگر ہم بدنصیب عورتیں بچ گئیں تب بھی اباجی کا دیگر مردوں کے ساتھ مقتول ہوجانا یقینی ہے۔ موقع بار بار نہیں ملتا اسپر اسکے ابا نے کہا کہ میں کل سے اس مسئلہ پر غور کررہا ہوں۔ میری بھی یہی رائے ہے۔ اور گھر گو تباہ و برباد ہوچکا ہے اور اسمیں ہندوستانیوں نے کوئی کام کی چیز نہ چھوڑی ہوگی تاہم ممکن ہے کہ پھر بھی کوئی مطلب کی چیز مل جائے وہاں سے جس طرح بن پڑیگا آگرہ چلا جاؤں گا۔ ایلن نے کہا کہ آپکی رائے بالکل بجا و درست ہے مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم لوگوں کو چھوڑکر تنہا جانے میں کیا مصلحت ہے؟ کیا ہملوگوں کے ہم سفر ہونے میں کسی نقصان کا اندیشہ ہے؟ ایلن کی رائے مجکو صحیح معلوم ہوئے اسلئے میں نے کہا کہ ایلن کی رائے بالکل صحیح ہے اور اسی میں ہم سب کا فائدہ ہے۔ اگر راستہ محفوظ و مامون ہوگا تو ہم سب بخیر و خوبی آگرہ پہنچ جائیں گے اور اگر کوئی حادثہ پیش آیا تو ہم سب ایک دوسرے کے شریک رنج و راحت ہونگے اور سب کی یکجائی آپس کی جدائی سے بہرحال بہتر ہے کہ جو کچھ ہوگا آنکھوں کے سامنے گذریگا۔ انتظار کی بے چینی نہوگی۔

مغربی معاشرت

(از جناب سید نصیر احمد صاحب)

"میں نے تم سے کئی مرتبہ کہا ہے کہ میری چیزوں کو ہاتھ نہ لگایا کرو" جمشید نے اپنی خادمہ سے کہا "تمہیں میری چیزوں سے کیا مطلب۔ تار جو کل آیا تھا وہ کہاں ہے۔ تار میرے بھائی نے بھیجا تھا۔ جلدی سے تلاش کرو"

خادمہ جو ایک دبلی پتلی عورت تھی سہم گئی۔ ردی کی ٹوکری میں اور میز کے نیچے اس نے ڈھونڈنا شروع کیا اس نے بہت سے تار ڈاکٹر کو دکھلائے لیکن ان میں اسکے بھائی کا تار نہیں تھا۔ باوجود کوشش کے وہ نہیں مل سکا۔

رات کے دس بجنے والے تھے۔ ڈاکٹر جمشید جانتا تھا کہ اسکی بیوی ایک دو بجے سے پہلے نہیں آئیگی۔ اسے اپنی رفیقہ حیات پر مطلق بھروسہ نہیں تھا۔ وہ ایک آزاد قسم کی عورت تھی۔ ڈاکٹر کو اسکی ہر چیز سے نفرت تھی۔ آئینہ سے، میز سے، کپڑوں سے غرضکہ ہر سامان سے وہ اپنی بیوی کی میز پر گیا۔ کتابوں کو اٹھایا۔ ایک کتاب کے نیچے سے تار کا لفافہ نکل آیا۔

لفافہ پر اسکی بیوی کا نام تھا اور اسکی والدہ کے توسط سے بھیجا گیا تھا۔ جمشید نے غور کرنا شروع کیا "یہ تار کہاں سے آیا۔ خیر تار کا آنا تو غیر معمولی بات نہیں لیکن بجائے میرے توسط کے یہ اسکی والدہ کے توسط سے کیوں بھیجا گیا ہے۔ اب ہر چیز مجھ سے پوشیدہ رکھی جائیگی"

اس نے لفافہ کھولا۔ تار منصوری سے آیا تھا اور بھیجنے والے کا نام تھا فیروز۔ اس میں لکھا تھا "نوروز کی تقریب پر میری طرف سے مبارکباد قبول فرمائیے۔ ملاقات کا اشتیاق حد سے گذر چکا ہے"

جمشید غصہ سے دانت پیسنے لگا "یہ فیروز کون ہے" اس نے اپنے آپ سے کہا "اشتیاق حد سے گزر چکا ہے۔ خوب"

گذشتہ سات برس سے وہ اپنی بیوی کو شبہ کی نظروں سے دیکھتا تھا۔ اسکی ہر حرکت اور ہر بات کی ٹوہ میں رہتا تھا۔ اسے ان باتوں میں اتنا کمال ہو گیا تھا کہ ڈاکٹر کہا کرتا تھا کہ ڈاکٹری کی بجائے وہ ایک اچھا سراغ رساں ہوتا۔ اپنے کمرہ میں واپس آکر اس نے سوچنا شروع کیا اور فوراً اسے خیال آگیا کہ کس طرح ایک مرتبہ وہ اور اسکی بیوی موسم گرما گزارنے کے لئے منصوری گئے تھے۔ وہاں اسکے ایک قدیم ہم جماعت نے ایک دعوت کے موقعہ پر ان کا تعارف ایک نوجوان سے کرایا تھا جس کا اصلی نام تو تھا فیروز لیکن اسے سب "فوجی فوجی" کہتے تھے۔ دو ماہ بعد ڈاکٹر نے اپنی بیوی کے البم میں اسکی تصویر بھی دیکھی تھی جس کے نیچے لکھا تھا "ماضی کی یاد اور مستقبل کی امید میں" سردیوں کے زمانہ میں وہ خود دہلی آیا تھا اور کئی مرتبہ اس سے ملا تھا۔ انہیں دنوں اسکی بیوی رات کو دیر میں واپس آتی تھی اور بعض وقت تو رات رات بھر غائب رہتی تھی۔ اور صبح آکر کہہ دیتی تھی کہ وہ اپنی والدہ کے ہاں گئی تھی۔

اس کے ساتھ ہی اسے معلوم ہو گیا کہ آج سے چند یوم قبل اسکی بیوی بار بار اس سے یہ کیوں کہتی تھی کہ اسے منصوری

یا کسی اور صحت بخش مقام پر چلے جانا چاہیئے کیونکہ اسکی صحت خراب ہو رہی ہے۔ اب وہ تمام باتیں سمجھ گیا۔ فیروز کون ہے اور اسکی بیوی منصوری جانے کی اتنی خواہشمند کیوں ہے۔

مارے غصہ کے وہ کانپنے لگا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب اس قسم کی باتیں نہیں ہونے دیگا۔

سات برس میں یعنی جب سے ان کی شادی ہوئی تھی سوائے رنج و آلام اور مصائب کے اُسے کچھ حاصل نہوا جس طرح کہ کوئی پرندہ قفس میں جاکر پھنس جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح وہ بھی ایک صیاد کے ہاتھوں گرفتار تھا۔ اسکی یہ زندگی بالکل دوزخ کی سی زندگی تھی۔ نہ خوشی نہ مسرت۔ اسکی صحت خراب ہو رہی تھی تنخواہ میں سے ایک پیسہ بھی نہیں بچتا تھا۔ قرض دن بدن زیادہ ہو رہا تھا

وہ کمرے میں ٹہلنے لگا۔ جب تھک جاتا تو کرسی پر بیٹھ جاتا اور تھوڑی دیر کے بعد پھر ٹہلنا شروع کر دیتا۔ جب تھک کر چور ہو گیا تو اس نے کہنا شروع کیا "لیکن قصور میرا اپنا ہی۔ مجھے ذرا سخت ہونا چاہیئے تھا۔ اسکے علاوہ میں ایک ڈاکٹر ہوں اور مجھے عورتوں کے احساسات کا بالکل علم نہیں۔ لیکن میری صحت اب خراب ہو رہی ہے۔ مجھے دنیا میں زیادہ نہیں رہنا ہے میں کیوں کسی کو رنج دوں۔ میں اپنی بیوی کو کہہ دونگا کہ جس شخص سے وہ محبت کرتی ہے اسکے پاس چلی جائے۔ میں اسے طلاق دے دونگا۔"

تین بجے کے قریب اسکی بیوی واپس آئی۔ اپنے کمرہ پر آکر فوراً چلانا شروع کیا جیسے سانپ نے کاٹ کھایا ہو۔ "نوکروں نے قافیہ تنگ کر رکھا ہے۔ ادھر روپے رکھے اور ادھر غائب۔ اتنے نوکر ہیں میں چوری کا الزام کس کو دوں۔"

"بات کیا ہے" جمشید نے اسکے کمرہ میں جاکر کہا۔

"میں شام کو اس دراز میں پندرہ روپے رکھ کر گئی تھی۔ اسوقت آکر دیکھا تو غائب ہیں" اتنا کہکر اس نے رونا شروع کر دیا

"خیر جو ہونا تھا ہو گیا" ڈاکٹر نے کہا "اب چپ رہو میں تم سے چند باتیں کرنی چاہتا ہوں"

"میں کوئی کروڑپتی تو ہوں نہیں کہ اپنے روپوں کا کچھ رنج نہ کروں۔ تم بھی عجب باتیں کرتے ہو"

"اچھا خاموش بھی رہو" جمشید نے کسی قدر غصہ سے کہا "میں صبح تمہیں پندرہ کی بجائے بیس روپے دے دونگا بس خاموش ہو جاؤ"

دونوں بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد بیوی نے کہا "اچھا اب تم مجھ سے کیا کہنا چاہتے تھے"

"مجھے اتفاق سے یہ چیز مل گئی ہے" ڈاکٹر نے تار اسکی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

اس کی بیوی نے اپنے کاندھے ہلا کر اور چہرہ کو رومال سے صاف کر کے جواب دیا "ہاں ہے کیا۔ نوروز کی مبارکباد ہے۔ اس میں کچھ اسرار تو پوشیدہ نہیں ہیں"

"تم مجھے بچہ نہ سمجھو میں سب باتیں جانتا ہوں لیکن میں اس گھر کو لڑائی کا میدان نہیں بنانا چاہتا۔ لڑائیاں اور جھگڑے کافی ہو چکے ہیں۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں تم آزاد ہو جہاں تمہارا دل چاہے چلی جاؤ"

تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے پھر کہنا شروع کیا "نوشابہ۔ اگر تمہیں اس نوجوان سے محبت ہے تو میں درمیان میں حائل نہیں ہونا چاہتا۔ اگر تم اس کے پاس جانا چاہتی ہو تو چلی جاؤ"

"میں تم سے کچھ چھپانا نہیں چاہتی" نوشابہ نے کہا

دل بالکل صاف ہے۔ کاش اگر تم اسے چیر کر دیکھ سکتے۔ ٹھیک ہے میں منصوری جانا چاہتی ہوں۔ لیکن صرف اپنی محبت کی خاطر۔ زندگی کے لئے۔

"میں یہ کہہ رہا ہوں تم آزاد ہو"

"تو میں منصوری کب جاؤں"

"جب تمہارا دل چاہے"

"لیکن میں صرف ایک ماہ کے لئے جانا چاہتی ہوں۔"

"نہیں۔ ہمیشہ کے لئے" جمشید نے زور سے کہا "میں تمہیں طلاق دئے دیتا ہوں۔ سارا الزام اپنے سر لے لوں گا۔ تم "فوجی" سے شادی کر سکتی ہو"

"لیکن میں تم سے الگ ہونا تو چاہتی نہیں اور نہ میں نے اسکے متعلق تم سے کچھ کہا ہے"

"لیکن اس میں حرج ہی کیا ہے" ڈاکٹر نے غصہ سے کہا "تم بھی عجیب عورت ہو اگر تم اس سے محبت کرتی ہو اور اسکے پاس رہنا چاہتی ہو تو سب سے اچھا طریقہ یہی ہے کہ اس سے شادی کرلو"

"میں تمہاری باتیں سمجھ گئی ہوں" نوشابہ نے آنکھیں نکالکر کہا "تم مجھ سے تنگ آگئے ہو۔ اور کسی طرح مجھ سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہو۔ میں ایسی احمق نہیں ہوں۔ بس رہنے دو۔ دوسرے یہ کہ میری عمر ستائیس برس کی ہے اور فیروز صرف تیئس برس کا ہے وہ تو چند دنوں میں مجھے باہر کر دیگا۔ میں تمہیں چھوڑ نہیں سکتی"

"میں تمہیں باہر نکال دونگا۔ مکار۔ پاجی عورت"

"دیکھی جائیگی"۔ یہ کہہ کر نوشابہ اپنے کمرہ میں جاکر سوگئی۔ ڈاکٹر نے اپنے کمرہ میں آکر ٹہلنا شروع کر دیا۔ اب صبح ہو رہی تھی۔ اور کمرہ کسی قدر روشن ہو گیا تھا اسکی نظر ایک تصویر پر پڑ گئی جو دیوار پر ٹنگی ہوئی تھی۔ یہ تصویر آج سے سات برس پیشتر اسکی شادی کے موقعہ پر لی گئی تھی۔ اسمیں اسکے خسر اسکی ساس، نوشابہ اور خود اسکی تصویریں تھیں اسکا خسر موٹا اور بھاری سا انسان تھا جسکی شکل وصورت سے مکاری اور عیاری ظاہر ہوتی تھی۔ اسکی ساس جسکے خط رخال بہت نمایاں تھے ایک خوفناک شیرنی معلوم ہو رہی تھی۔ نوشابہ جسکی عمر اسوقت بیس برس کی تھی اگر شیرنی نہیں تو کسی وحشی جانور کے لگ بھگ تو ضرور تھی۔ اور خود جمشید ایک معصوم نیک دل اور بھولا بھالا آدمی لگتا تھا۔ تصویر دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ ایک غریب انسان وحشی جانوروں کے پنجہ میں پھنس گیا ہے جہاں سے نکلنا بالکل ناممکن سا ہے۔

اس نے سوچنا شروع کیا کہ کس طرح وہ ایک غریب نیک اور معصوم آدمی ایسے انسانوں کے قبضہ میں چلا گیا جن کی صورتیں تو انسانوں کی سی ہیں لیکن سیرتیں حیوانوں سے بدتر ہیں اسکو اپنی حالت پر بڑا ترس آیا۔

نو بجے دن کے جب وہ کوٹ پہنکر ہسپتال جانیکی تیاری کر رہا تھا تو ایک نوکر نے آکر اسے سلام کیا۔

"کیا ہے" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"بیگم صاحبہ ابھی سوکر اٹھی ہیں۔ رات کو ان کے پندرہ روپے گم ہو گئے تھے اور آپ نے وعدہ کیا تھا کہ بیس روپے دے دینگے۔ انہوں نے یہ روپے منگوائے ہیں"



کسی زمانے کی دلّی

(از مصور غم علامہ راشد الخیری مدظلہٗ)

...ماں آباد دیکھنے والی صورتیں تو ٹوٹی ہی تھیں قلق یہ ہے ...ان کو دیکھنے والی آنکھیں بھی بند ہو گئیں۔ آج ان کے ...رونے والے مجھ جیسے دو چار مرثیہ خواں باقی ہیں۔

شہر آبادی کا سماں میں نے بھی نہیں دیکھا ہاں ان مقدس چہروں کی زیارت کی ہے جن کے دل دلی کی آگ سے بھر رہے تھے جن کی داستانیں صحبت شب کا سماں دکھا دیتی تھیں اور جن کی تانیں زخمی دلوں کے ٹکڑے اڑا رہی تھیں میں نے دلی کا وہ دورہ نہیں دیکھا جب چپے چپے اور کونے کونے میں گوہر یکتا چمک رہے تھے۔ ہاں چوک کے دو رویہ درخت جو جیٹھ بیساکھ کی گرمی میں تھکے ماندے مسافروں کو پناہ دیتے تھے میری آنکھ کے سامنے ہیں۔ سعادت خاں اور مور سرا کی نہریں میرے سامنے متی ہیں۔ پن چکی کو برابر ہوتے میں نے دیکھا ہے۔ زینت محل کے کمرے کی پہلی تصویر اب بھی میری آنکھوں میں پھر رہی ہے۔ بیلے کے سرسبز اشجار کھڑکھ...

...اور پہاڑ گنج کی عالیشان عمارتیں میرے سامنے ڈھنڈار ہوئی گیا آج دن عبارت ہے وائسریگل لاج سے، سرکیٹ ہاؤس سے رائے سینا کی پختہ سڑکوں اور خوشنما باغیچوں سے اور جب سنتا ہوں کہ قطب تک عمارتیں بن گئی ہیں جنگل میں منگل ہو رہا ہے تو بے ساختہ کہتا ہوں کہ مکان بن گیا مگر وہ مکیں کہاں۔

تاجور صاحب آپنے ان چند سطروں کی فرمایش سے مجھے تکلیف دی۔ بھائی دلی کیسی اور دلی والے کہاں! وہ صحبت ختم اور بزم برہم ہوئی اس خاک سے ایسے لوگ اٹھے ہیں کہ وضعداری ان کے قدم چومتی تھی اور انسانیت انکی زندگی پر قربان ہوتی تھی بیس سال سے زیادہ ہی ہوتے ہونگے۔ میں چاوڑی بازار میں مرزا جان رفوگر کی دوکان پر بیٹھا ہوا تھا۔ اللہ اللہ مرزا صاحب کا خیال آتے ہی انکی صورت آنکھوں میں پھر گئی۔ سرخ و سپید رنگ، بھری ہوئی ڈاڑھی گٹھا ہوا بدن تن زیب کا انگرکھا۔ تنا ہوا جسم۔ بنے ہوئے ڈنٹر بشاگرد

گھٹنوں پر شالیں ڈالے رفوگر رہے ہیں اور مرزا صاحب خاموش بیٹھے ادھر دیکھ رہے ہیں کوئی دلی والا دکھائی دیگیا تو ذرا سی سلام کیا اور پاس بلاکر دو چار باتیں کیں۔ زبان سبحان اللہ! فصاحت کا دریا بہتا کہ امنڈتا تھا۔ ساٹھ برس کی عمر ہو چکی ہے۔ مگر کثرت کا شوق باقی تھا دونوں ڈنڈوں کو دیکھ رہے ہیں اور خوش ہو رہے ہیں۔ مجھ سے فرمانے لگے۔

آکا۔ دولی نصیب نہیں۔ مگر اب بھی پانسو بیل لیتا ہوں میں نے کہا۔ مرزا صاحب! فرمایئے آج کل کیا شغل ہے ٹھنڈا سانس بھر کے کہنے لگے۔ ارے میاں کیا پوچھتے ہو۔ شہر اجڑا شہر والے اجڑے مولانا دیکھتے ہی دیکھتے بھرے گھر صاف ہو گئے نواب علاء الدین خاں کی سرکار حکیم محمود خاں کا دربار ظہیر الدین خاں کی بیٹھک ہائے مولانا کیا سماں اٹھی ہیں۔ دل تڑپتا ہے۔ کیسے پایہ کے لوگ تھے۔ اب اجڑے شہر کی نشانیاں یہ دو گھر رہ گئے ہیں۔ اجمل خاں اور رضی الدین خاں۔ مگر غضب تو دیکھو دونوں میں پھوٹ ہے۔ پھوٹی آنکھ کا دیدہ دو ڈیوڑھیاں اور وہ بھی گائے کا گردہ! آکا مشکل تو میری ہے میں نے محمود خاں اور ظہیر الدین خاں دونوں کے ہاتھ چومے ہیں اب اس منہ سے کس کو برا کہوں گیارہ بجے تک اجمل خاں کے ہاں بیٹھتا ہوں دو بجے تک رضی الدین خاں کے ہاں بائیس برس سے حاضری میں فرق نہیں آیا جو یہاں سنا وہ یہاں چھوڑا۔ جو وہاں کان میں پڑی وہ وہاں پھینکی مرزا صاحب نے اب پھر دونوں ڈنڈ دیکھے اور فرمایا۔ آکا دیکھو تو سہی لوہے کی سلاخیں ہیں۔ ایمان سے کہنا! آکا اس بدن پر ریاض کیا ہے۔ ریاض!

(۲) شام ہو رہی ہے بسیلانی جیوڑے، رنگین چادر بغل میں لئے پان کی گلوری منہ میں دبائے چاوڑی کی سیر کو نکل پڑے ہیں۔ مینا اور چنبیلی کی صداؤں سے بازار گونج رہا ہے فٹنیں اور چوکڑیاں پالکیاں اور گاڑیاں آ اور جا رہی ہیں۔ مرزا صاحب تن تن کر اور پھیل پھیل کر ڈنڈوں کو دیکھ رہے ہیں۔ ہدایت پنواڑی کی دوکان پر جھگھٹا لگا ہوا ہے۔ الائچی دار پانوں کی فرمائش ہو رہی ہیں۔ سامنے سے ایک گورا چٹا آدمی شربتی کا چست انگرکھا پہنے۔ آٹھ انگل لیس کی ٹوپی سر پر وصلی کی جوتی پاؤں میں سبز رنگ گھوڑے پر خراماں خراماں چلا آ رہا ہے۔ مرزا صاحب نے بھانپا اور کہنے لگے۔

نواب احمد سعید خاں آ رہے ہیں۔ آکا ہو بہو علاء الدین خاں کی تصویر ہے۔ عادت میں خصلت میں۔ صورت میں شکل میں وضع میں قطع میں۔ بات میں چیت میں دوسرا علاء الدین سمجھ لو آکا اب ادب بھی اللہ کا نام ہے۔ لو اب تم سیر دیکھو۔ نظر کے ساتھ ساتھ ہاتھ اٹھے گا جنتی نواب کا بھی یہی وطیرہ تھا۔ میاں یہ رنگ بھی ختم ہو رہا ہے۔

(۳) وقت کی بات تھی یا مرزا صاحب کی تقدیر میں ندامت کہ نواب نیچی گردن کئے بغیر سلام کئے نکل گئے۔ اب مرزا صاحب کی عجیب کیفیت تھی گھبرا کر کہنے لگے۔

مولانا خدا کی قسم! احمد سعید خاں نے جس روز سے نکلنا شروع کیا ہے۔ آجتک بے سلام کئے آگے قدم نہیں اٹھایا آکا بھول گیا۔ پیڑیوں کا نواب ہے نام کو تمکنت نہیں۔ اچنبا ہے اچنبا۔ احمد سعید خاں اور بے سلام کئے جائے عقل کام نہیں کرتی۔ مرزا صاحب متحیر و متعجب سروھن رہے تھے۔ کہ نواب کا گھوڑا لوٹا اور چشم زدن میں احمد سعید خاں ہاتھ باندھے دوکان کے آگے کھڑے فرما رہے۔ حضرت مرزا صاحب معاف فرمائینگا میں

پنی دمن میں چلا گیا تھا۔

(۴) سبحان اللہ سبحان اللہ کہ ما پہ لطف سماں ہے نواب ...حمید خاں سلام کرنے پہ سر لی۔ قوس کے معافی مانگ رہے ہیں، اور کس طرح گھوڑے سے اتر کر اور ہاتھ جوڑ کر

دلی کی وضعداری کا یہ دلی سا نمونہ اور صحبت شب کی ہلکی سی جھلک تھی۔ اب یہ صحبت ختم ہو گئی اور ...، جہاں خوش الحان کی چہک انسانیت کے نغمے سنا رہی تھی وہاں تھینکیو اور ویری سوری کی آوازوں سے کانوں کے پردے پھٹ رہے ہیں۔ (علامہ ...)

خون کی ارزانی

ولایتی اخبارات کے حوالہ سے ہندوستان کے اخبارات میں بھی اعداد ذیل شائع ہوئے ہیں۔

جنگ کریمیا میں ، لاکھ ۸۵ ہزار۔ انسان قتل ہوئے
امریکہ کی جنگ آزادی میں ،، ،، ،،
روس جاپان کی جنگ میں ، ،، ۲۴ ،، ،، ،،
جنگ بلقان میں ا ،، ،، ،،
جنگ عمومی میں ۲ کروڑ ۸۰ لاکھ ،، ،،

یہ اعداد ایک صدی کے اندر کے مقتولین جنگ کے ہیں لیکن ان میں شمار صرف بڑی بڑی اہم جنگوں کو کیا گیا ہے، چھوٹی چھوٹی بہت سی جنگوں کو چھوڑ دیا گیا ہے، اور پھر اعداد صرف اُن مرنے والوں کے ہیں، جو عین میدان جنگ میں کام آئے، جو زخمی ہوئے، اور گھر پر آکر جانبر نہ ہو سکے، یا جو جیتے رہے۔ مگر زندہ درگور، وہ سب اس فہرست سے خارج ہیں!

یہ کشتگان خنجر و شمشیر کی نہیں، قتیلان تفنگ، توپ، و گیس کی تعداد ہے! یہ مہذب اور نیک نام "جنگ" کی فرد عمل ہے، وحشیانہ اور بدنام "جہاد" کی نہیں۔ "(سچ)"

مہاتما گاندھی سے مسلمانان مصر کی عقیدت

تازہ ڈاک میں جو مصری اخبارات موصول ہوئے ہیں وہ گاندھی جی اور ان کے روزے کے متعلق نہایت پرزور مضامین سے لبریز ہیں۔ ذیل میں مشہور مصری شاعر احمد یوسف بک کی ایک نظم کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ دنیائے اسلام گاندھی جی کو کس نظر سے دیکھتی ہے۔

گاندھی کے روزے میں اللہ برکت دے

گاندھی مشرق کے لئے قوت ہے اور روشنی کا ستون وہ صحیح رائے کے ساتھ روح کی قوت ہے۔

گاندھی نے ہندوستان پر سب کچھ قربان کر دیا ہے نہ اُس کی نگاہ میں مال کی کوئی قیمت ہے اور نہ دنیا اُسے اپنے دامنوں میں پھنسا سکتی ہے۔ زندگی اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ اُس کے دل کو نہیں لبھا سکتی۔

وہ زاہد ہے۔ اپنے جسم کو تکلیف سے بچانے والے سامان کی بھی اُسے طلب نہیں۔

وہ زندگی سے جس مقصد کا طالب ہے۔ وہ خود زندگی سے بہت بلند ہے۔ وہ ہندوستانیوں کے لئے ایسی عزت کی زندگی چاہتا ہے جس میں نہ کوئی ذلت ہو نہ خواری۔

وہ تمام مخلوق کی خوشی کا طالب ہے، جو طمینان و امن کے زیر سایہ ہو۔ گاندھی نے اپنے عزم سے زمیں کا مرکز ہلا ڈالا ہے

("ہند جدید")

ہندوستان کی عظمت

ہندوستان سلطنت جرمنی سے ۱۰ گنا زیادہ بڑا ہے۔
ہندوستان جاپانی سلطنت سے ۱۱ گنا زیادہ بڑا ہے۔
ہندوستان جزائر برطانیہ سے ۱۵ گنا زیادہ بڑا ہے۔
ہندوستان بر اعظم یورپ کے برابر ہے۔ باستثنا روس
ہندوستان میں ۷،۰۰،۰۰۰ دیہات میں
ہندوستان میں ۶۷۷ دیسی ریاستیں ہیں۔

برطانوی ہندوستان ۱۴ صوبوں پر منقسم ہے۔ ہر صوبہ ضلعوں پر منقسم ہے ہر ضلع تعلقوں یا تحصیلوں پر منقسم ہے ہر تعلقہ تھانوں پر منقسم ہے ہر ضلع کا اوسط رقبہ ۴۵۰۰ مربع میل ہے۔

ہندوستان کی دس میں سے نو حصہ آبادی دیہاتوں میں رہتی ہے۔

ہندوستان میں ایک لاکھ سے زیادہ آبادی رکھنے والے ۳۱ شہر
ہندوستان کی آبادی دنیا کی مجموعی آبادی کا پانچواں حصہ ہے۔
ہندوستان کی آبادی ولایت متحدہ کی آبادی سے تین گنا زیادہ ہے۔
ہندوستان کی آبادی فرانس کی آبادی سے ۸ گناہ زیادہ ہے۔
صرف مدراس اور میسور کی آبادی جاپان کے برابر ہے۔
صرف بمبئی کی آبادی سپین اور پرتگال کی مجموعی آبادی سے زیادہ ہے۔

ہندوستان میں ہر مربع میل کی اوسط آبادی ۱۷۷ ہے۔

اگر ہر منٹ میں ۲۵۲ آدمیوں پر نظر ڈالی جائے تو پورے ہندوستان کی آبادی دیکھنے کے لئے تیس (۳۰) برس کا زمانہ درکار ہوگا۔ (ملت)

مسلمانوں کے حقیقی دشمن

سلطنت کھو چکنے کے بعد ہندوستان کی زمین مسلمانوں پر تنگ ہوگئی تھی۔ ایک طرف حکومت ان سے بیزار تھی دوسری طرف ہندوستانی فرقے انہیں پیسے ڈالتے تھے۔ سر سید احمد خاں مرحوم و مغفور کا خیال تھا کہ اگر حکومت کو یقین ہو جائے کہ مسلمان اس کے وفادار ہیں تو انکی حالت سدھر سکتی ہے چنانچہ انہوں نے مسلمانوں کو حکومت کی خدمت و وفاداری کی طرف بلایا اور مسلمان مدتوں انکی مقرر کی ہوئی روش پر چلتے رہے۔ مسلمانوں نے حکومت کی خدمت و موالات میں کوئی کوتاہی نہیں کی، حتیٰ کہ حکومت کی خوشنودی کو اپنے مذہبی احکام پر بھی ترجیح دی، مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ حکومت کی طرف سے انہیں کوئی فائدہ نہ پہنچا۔

جب ہوشمند مسلمانوں کو یقین ہو گیا کہ ہندوستان میں ملت اسلامیہ کے بقا و دوام کے لئے حکومت پر نہیں بلکہ اپنی ذاتی قوت پر بھروسہ کرنا چاہیئے تو خود مسلمانوں میں سے ایک گروہ ان بہی خواہان قوم کی مخالفت کیلئے اٹھ کھڑا ہوا اور ان کی راہ میں ہر طرح کی رکاوٹیں پیدا کرنے لگا اور یہ صرف اس لئے کہ حکومت سے چند خطاب اور چند نوکریاں حاصل کر سکے۔

اس گروہ نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کی کہ مسلمانوں کو میدان حیات و ترقی میں آگے بڑھنے نہیں دیا بلکہ سب سے بڑا ظلم یہ کیا کہ ایک طرف ہندوؤں اور سکھوں کو بر سر جنگ کر دیا اور دوسری طرف مسلمانوں میں کمزوری اور بزدلی پیدا کر دی۔ چنانچہ مدتوں بری طرح پٹتے اور برباد ہوتے رہے

[redacted]

ہندوؤں اور سکھوں وغیرہم سے انہیں تجدستایا اور ان سے سخت ناانصافانہ دبے رہنا سلوک کرتے رہے (ہند جدید)

اجڑی بستی کو بسانے کی تیاریاں

سر سیموئیل ہور کی رجعت پسندی کی بالکل تازہ مثال یہ ہے کہ انہوں نے ایک سو بنگالی نوجوانوں کو اس الزام پر کہ وہ انارکسٹ ہیں انڈیمان بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے۔ انڈیمان میں خونی اور دیگر خطرناک ترین مجرم بھیجے جایا کرتے تھے ان کے ساتھ ہی وہ پولیٹکل قیدی بھی جنہیں عمر قید کی سزا دی جاتی تھی لیکن گورنمنٹ کی اخلاقی ہمدردی اس بات کو برداشت نہ کر سکی کہ خطرناک اور لمبی میعاد کے قیدیوں کو بھی ایسی آب و ہوا میں رکھا جائے جو زندہ کو مردہ بنانے والے ہیں۔ ۱۹۱۹ء میں گورنمنٹ نے ایک انڈین جیلز کمیٹی مقرر کی۔ اس کمیٹی نے قیدیوں کو انڈیمان بھیجے جانے کے خلاف سخت شکایت کی، کیونکہ وہ جگہ صحت کے لئے سخت ضرر رساں ہے۔ اس کمیٹی کی سفارشات کا نتیجہ یہ ہوا کہ عبور دریائے شور کی سزا کو موقوف کرنے کے لئے ایک بل پیش کیا گیا۔ سر ولیم ونسنٹ ہوم ممبر گورنمنٹ ہند نے ۲۳ ستمبر ۱۹۲۲ء کو لیجسلیٹو اسمبلی میں بل پیش کرتے ہوئے کہا، گورنمنٹ کا منشا نہ صرف عبور دریائے شور کی سزا کو موقوف کرنے کا ہے بلکہ انڈیمان کو بطور ایک تعزیری جیل کے چھوڑ دینے کا، انہوں نے یہ بھی کہا کہ جیل کمیٹی کی سفارشات کو منظور کرتے ہوئے کئی صوبوں کی گورنمنٹوں نے اپنے قیدی انڈیمان سے بلا لئے ہیں، اور وہ تمام قیدی اس وقت تک واپس آ چکے ہیں جنہیں پولیٹکل کا نام دیا جا سکتا ہے۔ چند موپلا قیدیوں کو چھوڑ کر باقی سب کو بلا لیا گیا چنانچہ اس وقت سے لیکر قیدیوں کا انڈیمان بھیجا جانا بند کر دیا گیا۔

سر سیموئیل ہور کی رجعت پسندی کی اس سے بڑھ کر کیا دلیل ہوگی، کہ انہوں نے گورنمنٹ ہند کے سالوں کے تجربہ کو اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا ہے، انہیں اس بات کی پرواہ نہیں کہ جیلز کمیٹی نے کیا سفارش کی تھی، انہیں اس بات کی پرواہ نہیں کہ لیجسلیٹو اسمبلی گورنمنٹ کی سفارش پر عبور دریائے شور کی سزا موقوف کر چکی ہے، انہیں اس بات کی پرواہ نہیں کہ گورنمنٹ بنگال نے اس قسم کے خطرناک قیدیوں کے لئے ہجلی وغیرہ کئی مقامات مقرر کر رکھے ہیں حال ہی میں گورنمنٹ نے راجپوتانہ میں دیولی جیل ایسے نوجوانوں کے لئے مقرر کیا ہے۔ دس سال کے بعد اب، پھر انڈیمان کو بسانے کی تیاریاں ہیں، خطرناک قسم کے، اخلاقی قیدیوں سے نہیں بلکہ پولیٹکل قیدیوں سے باوجود اس کے سر سیموئیل ہور کو یہ شکایت ہے کہ انہیں رجعت پسند اور غیر ہمدرد سمجھا جاتا ہے۔ (پرتاب)

سگریٹ سگار اور پائپ

آج کل جدید تہذیب کے ماتحت، اس شخص کو بمشکل مہذب قرار دیا جائیگا جو بیچارا سگریٹ، سگار یا پائپ نہ پیتا ہو۔ یہ عام "فیشن" میں داخل ہے کہ منہ میں اگر پائپ اور سگار نہیں تو کم سے کم سگریٹ ہی دبا ہوا ہو۔ اصحاب لوگوں سے لیکر صدہا ملکی رہنماؤں کی بھی یہ حالت ہے۔ کہ سیکڑوں روپیہ سالانہ وہ سگریٹ اور سگار پر خرچ کر ڈالتے

ہیں۔ ممکن ہے کہ بعض لوگوں کو کسی ڈاکٹر نے ہدایت کی ہو اور تمباکو نوشی کا کسی مصلحت سے مشورہ دیا ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی بہت بڑی تعداد بغیر کسی وجہ خاص کے اس خراب عادت میں مبتلا ہے۔ سب سے زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ انکی اس عادت سے ملک کی دولت کا بہت بڑا حصہ دوسرے ملکوں کو چلا جاتا ہے اور اس کے عوض میں ہندوستان کو صرف جلی ہوئی راکھ تھوڑی سی مقدار میں مل جاتی ہے اور کچھ نہیں!

ٹیکسوں کی تحقیقاتی کمیٹی نے حال میں ہندوستان میں سگریٹ کے خرچ کا اندازہ لگایا تھا۔ اس اندازہ کے مطابق ملک میں ساڑھے چار ارب سگریٹوں کا سالانہ خرچ ہے جسکی تیاری میں کم و بیش ایک کرور پونڈ تمباکو صرف ہوتا ہے۔ اس ایک کرور پونڈ کا نصف یعنی پچاس لاکھ پونڈ تمباکو ہر سال دوسرے ملکوں سے آتا ہے یہی نہیں کہ اس تمباکو کی لاکھوں روپیہ قیمت ہمارے اپنے ہاتھوں دوسرے ملکوں کی جیبوں میں چلی جاتی ہے بلکہ ہم ہر سال ۵۰ لاکھ روپیہ ٹیکس کی صورت میں حکومت کو بھی دیدیتے ہیں۔

بہت سے لوگ تمباکو خرید کر اپنے ہاتھ سے سگریٹ بنا کر پیتے ہیں۔ وہ بازار سے کاغذ اور تمباکو دونوں علیحدہ علیحدہ خرید لیتے ہیں۔ یہ کاغذ تمام تر دوسرے ملکوں سے آتا ہے۔ اسپر بھی جو ٹیکس عائد ہوتا ہے اسکے ذریعہ کم و بیش سوا لاکھ روپیہ حکومت کو مل جاتا ہے۔ پونے چار لاکھ روپیہ حکومت ہر سال سگریٹ کے ٹین کے ڈبوں اور کاغذ کے پیکٹوں وغیرہ کے سامان پر ٹیکس لگا کر وصول کر لیتی ہے غرضیکہ سگریٹ کے ذریعہ حکومت کو نقد اسی لاکھ روپیہ سالانہ کی آمدنی ہے جسکا اوسط عہ فی ہزار سگریٹ یا تقریبًا ۰۲ فی سیکڑہ سگریٹ پڑتا ہے یعنی ہر سگریٹ پر سگریٹ پینے والے ایک پیسہ حکومت کے جیب میں ڈالدیتے ہیں۔

ان سگریٹوں کی قیمت کا اندازہ مشکل ہے اور اس لئے قطعی طور پر ہم نہیں بتا سکتے کہ ہر سگریٹ پر کتنے پیسے ہم دوسرے ملکوں کو دے ڈالتے ہیں تاہم ہمکا تخمینی اوسط صہ فی ہزار پڑا ہو ۸ فی سیکڑہ دوسرے ملکوں کو دیا جاتا ہے جسکے معنی یہ ہوئے کہ ہر تین سگریٹ پر ایک پیسہ دوسرے ملک والے ہماری جیب سے نکال لیتے ہیں!

ان اعداد و شمار کے بعد کیا یہ امید کی جائے کہ سگریٹ سگار اور پائپ پینے والے ذرا اسپر غور کر لیا کرینگے کہ وہ اپنی اس عادت سے ملک کو حکومت کو اور دوسروں کو کتنا نفع پہنچاتے ہیں؟



بی ہمسائی

از سعید احمد

"آپا! اس دن آپنے مجھے اسمبلی اور کونسل کا مطلب تو سمجھا دیا تھا لیکن عورتوں کو جو نشستیں ان مجلسوں میں ملی ہیں انکے متعلق کچھ ایسا خیال ظاہر کیا تھا کہ گویا یہ کچھ اچھا نہیں ہوا۔ میں نے پوچھا بھی تھا کہ کیوں آپ کا ایسا خیال ہے تو آپنے دوسرے دن کا وعدہ کرکے اس وقت ٹال دیا تھا۔ اس دن سے کچھ ایسے اتفاق ہوتے رہے کہ یا تو مجھے فرصت نہ ہوئی کہ اگر کہیں کسی میں کھڑی ہوتی۔ یا اگر مجھے موقع ملا تو آپ نہ مل سکیں۔ آج کوئی دس بارہ روز کے بعد کہیں جاکے ایسا ہوا ہے کہ آپ بھی گھر میں موجود ہیں اور مجھے بھی کئی گھنٹے کی فرصت ہے۔ اگر کچھ حرج نہو تو آج مجھے یہ بات سمجھا دیجئے کہ اسمبلی اور کونسل میں جانا اور ملک کے انتظام میں مردوں کی طرح حصہ لینا عورتوں کے لئے کیوں اچھا نہیں ہے"!

ہمیدہ۔ (مسکرا کر) لے ہے حمیدہ بہن! تم تو بس ایک بات کے پیچھے ہی پڑ جاتی ہو۔ اب خدا جانے اس دن میرے دل میں کیا کیا باتیں بھری ہوئی تھیں اور میں نے یہ کہدیا تھا۔ اب تو میں بھول بھی گئی۔

حمیدہ۔ نہیں میری اچھی آپا! یہ تو مجھے بتا ہی دیجئے۔ انہوں نے کئی دن سے میرا سر کھا لیا ہے۔ روز یہی ذکر ہوتا رہتا ہے کہ عورتوں کو اس سے بڑا فائدہ پہونچیگا، اور جو عورتیں اسمبلی اور کونسل میں جائیں گی وہ اپنے فرقہ کے لئے اب بہت کچھ کر سکتی ہیں۔ اب تک صرف مرد ہی کونسلوں میں جایا کرتے تھے، اور انہیں نہ عورتوں کی ضرورتوں سے پوری پوری واقفیت تھی، اور نہ انہیں کچھ ایسی غرض ہی تھی کہ خواہ مخواہ کے لئے دردسر مول لیں اور مردوں کی بہبود کے کام چھوڑ کے عورتوں کے لئے کچھ کرتے پھریں۔ عورتیں اپنے فرقہ کی ضرورتوں سے بھی اچھی طرح واقف ہونگی، انکے دل میں اپنے فرقہ کی خدمت کا جوش بھی ہوگا اسلئے وہ عورتوں

کی ترقی اور بہبود کیلئے بہت کچھ کرسکتی ہیں۔ وہ بھی کہتے تھے کہ اس طرح اسمبلی اور کونسلوں کے اندر نشستیں مل جانے سے عورتوں کی قدر اور منزلت بھی بہت کچھ بڑھ گئی ہے، اور اسکے معنی یہ ہیں کہ گویا اب حکومت نے بھی یہ تسلیم کرلیا ہے کہ عورتوں کا طبقہ بھی ملک کی آبادی کا ایک اہم اور ضروری حصہ ہے اور ملک کا انتظام کرتے وقت اس طبقہ سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی۔ ابھی تک چونکہ حکومت نے عورتوں کے اس حق کو تسلیم نہیں کیا تھا تو مرد بس یہی سمجھا کرتے تھے کہ جو کچھ ہیں وہی ہیں، اور عورتیں کسی شمار و قطار ہی میں نہیں ہیں لیکن اب وہ ایسا نہیں کرسکتے اور انہیں مجبور ہوکر عورتوں کی اہمیت ماننی پڑے گی، اور اب وہ عورتوں کی ضرورتوں کو حقارت کے ساتھ نہ ٹھکرا سکیں گے۔

فہمیدہ۔ (مسکراکر) تمنے تو پوری الف لیلہ دہرا ڈالی، اور ماشاءاللہ ذہن کس قدر اچھا ہے کہ جو لفظ انکی زبان سے سنے تھے سب ویسے کے ویسے ہی یاد ہیں۔ اب میں عورت ذات، اور پھر بے پڑھی لکھی انکی دلیلوں کا جواب کیا دے سکتی ہوں۔ وہ خدا کے فضل سے نہایت اچھے تعلیم یافتہ اور عقلمند آدمی ہیں، اور پھر یہ کہ رات دن اخبار اور رسالے پڑھتے، اور دوسرے شخصوں سے انہیں باتوں کے متعلق گفتگو کرتے رہتے ہیں، انہوں نے اس قدر سوچ سمجھ کر، اور بحث مباحثے کرکے جو رائے قائم کی ہوگی وہ ٹھیک ہی ہوگی لیکن خدا جانے کیا بات ہے کہ اندر سے میرا دل یہی کہتا ہے کہ یہ "کونسل کی نشستیں" اور یہ "عورتوں کے حقوق کی حفاظت" سب فضول اور لغو سی باتیں ہیں، اور ان سے اچھے کی بجائے کچھ برا ہی نتیجہ نکلے گا۔

حمیدہ۔ اے ہے تو یہی تو میں بھی پوچھتی ہوں کہ کیوں آپ کا ایسا خیال ہے۔ ان سے تو ابھی تک میں نے کچھ کہا نہیں ہے مگر میں سچ کہدوں کہ مجھے تو آپ پر کچھ ایسا عقیدہ ہوگیا ہے کہ جو کچھ بھی آپ کہدیں بس وہی صحیح معلوم ہوتا ہے اور پھر اسکے خلاف کوئی کتنی ہی دلیلیں پیش کرے۔ ایک بھی میرے دل میں نہیں اترتی۔ آپنے اس دن یونہی کچھ اشارہ سا کیا تھا کہ عورتوں کو یہ حق ملنا انکے لئے کچھ اچھا نہیں ہے، بس اب یہی بات میرے دل میں جم گئی ہے، اور اسکے خلاف روزمرہ انکی بیسیوں دلیلیں سنتی ہوں لیکن ایک بھی سمجھ میں نہیں آتی۔ ان سے بحث کرنے کی تو نہ مجھ میں لیاقت اور نہ ہمت اسلئے جو کچھ وہ کہتے رہتے ہیں اسے خاموشی سے سن لیتی ہوں، لیکن خدا جانے کیا بات ہے کہ دل میرا بھی اندر سے یہی کہتا رہتا ہے کہ یہ ٹھیک نہیں ہے۔

فہمیدہ۔ ایسی عقیدت تو کسی کام کی نہیں ہوتی کہ آدمی عقل سے بھی کام نہ لے۔ تمہیں ہر حالت میں ایک صحیح بات کو مان لینے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ اگر ناصر میاں کی دلیلیں تمہاری سمجھ میں آتی ہیں اور وہ تمہیں صحیح معلوم ہوتی ہیں تو صرف اس وجہ سے کہ میں ان کے خلاف رائے رکھتی ہوں تمہیں انکو غلط نہ سمجھنا چاہئے۔ بات یہ ہے بہن کہ مجھے یہ نئی تہذیب اور نئی روشنی کے چوچلے کچھ بہت اچھے نہیں معلوم ہوتے ہیں۔ میں نے اکثر یہی دیکھا ہے کہ ان باتوں میں سچائی اور اصلیت بہت کم ہوتی ہے، اور ظاہری دکھاوا اور نمایش بہت زیادہ ہوتی ہے۔ ظاہر میں واقعی یہ ایک بہت ہی اچھی بات معلوم ہوتی ہے کہ حکومت نے

غریب اور بیکس عورتوں کی طرف توجہ فرمائی، اور انہیں بھی مردوں کی طرح اس بات کا موقع دیدیا کہ ملک کے انتظام میں حصہ لیکر اپنے فرقے کی بھلائی کی صورتیں پیدا کریں، لیکن اگر تم غور سے دیکھوگی تو تمہیں معلوم ہوگا کہ اس سے نقصان کے سوا نفع کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ عورتیں ہوں یا مرد، سب کی حقیقی اور اصلی ضرورتیں یہ ہیں کہ انہیں پیٹ بھر کر روٹی، اور تن ڈھکنے کو کپڑا میسر آجائے، انکی تعلیم اور تربیت کا ایسا انتظام ہو کہ وہ اچھے اور لایق انسان بن سکیں، اور اسکے بعد یہ کہ انکی حفاظت کا کافی سامان موجود ہو تاکہ خراب اور بدمعاش لوگ انہیں نہ ستا سکیں، اور انکے جان و مال کو نقصان نہ پہونچا سکیں۔ اگر کوئی حکومت اپنی رعایا کے لئے یہ سب انتظام کر سکتی ہے تو پھر رعایا کو شکایت کرنے کا کوئی موقع نہیں ہے، اور ایسی حکومت کو ضرور ایک اچھی حکومت کہا جائیگا۔ جہاں تک کھانے کپڑے اور حفاظت کے سوالوں کا تعلق ہے عورتوں اور مردوں کے فرقوں کے درمیان آپس میں کوئی کشمکش، اور کوئی جھگڑا موجود نہیں ہے۔ دنیا میں کسی جگہ بھی ایسا نہیں ہوتا کہ مرد یہ کوشش کرتے ہوں کہ عورتوں کو روٹی اور کپڑا نہ ملے، یا یہ کہ پولیس اور فوج کے جو انتظامات ہیں وہ صرف مردوں کے لئے ہوں اور عورتوں کو ان سے کوئی فائدہ نہ پہونچے اسلئے ظاہر ہے کہ حکومت کی باگ مردوں کے ہاتھ میں ہو یا عورتوں کے ہاتھ میں، ان تین ضرورتوں کے لئے تو مردوں اور عورتوں میں باہم لڑائی جھگڑے کا کوئی امکان ہے ہی نہیں، اب صرف ایک چیز یعنی تعلیم و تربیت باقی رہجاتی ہے جسکے متعلق مرد عورتوں کی طرف سے یا عورتیں مردوں کی طرف سے غفلت برت سکتی ہیں لیکن خوش قسمتی سے یہ چیز بھی ایسی ہے کہ جسکے متعلق مرد اس بات پر مجبور ہیں کہ اپنے فرقے سے زیادہ ہمارے فرقے کی تعلیم اور تربیت کا خیال رکھیں کیونکہ اچھی ماؤں کے بغیر اچھے بیٹے کبھی نہیں پیدا ہو سکتے، اور جاہل اور نالایق عورتوں کی گود میں پلکر جو بچے جوان ہوتے ہیں وہ ہرگز ہرگز اس قابل نہیں ہوتے کہ قوم ان پر فخر کر سکے۔ اگر مردوں کو اس بات کی ضرورت ہے کہ انکی قوم میں لایق اور ہونہار نوجوان پیدا ہوا کریں تو وہ اس بات پر مجبور ہیں کہ پہلے ان نوجوانوں کی پالنے والیوں کو لایق اور تعلیم یافتہ بنائیں اور اسکے یہ معنی ہوئے کہ حکومت کے انتظام میں عورتوں کا ہاتھ ہو یا نہو، مرد خود اپنے فرقے کی فلاح اور بہبودی کی خاطر عورتوں کی عمدہ تعلیم و تربیت کا انتظام کرنے پر مجبور ہیں۔ اب جبکہ ہمیں اس بات کا پورے طور پر اطمینان ہے کہ ہماری ترقی اور ہماری بہبود کا ہر وقت اور ہر لحظہ خیال رکھنے پر مرد خود مجبور ہیں اور ہماری طرف سے غفلت برتنے میں ہمارا نہیں، بلکہ خود انکا نقصان ہے تو پھر وہ ضرورت کونسی باقی رہتی ہے کہ جسکے لئے ہم اپنے گھروں کو ماماؤں اور اپنے بچوں کو اناؤں پر چھوڑ کر کونسلوں کی تکلیف دہ کرسیوں پر جا کر بیٹھیں اور اپنی جان کو مفت کا ایک ہلجان لگالیں۔ کونسل میں جاکر ہم یہی تو کرتے کہ جو قانون بھی ملک کے لئے بنائے جاتے ان میں اس بات کا لحاظ رکھتے کہ کبھی ایسا نہونے پائے کہ مردوں کے پیٹ میں تو روٹی پڑجائے اور عورتیں بھوکی رہجائیں، یا یہ کہ مرد تو کپڑا پہن لیں اور عورتوں سے کہدیں کہ تم ننگی پھرا کرو، یا یہ کہ مردوں کی حفاظت کے لئے تو فی مرد ایک سپاہی اور ایک ایک مشین گن مل جائے اور عورتیں اگر دن میں بار سے

لوٹ جائیں تب بھی کوئی انکا پرسان حال ہو، یا یہ کہ مردوں کی تعلیم اور تربیت کے لئے تو محلے محلے ایک ایک اسکول اور گھر گھر ایک ایک استاد مہیا کر دیا جائے، اور عورتوں کے لئے تعلیم حاصل کرنا جرم قرار پا جائے۔ اگر ہم کونسلوں میں جاکر بھی کرتے تو یہ سب کام تو بغیر ہمارے وہاں جانے بھی لازمی طور پر انجام پاتے رہتے ہیں اور پاتے رہیں گے پھر ہماری موجودگی وہاں کس کام آئے گی، اور ہمارے وہ کون سے حقوق ہیں جنکی حفاظت کیلئے یہ ضروری ہے کہ ہم خود ہی کونسل میں جاکر بیٹھیں اور اپنے سامنے ملک کے قانون بنوائیں۔ میں نے یہ لفظ کہ "اپنے سامنے قانون بنوائیں" اسلئے کہے کہ ایسا تو کبھی ہو ہی نہیں سکتا کہ ہم خود کوئی قانون بنا سکیں کیونکہ اگر مقابلہ ہی آپڑا تو سینکڑوں مردوں کے مقابلے میں چار چھ یا دس عورتیں کیا کام دے سکتی ہیں اور کس طرح اپنی مرضی کے مطابق کوئی قانون بنا سکتی ہیں۔

حمیدہ۔ مگر آپا آپ یہ تو دیکھئے کہ مردوں نے بہرحال آجتک ہماری تعلیم اور تربیت کی طرف سے غفلت برتی ہی ہو۔ اگر انکی طرف سے ایسی غفلت نہ ہوئی ہوتی تو آج مجھ جیسی جاہل عورتیں کیوں بیٹھ کر اپنے نصیبوں کو رویا کرتیں۔

فہمیدہ۔ بالکل ٹھیک ہے۔ ہمارے مردوں نے یقیناً ایسی غفلت ہوتی ہے بھی نہیں بلکہ بہت سے تو عورتوں کی تعلیم کو گناہ خیال کرتے رہے ہیں۔

حمیدہ (بات کاٹ کر) پھر آپ یہ کیسے کہہ سکتی ہیں کہ عورتیں اگر کونسل میں نہوں تب بھی مرد خود اس بات پر مجبور ہیں کہ عورتوں کی ان ضرورتوں کا خیال رکھیں؟

فہمیدہ (مسکراکر) مجھے بات ختم تو کر لینے دی ہوتی۔ تمہارا یہ اعتراض بالکل صحیح ہے کہ مدتوں سے ہمارے مردوں نے ہماری تعلیم اور تربیت کی طرف سے انتہائی بے پرواہی اور غفلت اختیار کر رکھی ہے۔ لیکن تم یہ بھی تو دیکھو کہ اس کا نتیجہ کیا نکلا ہے۔ یہی ناکہ ہمارے مرد خود بھی حد سے زیادہ پست ذلیل، اور بداطوار ہوگئے ہیں۔ کوئی مردانہ صفت، اور کوئی شریفانہ خصلت اب ان میں موجود نہیں ہے۔ جس طرح گائے بیل بندر، اور بھیڑیئے جنگل میں اپنی زندگی بسر کرتے ہیں تقریباً وہی زندگی اب ہمارے مردوں کی ہے انکی زندگی کا اب کوئی مقصد نہیں رہا ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ اس سے بھی ایک درجہ اور نیچے گر گئے ہیں اور اب انکی زندگی کا مقصد صرف یہ رہ گیا ہے کہ جائز یا ناجائز غرضکہ جس طریقہ پر بھی ممکن ہو اپنے پیٹ کیلئے دو روٹیاں حاصل کرلیں، اور جب یہ دو روٹیاں آسانی سے ملنے لگیں تو پھر ہر طرح کے مکر و فریب اور ظلم وستم سے کام لیکر اپنے بھائیوں کے مال و اسباب پر قبضہ کریں، ضرور آخر میں اسی لیے ذلیل اور ناپاک طریقوں سے حاصل کی ہوئی دولت کو اپنی شہرت اور اپنی عزت کا ذریعہ بنائیں "گناہ جب تک کہ وہ دوسرو کی نگاہوں سے پوشیدہ ہے گناہ نہیں ہوتا" اب انکی زندگی کا اصول ہے، اور یہی وجہ ہے کہ اب چھپکر انہیں کوئی برے سے برا کام کرنے میں بھی تامل نہیں ہوتا سچائی اور خلوص انکے نزدیک بالکل مہمل اور بے معنی الفاظ ہیں، اور اسی لئے وہ حد سے زیادہ بزدل ہوگئے ہیں۔ ہر صاحب قوت وطاقت کے سامنے انکے سر جھک جاتے ہیں، اور ہمیشہ جان کا ڈر یا ذراسی جسمانی تکلیف کا خوف انہیں مجبور کر دیتا ہے کہ ایمان اور ضمیر کے خلاف ہر ایک ...

بھول کریں۔ اخلاق کی یہ تمام پستی اور ایمان کی یہ تمام کمزوری صرف اسی سبب سے پیدا ہو گئی ہے کہ وہ جاہل اور بزدل ماؤں کی گود میں پلکر بڑے ہوتے ہیں، اور خود بھی جاہل اور کندۂ ناتراش رہتے ہیں۔ ان میں سے تھوڑے سے جو تعلیم حاصل کر لیتے ہیں انہیں انکا علم یہ تو بتا دیتا ہے کہ فلاں کام بُرا ہے اور فلاں اچھا، لیکن انکے دلوں میں ایمانی جرأت وہ کبھی پیدا نہیں کرسکتا جو انہیں خوف اور لالچ کے موقعوں پر گناہ سے بچا سکے اور انکے قدموں میں لغزش نہ آنے دے۔ اسکا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ ہمارے لئے رحمت ہونے کی بجائے جاہلوں سے بھی کچھ زیادہ مصیبت اور لعنت بنا ہوا ہے۔ علم انکی عقلوں پر جلا کر دیتا ہے اور جاہلوں کی بہ نسبت وہ اپنے عیبوں اور گناہوں کو بہت زیادہ خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ چھپانے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ وہ ایک عجیب قسم کی مصنوعی زندگی اختیار کر لیتے ہیں، اور ان کے کسی کام میں سچائی اور خلوص کا شائبہ بھی باقی نہیں رہتا۔ چند مصنوعی اداؤں کی مشق، اور ہونٹوں پر حسب ضرورت مسکراہٹ پیدا کر لینے کی عادت انکے دل کی تمام ناپاکیوں کو چھپائے رکھتی ہے اور انکے فریب میں ہر شخص بہ آسانی آجاتا ہے۔ ماں کی گود انہیں نیک، ایماندار، اور بہادر بنا سکتی تھی لیکن انہوں نے اپنے اس مدرسے کو خود ہی تباہ و برباد کر دیا اور اب اسکی سزا بھگت رہے ہیں۔ ذلت اور غلامی کی لعنت انکے گلے کا ہار ہو گئی ہے، اور مفلسی اور ناداری نے ہمیشہ کے لئے انکے گھروں میں ڈیرے ڈال دیئے ہیں۔ ایسی صورت اور ایسی حالت میں اگر دو چار یا دس بیس عورتیں اسمبلی اور کونسلوں میں جاکر مہاتما بودھ جی کی مورتیوں کی طرح کرسیوں پر بیٹھ بھی گئیں تو نتیجہ کیا نکلے گا؟ انہیں اگر لڑنا اور مقابلہ کرنا پڑا تو وہ انہی تعلیم یافتہ مردوں سے ہوگا، اور ظاہر ہے کہ اگر وہ فریب سے کام نہ لیں اور صرف مخالفت ہی ہی کریں تب بھی انکی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ ہم کوئی تجویز اپنے منشار کے مطابق پاس کرا ہی نہیں سکتے۔ اور اگر لڑنا نہیں ہے اور مردوں کو خود اتنی سمجھ آگئی ہے کہ وہ یہ سمجھکر کہ عورتوں کی ترقی در حقیقت انکی اپنی ترقی ہے، عورتوں کی بہبود اور فلاح کے لئے کچھ قانون بنوانے پر آمادہ ہوں تو پھر کسی عورت کی موجودگی کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہتی۔

حمیدہ۔ میں سمجھ تو گئی، لیکن آپا آپکی اس تمام گفتگو کا مطلب صرف یہ نکلا کہ عورتوں کا کونسل میں جانا نجانا بالکل برابر ہے اس سے یہ کیسے ثابت ہوا کہ انکا کونسل میں جانا بُرا ہے۔

فہمیدہ۔ اول تو کسی ایسے کام پر وقت ضائع کرنا کہ جسکا کوئی نتیجہ نہ نکلے ایک حماقت کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن اگر اس حماقت کو جائز بھی تصور کر لیا جائے تب بھی تو جہاں تک میرا خیال ہے اسکے نتیجے کچھ خراب ہی نکلیں گے دو شخصوں میں جب تک کہ ہر چیز کے متعلق "یہ میرا اور وہ تیرا" کے اصول پر عملدرآمد نہیں ہوتا اس وقت تک تو محبت اور دوستی قایم رہتی ہے، لیکن جہاں تیرا اور میرا کا سوال درمیاں میں آیا اور محبت اور دوستی سب رخصت ہوگئی دنیا بھر میں ایک قوم بھی ایسی نہیں ہے کہ جسکے مختلف فرقوں میں اپنے اپنے حقوق طلب کرنے کی وبا پھیلی ہو اور وہ تباہ نہ ہو گئی ہو۔ ہندوستان کے مختلف فرقوں کی تباہی کا سبب اسکے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ ہندو اور مسلمان، سکھ اور پارسی اور عیسائی اور اچھوت سب الگ

الگ اپنے اپنے حقوق طلب کرتے رہتے ہیں اور آپس میں یہ دقت تکرار اور رات دن جوتم پیزار ہوتی رہتی ہے۔ عورتیں اگر کونسل میں گئیں تو لازمی طور پر اسی قسم کی جوتم پیزار مردوں اور عورتوں کے درمیان شروع ہو جائے گی۔ اور یہ اکھاڑا اسمبلی اور کونسل کے کمرے تک محدود نہیں رہیگا۔ بلکہ ہر گھر ایک اکھاڑا بنجائیگا۔ ناصر میاں کے ہاتھ میں لاٹھی ہوگی اور تمہارے ہاتھ میں جھاڑو، اور تمہاری یہ چھوٹی سی جنت سچ مچ کی دوزخ بنجائے گی۔ یورپ میں مرد اور عورت الگ الگ دو فرقے بن چکے .... ہیں، اور انسانیت کی اس تقسیم نے زندگیوں کو جس قدر بے لطف اور خوشگوار بنا دیا ہے اسکے قصے روزمرہ وہاں کی عدالتوں میں اسوقت سننے میں آیا کرتے ہیں جب حقوق طلب مرد اور حقوق طلب عورتیں طلاق کی درخواستیں ہاتھوں میں لئے حاکم عدالت کے کمرے کی طرف بیتابی کے ساتھ دوڑتی ہیں۔ ایک مرد اور ایک عورت ملکر ایک مکمل انسان بنتے ہیں، اور ہر ایسی تدبیر جو مردوں اور عورتوں کو الگ الگ دو فرقوں میں تقسیم کردے تباہی کے سوا اور کوئی نتیجہ نہیں پیدا کرسکتی۔ عورتیں حقوق طلبی کے لئے کونسلوں میں جاکر باہمی نفرت وعداوت کے سوا اور کچھ پیدا نہیں کرسکتیں، حالانکہ قوم کی ترقی کے لئے ضروری یہ ہے کہ وہ اچھے نیک اور بہادر بچے پیدا کیا کریں۔

ناصر میاں تمہیں مبارکباد دے رہے ہیں کہ تمہارے فرقے کی عزت بڑھ گئی کہ اسکی کونسلوں کے اندر رسائی ہوگئی۔ تم میری طرف سے ان سے تعزیت کرلینا کیونکہ میں جانتی ہوں کہ یہ پرامن گھروں کی تباہی کا پیش خیمہ ہے۔



استبداد اور اسکے نتیجے

(از جناب مولوی عبدالہادی خاں صاحب شاہجہاں پوری)

علما اور حکمار کی توجہ سے "سیاست" اب ایک باقاعدہ علم بن گئی ہے اب کوئی ایسی قوم دنیا میں اطمینان اور خوشحالی کی زندگی نہیں بسر کرسکتی کہ جسے سیاست سے کوئی واقفیت اور کوئی دلچسپی نہو شطرنج کے بساط پر لکڑی یا ہاتھی دانت کے مہروں کو حرکت دے دیکر اپنی سیاسی قابلیتوں کے اظہار کا زمانہ اب گذر چکا ہے۔ اب دنیا میں کشمکش حیات کا دور دورہ ہے۔ اس میں وہی قومیں زیادہ کامیاب رہتی ہیں جنکے افراد علم سیاست کے بہتر ماہر ہوں۔ انگریزی میں اس موضوع پر اچھی سے اچھی صدہا کتابیں موجود ہیں لیکن بدنصیبی سے اردو کا دامن ابھی تک اس "گل حیات" سے خالی ہے ہم جناب مولوی عبدالہادی خانصاحب کے ممنون ہیں کہ انہوں نے عربی کی ایک کتاب "طبایع الاستبداد و مصارع الاستعباد" سے علامہ عبدالرحمان کو کبی عراقی کے خیالات کا ترجمہ کرکے ہمیں مستفید ہونے کا موقع دیا ہے۔

فی الحقیقت علامہ موصوف کے یہ مضامین "ک ت" کے نام سے مصری اخبارات میں ۱۸۹۸ء میں شائع ہوتے تھے جبکہ عباس حلمی پاشا خدیو مصر تھے۔ اب ان سب کو جمع کرکے مصنف کی نظر ثانی کے بعد کتابی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔ مصنف کا یہ خیال کہ تاریکی کا ذکر روشنی کے تصور سے ہمیں آشنا کردیا کرتا ہے بہت ہی صحیح ہے "تعرف الاشیاء باضدادھا" اور اس بنا پر استبداد کا ذکر کہ جسکے معنی کسی جماعت کے لئے اس کی مرضی کے خلاف انتظام

کرنا ہیں فی الحقیقت صحیح طریقہ سیاست کی طرف رہنمائی کرنا ہے۔ (ایڈیٹر)

علم سیاست بہت وسیع علم ہے۔ اور بہت سی دقیق و لطیف اقسام پر منقسم ہے۔ جس طرح یہ مشکل ہے کہ کوئی شخص اس علم کی تمام شاخوں اور تمام فروعات پر حاوی ہو اسی طرح یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ کسی شخص کو اس علم سے ادنیٰ واقفیت ہی نہو۔

دنیا کی تمام متمدن اور مہذب قوموں کے اندر ہر وقت اور ہر ملک میں وقتاً فوقتاً ایسے علما پیدا ہوتے رہے ہیں جنہوں نے علم سیاست پر خامہ فرسائی کی ہے۔ عموماً تاریخ اخلاق، ادب اور قانون کے ساتھ اس کے مباحث کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ خالص علم سیاست پر متقدمین میں جمہوریت پسند اہل رومہ کے سوا کسی اور قوم نے اپنا کوئی علمی سرمایہ نہیں چھوڑا ہے۔ جمہوریت پسند رومیوں کے علاوہ دیگر اقوام کی جو تالیفات ہیں وہ یا تو علم سیاست اور علم اخلاق کا مجموعہ ہیں جیسے انوار سہیلی اور یونانی حکیم گریگوری کے بعض رسائل۔ یا مذہب و سیاست کا مجموعہ ہیں جیسے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی نہج البلاغت اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب الخراج

قرون متوسطہ میں علمائے اسلام کے سوا اور کسی قوم کی کوئی تالیفات اس موضوع پر موجود نہیں ہیں بعض علماء نے اخلاق و سیاست کو ملا کر لکھا ہے جیسے امام فخر الدین رازی، محقق نصیر الدین طوسی، امام غزالی اور علائی وغیرہ اور یہ ایرانی طریقہ ہے۔ بعضوں نے سیاست و ادب کو ملا کر لکھا ہے۔ جیسے ابو العلا معری اور متنبی اور یہ عربوں کا طریقہ ہے۔ بعضوں نے تاریخ و سیاست کو ملا کر لکھا ہے جیسے ابن خلدون اور ابن بطوطہ۔ یہ مغرب کا طریقہ ہے۔

متاخرین اہل یورپ نے اس فن کو بہت وسعت دی ہے۔ خوب خوب طبع آزمائیاں کی ہیں۔ حتیٰ کہ بعض نے تو ایک ایک موضوع پر ضخیم کتابیں لکھی ہیں۔

پھر سیاست کی ہر شاخ کو ایک دوسرے سے نمایاں کر کے سیاست عمومی، سیاست خارجی، سیاست داخلی، سیاست انتظامی، سیاست اقتصادی اور سیاست قانونی وغیرہ کو ایک دوسرے سے بالکل جدا اور علیحدہ کر کے لکھا ہے۔ پھر انہیں میں سے ہر ایک کو مختلف مباحث اور متعدد فروعات پر تقسیم کر کے ہر ایک کے متعلق تفصیل و تشریح کی ہے۔

متاخرین اہل مشرق میں ترکوں میں ایسے بہت سے علماء گذرے ہیں جنھوں نے تنہا علم سیاست پر یا کسی دوسرے علم کے ساتھ اسکو شامل کر کے مستقل تالیفات کی ہیں جیسے جودت پاشا، کمال بک، سلیمان پاشا اور حسن فہمی پاشا وغیرہ۔ عربوں میں ایسے علماء بہت کم ہوئے ہیں اور جو ہیں اُن کی تحریرات اس علم پر بہت کم ہیں اور جسقدر ہیں وہ بھی کچھ بہت زیادہ قابل توجہ نہیں ہیں۔ رفاعہ بک، خیر الدین پاشا تونسی، احمد فارس شدیاق سلیم بستانی اور مبعوث مدنی وغیرہ ان لوگوں میں ہیں جنکا اس ضمن میں ذکر کیا جاسکتا ہے۔

ہندوستان میں جہاں تک ہمکو معلوم ہے اردو میں اس قسم کی تالیفات تقریباً مفقود ہیں ہندوؤں نے

بیشک اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے جسمیں غالباً بنگالی سب سے پیش پیش ہیں۔ گاندھی جی، تلک آنجہانی آرہندو گھوش مولانا ابوالکلام آزاد، اور مولانا محمد علی مرحوم نے اس موضوع پر لکھا ہے۔ لیکن ان سب لوگوں کی تحریرات بجز مولانا ابوالکلام آزاد کے یا تو بنگالی مرہٹی اور گجراتی میں ہیں یا انگریزی میں۔ اسلئے مسلمانوں کا بہت بڑا طبقہ جو صرف اردو جانتا ہے اس علم سے قطعاً ناآشنا ہے۔

آج ملک جن حالات سے گذر رہا ہے۔ اسنے اردو میں بھی کسی نہ کسی حدتک اس قسم کا مواد مہیا کر دیا ہے تاہم ابھی اس سب سے زیادہ اہم موضوع پر کچھ بھی نہیں لکھا گیا ہے۔ کہ مشرق کا مرض کیا ہے؟ اور اسکا علاج کیونکر ہو؟

سیاست کی اس تعریف کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ "سیاست جماعتوں کے مشترک حالات کا عقل و حکمت کے مطابق بندوبست کرنے کا نام ہے" استبداد (مشترک حالات کا خودرائی سے بندوبست کرنا) کی بحث لامحالہ سب سے پہلی اور سب سے ضروری بحث ہوجاتی ہے چیزیں اپنی ضد کے ذریعہ سے بہ آسانی شناخت میں آجاتی ہیں
۲ بدی کا ذکر کر کے ہم نیکی کا مفہوم لوگوں کے ذہن نشین کرا سکتے ہیں، اور تاریکی کا بیان کر کے روشنی کا تصور دلانا بہت آسان ہے اسلئے میرا خیال ہے کہ اس مبحث پر کچھ لکھنے والے کیلئے یہ ضروری ہے کہ سب سے پہلے وہ اس امر کو تفصیل سے بیان کرے کہ استبداد کیا چیز ہے؟ اسکے اسباب کیا ہوتے ہیں؟ اسکی علامات کیا ہیں؟ اسکی شناخت کیا ہے؟ اسکا اثر کیا ہے؟ اس سے کیا کیا نقصانات ہوتے ہیں؟ اور انکا علاج کیا ہے؟ اور سیاست کی یہ خرابیاں معلوم ہو جانے کے بعد ہر شخص خود ہی سمجھ سکے گا کہ عمدہ سیاست کیا چیز ہوتی ہے انہیں سے ہر موضوع بہت زیادہ تفصیل کا محتاج ہے اور بعض تو مستقل تالیف چاہتے ہیں۔

پھر یہ مسائل من حیث المجموع بہت سے ضمنی اور فروعی مسائل پر مشتمل ہیں جنہیں سے بعض اصولی امور پر آیندہ گفتگو کی جائیگی مثلاً یہ کہ استبداد کیسا ہوتا ہے؟ مستبد یعنی استبداد کرنیوالا ڈرتا کیوں ہے؟ مستبد کی رعایا بزدل کیوں ہو جاتی ہے؟ استبداد کا مذہب پر کیا اثر ہوتا ہے؟ علم پر کیا اثر ہوتا ہے؟ شرافت پر، دولت پر، اخلاق پر، ترقی و تربیت پر کیا اثر ہوتا ہے؟ مستبد کے سب سے بڑے مددگار کون لوگ ہوتے ہیں؟ کیا استبداد کو برداشت کر لینا چاہئے؟ استبداد سے رہائی کیونکر ممکن ہے؟ استبداد کا بدل کس چیز سے کیا جائے وغیرہ؟

اس سے قبل کہ موضوعات مذکورۃ الصدر کی تفصیل کیجائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ غور و فکر کرنے والوں نے مختلف لحاظ سے استبداد کے نتائج کے متعلق جو رائیں ظاہر کی ہیں انکا ذکر کر دیا جائے۔ اس قسم کی تمام رائیں گو ایک دوسرے سے طرز ادا اور الفاظ میں مختلف کیوں ہیں کہ جس نے اپنے نقطہ نظر کے مطابق جو کچھ سمجھا اسکو ادا کر دیا مگر مفہوم سب کا بالکل ایک ہے۔

مادہ پرست کہتا ہے کہ مشرق کی بیماری ایک قوت ہے اور اسکا علاج مقاومت ہے۔ سیاسی شخص کہتا ہے کہ مشرق کی بیماری لوگوں کو غلام بنانا ہے اور اسکا علاج آزادی

کا حصول ہے۔ حکیم کہتا ہے کہ بیماری ظلم پر قدرت ہونا، اور اسکا علاج انصاف حاصل کرنے پر اقتدار ہے۔ قانونی آدمی کہتا ہے کہ بیماری قانون سازی پر قوت نافذہ کا غلبہ ہے علاج قانون سازی کا قوت نافذہ پر غلبہ ہو جانا۔ مذہبی آدمی کہتا ہے کہ بیماری اللہ کے ساتھ غیر اللہ کا جبروت میں شریک کرنا اور اسکا علاج اللہ کو یکتا سمجھنا ہے۔ مگر یہ تمام اقوال علمی پہلو سے ہیں عملی لحاظ سے ذلت کو گوارا نہ کرنے والوں کا مقولہ ہے کہ بیماری لوگوں کا غلام بن جانا اور گلے میں طوق ڈلوا لینا ہے اور اسکا علاج یہ ہے کہ ذلت سے انکار کر دیا جائے دلیر آدمی کہتا ہے کہ بیماری یہ ہے کہ لوگوں پر جھوٹی برتری حاصل کیجائے اور اسکا علاج یہ ہے کہ متکبروں کو ذلیل کیا جائے۔ سنجیدہ آدمی کہتا ہے کہ بیماری یہ ہے کہ حکام بلاکسی باگ ڈور کے ہوں اور اسکا علاج یہ ہے کہ انکو سخت ترین پابندیوں سے مقید کر دیا جائے۔ مرنے والا کہتا ہے کہ بیماری یہ ہے کہ انسان کو زندگی پیاری ہو اور اسکا علاج یہ ہے کہ انسان کو زندگی کے بجائے موت پیاری ہو جائے۔

استبداد کیا ہے؟ یہ کہ آدمی ان اُمور میں جن کے متعلق اُسے مشورہ کی ضرورت ہو صرف اپنی رائے اور اپنی مرضی کے مطابق عمل کرے۔ استبداد کا لفظ عام طور پر جب استعمال کیا جاتا ہے اس سے حکومت کا استبداد مراد ہوتا ہے کیونکہ یہی استبداد انسان کو سب سے زیادہ بدنصیب اور بدبخت بنا دیتا ہے۔ مذہبی علماء کا استبداد یا کسی ایک قسم کی آبادی کا دوسری آبادی پر استبداد جیسا کہ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کا اچھوت قوموں کے ساتھ، یہ صرف مجازاً استبداد کہا جاتا ہے مگر علمائے سیاست کے نزدیک استبداد کے معنی یہ ہیں کہ ایک فرد یا کوئی پوری جماعت کسی قوم کے حقوق میں اس طرح دست اندازی کرے کہ اسکو بازپرس کا کوئی خطرہ نہ ہو

استبداد سے جو آثار و نتائج مرتب ہوتے ہیں اسکے لحاظ سے استبداد کو ظلم، تسلط، تحکم، اور غلام بنانا بھی کہدیتے ہیں اور اسکے مقابل حالات کے لئے قانون محفوظ، محترم حقوق، حس مشترک اور حیاۃ طیبہ وغیرہ الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں

استبداد کرنے والے کو خودرائے حاکم، حاکم مطلق، ظالم، اور جابر، کہدیتے ہیں اور اسکی مقابل حکومت کو حکومت عادلہ، حکومت مسئولہ، حکومت مقیدہ اور دستوری حکومت کہتے ہیں۔

مستبد کی رعایا کو غلام، ذلیل، حقیر اور حشرات الارض کہدیتے ہیں اور اسکے مقابل کے لئے ذلت کو گوارا نہ کرنے والے آزاد اور زندہ کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں

استبداد کی مذکورۃ الصدر تعریف تو مرادف و مقابل الفاظ کے ذریعہ تھی استبداد کی اپنے اوصاف کے لحاظ کی تعریف یہ ہے کہ استبداد حکومت مطلقہ کی ایسی حالت کو کہتے ہیں جبکہ وہ اپنے محکوموں کے ساتھ جیسا جی چاہے برتاؤ کرے۔ نہ اسکو کسی بازپرس کا کوئی خطرہ ہو اور نہ کسی جواب دہی کا کوئی ڈر ہو۔

استبداد کا باعث یہ امر ہوا کرتا ہے کہ حکومت کو اپنے اعمال و افعال کسی قانون کسی رواج یا قوم کی مرضی کے مطابق کرنے پر کوئی مجبوری نہ ہو۔ وہ ان تمام پابندیوں سے بالکل

آزاد ہو۔ خود رائے اور غیر مقید حکومتوں کا یہی حال ہوتا ہے کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ حکومت قانون، رواج یا قوم کی مرضی کی پابند ہوتی ہے لیکن اپنے اقتدار کی بدولت اپنے حسب مرضی ان تمام پابندیوں کو لغو اور بیکار کر دینے کی طاقت رکھتی ہے۔ اور یہ حالت تقریباً ان تمام حکومتوں کی ہے جو اپنے آپکو مقید اور قانون کا پابند سمجھتی ہیں۔

خود رائے حکومت کی بہت سی صورتیں ہیں جنکی تفصیل کی کوئی ضرورت نہیں اس موقع پر صرف اسقدر جان لینا کافی ہے کہ خواہ کوئی ایک شخص موروثی حاکم ہو یا منتخب شدہ حاکم ہو یا قوت کے زور سے حاکم بن بیٹھا ہو بہرحال اگر اسکے اعمال و افعال قوم کی مرضی اور قانون و رواج کی نگرانی سے علیحدہ ہونگے تو وہ خود رائے اور استبدادی حکومت ہوگی۔ قوم کے منتخب کردہ افراد کی جمہوری حکومت بھی استبداد کا مظاہرہ کرسکتی ہے کیونکہ ایک کی بجائے چند اشخاص حکومت کی رائے کا مشترک ہونا استبداد کو روک نہیں سکتا۔ کسی قدر اس طرح اعتدال حاصل ہو جاتا ہے مگر اسی اعتدال کیوجہ سے شخص واحد کے استبداد کے مقابلہ میں یہ جماعت کا استبداد بہت زیادہ سخت اور بہت زیادہ مضرت رساں ہوتا ہے۔ وہ دستوری حکومت بھی استبداد سے بچ نہیں سکتی جہاں قوت مقننہ (لیجسلیچر) اور قوت نافذہ (اکزیکیوٹو) الگ الگ ہوں۔ ایک جماعت صرف قانون بنادے اور دوسری جماعت اسکے مطابق عمل کرائے اور اس قانون کو نافذ کرے۔ ہاں اگر قانون کو نافذ کرنیوالے قانون بنانیوالوں کے سامنے جواب دہ ہوں تو پھر استبداد کا کوئی خطرہ نہیں ہوسکتا کیونکہ اس طرح ہر جماعت بلاواسطہ یا بالواسطہ قوم کے سامنے جواب دہ ہوگی اور قوم کیلئے یہ اندازہ کرنا آسان ہوگا کہ اسکی مرضی اور قانون کے مطابق عمل درآمد ہو رہا ہے یا نہیں۔ غرضکہ حکومت خواہ کسی قسم کی ہو۔ فرد واحد کی ہو یا دستوری و جمہوری جب تک اسکی نہایت شدید نگرانی نہوگی ایسی کہ ادنی سستی اور فرو گذاشت بھی نہونے پائے اس وقت تک استبداد کا خطرہ دور نہیں ہوسکتا۔ خلفائے راشدین کی حکومت، حکومت عادلہ غیر مستبدہ کی بہترین مثال ہے یہ بالکل یقینی ہے کہ کوئی حکومت خواہ کتنی ہی عادل اور منصف ہو قوم کے خود غافل ہو جانے یا غافل بنا دیئے جانیکی وجہ سے جب کبھی اسکو باطمینان ہو جائیگا کہ اب کوئی اس سے باز پرس کرنیوالا اور اسکے اعمال و افعال کی گرفت کرنیوالا نہیں ہے وہ فوراً استبداد اور خود رائی پر اتر آئیگی اور ایک مرتبہ استبداد میں مبتلا ہو جانے کے بعد استبداد کو کبھی ترک نہ کریگی خصوصاً جبکہ اسکو باقاعدہ عسکری قوت اور قوم کی غفلت کی مدد بھی حاصل ہو کیونکہ یہی دونوں، خصوصاً قوم کی جہالت ایک بڑی خطرناک اور ہولناک طاقت ہے۔

ابتدائے تمدن سے لیکر آجتک کسی فرمانروا اور قوم کے سامنے جواب دہ حکومت کو پچاس سال سے لیکر ڈھائی سو سال سے زیادہ مدت تک باقی رہنے کا موقع نہیں مل سکا۔ قبائلی حکومتیں جنکے افراد مختلف قبیلوں اور خاندانوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اور خانہ بدوشوں کی حالت میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ شاذ و نادر ہی کبھی استبداد میں مبتلا ہونے پاتی ہیں۔ کیونکہ اگر کبھی حکومت کی طرف سے استبداد کا ادنی مظاہرہ ہوتا ہے جس سے انکی آزادی کو خطرہ ہو قبائل کا شیرازہ منتشر ہو جاتا ہے اور جس کا جہاں سینگ

سمانا ہے چلا جاتا ہے۔ قبائلی حکومت کی بہترین مثال صحرائے عرب کے بدوی اور ہندوستانی سرحد کے وزیری اور مسعودی ہیں۔

علماء اور خصوصاً متاخرین حکماء نے استبداد کو خوب اچھی طرح واضح کرنے کے لئے ایسے عجیب غریب جملے استعمال کئے ہیں جن سے ایک بیوقوف سے بیوقوف شخص کی سمجھ میں بھی اچھی طرح آجاتا ہے کہ استبداد کیا ہے؟ اور اس سے رہائی پانے کی کیا صورت ہے؟ بعض مقولے یہ ہیں:-

مستبد لوگوں کے معاملہ میں ان کی مرضی سے نہیں بلکہ اپنی مرضی سے جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ قانون سے نہیں بلکہ اپنی خواہشات کے مطابق حکومت کرتا ہے۔ اور چونکہ وہ سمجھتا ہے کہ میں غاصب اور ظالم ہوں اسلئے کروڑوں آدمیوں کے منہ زبردستی بند کر دیتا ہے۔ کہ نہ وہ کچھ بول سکیں اور نہ اپنے حقوق کا مطالبہ کر سکیں۔

مستبد حق اور آزادی کا دشمن اور قاتل ہے۔ اور حق انسان کا باپ ہے آزادی ماں ہے۔ عوام لاوارث بچے ہیں جو سو رہے ہیں اور کچھ نہیں جانتے۔ علماء انکے لایق بھائی ہیں اگر علماء ان کو سوتے سے جگا دینگے تو وہ اٹھ کھڑے ہونگے اور اگر ان کو پکاریں گے تو وہ متوجہ ہو جائینگے

مستبد ایک انسان ہے۔ اور انسان سے بھلائی اور برائی دونوں سرزد ہو سکتی ہیں۔ یہ قوم کا فرض ہے کہ وہ بھلائی اور برائی میں امتیاز کرنے کیلئے مستعد رہے اور برائی کو برداشت کرنے سے صاف انکار کر دے اور استبداد کو دور کرنے کی خاطر ہر قسم کی قربانی کرنے کو تیار رہے صرف زبانی انکار ہوائی تموج سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا عمل کا جذبہ ہی استبداد کو باز رکھنے کیلئے بہت بڑا عمل ہے۔

مستبد انسان ہے۔ اور انسان چونکہ سب سے زیادہ کتے اور بکری سے مانوس ہوتا ہے۔ اس لئے مستبد چاہتا ہے کہ اسکی قوم بکری کی طرح مسکین اور بے زبان اور کتے کی طرح چاپلوسی اور عجز کا اظہار کرنے والی ہو مگر قوم کا فرض ہے کہ وہ گھوڑے کی طرح رہے۔ جب تک اسکی خدمت کی جائے وہ بھی خدمت کرے اور جب زیادتی کیجائے تو بدلگامی اور منہ زوری کرنے لگے۔ یہی نہیں بلکہ رعایا کو چاہیئے کہ وہ اپنے مرتبے کو پہنچانے۔ کہ آیا وہ مستبد کی خادم ہے یا مستبد اسکا خادم ہے تاکہ وہ مستبد سے خدمت لے سکے۔ سمجھدار قوم استبداد کی منہ زوری کو ایک ایسی لگام کے ذریعہ قابو میں رکھتی ہے جسے اپنے ہاتھ میں رکھنے کے لئے وہ مرجانے پر بھی تیار ہو جاتی ہے تاکہ استبداد کی منہ زوریوں سے محفوظ رہ سکے۔

اس قدر بیان سے یہ بات اجمالی طور پر بخوبی ذہن نشین ہو گئی ہوگی کہ استبداد کیا ہے آیندہ مباحث میں اسی اجمال کی تفصیل ہے۔ (باقی آیندہ)



سعید کا دور جدید

"سعید" کے متعلق اس وقت تک میری درخواستوں کے باوجود کسی جگہ سے کوئی شکایت وصول نہیں ہوئی بجز اسکے کہ اسکی اشاعت صحیح وقت پر نہ ہوتی تھی اور اس کے قدردان تکلیف انتظار سے پریشان ہو ہو کر خط لکھنے پر مجبور رہا کرتے تھے مجھے دلی مسرت ہے کہ میری ناچیز کوششوں کو اس قدر عزت اور قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے کہ اسکے عیوب پرکسی کی نظر ہی نہیں پڑتی، اور ساتھ ہی انتہائی ندامت و شرم کہ کیوں ایسا ہوا کہ خریداران "سعید" کو یہ ایک شکایت بھی پیدا ہوئی۔ "ہوے" کو "انہوا" کر دینا ناممکن ہے اور اپنے قصور کیلئے عذرات پیش کرنا خواہ وہ کتنے ہی معقول کیوں نہ ہوں ایک امر لاحاصل بلکہ شاید بدتراز گناہ ہوا کرتا ہے۔ تاخیر اشاعت کے جو کچھ اسباب تھے انہیں دور کرنا میرے امکان سے باہر تھا اور انہیں اس سے پہلے میں ظاہر کر چکا ہوں۔ میں اب اگر کچھ کر سکتا تھا اور کسی طرح اشاعت کو ٹھیک وقت پر لا سکتا تھا تو اسکی یہی صورت تھی جو اختیار کی گئی جنوری ۳۳ء کا "سعید" یکم جنوری ۳۳ء کو نکل رہا ہے اور اب ایسے انتظامات بھی کر دیئے گئے ہیں کہ اگر میں پھر بیمار ہو جاؤں تو پرچہ کی اشاعت پر اسکا کوئی اثر نہ پڑے۔ آیندہ سے "سعید" اگر خدا نے چاہا تو برابر ہر انگریزی مہینے کی پہلی تاریخ کو نکلتا رہیگا، اور اسکے متعلق جو یہ ایک شکایت ہے وہ بھی دور ہو جائیگی۔ گذشتہ سال میں سے جو تین مہینے گھٹے ہیں وہ "سعید" کی عمر میں سے گھٹے ہیں خریداروں کے چندہ پر اسکا کوئی اثر نہ پڑیگا انہیں سال بھر میں پورے بارہ پرچے پہونچ جائیں گے جسکے معنی یہ ہیں کہ انکے چندہ کی عمر گھٹنے کی بجائے تین مہینے کے بقدر بڑھ گئی ہے۔

سعید کے وی پی

خدا جانے کیوں مجھے شروع ہی سے یہ خیال تھا کہ پہلے سال کا چندہ ختم ہونے پر "سعید" کو وہ روز بد نہ دیکھنا پڑیگا جو اکثر رسالوں کو اس نازک موقع پر دیکھنا پڑتا ہے" اور اسکے جو وی پی اگلے سال کے چندے کیلئے بھیجے جائیں گے وہ واپس نہ آئیں گے۔ ایسا ہی ہوا۔ "سعید" کے بیشتر خریداروں نے تو اپنا چندہ منی آرڈر کے ذریعہ سے بھیج دیا اور جن تھوڑے سے صاحبان نے اسطرح چندہ نہیں بھیجا تھا انکی خدمت میں بھی جب وی پی پہنچا تو ان میں سے اکثر نے وصول کر لیا۔ مجھ سے کہا گیا تھا کہ عام طور پر پچاس فیصدی وی پی واپس آیا کرتے ہیں اور سال شروع ہونے کے موقعوں پر رسالوں کے خریداروں کی ایک بہت بڑی تعداد گھٹ جایا کرتی ہے میں ڈر رہا تھا کہ اگر "سعید" کے خریدار بھی اسی نسبت سے گھٹے تو اسکے معنی یہ ہونگے کہ اسکے ان چارسو کے قریب خریداروں میں سے کہ جو پہلے مہینے سے اسکے خریدار تھے نصف کم ہو جائیں گے۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ میرے تمام اندیشے فضول ثابت ہوئے اور "سعید" کے وی پی کی واپسیوں کا اوسط بہ مشکل دس فیصدی ہے۔

مجھے سچے دل سے اعتراف ہے کہ "سعید" ہرگز ہرگز ابھی وہ چیز نہیں بن سکا ہے کہ جو میں اسے بنانا چاہتا ہوں، لیکن اسکی اس

کوتاہی کے باوجود لوگوں کی اسکے ساتھ اس قدر محبت بہت ہی حیرت انگیز ہے "اس قدر حیرت انگیز کہ ہمارے مختصر مگر جامع مینجر صاحب کی بھی باچھیں کھلی پڑی ہیں، اور ایک سے زیادہ مرتبہ آپ بہ انداز مختلفہ یہ ظاہر فرما چکے ہیں کہ "سعید" کا چندہ منی آرڈر کے ذریعہ منگانے کی تجویز آپ ہی کے مختصر دماغ کی نکلی ہوئی ہے۔

خیر یہ تجویز تو مینجر صاحب کے مختصر دماغ کی تھی لیکن اب یہ تجویز میں اپنے دماغ سے نکال کر پیش کر رہا ہوں کہ اب اگر آپ "سعید" کو اس سے بہتر حالت میں دیکھنا چاہتے ہیں تو اسکی امداد پر کمر بستہ ہو جایئے، اور زیادہ نہیں صرف دو دو خریدار فی کس اپنی کوشش سے اسکے لئے بہم پہونچا دیجئے۔ یہ کوئی دشوار کام نہیں ہے ہر شخص کے دو چار دس ایسے احباب ضرور ہوتے ہیں جنہیں چار آنے مہینا ایک پرچے کی خریداری کے سلسلے میں خرچ کرنے پر مجبور کیا جا سکے۔ آپ اپنے ایسے احباب میں جن کو مجبور کر سکتے ہوں۔ کیجئے اور پھر دیکھئے کہ "سعید" کیا چیز بن جائیگا۔ میں اس سے پیشتر بھی کہہ چکا ہوں اور اب بھی اس کے ظاہر کرنے میں مجھے کوئی شرم نہیں ہے کہ میں کوئی سرمایہ دار نہیں ہوں، اور رسالوں میں تمام خوبیاں صرف قلم سے نہیں پیدا ہوا کرتیں۔ "سعید" کی ترقی کے متعلق بہت سی تجاویز ایسی ہیں کہ جو میرے ذہن میں ہیں۔ صرف اسی صورت میں عملی جامہ پہن سکتی ہیں کہ جب اسکی آمدنی میں کافی اضافہ ہو جائے "سعید" کے نئے دور کے ساتھ اگر آپ کی تازہ بارش کرم بھی شروع ہو جائے تو یقیناً "سعید" بہت جلد ایک ایسی چیز بن سکتا ہے کہ جس سے آپ خوش ہو جائیں اور جس پر میں ناز کر سکوں۔

میری کتاب پر ایک تنقید

میرے افسانوں کا مجموعہ "دامنِ باغبان" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ اس کا اشتہار بھی ہر پرچے میں مینجر صاحب دیتے ہیں اور آپ کی نظر سے گذرا ہوگا۔ یہ کتاب رسالہ "جامعہ" دہلی کے دفتر میں تبصرہ کی غرض سے بھیجی گئی تھی۔ "جامعہ" میں اس پر جو تبصرہ شائع ہوا ہے وہ حسب ذیل ہے:۔

"دامن باغبان" یہ جناب ڈاکٹر سعید احمد صاحب مدیر رسالہ "سعید" کے افسانوں کا مجموعہ ہے جو "کف گل فروش" کے ہاتھوں بازار سخن میں پہونچا ہے اس مجموعہ میں کل سات افسانے ہیں منفرداً کسی افسانے پر رائے ظاہر کرنا مشکل ہے سب ہی خوب ہیں۔ پہلا افسانہ "نصیبن کا بیاہ" بہت خوب ہے لیکن اس میں پیر مولا بخش آرہ کش کی زبان سے "اولاد کا فتنہ" کہنا اصول افسانہ نگاری کے اعتبار سے کھٹکا، ایک معمولی آرہ کش جس کی کم علمی بلکہ بے علمی کا اعتراف افسانہ نگار نے کئی مواقع پر کیا ہے، کا قرآنی تلمیح استعمال کرنا بہت مستبعد ہے۔ شائقین ادب کو اس مجموعہ کا ایک ایک نسخہ ضرور اپنے پاس رکھنا چاہیئے ....."

مجھے فاضل تنقید نگار سے اسکے متعلق صرف اس قدر عرض کرنا ہے کہ قرآن پاک کی یہ تلمیح کہ "ہمارے مال اور ہماری اولاد ہمارے لئے فتنہ ہیں" اسرار معرفت کا کوئی دقیق اور باریک نکتہ نہیں ہے جو ایک آرہ کش کو نہ معلوم ہو۔ رات دن وہ دو روپے فیس والے مولوی بھی کہ جنہوں نے وعظ تلقین کو ایک منفعت بخش پیشہ بنا لیا ہے اپنے بیان میں درود شریف کے فضائل اور دوزخ و جنت کے فرضی حقائق بیان کر چکنے کے بعد اکثر خدائے پاک کا یہ ارشاد لوگوں کو سنا دیا کرتے ہیں اور یہ واقعہ ہے کہ ان وعظوں میں سامعین کی بیشتر تعداد ایسے ہی عامی و جاہل مسلمانوں پر مشتمل ہوتی ہے جیسا کہ جب مولا بخش تھا۔ علاوہ بریں فاضل تنقید نگار کو یہ تو ضرور معلوم ہوگا کہ کلام مجید علماء کے سینوں میں بند رہنے کیلئے نازل نہیں ہوا ہے۔ اسکے نکات ہر عامی و جاہل تک پہونچنے چاہئیں اور پہونچتے رہتے ہیں اسلئے مولا بخش کا اس مسئلے سے واقف ہونا "بہت مستبعد" کیا معنی ذرا بھی مستبعد نہیں ہے۔

سعید احمد پرنٹر و پبلشر نے محبوب المطابع برقی پریس دہلی میں چھپوا کر کوچہ چیلان دہلی سے شائع کیا،

جلد ۳
نمبر ۲
ایڈیٹر
سعید احمد
بریلوی

باتصویر
ماہوار رسالہ

سہیل

فروری
سنہ ۱۹۳۳ء

قیمت
سالانہ تین روپیہ ۔۔۔ ۳ے
ششماہی ..... ۱۲ عہ
فی پرچہ چار آنہ .... ۴؍

فہرست مضامین

ڈاکٹر سعید احمد صاحب پرنٹر و پبلشر نے محبوب المطابع برقی پریس میں چھپوا کر کوچہ چیلان دھلی سے شائع کیا۔

شاعر اور ہلال عید

(از سعید بریلوی)

تیرگی چھائی ہوئی تھی ہر طرف سب جا نہیں — منتشر تھے ذرہ ہائے خاک ریگستان میں
تشنۂ کامل جامد و مفلوج بے حس بے عمل — آج بھی یعنی وہی حالت ہے جو حالت تھی کل
زندگی کا اک پیمانہ سا کچھ انداز تھا — ناز کچھ تھا بھی تو بس بد مستیوں پر ناز تھا
خواہش صحبت عورتوں کی حیثیت جاری اندرن — یا مئے بازار شغل یکساں ہی رات دن
آندھیوں کی وہ ہوا اٹھتی بھی تو لڑنے کیلئے — جست اگر کرتے تو بس باہم جھگڑنے کیلئے

اے ہلال عید اتو تو واقف حالات ہے — لیکن اب کیا یاد ہو گا اک پرانی بات ہے
روشنی سی کچھ ہوئی تھی قلۂ فاران پر — چھا گیا تھا ایک سورج ارض ریگستان پر
پھونک دی تھی روح اُس نے ذرہ ہائے خاک میں — جنبشیں پیدا ہوئی تھیں پھر خس و خاشاک میں
سنگریزوں کو جلا دے دیکے ہیرا کر دیا — دشت کو لعل و جواہر کا ذخیرہ کر دیا
شانِ حق! وہ خاک کے ذرے ضیا دینے لگے — اُڑ کے سیار و ثوابت کا پتا دینے لگے
ذرہ ذرہ رشکِ مہرِ درخشاں بن گیا — مورِ بے مایہ تھا ہمدوشِ سلیمان بن گیا

سر بکف کچھ نوجوان نکلے رجز گاتے ہوئے — سبز سے پرچم سروں پر اپنے لہراتے ہوئے
معرکوں میں تو نے دیکھا تھا انہیں مرتے ہوئے؟ — راہِ حق میں جان ہنس ہنس کر فدا کرتے ہوئے؟
داخلہ دیکھا تھا اُنکا تو نے ارضِ شام میں؟ — غلغلہ اُن کا سنا تھا مصر کے اہرام میں؟

تو نے پر دیکھے تھے ان ذروں سے میدان چین کے — کارنامے یاد ہیں غازی صلاح الدین کے
قصر الحمرا کی دیواروں کا نقشہ یاد ہے — ارض غرناطہ کے میناروں کا نقشہ یاد ہے
سرفروشِ کربلا کی داستانیں یاد ہیں؟ — زیر خنجر اُسکی مستانہ ادائیں یاد ہیں؟
غیر حق کے سامنے سر خم نہ کرنا یاد ہے؟ — زندہ رہ سکتے تھے جو اُن سب کا مرنا یاد ہے؟

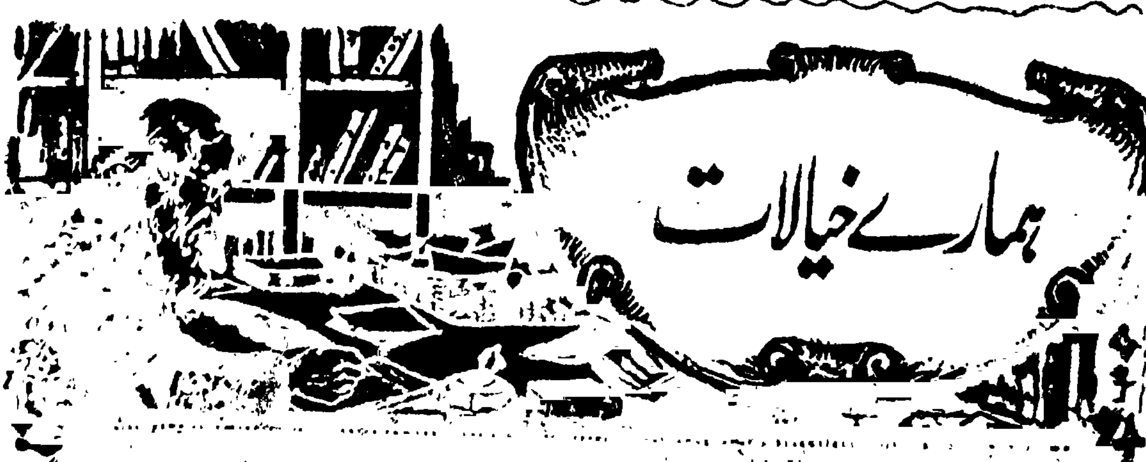
نشۂ دولت میں اُنکی آہ! پھر سرشاریاں — خدمتِ خلقِ خدا سے آہ! وہ بیزاریاں
وہ ہمہ وقت اُنکی وہ جہد ایری کے لئے — دوسرے ملکوں پہ پیہم ملک گیری کے لئے

کھو بیٹھے ساری "خدمتوں" سے "عظمتیں" پائی ہوئی — قیصر و کسریٰ کی رسموں سے شناسائی ہوئی
اب "خادم" کا لقب تکلیف پہنچانے لگا — دل کو کچھ "مخدوم" بننے میں مزہ آنے لگا
اپنے نفس اور اپنی ہستی سے محبت ہو چلی — دوسروں کی آگ میں جلنے سے نفرت ہو چلی
جذبۂ ایثار سے اب قلب عاری ہو گئے — حق کے طالب مال و دولت کے پجاری ہو گئے
اب حکومت تھی دلوں پر اُنکی حرص و آز کی — قصۂ ماضی بنیں سب رفعتیں پرواز کی
غیر کو اپنا بنا لینے پہ کل تھا افتخار — غیر اپنوں کو بنانا اب ہوا ان کا شعار
بج رہا تھا جنکا ڈنکا اوج ہفت افلاک پر — لوٹتے دیکھا اب اُنہی ذروں کو فرشِ خاک پر
جس سے روشن تھی یہ ذرے وہ چمک جاتی رہی — پھول اب بھی ہیں مگر اُنکی مہک جاتی رہی



شاعر اور ہلال عید

جامعہ پریس، جامع مسجد، دہلی۔



برتھ کنٹرول

نئی تہذیب نے ہمیں اور کچھ سکھایا ہو یا نہ سکھایا ہو لیکن اتنا ضرور سکھا دیا ہے کہ اب ہم اپنی کمزوریوں اور اپنے عیبوں کو بھی خوش آئند اور خوبصورت ناموں سے موسوم کرکے اور اپنی برائیوں کو بھلائیوں کا لباس پہنا کر بلا تکلف سب کے سامنے پیش کردیا کرتے ہیں۔ مغرب کو اس فن میں یدطولیٰ حاصل ہے۔ طبی امداد کے نام سے شراب خوری، قسمت آزمائی کے نام سے قماربازی انسداد غلامی کے لباس میں توسیع سلطنت، اور اشاعت تہذیب کے بھیس میں آزاد اور وحشی قبائل کو غلام بنالینا تو مدتوں سے رائج تھا ہی اب کچھ عرصہ سے "برتھ کنٹرول" (منع اولاد) کے نام سے قطع نسل یا قتل اولاد کی ناپاک اور شرمناک رسم بھی ہمارے سامنے پیش کیجارہی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس سے ہماری مراد صرف افزائش نسل کو قابو میں رکھنا ہے اور ثبوت میں یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ اگر کسی غریب آدمی کے چھ یا آٹھ یا دس بچے ہوگئے جیسا کہ اکثر ہوا ہی کرتا ہے تو وہ انہیں معقول طریقہ پر پرورش نہیں کرسکتا اچھی تربیت اور عمدہ تعلیم انکے لئے مہیا کرنا تو بڑی بات ہے اس سے تو یہ بھی ممکن نہیں ہوتا کہ دونوں وقت انہیں پیٹ بھر روٹی ہی دیدیا کرے، اور اس طرح قوم میں ایسے افراد کی تعداد برابر بڑہتی چلی جاتی ہے جو بد اطوار اور ہر قسم کے علم و فن سے عاری ہوں۔ یہی نہیں بلکہ ان بدنصیب نوجوانوں کی صحت بھی بہت ہی کمزور اور خراب ہوتی ہے اور وہ ہرگز اس قابل نہیں ہوتے کہ ضرورت کے وقت قوم ان پر بھروسا کرسکے یا وہ قوم کے کسی کام آسکیں ایک عجیب و غریب دعویٰ یہ بھی پیش کیا جاتا ہے کہ افزائش نسل کو اگر باغوں کی خود رو گھاس کی طرح قابو میں نہ رکھا تو چند صدیوں میں ملک کی آبادی اس قدر بڑھ جائیگی کہ زمین پر ان کے رہنے کے لئے ٹھکانا نہ رہے گا۔

یہ وبا جب تک یورپ اور امریکہ کی سرزمینوں تک محدود رہی اُس وقت تک تو ہمنے اس کی طرف زیادہ توجہ کرنا ضروری خیال نہ کیا لیکن اس مرتبہ خاص لکھنؤ میں جو زنانہ کانفرنس ہوئی تھی اُسکی روئداد پڑھکر ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی اس کانفرنس نے "منع اولاد" کی تجویز پاس کردی اور معلوم ہوا ہے کہ اس بھری محفل میں صرف سات اللہ کی بندیاں ایسی تھیں کہ جنھوں نے اس تجویز کی مخالفت کی۔ اور اس کے کھلے ہوئے معنی یہی ہیں کہ آہستہ آہستہ یہ وبا ہندوستان میں بھی پھیل ہی گئی، اور مغربی تعلیم کے "بابرکت" اثرات سے یہ غریب ملک بھی محفوظ نہ رہ سکا۔

مغربی سنرمینوں کے اور بہت سے زہریلے پودے جسطرح اس ملک میں پھیل پھول چکے ہیں اسے دیکھتے ہوئے ماننا پڑتا ہے کہ "منع اولاد" کا جو بیج بو یا گیا ہے یہ بھی ضرور پروان چڑھے گا۔ اور ایک نہ ایک دن ہندوستان کی عورتیں بھی اپنی مغربی بہنوں کی طرح اولاد کو ایک ناقابل برداشت مصیبت خیال کرنے لگینگی، اور آنیوالی بڑی بوڑھیاں اپنی بچیوں کو یہ دعا دینے کی بجائے کہ "دودھو نہلائے اور پوتوں پھلے" یہ دعا دیا کرینگی کہ "اللہ تجھے دودھ اور پوت کی مصیبتوں سے محفوظ رکھے" لیکن قبل اس کے کہ ہم اس "مہذب" رسم کو اختیار کریں کیا یہ مناسب نہو گا کہ ان دلیلوں پر جو اسکی حمایت میں پیش کیجاتی ہیں ایک غائر نظر ڈال لیں۔

ہم سے کہا تو یہ جاتا ہے کہ چونکہ ایک غریب آدمی اپنے چار یا چھ یا دس بچوں کی پرورش اچھی طرح نہیں کرسکتا اس لئے اس کے لئے یہی مناسب ہے کہ وہ بچے پیدا ہونے دے۔ لیکن دیکھنے میں یہ آتا ہے کہ اس تدبیر سے فائدہ مفلس اور نادار نہیں، بلکہ دولتمند اور عیش پرست اٹھاتے ہیں۔ اگر فی الحقیقت یہ تدبیر مفلسوں کو پرورش اولاد کی مصیبت سے نجات دلانے کے لئے نکالی گئی تھی تو ضرورت اس بات کی تھی کہ اس کی تبلیغ غریبوں ہی میں کیجاتی اور انہیں افزائش نسل سے باز رکھکر قوم کے امیر اور دولتمند اصحاب مردم شماری کی کمی پوری کرنے کیلئے اپنے گھروں میں زیادہ سے زیادہ اولاد پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔ ایسا نہیں ہوتا اور غریبوں کی بجائے امیروں کو اس تجویز پر عمل پیرا دیکھکر مجبوراً یہی خیال کرنا پڑتا ہے کہ اس تجویز کا اصلی مقصد قوم کی خدمت نہیں بلکہ نفس پرستی ہے۔ اگر فی الحقیقت اس تجویز کا محرک یہی خیال تھا کہ غریبوں کے گھروں میں پیدا ہوکر قوم کے بہت سے ہونہار بچے مناسب تعلیم و تربیت اور ناکافی غذا سے محروم رہ جاتے ہیں اور یہ قوم کا ایک ناقابل تلافی نقصان ہے تو اس کا یہ علاج کسی طرح بھی معقول نہیں کہلایا جاسکتا کہ ہم بچوں کی پیدائش ہی کو روک دیں اور اس طرح قوم کی مردم شماری میں کمی پیدا کرکے قوم کو اس سے بھی بڑا اور اس سے بھی زیادہ ناقابل تلافی نقصان پہونچا دیں۔ اس کا بہت ہی آسان علاج یہ ہوسکتا ہے کہ قوم کے امراء جنھیں خدا نے انکی ضرورت سے بہت زیادہ دے رکھا ہے اپنی تین سو پینسٹھ دن کی آمدنی میں سے صرف ایک روز کی آمدنی اپنی عیش پرستیوں پر لٹانے کی بجائے اپنی قوم کے غریب بچوں کی تربیت و اصلاح پر خرچ کردیا کریں، اور غریبوں کے ہر محلے میں ایسی تربیت گاہیں کھول دیں جہاں انکے بچوں کو عمدہ تعلیم اور معقول تربیت مفت مہیا ہوسکے۔ ہر امیر اگر اوسطاً چھ غریب بچوں کی پرورش اور تربیت اپنے ذمہ لیلے تو قوم کا ایک بچہ بھی ناتربیت یافتہ یا جاہل نہیں رہ سکتا۔ بطور خود اس قسم کے انتظامات کرنے میں کچھ دشواریاں نظر آئیں تو ہم یہ بھی کرسکتے ہیں۔ کہ حکومت وقت کو مجبور کریں کہ وہ تمام غریب بچوں کو ابتدائی اور ثانوی تعلیم مفت دے اور اس طرح حکومت پر خرچ کا جو بار پڑے اسے ہم ایک نئے ٹیکس کی صورت میں ادا کردیا کریں۔ کہاں کی دانائی ہے کہ درد سر کو دور کرنے یا اس سے محفوظ رہنے کے لئے ہم اس سر ہی کو دور کردیں کہ جس میں کبھی کبھی درد پیدا ہوجانے کا اندیشہ ہے۔ اور پھر جب ہم دیکھتے ہیں کہ وہ علاج معقول ہی یا نامعقول اس پر عمل درآمد غریبوں کا نہیں بلکہ امیروں کا ہے تو صاف ظاہر ہوجاتا ہے کہ اس "قومی خدمت" اور "قومی ہمدردی" کی تہ میں کیا اغراض پنہاں ہیں۔

بہت سے ملک اور قوم کے "بہی خواہ" اعداد و شمار کے ذریعہ ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ قوم کی آبادی روز بروز بڑھ رہی ہے اور اگر اس ترقی کو روکا نہ گیا تو بہت جلد وہ وقت آجائے گا کہ ملک کی زمین ہمارے لئے تنگ ہوجائے گی اور ہمیں کہیں رہنے کو جگہ نہ ملے گی۔ ان "محتاط" اور "دُوراندیش" ہمدردانِ قوم سے کوئی یہ پوچھے کہ آپ نے گذشتہ دس بیس یا پچاس سال کی پیدائشوں کا حساب لگا کر یہ تو معلوم کرلیا کہ آئندہ ایک ہزار یا دو ہزار سال میں قوم کی مردم شماری موجودہ کی بہ نسبت دس گنی یا بیس گنی یا پچاس گنی ہوجائیگی لیکن کیا آئندہ کے متعلق یہ حساب لگانے کا بھی کوئی ذریعہ آپ کے پاس ہے کہ اگلی ایک صدی میں ملک میں کون کون سی اور کتنی وبائیں آئیں گی اور ان میں سے ہر ایک کتنے انسانوں کی جان لیگی یا آنیوالی ایک صدی کے اندر ہماری ہوس استعمار یا تیل کے چشموں پر قبضہ کرنے کی خواہش ہمیں کتنی اور کیسی کیسی خونریز جنگوں میں مبتلا کرکے ہماری مردم شماری کو کتنے سال پیچھے پہونچا دیگی۔ ابھی تک جمعیۃ اقوام کی "صلح جویانہ" کوششیں بار آور ہوئی ہیں نہ تخفیف اسلحہ کی تجویز پر عملدرآمد ہو

اور نہ ماہرین سائنس کی ہلاکت آفرین ایجادات میں کسی قسم کی کمی ظہور پذیر ہوئی ہے۔ پھر یہ لایعنی اور مہمل اندیشے کیوں لاحق ہو رہے ہیں کہ دنیا سے ہلاکت اور خونریزی معدوم ہوجائے گی اور کسی ملک کی آبادی کامل امن وصلح اور صحت وعافیت میں رہ کر اتنی ترقی کر جائیگی کہ ملک میں کہیں ایک چھپّر ڈال لینے کی بھی جگہ نہ رہے رہیں غیر مہذب قومیں تو اول تو انکی آبادی کا توازن قائم رکھنے اور کثرت آبادی کی "مصیبت" سے انہیں نجات دلانے کے لئے "مہذب" قوموں کی اژدر دہاں توپیں، زہریلی گیسوں کے پیپے اور آسمان سے آگ برسانے والے طیارے ہی بہت کافی ہیں، اور اگر ان سے کام نہ بھی چلے تو قدرت کا وہ طاقتور اور زبردست ہاتھ جس نے لاکھوں برس سے اب تک ایک دن کے لئے بھی توازن کو بگڑنے نہیں دیا ہے اب بھی اپنا کام کرتا رہے گا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جنگل کے وہ جانور بھی کہ جنھیں کبھی کوئی نہیں مارتا اور جو یقینی طور پر افزائش نسل کے متعلق ہم سے زیادہ صحیح القویٰ بھی ہیں ابتدائے آفرینش سے لیکر آج تک کبھی اپنی نسل کو اتنی ترقی نہ دے سکے کہ جنگل کا جنگل انہی سے بھر جاتا یا دنیا میں انکے لئے جگہ نہ رہتی۔ اس کے برخلاف ہمارا مشاہدہ گواہ ہے کہ انہی جانوروں کی بعض نسلیں جنھیں انسان اپنی خوراک کی خاطر لاکھوں اور کروروں کی تعداد میں روزانہ ہلاک کیا کرتا ہے انکی تعداد میں اتنی ذرا سی بھی کمی آج تک نہیں ہوئی ہے کہ انکی قیمتوں میں دوسری چیزوں کے تناسب سے پانچ فیصدی کا بھی اضافہ ہو جاتا تو ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ نسل کی افزائش یا نسل کو فنا کرنے کے متعلق ہماری تمام کوششیں بے سود ہیں یہ کام قدرت نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے اور اسے ہمارے ماہرین سیاسیات کے مشوروں کی کچھ زیادہ ضرورت نہیں ہے حقیقت یہ ہے کہ جس وقت تک دنیا میں تیل کے چشمے، سونے چاندی کی کانیں گیہوں اور کپاس پیدا کرنے والی سیر حاصل زمینیں، سورج کی صحت بخش شعاعوں سے مستفید ملک اور ان تمام چیزوں کو لالچ بھری نگاہوں سے دیکھنے والے ماہرین سیاسیات موجود ہیں، اور جب تک انہیں ماہرین اقتصادیات کے "مفید مشورے" اور ماہرین سائنس کی "مفید" ایجادات کی امداد حاصل ہے اس وقت نہ جنگ وخونریزی کے کم ہونے کا کوئی "اندیشہ" ہے اور نہ انسانی آبادی کے بڑھنے کا کوئی امکان، ہمارے لئے یہی زیادہ مناسب ہے کہ اپنی ترقی یافتہ عقلوں کو اس سے بہتر اور مفید تر کاموں پر صرف کریں اور ان انتظامات کو قدرت ہی کے ہاتھوں میں رہنے دیں جو کبھی ماہرین سائنس کی گیسوں اور برقی شعاعوں کے ذریعہ سے اور کبھی ماہرین طب کے نئے نئے ٹیکوں اور سم آلود دواؤں کے وسیلے سے کبھی جنگ وخونریزی کا بازار گرم کر کے اور کبھی نئی نئی مہلک وبائیں پھیلا کر انسانی آبادی کو اپنی مقررہ حدود سے آگے متجاوز نہیں ہونے دیتا۔

ہزار دو ہزار برس پہلے سے بڑھی ہوئی آبادی کا شمار لگانا اسکے رہنے کے لئے مربع یا مکعب گزوں میں ملک کی زمین ناپنا اگر حماقت نہیں تو اور کیا ہے جبکہ ہمیں کسی طرح بھی یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ اس وقت تک کتنے جارج لائیڈ پیدا ہونگے جو سمندر کی تہ توڑ توڑ کر کر نئی نئی زمینیں نکالینگے، کتنے آتش فشاں پھٹ پھٹ کر زمین کو سمندر اور سمندر کو زمین بنا ڈالینگے۔

برتھ کنٹرول کی ایک بہت بڑی ضرورت یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ اسکے ذریعہ سے ماؤں کی بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ان عورتوں کی کہ جو مائیں بن سکتی ہیں صحت درست حالت میں رکھی جا سکتی ہے۔ دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ نحیف الجثہ اور کمزور عورتیں زچگی کی اور اس کے بعد رضاعت یعنی بچے کو دودھ پلانے کی مصیبتیں برداشت نہیں کر سکتیں اس لئے انکے لئے یہی بہتر ہے کہ وہ اس قسم کی آزمائشوں میں نہ

ہیں اور مختلف آلات اور دواؤں کی مدد سے ایسی صورت پیدا کریں کہ انکے بچے پیدا ہونے ہی نہ پائے۔ اس سے زیادہ غلط دعویٰ اور قدرت اور انتظامات قدرت کی اس سے زیادہ توہین اور کسی طرح نہیں ہو سکتی۔ قدرت نے عورتوں کے خون کی صفائی اور انکے جسم سے ناقص مادے فاسد کے اخراج کا ایک قدرتی طریقہ یہ رکھا ہے کہ زچگی اور رضاعت کے ذریعہ سے تمام قسم کی غلاظتیں اور مضر صحت مادے انکے جسم سے خارج ہو جاتی ہیں جس کے یہ معنی ہیں کہ زچگی اور رضاعت عورتوں کی صحت کو خراب اور انکے جسم کو کمزور کرنے کی بجائے ایک بڑی حد تک انکی صحت میں مدد دیتی ہیں۔ بسا اوقات یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ ایک کمزور اور دائم المریض لڑکی ماں بنتے ہی اچھی خاصی مضبوط اور تندرست عورت بن گئی۔ اور اس حیرت انگیز تبدیلی کا باعث زچگی اور رضاعت کی مصیبتوں کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ قدرت نے بھوک اور پیاس کی طرح ماں بننے کی خواہش بھی ہر عورت کی سرشت میں داخل کر دی ہے اور ماں بنکر جو روحانی مسرت اور دلی اطمینان اسے حاصل ہوتا ہے وہ مفرح اور مقوی دواؤں کی سینکڑوں خوراکوں سے زیادہ ہے جن عورتوں کے بدقسمتی سے اولاد نہیں ہوتی انکا دوسروں کے بچوں پر ٹوٹ ٹوٹ کر گرنا اور پروانہ وار انکے گرد پھرنا جس نے دیکھا ہے وہ اس خواہش کا اندازہ لگا سکتا ہے کہ جو بچے پیدا کرنے اور انہیں اپنی گود میں کھلانے کے متعلق عورتوں کے دل میں موجود ہے۔ اور اس شوق اور اس خواہش کو دیکھتے ہوئے بلا اندیشہ تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہیں حصول اولاد سے باز رکھنا ان پر ظلم ہے۔

آخر میں ہم نہایت ادب کے ساتھ ان حامیانِ منع اولاد سے کیا یہ پوچھ سکتے ہیں کہ اگر شادی کا مقصد افزائش نسل نہیں ہے تو پھر شادی اور خانہ آبادی کی ضرورت ہی کیا باقی رہ جاتی ہے اور اگر واقعی وہ بچوں کی پیدائش کو قوم کیلئے ایک خطرہ اور ماں باپ کیلئے ایک مصیبت خیال کرتے ہیں تو دواؤں سے یا دوسرے ذریعوں سے ایک جاندار شے کو ہلاک کر کے قتل اولاد کے مرتکب ہونے کی بجائے وہ لوگوں کو مدت العمر کنوارا رہنے کی تبلیغ کیوں نہیں کرتے۔ اگر حصول اولاد کی بجائے منع اولاد ہمارا مقصد ہے تو پھر ایک مرد اور ایک عورت میں کوئی تعلق اور کوئی واسطہ ہی کیوں ہو۔ چونکہ ایسا نہیں کیا جاتا اور ہم جانتے ہیں کہ کبھی نہیں کیا جائے گا اس لئے اگر ہم ان کوششوں سے یہ نتیجہ نکالیں کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے نہ ہمدردی قوم کی بنا پر ہو رہا ہے نہ صحت مادران کے لحاظ سے بلکہ اس کا مقصد صرف اسقدر ہے کہ ہم بے غل و غش حظ نفسانی حاصل کرتے رہیں اور کبھی کسی ضدی اور خاموش ہونے والے بچے کے رونے کی آواز باپوں کے عیش و مسرت میں خلل انداز یا ماؤں کے کلب جانے اور مزے اڑانے میں حارج نہ ہو سکے۔ غریب اگر بچوں کی پرورش اور غور و پرداخت سے گھبرا کر اس قسم کی کوئی کوشش کرتے تو اسکے خلوص اور صداقت پر اعتبار کیا جا سکتا تھا لیکن امیروں اور دولتمندوں کی جانب سے اس قسم کا کوئی عذر کس طرح سنا جا سکتا ہے۔ کمزور اور ناتواں عورتیں بھی زیادہ تر غربا ہی کے طبقہ میں پائی جاتی ہیں اور انہیں اگر یہ اندیشہ لاحق ہو کہ دوران حمل میں کافی غذا میسر نہ آنیکے باعث وہ اور زیادہ کمزور ہو جائینگی تو یہ عذر کسی حد تک قابل سماعت ہو سکتا ہے لیکن ان عورتوں کی طرف سے کہ جنہیں غذا کی کمی نہیں بلکہ زیادتی اور افراط بیمار ڈالا کرتی ہے یہ عذر، عذر لنگ سے زیادہ کوئی وقعت نہیں رکھتا۔

اس کے بعد ہمیں اس بات پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ آیا جس اصول کی ہم تعلیم دے رہے ہیں اس میں عالمگیر بننے کی صلاحیت بھی ہے یا نہیں۔ منع اولاد کا اصول اگر عام طور پر تسلیم کر لیا جائے اور پوری قوم اسپر عمل پیرا ہونے لگے تو اسکا نتیجہ کیا نکلے گا؟ یہی کہ پچاس یا زیادہ سے زیادہ سو برس کے بعد قوم کا ایک بچہ بھی کہیں باقی نہ رہے اور سرے سے پوری قوم ہی فنا ہو جائے۔ اور یہ یقیناً قوم کی سب سے بڑی خدمت ہے؟

قدرت اپنے مقرر کئے ہوئے اصولوں اور ضابطوں کی توہین گوارا نہیں کیا کرتی ہے قومیں اپنی عقل کی فوقیت کے زعم میں اس کے اصولوں کا مضحکہ اڑانے کی کوشش کرتی ہیں وہ انہیں فنا کر کے چھوڑتی ہے اور غالباً کسی قوم کیلئے یہ کوئی خوشگوار انجام نہیں ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ قدرت یہ دیکھکر کہ انسانی مادہ اب بچہ پیدا کرنے سے جان چراتی ہے اور یہ محسوس کر کے کہ دنیا میں اسے انسانی نسل کو باقی رکھنا ہے اپنے انتظامات ہی بدل دے اور آئندہ یہ خدمت عورتوں کی بجائے مردوں کے سپرد کر دی جائے یہ صورت حال بھی کم سے کم ایک طبقہ انسانی کیلئے تو کچھ بہت آرام دہ اور مسرت بخش نہ ہو گی۔

ایک پردہ نشین کا خط

گذشتہ جنوری کے "سعید" میں بی ہمسائی کے عنوان سے دو عورتوں کا جو مکالمہ شائع ہوا تھا اس میں اس امر پر بحث کی گئی تھی کہ ملک کے نئے دستور اساسی میں جو گول میز کانفرنس نے تیار کیا ہے عورتوں کے لئے چند نشستوں کی تخصیص آیا ہمارے لئے مفید ثابت ہوگی یا مضر، اور یہ دکھایا گیا تھا کہ اس طرح اسمبلی اور کونسلوں میں عورتوں کے لئے نشستوں کا مخصوص کیا جانا مردوں اور عورتوں کے باہمی تعلقات پر بہت برا اثر ڈالے گا۔ نیز یہ کہ ملک کے مردوں میں اگر بیداری موجود ہو

اور وہ اس حقیقت کو سمجھ لیں کہ عورتوں کی ترقی کے بغیر قوم کی ترقی ناممکن ہے تو پھر عورتوں کو اس کی ضرورت بھی نہیں رہتی کہ وہ کونسلوں میں جا جاکر اپنے حقوق کیلئے لڑتی پھریں کیونکہ اگر قوم کی بہبود و ترقی مد نظر ہے تو مرد خود اس بات پر مجبور ہیں کہ سب سے پہلے عورتوں کی ترقی و اصلاح کی تجویزیں سوچیں اور نہ صرف انکے حقوق بلکہ ان کے حق سے بھی زیادہ انہیں دیں۔

اس بحث کے متعلق ذوق سینڈمین سے ہمارے پاس ایک خط آیا ہے جو درج ذیل ہے۔

جناب ایڈیٹر صاحب،

تسلیم! ماہ جنوری ۱۹۳۳ء کے پرچہ میں آپ نے لکھا ہے کہ عورتوں کو کونسل میں جو نشستیں دی گئی ہیں وہ مفید ثابت نہیں ہو سکتیں کیونکہ عورت اور مرد کی زندگی مشترک ہے اس لئے جو کام مرد کے لئے مفید ثابت ہوگا وہی عورت کے لئے بھی مفید ہوگا۔ اور اس لئے کونسل میں عورتوں کی نمائندگی کی ضرورت نہیں۔

سوال یہ ہے کہ عورتوں کو کونسل میں جو نشستیں دی گئی ہیں آیا وہ نشستیں عورتوں کو محض جنس لطیف کے حقوق کے تحفظ کے لئے دی گئی ہیں یا وہ ہر ایک معاملہ میں آزادی سے اظہار خیالات کر سکتی اور رائے دے سکتی ہیں۔

اگر محض جنس لطیف کا تحفظ ہی اصل مقصد ہے تو پھر تعداد کو ملحوظ رکھتے اس میں شک کی گنجائش ہی نہیں کہ عورتوں کا کونسل میں جانا اور نہ جانا برابر ہے۔

برخلاف اس کے اگر عورتیں مردوں کی طرح ہر معاملے میں اظہار خیالات کر سکتی اور رائے دے سکتی ہیں تو کیا وجہ ہے کہ ایک قابل عورت کونسل میں جاکر ویسا ہی یا زیادہ مفید کام نہ کر سکے جیسا کہ اتنی ہی یا کم قابلیت کا ایک مرد

امید ہے کسی پرچہ میں اس امر پر روشنی ڈالی جائے گی میں نے اپنا مطلب اس ٹوٹی پھوٹی اردو میں ظاہر کر دیا ہے مگر نکتہ چینی کی نیت سے نہیں بلکہ میں چاہتی ہوں کہ میرے اور دیگر بہنوں کے شکوک رفع ہو جائیں

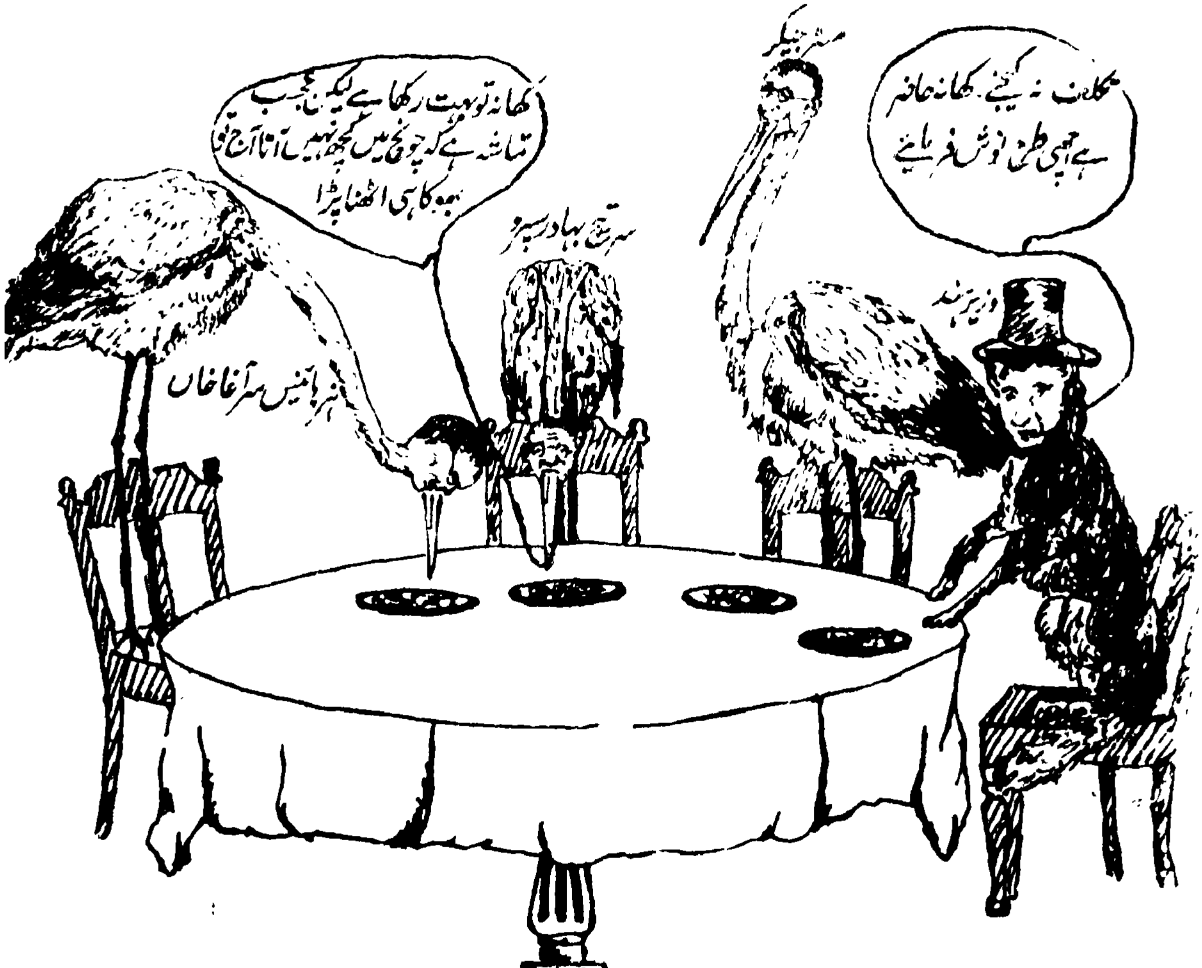
ایک پردہ نشین

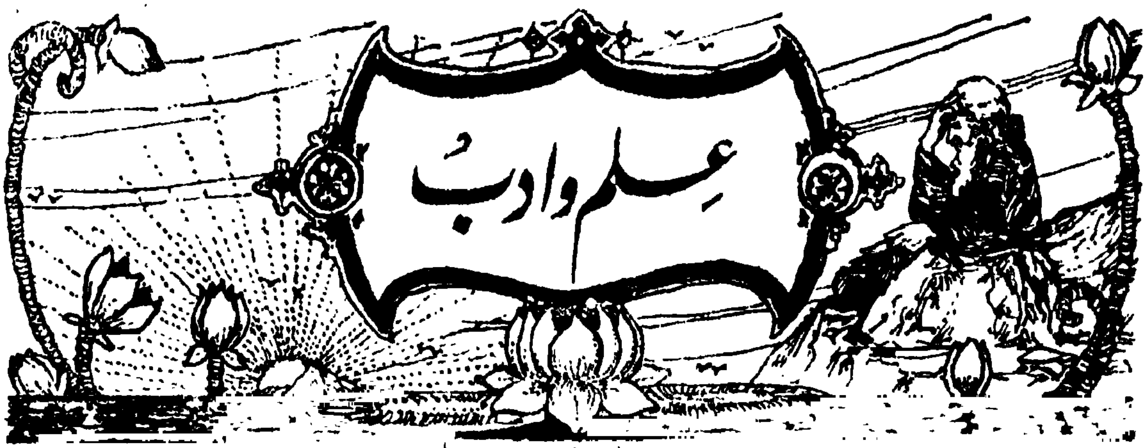
ہمیں یہ دیکھ کر دلی مسرت ہوئی کہ "سعید" کے مضامین صرف وقت گذاری اور ہنگامی تفریح کیلئے نہیں پڑھے جاتے بلکہ اس کے پڑھنے والے بھائی اور بہنیں سنجیدگی سے ان خیالات پر غور کیا کرتے ہیں جن کا اظہار اس میں کیا گیا ہو "سعید" کے اجرا کے وقت ہم نے اسکے اغراض و مقاصد کی تعیین نہیں کی تھی اور اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ "سعید" کا اس کے سوا اور کوئی بھی مقصد نہ تھا کہ وہ قوم میں غور کرنے اور سوچنے کا شوق پیدا کر دے اور منقولہ بالا خط کو پڑھکر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید ہماری یہ آرزو پوری ہو جائے۔ صاحب تحریر بہن نے قوم کی موجودہ ذہنیت کا لحاظ کرکے بڑی وضاحت کے ساتھ یہ لکھنا ضروری خیال کیا کہ ان کا مقصد نکتہ چینی نہیں ہے لیکن ہم انہیں یقین دلاتے ہیں کہ اگر نکتہ چینی ہی کے خیال سے وہ ایسا کرتیں تب بھی ہمارا مقصد حاصل تھا۔ "سعید" کی تو غرض ہی یہ ہے کہ لوگوں میں یہ شوق پیدا کرے کہ وہ بے سوچے سمجھے کسی خیال اور کسی رائے کو قبول نہ کریں اور اپنے ماحول سے اتنی دلچسپی لینے لگیں کہ ایسے معاملے کے متعلق کہ جس کا اثر انکی زندگی پر پڑتا ہو اچھی طرح غور و خوض کرنے کے بعد اپنی ایک رائے قائم کیا کریں۔

ہم اپنی پردہ نشین بہن سے مودبانہ درخواست کرتے ہیں کہ وہ گذشتہ جنوری کے "سعید" کو ایک مرتبہ پھر پڑھ لیں۔ ہم نے اس میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش نہیں کی ہے کہ کسی عورت کا کونسل یا اسمبلی میں جانا قوم کے مفاد کے خلاف ہے بلکہ صرف یہ کہا ہے کہ عورتوں کو مردوں سے الگ ایک فرقہ تسلیم کرکے انہیں اس غرض سے چند مخصوص نشستیں دینا کہ وہاں انکے ذریعہ سے اپنے فرقہ کے حقوق کا تحفظ کر سکیں کسی طرح ہمارے لئے مفید نہیں ہو سکتا ہم ہرگز ہرگز اسکے مخالف نہیں ہیں کہ عورتیں کونسل اور اسمبلی میں جائیں اور ہر قابل عورت کو ہر ناقابل مرد کے مقابلے میں اپنا ووٹ دینے کے لئے تیار رہیں۔ لیکن ہمیں یہ کسی طرح پسند نہیں آ سکتا کہ عورتیں اپنے آپ کو ایک علیحدہ فرقہ تصور کرکے اپنے اس فرقہ کی حفاظت کی خاطر اسمبلی کے اندر قدم رکھیں۔ ہندو مسلمانوں کی فرقہ وارانہ کشمکش ہماری نگاہوں کے سامنے ہے اور ہم نہیں چاہتے کہ وہی جھگڑے مرد اور عورت کے درمیان بھی شروع ہو جائیں۔ امریکہ اور یورپ کو اس قسم کی مناقشوں کا بہت کافی تلخ تجربہ ہو چکا ہے اور دانشمندی سے بعید ہوگا اگر ہم اس سے سبق حاصل کرنے کی بجائے آنکھوں دیکھتے مکھی نگلنے کی کوشش کریں۔ عورتیں شوق سے کونسلوں میں بھی جائیں اور اسمبلی میں بھی لیکن قوم اور ملک کی خدمت کرنے کیلئے جائیں صرف عورتوں کی خدمت بجا لانے کے لئے نہ جائیں۔ عورتوں کی نشستوں کی تعداد معین ہو جانے کے تو یہ معنی ہیں کہ خواہ قابل عورتیں ملیں یا نہ ملیں اور خواہ ان سے بہت زیادہ قابل اور ہمدرد قوم مردوں کو محروم رہنا پڑے لیکن وہ کرسیاں ہر حالت و ہر صورت عورتوں ہی سے پُر کی جائیں۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ صورت حالات کسی پردہ نشین بہن کو بھی پسند نہ آئیگی۔

رسالہ سعید جلد ۳ نمبر ۲

گول میز پر لومڑی کے گھر سارسونکی دعوت





بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقد الشعر

معائب سخن

(از جناب پرویز بٹالوی سکریٹری بزم ادب ہوم ڈیپارٹمینٹ)

دنیائے جذبات

حضرت آدم کو جب توبہ قبول ہونے کے بعد بھی اسی زمین پر رکھا گیا تو لامحالہ اس ماوی ہیولیٰ اور اس کرۂ عناصر میں کوئی ایسی چیز رکھدی ہوگی جو بنی آدم کے قلبی اضطراب کو تسکین دینے کے لئے کافی ہو۔ ایسی طمانیت بخش نعمت جو کم سے کم اس جنت کو کچھ وقت کیلئے تو بھلادے جسکی یاد میں وہ برسوں نالاں اور گریاں رہے۔ ایسی کشش جو اس ماوی دنیا میں اتنی جاذبیت تو پیدا کرے کہ اس "نقد" کے عوض "نسیۂ جاودانی" بھی اگر ملتا ہو تو بطیب خاطر قبول نہ کیا جائے۔ یقیناً اس محبس آب وگل میں اسنے وہ جانِ صد آرزو ودیعت کرکے رکھدی کہ جس سے ابنِ آدم اس دنیا کو اپنا مستقر بنا کے بیٹھ گیا اور اس طرح کہ پھر اٹھنے کو جی ہی نہ چاہا۔ ہاں! اس جہانِ بے رنگ وبو میں، اس خارزارِ ہستی میں وہ نشاطِ ابدی وہ کیفِ سرمدی چھپا کے رکھدیا جس سے ملاءِ اعلیٰ کی ملکوتی دنیا بھی ناآشنا تھی اور یہی وہ لطیف راز تھا کہ جسکا حامل مسجودِ ملائک بنا۔ یہی وہ جذبۂ روحانی تھا جسے احساس حسن" کہئے یا حسن بین بصیرت جس نے حسین کو اسکے حسن سے آشنا کیا۔ جس کے جمال نازنے شباب کو زینتیں دیں۔ جو "حسن را پروردگار سے عشق راپیغمبرے" ہوا یہی تھی وہ حقیقت جسے جذبات کی دنیا" نام دیا گیا یہی تھا وہ زخم بے نشاں جس کی لذت درد محتاج درماں نہ ہوئی۔ یہی تھا وہ سوزِ نہاں جو شرمندۂ

... ہوا ... تھا ایک خفیف سا ... آگ ذرا سی تھی جو اصل زندگی یا لازمۂ زندگی، بلکہ عین زندگی بنا، احساس حسن کا یہ نورانی جذبہ انسان کے فطری عناصر میں داخل ہو۔ اور حسن میں نگاہوں سے اس عالم کون و فساد کو بھی اسی حسن مجرد کے کوائف و مظاہر قرار دیا ہے۔ یہ نہ صرف عام متصوفین کا ہی عقیدہ ہے بلکہ یہودیوں کے ایک اولوالعزم پیغمبر کا بھی قول ہے کہ "خدا کمال حسن سے جلوہ گر ہوا"۔ اس حسن ازل کو بے نقاب دیکھنے کے لیے قلب ... نے ایک تڑپ محسوس کی اور یہ تڑپ ... باعث گرمی محفل و ہنگامہ ہائے وہو ہوئی ورنہ اس کے بغیر یہ جہاں عناصر کے گھروندے سے ... نہ ہوتا۔

یہ آتش خاموش اگرچہ بعض جگہ سینہ میں دلمیں دل کے داغ ... وزاغ کے سوز میں سلگتی رہی، مغز استخواں تک جلا کر خاک کر دیا اور لب تک آکر شرمندۂ تکلم نہ ہوئی لیکن پھر بھی ازمنہ مختلفہ میں مختلف پیرائے اسکے اظہار کے لئے اختیار کئے گئے اور بقول **ایمرسن** "آنسوؤں میں ترنم پیدا کرنے کے لئے اور غم میں کیف موسیقی حاصل کرنے کے لئے محبت کی یاد کافی سمجھی گئی کیونکہ روح کے وعدے ہزاروں طریقوں سے وفا کئے جاسکتے ہیں۔ اور اسکی حسرتیں نئی نئی تمناؤں کا سرچشمہ ہوسکتی ہیں"۔ دنیا جب ابھی ابتدائی گہوارۂ تمدن میں تھی اور لطیف و نازک ادویات و آلات

مجسمہ سازی کا استعمال ابھی رائج نہ ہوا تھا تو جذبات کے اظہار کے لئے سنگ گرانبار و تیشہ آہنی استعمال کیا گیا۔ مجسمہ ساز کی نگہ تیز بین و خارا شگاف نے حشو و زوائد کو دور کرکے پتھر کی دیواروں میں چھپے ہوئے خدا کو بے نقاب کیا اور خدا بھی اسید رجہ حسین و جمیل کہ جس نے دیکھا بے اختیار کہ اٹھا کہ "ندانم چی ہرچہ ہستی توئی" اور نگہ حسن بین نے جہاں جہاں سے تقاضائے حسن یار ہوا جھک جھک کے سجدے کر دیئے صنمیات یونان آج بھی اس دور حسن و عشق کی زندہ جاوید یادگار موجود ہیں۔

موسیقی

دنیا نے کچھ اور ترقی کی اور ذرا زیادہ لطیف و نازک اشیاء استعمال میں آئیں رباب ہستی کے پردہ ہائے لطیف میں جنبش ہوئی چوب خشک پر فلزی تاریں کھینچی گئیں کہ جنکی لرزش نے فضا میں نغمہ رنگیں کی امواج مسلسل پیدا کردیں رگ ساز میں خوابیدہ ترنم نے کروٹ لی۔ وہی ترنم سحاب بنکر فضائے عالم پر چھا گیا۔ اور مست نغمے شراب بنکر تمام دنیا پر برس گئے موسیقی کی یہی دیوی "کنار رنگیں میں جان گلشن سرو بصد میکدہ بہ دامن" محفل رقص و سرود میں آئی اور افسانے کی پریاں کہتی ہیں کہ عالم ملکوت کی دو معصوم ہستیوں کو چاہ بابل میں اوندھا لٹکوا دیا۔ اور "خود" کار زمین رانکو ساختہ" گوش پروین کا درخشندہ آویزہ بنی یہی وہ نغمہ کیف آور وجانگداز تھا کہ جسے جناب **کنفیوشس** نے "سارے کائنات کی زبان" قرار دیا ہے۔ جسے **شکسپیر** نے "غذائے روح" مانا ہے۔ اور آج دنیا کا سب سے بڑا ریاضی داں فلاسفر، نظریہ اضافت کا موجد حکیم آئینسٹن (EINSTIN) (کہ جسکے نظریہ اضافت کو دنیا بھر میں چند فلاسفر سمجھ سکتے ہیں) کہتا ہے۔ کہ "جب ریاضی کے مسائل کے حل سے میرا دماغ تھک کر چور ہو جاتا ہے تو میں بچپن میں سیکھے ہوئے گیت اپنے رباب (ویلن) پر گاتا ہوں کہ مجھ میں پھر سے نئی زندگی آجائے"۔

مصوری

دنیا نے مزید ارتقائی منازل طے کیں اور تیشہ آہنی اور چوب خشک کی جگہ مو قلم اور صفحہ قرطاس نے لی اور الوان مختلفہ کے تناسب سے ماہرین فن نے وہ الہامی پیغام دنیا تک پہنچائے کہ مانی و بہزاد پیغمبر تک مانے گئے۔

شاعری

لیکن دنیا جب معراج کمال کو پہنچی تو ان روحانی جذبات کے اظہار کے لئے تمام مادی وسائل سے یکسر بے نیاز ہوگئی۔ اسکا ذریعہ صرف نقوش و حروف قرار دیئے گئے۔ شعر اسکا نام رکھا گیا اور اس پیکر تصویر کو دستبرد زمانہ سے محفوظ رکھنے کے لئے کاغذی پیرہن تجویز ہوا۔ یہ جذبات کے اظہار کا آخری ذریعہ ہے اور دنیا اس سے لطیف تر اور کوئی ذریعہ دریافت نہیں کر سکی۔ چونکہ یہ لطیف ترین ذریعہ اظہار ہے اس لئے فنون لطیفہ میں مشکل ترین ہے یہی وجہ ہے کہ اس فن کے مسلم الثبوت اساتذہ نے اس مشکل اور جگر کاوی کو تسلیم کیا ہے امیر مینائی فرماتے ہیں۔ ؎

خشک سیروں تن شاعر کا لہو ہوتا ہے
تب نظر آتی ہے اک مصرعہ تر کی صورت

اودھر غالب نے کہا ہے ؎

بینیم از گداز دل در جگر آتشے چو سیل
غالب اگر دم سخن رہ بہ ضمیر من زدی

یہ جگر کاوی ہے جس سے شعر میں وہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے کہ ڈارون ایسا فلاسفر (جسکے نظریہ ارتقا نے فلسفہ جدید میں انقلاب پیدا کر دیا ہے) آخری عمر میں اپنی عمر گذشتہ پر تبصرہ کرتا ہوا لکھتا ہے "اگر مجھے زندگی پھر سے مل جاتی تو ہفتہ میں کم از کم کچھ شعر پڑھنا اپنا معمول بنا لیتا۔ شاید میرے دماغ کے وہ حصے جواب بیکار ہو گئے ہیں استعمال میں رہنے کی وجہ سے مردہ ہونے نہ پاتے۔ ان دلچسپیوں کا مٹ جانا مسرت کا معدوم ہو جانا ہے۔ چونکہ اس سے ہمارے نفس کا وہ حصہ کمزور ہو جاتا ہے جس کا تعلق جذبات سے ہے"

اور جیمس ایسا ماہر نفسیات لکھتا ہے "واقعاً زندگی اصل میں جذبات کے دم سے ہے"

اردو شاعری

شاعری ہر زبان میں موجود ہے لیکن ہمیں اپنی زبان کی شاعری کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے اسمیں کلام نہیں کہ ہماری اردو شاعری پر فارسی شاعری کا پورا پورا اثر ہے۔ اور آج اردو و فارسی شاعری دونوں پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ ان میں فرسودہ خیالات، پیش پا افتادہ مضامین اور رکیک جذبات کے سوا اور دھرا ہی کیا ہے۔ یہ اعتراض کتنا ہی سطحی کیوں نہ ہو اور اسکا کتنا ہی مسکت جواب کیوں نہ دیدیا جائے لیکن اسمیں بھی شک نہیں کہ ہماری اردو شاعری کے انبار در انبار ایسے ہی خرافات سے بھرے ہوئے ہیں اور ان میں اصل شاعری کے لعل گرانمایہ کچھ اس طرح چھپے پڑے ہیں کہ سارا الزام معترض کی کوتاہ بینی کے سر ہی نہیں تھوپا جاسکتا اور جس طرح انبیاء (علیہ، مامورمن اللہ کے ساتھ ساتھ مدعیان کاذب کا سلسلہ بھی جاری رہا ہے اسی طرح شعرا کی جماعت میں متشاعر بھی پیش پیش رہے ہیں اور حق و باطل کی تمیز کا مسئلہ کچھ اسقدر باریک واقع ہوا ہے کہ مدعیان صادق کے مقابلہ میں مدعیان کاذب کو بھی معتقدین کی کمی کی شکایت کبھی نہیں ہوئی۔

معائب سخن

اگرچہ "شعر..." "قافیہ پیمائی و تک" مذاق کا فرق سمجھانے کے لئے بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ "معائب سخن" کے اظہار کی یہ کوششیں قافیہ، ردیف، تقطیع، بحر، وزن، متروک، درانج، سرقہ کی حد سے آگے نہیں بڑھیں اگرچہ یہ بھی ایک گونہ ضروری ہیں لیکن اصل سقم، سقم معنوی ہے ضرورت اس امر کی ہے کہ شعر کو شعر کے معیار پر جانچا جائے اور اس "طومار شاعری" کو چھان پھٹک کر اصل شاعری کی جنس گرانمایہ کو الگ کیا جائے ایک ایک شاعر کا کلام لیکر اس میں اسقدر کدوکاوش کرنا امکان سے باہر ہے اور مثال پیش کئے بغیر کلیات قائم کر دینا یہ بھی موزوں طریق کار نہیں۔ لہذا یہ زیادہ موزوں نظر آتا ہے کہ کسی ایسے شاعر کے کلام کو لیا جائے جو عام طور پر مستند مانا جاتا ہو اور اس کے کلام سے مثال کے طور پر وہ اشعار پیش کئے جائیں جو محض اسلئے کہے گئے ہوں کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ آج غالب غزل سرا نہ ہوا" یا جسے اصطلاح میں قافیہ پکڑ کر شعر کہنا کہتے ہیں تاکہ عوام میں صحیح مذاق شعر پیدا ہو سکے اور شعر اور تک بندی میں خود بخود فرق محسوس ہونے لگے اس سلسلہ میں آج ہم "ملک الشعراء" خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق کے کلام کو لیتے ہیں کہ جسے نشاۃ اخریٰ کے ایک بڑے افسانہ نگار نے عقیدت اور ارادت کی بنا پر معلوم نہیں کیا سے کیا بنا کر "حق استاد" ادا کیا ہے۔

شعر کیا ہے

شعر کیا ہے۔ اسکے جواب میں آجتک ہزاروں صفحات میں اس قدر لکھا جا چکا ہے کہ شاید وہ تصانیف خود شعرائے کرام سے بھی بڑھ جائیں۔ لیکن ماحصل مولانا شبلی مرحوم کے ان الفاظ میں ادا ہو سکتا ہے کہ "جو جذبات الفاظ کے ذریعہ سے ادا ہوں وہ شعر ہے" اور اسکی تائید شبلی کے اس فقرہ سے ہوتی ہے کہ "شعر عام الفاظ میں تخیل کا مظہر ہے" گویا اس سے نتیجہ نکلا کہ محض شاعری یا شعریت "جذبات و تخیل کا نام ہے اور الفاظ اسکے اظہار کے آلہ کار ہیں۔

(۱) اگر رفعت تخیل اور پاکیزگی جذبات کے ساتھ شوکت الفاظ و حسن ادا بھی ہو تو وہ شعر نور علیٰ نور ہے۔

(۲) اگر جذبات و تخیل صحیح معنوں میں موجود ہوں لیکن الفاظ میں استعاری جدت و پہلوئی لطافت (مثل شوق ۱) نہ ہو لیکن الفاظ ذم یا تنافر کا پہلو بھی نہ لئے ہوں تو وہ شعر تو ہوگا۔ اگرچہ سحر حلال تک نہ پہنچے اور (نوٹ ۱)

(۳) اگر جذبات و تخیل مفقود ہوں اور شعر میں الفاظ ہی الفاظ ہوں خواہ کسیقدر برجستہ و چست، تو اسے شعر نہیں کہا جائیگا۔ بلکہ قافیہ پیمائی و تک بندی۔ اور اسپر "مردہ بے ایمان قبر چھوڑ گیا" کی مثل صادق آئیگی۔ (۴) اور اگر شعر ایک

نوٹ ۱۔ ادبی دنیا میں مولانا تاجور نے حضرت عزیز لکھنوی کے اس شعر:-

اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حسن — بھولتا ہی نہیں عالم تیری انگڑائی کا!

پر تنقید فرماتے ہوئے لکھا تھا کہ علامہ اقبال سے جب دریافت کیا گیا کہ انہوں نے اس شعر کی اسقدر تعریف کیوں کی ہے تو انہوں نے فرمایا کہ "خیال اپنا اپنا پسند اپنی اپنی" مولانا تاجور نے علامہ موصوف سے اختلاف فرماتے ہوئے اپنی "پسند" کے تحت تحریر

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۳ پر)

طرف رعنائی خیال و ندرت تخیل سے عاری ہو اور دوسری طرف رکیک جذبات، مذموم الفاظ، ناروا ایہام، بدنما تشبیہات، اور نادر تراکیب کا آئینہ دار ہو تو اس کلام کو "اسفل السافلین" کے سوا اور کیا کہا جا سکیگا، لہٰذا جو کلام شق ۲ کے تحت میں آئیگا، نہ اسے شعر کہا جائیگا اور نہ اس صاحب کلام کو حقیقی معنوں میں شاعر۔ شاعری ان بناوٹوں سے بہت بلند و بالاتر چیز ہے۔

تغزل

ہماری اصناف شاعری میں غزل سب سے زیادہ لطیف، رنگین، دلکش و پراثر صنف سخن ہے۔ جذبات کی صحیح ترجمانی غزل میں ہی ہوسکتی ہے

بقیہ نوٹ صفحہ ۶۱) فرمایا جسکا مفہوم یہ ہے کہ مصرعہ ثانی میں لفظ انگڑائی نے اسقدر ثقل پیدا کردیا ہے کہ یہ شعر قطعاً کسی تعریف کے قابل نہیں رہا۔ نیز یہ کہ ہمیں کوئی ندرت دکھائی نہیں دیتی۔

بس یہی فرق ہے "خیال اپنا اپنا پسند اپنی اپنی" میں قبلہ علامہ کی نگہ حقیقت بیں نے اس ندرت تخیل پاکیزگی جذبات کی داد دی، جو شعر میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے اور مولانا صاحب لفظی گورکھ دھندے میں الجھ کر رہ گئے حالانکہ یہ امر ان سے بھی پوشیدہ نہیں کہ انگڑائی لیسے فرسودہ مضمون پر اس سے بہتر شعر ہماری تمام اردو شاعری میں موجود نہیں۔ اور رہے دیکھے اگر کوئی شعر پیش کیا جاسکتا ہے اور کیا گیا ہے، تو نظام کا یہ شعر ؎

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ دیکھا جو مجھکو چھوڑ دیئے مسکرا کے ہاتھ

لیکن اس شعر اور حضرت عزیز کے شعر میں جو فرق ہے وہ ذوق سلیم رکھنے والوں سے پوشیدہ نہیں۔ مزید براں عزیز صاحب کے شعر میں کوئی ایسا لفظ بھی نہیں جسے "غیر شاعرانہ" کہا جائے۔

حیرت کا مقام ہے کہ ادبی دنیا کی اس "تنقید شعری" کے تحت مولانا نے شائق کے اس شعر کو صف اول میں جگہ دی ہے۔

؎ بزم میں ہر شے سے پیدا ہے تیرے جلووں کا رنگ جلوہ زار شمع ہے خاکستر پروانہ آج!

حالانکہ اس شعر کے دونوں مصرعوں میں جلوہ کی جلوہ گری جو کراہت پیدا کر رہی ہے وہ محتاج تشریح نہیں (اس لفظی اعتراض کے اعتبار سے جو مولانا نے عزیز صاحب کے شعر پر کیا تھا) اور علاوہ ازیں "آج" نے جو تعینات کے پردے لٹکا رکھے ہیں وہ اس کلیہ کی تصحیح کے منافی ہے جسکا دعویٰ مصرعہ اولیٰ میں کیا گیا ہے۔ اس مضمون پر مولانا کی نظر سے غالباً یہ شعر نہیں گذرا۔

انداز ہیں جذب اس میں سب شمع شبستاں کے اک حسن کی دنیا ہے خاکستر پروانہ (اصغر)

غالباً اس مجبوری کا احساس کرتے ہوئے ذوق صاحب نے لکھا ہے۔

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب! ذوق یاروں نے بہت زور غزل پر مارا

لیکن انہیں یہ پتہ نہیں کہ زور مارنے سے وہ انداز نصیب نہیں ہوسکتا۔ یہ تو وہ آتش ہے "جو لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے"

غزل میں چونکہ واردات عشق و حسن تخیل سے کام لیا جاتا ہے اسی لئے غزل گل و بلبل کے فرسودہ مضامین تک ہی محدود نہیں رہ سکتی۔ بلکہ جذباتِ قلب کی سچی تصویر پیش کرنیکا ذریعہ قرار پاتی ہے۔ اور اس سے مفہوم ہی یہ ہوتا ہے کہ داعیات دل کا خاکہ ہوا اور واردات قلب کا مرقع۔

ہمارے ہاں غزل پر ریزہ خیالی کا الزام عائد کیا جاتا ہے لیکن یہ اعتراض بھی سطحی ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو جذبات کا اظہار جیسا غزل میں ہو سکتا ہے۔ نظم کی دیگر اقسام میں ویسی کامیابی ممکن نہیں کیٹس کہتا ہے کہ "ایک حسین چیز مسرت ابدی ہے" حقیقت نگار شاعر اس ابدی مسرت سے تمام مجازی پردے اٹھا دیتا ہے جو اسے عام نگاہوں سے پوشیدہ رکھ رہے ہوں۔ وہ اگر پھول کے ساتھ کانٹا دیکھتا ہے تو شاخ کے اندر پہنچکر اس راز کو پالیتا ہے کہ درون ادنہ گل باشد نہ خار است۔ غزل میں شاعر اس مسرت ابدی کے جس پہلو کو دیکھتا ہے اس کا اظہار کر دیتا ہے۔ امید و بیم، غم و مسرت، نالہ و خندہ، بہار و خزاں، غرضکہ جہاں جہاں اسکی نگہ حقیقت رس پہ حسن مستور دیکھتی ہے۔ سامنے لاکر رکھدیتی ہے سرور انگیز واردات قلب جس رنگینی تخیل اور نزاکت احساس کے ساتھ غزل میں ادا ہوتے ہیں وہ کوئی پوشیدہ امر نہیں پھر چونکہ غزل کا ہر شعر "ان الجز" ہوتا ہے۔ اس لئے موسیقی کو اس سے بہت مدد ملتی ہے اور یہی وہ چیز ہے جو سامعین پر ایک وجدانی کیفیت طاری کر دیتی ہے۔ خود غزل میں کلام میں ترنم و موسیقیت پیدا ہو جاتی ہے۔ غزل کی یہی جامعیت و دلاویزی تھی کہ جس سے جرمنی کے شہرہ آفاق شعرا مثل گوئٹے، پلاٹن روکرٹ، بوڈن اسٹاٹ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور انہوں نے حافظ و سعدی کے تتبع میں غزل گوئی کی۔ اور اس حد تک کہ استعارات و تشبیہات بھی انہوں نے ایران سے مستعار لئے۔ گوئٹے کے ہمعصر ہائنا نے تو اس رنگ تغزل میں وہ جوہر دکھائے کہ آج اس کے کلام پر غالب کے کلام کا شبہ ہوتا ہے۔

مقصود اس سے یہ ہے کہ غزل جذبات کے اظہار کا بہترین ذریعہ ہے اور چونکہ شاعری خود اظہار جذبات ہے اس لئے سب سے پہلے ہم ذوق کے کلام سے غزل لیتے ہیں اور غزل کا بھی وہ پہلو جس میں جذباتی پہلو زیادہ نمایاں ہو۔ اور مثال کے طور پر وہ شعر پیش کرتے ہیں جو جذبات سے عاری اور خشک ہیں۔ اور دیوان اٹھا کر دیکھ لیجئے اسمیں کچھ نظر انتخاب کا دخل نہیں۔ بلکہ "سینہ تمام داغ داغ پنبہ کجا کجا نہم" کا مضمون ہے دیوان میں سب سے پہلا شعر حمد باری تعالیٰ میں ہے۔ ذوق ایسے ثقہ۔ پرہیزگار متشرع جاز بس

حمد

سے کسی شاہد رعنا، نازنینِ سمن بر لبے آشوبِ شیخ و مرگِ زاہد" کے حریم ناز میں ہدیہ تعریف و توصیف گذارنے کی توقع کرنا اگر زیادتی ہے۔ تو کم از کم خدائے برتر و اعلیٰ کے حضور میں نذر مدحت و ثنا کی توقع تو زیادتی نہیں۔ جیسا کہ پیشتر عرض کیا گیا ہے۔ شاعری صرف جذبات کے اظہار کے لئے وجود میں آئی ہے۔ اور جذبات کا فلسفہ ہے کہ جتنے زیادہ وہ ذاتی و انفرادی ہونگے اتنا ہی زیادہ ان میں خلوص اور اثر ہوگا اس لئے اگر کوئی میدان ذوق کے لئے واردات قلبی کے اظہار کے لئے موزوں ترین ہو سکتا تھا تو یہی حمد تھی لیکن شعر ملاحظہ فرمائیے۔

باقی آئندہ،

مطائبات آزاد

(از حضرت آزاد انصاری مدظلہٗ)

سرگشتۂ طلب کو مقام فنا نصیب
رہ گیر جاں بلب کو دوام بقا نصیب

تم اور چارۂ غم فرقت خوشا نصیب
دکھ کو دوا نصیب مرض کو شفا نصیب

اس خوبی نصیب کے قربان جایئے
حسرت ستم نصیب، تمنا بلا نصیب

میں بے نصیب تھا مرے سر منڈھ دیا گیا
غم آشنا نصیب، ستم آشنا نصیب

آزاد! کیا گذارش حال بتر کروں
میں اور قید غم، مری قسمت، مرا نصیب

بھولی ہوئی یہ بات کہاں یاد ہو گئی

(از جناب محمد عبدالستار صاحب ظریف بریلوی)

بروقت آج آپ کی امداد ہو گئی　　جانِ اسیر جسم سے آزاد ہو گئی!
ہر شوخ کو یہ طرزِ ستم یاد ہو گئی　　شہرت پذیر آپ کی ایجاد ہو گئی
وعدوں سے اور ہجر کے بیمار کا علاج　　ہاں! کچھ تسلّیٔ دلِ ناشاد ہو گئی
مرنے پہ میری روح کا اللہ رے انبساط　　بلبل قفس میں بند تھی آزاد ہو گئی
دشمن بھی رو رہے ہیں مرے حالِ زار پر　　اب حدِّ جور اے ستم ایجاد ہو گئی
طرزِ عمل میں فرق یہ آیا شباب سے　　اب اک نہیں نہیں بھی انہیں یاد ہو گئی
خوکردۂ جفا پہ وہ ہیں مائل کرم　　طرزِ ستم نئی یہ اب ایجاد ہو گئی!
وہ باغ اور کسی کا وہ زانو وہ اپنا سر　　بھولی ہوئی یہ بات کہاں یاد ہو گئی!
یہ کس نے آج پھول چڑھائے کہ خود بخود　　زیرِ مزار روح مری شاد ہو گئی!
کیا بات ہے وہ پوچھتے ہیں مجھ سے بار بار　　شیریں کو کیوں محبتِ فرہاد ہو گئی
بلبل غریب کو گل و گلشن کی کیا خبر　　سب عمر نذرِ خانۂ صیاد ہو گئی

اک جاں بھی ظریف کا سرمایۂ حیات
کمبخت وہ بھی عشق میں برباد ہو گئی!

موسیقی

(از جناب عاطر حسن صاحب قریشی سی ٹی)

ہندوؤں کی متبرک کتاب وید کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ علم موسیقی کے موجد مہادیوجی تھے۔ انہوں نے ہی اس علم کی ایجاد کی اور اکثر اس سے شغل رکھتے تھے۔ انکی یہ ایجاد تفریح طبع کی غرض سے نہیں تھی بلکہ حمد خدا کا ایک طریقہ تھا۔ وہ جو کچھ گاتے تھے وہ خدا کی یاد میں اور اسکی تعریف میں ہوتا تھا۔ جتنے بھجن تھے وہ خدا ہی کی حمد و ثنا میں تھے انکا گانا آجکل کے گانوں سے بالکل جدا اور بالکل مختلف تھا ہندوؤں میں ابتک یہ رواج چلا آرہا ہے کہ مندروں وغیرہ میں پوجا کے اوقات میں ایک خاص لہجہ میں اشلوک پڑھے جاتے ہیں۔ صبح کیوقت مندروں میں گانا ہوتا ہے جس میں سوائے ان بھجنوں کے جو حمد و ثنا میں لکھے گئے ہوں اور کچھ نہیں گایا جاتا۔ یہ سلسلہ مہادیوجی سے شروع ہو کر انکے تمام چیلوں اور مریدوں میں پھیل گیا اور ہر متنفس اس سے آشنا ہو کر اسکا مشغلہ کرتا رہا مگر اسکا مقصد صرف حمد خدا ہی تھا۔ ہوتے ہوتے نوبت یہانتک پہنچی کہ راجہ بھوج کے زمانہ میں درباری گوئیے اس علم میں نہایت طاق اور ہوشیار لوگ بن گئے۔ ایک دن راجہ بھوج نے ایک ٹھمری بنائی جو کہ انسانی خدوخال کی تعریف میں تھی۔ یہ ٹھمری درباری گوئیوں کو دی گئی اور انکو اسکے گانے کا حکم ملا۔

گوئیوں کا استاد اس ٹھمری کو دیکھکر پہلے تو بہت خوش ہوا مگر اسکے بعد رونے لگا۔ راجہ نے جب اسکے ہنسنے اور رونے کا سبب دریافت کیا تو اس نے عرض کیا ہنسا اس لئے کہ آپکو یہ نئی بات خوب سوجھی کہ آپنے یہ ٹھمری تصنیف کی اور ٹھمری بھی نہایت ہی خوب لکھی ہے۔ اور رویا اس لئے کہ آج سے گانا گانا نہیں رہیگا اور اسکا مقصد بالکل بدل جائیگا۔ وہ زمانہ جلد آئیگا کہ یہ علم ایک نہایت ہی ذلیل چیز بنکر رہ جائیگا اسکے جاننے والے بھی ذلیل سمجھے جائیں گے اور اس کا شغل کرنے والے بیہودہ اور لفنگے خیال کئے جائیں گے۔ انسانی خدوخال کی تعریف ہر شخص کو پسند آئیگی اور ہزاروں ٹھمریاں انسانی خدوخال کے متعلق تیار ہو جائیں گی جنکو ہر شخص گائیگا۔ خدا کی حمد و ثنا کے بھجن لوگ بھول جائیں گے۔

راجہ نے اس کا کچھ خیال نہ کیا اور گانے کا حکم دیا۔ گوئیوں نے اسکو گایا۔ راجہ اور تمام درباری اس سے نہایت محظوظ ہوئے جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ چند دنوں میں ہر شخص نے ایک ایک ٹھمری بنا کر گوئیوں کو دی اور اب وہ گائی جانے لگیں۔

اسکے بعد مختلف قسم کے باجے اور ساز ایجاد ہونا شروع ہوئے اور نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ اگر کوئی استاد بھی چاہے کہ تمام باجوں کے نام گنادے تو اسکے لئے مشکل ہے بلکہ ناممکن ہے۔

ہندوؤں کے علاوہ دوسرے مذاہب میں گانا صرف حمد خدا کے لئے مخصوص ہو کتب اسلامی سے یہ ثابت ہے کہ داؤد علیہ السلام اور انکے پیرو تابوت کے آگے آگے

لحن داؤدی میں خدا کی حمد و ثنا گاتے ہوئے جاتے تھے اور اسی وقت سے لحن داؤدی مشہور ہے۔ عیسائیوں میں بھی یہ رواج ہے کہ گرجہ کے اندر گرجہ کے تمام حاضرین باجہ کے ساتھ خدا کی حمد و مسیح علیہ السلام کی تعریف میں گیت گاتے ہیں۔

اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے شرعی نقطہ نظر سے گانے کو حرام قرار دیا ہے۔ شارع اسلام کیوقت میں گانا اپنے مقصد کو چھوڑ کر اپنی جگہ سے ہٹکر بہت دور جا پڑا تھا اس کا مقصد تفریح اور دل بستگی ہو گیا تھا اسی لئے شارع نے یہ سمجھتے ہوئے کہ اب یہ علم ایک گمراہ کن علم ہونے والا ہے اسکو حرام قرار دیدیا۔

جہانتک علم کا تعلق ہے تو یہ کہنے میں کسی کو باک نہیں ہو سکتا کہ یہ علم اتنا مشکل علم ہے جسمیں کمال حاصل کرنا نہایت ہی مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ اگر ایک ہی شخص یہ چاہے کہ تمام قسم کے باجے اور ساز بجانے میں ماہر ہو جائے تو اسکے لئے عمر نوح بھی ناکافی ہوگی۔ یہ تو ممکن ہے کہ وہ دو چار قسم کے باجے نہایت کمال کے ساتھ بجالے اور انکے استعمال میں خاص مہارت حاصل کرے۔ اسکے علاوہ تمامی راگ کسی کو بھی سدھ نہیں ہوتے تان سین خاں جیسے استاد زمانہ کو بھی صرف تین راگ ہی سدھ تھے۔ جاننے کو وہ سب راگ تھے مگر جاننے اور سدھ کرنے میں بڑا فرق ہے۔ سدھ اسکو کہتے ہیں جس کے گانے سے اسکے تمام اثرات ظاہر ہونے لگیں اور اسکی دیویاں موجود ہو جائیں تو یہ بات انہیں بھی نہ تھی اس علم کی مشکلات کو دیکھکر اور اسکے نکات کو سمجھکر عقل سلیم اس بات کے ماننے پر مجبور ہے کہ ضرور قدرت نے اسکے موجد کو اسکی ایجاد میں مدد دی ہے اور شاید نبی نے اسکی استمداد کی ہے ورنہ سات سروں کے اندر چھ قسم کے راگ پیدا کرنا اور ہر ایک راگ کا ایک دوسرے سے بالکل مختلف ٹھاٹ قایم کرنا انسانی عقل سے باہر ہے اسکے علاوہ ہر ایک راگ کی راگنیاں اور انکے ٹھاٹ بھی علیحدہ علیحدہ بنائے ہوئے ہیں۔ اسی پر بس نہیں کیا بلکہ راگنیوں کے پتر اور پتروں کی بہار جائیں بھی بنائیں جنکی تعداد کئی لاکھ ہوتی ہے۔ بعض کا قول ہے کہ ایک کرور سے بھی زائد ہے۔ ان سب باتوں کے باوجود سر وہی سات رہتے ہیں انمیں کوئی کمی بیشی نہیں ہوتی۔

زمانہ حال میں سائنس میں ترقی کرتے کرتے انسان بہت کچھ نئی باتیں سیکھ گیا ہے اور سینکڑوں نئے انکشافات ہو گئے ہیں مگر علم موسیقی میں ایک نقطہ بھی نہ گھٹ بڑھ سکا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے اسکے موجد کو سب کچھ عطا فرماکر اسی پر اسکا خاتمہ کر دیا۔

قدرت نے آواز ہر انسان کو عطا فرمائی ہے کسی کی آواز پتلی ہوتی ہے کسی کی بھاری اور بھدی ہوتی ہے۔ مگر ہر آواز کسی نہ کسی سُر سے ملتی ضرور ہے اسلئے سُر اور آواز ہر ملک میں یکساں ہیں۔ ہر جگہ کے ساز اور باجے ایک ہی قسم کے سر رکھتے ہیں۔ مگر اصول موسیقی ہر ملک کے علیحدہ علیحدہ ہیں راگ اور راگنیاں مختلف ہیں۔ سارے ملکوں کے گانوں سے ہندی گانا زیادہ مشکل اور سب سے جدا ہے۔ اسکے اصول بھی بالکل مختلف ہیں ہندی گانے میں اتنے طرز ہیں کہ اگر تمام ممالک کے طرز یکجا کر دیئے جائیں تو بھی اسکی برابری نہیں کر سکتے اسکی ایک خاص وجہ ہے اول تو یہ کہ ہندی گانا خود ہی ایک وسیع علم تھا اسپر طرہ یہ ہوا کہ مسلمان بادشاہوں کے وقت میں ایرانی تورانی چینی۔ ترکی عربی و مصری وغیرہ وغیرہ لوگ یہاں آتے اور انہوں نے بھی اپنے کمال دکھائے وہ سب ہندی استادوں نے سنے

ہی اڑالئے اور انہیں اصلاح کرکے اپنے یہاں شامل کرلیا فارسی گانے کو تو ہندی گانے نے اپنے میں ایسا جذب کیا کہ دونوں کو علیحدہ کرنا مشکل ہے۔ اگر کوئی فارسی گویا گانے بیٹھے تو انکی طرز ادا اور زبان سے تو یہ معلوم ہوجائیگا کہ وہ فارسی ہے مگر طرز اور علم میں وہ ہندی ہی معلوم ہوگا۔

یونانیوں میں گانے کا رواج قدیم سے چلا آتا ہے۔ اول اول انکے یہاں گانے کے ساتھ باجہ وغیرہ نہیں ہوتا تھا صرف بھانجھ اور ایک خاص قسم کا ڈھول ہوتا تھا۔ اسکے بعد تانت کا ایک باجہ ایجاد ہوا۔ اسکی بنیاد اس طرح ہوئی کہ ایک مرتبہ ایک شکاری نے شکار پر تیر چلایا۔ کمان بہت سخت تھی تیر کے چلتے ہی تانت سے ایک قسم کی خوش آیند آواز پیدا ہوئی۔ شکاری نے اس تانت کو پھر چھوکر دیکھا اور اسکو یہ معلوم ہوا کہ جتنی مرتبہ تانت پر انگلی لگائی جاتی ہے اس سے ایک آواز پیدا ہوتی ہے لیکن آواز میں ایک فرق ضرور ہوتا ہے اور وہ انگلی کے زور سے یا آہستہ سے لگانے پر ہوتا ہے۔ جب وہ گھر واپس آیا اسنے اور لوگوں کی کمانوں کو چلا چڑھایا اور انکی تانتوں کو چھو چھوکر آزمایا۔ اسنے معلوم کرلیا کہ ہر ایک کمان کی تانت سے آواز پیدا ہوتی مگر فرق کے ساتھ جس سے اسکو معلوم ہوگیا کہ سخت اور ہلکی تانتیں مختلف آوازیں دیتی ہیں۔ اب اس نے لکڑی کے ایک تختہ پر تین تانت لگائے اور انکی سختی میں تھوڑا فرق رکھا۔ اسکے بعد اسنے ہر تانت کو لکڑی کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے سے چھوا جن سے مختلف سروں کی آوازیں پیدا ہوئیں۔ یہی باجہ ترقی کرکے ایک عمدہ باجہ ہوگیا اسی کو مصریوں نے بھی اپنے یہاں لے لیا اور استعمال کرنے لگے

ہارمونیم کی ایجاد ایک نئی ایجاد ہے۔ اسکے موجد نے ایک مرتبہ یہ معلوم کرنے کے بعد کہ ہوا اگر تنگ راستہ سے گذرتی ہے تو اس سے ایک آواز پیدا ہوتی ہے۔ مختلف قسم کے باجے بنانے شروع کئے اور آخر کار کامیاب ہوگیا۔ اسنے یہ معلوم کرلیا کہ ہوا دینے والی چیز اور ہوا کے خارج کرنیکا سوراخ ایک ہی صندوق میں ہونا چاہیئے۔ اور صندوق اس قسم کا ہو کہ اس میں سے ہوا کسی اور طرف سے خارج نہو سوائے اس جگہ کے جہاں سے مقصد ہو۔ اس طرح سے ہارمونیم عالم ایجاد میں آیا۔

پیانو تانت کے مصری باجوں کی نقل ہے ایک اطالوی شخص نے مصری باجوں سے متاثر ہوکر اسکو ایک عمدہ شکل میں لانیکی کوشش کی۔ رفتہ رفتہ اسکو یہ بات معلوم ہوئی کہ ایک کھنچے ہوئے تانت کی آواز لوہے کے تار کی آواز سے ملتی ہے۔ مگر تار کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ وہ بھی کسی چیز سے کسا ہوا ہو۔ اس نے کئی تاروں کو شکنجہ میں کسکر ایک چھوٹی سی ہتوڑی سے انپر آہستہ آہستہ ضرب لگائی اور محسوس کیا کہ اسی قسم کے سروں کی آواز پیدا ہوتی ہے جیسی تانت سے اب اسنے زیادہ محنت کی اور ایک صندوق ایسا بنایا جسمیں تار دونوں طرف سے کسے ہوئے ہوں ہر تار کے نیچے اسنے ایک ایک چھوٹی چھوٹی ہتوڑی لگائی جو اسکی چابی کو دبانے سے اٹھتی اور گرتی تھی۔ اب اسنے ہر چابی کو دبایا اور گرایا اس طرح اسے اپنی کامیابی پر یقین ہوگیا۔ رفتہ رفتہ کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب پیانو موجودہ خوبصورت شکل میں آگیا۔

علم موسیقی کی کئی ایک شاخیں ہیں مثلاً گانا۔ ساز بجانا۔ باجہ بجانا طبلہ ڈھولک بجانا۔ ناچنا۔ وغیرہ۔ آپ نے گانے اور باجہ کے متعلق تو ملاحظہ فرمایا اب طبلہ کا بھی تھوڑا سا حال سن لیجئے۔ ہندی تالوں اور دوسرے ممالک کی تالوں میں بہت بڑا فرق ہے دوسرے ممالک میں زیادہ تر

دو تین قسم کی تالیں استعمال ہوتی ہیں۔ وہ یہ ہیں ایک تالہ کہروا دادرا اور تیتالا۔ اسکے علاوہ دوسری تالوں کی کوئی تال ہو نہ اسکی ضرورت ہے کیونکہ انکا گانا ہی ایک سادہ گانا ہے۔ ہندی تالوں کا حال اسکے بالکل برعکس ہے۔ یہاں گانوں کی طرح تالیں بھی بہت سی ہیں۔ دادرا۔ کہروا اور تین تالہ تو یہاں نہایت ہی معمولی تالیں شمار کی جاتی ہیں انکے علاوہ جھپ تالہ۔ دیپچندی۔ تیوڑا۔ سول فاختہ۔ دھمال۔ چاچر وغیرہ مستعمل ہیں جو اونچے اور بڑے گانوں میں کام آتی ہیں انکے علاوہ پیروں پشتیں اور ٹکڑے ہیں جو طبلہ نوازی کے وقت کام میں لائے جاتے ہیں جن سے ایک عجیب کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

ہندی گانوں میں ایک چیز رس ہوتا ہے جسکی کئی قسمیں ہیں مثلاً کام رس۔ کرودھ رس۔ پریم رس وغیرہ انکی صفت یہ ہے کہ جس رس کا گانا گایا جائیگا سننے والوں پر اسی کی کیفیت طاری ہو جائیگی۔ اور بے اختیار ہو کر وہ کام ہی کرنے کو تیار ہو جائیں گے جو وہ نہیں کرنا چاہتے۔ اگلے زمانہ کے گویئے اسکے مالک ہوتے تھے اور وہ جیسے سامعین سے مقابل ہوتے تھے ویسا ہی رس اختیار کرتے تھے۔ رئیسوں نوابوں سے گویئے بڑی چیز رس حاصل کر لیتے تھے یہانتک جو مانگتے تھے وہ پاتے تھے انکے گلے کے ہار اور ہاتھوں کی انگوٹھیاں تک اتروا لیتے تھے بعض اوقات تو یہاں تک نوبت پہنچی ہے کہ شاہوں کو بیخود کر کے انکے خلاف مرضی احکام صادر کروالئے ہیں۔ شاہان اودھ کے یہاں یہی وجہ تھی کہ تمام افسر اور درباری وہی لوگ تھے جو علم موسیقی کے ماہر تھے انھوں نے نوابان اودھ کو اپنے رس کے ذریعہ سے اپنے قابو میں کر لیا تھا اور جو چاہتے تھے وہ کرتے تھے۔ اب ایسے لوگ نایاب ہیں۔

آیئے اب آپ کو ہندی پرانے اور نئے گانوں کی حالت بتائیں اور دونوں کا مقابلہ کر کے دیکھیں۔ ذیل میں دونوں قسم کے گانے درج ہیں اور انکی حالت بتائی گئی ہے۔

پرانا گانا

سمرن کر لے میرے منا تو ری بیتی عمر ہری نام بنا
ہستی دنت بنا پنچھی پنکھ بنا ناری پورش بنا
جیسے دنیا کے پتہ پتا بنا ہینا ویسے پرانی ہری نام بنا
دین چندر بنا دیہ نہیں بنا دھرتی میگھ بنا
جیسے پنڈت وید بنا ہینا ویسے پرانی ہری نام بنا

اس میں شاعر خدا کے بندوں کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ اے انسان تیری اتنی عمر خدا کی عبادت کے بغیر گذری ہے اب تو تو کچھ عبادت اور توبہ کر لے۔ شاعر بتاتا ہے کہ جیسے ہاتھی بغیر دانت کے نہیں ہوتا اور پرند بغیر بازو کے بیکار ہے اور عورت بغیر شوہر کے خراب ہے اور جیسے طوائف کے بچے بغیر باپ کے ذلیل ہیں اسیطرح انسان بغیر خدا کے ذلیل و بیکار ہے۔ آگے چل کے وہ پھر یہ کہتا ہے کہ جیسے بغیر چاند کے اندھیری رات ہوتی ہے یا بغیر آنکھ کے اندھا جسم رہتا ہے یا بغیر مینہ کے زمین خشک رہتی ہے اور جیسے بغیر وید کے پنڈت بیکار ہوتا ہے اسی طرح انسان بغیر خدا کی محبت کے ذلیل ہے۔

اس قسم کے پرانے گانے ہوتے تھے۔ اب ذرا نئے گانے کو ملاحظہ فرمایئے۔ نیا گانا۔

دن رتیاں نہ چھیڑو سیاں چھانڈو بتیاں دھڑ کے
چھتیاں پھڑ کے انکھیاں ہاں۔

میں لاگوں تورے پیّاں موری ٹوٹی رے کلیاں نہ چھیڑو سیّاں۔

بات توری گہات ساری تڑپت بیتی رات ساری

چلو ہٹو جاؤ باتیں نہ بناؤ جیا نہ جلاؤ گلے لگ جاؤ

اب ذرا اس شاعری کو دیکھئے معنی لکھنا تو میرے قلم کی طاقت سے باہر ہے یا یوں سمجھئے کہ میں لکھنا نہیں گوارا کر سکتا ہاں یہ ضرور کر سکتا ہوں کہ اسکی بندش کے متعلق کچھ عرض کروں پہلے ٹکڑے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص کسی کی زبردستی سے تنگ آکر خوشامد کر رہا ہے دوسرے ٹکڑے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرقت سے بے چین ہو کر عورت پریشان ہوگئی اور جب اسکا شوہر سامنے آیا تو اسکو وہیں رہنے کی ہدایت کر دی اور ناراض ہونا ظاہر کر دیا مگر آخر میں گلے لگ جانا کچھ معنی نہیں پیدا کرتا۔

یہ ہے آجکل کی ہندی شاعری جو گانے کی غرض سے ہوتی ہے۔ بھلا ایسی چیزیں اور انکے گانے والے کیوں نہ ذلیل ہوں۔

جواہر پارے

(۱) أَسَدٌ حَطُومٌ خَيْرٌ مِنْ وَالٍ ظَلُومٍ۔
چیر پھاڑ ڈالنے والا شیر ظالم حاکم سے اچھا ہے۔

(۲) يَدُ الرِّفْقِ تَجْنِي ثَمَرَ السَّلَامَةِ۔
نرمی کرنیوالا ہاتھ سلامتی کے پھل چنتا ہے۔

(۳) إِنَّكَ لَا تَجْنِي مِنَ الشَّوْكِ الْعِنَبَ۔
کانٹے سے انگور تم نہیں چن سکتے۔

(۴) مَنْ عَابَ سِفْلَةً فَقَدْ رَفَعَهُ وَمَنْ عَابَ شَرِيفًا فَقَدْ وَضَعَ نَفْسَهُ۔
کمینہ کی عیب گیری اسکو عزت دیتا ہے اور شریف کی عیب گیری اپنے آپ کو ذلیل کرتا ہے۔

(۵) الدِّيكُ الْفَصِيحُ مِنَ الْبَيْضَةِ يَصِيحُ۔
بولنے والا مرغ انڈے سے نکلتے نکلتے چیخنے لگتا ہے۔

(۶) الْقَادِرُ يَفْعَلُ وَالْعَاجِزُ يَقُولُ۔
جو کر سکتا ہے وہ کرتا ہے اور جو نہیں کر سکتا ہو وہ باتیں بناتا ہے۔

(۷) صِلَةُ الرَّحِمِ تَزِيدُ فِي الْعُمُرِ۔
عزیزوں کے ساتھ سلوک کرنے سے عمر زیادہ ہوتی ہے۔

(۸) بِجَانِبِ الْحَظِّ تَقِفُ الْمُصِيبَةُ۔
جیسا حصہ اسیقدر مصیبت۔

(۹) مَنْ وَضَعَ نَفْسَهُ دُونَ قَدْرِهِ رَفَعَهُ النَّاسُ فَوْقَ قَدْرِهِ، وَمَنْ رَفَعَهُ فَوْقَ قَدْرِهِ وَضَعَهُ النَّاسُ دُونَ قَدْرِهِ
جو کوئی اپنے آپکو اپنے مرتبہ سے کمتر سمجھتا ہو لوگ بھی اسکے مرتبہ سے زیادہ عزت کرتے ہیں اور جو کوئی اپنے آپ کو اپنے مرتبہ سے برتر سمجھتا ہے لوگ اسکو اسکے مرتبہ سے بھی گرا دیتے ہیں۔

(۱۰) الْجَهْلُ فِي الْقَلْبِ كَالْأَكْلَةِ فِي الْجَسَدِ۔
جہالت دل میں ایسی ہے جیسے جسم میں آکلہ (ایک بیماری کا نام ہے)،

(۱۱) يَدُ اللهِ عَلَى الْجَمَاعَةِ۔
جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے۔

(۱۲) لَا تَعْمَلْ شَيْئًا مِنَ الْخَيْرِ رِيَاءً وَلَا تَتْرُكْهُ حَيَاءً۔
کوئی اچھا کام نہ نام و نمود کے لئے کرو اور نہ شرم کی وجہ سے ترک کرو۔

(۱۳) الْجَنَّةُ تَحْتَ ظِلَالِ السُّيُوفِ۔
جنت تلواروں کے سایہ کے نیچے ہے۔

(۱۴) خُذُوا الْحِكْمَةَ أَيْنَمَا وُجِدَتْ۔
حکمت کی بات جہاں کہیں ملے اسے لے لو۔

(۱۵) الشَّرَفُ بِالْهِمَمِ الْعَالِيَةِ لَا بِالرِّمَمِ الْبَالِيَةِ۔
شرافت بلند ہمتوں سے حاصل ہوتی ہے پوشیدہ ہڈیوں سے نہیں۔

(۱۶) مَفَاتِيحُ الْجَنَّةِ الْخَيْرُ وَالْخَيْرُ فِي السَّيْفِ، وَالْخَيْرُ مَعَ السَّيْفِ وَالْخَيْرُ بِالسَّيْفِ۔
جنت کی کنجی بھلائی ہے اور بھلائی تلوار میں ہے، تلوار کے ساتھ ہے، تلوار کے ذریعہ ہے۔

(۱۷) مَنْ صَحِبَ الذِّئَابَ كَانَ لَهُ عُوِيْلٌ مِثْلُهَا ۔
جو بھیڑیوں کیساتھ رہیگا اسکی آواز بھی ویسی ہی ہوگی۔

(۱۸) اَلصَّاحِبُ لِلصَّاحِبِ كَالرُّقْعَةِ لِلثَّوْبِ اِنْ لَمْ تَكُنْ مِثْلَهُ شَانَتْهُ ۔
انسان کا ساتھی ایسا ہے جیسا کپڑے کا پیوند اگر ملتا ہوا نہوا۔ تو بدنما ہوتا ہے

(۱۹) اِذَا نَزَلَ بِكَ مَكْرُوْهٌ فَانْظُرْ فَاِنْ كَانَ لَهُ حِيْلَةٌ فَلَا تَعْجَزْ كَانَ مِمَّا لَا حِيْلَةَ لَهُ فَلَا تَجْزَعْ ۔
اگر تم پر کوئی مصیبت آئے تو دیکھو اگر اسکی کوئی تدبیر ہوسکتی ہو تو عاجز نہ بنو اور اگر کوئی تدبیر نہیں ہوسکتی ہو تو پھر گھبراؤ نہیں۔

(۲۰) اِنْ كَانَ شَيْءٌ فَوْقَ الْحَيَاةِ فَهُوَ الصِّحَّةُ وَاِنْ كَانَ شَيْءٌ فَوْقَ الْمَوْتِ فَهُوَ الْمَرَضُ ۔
اگر زندگی سے بڑھکر کوئی چیز ہے تو صحت ہے اور موت سے بڑھکر اگر کوئی چیز ہے تو مرض ہے۔

(۲۱) خَيْرٌ لَكَ اَنْ تَكُوْنَ فَقِيْرًا اَمِيْنًا وَلَا تَكُنْ غَنِيًّا خَائِنًا ۔
یہ تمہارے لئے اچھا ہے کہ تم امانت دار فقیر ہو مگر بددیانت مالدار نہ بننا۔

(۲۲) لَيْسَ الْفَشَلُ جَرِيْمَةً وَاِنَّمَا الْجَرِيْمَةُ السَّعْيُ لِغَرَضٍ حَقِيْرٍ ۔
ناکامی جرم نہیں جرم تو کسی حقیر غرض کے لئے کوشش ہے۔

عید کے مختلف رخ

از سحر طراز حضرت ثاقبؔ کانپوری

مفلوک الحال مسلمانوں کی عید

کسقدر افسردہ ہے مذہب کے دیوانوں کی عید
بزم میں بے شمع ہو جس طرح پروانوں کی عید
اب نہ وہ ذوقِ مسرت ہے نہ وہ جوشِ حیات
دیکھ تو بھی اے فلک آکر مسلمانوں کی عید

قدامت پرستوں کی عید

کار ہائے حریت کی ناتمامی اور عید
آہ ناداں یوں خلافِ نیک نامی اور عید
دیکھ او محوِ طرب تو یاد رکھ یہ مسئلہ
جمع ہو سکتی نہیں یکجا غلامی اور عید

بے روزہ دار کی عید

یاد رکھ، ہاں یاد رکھ ہو صبحِ عشرت شامِ عید
ہو نہیں سکتا کبھی وہ لایقِ انعامِ عید
جس نے غفلت میں گزارا ہو ترا ماہِ صیام
زہر سے لبریز ہے اسکے لئے یہ جامِ عید

غلاموں کی عید

ہو کے مسلم پھر بھی ہے تو ہند میں تاراجِ عید
تیری غفلت کیشیوں پر ہنس رہی ہے آج عید
اٹھ ذرا ہمت تو کر اے حاملِ شرعِ مبین
پھر مٹا داغِ غلامی پھر پہن لے تاجِ عید

غلامی پسندوں کی عید

یہ نشانِ ذلت کا پیشانی پہ اور احسانِ عید
اے غلامِ ہند تو اور سلسلہ جنبانِ عید
تجھکو کیا اسکی خبر، اے ناشناسِ حریت
عید وہ کیا ہے، غلامی میں جو ہو ارمانِ عید

زنداں کی عید

آئی ہے سنتے ہیں ہم بھی عالمِ امکاں میں عید
پھر منائی جا رہی ہے ہر طرف خوباں میں عید
ہاں مگر ثاقبؔ جو تم دیکھو نگاہِ غور سے
ہے انہیں کی عید جنکی کٹ گئی زنداں میں عید



آغوشِ جرم میں

از جناب مظہر انصاری دہلوی۔ (بی۔ اے۔ (آنرز)

نوخیز مجرم اب سے سو برس پہلے ایک معمولی سی چیز چرانے کے جرم میں بھی بچوں کو بڑی سخت سزائیں دیجاتی تھیں۔ موجودہ زمانے میں ہمارا نظریہ بہت کچھ آدمیوں کا سا ہو گیا ہے۔ مگر حالت اب بھی قابل اطمینان نہیں کہی جا سکتی اب سے صرف ہی برس پہلے کی بات ہے کہ انگلستان میں بارہ سال سے نیچی عمر کے ۷،۴۵۱ لڑکے جیل بھیجے گئے تھے اور ۱۲۲۲۵ لڑکے ۱۲۔ اور ۱۶ سال کے سال درمیان والے۔ حالانکہ اصولاً ۱۶ سال سے کم عمر کے لڑکوں کو عام قید خانے میں ہرگز نہیں بھیجنا چاہئے اور ان کے مقدمات فیصل کرنے کیلئے علیحدہ کچہریاں ہونی چاہئیں اور ۱۴ برس سے کم عمر کے لڑکوں کو سزا مطلق نہیں ملنی چاہیے۔ ہم ہندوستانیوں کو اس بات پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیئے۔

آہستہ آہستہ یہ بھی محسوس کیا جا رہا ہے کہ ہمارے جدید اصلاحی طریقے بیکار ثابت ہونگے اگر نوخیز مجرموں کیساتھ ہی ان کے والدین کی بھی اصلاح نہ کی گئی۔ گندے سندے گھروں میں، بدسلیقہ اور پھوہڑ ماں باپ کے زیر تربیت اچھے بچے تو اٹھنے سے رہے۔ برے ہی اٹھیں گے۔ بڑی ضرورت ہے اس بات کی کہ بچوں کے ساتھ سختی کا برتاؤ کرنے کی بجائے ان کے ماں باپ اور رکھوالوں کو اچھی طرح جھڑ جھڑایا جائے جنکی برکت سے انسانیت کی پاک زمین میں بس کے بیج بوئے جا رہے ہیں۔

جرموں کو پرکھنے کا یہ نیا اصول

آیندہ زمانے کی لال کتاب بہت سے ایسے جرموں کا نام محو کر دیگی جو اسوقت کے معاشرتی نظام میں خلل ڈال رہے ہیں اور بہت سے ایسے نئے جرموں کے نام بڑھا دیگا جو اس وقت جرم نہیں سمجھے جاتے مثلاً بے کاری جرم خیال کیجائیگی اور نہ صرف ایک گداگر کا ٹکڑا ٹیڑا مانگنا ہی بیکاری میں داخل ہوگا بلکہ ایک سرمایہ دار کا مسکوڑے لینا بھی

خاص طور پر خود غرضانہ مقاصد کیلئے دولت کا انبار لگانا شدید نگاہ سے دیکھا جائیگا۔ یہ قومی دولت ہوگا اور اس کا مناسب استعمال دونوں پر فرض ۔۔۔ افراد پر بھی حکومت پر بھی ۔۔۔ چنانچہ وہ موٹی توند والا سرمایہ دار جو یا تو کچھ نہیں کرتا یا اپنے سنہری روپہلی ذرائع کو ناجائز مقاصد کے حصول کیلئے استعمال کرتا ہے قابل سزا تصور کیا جائیگا۔

اسی طرح قوم کے بچے بھی قوم کی ملکیت ہونگے۔ اور ماں باپ کے پاس بطور امانت رہیں گے۔ اور ماں باپ کی انکی طرف سے لاپرواہی برتنا جرم خیال کیا جائیگا اور اسی طرح ان کے ساتھ ظلم روا رکھنا بھی

نئے نظریے سے چند منطقی نتائج

یہ دردمندانہ اپیل میں منطق جیسی غیر ہمدردانہ چیز کا ذکر لے آنا کچھ مناسب تو نہیں مگر ایک اصول کی تشریح کرنے کے بعد اس سے کچھ نتیجے نکالنا بھی ذرا ضروری ہی سا ہے۔ اس لئے "منطقی" آپ انہیں مانیے یا نہ مانیے (اس سے بحث نہیں)

وہ نتیجے سن لیجئے

یہ بہرکیف ظاہر ہے کہ جدید نظریہ جرم بہت سی تبدیلیاں چاہتا ہے اور خاصی بھاری بھرکم تبدیلیاں۔ سب سے پہلی چیز تو یہ ہے کہ ہمیں انسداد جرم کے سلسلے میں پرانی روش چھوڑنی ہوگی اور مندرجہ ذیل پروگرام پر عمل کرنا ہوگا

اول۔ یہ معلوم کرنا کہ

(۱) کونسی وجوہات ارتکاب جرم کا باعث ہوئیں ؟

(۲) مجرم کی شخصیت کہاں تک جرم پر اثر انداز ہوئی ؟

دوئم۔ تربیت اور محنت سے (مگر اس محنت سے جو تعمیری ہو) مجرم کو اس قابل بنا دینا کہ وہ جیل کی چار دیواری سے باہر نکل کر اپنے بل بوتے پر کچھ کھا کما سکے۔

سوئم۔ سوسائٹی کی ذہنیت کو مسلسل نشتر دینا یہانتک کہ سوسائٹی مجرم کے ساتھ موجودہ رویہ برتنا چھوڑ دے۔ اور اس پر حقارت کی نظر نہ ڈالے اور اسے تنگ نہ کرے اور اسے وہی سمجھے جو وہ ہے یعنی سوسائٹی کا عضو معطل۔ اور اس تعطل کو دور کرنے کی حتی الامکان کوششیں کرے اور اپنا مقصد اصلاح بنائے اور وہ طریقے اختیار کرے جن سے خوشگوار نتائج پیدا ہوں۔

معصومیت پر گنہ کا سایہ

جیسا کہ ابھی کہا جا چکا ہے جرم جس چیز کی مدد سے جڑ پکڑتا ہے وہ ہے خرابی تربیت۔ اس خرابی تربیت کے ذمہ دار کون لوگ ہوئے ماں باپ تو پھر ہمارے پروگرام کا یہ بھی ایک جز ہونا چاہیے کہ نوخیز مجرموں کے ماں باپ کو ان کی اولاد سے محروم کر دیا جائے اور ان کی اولاد حکومت کے خرچ پر حکومت کے مقرر کئے ہوئے ذمہ دار لوگوں کی نگرانی میں پلے۔ ان کے ساتھ مجرموں کا سا سلوک نہ کیا جائے بلکہ بچوں کا سا۔ باغ انسانیت کی شگفتہ کلیوں کا سا۔

جرم کی بنیادوں پر سائنس اور عقل کے کلہاڑے بجائے جائیں اور قید میں ڈال کر سڑانے کی بجائے ان انسانی پیداوار کے بیجوں سے لہلہاتے ہوئے تہذیب کے چمنستان پیدا کئے جائیں۔

گویا۔ (اور اسے بحث کا خلاصہ سمجھئے)

نئے زاویۂ نگاہ کی روشنی میں "سزا" کا مفہوم بمعنیٰ "انتقام" بالکل مجہول ہے۔ سوسائٹی کی حفاظت یقیناً بہت ضروری ہے مگر اس کا طریقہ یہ نہیں ہونا چاہیئے بلکہ اس طرح توجہ دینی چاہیئے کہ تھوڑی سی اصلاحی کوشش سے مجرم بجائے مضر پڑنے کے اپنی سوسائٹی کیلئے مفید پڑ جائے۔ ہمارے سامنے دو اور صرف دو باتیں ہونی چاہیئیں۔

سوسائٹی کا بھلا اور سوسائٹی کے صدقے میں مجرم کا بھی بھلا

جس طرح ہم جسمانی بیماریوں کی فکر کرتے ہیں اسی طرح ہمیں اپنی سوسائٹی کی اخلاقی بیماریوں کی طرف توجہ کرنی چاہیئے۔ ہمیں۔

(۱) مجرموں کی دماغی کیفیات پر عبور حاصل کرنا چاہیئے
(۲) مجموعی کوششوں سے ان کیفیات کا ازالہ کرنا چاہیئے

اور

(۳) اگر ضرورت ہو تو علیحدہ بستیاں قائم کر کے سوسائٹی کو ان سے محفوظ کرنا چاہیئے۔

مطلب یہ ہے

کہ جرم کو "گناہ" نہیں "بیماری" سمجھنا چاہیئے اور اسکا علاج کرنا چاہیئے۔

ہندوستان میں ابھی ان باتوں پر عمل ہونا بہت مشکل معلوم ہوتا ہے تاہم کوئی وجہ نہیں کہ ہم ان اصولوں کو سامنے رکھکر آگے بڑھنے کی کیوں نہ کوشش کریں۔

مندرجہ ذیل امور قابل توجہ ہیں۔

(۱) قتل کے حادثات میں کمی کرنے کی کوشش کیجائے۔ مگر اس کی ترکیب یہ نہیں کہ لیا اور قاتلوں کو دھڑا دھڑ پھانسی پر لٹکا دیا۔ جب تک انسانی خون "مانند آب ارزاں" اور "ہمدردی" کی قوتیں "سرنگوں" رہیں گی حادثات قتل میں کمی کی کوئی صورت نہیں نکل سکتی۔

(۲) مذہبی رواداری پیدا کیجائے۔ خصوصاً سیاست اور معاشرت میں۔

(۳) اخلاقی معیار کو بلند کیا جائے۔

(۴) جیلوں کی آبادی گھٹائی جائے۔ ہندوستان میں یہ آبادی جس سرعت سے بڑھ رہی ہے اسکا اندازہ صرف اس سے ہو سکتا ہے کہ اسوقت صرف پنجاب کی جیلوں میں ۹۰۰۰ سے زائد قیدی ہیں۔

(۵) تھوڑی میعاد کی قیدیں اڑا دی جائیں اور ان کی جگہ اصلاحی طریقے کام میں لائی جائیں۔

(۶) ضمانتیں منظور کرنے میں عدالتیں ذرا فراخدلی سے کام لیں۔

(۷) "قید" کی جگہ "جرمانے" کا استعمال زیادہ کیا جائے۔

(۸) جرمانے کی ادائیگی کیلئے وقت زیادہ دیا جائے۔

(۹) دیوالئے یا مقروض قیدیوں کے لئے جیلخانوں کی بجائے فیکٹریوں اور کارخانوں کے دروازے کھولے جائیں۔ ایک مقروض کو جیل میں ٹھونس دینے سے قرضخواہ کو آخر کیا مل جاتا ہے۔ لیکن برخلاف اس کے اگر وہ کارخانے میں کام کریگا تو جہاں اپنی مزدوری سے تھوڑا بہت قرضہ ادا کر دیگا وہیں اپنی محنت سے کوئی کام بھی سیکھ جائیگا۔

(۱۰) پہلے جرم میں کوئی سزا نہ دیجائے۔

(۱۱) ایک قانون "قانون طفلاں" کے نام سے پاس کیا جائے

اور اسیر نوعمر قیدیوں کیلئے مختلف رعایات رکھی جائیں ان کا ذکر تفصیل چاہتا ہے۔ انشاءاللہ اس بحث پر ایک مفصل مضمون پیش کیا جائیگا۔

(۱۲) نئے مجرموں کو مقدموں میں آسانیاں بہم پہنچائی جائیں۔

(۱۳) ایسے مجرموں کو جن کی حالت قابل اصلاح ہے جیل بھیجنے کی بجائے ہسپتالوں میں داخل کیا جائے اور ان کی ضروریات کے سلسلے میں ایک قانون "قانون تحفظ مجرمان" پاس کیا جائے۔

(۱۴) ایک آخری مگر بہت ضروری بات یہ ہے کہ جیل سے رہا ہونے کے بعد قیدی کی مدد کا انتظام کیا جائے۔ گورنمنٹ اپنی طرف سے کرے یا نہ کرے مگر لوکل جماعتوں کو اس قسم کی جگہیں بنانی چاہئیں اور ان کی کفالت کرنی چاہئے۔

قصہ ختم ہونے آیا مگر اب بھی یہی محسوس کر رہا ہوں کہ کچھ نہیں کہا۔

خیر اگر یہ کہانی آپ کو طول طویل معلوم ہو، اگر یہ حکایت دراز تر نظر آئے تو سب کی سب ذہن میں رکھنے کی کوشش نہ کیجئے۔ سب کچھ چھوڑ جائیے مگر میری خاطر سے یہ بات اپنے پاس رکھ لیجئے کہ۔

ہر مجرم ہمارا بھائی ہے اور ہماری ہمدردی کا مستحق ہے

ڈاڑھی رکھنی چاہئے یا نہیں

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ؕ اسلام کا دعویٰ ہے اور تکمیل دین، اتمام نعمت اور اللہ کا دنیا کے لئے صرف اسلام کو پسند کرنا اسوقت تک صحیح نہیں ہو سکتا۔ جبتک کہ اسلام میں ہر زمانہ ہر ملک، ہر قوم اور ہر قسم کی آب و ہوا کے اندر ہر ہر فرد بشر کے لئے اسکی ہر ہر قسم کی دینی و دنیاوی، انفرادی و اجتماعی، خانگی و معاشرتی غرضکہ ہر ممکن ضرورت اور موقع کے لئے ایک دستور العمل اور ایک نظام کار موجود نہو تاکہ کسی ایک فرد کو بھی کسی وقت اور کسی جگہ اسلامی تعلیمات کے سوا ادھر ادھر دیکھنے اور تلاش و جستجو کی حاجت نہ رہے بلکہ اسکی ہر ضرورت اور ہر حاجت یہیں سے پوری ہو جائے۔

اسلام نے عبادت و پرستش کے طریقے بھی بتا دیئے اور رسول علیہ التحیہ والتسلیم نے اپنے عمل سے انکی تفسیر و تشریح بھی کر دی۔ بنی نوع کے ساتھ تعلقات و معاملات کی حد بندی بھی کر دی۔ غرضکہ ضروریات دین اور لوازمات معاشرت میں سے ہر ہر چیز کے متعلق خدا کے حکم اور رسول کی عملی تفسیر سب کچھ موجود ہے۔ ان مخصوص چیزوں کو بھی متعین کر دیا گیا جنسے اسلام و غیر اسلام، مسلم و غیر مسلم میں امتیاز اور شناخت ہوتی ہے اور اسلئے وہ خصائص شعار اسلام کہلاتی ہیں۔ اسی وجہ سے شعائر نہایت اہم اور بہت ضروری ہیں اور انکا تارک قومی نقطہ نظر سے سخت ترین جرم کا مرتکب قرار پاتا ہے۔

شعائر کچھ اسلام کی خصوصیات نہیں ہیں۔ ہر قوم کی کوئی نہ کوئی ایسی خصوصیت ضرور نکلے گی جو اسکو دوسروں سے ممتاز کرتی ہوگی۔ ہندوستان میں پیشانی پر تلک اور سر پر چوٹی ہندوؤں کی خصوصیت ہے۔ سکھوں کے پانچ ککے یعنی کرپان، کچھنا، کڑا، کیس (سر کے بال) اور کنگھا قومی خصوصیت ہیں۔ پھر شعار کوئی اتفاقیہ اور غیر اختیاری چیز نہیں ہوتی بلکہ اختیار کردہ اور سوچی سمجھی ہوئی ہوتی ہے اور اسلئے ہوتی ہے کہ افراد قوم میں شعار کی موجودگی اپنی شخصیت اور قومیت کے احساس کو زندہ رکھ سکے تاکہ کسی فرد سے کوئی ایسا کام نہو سکے جو قومیت کے منافی اور خلاف ہو جاہلوں سے اس بارہ میں کچھ غفلت اور سستی ہو جائے تو ہو جائے۔ لیکن تعلیم یافتہ اور زندہ قومیں اسکا ہر وقت خیال رکھتی ہیں اور قومی شعار کو کبھی نظر انداز نہیں ہونے دیتیں۔ اسلام ایک کامل ترین نظام العمل اور دستور ہے وہ اس چیز کو کیونکر نظر انداز کر سکتا تھا۔

ختنہ، بڑھی ہوئی ڈاڑھی اور کتری ہوئی لبیں اسلامی شعار ہیں۔ ختنہ پر تو ہم ہندوستانی مسلمانوں کا اب تک اسی شدت کے ساتھ عمل ہے جیسا ایک شعار پر ہونا چاہئے مگر ڈاڑھی کی اہمیت انکے دل سے اب اس حد تک نکل چکی ہے کہ خود رکھنا تو در کنار ڈاڑھی اور ڈاڑھی رکھنے والے دونوں انکی نظر میں ذلیل و خوار ہو گئے ہیں۔ حالانکہ سلف سے لیکر

خلاف تک کوئی ایسا قول منقول نہیں ہے جس سے ڈاڑھی نہ رکھنے کا جواز نکلتا ہو۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔ اَعْفُوا اللُّحٰی وَقُصُّوا الشَّوَارِبَ۔ ڈاڑھیاں بڑھاؤ اور مونچھیں کترواؤ۔ لیکن حضرت عمر یا عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما میں سے کسی ایک سے ایک مشت سے زیادہ ڈاڑھی کو کتر دینا بھی منقول ہے۔ اس بنا پر رسولؐ کے وقت سے لیکر اب سے کچھ قبل تک جبکہ ہمارے اوپر کو برائے نام ہی ایک اسلامی حکومت قائم تھی اور اس کے ساتھ ہمارا اپنا تمدن بھی سانس لے رہا تھا مسلمانوں میں ڈاڑھی کا رواج تھا۔

اسلام نہ کسی ملک میں محدود ہے نہ کسی قوم سے مخصوص ہے۔ وہ عربیوں کا بھی اسی طرح مذہب ہے جس طرح ایرانیوں کا ہے۔ افریقہ کے حبشی اور امریکہ کے غلاموں کو بھی اسکے ساتھ وہی نسبت ہے جو یورپ کے گوروں اور امریکہ کے حاکموں کو حاصل ہے۔ اسلام کا شعار کوئی ایسی ہی چیز ہونی چاہئے تھی جس پر ہر شخص ہر ٹھنڈے اور گرم ملک میں رہ کر عملدرآمد کر سکے اور کسی کو کسی وقت کوئی دقت محسوس نہ ہو۔ اور یہی عین مقتضائے فطرت بھی ہے۔

خدائے تعالیٰ نے نوع انسانی کی دو صنفیں مرد اور عورت پیدا کی ہیں۔ دونوں سے الگ الگ ضرورتیں وابستہ ہیں اور اسی کے مطابق دونوں کی جسمانی ساخت اور افتاد مزاج و طبیعت مختلف ہے۔ اسکے علاوہ مرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں ہے دو ہاتھ، دو پیر، ناک، کان غرضکہ سب کچھ بالکل یکساں ہے۔ سر پر اور جسم پر بال بھی یکساں ہیں مگر چہرہ پر ڈاڑھی صرف مردوں کے ہوتی ہے عورتیں اس سے یکسر معرا ہیں۔ سو دو سو ہزار دو ہزار برس پہلے بھی ڈاڑھی صرف مردوں کے ہوتی تھی آج بھی صرف مردوں کے ہے۔ ان ممالک میں بھی ڈاڑھی صرف مردوں کے ہوتی ہے جہاں رکھنے کا رواج ہے اور ان خطوں میں بھی ڈاڑھی صرف مردوں کے ہوتی ہے جہاں اسکو نہایت مبالغہ سے صاف کر دینا تہذیب کی نشانی ہے فطرت کا مرد اور عورت میں یہ امتیاز قائم کرنا چاہتا ہے کہ مرد کی ڈاڑھی اسی لئے ہے کہ اسکو رکھا جائے اور منڈا کر اس عطیۂ الٰہی کی ناشکری نہ کیجائے یہ کفران نعمت رائیگاں نہیں جاتا بلکہ صورت بھی برباد ہو جاتی ہے۔ ڈاڑھی سے گلے اور کلوں کے ساتھ دانت بھی ہر ارضی و سماوی آفت سے محفوظ رہتے تھے مگر ڈاڑھی منڈا دینے سے وہ رکاوٹ دور ہو جاتی ہے۔ عورتوں میں تو انکے کلوں اور گردن کی چربی ان صدمات کی برداشت کر لیتی ہے مگر مردوں نے اپنے قدرتی محافظ کو ضائع کر دیا اور کوئی مصنوعی بدل اب تک میسر نہیں ہو سکا۔

آج کل پائیوریا یعنی مسوڑھوں سے پیپ آنے کا مرض جس کثرت سے پھیلا ہوا ہے اس سے ہمارے بزرگ قطعاً ناآشنا تھے۔ پہلے بھی کبھی کبھی کسی کسی کے دانتوں سے خون آتا تھا مگر بہت کم ستر ستر، اسی اسی، نوے نوے سال کی عمریں ہوتی تھیں اور ان عمروں میں بھی اکثر بوڑھے چنے چباتے اور ہڈیاں توڑتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوتے تھے۔ نہ کبھی دانت سے خون آتا تھا نہ دانت اکھاڑنے کی ضرورت ہوتی تھی۔ مگر آج جسکو دیکھو پائیوریا

کا مریض ہے جسکو دیکھو قبل از وقت پوپلا ہے۔ پھر تلاش وجستجو کیجائے تو عورتوں کی نسبت مردوں میں اور مردوں میں بھی وہ لوگ زیادہ ملیں گے جنکی ڈاڑھیاں روزانہ تختۂ مشق بنی ہیں۔

ڈاکٹروں کا اس ناشاد مرض کے متعلق یہ بھی خیال ہے کہ پائیریا ایک دفعہ ہو کر مدت العمر جاتا نہیں ہے ممکن ہے کہ جہاں کلوں پر ڈاڑھی کا باقی نہ رہنا اس مرض کا سبب ہو وہاں اس عمل کی پابندی اور تسلسل اسکے نہ جانے کا سبب ہو کیونکہ کسی مرض سے شفا حاصل کرنے کے لئے سبب مرض کا ازالہ ضروری ہے اور اگر اس مرض کا سبب وہ مسلسل رگڑ اور خراش ہے۔ جو ڈاڑھی منڈانے سے روزانہ کلوں کو پہونچتی ہے تو جب تک یہ رگڑ اور یہ خراش بند نہ ہو جائے۔ شفا نا ممکن ہے

پھر اگر صرف مسوڑھوں سی پیپ آتی رہے جب بھی یہی کیا کم تکلیف دہ ہے۔ دانت بھی اکھاڑنے پڑتے ہیں منہ سے پیپ بہتی ہو تو کیونکر ممکن ہے کہ تھوڑی بہت معدہ میں نہ پہونچے۔ معدہ بھی خراب ہو جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ معدہ کی خرابی تمام خرابیوں کی بنیاد ہے۔ جو مرض بھی اُٹھ کھڑا ہو تھوڑا ہے بعض اوقات وجع مفاصل اور گٹھیا کی شکایت ہو جاتی ہے۔ اٹھنا بیٹھنا چلنا پھرنا بلکہ یوں کہو کہ زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔

بالکل یقینی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ پائیریا کا واحد سبب ڈاڑھی منڈانا ہے۔ لیکن ان لوگوں کو دیکھکر جو اوروں کی نسبت اس مرض کا زیادہ شکار ہوتے ہیں یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ جہاں اس مرض کے اور اسباب ہوں سب سے قوی اور سب سے قوی سبب یہ ہے

ڈاڑھی منڈانے سے انسان صرف پائیریا ہی کا شکار نہیں ہو سکتا بلکہ ہر قسم کے جراثیم کے جسم کے اندر داخل ہونے کا ذریعہ بھی اکثر و بیشتر جلد کی خراش ہوا کرتی ہے اس بنا پر بہت وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ایسے لوگ اپنے مختلف امراض میں مبتلا ہونے کا سبب خود بنتے ہیں کیونکہ انتہائی احتیاط کے باوجود بھی کہیں نہ کہیں جلد کا خراش دار ہونا بہت معمولی بات ہے پھر اگر صرف یہیں تک معاملہ ختم ہو جائے جب بھی خیر دولت پر بھی اس کا اثر پڑتا ہے۔ اور بڑا حصہ ڈاکٹروں اور حکیموں کی نذر ہو جاتا ہے غرضکہ جانی و مالی دونوں قسم کا نقصان ہی نقصان ہے۔ ایسی حالت میں کیونکر کہا جاسکتا ہے کہ اس عمل پر اصرار درست اور تسلسل بالکل صحیح ہے؟



نشہ کی دکھیا

(گذشتہ سے پیوستہ)

از جناب مولوی عبدالہادی خانصاحب شاہجہانپوری

سترھواں باب
محمد فیلبان کی موت

وہ بولے میرا خیال ہے کہ محمد ہملوگوں کے گھر گیا ہوگا اور وہاں ہمارا انتظار کر رہا ہوگا۔ ایلن بولی اور یہ کیوں ممکن نہیں کہ ولیم بھی وہیں موجود ہو۔ گذشتہ رات میں نے ایک خواب دیکھا تھا جس کی تعبیر میرے نزدیک یہ ہے کہ ہملوگ آپس میں ایک دوسرے سے ملیں گے اور خدا سے میری دعا ہے کہ میرا خواب سچا ہو۔ میں بولی کہ فال ہی لینا ٹھیری تو میں یہ توقع کیوں نہ رکھوں کہ میرے بھی دن اچھے آرہے ہیں۔ ولیم مجھکو ملجائے گا اور میں اسکے دیدار سے آنکھوں کو نور اور دلکو سرور پہونچا سکونگی۔ غرضکہ اس قسم کی باتیں کرکے ہملوگ ناموش ہوگئے کہ مبادا ہمارے خیالات سے دیگر لوگوں کو بھی اطلاع ہو جائے۔ اور تن بہ تقدیر اس انتظار میں میں لگ گئے کہ سیاہی شب کے پردہ سے ہمارے لئے کیا کچھ سامنے آنے والا ہے۔ ابھی ہماری اس قسم کی گفتگو کو ایک گھنٹہ بھی نہ گذرا ہوگا کہ وہی عورت جو ہمکو اس جگہ پہونچا گئی تھی آتی ہوئی نظر پڑی اسے دیکھتے ہی میں کھڑی ہوگئی اور اسکا ہاتھ پکڑ کر میں نے اس سے پوچھا کہ کہو تمکو کچھ محمد کی بھی خبر ہے کہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے؟ انگریزوں کے پاس جو عورتیں ملازم ہوتی ہیں وہ کسی قدر انگریزی الفاظ سیکھ لیتی ہیں جو متعلقہ کام کے بارے میں ادائے مطلب کیلئے انہیں مدد دیتے ہیں لیکن اگر کوئی مسلسل گفتگو کرتی ہوتی ہے یا کوئی ایسی بات

ہوتی ہے جس کا روزانہ کے کام کاج سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا تو انکے لئے ادائے مطلب ناممکن ہوجاتا ہے اسی بنا پر وہ الفاظ کے ذریعہ تو ادائے مطلب نہ کرسکی مگر اشارہ سے اُسنے بتایا کہ مفسدین نے محمد کو گرفتار کر کے قتل کردیا انسان بھی عجیب چیز ہے! ادبار کے زمانہ میں اُسے اقبال کے وقت سے زیادہ اپنا غم ہوتا ہے اسلئے انتہائی شرم وندامت کے ساتھ اس امر کا اظہار کرتی ہوں کہ مجھکو محمد کے مقتول ہونے کا اس سے زیادہ رنج نہیں ہوا کہ جتنا اس کے مرنے سے نقصان ہوا اس یار وفادار اور مخلص دوست نے حقوق خدمت و نمک کو مرتے دم تک جس طرح اس نے کہا تھا ادا کردیا اور صرف ہماری خاطر ہر موقع پر وہ اپنے آپ کو خطرات میں ڈالتا رہا یہاں تک کہ اسکا وقت پورا ہوگیا اور داعیٔ اجل کو لبیک کہتا ہوا وہ عالم آخرت کو سدھار گیا

مگر اب جبکہ وہ پیوند خاک ہوچکا رنج وافسوس سے کوئی فائدہ نہیں۔ اسی دوران میں وہ عورت اپنے چاروں طرف نظر ڈالتی رہی اور ہمکو اشارہ سے بتایا کہ اسکے ساتھ ہم بھی یہاں سے ایک لمحہ انتظار کئے بغیر نکل کھڑے ہوں۔ ہم اسکے کہنے کے مطابق نکلے اور ان تنگ وتاریک گلیوں کے دروازہ کو طے کرکے شارع عام پر پہونچ گئے اپنے شرکا مجلس کو چھوڑنے کا مجکو بہت قلق ہوا مگر کیا کیا جائے موقع ہی کچھ اس قسم کا تھا کہ ساتھیوں کو خبر کرنا کسی طرح مناسب نہیں ہوسکتا تھا اسوقت ہماری حالت بعینہ اس کشتی کی سی ہورہی تھی جو متلاطم سمندر میں پڑی بہ رہی ہو۔ بادبان پارہ پارہ اور تختے شکستہ ہوچکے ہوں طوفان وقتاً فوقتاً بڑھ رہا ہو۔ پانی موجوں سے بھر بھر آتا ہو۔ ایک کمزور ولاچار ملاح اسکا نگراں ہو چاروں طرف سے زبردست دشمنوں کے نرغے میں ہو۔ ایسے وقت اور ایسی حالت میں اگر ایک ننھی سی ڈونگی پر نجات منحصر ہو جسمیں صرف تین آدمی بیٹھکر ممکن ہے کہ ساحل تک پہونچ جائیں تو کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص بھی انسانیت ومروت کا لحاظ وخیال کرکے شرکا کشتی کا انتظار کریگا نہیں اور ہرگز نہیں۔ ایسے وقت مسافروں کا فرض ہوگا کہ جس قدر انسے جلدی ہوسکتی ہے کریں اور جو سب سے آگے اور پیش پیش رہیگا وہی سب سے زیادہ عقلمند ہوگا۔ ہمارے ساتھیوں کو اگر اسوقت ہمارے ارادوں کی اطلاع ہوجاتی تو وہ ہمارے ارادوں میں مانع ہوتے اور ہماری سب تدبیریں خاک میں مل جاتیں۔

راستہ کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا سے ہماری جسم میں توانائی محسوس ہونے لگی اور چوپال کی گندگی اور غلیظ ہوائیں رہتے رہتے ہمارے حواس جو کسیقدر ماند ہوگئے تھے ان میں بھی دوبارہ زندگی کی لہر دوڑ گئی ہماری حالت اسوقت بالکل ایسی ہورہی تھی جیسے کسی مردہ کو قبر سے نکلکر اپنی اس حیات تازہ سے ایک خاص مسرت اور دلچسپی ہو۔ ہم لوگ اس عورت کے پیچھے چلتے چلتے ایک چھوٹے سے محل کے پاس پہونچے یہاں پہونچکر اس عورت نے الو کی بولی بولی جسکا جواب فوراً دوسری طرف سے ملا اور اسکے بعد ہی دیوار کی آڑ میں سے چار آدمی نکلے جو لمبے لمبے سفید کپڑوں میں ملبوس تھے چونکہ زمانہ کے سرد وگرم، تلخ وشیریں کو بدقسمتی کے زمانہ میں میں نے خوب تجربہ کیا ہے میرے اقوال وافعال سے اصول وقواعد اخذ کئے جاسکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ جس طرح انسان خوش قسمتی کے زمانہ میں

بہ انقلاب کی پیش بینی کر لیتا ہے اسی طرح کو رنجی و بد نصیبی
کے ایام میں بھی وقوع واقعہ سے قبل اس کا دل گواہی دینے
لگتا ہے۔ ہم لوگوں نے جوں ہی ان چاروں شخصوں کو دیکھا
تھا ایک قسم کی مسرت محسوس کرنے لگے تھے۔ پھر ان میں سے
ایک شخص سے الگ ہوکر ہماری طرف آیا اور جب بالکل
قریب آگیا تو ہماری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی وہ ولیم تھے
دل باغ باغ ہوگئے۔ ایلین دوڑ کر ولیم سے لپٹ گئی آنکھیں
ڈبڈبائی ہوئی تھیں اور دل اشتیاق کی وجہ سے امڈا
چلا آتا تھا اور کیوں نہ ہوتا ہم لوگ تو یہ سمجھ چکے تھے کہ بارود
خانہ کے ساتھ ولیم بھی جلکر خاکستر ہوگیا ہوگا۔ یا وہاں سے
بچا ہوگا تو مقتول ہوگیا ہوگا مگر اللہ کی شان کہ وہ جیتا جاگتا
تندرست و صحیح و سالم ہماری آنکھوں کے سامنے کھڑا
تھا غرضکہ اس مایوسی کے بعد اسکی ملاقات سے جو دلکو
مسرت و شادمانی ہوئی الفاظ اسکو ادا نہیں کرسکتے موقع
متصل گفتگو کا نہ تھا۔ ایلین ولیم کا ہاتھ پکڑکر آگے کو بڑھی
اسپر ولیم نے بھی کہا کہ جلدی جلدی چلو۔ ابھی مشکل ہم لوگ
ایک ہزار قدم چلے ہونگے کہ ایک خالی جگہ پر پہونچ گئے۔
یہاں پہونچکر ہمکو چار گھوڑے ملے چار سائیس لئے کھڑے
تھے۔ ولیم کے اشارہ سے ہم لوگ سوار ہولئے اور ان کی
لگام ڈھیلی کردی اور پیدلوں کو پیچھے چھوڑکر کلکتہ دروازہ
کا رخ کیا۔ دروازہ پر محافظ سے ملے جو ہندوستانی اور
ولیم کا دوست تھا۔ ولیم قبل ازیں اس سے ہم لوگوں کے
متعلق طے کرچکا تھا۔ ہمارے پہونچتے ہی اس نے دروازہ
کھولدیا اور ہم لوگ دروازہ سے باہر نکل گئے۔ مگر ہم ابھی
جمنا کی ایک شاخ کے آدھے پل کو بھی طے نہ کرپائے
ہونگے کہ پیچھے سے بندوقوں کی آوازیں آئیں اور ہم
سے ادھر ادھر گولیاں گریں ولیم نے کہا دربان نے ہم
لوگوں کو دروازہ سے باہر نکال تو دیا مگر خبث باطن اپنا
رنگ لائے بغیر نہ رہی اور گولیوں سے ہماری مشایعت
کی مگر خیر اللہ کی مہربانی سے ہمکو کوئی چشم زخم نہیں
پہونچا۔

راستہ میں ولیم نے ہم کو اجمالاً بتایا کہ بارودخانہ کے
اڑجانے کے بعد اسپر کیا کیا گزری اس نے کہا کہ جب وہ
بارودخانہ سے صحیح و سالم نکلا تو بڑی کوششوں کے بعد
جنرل کراؤ کی خندقوں میں جا ملا۔ جنرل کے پاس جو فوج
تھی وہ اسکی منتظر تھی کہ جنرل برنارڈ کے ماتحت انگریزی
کمک آجائے یہاں پہونچکر اسکو اطمینان ہوگیا۔ اور روزانہ
رات کے وقت نکل کر اس نے ہم لوگوں کی تلاش شروع
کی دو ہندوستانیوں کے ساتھ جو اسکے دوست تھے
بھیس بدلکر رات کو نکلتا تھا اور ادہر ادہر ڈھونڈھتا تھا مگر
اسکی تلاش و جستجو سب ناکام رہی اور یہ اسوقت کا قصہ ہے
جب ادہر ہم لوگ سائبان میں مقیم تھے جب اسکو ہماری
دھلی کی موجودگی سے مایوسی ہوگئی تو اس کے دل میں خدا
نے ڈالدیا کہ وہ ہمارے سابق مکان پر جائے۔ وہاں
گیا تو محمد کو سفر کا سامان کرتا ہوا پایا محمد کی زبانی ولیم کو یہ
بھی معلوم ہوا کہ ہم لوگ اسوقت کہاں ہیں۔ محمد کو سفر کی
تیاری میں مشغول دیکھکر ہمسایوں کو بھی اسکے ارادہ کی
اطلاع ہوگئی اور انھوں نے محتسب کو خبر کردی کہ یہ منافق
ہندوستانی ہوکر انگریزوں سے تعلقات رکھتا ہے اور
انکی امداد کرتا ہے اور اب خفیہ طور پر انکو دھلی سے باہر جانا

چاہتا ہے محتسب نے کسی سابق عداوت اور دشمنی یا الزام کے بغیر اچانک محمد کو گرفتار کر لیا اور وہیں گھر میں نیب کے درخت میں اسکو پھانسی پر لٹکا دیا جسکے سایہ سے ہمنے خوش قسمتی کے زمانہ میں مدتوں فائدہ اٹھایا تھا مگر آج وہ اس بے خطا و بے قصور ملزم کے لئے تختہ دار ثابت ہوا جس کی ذات واحد پر ہمارا تمام تر اعتماد اور بھروسہ تھا۔ کاش اگر ہمکو سوقت کوئی خوف وخطر نہ ہوتا تو اس آدمی پر جس نے ہماری خاطر اپنی جان دی جی کھولکر روتے۔ مگر مصائب و آلام کے ازدحام اور خوف و دہشت نے دل کی بھڑاس نہ نکالنے دی اور حقیقت تو یہ ہے کہ ایسے وقت میں مرے ہوؤں پر نہیں زندوں پر رونے کا کام ہے۔

اس موقع پر ہم عورتوں کی اس فطری کمزوری کا ذکر بھی ضرور ہے جو بنات حوا کو ماں سے ورثہ میں ملی ہے یعنی حسد! حسد مجکو اس بات پر ہوا کہ میری اپنی بچی ایلین اور اسکا شوہر ولیم ساتھ ساتھ چلنے لگے اور ہر قدم پر ذرا سے موقع سے نیا لطف اٹھانے لگے۔ ایلین کی ایسے موقع پر خوشی و مسرت کی کوئی حد و انتہا نہ تھی۔ وہ انتہائی انہماک کے ساتھ اپنے حتی المقدور ان تکلیفوں اور مصائب کا ذکر کر رہی تھی جو ولیم کے پس غیبت ہمکو برداشت کرنی پڑی تھیں اس غیر مترقبہ ملاقات سے دونوں بے انتہا خوش تھے اور راز و نیاز کی گفتگو میں مشغول تھے اور ہم دونوں سے غافل تھے اگر کبھی ولیم کو میں کسی معاملہ میں اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتی تھی تو وہ بہت کم توجہ دیتا تھا کیونکہ وہ اسوقت اپنے خیالات میں مگن اور اپنے لطف و سرور سے مسرور و مدہوش ہو رہا تھا۔ ولیم کی یہ کیفیت دیکھکر میرے سینہ میں آتش حسد مشتعل ہوگئی اور میں نے اپنے جی میں کہا کاش میں ہندستہ کے ہاتھوں مقتول ہوگئی ہوتی کہ ایلین کے ساتھ ولیم کے اس شغف کو نہ دیکھ سکتی۔ میرے لئے خود میرے غم کیا تھوڑے ہیں کہ یہ اور صدمہ برداشت کرنا پڑا

اٹھارھواں باب

شعاع امید

ان جذبات سے متاثر ہوکر میں نے آگے بڑھکر ولیم کا ہاتھ پکڑ کر غصہ میں زور سے کھینچا جسکو اس نے کسی قدر محسوس بھی کیا اور میں نے اس سے پوچھا کہ تمکو میرے بچہ اور اس کی انا کی بھی کچھ خبر ہے۔ مگر ولیم نے اس کا ایسا جواب دیا جس نے میرے کشت امید کو از سر نو سرسبز اور میرے افسردہ طبیعت کو ہشاش و بشاش کر دیا اس کا دل خوش کن جواب سنکر میرا سارا غم و غصہ جاتا رہا اور یہ امید ہوئی کہ میرے خوش قسمتی کا زمانہ بھی عنقریب ہے اور اس خیال نے مجکو اسقدر مسرور و شادماں کر دیا کہ میرا دل چاہتا تھا کہ اس کے پاؤں چوم لوں۔

ولیم نے کہا کہ آپ کا بچہ ویل اور اسکی انا دونوں صحیح و سالم اور تندرست ہیں آپکے پرانے مکان میں مقیم ہیں آپکا انتظار کر رہے ہیں۔ ولیم کی زبان سے یہ خبر سنکر میں اپنے سارے مصائب و آلام بھول گئی۔ بدن میں طاقت محسوس ہونے لگی۔ اور جی ہی جی میں اپنے آپ کو برا بھلا کہنے لگی کہ ولیم کے ساتھ میں نے ایسی بدگمانی اور حسد کیوں کیا خدا سے توبہ کی اور خوشی کے مارے گھوڑے کو ذرا تیز

لڑکے چلی۔ سب سے پہلے پہونچا۔ اپنے پیار کے دیدار سے آنکھوں کو نور اور دل کو سرور پہونچا سکوں۔ پہنچتے پہنچتے گھر کے قریب پہونچ گئی۔ گھر کی عمارت تو دور ہی سے نظر آ رہی تھی عالیشان تھی مگر اسوقت وہاں ان ہی کے ڈھیروں کے سوا کچھ اور کچھ نہ ملا۔ آہ وہ گھر جو کسی وقت راحت و آرام کا گہوارہ اور عیش و نعمت اور دولت و ثروت کا خزانہ تھا آج وہی گھر زمانے کے ہاتھوں کھنڈر اور اسکی تمام عمارت مٹی کا ڈھیر ہو چکی تھی۔

چلتے چلتے جب گھوڑا پتھروں سے ٹھوکر کھاتا تھا تو میرے دل پر اور صدمہ گذرتا تھا۔ رات اچھی طرح بھیگ چکی تھی۔ ویل سے ملاقات کا اشتیاق تو اپنی جگہ ابھارتا تھا کہ جس طرح ہو سکے اس تک پہونچوں مگر گھر کی یہ ویرانی و تباہی کہتی تھی کہ اس حالت کو میں نہ دیکھوں غرضکہ اسی ادھیڑ بن میں ادھر سے اُدھر ٹاپک ٹوئیاں مارتی پھرتی تھی کہ کہیں سے کوئی رستہ اندر تک پہونچنے کا مل سکے مگر نہ کہیں کوئی روشنی تھی نہ کسی ذی روح کی موجودگی کا پتہ چلتا تھا۔ اس حالت میں مجھے وحشت ہونے لگی اور رات کی تاریکی نے اسمیں اور اضافہ کیا۔ آنکھوں کو خوب ملکر اِدھر اُدھر دیکھا کہ شاید کوئی علامت معلوم ہو مگر ناکامی ہوئی۔ کانوں سے کام لینا چاہا کہ شاید اس طرح کسی انسان کی موجودگی کا پتہ چلے مگر کیڑے مکوڑوں کی آواز کے سوا اور کچھ سنائی نہ دیا۔ سب طرف سے مایوس ہو کر میں جہاں کی تہاں کھڑی کی کھڑی رہ گئی کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں اپنے جگر پارہ تک کیوں کر پہونچوں۔ میں اسی حال میں ساکت و صامت مبہوت کھڑی تھی کہ ایلن کے ابا اور ولیم بھی آگئے اور گھوڑوں سے اتر پڑے۔ میں بھی اتر پڑی اور گھوڑوں کو باندھ دیا۔ پھر میں اور ولیم، ایلن اور اسکے ابا سے آگے ہو لئے۔ ولیم رہنمائی کر رہا تھا۔ اگر گھر اپنی معمولی حالت میں ہوتا تو بہت جلد پہونچ جاتے مگر اسوقت تو گھر کی حالت ہی کچھ اور ہو رہی تھی کہ کوئی دیوار یا چھت باقی رہی تھی اور نہ کوئی ایسی علامت باقی تھی جس سے گھر کی اصلی حالت کا اندازہ کیا جا سکتا صرف سیب کا درخت باقی تھا مگر اسکی بھی ٹہنیاں ٹوٹ پھوٹ کر اور پتے جھڑ جھڑ کر گھر میں پھیلے پڑے تھے۔ اس خوف سے کہ مبادا ہمسایہ کے ہندوستانی ہماری آہٹ پالیں ہم لوگ چلنے میں نہایت احتیاط سے اور سانس بھی بہت روک روک کر لے رہے تھے۔

اس ڈر سے کہ کہیں کسی گڑھے یا کنویں میں نہ گر پڑیں ایک نے دوسرے کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ اس حالت سے چلتے چلتے آخر مکان کے وسط میں پہونچ گئے۔ مگر یہاں ہوا کی سرسراہٹ پتوں کی کھڑکھڑاہٹ اور حشرات الارض کی چرچراہٹ کے سوا اور کوئی آواز نہ سنائی دی دور کچھ کتے بھونک رہے تھے۔ لیکن جب ہم لوگ سیب کے درخت کے قریب پہونچے کراہ کی سی آواز آئی، اس سے ہماری وحشتوں میں اور اضافہ ہو گیا خصوصاً میری کیونکہ اوروں کی بہ نسبت میں پہلے ہی سے زیادہ خوف زدہ ہو رہی تھی۔ ایلن کے ابا اور ولیم نے اپنے اپنے پستول سنبھال لئے اور مستعد ہو گئے کہ اگر ضرورت پڑے تو ان سے کام لیں۔ یہ کراہ کی آواز ایک بہت بڑے جسم میں سے آ رہی تھی۔ پھر ہمکو ایک بڑی سی چیز اپنی طرف آہستہ آہستہ آتی ہوئی

نظر پڑی اور آتے آتے ہم سے پانچ قدم کے فاصلہ پر رک
گئی۔ ولیم نے اس پر زور سے کہا کہ ڈرنے کی بات نہیں
یہ تو ہمارا ہاتھی ہے ہمارے استقبال کیلئے آتا ہے اور
ہماری ملاقات کے اشتیاق اور محمد کی موت پر رو رہا ہے
پھر ہاتھی ہم سے قریب آگیا اور ایک ایک کو اپنی سونڈ
سے اس نے سلام کیا ایلن کے ابا نے اسکو پیار کیا سونڈ
پر ہاتھ پھیرا اور اس سے کہا کہ یہاں کیا کرتا ہے۔ یہ سنتے ہی
وہ ہم سے الگ ہو گیا اور اپنے بدن کو نیچے کے درخت سے
رگڑنے لگا اور سونڈ سے ادہر کو اشارہ کرتا تھا جہاں محمد کی
لاش لٹک رہی تھی۔ چونکہ اسکو محمد سے بڑی محبت تھی اور
اپنی آنکھوں سے اسکو پھانسی چڑھتے دیکھا تھا اسلئے وہیں
رنج وغم کرتا ہوا پڑا رہتا تھا کہ محمد کی لاش کو درندے نہ کھانے
پائیں۔ ہاتھی کی تعریف میں بہت کچھ کہہ چکی اور اتنا اور
کہونگی کہ اپنے اسقدر بڑے ڈیل ڈول کے ساتھ اسکی سمجھ
بھی اسکے جسم کے مناسب ہے اور دیگر جانوروں سے قوت تمیز
بھی بہت زیادہ ہے بھلائی اور برائی کو جانتا ہے۔ محبت
و دشمنی کو پہچانتا ہے اور سختی و نرمی کو کبھی نہیں بھولتا
ہندوستان میں ہم نے اسکو کچھ اوپر دو ہزار روپیہ میں
خریدا تھا ہمارے پاس کئی سال رہا مفسدین نے محمد کو
قتل کر کے چاہا کہ اسکو گرفتار کر لیں مگر کامیاب نہیں ہوئے
کیونکہ دن کے وقت وہ جنگل جھاڑیوں میں چلا جاتا تھا اور
رات کو آکر اپنے پرانے خادم کی لاش پر پہرا دیتا تھا۔ غرضکہ
اس درخت کی نشانی سے گھر میں داخل ہونے کا رستہ
معلوم ہو گیا۔ ولیم نے جو لوگ اس کے ساتھ پیدل آئے
تھے انکو کہہ دیا تھا کہ گھر کے چاروں طرف پہرا دیں اور آپ
سیٹی بجائی۔ سیٹی کو بمشکل چار پانچ منٹ ہوئے ہونگے
کہ سرداب کے اندر سے ایک چراغ نظر پڑا۔ ہم لوگ اس
ٹمٹماتی روشنی کی طرف بڑھے۔ ناظرین کو یہ بات اپنے
ذہن میں رکھنی چاہیے کہ میرا مقصد صرف یہ تھا کہ میرا بچہ
مجکو مل جائے۔ امید! تو بہت بڑے چیز ہے سرداب میں
پہونچتے ہی میں نے دیکھا کہ میرا بچہ ایک کونے میں پڑا
سو رہا ہے یہ دیکھتے ہی میں بے تحاشا اسکی طرف دوڑی
اور شدت شوق سے میرا جی چاہتا تھا کہ باز کی طرح اسپر
ٹوٹ پڑوں۔ میں نے اسکو جگانا چاہا تو اسکی انا نے کہا کہ جلدی
نہ کرو اسے آرام سے سونے دو اور پریشان نہ کرو۔ میں
اسکے پاس بیٹھ گئی اور اسکا گدگدا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر
چومنے لگی اور کہہ رہی تھی بیٹا! کہاں گئے تھے بہت دیر
میں واپس آئے کہاں تھے اور کیسے رہے۔ تیرے مکھڑے
کو دیکھکر میرے دل کی گھٹائیں سب چھٹ گئیں ڈیل کو
دیکھکر میری تمام رنج و تکلیف دور ہو گئی میرے دل کو اسکی
ایسی لو لگی تھی جیسے خشک تپتی ہوئی زمین کو پانی کی ہوتی ہے
اگر میں مسرت و شادمانی کا ذکر کرنا چاہوں تو زبان میں نہ
اتنی طاقت ہے نہ وقت میں اسقدر گنجایش بہرحال مجکو ابھی
کچھ بہت زیادہ دیر اس حال میں نہ گذری ہوگی کہ انہوں نے
کہا کہ ہم لوگ ہندوستانی بھیس بدل لیں۔ ڈیل کی انا
نے ہمکو بتایا کہ جب ہم لوگ ابتدائی شورش میں بچ کے مکان
میں چھپے تھے تو وہاں موقع کی حالت کا اندازہ کرتے ہوئے
مجکو یقین ہو گیا تھا کہ وہاں سے ہم لوگ سلامت نہ نکل
سکو گے۔ میں نے اپنے جی میں کہا اس بچہ کے لئے میں نے
بھی بہت مصیبتیں جھیلی ہیں اپنی چھاتی سے لگائے لگائے

پھڑکتا ہوں اس لیے میرے دل نے اسکو گوارا نہ کیا کہ میں اسکو وہاں چھوڑ دیتی میں چھپکر وہاں سے نکل کھڑی ہوئی اور اس گھر کے ارادہ سے چلی۔ تمہارے داماد کو میں نے اپنے یہاں ہونے کی اطلاع کردی تاکہ تم کو اس سے اطلاع ہو جائے اور میں تم کو تمہاری امانت حوالہ کردوں اب میں تمکو تمہاری امانت حوالہ کرتی ہوں اور میرے لئے یہی خوش نصیبی کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھکو اس خدمت کی توفیق رحمت فرمائی۔

ہم لوگوں نے ہندوستانی کپڑے پہن لیے اور چہروں اور ہاتھ پاؤں میں ایک پیلا سا رنگ پوت لیا جو ہندوستانیوں کے رنگ سے ملتا جلتا تھا۔ اپنے ساتھ حسب ضرورت کپڑا لیا اور کھانے پینے کا سامان لے لیا جو محمد نے ایک وقت سے قبل ہمارے لئے جمع کیا تھا۔ اور ایک گھوڑے پر سب سامان لاد دیا۔ سمندر کے مسافروں کی طرح کہ جب جہاز لنگر اٹھا دیتا ہے تو انکی سب طرف سے امید منقطع ہو کر صرف ملاح اور ناخدا سے وابستہ ہوتی ہے ہم نے اپنے تمام سیاہ و سفید کا ذمہ دار اور مختار کل ولیم کو بنا دیا اور اسکے احکام کا اپنے آپ کو پابند کرلیا۔ مگر جب سب سامان درست ہوگیا اور گھوڑے سامنے آئے تو اس نے سامنے آکر کہا کہ بس اب آپ لوگ سوار ہوں اور جلد از جلد راستہ کو طے کریں دہلی سے پانچ کوس نکل کر جمنا کے کنارے پہونچ جاؤگے۔ وہاں ایک بہت گھنا جنگل ہے۔ اسمیں گھسکر دیا سلائی جلانا۔ اس پہچان سے وہاں آپکو ایک ملاح ملے گا جسے میں نے اس پر راضی کر لیا ہے کہ وہ آپ لوگوں کو اور آپکے سامان کو کشتی میں آگرہ تک پہونچاویگا خدا سے میری دعا ہے کہ وہ آپ لوگوں کی قیام و سفر دونوں حالتوں میں نگرانی و حفاظت کرے اور میں مفسدین سے لڑنے کے لئے جا رہا ہوں جب تک میری جان میں جان ہے انگلستان اور انگلستان کے جھنڈے کی دہلی میں عزت اور اپنے فوجی ناموس کی خاطر لڑونگا۔

(باقی آیندہ)



ہمارا لباس

(از سعید بریلوی)

ہمیں اب یاد ہو یا نہ ہو اور اس کے خیال سے خواہ ہمیں آج کتنی ہی شرم کیوں نہ آئے لیکن یہ واقعہ ہے کہ شروع شروع میں جب ہم اس دنیا میں آئے یا کشاں کشاں لائے گئے تھے تو اس دنیا کی دوسری مخلوق کی طرح ہمارے جسم بھی صرف اسی قدرتی لباس سے ڈھکے ہوئے تھے کہ جو الٹے اور سیدھے کے تکلفات سے بری ہے اور جس میں ایک مسام دار جلد اور تھوڑے سے چمکدار بال داخل ہیں بلمتیں اور لیتھے اور فلالینیں اور سرجیں سب ہماری اپنی ایجادیں ہیں اور ان ایجادات کی عمر جہاں تک ہمیں معلوم ہے میں ہزار سال سے زیادہ نہیں ہے شرم و حیا کے پتلے انسان کو آج اس خیال سے بھی شرم آتی ہے کہ کسی زمانہ میں اسکے آباؤ اجداد بلا ذرا سی بھی جھجک اور شرم کے ننگے مادر زاد بکریوں اور ہرنوں کے پیچھے جنگلوں میں مارے مارے پھرا کرتے تھے اور عورتیں ہوں یا مرد کسی کو بھی کبھی اتنا خیال نہ آتا تھا کہ اور کچھ نہیں تو کپڑے سے ستر تو چھپا لیں۔

ہزارہا سال ایسی حالت اور ایسی صورت پر گذار چکنے کے بعد جب انسان نے اپنی عقل اور اپنے جذبات کے لحاظ سے کچھ ترقی کی تو اسے اس طرح ننگے پھرنے سے کسی قدر شرم سی محسوس ہوئی اور اس کی عقل نے اسے بتایا کہ درختوں کے بڑے بڑے پتے اگر آگے اور پیچھے باندھ لئے جائیں تو جسم کے نادیدنی اور پوشیدنی حصے چھپ سکتے ہیں اور چونکہ عورتوں کی فطرت میں حیا کا مادہ مردوں کی بہ نسبت زیادہ تھا اس لئے ابتدا انہی نے کی اور اپنے جسم کے بعض حصوں کو پتوں سے ڈھکنا شروع کر دیا ایک مدت دراز تک درختوں کے پتے ہمارے لباس کا کام دیتے رہے اور پوشاک کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ اس سے جسم کے پوشیدنی اعضا کو چھپا لیا جائے۔

جو حصہ ہائے جسم اس طرح ہر وقت پتوں سے ڈھکے رہتے تھے وہ موسمی سردی اور گرمی کے اثرات سے بھی نسبتاً بہت کچھ محفوظ ہو جاتے تھے اس لئے انسانی عقل نے اب یہ بھید بھی معلوم کر لیا کہ سردی اور گرمی سے بچنے اور بارش کے وقت مینہ سے محفوظ رہنے کیلئے بھی درختوں کے پتے ایک بہت کارآمد چیز ہیں۔ اب یہ کوشش شروع

بدوی زمانہ میں ... سے کسی قسم کی ... امتیاز نہیں تھا سے لے تو بر وقت جسم ... ڈھکے اور ... جا ... ان کی وجہ سے کوئی ... فن جمالی کی طرف انسان کا ... ملک ... محلہ

ابتدائی زمانہ سے مردوں اور عورتوں کے کاموں کی تقسیم رہی ہی ہے کہ مرد تو دن بھر تلاش معاش میں مارے مارے پھریں اور عورتیں اپنے گھروں کو سنبھالیں اور ... تقسیم عمل کی وجہ سے عورتوں کو اس بات کا موقع بہت زیادہ ملتا تھا کہ دنیا کی چیزوں کا بغور مطالعہ کیا کریں اور ہر چیز کے متعلق غور و فکر سے تجربے کرکے یہ معلوم کرتی رہیں کہ وہ کس طریقے پر انکے لیے کار آمد ہو سکتی ہے ابتدائی تجربوں کے دوران میں عورتوں نے گھاس کی پتیوں اور پیڑ پودوں کی شاخوں کو آپس میں بننا سیکھا اور گھاس سے کپڑا اور شاخوں سے ٹوکریاں بنانے لگیں۔ بات میں سے بات نکلتی چلی آیا کرتی ہے گھاس کے بعد جانوروں کے بالوں کی طرف خیال گیا اور چند ہی روز میں عورتوں نے اون اور اون کے کمبل بنانے کا فن ایجاد کر لیا مرد بھی ایجاد کی دنیا میں عورتوں سے کچھ بہت پیچھے نہ رہے اور انھوں نے جانوروں کی کھالوں کو جیسے بھی بنا صاف کرکے اس قابل بنا لیا کہ انتہائی سردی کے وقت انکی مدد سے اپنے جسم کو گرم رکھ سکیں روئی کی دریافت اور ریشم اور روئی سے کپڑے تیار کرنا بہت بعد کی ایجادیں ہیں

ان تمام تفصیلات سے یہ امر اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ لباس کے فی الحقیقت دو ہی کام تھے ایک یہ کہ ہمارے جسم کے ایسے حصوں کو کہ جنھیں ہم دوسروں کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں چھپانا اور دوسرے سردی اور گرمی کے اثرات سے ہمارے جسموں کو محفوظ رکھنا۔ شیخی اور غرور کے پتلے انسان نے اسی لباس سے ایک اور کام بھی لینا شروع کردیا۔ اور وہ اپنی دولتمندی اور حسن کی نمائش تھی۔ جبر و استبداد کے ذریعہ سے حاصل کی ہوئی دولت اور غریب کسانوں اور مزدوروں کا خون چوس چوس کر جمع کیا ہوا روپیہ اب اس کام آئیگا کہ اس سے زربفت اور کمخواب کے تھان کے تھان اپنے بدن پر لپیٹ لئے جائیں اور اس طرح دوسروں کے دلوں پر اپنا رعب اور اپنا وقار قائم کیا جائے، عورتوں نے خاص طور پر لباس کو نمود حسن کا ایک بہترین ذریعہ بنا لیا اور نئی نئی وضع و تراش کے ذریعہ اپنے ... خوبیاں ... کہ جو ایک جھلک بھی دیکھ پائے وہ دیکھتا کا دیکھتا رہ جائے۔ آہستہ آہستہ لباس کا مقصد اعلیٰ یعنی ستر پوشی اور موسم کی سختیوں سے تحفظ اگر بالکل مفقود نہیں بھی ہوا ہو تو اس کی حیثیت ثانوی ضرور رہ گئی ہے اور آج مہذب دنیا میں پوشاک کی غرض اصلی یا نمود تمول ہے یا نمود حسن اور اگر اس چیز کو پیش نظر رکھا جائے کہ اپنے آپکو مہذب کہنے والی دنیا کی صنف لطیف سخت سے سخت سردی کے موسم میں بھی اپنے سینہ و بازو یا آئینہ زانو کو پوشیدہ رکھنا پسند نہیں کرتی تو ماننا پڑے گا کہ انکے نزدیک پوشش و لباس کا نمود حسن کے سوا کوئی اور مقصد ہے ہی نہیں

دوشیزگان مغرب کی یہ عریانیاں اور ملبوسات جسمی میں ان کی یہ تخفیف خواہ کتنی ہی نظر فریب اور دلآویز کیوں نہ ہو پھر بھی طبی نقطۂ نگاہ سے اسے پسندیدہ نہیں کہا جاسکتا اور نظر بازوں کے دل کو خواہ کتنا ہی صدمہ کیوں نہ پہونچے پھر بھی طب کا فیصلہ یہی ہوگا کہ لباس کا مقصد اولین اپنی حفاظت جسم ہے نہ کہ نمائش حسن اور اسی بنا پر لباس کے متعلق حفظان صحت کے اصول جو پابندیاں عائد کرتے ہیں ان سے کسی طرح چشم پوشی نہیں کی جاسکتی۔

مغرب کی عریاں پسندیوں پر ہم اگر ہنسنا چاہتے ہیں تو ہنس سکتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ پوشاک کے متعلق ہمارے مقاصد اور ہمارا نصب العین بھی تبدیل ہو چکا ہے اور آج ہم بھی جس قسم اور جس وضع

کے کپڑے پہنتے ہیں انہیں بھی طب ناک بھوں چڑھائے بغیر نہیں دیکھ سکتی. نمود حسن کے ذوق نے یہ ضرور ہے کہ ابھی تک ہماری صنف نازک کو عریانی یا نیم برہنگی پر مائل نہیں کیا ہے لیکن اس حقیقت سے کسی طرح انکار نہیں ہو سکتا کہ کپڑے پہننے کا مقصد اب ہمارا بھی نمود نمائش کے علاوہ شاید ہی کچھ اور ہو. حفظان صحت کے اصولوں سے ناواقفیت ہمیں افراط و تفریط دونوں کا مرتکب بنا دیتی ہے اور روز دن ایسی مثالیں دیکھنے میں آتی رہتی ہیں کہ لوگوں کے جسم پر یا تو موسم کے لحاظ سے ناکافی لباس ہے یا ضرورت سے بدرجہا زائد اور موسمی ضرورتوں کے لحاظ ناموزوں اور نامناسب لباس تو تقریباً ہر شخص کے جسم پر نظر آجاتا ہے۔

ہندوستان کا بیشتر حصہ منطقہ حارہ میں واقع ہے اس لئے اس کا شمار گرم ملکوں میں کیا جاتا ہے لیکن ایک گرم ملک ہونے کے باوجود اسمیں یہ کیفیت موجود ہے کہ وہی قطعات زمین جو گرمیوں میں جلتے توے کی طرح تپ رہے تھے سردی آتے ہی ایک دم سے بالکل سرد ہو جاتے ہیں اور شمالی ہندوستان کے اکثر مقامات پر تو برف جمنے لگتی ہے۔ دوسرے ملکوں میں بھی موسم بدلتے ہیں لیکن انمیں باہم اتنا زیادہ فرق نہیں ہوتا. کہ ایک موسم کے کپڑے دوسرے موسم میں پہنے ہی نہ جا سکیں یا ناکافی ثابت ہوں. ٹھنڈے ملکوں میں لوگ، وہی جاڑوں کے اونی کپڑے بلا تکلف گرمیوں میں بھی پہنتے رہتے ہیں اور ان سے کوئی تکلیف نہیں ہوتی. سخت گرم ملکوں میں کہ جو خط استوا کے بالکل قریب واقع ہیں بعض قومیں تو ابھی تک ایسی آباد ہیں کہ جو دامان و گریبان کے جھگڑوں سے کوئی واسطہ ہی نہیں رکھتیں اور باقیماندہ جو تہذیب سے کسی قدر آشنا ہو چکی ہیں انکے لباس میں بھی اکثر ایک تہمد ایک کرتہ اور ایک چادر کے سوا کچھ نہیں ہوتا جسے وہ ہر موسم میں یکساں استعمال کرتی رہتی ہیں۔ یہ گوناگونی اور یہ بوقلمونی ہندوستان ہی میں ہے۔

کہ اوپر گرمی آئی اور اودھر رضائی، لحاف، فرغل، لبادہ، پوستین اور جسپر سب اتار کر پھینک دیئے گئے اور اب جسے دیکھو تنزیب، ململ، نینسوک اور جالی کے کرتے پہنے پھر رہا ہے، اور اسی تبدیلی لباس میں صحت کی وہ تمام خرابیاں مضمر ہوتی ہیں کہ جنہیں تبدیلی موسم کی خرابیاں کہا جاتا ہے۔ گرمیوں میں نہیں صرف وہی کپڑے اچھے معلوم ہوتے ہیں کہ جو اس قدر باریک ہوں کہ ہمارے جسم سے حرارت کا جو اخراج ہر وقت ہوتا رہتا ہے اسے مدد ملتا رہے تاکہ ہمارا جسم اندر سے ٹھنڈا رہے اور درجہ حرارت اعتدال سے بڑھنے نہ پائے لیکن یہ باریک سوتی کپڑے جس طرح ہمارے جسم کی حرارت کو اندر سے باہر جانے میں حارج نہیں ہوتے اسی طرح بیرونی حرارت کو ہمارے جسم میں داخل ہونے سے بھی نہیں روک سکتے اور اگر فضا کا درجہ حرارت بہت اونچا ہو تو یہ بیرونی گرمی جسم میں داخل ہو کر ہماری حرارت غریزی کو بھی بڑھا دیتی ہے جس کا نام بخار ہے۔ دنیا میں جتنی بھی چیزیں ہیں، وہ دو قسم کی ہیں ایک وہ کہ جنکے اندر حرارت بہ آسانی گذر جاتی ہے جیسے لوہا تانبا وغیرہ اور دوسری وہ کہ جنکے اندر سے گذرنے میں حرارت کو سخت دشواری پیش آتی ہے جیسے لکڑی وغیرہ۔ اون بھی انہی چیزوں میں سے ہے کہ جن کے اندر سے حرارت نہیں گذر سکتی اس لئے گرمی کے موسم میں اگر جسم پر فلالین کی ایک قمیص موجود ہو تو بیرونی حرارت ایسی آسانی سے بدن میں داخل نہ ہو سکے گی اور اس طرح لو لگنے سے جسم کی بہت کچھ حفاظت ہو سکتی ہے۔

محنت و مشقت کرنے یا دوڑنے کے وقت ہمارے جسم میں حرارت بہت زیادہ پیدا اور بہت تیزی سے خارج ہوتی رہتی ہے اسی وقت پسینہ بھی بہت زیادہ آتا ہے اور جسم پر نمی موجود رہتی ہے. نمی کا یہ خاصہ ہے کہ جب وہ کسی سطح پر سے بخارات بنکر اڑتی ہے تو آس پاس کی تمام سطح کے اندر کی حرارت کو جذب کر لیتی ہے یہی وجہ ہے کہ ذرا سا بھی پانی ہمارے بدن پر کہیں لگا ہو تو اس جگہ سردی محسوس ہونے لگتی ہے۔

اب محنت و مشقت کے وقت ایک طرف تو خود جسم سے حرارت کا بکثرت اخراج ہوتا ہے اور دوسری طرف پسینہ اس حرارت کو نکالنے کیلئے جسم سے حرارت جذب کر لیتا ہے۔ اگر ذرا احتیاط نہ ہو تو سردی لگ جانے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں اور پیٹ اور سینہ کے اندر کے اعضا میں ورم پیدا ہو جاتا ہے۔ جسم پر اونی کپڑے کی موجودگی اور محنت سے فارغ ہوتے ہی مزید اونی کپڑوں سے جسم کو ڈھک لینا جسم کی اندرونی حرارت کو خارج ہونے سے روکتا ہے اس لئے ایسے موقعوں پر بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔

بیاہ برات کے موقعوں پر نمود و نمائش کا شوق اکثر عورتوں کو مجبور کر دیتا ہے کہ وہ بچوں کی صحت کی طرف سے بالکل بے پروا ہو جائیں اور عام طور پر یہ بات دیکھنے میں آتی ہے کہ سخت سردی کا موسم ہے اور شادی بیاہ کی محفل ہے عورتیں محض اس خوف سے کہ کہیں انکے ہاتھ گلے کے زیورات نہ چھپ جائیں ایک پاؤ یا ایک دو بچے اوڑھے بیٹھی رہتی ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ گھر پہونچتے پہونچتے انہیں کھانسی زکام بخار نمونیا وغیرہ کوئی نہ کوئی مرض ہو جاتا ہے اور اس کا باعث وہ بالعموم یہ بتایا کرتی ہیں کہ چاول نے نقصان کیا یا گھی میں چربی ملی ہوئی تھی اس سے کھانسی ہوگئی

ہمارے بچوں کے لباس بدقسمتی سے سب سے زیادہ اصلاح طلب ہیں عام طور پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ بچوں کے سر اور کانوں کو زیادہ سے زیادہ گرم رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے اور ان کے پیروں کو بالکل یا تقریبا بالکل ننگا چھوڑ دیا جاتا ہے حالانکہ ہونا یہ چاہئے تھا کہ سر کو ٹھنڈا اور پیروں کو گرم رکھا جاتا۔ ہمارے جسم کے جو اعضا دل سے دور ہیں انہیں گرم رکھنے کی سب سے زیادہ ضرورت ہے تاکہ ان میں خون اچھی طرح پہونچتا رہے اور ایسا نہ ہو کہ سردی کی وجہ سے خون کی رگیں اس قدر سکڑ جائیں کہ خون کا گذر ان میں محال ہو جائے۔ سر چونکہ دل سے بالکل قریب ہے اس لئے اس قسم کی احتیاط اس کے لئے قطعاً غیر ضروری ہے علاوہ بریں دماغ ایک بہت ہی نازک عضو ہے اور اس میں اگر تھوڑی سی بھی گرمی زیادہ ہو جائے تو اس کے لئے ناقابل برداشت ہو جاتی ہے اس لئے سردی کے موسم میں کئی کئی گرم ٹوپے سر پر اوڑھنے سے نقصان کے علاوہ کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا اور پاؤں چونکہ دل سے دور ہیں اس لئے انہیں کھلا رکھنا صدہا خرابیوں کا باعث بن سکتا ہے۔ ٹھنڈا سر اور گرم پاؤں اچھی صحت کی ضمانت ہیں اس لئے بچوں کے کپڑوں میں سب سے زیادہ لحاظ اسی بات کا رہنا چاہئے کہ انکے پاؤں کسی وقت سرد نہونے پائیں اور انکے سر ہر وقت ٹھنڈے رہیں۔

بچوں کی پوشش کے متعلق ایک دوسری غلطی عام طور پر یہ کی جاتی ہے کہ انہیں خوب چست اور تنگ کپڑے پہنائے جاتے ہیں چست کپڑے ممکن ہے کہ دیکھنے میں ڈھیلے ڈھالے کپڑوں کی بہ نسبت خوشنما معلوم ہوتے ہوں لیکن بچوں کے نشو و نما پر ان کا بہت بڑا اثر پڑتا ہے۔ ان کا ننھا سا جسم ہر وقت بڑھتا رہتا ہے اور اس کے بڑھنے کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہونی چاہئے۔ تنگ لباس انکے بدن کو مقید کر لیتا ہے اور آزادی سے بڑھنے اور نشو و نما پانے کا موقع نہیں دیتا اس لئے یہ بہت ہی ضروری ہے کہ انکے کپڑے بالکل ڈھیلے ڈھالے ہوں خواہ ظاہری خوشنمائی بالکل ہی جاتی رہے۔

ہماری آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ مدت العمر اپنی ٹانگیں ننگی رکھنے اور ایک دھوتی یا ایک تہمد باندھکر سخت سے سخت سردی کا موسم گذار دینے کا عادی ہے۔ اگر اس طرح ننگے پھرنے کا باعث مفلسی اور ناداری ہے تو مجبوری ہے لیکن بصورت دیگر

اسے ہرگز اچھا نہیں کہا جا سکتا۔ صاحب مقدرت لوگ اگر اس طرح بلا وجہ اپنے جسم کو بالخصوص جسم کے اس حصے کو کہ جو دل سے دور ہے ننگا رکھیں تو یہ یقیناً انکی غلطی ہے۔

بعض لوگ سردی کے موسم میں اپنے جسم پر زیادہ سے زیادہ مقدار روئی کی لاد لینے کے عادی ہوتے ہیں اور لبا اوقات انکی یہ کوشش انکی ظاہری ہیئت کو مضحکہ خیز بنا دیتی ہے۔ اوپر تلے تین چار اونی قمیصیں اور ان پر ایک چھوڑ دو دو روئی کی نیم آستینیاں اور پھر اس بار عظیم پر روئی کا کوٹ یا لبادہ لاد کر بھی انہیں چین نہیں پڑتا۔ اور ان تمام کپڑوں کے اوپر سے ایک خوب موٹی سی رزائی اوڑھ کر وہ اچھی خاصی روئی کی ایک گٹھری بنجاتے ہیں بیس پچیس سیر روئی جسم پر لاد لینے سے انہیں سردی سے کچھ پناہ مل جاتی ہو لیکن ان کا جسم ہوا کے صحت بخش اثرات سے بالکل محروم ہو جاتا ہے اور ہماری جلد کے مسامات کے ذریعہ سے جو ہوا ہمارے جسم میں داخل ہو کر ہمارے خون کو صاف کیا کرتی ہے اسے ان تہ در تہ کتانی اور پشمینی دیواروں کے اندر سے گذرنے کا کسی طرح موقع نہیں ملتا۔ ایک اونی قمیص ایک اونی سوئٹر یا روئی کی مرزائی۔ اور ان پر ایک اونی یا روئی کا کوٹ بالکل کافی کپڑے ہیں اور اگر ہم سست اور بیکار نہ پڑے رہیں بلکہ کام میں مصروف رہیں تو اتنے کپڑوں کی بھی ضرورت نہیں ہے۔

ہمارے لباس میں اور بھی بہت سی خرابیاں ہیں لیکن چونکہ انکا تعلق یا اقتصادیات سے ہے یا ہماری کاروباری حالت سے اس لئے اس مضمون میں ان کا ذکر مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ اس مضمون میں صرف انہی چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے کہ جنکا تعلق طب سے ہے آجکل اصلاحات کا دور دورہ ہے زندگی کے ہر شعبے میں ترقی اور اصلاح ہو رہی ہے اس لئے نامناسب نہ ہوگا۔ اگر ہمدردان قوم قومی لباس کی طرف بھی توجہ کریں۔ اور اچھی طرح غور و خوض کرنے کے بعد ایک ایسا لباس قوم کے لئے وضع کر دیں جو ہر لحاظ سے مناسب موزوں اور مفید ہو۔ لباس پر ہماری صحت ایک بہت بڑی حد تک منحصر ہے اس کی طرف سے تغافل برتنا قوم کی ہلاکت میں مدد دینا ہے ضرورت ہے کہ جلد سے جلد اس کی طرف توجہ کی جائے اور ان ہزاروں انسانوں کی جان بچائی جائے جو ہر سال صرف لباس کی خرابی کی بدولت نذر اجل ہوتے رہتے ہیں۔



استبداد اور مذہب

بسلسلہ اشاعت گذشتہ

(ترجمہ از جناب مولوی عبدالہادی خانصاحب شاہجہانپوری)

گذشتہ بیان میں اس امر کا اجمالی ذکر ہو چکا ہے کہ ہتبد لگئے ہتے ہیں لیکن یہ اجمالی بیان بھی اسوقت تک ناکمل ہے جبتک بعض ان مباحث پر خامہ فرسائی نہکیجائے جنکا گذشتہ بیان میں اشارتاً ذکر کیا جاچکا ہے۔

فرنگی سیاسی مصنفین میں سے اکثریت کی رائے یہ ہے کہ سیاسی استبداد دینی اور مذہبی استبداد ہی سے پیدا ہوا ہے تھوڑے سے افراد ایسے بھی ہیں جنکا خیال ہے کہ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ سیاسی استبداد مذہبی استبداد سے پیدا نہیں ہوا ہے تب بھی ہمیں کسی طرح شک نہیں ہے کہ دونوں کسی ایک تیسری چیز سے پیدا ہوئے ہیں، اور دونوں کو ایک دوسرے سے بہت قوی تعلق ہے یعنی ہر وقت انسان کو ذلیل کرنے کیلئے ایک کو دوسرے کی امداد و اعانت کی ضرورت ہے۔ دونوں کی یکسانی ظاہر ہے۔ ایک کی حکومت اگر دلوں پر ہے تو دوسرے کو اجسام پر تسلط اور تغلب

حاصل ہے۔ ہمارے خیال میں جہاں تک کہ متقدمین اولین کی تحریرات، توریت کے تاریخی حصہ اور ان رسائل کا تعلق ہے جو انجیل سے الحاق کئے گئے ہیں ان لوگوں کا خیال صحیح ہے۔ اور علی الاطلاق غلط ہے۔ اسی طرح انکا یہ خیال بھی غلط ہے کہ قرآن کریم نے ایک ایسے استبداد کی مثال پیش کی ہے جو سیاسی استبداد کا ممد و معاون ہے یا سیاسی استبداد سے خود اعانت حاصل کی ہے لیکن اس معاملہ میں ان لوگوں کو اسوجہ سے معذور رکھا جاسکتا ہے کہ یہ لوگ براہ راست قرآن کریم کے رموز و نکات لطائف و اشارات سے تو محض نابلد ہیں۔ انکے استدلال کا مبنی تمامتر مسلمانوں کی موجودہ حالت ہے کہ اسلامی استبداد پسند مذہب کی کس کس طرح آڑ لیا کرتے ہیں ان لوگوں کا مقولہ ہے کہ مذہبی کتابیں انسان کو ایک ایسی زبردست اور عظیم الشان طاقت سے خوفزدہ

عرفی ہیں جسکی حقیقت و ماہیت عقل بشری کے حدود وادراک سے بالا ہے۔ وہ ایک فوق الادراک قوت انسان کو دنیاوی زندگی میں بھی ہر قسم کی مصیبت اور تکلیف میں مبتلا کرسکتی ہے اور مرنے کے بعد دائمی یا طویل عذاب میں بھی ڈال سکتی ہے۔ اور یہ خوف حد درجہ شدید ہوتا ہے جس سے قویٰ مضمحل ہوجاتے ہیں اور عقل ماند پڑ جاتی ہے اسلئے ہر قسم کے توہمات میں انسان مبتلا ہوجاتا ہے۔ پھر یہ تعلیمات نجات کا دروازہ بتاتی ہیں جسکی دربانی انسان کے ذمہ ہے۔ وہ دربان راہب، پادری اور مشائخ ہیں اس دروازہ میں داخل ہونے کا ذریعہ یہ ہے کہ انسان قلب اور قالب سے انتہائی تعظیم کا اعتراف کرے۔ سب سے پہلے اپنی ذلت کا اعتراف اور اس قوت کی عزت کا احترام کرے۔ یا ان دربانوں کے سامنے چشم پوشی کا نذرانہ پیش کرے یا بیت المال سے ان لوگوں کا وظیفہ مقرر کرے۔ ان دربانوں میں سے بعض کے متعلق تو یہاں تک عقیدہ رکھنے کی توقع کیجاتی ہے کہ وہ روح کو بھی خدا کے دیدار سے باز رکھ سکتے ہیں اگر ان کو قبر تک جانے کا ٹیکس اور اقرار سے رہائی کا فدیہ نہ ادا کر دیا جائے۔

یہ لوگ کہتے ہیں کہ سیاسی مستبد اپنے استبداد کی بنیاد ایسی ہی باتوں پر قایم کرتے ہیں۔ کیونکہ سیاسی مستبد لوگوں کو زور و قوت سے مال و دولت کو چھین کر اس درجہ ذلیل و خوار اور اپنا مطیع و فرمانبردار اور اپنا آلہ کار بنا لیتے ہیں۔ جیسے آدمی بھی حیوانات غیر عاقلہ ہی کی ایک قسم ہیں اور ضروریات زندگی میں سے صرف اسقدر کی انکو حاجت ہے جس سے نوعی حفاظت ہوسکے

ان لوگوں کا خیال ہے کہ دینی اور سیاسی استبداد کی صورت اور نتائج کی یکسانی کا یہ اثر ہے کہ فرانس جیسے ملک میں پیرس سے باہر عمل میں دونوں اس طرح مشترک ہیں جیسے ایک دوسرے کے معاون ہوں اور روس جیسے ملک میں ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ ہیں جیسے قلم دوات کسی بدنصیب کی قسمت کا فیصلہ لکھنے کے لئے ضروری ہے۔

اس سے یہ لوگ ثابت کرتے ہیں کہ مذہبی اور سیاسی استبداد کے ہم شکل اور ہم صورت ہونے سے عوام کو، جنکی غالب اکثریت ہے، معبود برحق اور متسلط میں کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا کہ دونوں انکی فہم ناقص میں عزت و وقعت کے مستحق ہیں اور جوابدہی اور بازپرس سے بالا ہیں اسلئے انکو کبھی خیال بھی نہیں آتا کہ مستبد سے بازپرس کا انکو کوئی حق حاصل ہو۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھو کہ عوام بہت سے حالات میں نام میں اور صفات میں معبود برحق اور جابر میں ایک اشتراک پاتے ہیں۔ جو کچھ وہ ہیں ظاہر ہیں ان کے لئے یہ ناممکن ہوجاتا ہے کہ وہ فعال مطلق اور حاکم خود رائے، جوابدہی سے برتر و بالاتر اور غیر جواب دہ، منعم حقیقی اور ولی نعمت جل شانہ اور جلیل الشان کے درمیان کوئی امتیاز اور فرق قایم کرسکیں۔ اسلئے عوام اپنے اوپر مسلط اور غالب جابرین کی بھی وہی عزت و تعظیم کرنے لگ جاتے ہیں جو صرف خدا کی شان تھی۔

انہیں حالات نے گذشتہ غیر مہذب اقوام کے مستبدین کو خدائی کا دعویٰ کرنے پر آمادہ کر دیا۔ پھر طبقی

جسکو صلاحیت نے اجازت دی تھی اس نے ہاتھ پاؤں نکالے۔ چنانچہ ایسا کوئی سیاسی مستبد نہ ہوگا جو اپنے لئے کسی قدسی صفت کو اختیار نہ کرے جس سے وہ خدا کا شریک یا اسکے متعلقین میں داخل ہو جاوے۔ کم از کم یہ صورت ہوگی کہ وہ مذہبی مستبدین میں سے بعض کو اپنا رازدار بنا لے تاکہ انکی امداد و معاونت سے وہ لوگوں پر مذہب کے نام سے ظلم و زیادتی کر سکے۔

ان لوگوں کے اس خیال کی دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ داؤد اور قسطنطین کے جانشینوں، فلپ ثانی شاہ ہسپانیہ، ہنری ہشتم شاہ انگلستان کا مذہب کی حمایت حفاظت کرنا حتی کہ ہنری ہشتم نے انگریزوں کی مذہبی مجالس بھی قایم کیں۔ یا فاطمی سلاطین مصر اور دیگر غیر عربی سلاطین کا اکثر صوفیوں، پیروں فقیروں کی مدد اور تکیہ جات اور خانقاہیں تعمیر کرنا یہ سب کچھ صرف اسلئے تھا کہ اس طرح مسکینوں پر دل کھولکر بلا کسی رُک ٹوک کے مظالم کئے جا سکیں۔

ان وجوہ سے ان لوگوں کا فیصلہ ہے کہ مذہبی اور سیاسی استبداد میں بہت قریبی تعلق ہے۔ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتا۔ جب کبھی ایک صورت پائی جائیگی دوسری صورت ضرور پائی جائیگی اور جب ایک صورت چلی جائیگی تو دوسری بھی معدوم ہو جائے گی اور ایک صورت کو ضعف آجائے گا یعنی اسکی کسیقدر اصلاح ہوجائے گی تو دوسری کی بھی خود بخود اصلاح ہو جائیگی اس کی مثالیں ہر وقت اور ہر ملک میں موجود ہیں جو یہ بھی ببانگ دہل بتاتی ہیں کہ مذہب کا اثر سیاست سے بہت زیادہ قوی ہے جسکی بہترین مثال یہ ہے کہ سکسونی اقوام جو عام طور پر پروٹسٹنٹ عقیدہ کی ہیں انکی اصلاح بہ نسبت کیتھولک عقائد کی پابند قوموں کے بہت زیادہ اور بہت جلد ہو سکی ہے۔ غرضکہ تمام سیاسی محققین کی یہ رائے ہے کہ دین اور سیاست ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ مذہبی اصلاح آسان بھی ہے اور سیاسی اصلاح کے لئے صحیح ترین صورت بھی ہے۔

ان لوگوں کا خیال ہے کہ خدائی میں اشتراک کا عقیدہ داخل کر کے سیاسی اصلاح کے مسئلہ کو سب سے اول یونانی حکماء نے حل کیا اور خود انہوں نے یہ عقیدہ اشوریوں سے اخذ کیا پھر اسمیں مصری توہمات کو شامل کر کے اس طرح پیش کیا کہ عدالت اور انصاف ایک خدا سے جنگ دوسرے سے، سمندر اور دریا تیسرے سے، بارش چوتھے سے متعلق کی اور اسی طرح ہر کام کا ایک الگ خدا فرض کر لیا اور خدائے خدایان کا کام یہ بتایا کہ وہ سب کی نگرانی کرتا ہے اور اگر کسی وقت ماتحت خداؤں میں اختلاف ہوتا ہے تو اپنے "کاسٹنگ ووٹ" سے کسی ایک کی رائے کو ترجیح دیتا ہے۔ اور اس طرح ان حکماء نے اپنے مستبد بادشاہوں کو سیاست میں اشتراک پر آمادہ کر دیا۔ پھر جب یہ عقیدہ آسانی سے سمجھ میں آجانے والی جادو بیانی کے ذریعہ لوگوں کے دلوں میں خوب مضبوطی سے قایم ہو گیا تو ان حکماء کے لئے بہت آسانی سے ممکن ہو گیا کہ لوگوں کو اب اسپر آمادہ کر دیں کہ وہ اپنے متسلط اور متغلب بادشاہوں کو انفرادیت کے بجائے اس امر پر مجبور کر دیں کہ دنیا کا انتظام بھی آسمانی انتظام کی طرح

فرد واحد کی بجائے جماعت کے متعلق ہو۔ اور بادشاہوں کو جبراً اور قہراً لوگوں کے اس مطالبہ کو تسلیم کرنا پڑا۔ ایتھنز اور سپارٹا کی جمہوریات کے قیام کا یہی سب سے بڑا باعث تھا۔ بعینہٖ یہی پر رومیوں نے عمل کیا۔ شاہی اور جمہوری حکومتوں کے شعبہ جات کی تقسیم کی یہ سب سے پرانی مثال ہے

مگر خدائی میں اشتراک کے اس عقیدہ سے جو فی نفسہ بھی ایک نہایت لغو اور باطل چیز ہے آخر میں ایسا ردعمل ظہور میں آیا جو سخت مضر تھا ہر جماعت کے ہر کس ناکس کو اپنے لئے کسی قدسی صفت اور روحانی تصرف کے دعویٰ کرنے کی جرأت ہو گئی جو صرف خدائے تعالےٰ کی ذات پاک سے مخصوص ہیں اس سے پہلے اس قسم کی جرأت بڑے بڑے جابروں اور متسلطین کے سوا کسی اور کو نہیں ہوتی تھی۔ اور چونکہ انسانی طبیعت کو اس خرابی کی بوجوہ بہت زیادہ مناسبت ہے، جسکی تفصیل کا یہ موقع نہیں، یہ خرابی اسقدر پھیلی کہ مستبدین کی اعانت کے لئے ایک جرار فوج تیار ہو گئی۔

تورات نازل ہوئی تو اس نے نہایت باقاعدگی اور جوش سے اسباط بنو اسرائیل میں سے اس اشتراک کے عقیدہ کو دور کردینا چاہا۔ مختلف خداؤں کو اس نے ملائکہ کہا لیکن بعض اسرائیلی بادشاہوں کو توحید پسند نہ آئی اور انھوں نے تورات کی تعلیمات کو مسخ کردیا پھر علم و برداشت کی تعلیم لیکر انجیل نازل ہوئی اور اس نے بھی عقیدہ توحید کی تائید کی مگر انجیل کے پہلے معلم ان غیر مہذب اقوام کو جو مہذب اور شائستہ اقوام کی بہ نسبت انجیل کی تعلیمات پر سب سے پہلے ایمان لائیں باپ بیٹے کا مسئلہ اچھی طرح ذہن نشین نہ کرا سکے کہ اسلامی مسئلہ تقدیر کی طرح اسکو عقل سے سمجھا نہیں جاسکتا بلکہ صرف تسلیم کرلینا چاہئے۔ ان اقوام نے باپ بیٹے کے حقیقی اور اصلی معنے لئے کیونکہ وہ لوگ اپنے بعض ظالم اور مستبد بادشاہوں کے متعلق ابن اللہ ہونے کے عقیدہ سے آشنا تھے۔ انکو یہ بات گراں گذری کہ عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام میں کسی ایسی صفت کو تسلیم کرلیں جو ان ظالم اور مستبد بادشاہوں کی صفت سے کمتر مرتبہ رکھتی ہو پھر تھوڑے ہی دنوں بعد جیسا کہ سابق ادیان کا حشر ہوا تھا عیسائیت نے بھی اپنا چولا بدل لیا اور پولس حکیم وغیرہ کے رسائل بھی انجیل میں داخل ہوگئے۔ اور یہاں تک نوبت پہونچ گئی کہ کاہنوں کو نائب خدا، معصوم اور شارع سمجھا جانے لگا۔ ان عقائد میں سے اکثر حصہ کو پروٹسٹنٹ یعنی اصلی انجیل کے پیرووں نے آخر کو ترک کردیا۔

پھر اسلام حکمت و عزم کے ساتھ آیا اور اس نے اشتراک کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا اور ایک ایسی سیاسی آزادی کے حصول کی حمایت کی جو دیمقراطی (ڈیماکریٹک (Democratic) وارسٹوقراطی (اریسٹوکریٹک (Aristocratic) آزادی کی درمیانی صورت ہے اس نے توحید کی بنیادوں کو مضبوط کیا اور خلفاء راشدین کی ایک ایسی حکومت قایم کی جس کی مثال دنیا کی تاریخ میں مفقود ہے۔ بلکہ خود مسلمانوں میں بھی حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ مہدی عباسی سلطان نورالدین زنگی شہید رحمہا اللہ وغیرہ چند نفوس کے علاوہ اس قسم کی مثالیں مفقود ہیں۔

ان خلفاء راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے چونکہ قرآن کو سمجھا تھا اسلئے اسی کے مطابق انھوں نے عمل کیا اور اسی کے احکام کو اپنا دستور العمل اور امام بنایا۔ یہی وجہ ہے انھوں نے ایک ایسی حکومت قائم کی جہاں کسی قسم کا کوئی امتیاز اور کوئی خصوصیت نہ تھی خود ان حضرات اور قوم کے کمترین فرد کے درمیان بھی ادنیٰ امتیاز نہ تھا خلیفہ وقت ادنیٰ رعایا کا بھی راحت میں برابر کا حصہ دار تھا۔ اور اپنے اس برتاؤ سے ان حضرات نے مسلمانوں کے درمیان کچھ ایسے برادرانہ جذبات، اجتماعی تعلقات اور مشترک معاشرتی حالات پیدا کر دیئے تھے جو ایک ماں اور ایک باپ کی آغوش شفقت میں تربیت پائے ہوئے دو بھائیوں میں بھی نہیں ہوتے۔

قرآن کریم خود استبداد کو مٹا دینے، مساوات اور عدل قائم کرنے کی تعلیمات سے بھرا ہوا ہے حتیٰ کہ قصص قرآنی بھی یہی تعلیم پیش کرتے ہیں۔

بلقیس ملکہ سبا اپنی قوم تبع کے اشراف کو مخاطب کرتی ہے یٰۤاَیُّهَا الْمَلَؤُا اَفْتُوْنِیْ فِیْۤ اَمْرِیْ الآیہ۔ اے لوگو مجھے میرے معاملہ میں بتاؤ۔ میں کسی امر کا اسوقت تک فیصلہ نہیں کرتی جب تک تم تصدیق نہ کرو (لوگوں نے) کہا ہم قوت والے اور سخت جنگ کرنے والے ہیں اور اختیار آپ کو ہے۔ غور کر لیجئے جو کچھ آپ حکم دینا چاہیں۔ (بلقیس نے) کہا بادشاہ جب کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو اسکو برباد کر دیتے ہیں معززین کو ذلیل کر دیتے ہیں اور اسی طرح کرتے ہیں

اس قصہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہوں کو ملا یعنی اشراف رعیت سے کیوں کر مشورہ لینا چاہئے کسی امر کا اُن کی رائے کے بغیر فیصلہ نہیں کرنا چاہئے۔ قوت و باس رعایا کے قبضہ میں محفوظ رکھی جائے۔ بادشاہوں کا کام صرف تنفیذ ہو۔ امر کی نسبت ان کی طرف کیجائے یعنی امیر کے معزز لفظ سے ان کو مخاطب کیا جائے مستبد بادشاہوں کی حالت کا اعلان کیا جائے کہ ان سے باز پرس اور جواب دہی کیجانی چاہئے۔

اسی طرح موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں مذکور ہے وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ الآیہ اور اشراف قوم فرعون نے ایک دوسرے سے کہا یہ تو بہت واقف کار جادوگر ہے وہ چاہتا ہے کہ تم کو تمہارے ملک سے نکال دے پھر تمہاری کیا رائے ہے (پھر جب انکی ایک رائے قرار پا گئی تو انھوں نے فرعون سے) کہا حضرت موسیٰ اور انکے بھائی کو بلاؤ اور لوگوں کو ملک بھر میں بھیجدو کہ وہ واقف کار جادوگروں کو جمع کرلائیں۔ پھر اُن میں کسی رائے پر اختلاف ہوا۔ اور انھوں نے خفیہ گفتگو کی بعینہٖ یہی آج دنیا کی نمایندہ مجالس میں ہوتا ہے کہ اگر کسی امر پر کھلے اجلاس میں بہت زیادہ اختلاف ہوتا ہے تو بند اجلاس ہوتا ہے۔

اس بنا پر ان آیات کے بعد اسلام پر استبداد کا الزام لگانا کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتا خصوصًا ایسے حال میں کہ ان آیات کی آیات احکام سے تفسیر بھی کردی گئی ہو اور صاف صراحت کے ساتھ بتا دیا گیا ہو کہ کیا مراد ہے۔ شَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ (ان سے معاملات میں مشورہ کر) وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَیْنَهُمْ (انکی شان آپس میں صلاح و مشورہ ہے) یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا

اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ
اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو اطاعت کرو اللہ کی اور اللہ کے رسول کی اور شان والوں یعنی علماء اور عائدین کی، پھر اس معنی کی ان آیات سے مزید تائید ہوتی۔ وَمَا اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِیْدٍ (اور امر فرعون کچھ اچھا نہیں ہے) حدیث میں ہے اَمِیْرِیْ مِنَ الْمَلٰئِکَۃِ جِبْرِیْلُ (میرا امیر یعنی مشورہ دینے والا فرشتوں میں سے جبریل ہیں)

اس بیان سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوگئی کہ اسلامیت جمہوری ادارہ اور مشورہ اشراف کے اصول پر قائم کی گئی ہے۔ نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم اور خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کا زمانہ ان اصول کے مطابق عملدرآمد کا بہترین اور کامل ترین نمونہ تھا خصوصاً اس معاملہ میں کہ دینی مسائل کے قیام کے سوا اسلامیت میں اور کسی قسم کا دینی نفوذ اور اثر نہیں تھا اسلام ایک نہایت سادہ، آسان اور آزادی سکھانے والا دین تھا۔ جس نے ہر قسم کے امتیاز، ہر نوع کی تفریق اور ہر صورت کے استبداد کو مٹایا تھا مگر جاہلوں نے قرآن کی مصلحتوں اور حکمتوں کو نظر انداز کرکے اسلام پر بہت سخت ظلم کیا۔ ایسے علماء اور دین کے ایسے خادم اس کی خدمت کرنے سے معذور رہ گئے جو اسکی حقیقت اور حکمت کو سمجھتے تھے نتیجہ یہ ہوا کہ مستبدین نے اس پر قبضہ کرلیا اور خواہشات نفسانی حاصل کرنیکی خاطر قوم میں تفریق اور تقسیم کے لئے انھوں نے اسکو آلہ کار بنالیا اسے بھی بگاڑ دیا اور اس میں بیجا سختیوں اور غیر اسلامی باتوں کو داخل کرکے قوم کو بھی برباد کردیا۔ اسلام کی بھی وہی حالت کردے جو سابق مذاہب کی ہوچکی تھی کہ ان تمام باتوں پر جنکو اسلام سمجھا جارہا ہے اور جنکے بارے میں خاص و عام دونوں کو تردد ہے کسی طرح عمل نہیں کیا جاسکتا اور کوئی شخص خواہ کتنا ہی مذہبی کیوں نہ ہو موجودہ اسلام پر پوری طرح عامل نہیں ہوسکتا۔

اسکا لازمی اثر یہ ہوا کہ ہر شخص اپنے آپ کو قاصر اور مجرم سمجھنے لگا اور یہ اعتقاد میں داخل ہوگیا کہ اس حالت سے نہ رسائی کی کوئی صورت ہے نہ نجات ہوسکتی ہے محاسبہ نفس کا کوئی امکان نہیں۔ ان عقائد اور خیالات سے انسان خود اپنی نظر میں ذلیل ہوجاتا ہے طبیعتیں بجھ جاتی ہیں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنیکی جسارت مفقود ہوجاتی ہے جس پر مذہب اور نظام وعدل کا مدار وانحصار ہے۔

اس نگرانی اور بازپرس میں سستی نے سلاطین اسلام کے لئے استبداد اور حدود سے تجاوز کے زیادہ سے زیادہ موقعے پیدا کردیئے۔ اور حضور روحی فداہ کی یہ پیشین گوئیاں پوری اتریں ھَلَکَ الْمُتَنَطِّعُوْنَ یعنی دین میں سختی کرنے والے ہلاک ہوئے اور لَتَاْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلَتَنْهَوُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ اَوْ لَيُسَلِّطَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ شِرَارَكُمْ فَلْيَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْءَ الْعَذَابِ (یا تو تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ضرور کرتے رہنا نہیں تو پھر تمہارے اوپر خدائے تعالیٰ تمہارے بروں کو مسلط کردیگا اور وہ پھر تمکو برے سے برا عذاب دیں گے)

بعض لوگوں نے چند ایسی باتوں کو جمع کیا ہے جو حقیقت میں اسلام کی باتیں نہیں ہیں بلکہ مسلمانوں نے اور قوموں سے سیکھکر اپنے دین میں داخل کرلی ہیں

پاپائیت سے یہ لیا۔ بزرگوں کی عزت و احترام کو عبادت کے درجہ کو پہونچا دیا، بڑوں کی اندھی اطاعت شروع کر دی۔ بطریقوں، کردنیالوں، شہیدوں اور شہر کے اسقفوں کی طرح طرح مراتب قایم کئے (عیسائی راہبوں اور عالموں کے مختلف نام ہیں) قدیسین کی شکل صورت اور کرامات، پادریوں کی وضع قطع اور صلیب کی مختلف شکلوں پر مدتوں قایم رہنے کی نقل کی گئی۔ رہبانیت اور اس کا لباس، گرجے اور انکے خدام و مجاور، کاہن اور ان کے مراتب و لباس، وغیرہ اختیار کئے گئے۔ گرجوں کی رسومات اور انکی زیبائش و زینت، محافل و مجالس، انکی موسیقی کے ساتھ عبادت اور اسکے اوزان اخذ کر لئے گئے قبروں پر قبہ جات اور گنبد بنا لئے گئے، ان پر روشنی کیجانے لگی، دور دراز کی مسافت سے ان کے عرس میں شرکت اور زیارت کیلئے سفر اختیار کئے جانے لگے اور قبر کے لوگوں سے منتیں مانی جانے لگیں۔ بزرگوں کی دستار، عصا، مزارات کے غسل کے پانی کو متبرک سمجھا جانے لگا سینہ پر صالحین کے ذکر کے موقع پر ہاتھ پھیرا جانے لگا جو صلیب کا اشارہ تھا سر سے حقیقت بنائی گئی، حلول سے سے وحدۃ الوجود کا عقیدہ گھڑا گیا۔ مجاوریت سے خلافت نکلی۔ مولود میلاد مسیح سے اخذ کی گئی اور محفل مولود علیہ میلاد مسیح سے سیکھی گئی۔ مکان میں تصویروں کی بجائے ایسے اسمار کی وصلیاں لگائی جانے لگیں جنپر یا علی یا شیخ عبد القادر جیلانی وغیرہ لکھا ہوتا ہے مراقبہ بتوں کے سامنے سر جھکا کر متوجہ ہونے سے اخذ کیا گیا۔ کیتھولک کاہنوں اور یہودیوں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے کہ وہ لوگ اپنے سوا کسی کو انجیل پڑھنے نہیں دیتے، قرآن کریم اور حدیث رسول علیہ التحیہ والتسلیم کو ہدیہ میں دینا منع کیا گیا۔ مجوسیت سے نجوم سیکھا گیا۔ اجرام فلکی سے خوف کیا جانے لگا سعد و نحس کا عقیدہ ہونے لگا اس کے علاوہ اسرائیلیات اور اسی قسم کے دیگر مذہبی افسانوں سے بہت سی باتیں اخذ کی گئیں اور ان کا نام لدنیات رکھا گیا۔

ان باتوں پر غور کرنے سے ہر شخص کی آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ یہ تمام کی تمام استبداد کا سرچشمہ اور غلامی کی زنجیریں ہیں اسی طرح دین برباد ہوا کرتے ہیں اور انسان کی بدقسمتی کی ابتدا ہوتی ہے لاحول ولا قوت الا باللہ العظیم۔

اسی طرح عیسائی بدعتیوں کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ متاخرین نے جن بہت سی باتوں کو دین سمجھ رکھا ہے حتیٰ کہ خود تثلیث کا مسئلہ اسکی اس تعلیم میں کوئی اصل نہیں ہے جو عیسی علیہ السلام نے پیش کی تھی۔ اکثر حصہ بعد میں اضافہ کیا گیا ہے۔ کچھ اپنی ایجاد ہے، اور بڑا حصہ دوسروں سے اخذ کیا گیا ہے۔ آج اثری علماء نے مصری خرافات میں وقتاً فوقتاً کتبوں اور تختیوں کی صورت میں برآمد ہوتے جارہے ہیں بہت سی مذہبی امور کی اصل دریافت کی ہے۔ یہودی احبار کی بہت سی زیادہ کی ہوئی باتوں کی اصل اشوری مذہبی افسانوں اور تحریروں میں دریافت کی ہے۔ تحقیق و جستجو کرتے کرتے وہ لوگ اس حد تک کامیاب ہوگئے ہیں کہ انہوں نے معلوم کرلیا ہے کہ مشرق قریب کے اکثر مذاہب کی بہت سی خرافات مشرق بعید یعنی ہندوستان و چین کے فلاسفہ کی تعلیمات اور خیالات سے ماخوذ ہیں غرضکہ وہ تمام بدعتیں جن سے ایمان متزلزل

اور مذاہب مسخ ہوگئے ایک دوسرے سے وابستہ ہیں
اور سب کی غرض واحد یہی استبداد ہے۔

اسلام کی تاریخ کو اگر کوئی شخص غور سے مطالعہ کرے تو اسکو معلوم ہوگا کہ امرا و حکام، سلاطین و خلفا، اور منافق علمار نے کیا کیا خوفناک تدبیریں کی ہیں کس کس طرح اور کن کن ترکیبوں سے علم کے چراغ کو گل کرنا چاہا ہے مگر خدا کا وعدہ ہے اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ بیشک ہم ہی نے قرآن نازل کیا ہے اور ہم ہی اسکے محافظ ہیں منافق لوگ اس آفتاب علم اور کنز العلوم میں کسی قسم کی کوئی تحریف تو کر نہ سکے زیادہ سے زیادہ یہ کر سکے کہ تاویلات کرلیں اور یہ بھی قرآن کا معجزہ ہے کیونکہ قرآن اسکی خود خبر دے چکا ہے فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ۔ پھر وہ لوگ جنکے دلوں میں کجی ہے پس وہ اسکی متشابہ آیات کا پیچھا کرینگے فتنہ کی خاطر اور تاویل کی خاطر۔

ناظرین کو میں بتانا چاہتا ہوں کہ استبداد نے حکیم علمار کو قرآن کی آیات نعم اور آیات اخلاق کی باریک و لطیف تفسیر کرنے سے روک کر کیا کیا علمار کو خوف تھا کہ اگر ان لوگوں نے اسلف صالحین کی رائے سے اختلاف کیا جو ان کے برابر دیگر علوم میں بصیرت نہ رکھتے تھے تو فوراً ان پر کفر کا فتویٰ لگ جائے گا اور قتل کر دیئے جائیں گے۔ یہی ایک اعجاز قرآن کا مسئلہ لیجئے۔ دین میں بہت اہم اور بہت بڑا مسئلہ ہے مگر آجتک حکیم علمار اسکو اچھی طرح صاف نہ کر سکے کہ آیا قرآن کریم کے معجزہ ہونیکا کیا مطلب ہے۔ زیادہ سے زیادہ قرآن کے اعجاز کے متعلق جو کہا گیا ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کی فصاحت و بلاغت اور بعض آئندہ ہونے والی باتوں کی پیشگوئی قرآن کا اعجاز ہے لیکن اگر اہل تاویل کی طرح حکیم علمار کو بھی قرآن پر غور کرنے اور سمجھنے کا موقع دیا جاتا تو قرآن کی ہزاروں آیات میں اعجاز کی ہزاروں نشانیاں ملتیں اور ایسی نشانیاں ملتیں جو حوادث و واقعات کے ساتھ ساتھ ایک نئے معجزہ کا اظہار کرتیں اور ثابت کر دیتیں کہ لَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ اور نہ کوئی تر اور نہ کوئی خشک بلکہ ہر چیز کتاب مبین میں ہے اور یہ ثبوت مشاہدہ و معائنہ پر مبنی ہوتا صرف ایمان اور عقیدہ نہ ہوتا۔

مثال کے طور پر یوں سمجھو کہ علم نے آج بہت سی ایسی باتیں منکشف کی ہیں جو یورپ اور امریکہ کے انکشاف کرنے والوں کی طرف منسوب ہیں مگر قرآن میں غور کرنے والے کو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے اکثر کا قرآن میں ذکر موجود ہے کہیں صراحت کیساتھ ہے کہیں اشارہ اور کنایہ کی صورت میں ہے اب تک یہ باتیں اسی لئے پوشیدہ رہیں کہ جب انکشاف ہوں تو اعجاز قرآن پر دلالت کریں اور ببانگ دہل دنیا کو بتائیں کہ قرآن اس خدا کا کلام ہے جسکے سوا اور کوئی غیب کو نہیں جانتا مثلاً آج یہ بات پایہ ثبوت کو پہونچ گئی ہے کہ موجودات عالم جس مادہ سے بنی ہے۔ وہ اثیر (ایتھر) ہے قرآن میں بھی ابتدائے تکوین کا ذکر موجود ہے وَاسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ اور مستوی ہوا وہ آسمان کے اور وہ دخان (یعنی اثیر) تھا۔

انکشاف کیا گیا ہے کہ کائنات ایک دوامی حرکت میں ہیں قرآن کہتا ہے وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ اَحْيَيْنٰهَا...... وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ۔

تحقیق کیا گیا ہے کہ زمین نظام شمسی سے ٹوٹ کر الگ ہوئی ہے

قرآن کہتا ہے اِنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰھُمَا آسمان اور زمین دونوں جڑے ہوئے تھے پس جدا کیا ہم نے ان دونوں کو۔

تحقیق کیا گیا ہے کہ چاند زمین سے ٹوٹ کر الگ ہوا ہے قرآن کہتا ہے اَفَلَا یَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِی الْاَرْضَ نَنْقُصُھَا کیا وہ نہیں دیکھتے ہیں کہ ہم زمین کو کم کرتے جا رہے ہیں! اِقْتَرَبَتِ السَّاعَۃُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ قیامت قریب آگئی اور چاند پھٹ گیا۔

تحقیق کیا گیا ہے کہ زمین کے سات طبقات ہیں قرآن کہتا ہے خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا وَمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَھُنَّ سات آسمان پیدا کئے ہیں اور زمین کے بھی انہیں کی طرح۔

تحقیق کیا گیا ہے کہ اگر پہاڑ نہ ہوتے تو ثقل نوعی کی وجہ سے زمین اپنی دوری حرکت میں ہلنے لگتی قرآن کہتا ہے وَاَلْقٰی فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِکُمْ اور زمین میں اس نے پہاڑ قائم کئے ہیں کہ کہیں وہ ہلنے لگے۔

دریافت کیا گیا ہے کہ ترکیب کیمیاوی ہو یا معنوی اس میں اختلاف نسبت اجزاء کے اختلاف سے ہوتا ہے قرآن کہتا ہے وَکُلُّ شَیْءٍ عِنْدَہٗ بِمِقْدَارٍ اس کے پاس ہر چیز ایک اندازہ سے ہے۔

دریافت کیا گیا ہے کہ جمادات کی زندگی بھی پانی پر موقوف ہے قرآن کہتا ہے وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ کُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ اور کیا ہے ہمنے پانی سے ہر چیز کو زندہ

تحقیق کیا گیا ہے کہ عالم عضوی اور یہی میں انسان بھی جمادات سے ترقی کرتے کرتے موجودہ حالت تک پہونچا ہے قرآن کہتا ہے وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَۃٍ مِّنْ طِیْنٍ اور بیشک پیدا کیا ہے ہمنے انسان کو مٹی سے۔

دریافت کیا گیا ہے کہ تمام نباتات میں حصول لقاح (یعنی نرنبات کا کوئی حصہ مادہ میں پیوست کر دیا جائے تو پھل اور پھول خوب آتا ہے ورنہ کم آتا ہے) جاری و ساری ہے۔ قرآن کہتا ہے خَلَقَ الْاَزْوَاجَ کُلَّھَا مِمَّا تُنْبِتُ الْاَرْضُ نباتات کے تمام جوڑے پیدا کئے فَاَخْرَجْنَا بِہٖ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰی پس ہمنے پانی کے ذریعہ بہت سے جوڑے مختلف نباتات کے نکالے۔ اِھْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَاَنْبَتَتْ مِنْ کُلِّ زَوْجٍ بَھِیْجٍ وہ ہلی اور بڑھی اور اگائے اس نے تمام عمدہ جوڑے وَمِنْ کُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِیْھَا زَوْجَیْنِ اور تمام پھلوں کے زمین میں جوڑا بنایا۔

دریافت کیا گیا ہے کہ اساک ظل یعنی تصویر شمسی (فوٹو) کا کیا طریقہ ہے قرآن کہتا ہے اَلَمْ تَرَ اِلٰی رَبِّکَ کَیْفَ مَدَّ الظِّلَّ وَلَوْ شَاءَ لَجَعَلَہٗ سَاکِنًا ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَیْہِ دَلِیْلًا کیا تونے اپنے رب کی طرف نہیں دیکھا کس طرح اس نے بڑھایا ہے سایہ اور اگر وہ چاہتا تو اسکو ساکن کر دیتا پھر ہمنے سورج کو اسپر دلیل بنایا ہے۔

دریافت کیا گیا ہے کہ جہاز اور گاڑیاں بجلی اور بھاپ سے چلائی جا سکتی ہیں قرآن چوپاؤں اور بادبانی جہازوں کا ذکر کرنے کے بعد کہتا ہے وَخَلَقْنَا لَھُمْ مِّنْ مِّثْلِہٖ مَا یَرْکَبُوْنَ اور پیدا کی ہیں ہم نے انکے لئے انہیں جیسی وہ چیزیں جن پر وہ سوار ہوتے ہیں۔

دریافت کیا گیا ہے کہ جراثیم موجود ہیں اور مختلف امراض کا باعث ہوتے ہیں قرآن کہتا ہے۔ وَاَرْسَلَ عَلَیْھِمْ طَیْرًا اَبَابِیْلَ تَرْمِیْھِمْ بِحِجَارَۃٍ مِّنْ سِجِّیْلٍ اور بھیجے ہمنے ان پر پرندے جھنڈ کے جھنڈ پھینکتے تھے وہ ان پر سڑی ہوئی جگھوں کی سوکھی مٹی۔

غرضکہ یہ اور ان کے علاوہ اور بہت سی آیات اس قسم کی موجود ہیں جو علم ہیئت کے انکشافات اور ناموس فطرت کی معلومات کی تصدیق کرتی ہیں اور اسی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایسی بہت سی آیات ابھی ہونگی۔ جن کا راز اپنے وقت پر منکشف ہوگا تاکہ جب تک دنیا موجود ہے اعجاز قرآن کی وقتاً فوقتاً تجدید ہوتی رہے۔



پردیسی کی عید

(از جناب ڈاکٹر راشد صاحب اختر)

پردیس میں عید آئے تو کیا ہو کوئی دل شاد	رہ رہ کے ہر اک کام پہ آتا ہے وطن یاد
خوش ہونے کو خوش ہیں مگر ایسی بھی خوشی کیا	کچھ دل پہ اثر نام کو پیدا نہ ہو جس کا
ہنستے ہیں تو وہ بات ہنسی میں نہیں ہوتی	سچ ہے کہ خوشی بے وطنی میں نہیں ہوتی
احباب و اعزا کی ہے تصویر نظر میں!	اپنا کبھی گھر یاد نہ آیا تھا سفر میں
کہتے ہیں وطن کس کو، یہ معلوم ہوا آج	ہے کتنی وطن سے ہمیں الفت یہ کھلا آج
عید آئی ہے اور ہم ہیں غریب الوطن اختر	کیا خوش ہوں کہ ہر وقت ہے کچھ بوجھ سا دل پر

(طاقت)

پیام سروش

(از جناب نہال سیوہاروی)

کبتک فسانۂ غم ایام کہے گا... تو!	اسلامیوں کو خون کے آنسو رلائے گا
کبتک خیال عظمت رفتہ میں غم کا جوش	کبتک وفور گریہ سے طوفان اٹھائیگا
کبتک رہے گی لب پہ حدیث کہن تیرے	جو ہو چکا ہے اسکو کہاں تک سنائیگا
کبتک دھنیگا حزن کے عالم میں سر کو تو	کبتک جہاں کو غم کے مناظر دکھائے گا
کبتک یہ طول نوحہ اقبال و ملک و جاہ	دکھتے ہوئے دلوں کو کہانتک دکھائے گا
کبتک، اتباہ، رہیگا خراب سے مئے قنوط	تا چند یہ شراب پیئے گا۔ پلائیگا

وہ آئی مسکراتی ہوئی صبح عید کی
نادان! فکر چاہیئے دور جدید کی

(طاقت)

ماضی کے تذکرے میں نہ اوقات کر تلف
جوشِ عمل سے اپنے نیا اک جہاں بنا

پھر روحِ نغمہ سنجی کی گلشن میں پھونک دے
شاخِ چمن پہ از سرِ نو آشیاں بنا

معیارِ بود و باش جہاں کو بلند کر
اس سرزمیں کو غیرتِ نہ آسماں بنا

طاعت کی تیرے دل میں ہو پیدا وہی تڑپ
خاکِ سیہ کو جلوہ گہِ جانِ جاں بنا

وقفِ خزاں ہوئیں روشیں باغِ ہند کی
مثلِ قدیم پھر اسے جنت نشاں بنا

وہ دور ہو کہ زہدِ صد سالہ بھی بہے
ساقی نشاطِ بادہ سے مجھکو جواں بنا

تقلیدِ جوئے آب مکن بے کنار شو!
دستِ خدا توی بخدا مردِ کار شو!

تہنیتِ عید

از حضرت اکبر حیدری

عید آئی ہے کرم فرمائیے
مژدۂ چشمِ عنایت لائیے

انتہائے شرمِ بیجا ہو گئی
آئیے پردے سے باہر آئیے

غایتِ ظلمِ تمنا ہو گئی!
ڈھائیے دیوارِ فرقت ڈھائیے

حالتِ بیمارِ ہجراں دیکھئے
چارۂ دردِ نہاں فرمائیے

دفترِ رنجِ جدائی دھوئیے
اخترِ بختِ سیہ چمکائیے

بندِ محرومیِ قسمت کھولئے
عقدۂ شوقِ نہاں سلجھائیے

دولتِ دیدار سے خوش کیجئے
جلوۂ روئے مبیں دکھلائیے

پے بہ پے صہبائے عشرت دیجئے
بارشِ لطف و عطا فرمائیے

بادۂ نابِ تمنا ڈھالئے
ساغرِ چشمِ کرم چھلکائیے

نغمۂ سازِ محبت چھیڑئیے
محفلِ عیش و طرب گرمائیے

مہرِ خاموشیِ الفت توڑئیے
دردِ دل کہہ جائیے سن جائیے

چیستانِ عاشقی حل کیجئے
معنیِ لفظِ وفا سمجھائیے

بے تکلف ہو کے ہنسئے بولئے
بے تامل وصل کی ٹھہرائیے

میرے ارمان اپنے ارمانوں کیساتھ
منزلِ مقصود تک پہنچائیے

روزگارِ نازِ بیجا ہوچکا
نازِ بیجا کر کے ناز اٹھوائیے

ماحصل یہ ہے کہ دل رکھ لیجئے
مختصر یہ ہے گلے لگ جائیے

آپ سے ہے اکبرِ محزوں کی عید
آئیے قربان مقدم آئیے۔

(نیرنگ)

بزمِ سعید

ڈاکخانہ کی شکایتیں ۔۔۔ "سعید" کی تاخیر اشاعت کی شکایتوں کا سلسلہ بند ہوا تو اب پرچہ نہ پہنچنے کی شکایتیں [illegible] موصول ہونی شروع ہو گئیں اس سے پہلے بھی اس قسم کے بہت سے خط آ چکے تھے اور دفتر کی جانب سے ڈاکخانہ کو اس امر کی جانب توجہ دلائی گئی تھی لیکن ان سرکاری محکموں کا نظام [illegible] ایسا باقاعدہ اور اس قدر مستحکم ہے کہ لاکھ چیخئے چلائیے [illegible] تبدیلی نہیں ہوتی جتنے پرچے "سعید" کے دو چار یا چھ مہینے پیشتر ڈاک [illegible] ہوا کرتے تھے ٹھیک اتنے ہی آج بھی ضائع ہو رہے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیخ سعدی علیہ الرحمۃ کے اس شعر میں [illegible]

فرشتہ کہ وکیل است بر خزائن باد ۔۔۔ [illegible]

[illegible] غریب پرچہ نے نشانہ تے ہوئے [illegible] پر آمدنیاں بھیجا رہتا ہے [illegible] ڈاک کا ہر کارہ بھی [illegible] پروا کئے بغیر کہ ایک غریب پرچے کی شہرت اور ترقی اشاعت پر اس کا کیا اثر پڑیگا اور ایک مختصر سے عمر کی جان پر کیا گذر جائیگی پرچوں کی ایک مقررہ تعداد ہر مہینے کے مہینے نکالتا رہتا ہے اور خواہ آپ کتنی ہی فریاد کریں اور کیسا ہی شور غل مچائیں اسکے کان پر جوں نہیں رینگتی۔ ایک دو پرچے اگر اس طرح محکمہ ڈاک کے علم دوست اہلکاروں کو پسند آجایا کریں تو صبر کر لیا جاسے، لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ پندرہ پندرہ اور بیس بیس پرچے دوبارہ بھیجنے پڑتے ہیں اور اس ناخوشگوار فرض کی انجام دہی پر ہمارے مختصر منیجر صاحب کا درجہ حرارت عموماً حد سے بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے اور انکی زبان بہت ہی آہستہ آہستہ بعض ناگفتنی الفاظ کی مسلسل تکرار کرتی رہے تو نہیں کیا کہا جا سکتا ہے۔ ہمیں اب یقین ہو چلا ہے کہ ڈاک کے متعلق یہ شکایت ہیضہ اور طاعون کی وباؤں کی طرح اٹل ہے اسلئے بدرجہ مجبوری ہم اپنے قدردانوں سے یہی درخواست کرتے ہیں کہ اگر کسی مہینے کی پندرہ تاریخ تک بھی پرچہ انکے پاس نہ پہونچے تو وہ ازراہ کرم دفتر کو مطلع فرما دیں۔ یہاں سے دوسرا پرچہ انکی خدمت میں بھیجدیا جائیگا۔ یہ ہم یقین دلا سکتے ہیں کہ دفتر سے پرچے بہت کافی احتیاط کے ساتھ ڈاک میں ڈالے جاسکتے ہیں اور منیجر صاحب کی بڑھی ہوئی نیند یا پانوں کی ڈبیا سے انکا بہیم شغلہ کبھی اس قسم کی غلطی ان سے سرزد نہیں کراتا کہ کوئی پتہ لکھنے سے رہجائے اس کا باعث یہ نہیں ہے کہ وہ خود کچھ بہت زیادہ محتاط واقع ہوئے ہیں۔ بلکہ بات یہ ہے کہ چونکہ میں خود پرچوں کا مقابلہ رجسٹر سے کرلیتا ہوں اسلئے انہیں ذرا اندیشے سے لگے رہتے ہیں۔

بلوچستان کا ادبی ذوق ۔۔۔ اب جبکہ پرچے کی تیاری کیلئے مجھ کو کافی وقت ملنے لگا ہے تو فرصت بھی ذرا زیادہ رہتی ہے اور مصداق اس مثل کے کہ "خالی بنیا کیا کرے اس کوٹھی کے دھان اس کوٹھی میں" اب بھی دفتر میں بیٹھے کام محض وقت گذاری کیلئے کرتا رہتا ہوں اسی قسم کا تفریحی مشغلہ یہ بھی تھا کہ میں نے صوبہ وار "سعید" کی اشاعت کا حساب لگایا اور یہ دیکھکر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ "سعید" کے سب سے زیادہ قدردان صوبہ بلوچستان میں ہیں۔ باشندگان بلوچستان کا یہ ذوق ادب دیکھکر میرے دل میں بھی انکی خدمت کا ولولہ اور شوق پیدا ہوا اور بہت کافی تجسس و تلاش اور ضرورت سے زیادہ تملق و خوشامد کے بعد میں ایک قابل و فاضل ادیب کو جو اس صوبے کے حالات سے کما حقہ واقفیت رکھتے ہیں اس امر پر رضامند کر سکا ہوں کہ وہ مستقل طور پر "سعید" کے لئے ایک ایسا سلسلہ مضامین لکھنا شروع کردیں جو حد سے زیادہ دلچسپ [illegible] ہونے کے علاوہ وہاں کے تمدنی اور معاشرتی حالات کا بھی آئینہ ہو اور ساتھ ہی ساتھ پشتو، بلوچی، اور فارسی ادب کے نمونے بھی اردو زبان میں پیش کرسکے۔ مجھے اطلاع ملی ہے کہ ممدوح نے "سعید" کو ممنون منت بنانے کا پختہ ارادہ کر لیا ہے اور اس سلسلہ کی پہلی قسط "حور صحرائی" کے نام سے "سعید" کی کسی قریبی اشاعت میں جلوہ افروز ہوگی میں بڑے وثوق کیساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ سلسلہ باشندگان بلوچستان کیلئے عموماً اور شائقین ادب و تاریخ کیلئے خصوصاً بیحد دلچسپ و دلآویز ثابت ہوگا لیکن "سعید" بھی اپنی اس خدمت کا معاوضہ چاہتا ہے اور وہ یہ کہ "سعید" کے بلوچستان کے سب خریدار آج ہی کم سے کم دو دو خریداروں کا چندہ دفتر میں بھجوا دیں کیا یہ کچھ زیادہ ہے؟

"سعید" کا باب مذہب و اخلاق ۔۔۔ "سعید" دنیائے ادب کے ایک فتنہ خوابیدہ کو جگانے میں بھی کامیاب ہوا ہے۔ اور اسکی اشاعت میں آپ جناب مرزا محمد سعید صاحب ایم اے کا ایک گراں قدر مضمون پڑھیں گے جسکے متعلق بلا اندیشہ تردید ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اپنی نوعیت کا بہترین مضمون ہے۔ دنیائے ادب ابھی مرحوم رسالہ "مخزن" دہلی کو بھولی نہوگی اور اسی کیساتھ غالباً یہ بھی یاد ہوگا کہ مخزن کو مخزن بنانیوالی چند مخصوص ہستیوں میں سے ایک مرزا محمد سعید صاحب بھی تھے۔ ادبی ذوق کی پستیوں نے آپکو ایک بڑی حد تک بددل کر دیا تھا اور آپنے اپنا دامن ان غلاظتوں سے محفوظ رکھنے کیلئے اس دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی "سعید" کو اپنی کوشش اور اپنی یاوری تقدیر پر ناز ہے کہ وہ ممدوح کو درخشندگی دینے کیلئے پھر جھروکے تک لانے میں کامیاب ہو سکا۔ اسی باب کے متعلق ایسے انتظامات بھی کئے گئے ہیں کہ اس خاندان عالیہ کے اعاظم و اکابر کے حالات ان صفحات میں دیئے جائیں

جلد ۳ — باتصویر — مارچ

نمبر ۳ — ماہوار رسالہ — ۱۹۳۳ء

اڈیٹر سعید احمد بریلوی

سعید

قیمت

سالانہ ۳ے/

ششماہی ۱۲عہ/

فی پرچہ ۴/

فہرست مضامین



ایک مضمون اور ایک خط

"سعید" اس غرض سے نہیں نکالا گیا ہے کہ اس کے ذریعہ سے ہم صرف اپنے خیالات کی اشاعت کیا کریں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں میں ہر ایک مسئلے کے متعلق غور و فکر کرنے کا شوق اور بطور خود ہر ایک بات سے نتیجہ نکالنے کا ذوق پیدا کرے۔ "سعید" کی گزشتہ اشاعت میں برتھ کنٹرول یا منع اولاد پر ایک نوٹ لکھا گیا تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس موضوع سے بہت کافی دلچسپی لی گئی۔ "سعید" کے ایک مربی و محسن جناب ڈاکٹر محمد ایوب صاحب نے ایک طویل و بسیط مضمون کا ترجمہ کر کے بغرض اشاعت ہمارے پاس بھیجا ہے اور ایک دوسرے صاحب نے ایک خط جو بجائے خود ایک مضمون ہے اس لئے ارسال فرمایا ہے کہ ہم انہیں اس معما کا حل بتائیں جو اس میں پیش کیا گیا ہے یہ دونوں تحریریں ہمارے گذشتہ نوٹ کی مخالفت میں ہیں گویا برتھ کنٹرول کی حمایت میں لکھی گئی ہیں۔ ہمیں اگر صرف اپنے ہی خیالات کی اشاعت منظور ہوتی تو بہ آسانی ان دونوں مضامین کو ردی کی ٹوکری کی نذر کیا جا سکتا تھا۔ لیکن ہم ان دونوں مضامین کو دلی شکریہ کے ساتھ ان ہی صفحات میں جگہ دے رہے ہیں کہ جن میں خود ہمارا نوٹ شائع ہوا تھا اور یہ صرف اس لئے کہ موافق و مخالف دونوں قسم کی رائیں پڑھکر ارباب فہم خود ایک مناسب فیصلہ کریں۔

ڈاکٹر محمد ایوب صاحب کا خط اور مضمون حسب ذیل ہے۔

مکرمی و محترمی جناب اڈیٹر صاحب رسالہ سعید دہلی

السلام علیکم۔ آپ کو یاد ہوگا کہ دہلی میں دسمبر کے آخر میں جناب سے ملاقات کے موقع پر برتھ کنٹرول کے متعلق مجھ میں اور آپ میں کچھ گفتگو ہوئی تھی۔ اور آپ نے مجھے اس مسئلے پر اظہار خیال کرنے کی دعوت دی تھی۔ جنوری ۳۳ء کے انڈین میڈیکل گزٹ میں اس موضوع پر جناب اے۔ پی۔ پلے صاحب بہادر او۔ بی۔ ای۔ ایم۔ بی۔ پی۔ ایس۔ ڈائرکٹر یوجینک کلینک بمبئی کا ایک مختصر علمی مضمون میری نظر سے گذرا جس میں دلائل اور اعداد و شمار کا ایک نہایت قیمتی ذخیرہ موجود ہے۔ میں نے مناسب سمجھا کہ اس کا ترجمہ جناب کی خدمت میں ارسال کروں چنانچہ ترجمہ ارسال کر رہا ہوں۔ نظر ثانی اور اصلاح کے بعد اگر آپ شائع کرنا مناسب سمجھیں تو ایسا کر سکتے ہیں۔

واضح رہے کہ مصنف کے سب خیالات سے میرا متفق ہونا ضروری نہیں۔ لیکن میں ان کے بیشتر خیالات سے متفق ہوں۔

امید ہے کہ آپ بھی حسب وعدہ اس کی تائید یا تردید میں اظہار خیال فرمائیں گے۔

خادم محمد ایوب

تحریک انضباط پیدائش Birth control اور اطبا

اطبا بحیثیت جماعت کے اس امر سے زیادہ کسی شخص کو ایک فرد البشر یا عوام الناس کی صحت سے دلچسپی نہیں ہو سکتی لیکن ہم (اطبا) میں سے بہت ہی کم اصحاب کو اس امر کا احساس ہے کہ صحت عامہ کے لئے انضباط پیدائش کا مسئلہ کتنی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس مسئلہ کا تعلق سب سے پہلے خواتین سے ہے کیونکہ اس کے دو اہم ترین جزو خود خواتین اور اُن کے بچوں کی صحت ہیں۔ ہر ایک ڈاکٹر یہ تسلیم کرے گا کہ بعض جسمانی اور دماغی بیماریوں میں عورتوں کو بچہ نہیں جننا چاہیئے بچہ جننے کی صورت میں یا تو جننے والی کی موت واقع ہو جائیگی یا اس کا مرض شدت اختیار کر لیگا۔ اگر اولاد زندہ رہی تو وہ کمزور اور دائم المریض ہوگی۔ ہندوستان میں پیدائش کے وقت بچوں کی اموات کا تناسب بہت زیادہ ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ تمام اموات متذکرۃ الصدر وجہ کے باعث ہوتی ہیں لیکن ایک ایسے ملک میں جہاں شادیاں عالمگیر اور دایاں اپنی نالائقی میں شہرۂ آفاق ہوں۔ اموات کی یہ بڑی اہم وجہ ہے اس پر اُن ماؤں کا اضافہ کر دیجئے جو دائم المرض ہیں۔[1]

[1] ایک طبیب کی حیثیت سے سولہ سالہ تجربہ کے بعد مترجم اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ ہندوستان کے متمدن طبقے میں ایسی بیوی مستثنیات سے ہے جو سال کے زاید حصے میں کسی نہ کسی مرض میں مبتلا نہ رہتی ہو اور ایسی تو شاید کوئی بھی شادی شدہ خاتون نہیں جو کسی نہ کسی مخصوص زنانہ مرض میں مبتلا نہ ہو۔ (مترجم)

تمام اطبا اس امر کو تسلیم کریں گے کہ کمزور خواتین اور ان کے بچوں کی صحت کا مفاد اس میں ہے کہ بچوں کی پیدائش کے درمیان کافی اور متعین وقفہ ہو۔ اس سلسلے میں ممالک متحدہ امریکہ کے ہیلتھ ڈپارٹمنٹ کے ذیل کے اعداد ناظرین کی دلچسپی کا باعث ہوں گے۔

گوشوارہ الف

پیدائش کے درمیانی وقفہ	شیر خوار بچوں کی شرح اموات فی ہزار
۱ - سال	۱۴۷
۲ - ”	۹۸
۳ - ”	۸۶
۴ - ”	۸۵

گوشوارہ ب

خاندان میں بچوں کی کل تعداد	” ” ”
۴ یا کم	۱۱۸
۶ اور زیادہ	۲۶۷
۷ اور زیادہ	۲۸۰
۸ اور زیادہ	۲۹۱
۹ اور زیادہ	۳۰۳

گوشوارہ ج

پیدائش کی ترتیب	” ” ”
پہلا اور دوسرا بچہ	۱۲۸٫۳
تیسرا اور چوتھا بچہ	۱۴۳٫۲
پانچواں اور چھٹا بچہ	۱۷۷٫
ساتواں اور آٹھواں بچہ	۱۸۱٫۵
نواں یا اس کے بعد کا بچہ	۲۰۱٫۱

گوشوارہ د

	شیر خوار بچوں کی شرح اموات	مردہ پیدائشوں کا تناسب زندہ پیدائشوں سے	زندہ بچے فی ہزار حمل	
جب ۵ یا اس سے کم حمل قرار پا چکے ہوں	۲۲۶،۱۳	۱۰۲ ، ۵	۶۲۳،۱۷	یہ اعداد ہندوستان کے ہیں
جب ۶ یا اس سے زیادہ حمل ہوں	۲۶۷،۱۲	۲۰،۹	۵۰۴،۱۴	

گوشوارہ ۔ ر ۔ یہ اعداد ہندوستان کے ہیں

ماں کی عمر	بچوں کی شرح اموات
۱۸ سال سے کم عمر	۱۶۰،۳
۱۸ سے ۱۹ سال تک	۱۲۸،۹
۲۰ سے ۲۴ سال تک	۱۰۹،۵
۲۵ سے ۲۹ سال تک	۱۰۱،۴
۳۰ سے ۳۴ سال تک	۱۰۴،۷
۳۵ سے ۳۹ سال تک	۱۲۶،۵
۴۰ سے ۴۴ سال تک	۱۳۱،۳
۴۵ سال سے اور زیادہ	۲۵۰،۰

یہ بھی امر مسلمہ ہے کہ خاندان کی آمدنی کا بچوں کی شرح اموات اور باقی زندہ بچوں کی صحت پر بہت بڑا اثر پڑتا ہے اس سلسلہ میں ممالک متحدہ امریکہ کا ذیل کا نقشہ سبق آموز ہے۔

باپ کی آمدنی فی سال	بچوں کی شرح اموات فی ہزار
۴۰۰ ڈالر سے کم	۱۷۰
۴۵۰ ڈالر سے ۵۴۹ تک	۱۳۰
۵۵۰ سے ۶۴۹ ″	۱۲۰
۶۵۰ سے ۸۴۹ ″	۱۱۰
۸۵۰ سے ۱۰۴۹ ″	۹۰
۱۰۵۰ سے ۱۲۴۹ ″	۷۰
۱۲۵۰ اور اس سے زیادہ	۶۰

ان اعداد سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شیر خوار بچوں کی شرح اموات اور باقی زندہ بچوں کی صحت خاص کر ذیل کے امور پر منحصر ہے

(۱) ماں کی صحت (۲) ماں باپ کی نسل کا اثر۔

(۳) باپ کی آمدنی

(۴) بچوں کی پیدائش کے درمیان وقفہ اور ان کی تعداد

(۵) ماں کی عمر۔

اس مسئلہ کے طبی پہلو سے قطع نظر کرکے بعض ایسی صورتیں بھی ہیں جو صحت عامہ کی ذیل میں آتی ہیں۔ ان میں ذیل کے امور قابل ذکر ہیں۔ انضباط پیدائش سے بدکاری کم ہو جائیگی کیونکہ نوجوانی کی پر مسرت شادیاں ترقی پذیر ہوں گی۔ اندر خاوند کو بیوی کی صحت کو نقصان پہنچنے کا فکر دامنگیر ہوگا۔ اور ایسے جنسی تعلقات جنکی وہ ضرورت محسوس کرتا ہے گھر پر میسر ہوں گے امراض قبیحہ venereal diseases آتشک سوزاک وغیرہ میں بھی کمی واقع ہوگی۔ آبادی میں غیر ضروری اضافہ اور اس کے لازمی بد نتائج۔ مثلاً کم عمری میں بچوں کی پیدائش اور ادنیٰ طرز معاشرت میں بھی کمی واقع ہوگی۔ اس ذریعے سے مختلف جماعتیں اپنی تندرستی اور طرز معاشرت کا درجہ بلند کرنے میں کامیاب ہوں گی۔

انضباط پیدائش اور بچوں کی پیدائش کے درمیان مناسب وقفہ ڈالنے کے لئے آج کل ایک ناجائز اور دو جائز طریقے ہیں (۱) اسقاط حمل (۲) جنسی تعلقات سے اجتناب اور (۳) انضباط حمل۔ اسقاط حمل کا تو نہ کوئی طبیب

مشورہ دے سکتا ہے اور نہ عمل کرسکتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود استقرار حمل یا اس کی کوشش شادی شدہ خاندانوں میں سالہا سال لاکھوں کی تعداد میں ہوتی ہے۔ ہر ایک دوافروش دائی یا مرد اور عورتوں کے امراض مخصوصہ کے ماہر طبیب اُن لاتعداد درخواستوں کی بنا پر جو انہیں ایام ماہواری کے باقاعدہ جاری کرنے کے لئے نسخوں کے واسطے موصول ہوتی ہیں۔ ہمارے اس بیان کی تصدیق کرسکتے ہیں اس کے بعد ہمارے لئے صرف دو جائز طریقے باقی رہ جاتے ہیں ضبط نفس self control اور ضبط پیدائش۔ اطبا کے لئے یہ کوئی راز نہیں ہے کہ حوائج شکمی کے بعد تعلقات جنسی کی خواہش ہی نوع انسان کے لئے نہایت نمایاں مستقل اثر رکھتی ہے۔ اگرچہ رفاہ عام کا کام کرنے والے اس مسئلے کی زبردست اہمیت سے لاعلم ہونے کے باعث اس خواہش کو دبانے کے حق میں آواز بلند کرتے ہیں۔ ضبط نفس کے یہ معنی ہیں کہ ایک طبعی اور ضروری تحریک کو دبایا جائے اور یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ ایسی خواہش کا دبانا اس کے پورا کرنے کی نسبت زیادہ مضر ہے نوجوان اور تندرست جوڑے زیادہ عرصے تک اپنی ذہنی جسمانی اور اخلاقی حالت کو ضرر پہنچانے کے بغیر اس خواہش کو ضبط نہیں کرسکتے۔ جو لوگ ضبط نفس پر عمل کرسکتے ہیں اُن کے لئے انضباط پیدائش کی تعلیم بالکل غیر ضروری ہے میری یہ رائے ہے کہ اگر سب نہیں تو بہت سے اطبا انضباط پیدائش کے حامی ہیں اور اُن میں سے بہت سے ان طریقوں پر عمل بھی کرتے ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ بحیثیت معالج وہ مریضوں کو ایسا مشورہ دینے سے کتراتے ہیں۔ آخر اطبا کی خاموشی کا کیا باعث ہے۔ اخلاقی جرات کی کمی۔ جذبۂ انسانیت کا فقدان۔ یا لاعلمی؟ میرے خیال میں اُن کی خموشی کا راز ذیل کے وجوہ میں مضمر ہے۔

(۱) مذہبی تعصب اور اُن کی یا اُن کے بزرگوں کے ضمیر کی ملامت۔

(۲) فحش پسندی کا کلنک

(۳) ناجائز استعمال کا خوف

(۴) ضبط پیدائش کے طریقوں سے لاعلمی

گزشتہ زمانے میں مذہب کا سائنس پر غالب اثر تھا لیکن اب سائنس اپنی قدر اور طاقت سے اُسی قدر واقف ہے۔ جتنا کہ اپنی مجبوریوں سے۔ یہی وجہ ہے کہ بیماروں کے علاج اور مشورے میں وہ مذہب کی مداخلت گوارا نہیں کرتی۔ استقرار حمل کو روکنے کا طبی مشورہ ایک قسم کا علاج ہے۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ مذہب کو اس مسئلے میں مداخلت کی اجازت دی جائے۔ مذہب ایسے اخلاقی اصول وضع کرسکتا ہے جو آدمیوں کے آپس کے تعلقات کو حد اعتدال سے تجاوز نہ کرنے دیں۔ لیکن انسان کے نجی معاملات میں مذہب کو دخل نہیں ہونا چاہیئے۔ رہا فحش پسندی کا کلنک سو انضباط پیدائش کا مسئلہ فواحش سے قطعی پاک ہے۔ اس مسئلے میں فواحش کا وجود لوگوں کے اپنے دماغوں کی تخلیق ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ انضباط پیدائش کی تعلیم کا ناجائز استعمال ہونے کے امکانات ہیں۔ لیکن کیا یہ بہتر ہے کہ دنیا اسقاط حمل اور امراض خبیثہ Venereal diseases کی لعنتوں میں گرفتار رہے۔ اور ان لعنتوں کی قربان گاہ پر لاتعداد ماؤں اور شیرخوار بچوں کی جانیں بھینٹ دی جاتی رہیں۔ بجائے

اس کے کہ دنیا ان بلاؤں سے نجات پانے کی خاطر ناجائز تعلقات میں اضافے کے خفیف سے امکان کو گوارا کرے۔

میرے خیال میں اطبا کی استقرار حمل روکنے کے طریقے بتلانے سے معذوری کا خاص سبب اُن کی لاعلمی ہے۔ اس سلسلے میں اُن کے معلم۔ ماہر خصوصی یا علمی رسالے نہیں ہیں بلکہ اُن کے جاہل دوست اور دوا فروشوں کے اشتہارات ہیں۔ اسی وجہ سے اُنہیں اُن کے بے ضرر اور قابل اعتماد ہونے پر یقین نہیں ہوتا اور وہ اُن کے متعلق مشورہ دینے میں تامل کرتے ہیں پروفیسر جولین ھکسلے کا قول ہے۔

"ہماری آیندہ نسلوں کو ایسے زمانہ کے وجود پر کبھی یقین نہ آئیگا جس میں اطبا عورتوں کو ایسا مشورہ دے سکتے ہیں کہ اُنہیں استقرار حمل سے قطعی اجتناب کرنا چاہیئے۔ کیونکہ ایسا واقعہ اُن کی جانوں کو خطرہ میں ڈال دے گا لیکن جب اُن کی منت کی جائے کہ اس مقصد کے حصول کے ذرائع سے اُنہیں آگاہ کریں۔ تو وہ مشورہ دینے سے قطعی انکار کردیں"۔

ایسی خواتین کو جنہیں ایسے مشورہ کی واقعی ضرورت ہو مشورہ دینے سے انکار کرنا۔ فن طبابت کی ذمہ داریوں سے بعید بلکہ انسانیت سے بھی دور ہے۔

ایسی خواتین کو جنہیں ایسے مشورہ کی واقعی ضرورت ہو، مشورہ دینے سے انکار کرنا فن طبابت کی ذمہ داریوں سے بعید بلکہ انسانیت سے بھی دور ہے۔

سر کلفورڈ البٹ نے اب سے چند سال پہلے برٹش میڈیکل ایسوسی ایشن کی صدارت کے فرائض انجام دیتے ہوئے اپنی تقریر میں فرمایا تھا۔" ہر ایک حق پرست طبیب اپنے کام کو ایک مجلسی خدمت تصور کرتا ہے اور نہ صرف جسمانی بلکہ مجلسی تعمیر اور اخلاقی اور ذہنی صحت کا ذمہ دار بھی سمجھتا ہے"۔ طبیب اپنے اس مقصد اعلیٰ میں انضباط پیدائش کے متعلق اُن مجبوریوں کے باعث کہ جو اُسے سماج کی تعمیری کارروائیوں میں مشیر اور رہنما کی حیثیت سے اپنی پوری قابلیت کے مطابق عمل کرنے سے روکتی ہیں رکاوٹ محسوس کرتا ہے۔ مسئلہ انضباط پیدائش کے ابتک ابتدائی مدارج طے نہ کرسکنے اور عوام الناس میں غیر یقینی اور مضر طریقوں کے تیزی سے رواج پا جانے کا باعث یہی ذہنیت ہے۔ اطبا کا گروہ اس نہایت ضروری انسانیت پرور لاعلمی مسئلے پر اپنے پیشے کے شریفانہ مسلک کے خلاف مجرمانہ روش اختیار کرنے کا یقیناً ملزم قرار دیا جاتا ہے۔

اس موضوع پر جو دوسرا خط موصول ہوا ہے وہ حسب ذیل ہے۔

مکرمی! السلام علیکم

برتھ کنٹرول کے سلسلہ میں جناب نے فروری کے سعید میں جو شذرہ سپرد قلم فرمایا ہے اس کے ایک ایک حرف سے مجھے اتفاق ہے۔ لیکن ذرا اس گتھی کو عملی طور پر سلجھانے کی کوشش کیجے۔ دور کیوں جایئے۔ میرے ایک دوست کی ہی مثال لیجئے جن کے چار بچے ہیں۔ پچاس روپیہ تنخواہ ہے۔ رشتہ داروں۔ خویش و اقارب سے ملنا جلنا ہے۔ دوستوں اور مہمانوں کی خاطر مدارات بھی ہے۔ بچوں کی تعلیم و تربیت کا بھی خیال ہے۔ عید تہوار بھی ہے۔ غرض ان کو ہر چیز سے واسطہ ہے جو ایک دنیا دار انسان کے لئے ضروری ہے۔ عمر ۲۸ سال ہے۔ یعنی جوان ہیں۔ اس سے ظاہر ہے بیوی بھی جوان ہی ہوں گی۔ اولاد کا سلسلہ ابھی ایک عرصہ تک جاری رہ سکتا ہے۔ اور ہاں آپ کی اس تجویز پر ابھی تک متمول سوسائٹی نے عمل بھی نہیں کیا۔ کہ ایک امیر شخص چھ غریب بچوں کی تعلیم کی

ذمہ داری اپنے سر لے۔ جو انی ہے۔ خواہشات ہیں۔ یہ بھی نہیں ہوسکتا کہ عمل زوجیت سے عمر بھر کے لئے احتراز کیا جائے اور جب احتراز نہیں ہوسکتا تو اولاد کا پیدا ہونا ایک حد تک یقینی ہے۔ اور جب اولاد کا سلسلہ بڑھیگا تو تکالیف میں اضافہ ہوگا جس کے معنی یہ ہیں کہ زندگی ایک مصیبت ہے جس سے ایک حساس انسان موت کو بہتر خیال کرتا ہے۔ یہ حالات خود میرے دوست کے لئے ہی مضر ثابت نہ ہوں گے بلکہ انکی اہلیہ اور بچوں پر بھی اس کا ناگوار اثر پڑے گا۔ ان حالات کو پیش نظر رکھکر کیا آپ ایک تسلی بخش جواب دینے کی زحمت گوارا فرمائیں گے؟ یعنی آپ کے نزدیک برتھ کنٹرول کے علاوہ کونسی تجویز ہے جس پر میرے دوست عمل پیرا ہو کر فراوانی اولاد کے باعث جو مشکلات پیش آسکتی ہیں ان سے نجات حاصل کرسکیں۔ لیکن خدا کے لئے کہیں یہ نہ ارشاد فرمایئے گا کہ اپنے دوست سے کہدو کہ خودکشی کرلیں۔

یہ وہ سوال ہے جو اکثروں کے دماغ میں چکر لگاتا رہتا ہے مناسب ہوگا اگر اس کا جواب بذریعہ سعید عنایت فرمائیے۔ ورنہ جو صورت آپ بہتر خیال کریں۔ نیاز کیش تنویر

فاضل ڈاکٹر بیلے صاحب نے منع اولاد یا بہ الفاظ صحیح قتل اولاد کے جواز میں سب سے پہلی دلیل یہ پیش کی ہے کہ "ہر ایک ڈاکٹر تسلیم کریگا کہ بعض جسمانی اور دماغی بیماریوں میں عورتوں کو بچہ نہیں جننا چاہیئے۔ بچہ جننے کی صورت میں یا تو جننے والی کی موت واقع ہوجائیگی یا اس کا مرض شدت اختیار کرلیگا" یہ دلیل بظاہر بہت ہی دقیع اور بہت ہی وزنی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن پوچھنے والا ڈاکٹر بیلے صاحب سے پوچھ سکتا ہے کہ جبکہ تمام ڈاکٹروں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ بعض معدہ اور آنتوں کی بیماریوں میں انسان کو غذا نہ کھانی چاہیئے ورنہ اس کے مرجانے یا اس کے مرض کے ترقی پکڑجانے کا اندیشہ ہے تو ڈاکٹر صاحب نے کوئی تحریک Food control (منع غذا) کے نام سے کیوں نہ شروع کی اور کیوں کوئی ایسا طریقہ ایجاد نہ فرمایا کہ جس سے لوگ طرح طرح کے خوش ذائقہ کھانے اور انواع واقسام کے لذت بخش پھل برابر کھاتے تو رہیں لیکن معدہ اور آنتوں پر ان کے ہضم کرنے کا بار نہ پڑے اور وہ جیسے کھائے تھے ویسے کے ویسے ہی جسم سے خارج ہو کر ضائع ہوجایا کریں۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ معدہ اور آنتوں کے امراض سے اس سے بہت زیادہ موتیں واقع ہوتی ہیں جتنی کہ استقرار حمل اور وضع حمل سے؟ اگر ایسا ہے تو کیا ایک ہمدرد بنی نوع کا یہ فرض نہیں ہے کہ پہلے اس مصیبت کو دور کرنے کی طرف توجہ کرے کہ جو بہت زیادہ عالمگیر اور بہت زیادہ مضرت رساں ہے؟ کیا صرف اس عذر پر کہ بعض حالتوں میں ہماری غذا ہی ہماری موت یا ہمارے مرض کا باعث ہوجاتی ہے ڈاکٹر بیلے صاحب یہ مشورہ دیں گے کہ آئندہ سے تمام انسان غذا کھانا بالکل چھوڑ دیں یا اپنے جسم کے اندر حلق سے لیکر امعاء مستقیم تک ایک ربڑ کی نلکی کسی اچھے ماہر فن ڈاکٹر سے ایسی ڈلوا لیا کریں کہ منہ زبان اور تالو غذا کی لذت بھی حاصل کرلیں اور ربڑ کی نلکی کی وجہ سے وہ معدہ اور آنتوں کی "مضر صحت" اثرات سے بھی پورے طور پر محفوظ رہ سکے۔

ممکن ہے کہ اس کے جواب میں ڈاکٹر صاحب یہ فرمائیں کہ غذا نہ پہونچنے کا تو لازمی نتیجہ موت ہے اور اس تدبیر پر عمل کرنے کے تو یہ معنی ہوں گے کہ چند ہفتوں میں تمام انسانی نسل ہی فنا ہوجائے۔ میں بھی نہایت ادب کے ساتھ ان سے یہی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ منع اولاد کی تدابیر پر عمل کرنے کا نتیجہ بھی اس کے سوا اور کچھ نہیں نکل سکتا اگرچہ یہ ضروری ہے کہ منع غذا کی طرح اس کے آثار چند ہفتوں میں ظاہر نہیں ہوسکتے۔ قدرت نے آپ کو جو خواہشیں عطا کی ہیں وہ اس لئے نہیں ہیں کہ

آپ اُن سے تھوڑا سا حظ اور تھوڑی سی لذت حاصل کر لیا کریں۔ یہ لذت اور یہ حظ تو ان میں صرف اس لئے رکھا ہے کہ آپ ان فرائض کی انجام دہی سے کبھی غافل نہ ہو سکیں اور ایک تیز اور زبردست خواہش یا طلب آپ کو یاد دلا دیا کرے کہ آپ کو اپنے جسم کی یا اپنے بنی نوع کی خدمت انجام دینی ہے۔ اگر آپ صرف حظ نفس یا کام و دہن کے ذائقہ کی خاطر یہ خدمات انجام دینا ترک کر دیں گے تو قدرت ہرگز ہرگز اپنی اس توہین کو برداشت نہ کرے گی اور یقینی طور پر اس کا نتیجہ نسل کی تباہی کی صورت میں نکلے گا۔ رہا یہ سوال کہ بعض جسمانی اور دماغی امراض کی موجودگی میں افزائش نسل کی کوششیں مضر ثابت ہوتی ہیں تو یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جو انسان تو انسان چھوٹے سے چھوٹے جانوروں تک کو معلوم ہے اور ہر جاندار یہ سبق قدرت سے سیکھ کر آتا ہے کہ ایسے خطرناک حالات میں خواہش کے باوجود تسکین خواہش کی کوششوں سے باز رہے۔ ادنیٰ درجے کے جانور بھی بیماری کی حالت میں افسردہ اور مضمحل ہو کر پڑ جاتے ہیں اور اگر انھیں کچھ کھلانے پلانے کی کوشش کی جائے تب بھی تسکین اشتہا کی طرف راغب نہیں ہوتے۔ اگر ڈاکٹر صاحب کا مطلب منع اولاد کی اس عالمگیر تحریک سے صرف اس قدر ہے تو ہمیں افسوس ہے کہ ان کی یہ انشا پردازی اور فراہمی اعداد و شمار کے متعلق اس قدر جانکاہی تحصیل حاصل سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی اور اب بھی اسی قسم کی غیر دانشمندانہ کوششوں میں سے ایک خیال کیا جائے گا کہ مچھلی کے بچوں کو تیرنے کے آداب سکھانے کی سعی خیال کی جاتی ہے۔

منع اولاد کے جواز کے متعلق ڈاکٹر صاحب جو دوسری دلیل پیش کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ "میں یہ نہیں کہتا کہ یہ تمام اموات متذکرۃ الصدر وجوہ کے باعث ہوتی ہیں لیکن ایک ایسے ملک میں جہاں کمسنی کی شادیاں عالمگیر اور دائیاں اپنی نالائقی میں شہرۂ آفاق ہوں اموات کی یہ بڑی اہم وجہ ہے" ہماری سمجھ میں کسی طرح یہ بات نہ آسکی کہ کمسنی کی شادی کی خرابیوں اور دائیوں کی ناقابلیتوں کا منع اولاد کی تحریک سے کیا تعلق ہے۔ ہوشیار مقرر اور ماہر فن مضمون نگار اپنی تقریر اور تحریر میں اکثر زور بیان کی خاطر چند ایسی باتیں بیان کر دیا کرتے ہیں کہ جن سے عام طور پر ہر شخص واقف ہو اور جو سب کے نزدیک مسلّم ہوں تاکہ لوگوں کا دھیان ان مسلّمہ حقیقتوں کی طرف بٹ جائے اور ان کے اپنے بیان کی خامیوں اور ان کی اپنی دلیلوں کی کمزوریوں کی طرف ان کی نظر نہ جائے۔ ممکن ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے بھی یہ ایک ایسی ہی کوشش کی ہو ورنہ ظاہر ہے کہ ایک ایسے شہر میں کہ جہاں اچھے باورچی مشکل سے ملتے ہوں یا جہاں عام طور پر پھلوں اور ترکاریوں کو ان کے پکنے سے پہلے ہی توڑ کر کھا لینے کا رواج ہو کوئی صاحب عقل ہمیں یہ مشورہ تو ہرگز نہ دیں گے کہ ہم ان غذاؤں کو کھائیں تو سہی اور زبان کے چٹخارے تو لے لیں لیکن حلق کے نیچے ربڑ کی نلکی لگا کر۔

ڈاکٹر صاحب نے ماؤں کے بالعموم دائم المریض ہونے کی جانب بھی ہمیں توجہ دلائی ہے اور بظاہر اس کا یہی مطلب معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح ہمیں شاید ہندوستان کی "نیم مردہ اور ضعیف و ناتوان" عورتوں کے حال پر رحم آ جائے اور ہم انھیں افزائش نسل کی "خطرناک" اور "مہلک" آزمائشوں میں مبتلا کرنے سے باز رہیں۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ ایک پڑھے لکھے اور سچ مچ کے ڈاکٹر ہونے کی وجہ سے انھیں کم سے کم یہ بھی ضرور معلوم ہوگا کہ بہت سی دائم المریض کنواریاں بیوی اور ماں بنتے ہی تندرست ہو جایا کرتی ہیں۔ اگر یہ دائم المریض لڑکیاں ڈاکٹر صاحب اور ان کے ہم خیالوں کے مشورہ پر عمل کر کے شادی ہی سے یا حصول اولاد سے باز رہتیں تو ظاہر ہے کہ ہمیشہ ان کی صحت کی وہی یا اس سے بھی بدتر حالت رہتی اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ اپنی اس حالت کے لئے ڈاکٹر صاحب کی کس حد تک شکر گزار ہوتیں۔

ہمیں اس بات کے تسلیم کرنے سے انکار نہیں ہے کہ ہمارے ملک میں مردوں کو عورتوں پر ایسا تسلط اور اس قسم کی فرماں روائی حاصل ہے کہ وہ اگر چاہیں تو عورتوں کی صحت کو اپنے حظ نفس پر قربان کر سکتے ہیں اور کبھی کبھی اس قسم کے ظلم کی کوئی مثال بھی دیکھنے کو مل جاتی ہے کہ جس میں مرد نے اپنی خواہشات و جذبات کے مقابلہ میں عورت کی صحت کی کوئی پرواہ نہ کی ہو۔ لیکن ایسی مثالیں شاذ ہیں اور شاید بمشکل ایک لاکھ عورتوں میں سے ایک کی زندگی اس طرح ضائع ہوتی ہو۔ لیکن اگر یہ مثالیں بالکل عام بھی ہوتیں تب بھی اس میں افزائش نسل کی کوششوں کا کیا قصور تھا۔ یہ تو ہمارے رسم و رواج کا قصور ہے جس نے مرد کو عورت پر ہر قسم کے مظالم کرنے کا حق دے دیا ہے اور جس کی بدولت ایک ہی نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ افسوسناک اور بہت سے مظالم اکثر ہوتے رہتے ہیں۔ کیا مردوں کی اس قسم کی زیادتیوں کا علاج یہی ہے کہ انھیں اور ان کی بیویوں کو منع اولاد کے "مہذب" طریقے سکھا دیے جائیں اور کیا ڈاکٹر صاحب کے خیال میں کمزور اور دائم المریض عورت کو اگر کوئی نقصان پہنچ سکتا ہے تو استقرار حمل ہی سے پہنچ سکتا ہے

اور اگر اس سے انھیں بچا دیا جائے تو زناشوئی کے تعلقات ان کی کمزوری یا ان کے مرض میں کوئی اضافہ نہیں کر سکتے؟ اگر ان کے مرض کے لئے زناشوئی کے تعلقات مضر ہیں تو ڈاکٹر صاحب منع اولاد کے طریقے تعلیم کر کے ان ظالم اور ناآشنائے درد مردوں کو ایسے تعلقات سے کس طرح روک لیں گے۔ کیا اپنا وقت جو یہ منع اولاد پر مضامین لکھنے پر ضائع کرنے کی بجائے اگر وہ اس قسم کے مردوں کے لئے اصلاحی مضامین لکھنے پر صرف کرتے تو زیادہ اچھا نہ ہوتا؟

ڈاکٹر صاحب نے اعداد و شمار کے متعدد نقشے اپنے مضمون میں شامل کر کے اسے بہت کافی شاندار بنا دینے کی کوشش کی ہے لیکن ان اعداد کو فراہم کرتے وقت وہ اس بات کو بھول گئے کہ ان میں سے بیشتر حسابات امریکہ کے ہیں۔ جہاں منع اولاد کے طریقے بہت دنوں سے رائج ہیں۔ اس لئے یہ زیادہ قابل اعتبار نہیں۔ ہم اس سے پیشتر یہ ظاہر کر چکے ہیں کہ قدرت کا زبردست اور طاقتور ہاتھ نسلوں کی فنا و بقا کے متعلق بطور خود انتظام کیا کرتا ہے اور ان انتظامات میں ہماری مرضی و ارادے کو دخل نہیں ہوتا۔ یورپ اور امریکہ میں تعلیم یافتہ اور متمول خاندانوں میں منع اولاد کی وبا ایک بڑی حد تک عام ہو چکی ہے۔ قدرت کا انتظام یہ تھا کہ انہی خاندانوں میں زیادہ سے زیادہ اولاد پیدا ہوتی۔ لیکن عیش پرست امیر اپنے اس فرض کی ادائیگی سے گھبرا اٹھیں۔ اور ہمارے ہمدرد دینی لوگ "ڈاکٹروں" نے یہ نسخے دیدئے کہ اولاد کی پیدائش ان کی صحت اور ان کے حسن کے لئے مضر ہے اس لئے قدرت کے انتظامات میں خلل پڑا اور وہ ان خاندانوں کی خدمات سے یکسر محروم ہو گئی کہ جنھیں اس نے انسانی نسل کا توازن قائم رکھنے کے لئے منتخب کیا تھا۔ مجبوراً قدرت کو غریب اور ادنیٰ درجہ کے خاندانوں سے وہ کام لینا پڑا جو امیروں کے لئے مخصوص تھا۔ اور نتیجہ یہ نکلا کہ غریب گھرانوں میں نسبت سے بہت زیادہ اولاد پیدا ہونے لگی۔ ظاہر ہے کہ غریب گھرانے اپنی حیثیت سے زیادہ اپنی اولاد کی پرورش اور تربیت پر خرچ نہ کر سکتے تھے۔ اور نہ اپنی عورتوں ہی کی صحت کی درستی پر کافی روپیہ خرچ کرنے کے لئے ان کے پاس تھا۔ لازمی طور پر مائیں بھی کمزور ہوتی چلی گئیں اور بچے بھی کمزور اور ناتواں پیدا ہونے لگے اور ان کی کثرت بھی ان ہی گھروں میں ہو گئی کہ جہاں وہ کافی غذا میسر نہ آنے کی وجہ سے طرح طرح کے امراض کا شکار ہو کر اموات کی تعداد میں اضافہ کرتے رہیں۔ اپنے اس دعوے کے ثبوت میں ہم امریکہ کے ایک مشہور و معروف پروفیسر ریمنڈ پل کی رائے پیش کرتے ہیں جو انھوں نے منع اولاد پر عمل کرنے والی دو ہزار عورتوں سے استفسار حالات کرنے کے بعد قائم کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "یہ جرم سے بھی بڑھ کر ہے۔ یہ ایک زبردست غلطی ہے۔ اس تحریک کا اثر تمام عورتوں پر یکساں نہیں ہے اونچے طبقہ کی عورتوں میں تو اوسط پیدائش تقریباً پانچ فی صدی کم ہو گیا ہے۔ لیکن مزدور پیشہ اور نیچے طبقہ کی عورتوں میں اور خصوصاً حبشی عورتوں میں اوسط پیدائش ضبط ولادت کے طریقوں سے اور زیادہ ہو گیا ہے۔ یعنی آبادی گھٹانے کے لئے جو وسائل اختیار کئے گئے تھے وہ حقیقتاً اسے بڑھا رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ مزدور پیشہ اور غریب طبقہ پر اس لئے الٹے نتیجہ کا کیا اثر پڑے گا۔ اور یہ صورت حال بیچاروں کے لئے کس درجہ ترددخیز ہوگی"

اب اس کے بعد امریکہ میں بچوں کی پیدائش اور اموات کے متعلق اعداد و شمار کی کچھ بہت زیادہ وقعت نہیں رہتی کیونکہ وہ طبعی حالات کے ماتحت پیدا اور ہلاک نہیں ہو رہے ہیں۔

اعداد و شمار کے اس تقریباً لایعنی طومار سے خود ڈاکٹر صاحب نے جو نتیجہ نکالا ہے وہ یہ ہے کہ "شیرخوار بچوں کی شرح اموات اور باقی زندہ بچوں کی صحت خاص کر ذیل کے امور پر منحصر ہے (۱) ماں کی صحت (۲) ماں باپ کی نسل کا اثر (۳) باپ کی آمدنی (۴) بچوں کی پیدائشوں کے درمیان وقفہ اور ان کی تعداد (۵) ماں کی عمر"

کیا کوئی صاحب عقل اور صاحب انصاف شخص کسی طرح بھی یہ تسلیم کر سکتا ہے کہ ان خرابیوں کا علاج یہ ہے کہ ہم اولاد نہ پیدا ہونے دیں؟ عورت اگر مریض ہے تو کیا اس غریب کے حصے کوئی دوا کسی اسپتال یا دواخانے میں باقی نہیں رہی ہے۔ کیا کسی طرح یہ ممکن ہے کہ بچے پیدا کرنے سے باز رہنا اس کے لئے جادو یا ٹونکے کا اثر رکھے اور اسے تندرست کر دے۔ کیا دنیا میں لاکھوں مثالیں ایسی موجود نہیں ہیں کہ جن میں شادی کی خوشی اور حصول اولاد کی مسرت نے ایک لڑکی کے برسوں کے پرانے مرض کو کھو دیا اور کیا یہ ایک مسلمہ امر نہیں ہے کہ استقرار حمل، وضع حمل اور بچے کو دودھ پلانا عورت کا خون صاف کرنے کے بہترین ذریعے ہیں۔

ماں باپ کی آمدنی کی کمی کا بھی یہ علاج نہیں ہے کہ حصول اولاد سے باز رہا جائے۔ ماں باپ کو اپنی آمدنی میں اضافہ کرنے کی کوشش کرنی چاہئیں اور اگر کسی طرح اضافہ ممکن نہ ہو تو اپنے اخراجات میں کمی کر کے بچوں کے لئے اسی آمدنی میں گنجائش نکالنی چاہئیے۔ ایک انسان کی حقیقی ضرورتیں کہ جنھیں اس کی زندگی کی ضروریات کہا جاتا ہے۔ قدرت

نے اس قدر کم رکھی ہیں کہ ان کا مہیا کر لینا کچھ بھی دشوار نہیں ہے۔ صاف اور تازہ ہوا بافراط ہر جگہ موجود ہے۔ اور اس کے لئے ہمیں کچھ خرچ نہیں کرنا پڑتا۔ تھوڑی سی غذا بھی نہایت آسانی سے میسر آسکتی ہے اور پانی کے دریاؤں اور چشموں کی بھی کوئی کمی نہیں ہے۔ اگر ہم مجبور ہیں اور کسی طرح اپنی آمدنی کو اس قدر نہیں بڑھا سکتے کہ موٹروں کی سواری اور کیک اور بسکٹ کی نہاری اپنے خاندان کے لئے مہیا کر سکیں تو ہمیں اپنی زیست کا معیار اس قدر بلند رکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ انسان کی حقیقی بلندی اس کے معیار زیست کے گراں قیمت ہونے میں مضمر نہیں ہے۔ انسان کی بلندی اور پستی کا تعلق تمام تر اس کے اخلاق سے ہے۔ انتہائی عزت اور افلاس کی زندگی بسر کر کے بھی ایک انسان بلحاظ انسانیت بہت بلند ہو سکتا ہے۔ اور ہوائی جہازوں میں اڑنے والے بھی اتنی بلند پروازی کے باوجود پستی کے عمیق ترین غار میں پڑے رہ سکتے ہیں۔ محض اس خوف سے کہ ہم اپنی اولاد کی پرورش نہ کر سکیں گے حصول اولاد سے باز رہنا انتہا درجہ کی بزدلی اور پست ہمتی ہے۔ یہ تو بالکل صاف اور کھلے ہوئے لفظوں میں اس بات کا اعتراف ہے کہ ہمیں اپنی موجودہ حالت کو ترقی دینے کی کوئی امید نہیں ہے۔ اور نئے بچے کی پیدائش کے وقت تک ہماری مالی حالت میں کوئی فرق نہیں پڑ سکتا۔

ہم رات دن یہ تماشے دیکھا کرتے ہیں کہ بالکل نحیف و ناتواں ماں باپ کی اولاد نہایت تندرست و توانا پیدا ہوئی اور ایسے حالات میں سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر ڈاکٹر پلے صاحب کے مشورہ کے مطابق یہ ماں باپ حصول اولاد سے باز رہتے تو قوم کو کس قدر سخت نقصان پہنچتا کہ وہ ایسے ہونہار فرزندوں کے وجود سے محروم رہ جاتی۔

ایک دق یا سرطان کے مریض کے متعلق ہمیں یقین کے ساتھ یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ تندرست نہیں ہو سکتا۔ اور ہم اپنی آنکھوں سے اس کی یہ حالت دیکھتے ہیں کہ کھانسی کی شدت اسے سانس نہیں لینے دیتی۔ منہ بھر بھر کر تازہ تازہ خون کی وہ کلیاں کر رہا ہے بخار کی وجہ سے اس کے جسم پر ہاتھ نہیں رکھا جاتا، اور سینے کے درد کے سبب سے وہ مچھلی کی طرح تڑپ رہا ہے۔ لیکن کیا دنیا میں کوئی ڈاکٹر یا حکیم اس کو گوارا کر سکتا ہے کہ ان حالات میں زہر دے کر اس مریض کی تکالیف کا خاتمہ کر دے؟ اگر نہیں تو پھر ہم ان بچوں کی زندگی کا خاتمہ کرنے یا انھیں دنیا میں آنے سے روک دینے کے لئے کیسے تیار ہو سکتے ہیں جن کے متعلق ہمیں کسی طرح بھی یہ نہیں معلوم ہو سکتا کہ ان کی تندرستی کی حالت کیا ہو گی۔ کیا انسانی زندگی ایسی ہی بے قیمت چیز ہے کہ محض اس ذرا سے شک اور اس ذرا سے شبہ پر کہ چونکہ والدین کی تندرستی بظاہر اچھی نہیں ہے اور اندیشہ ہے کہ اولاد کمزور اور مریض پیدا ہو گی۔ ہم اسے ضائع کر دینے کا فتویٰ دیدیں۔

اعداد و شمار کے تمام دفتر بے معنی سے ڈاکٹر پلے صاحب نے جو نتیجے نکالے ہیں وہ یہ ہیں کہ شیر خوار بچوں کی شرح اموات اور باقی بچوں کی صحت حسب ذیل کے امور پر منحصر ہے۔ (۱) ماں کی صحت (۲) ماں باپ کی نسل کا اثر (۳) باپ کی آمدنی (۴) بچوں کی پیدائشوں کے درمیان وقفہ اور ان کی تعداد (۵) ماں کی عمر۔ اور اس کا مطلب بالفاظ دیگر یہ ہے کہ اگر ماں تندرست اور باپ متمول ہو تو ڈاکٹر صاحب ایسے جوڑوں کو افزائش نسل کی کوششوں سے منع کرنا نہیں چاہتے، لیکن بدقسمتی سے دیکھا یہ جاتا ہے کہ منع اولاد کی مذموم رسم پر سب سے زیادہ عملدرآمد انہی والدین کا ہے جو خوشحال فارغ البال اور کافی تندرست و توانا ہیں۔

مسئلے کے طبی پہلو سے الگ ہٹ کر ڈاکٹر صاحب نے جو باتیں بیان فرمائی ہیں وہ ان سے بھی زیادہ عجیب ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ منع اولاد کے ذریعہ سے بدکاری کم ہو جائے گی۔ حالانکہ دنیا جانتی ہے کہ بد اطوار نوجوانوں کو بہت سی حالتوں میں جو خوف بدکاری سے روکتا ہے وہ صرف یہی ہوتا ہے کہ چند ہی روز بعد ان کی بداعمالی کا ایک جیتا جاگتا نتیجہ پیدا ہو کر تمام دنیا کو ان کی حرکتوں سے خبردار کر دیگا۔ اور نوجوانوں کے اس طبقہ کو یقیناً ڈاکٹر صاحب کا نہایت سچے دل سے ممنون ہونا چاہیئے کہ وہ ازراہ ہمدردی انھیں ایسے طریقے سے آگاہ کر دینا چاہتے ہیں کہ جو ان کے شرمناک اور ناپاک ارادوں کی تکمیل میں پوری پوری مدد دے سکیں۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے اس دعوے کے ثبوت میں ایک بہت ہی دلچسپ اور مضحکہ انگیز دلیل پیش کی ہے اور وہ یہ کہ جب خاوندوں کو یہ اطمینان ہو گا کہ اولاد پیدا ہو کر ان کی بیویوں کی صحت کو خراب نہ کرے گی تو وہ بیویوں کی طرف زیادہ مائل ہونگے اور آوارگی سے محفوظ رہیں گے۔ اس کے معنی یہی تو ہوئے کہ ڈاکٹر صاحب کے خیال میں عورت کی صحت کو جو چیز نقصان پہنچاتی ہے

وہ مستقل ہے اور زناشوئی کے تعلقات کی کثرت کا اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کاش ڈاکٹر صاحب مضمون لکھنے سے پہلے اپنی کسی زمانے کی پڑھی ہوئی کتابوں پر ایک سرسری ہی نظر ڈال لیتے۔ لیکن یہ دلیل تو انھوں نے مسئلے کے مبنی پہلو سے الگ ہو کر لکھی ہے اس لئے شکایت فضول ہے۔

آبادی کے روز افزوں اضافہ کا خوف بھی ڈاکٹر صاحب کے دور اندیش دل میں پیدا ہوا ہے اور ان کی خواہش ہے کہ دنیا کو اس مصیبت ناک انجام سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کریں کہ جب شجر و حجر اور حیوانات و نباتات سب کی بجائے صفحۂ زمین پر انسانی بچے ہی بچے رینگتے اور لڑھکتے یا اچھلتے کودتے پھدکتے نظر آئیں گے لیکن ہمارا خیال ہے کہ ہمیں اپنی زمین کو اس ہیبت ناک وقت کے لئے بھی تیار کرنا چاہئیے کہ جب فضائے اثیری میں چکر لگاتے لگاتے مریخ کئی لاکھ میل فی گھنٹہ کی رفتار کی قوت سے آکر ہماری زمین سے ٹکرائے گا اور اس حادثے کے لئے ہم اسی طرح تیار ہو سکتے ہیں کہ زمین کی آبادی بے حد ترقی کر کے اسے زیادہ سے زیادہ وزنی بنا دیں تاکہ ٹکر کا صدمہ منعکس ہو کر خود مریخ کو پاش پاش کر دے اور ہم محفوظ رہیں۔ ڈاکٹر صاحب یقین رکھیں کہ ان سے زیادہ عقلمند اور ان سے زیادہ صاحب قدرت ایک ہاتھ ہے جو دنیا کا انتظام کر رہا ہے اور اسے ان کے "مفید" مشوروں کی ضرورت نہیں ہے۔

اگر ہم ان قوموں کی تندرستی اور اخلاق کی حالت پر ایک نگاہ ڈال لیں کہ جنھوں نے منع اولاد کو اپنا مسلک و مذہب بنا رکھا ہے تو پھر کسی بحث و تمحیص کی ضرورت ہی باقی نہ رہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ ان کے اخلاق ہم سے بدتر اور ان کی صحتیں ہم سے زیادہ خراب ہو گئی ہیں۔ ان کے چہرے اگر ہمیں روشن اور چمکدار نظر آتے ہیں تو وہ ان سفوفوں اور رنگوں اور مرہموں کی بدولت ہیں جن کے لاکھوں ڈبے روزانہ مہذب دنیا اپنے منہ پر مل مل کر خالی کیا کرتی ہے وہ بالکل ایک ایسی کرسی یا میز کی طرح ہیں کہ جس کے پاؤں کو اندر ہی اندر دیمک نے چاٹ لیا ہو اور صرف اوپر کا ڈھانچا اور پالش باقی رہ گیا ہو۔ برتھ کنٹرول کی تحریک جس کا آج کل اس قدر چرچا ہو رہا ہے فی الحقیقت ایک بہت ہی تباہ کن تحریک ہے۔ جسے چند عیش پرست دماغوں نے ایجاد کیا ہے ورنہ ضروری حالات میں برتھ کنٹرول پر قدرت اور طبیعت خود ہی عملدرآمد کرا دیا کرتی ہے اور اس کے لئے قطعاً اس کی ضرورت نہیں ہے کہ کوئی مغرب زدہ ڈاکٹر یا حکیم ہمیں اس کی تعلیم دے۔

دوسرا خط جن محترم بزرگ کا ہے ان کی خدمت میں میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگر ان کے دوست کسی ایسے لاعلاج مرض میں مبتلا ہو جاتے جیسے کہ دق یا سرطان ہیں تو وہ کیا کرتے۔ اس صورت میں بھی انھیں بہرحال زندگی بسر کرنی ہی پڑتی۔ جس طرح تکلیف و مصیبت میں صبر اور شکر کے ساتھ ایک دق کا مریض اپنی زندگی کے دن پورے کرتا ہے۔۔۔۔۔ بالکل اسی طرح وہ بھی اپنی اس غیر معمولی حالت پر صبر کریں اور جس طرح وہ مریض اپنی بیماری کو لاعلاج سمجھنے کے باوجود برابر اس کے علاج میں مصروف رہتے ہیں۔ اسی طرح یہ بھی اپنی آمدنی اور خرچ کو اچھی حالت پر لانے کی کوششوں میں لگے رہیں کہ روکھی سوکھی روٹی سب کے پیٹ میں پڑتی رہے۔ انھیں یقین رکھنا چاہئیے کہ اگر ان کے خاندان کے افراد آپس میں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں تو ان کا ٹوٹا پھوٹا گھر جنت اور ان کے سوکھے ٹکڑے بہشت کے میوے ہیں جو ہزاروں ایسے خاندانوں کو نصیب نہیں ہیں کہ جہاں دولت کی افراط ہے۔ رہی بچوں کی تربیت اور تعلیم تو ہم انھیں یقین دلاتے ہیں کہ قوم میں ایک شریف بہادر سچے اور محنتی مزدور کا اضافہ کر دینا اس سے ہزار درجہ بہتر ہے کہ ایک درجن خوش پوش، خوش وضع اور نکمے نوجوان پیدا کر دئے جائیں جیسے کہ آج کل کی مروجہ تعلیم پیدا کر رہی ہے۔



انیسواں باب

مساعدت بخت

(از جناب مولوی عبدالہادی خاں صاحب شاہجہانپوری)

ابتک ہم لوگ یہی سمجھ رہے تھے کہ ولیم ہم سے جدا ہوگا اور آئندہ ہمارا رنج وراحت کا ساتھی اور معین ومددگار ہوگا۔ لہٰذا ایلین نے جوں ہی مفارقت کا نام سنا اُس نے چیخ ماری اور روتے ہوئے اپنے شوہر کا دامن پکڑ لیا۔ ولیم اس وقت دوگونہ عذاب میں مبتلا تھا۔ ایک طرف اپنی بیوی سے جدائی کا خیال تھا کہ اسکی بھی ہمت نہ تھی دوسری طرف وہ ٹھہر بھی نہ سکتا تھا کہ فوجی قوانین کی روسے وہ جاکر اپنی فوج میں شامل ہونے پر مجبور تھا۔ غریب بچی کو نہ قانون کا کوئی خیال تھا نہ تقاضائے ملازمت کا کوئی پاس تھا نہ حفظ ناموس کا لحاظ تھا۔ اُس کو تو صرف اپنے لئے اپنا شوہر چاہیئے تھا وہ موجودہ یکجائی کو آئندہ کی کسی منفعت کی توقع میں کسی قیمت پر بدلنے کے لئے تیار نہ تھی۔ ولیم نے یہ دیکھکر کہ وہ ایلین کو کسی طرح راضی اور خاموش نہیں کرسکتا اپنا دامن ایلین کے ہاتھ سے چھڑا لیا اور چاہتا تھا کہ زینہ کی طرف دوڑے مگر وہ ابھی نکلنا چاہتا ہی تھا کہ ایک ملازم نے اس کو روکا اور کہا کہ چراغ گل کردو۔ میں نے ابھی کچھ سوار ادھر آتے دیکھے ہیں۔ ولیم نے پوچھا کتنے آدمی ہوں گے اُس نے کہا کہ ان کے گھوڑوں کی آوازوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ تقریباً بیس نفر ہوں گے۔ ابھی پہلا اپنی بات تم نہیں کرچکا تھا کہ دوسرے نے آکر بتایا کہ آنے والوں نے گھر کو گھیر لیا ہے۔ ایلین یہ سنکر بول پڑے کاش اگر ہم سب اس جگہ مقتول ہوجائیں تو یہ جدائی سے بدرجہا بہتر ہے اور یہ بھی ہم لوگوں کی خوش قسمتی تھی کہ ان لوگوں نے ہمارے بھاگنے کے راستہ کو روک دیا۔

تاریکی اور سواروں کے ادھر اُدھر بھٹکتے پھرنے کو دیکھکر

ہم لوگ بھاگنے کے لئے تیار ہوگئے اور اللہ پر بھروسہ کرکے
نکل کھڑے ہوئے اور میرٹھ کا رُخ کیا۔ تھوڑی دیر ادھر
اُدھر ہاتھ پاؤں ٹوبیاں مارتے رہ کر دریائے جمنا کے کنارے
پر پہونچ گئے۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں چند ہفتے پہلے فقیر نے
ہم کو ہماری آنے والی شومیٔ قسمت سے ڈرایا تھا۔ میں نے
اپنی دونوں حالتوں کا موازنہ کیا۔ تھوڑی دور تک ہمارے
پیچھے پیچھے ہاتھی کے کراہنے کی آواز بھی آتی رہی۔ جس سے معلوم
ہوا کہ اُس کو ہماری جدائی کا قلق ہے۔ سواروں کے ہجوم
اور ہم کو گھیرنے کا سبب یہ تھا کہ دربان نے ہم کو لالچ میں آکر
دروازہ سے باہر تو نکالدیا مگر ہندوستانیوں کو خبر کردی
اس لئے یہ چند سوار بھیجے گئے کہ ہم کو گرفتار کرلیں۔ چلتے چلتے
ہم دہلی سے دور ہوگئے اور ایک چھوٹے سے جنگل کے
پاس پہونچے۔ یہاں پہونچ کر ہم نے دیا سلائی جلائی جس کا
جواب ہم کو درختوں میں سے ایک شعلہ کی صورت میں ملا۔ اور
فوراً ایک آدمی ہمارے پاس آیا اور اس نے اشارہ سے ہم
کو ایک چھوٹی سی کشتی میں جو پہلے سے وہاں موجود تھی بیٹھنے کو
کہا۔ ہم لوگ کشتی میں بیٹھ گئے اور کشتی روانہ ہوگئی۔ دہلی سے
آگرہ تک کی مسافت کو ہم نے چھ دن میں طے کیا۔ صبح سے
لیکر شام تک ہم لوگ سفر کرتے تھے اور رات کے وقت آبادی
سے دور کسی مقام میں قیام کرتے تھے۔

دن کے خوف و دہشت اور گرمی کی شدت کے مقابلہ
میں راتیں ہم کو ایک نعمت معلوم ہوتی تھیں اور راحت کا
ذریعہ تھیں۔ جوں جوں ہم آگے بڑھتے گئے راستہ خطرناک
اور شورش کے آثار نظر آتے گئے۔ ہم نے دیکھا کہ سوار یا پیدل
جو کوئی بھی دریا کے ادھر یا اُدھر گذرتا تھا اُس کو جو کوئی انگریز
ملتا تھا قتل کر دیتا تھا۔ بسا اوقات ان لوگوں نے ہمارے
ملاح کو بھی دھمکایا کہ کشتی کنارے پر لا مگر اس نے ان لوگوں
کی دھمکیوں کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ بعض اوقات اوپر چڑھتے
ہوئے یا نیچے اُترتے ہوئے چھوٹی چھوٹی ڈونگیاں آتی تھیں
کیونکہ جمنا کے کناروں پر رہنے والے چاہتے تھے کہ ہماری
کشتی کا جائزہ لیں۔ لیکن چونکہ ہم لوگ بہت اچھی طرح پوشیدہ
تھے۔ باہر سے ان کو ہمارا کوئی پتہ نہ چلتا تھا۔ ساتویں روز ہم
لوگ جمنا کے بائیں کنارہ پر اترے۔ آفتاب غروب ہوچکا
تھا اور اس کی سرخ سرخ کرنوں کا عکس آگرہ کی جامع مسجد
کے برجوں پر پڑ رہا تھا جس سے ان کی رونق دوبالا ہوگئی تھی
آگرہ کی جامع مسجد ہندوستان کی مساجد میں بہت اچھی مسجد ہے
اور بہت مضبوط ہے۔ ہم لوگ قلعہ کے مقابل اترے تھے۔ آگرہ
کا قلعہ اکبر بادشاہ نے بنایا تھا اور آج انگریزوں کے قبضہ
میں تھا۔ اُترنے پر معلوم ہوا کہ وہاں بہت کشتیاں لنگر ڈالے
ہوئے ہیں۔ ان کے ملاحوں نے ہم کو پہچان بھی لیا۔ مگر انھوں
نے ظاہر نہیں کیا۔ ولیم بنگالی بولتا تھا اور اس قدر روانی سے
بولتا تھا جیسے کوئی بنگالی بولتا ہے۔ بنگالہ میں اس نے ان
لوگوں سے بات چیت کی ان لوگوں سے معلوم ہوا کہ شورش
بدستور بڑھ رہی ہے اور انگریز قلعہ میں محصور ہیں۔ اور الہ آباد
سے کمک کے منتظر ہیں۔ یہ معلوم ہو کر ہم کو سخت پریشانی ہوئی
کہ اگر شہر میں داخل ہوتے ہیں تو قلعہ تک رسائی کیونکر ہو اور
اگر یہیں آگرہ میں قیام کا قصد ہو تب بھی کوئی اطمینان نہیں
ہوسکتا بلکہ اغلب یہی ہے کہ شورش کنندگان ہم کو ڈھونڈھ
نکالیں گے اور قتل کردیں گے۔ ہمارے لئے ایسی صورت میں
یہی چارہ کار رہ جاتا تھا کہ موقعہ کو غنیمت سمجھ کر اس سے قبل

کہ ہمارے متعلق لوگوں کو اطلاع ہو جائے تو بھاگ پڑیں۔ مگر جائیں تو کہاں جائیں۔

آخر کار یہی رائے قرار پائی کہ شارع اعظم پر پڑ لیں۔ اس پر ڈاک اور قافلے آتے جاتے رہتے ہیں ممکن ہے کہیں راستہ میں انگریزی فوجیں مل جائیں اور ہم ان میں شامل ہو سکیں۔ مگر سواری کے بغیر یہ بھی کیونکر ممکن ہے۔ پھر سب کی یہی رائے ہوئی کہ کشتی کے ذریعہ چلیں اور نیچے کو اتریں اور کہان پور میں جہاں جنرل ویلو انگریزی افسر مقیم ہے پہونچ جائیں۔ مگر ملاح نے ہمارا ساتھ نہ دیا اور تعمیل حکم سے انکار کر دیا۔ مجبور ہو کر ہم نے فی نفر ایک ہزار روپیہ دینے کہا مگر وہ کسی طرح آمادہ نہ ہوا۔ اس نے کہا کہ میں آگے کبھی نہیں گیا ہوں اور نہ اس میں اچھی طرح کشتی چلا سکوں گا۔ اس پر ہم نے کہا کہ اچھا اگر تم جانا نہیں چاہتے تو ہمارے ہاتھ کشتی بیچ دو۔ ہم خود لے جائیں گے مگر کشتی بیچنے سے بھی انکار کر دیا۔ اصل میں اس دھوکہ باز لالچی کا مقصد یہ تھا کہ ہمارے ہاتھوں اپنی کشتی منہ مانگے داموں پر بیچے اور چونکہ اس کو اندازہ ہو گیا تھا کہ ہمارے پاس روپیہ ہے اس لئے ہر چند کہ ہم نے کہا کہ ہمارے پاس زیادہ روپیہ نہیں ہے اور ہم زیادہ نہیں دے سکتے مگر اس نے جب تک پانسو روپے نہ لے لئے کشتی ہمارے حوالہ نہ کی۔ ہمارے سوا کوئی اور شخص دو سو روپے سے زیادہ اس کو قیمت ہرگز نہ دیتا۔

کشتی کا معاملہ طے ہو جانے کے بعد احتیاط کا مقتضا یہی تھا کہ آفتاب نکلنے کا انتظار کئے بغیر صبح سے پہلے پہلے ہم آگرہ سے دور ہو جائیں۔ اس موقع پر ہمارے پاس دو ملاح آئے اور ہماری کشتی چلانے اور ضرورت کے وقت کام آنے پر آمادگی ظاہر کی۔ مگر ایلن کے ابا نے ان کی درخواست کو نامنظور کر دیا۔ مگر میں اپنے بچے اور بچی کے خیال سے کہ دن کی گرمی اور رات کی خنکی سے ان دونوں کو تکلیف ہوگی اس پر مُصر تھی کہ ان ملاحوں کو رکھ لیا جائے لیکن ہندوستانیوں کے متعلق میرا تجربہ محض سطحی اور ظاہری تھا باطن کے حال سے میں قطعًا نابلد تھی۔ میں ہر شخص کی صورت کو اس کے دل کا آئینہ سمجھتی تھی۔ ان کے چہروں سے مجھے وفا داری اور مروت کے آثار نظر آتے تھے۔ میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ وہ دونوں حقیقت میں ہم کو نقصان پہونچانا چاہتے ہیں زیادہ سے زیادہ میرا خیال تھا کہ وہ اگر دھوکہ بازی بھی کریں گے تو یہی کریں گے کہ ہم سے جدا ہو کر شورش کنندگان کو ہماری حالت سے مطلع کر دیں گے آخر کار اور ولیم بھی ان دونوں کو رکھ لینے پر راضی ہو گئے اور اپنی طبیعت کے خلاف ان دونوں کو رکھ لیا۔ دونوں کو وہاں دیو کی قسم کھلائی کہ نہ وہ دونوں خیانت کریں گے اور نہ وعدہ خلافی کریں گے۔ انھوں نے قسم کھا لی۔ ہم اس سے بھی غافل تھے کہ ان کے دلوں میں ہماری طرف سے کینہ ہے اور ہم کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ ہندوؤں سے الگ ہیں۔ مگر چونکہ ہم کو اس اصولی و فروعی اختلاف کی کوئی خبر نہ تھی اس لئے ہم نے ان کو حلف تو دیا مگر جس سے متوقع نتیجہ نکلنے کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی تھی ہم کو کیا معلوم تھا کہ وہ دونوں چور دل کے جاسوس ہیں جو دریاؤں کے کنارے مسافروں کو لوٹتے کھسوٹتے ہیں۔ بہرحال ہم لوگ اپنے جی میں مطمئن ہو کر یہاں سے روانہ ہوئے۔ قلعہ کے سامنے سے گذرتے ہوئے ہم کسی قدر رُکے کہ شاید قلعہ کے انگریز ہم کو دیکھ لیں مگر جب ان میں مایوسی ہوئی اور آفتاب نکلنے کو ہو رہا تھا [illegible] دل کے خوف

سے وہاں سے دور نکل گئے۔

اس کشتی میں ہم کو کافی آرام تھا کیونکہ اس کی چھتری بڑی تھی اور ضرورت کے وقت اس کے سایہ میں لباس تبدیل کرسکتے تھے۔ وہ اور ولیم کنارہ پر اتر کر ہرطرح کا شکار کرتے تھے۔ مور اور بعض آبی جانوروں کا شکار کرلیتے تھے اور ہم لوگ تازہ گوشت بھون اور پکا کر کھاتے تھے۔ آگرہ اور کانپور کی مسافت دریا کے راستہ ستر گھنٹہ کی ہے وہ دونوں ملاح کشتی کو قصداً آہستہ آہستہ لے جارہے تھے۔ دوسرے دن بائیں کنارہ کے قریب ایک جگہ جہاں پر بالکل سیدھا گھاٹ تھا کشتی ٹوٹ گئی اور پانی بھر گیا۔ ہم لوگ اُتر آئے اور بعض ضروری چیزیں بھی نکال لیں کہ کہیں کشتی ڈوب نہ جائے اور ہم لوگ اس سوچ میں پڑ گئے کہ آخر کشتی کے اس خاص جگہ بلا سبب ٹوٹنے کے کیا معنی ہیں۔ مگر اس کا کوئی سبب ہماری سمجھ میں نہیں آیا محض شومی قسمت معلوم ہوئی۔ غرضکہ ہم لوگ ایک جھاڑی میں چلے گئے اور وہاں ایک صاف سی جگہ تلاش کرکے اتر پڑے۔ رات کو مچھروں اور جنگلی جانوروں کے خیال سے آگ جلائی۔ پھر دن کا بقیہ کھانا کھا کر عبادت میں مشغول ہو کر جب سونے کا وقت آیا تو انھوں نے کہا کہ باری باری ہم میں سے ہر ایک صبح تک پہرا دے تاکہ اطمینان سے سوسکیں۔ مگر گذشتہ حوادث کی یاد اور آئندہ کے خوف میں سونا تو بڑی بات پاؤں پھیلانے کا بھی ہم کو کہاں ہوش تھا۔

میں سوچ رہی تھی کہ یا اللہ اب آئندہ آگے کیونکر جائیں گے دوسری کشتی ملے گی یا نہیں۔ اس ذلت و خواری سے بھی کبھی نجات ہوگی۔ یہی اور اس قسم کے دوسرے خیالات میں مستغرق میں نے اپنے آپ کو سوتا بنا لیا تاکہ ایلن اور اس کے ابا بھی مجھکو سوتا دیکھکر سو جائیں میرا خیال ہے کہ اُن دونوں نے میرے خیال سے اپنے آپ کو سوتوں میں ڈال لیا۔ سب سے زیادہ اطمینان اور سکون سے صرف ویل سویا۔ ولیم خیمہ کے باہر پہرے پر تھا اس کا پہرا دس بجے تک تھا۔ ولیم کے بعد ان کا چار گھنٹے تک اور ان کے بعد صبح تک میرا پہرہ تھا۔

بیسواں باب

ٹھگ

ہمارے دونوں ملاح ایک طرف کو ہو کر جہاں پر کئی پگڈنڈیاں ملتی تھیں سر پر چادر ڈال کر لیٹ گئے اور ہمارے دیکھتے ہوئے سو گئے۔ سونے سے پہلے ہم نے بہت سا کوڑا کرکٹ خیمہ کے باہر الاؤ کے پاس جمع کر دیا تاکہ آگ برابر روشن رہ سکے۔ اور کیڑے مکوڑوں اور درندوں سے امن رہے۔ پھر ایک ملاح نے کہا کہ کل میں آپ کے لئے ایک کشتی تلاش کروں گا۔ آہ! خط استوا کے نیچے راتیں بہت طویل ہوتی ہیں میں چت لیٹی تھی ویل میری چھاتی پر لیٹا تھا کبھی مصیبتوں کا ہولناک منظر سامنے آجاتا تھا اور کبھی میں اپنے دل کو مضبوط کرتی تھی۔ اسی کے ساتھ ایلن اور اس کے ابا کی حالت سے بھی میں غافل نہ تھی۔ ان کی سانس کی رفتار کو سنتی تھی اور نبض ٹٹولتی تھی اگر صحیح اور درست معلوم ہوتی تھی تو جی کو تسکین ہوتی تھی۔ اور اگر کوئی بدنظمی اور بے ترتیبی محسوس کرتی تھی تو اس طرح پیچ و تاب کھاتی تھی جیسے زخمی سانپ۔ جن لوگوں کو محبت اور شفقت سے واسطہ پڑا ہے وہ میری حالت کا اندازہ کرسکتے ہیں۔ ورنہ اگر میں خود اپنی حالت کا ذکر کردوں تو بے جا طوالت ہوگی۔ جب ایلن کے ابا کی باری آئی تو وہ

خیمہ سے باہر چلے گئے اور ولیم آکر ان کی جگہ پر سو گیا۔ اس خیال سے کہ ان کو مجھ سے بہت محبت ہے اور اگر میں اپنی باری کے وقت سو گئی تو وہ مجھکو جگا کر پہرے پر کھڑا نہ کریں گے اور صبح تک خود پہرا دیتے رہیں گے۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ میں سوؤں گی نہیں۔ مگر انسان کی طبیعت بھی ایک طرفہ شے ہے دو بجے تک سونے نہ سونے میں میں آزاد تھی مگر اس وقت مجھکو کسی طرح نیند نہ آئی۔ مگر اب جبکہ میری باری قریب آئی اور میرے پہرہ دینے کا وقت آگیا تو نیند آنے لگی۔ اور یہاں تک غلبہ ہوا کہ میں کسی طرح نیند کو نہ روک سکی بمشکل دس منٹ گذرے ہونگے کہ میں غافل ہو گئی۔ نہ ہوا کی سرسراہٹ نہ کتوں کا بھونکنا، نہ بانسکرے کی سیٹی، نہ ناکے کی گڑگڑاہٹ نہ جگنوؤں کا اڑنا۔ نہ حشرات الارض کی چرچراہٹ۔ نہ جمنا کا تلاطم۔ نہ اس کالی رات کی سیاہی۔ نہ ستاروں کا طلوع و غروب۔ غرضکہ کوئی چیز مجھکو نیند سے نہ روک سکی۔ حالانکہ میرا ارادہ تھا کہ صبح کو میں حسن فطرت کا مطالعہ کروں گی۔ مگر میرا خیال میرے کوئی کام نہ آیا۔ میری آنکھوں پر نیند کا غلبہ ہو گیا۔ ہر چند کہ ان حالات میں تو سکتہ و حیرت کا غلبہ عام طور پر ہوتا ہے۔ میں سو رہی تھی کہ مجھے ایک دفعہ ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے مجھکو بیدار کیا میں خوفزدہ ہو کر اٹھ بیٹھی اور آنکھیں ملتے ہوئے خیمہ کے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ مجھے ڈر سا لگا اور ایسا معلوم ہوا کہ دو آدمی خیمہ کے گرد گھوم رہے ہیں۔ میرا وہم فوراً اس طرف منتقل ہوا کہ کہیں ٹھگ تو نہیں ہیں۔ جن کے نزدیک کسی غیر مذہب والے کو مار ڈالنا مذہبی ثواب کا کام ہے۔ یہ فکر مجھ پر اس قدر غالب ہو گیا کہ مجھے سانپ سونگھ گیا ہے حس و حرکت کی قوت زائل ہو گئی۔ مگر اسی دوران میں ویل رو پڑا۔ اس کی آواز سے اس کے ابا اور ولیم بھی ہوشیار ہو گئے اور مجھکو انھوں نے آواز دی جس سے میری تمام وحشت کافور ہو گئی اور میں نے تمام واقعہ ان دونوں کے سامنے بیان کیا۔ یہ سنکر دونوں نے میرا بہت مذاق اڑایا۔ اور مجھے پاگل بنایا۔ خیمہ کے باہر جو آگ جل رہی تھی گل ہو گئی تھی۔ اس میں میں نے کچھ کوڑا کرکٹ ڈالدیا جس سے وہ روشن ہو گئی۔ پھر ہم نے اپنے راہنما ملاحوں کو دیکھا جو خیمہ کے باہر سو رہے تھے اور اب اس لئے اٹھے تھے کہ ہم کو ہلاک کر دیں۔ مگر جب انھوں نے دیکھا کہ ہم لوگ ہوشیار ہو گئے ہیں تو وہ دونوں بھاگ کر ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

ان دونوں کے بھاگ جانے سے ہم کو معلوم ہو گیا کہ ہو نہ ہو یہ لوگ ضرور ٹھگ تھے۔ ان کو جب یہ اندازہ ہو گیا کہ ہمارے پاس روپیہ پیسہ اور جواہرات ہیں تو انھوں نے کشتی کو توڑ دیا اور بستی سے دور اس جگہ ہم کو اتارا تاکہ بلا روک ٹوک وہ ہم پر اپنا وار کر سکیں اور ہمارے پاس جو کچھ ہے اس کو لیکر ہم کو مار ڈالیں۔ لیکن اللہ تبارک و تعالیٰ کی مہربانی نے ہم کو ان کے چنگل سے محفوظ رکھا۔ ویل رونے لگا اور وہ اپنے ارادہ میں کامیاب نہ ہوسکے اور بھاگ گئے۔ اس کے بعد نیند کیونکر آتی۔ صبح ہونے میں ابھی تین گھنٹے تھے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلنے لگی تھی۔ ویل تو خیر سو گیا اور ہم تینوں الاؤ کے گرد بیٹھکر سوچنے لگے کہ کل کیا کریں کیونکر چلیں اور کدھر کو چلیں۔ ولیم کو راستوں کا اچھی طرح علم تھا۔ اس نے کہا کہ ہم لوگ ابھی کانپور کے آدھے راستہ کو بھی طے نہیں کر پائے ہیں۔ شاہراہ اعظم سے ہم کو بچکر چلنا چاہیئے کیونکہ شورش کنندگان کا اس پر تسلط ہے اگر بائیں کنارہ کے

بجائے ہم لوگ داہنی طرف اُترتے ہوتے تو اچھا ہوتا کہ وہ سمت آبادی اور آمد و رفت سے خالی رہتی ہے مگر ہم لوگ بائیں جانب اترنے پر مجبور تھے کیونکہ ان دونوں خبیثوں نے ہم کو قصداً اس طرف اتارا تھا۔ ہم کو اپنی کور بختی کی شکایت کرنے کا بھی کوئی حق نہیں ہے کیونکہ ان کا لوٹنا ایک خاص مقصد کے لئے تھا جیسا کہ معلوم ہوگیا۔ تجربہ کار سیاحوں نے اس امر کو دریافت کیا ہے کہ ٹھگ سات شخص ہوتے ہیں جن میں سے ہر ایک کا ایک مخصوص کام ہوتا ہے ایک سب کا سردار ہوتا ہے جس کے احکام کی سب بلا چون و چرا تعمیل کرتے ہیں۔ دوسرا لوگوں کو پھنسانے اور گانٹھنے کا کام کرتا ہے۔ تیسرا قتل کرتے وقت دیوتاؤں کے منتر پڑھتا ہے۔ چوتھا اور پانچواں مقتولین کو دفن کرنے کے لئے گڑھا کھودتے ہیں۔ اور چھٹا ساتواں ایک مخصوص رومال سے گلے میں پھندا ڈال کر لوگوں کو گلا گھونٹ کر مار ڈالتے ہیں۔ دفن اس طرح کرتے ہیں کہ ایک بہت گہرا گڑھا کھود کر ایک لاش کو چت لٹاتے ہیں اور دوسری لاش اس طرح پہلی پر پیٹ کے بل رکھتے ہیں کہ اوپر والی لاش کا سر پہلی لاش کے پیروں کی طرف ہوتا ہے اور اگر لاشیں دو سے زیادہ ہوں تو اسی ترتیب سے نیچے اوپر رکھتے چلے جاتے ہیں۔

ٹھگوں کا حال سُن کر میں نے اُن سے کہا تو کیا اب یہ شریر ہم پر حملہ نہ کریں گے ولیم نے درمیان میں مداخلت کرکے کہا کہ کچھ خوف نہ کرو میں تم سے زیادہ ٹھگوں کو جانتا ہوں مجھکو معلوم ہے کہ ٹھگ ہمیشہ دھوکہ دیکر مارتے ہیں تاکہ اُن کے مقتول پوشیدہ رکھے جاسکیں۔ علانیہ حملہ کی جرأت نہیں کر پاتے ہیں۔ ہم لوگ اسی طرح آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ آہستہ آہستہ پاؤں کی آہٹ ہم کو اپنی طرف آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ اور ولیم دونوں ہوشیار ہو گئے۔ اپنے اپنے پستول سنبھال لئے اور چلایا ہی چاہتے تھے کہ درختوں میں سے ہرن کی سنگوٹیاں نظر آئیں۔ اُس نے دُور سے روشنی دیکھی ہوگی۔ اُس سے قریب سے لطف اندوزی کرنی چاہی مگر جب اُن کو حرکت کرتے ہوئے دیکھا تو بھاگ گیا۔ اس خوبصورت جانور کو جنگل میں نہ دن کو چین ہے نہ رات کو سکون ہے درندوں کے خوف سے بھاگتا پھرتا ہے۔ اس کی حالت بالکل ہمارے جیسی حالت ہے۔ غرضکہ صبح ہوگئی اور روشنی پھیلنے لگی۔ ہم لوگ ولیم کی رائے پر غور کرنے لگے کہ سڑک اعظم پر نہ جائیں اور اسی طرف رہ کر منزل طے کریں۔ ولیم یہ بھی کہتا تھا کہ ہندوستانیوں کو جیسا تسلط دہلی اور میرٹھ میں حاصل ہے ایسا ہندوستان میں کسی جگہ نہیں ہے اور ممکن ہے کہ اطراف الہ آباد میں اس شورش کا کوئی اثر بھی نہ ہوا ہو اور وہاں بالکل امن و امان ہو۔ سب سے افضل جو ہندوستانی ہم کو ملے گا اُس سے تمام حالات کا علم ہوجائے گا اور بہت ممکن ہے کہ اس کے ذریعہ کھانا کپڑا اور سواری کا بھی بندوبست ہوجائے۔ ایلین کے ابا کو چونکہ ہندوستانیوں سے بہت بدظنی تھی اس لئے وہ ہندوستانیوں کے راستہ میں ملنے سے بچنا چاہتے تھے اور عام راستہ پر چلنا پسند نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے یہ بھی کہا میرا جی ہوتا ہے گوالیار چلا جاؤں وہاں میرے بہت سے کاشتکار دوست ہیں۔ فرانس کی دیگر عورتوں کے برخلاف میرا اُن پر بہت اثر تھا کیونکہ شروع ہی سے میں رنج و راحت شادی و غم میں اُن کی شریک رہی ہوں کبھی اُن کے مال کو بیجا ضائع نہیں کیا۔ اُن کی ناموس کی ہمیشہ حفاظت کی اور کبھی عصمت و وفاداری میں فرق نہیں آنے دیا ان وجوہ سے اُن کو بھی مجھ پر بھروسہ اور میری اصابت رائے پر اعتماد تھا۔

شام کلیان

(ایک سیاسی اسیر کے قلم سے)

(زندان فرنگ کی چہار دیواری کیسی کیسی عجیب و غریب ہستیوں کو اپنے آغوش میں پوشیدہ کئے ہوئے ہے ایسے بلند پایہ ادیب کے تعمیرات کی جلوہ باریوں سے دنیائے ادب بیگانہ تھی (ایڈیٹر)

"بھیا رومیش ہیں کیا؟" گوپال نے چق ہٹا کر کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ "اوہو! پڑھائی ہو رہی ہے۔ کیوں صاحب۔ کیا پڑھا جا رہا ہے؟"

رومیش نے سامنے سے کتاب ہٹا کر مسکراتے ہوئے کہا۔ "آؤ آؤ۔ بیٹھو۔ کچھ نہیں۔ یوں ہی شیلے دیکھ رہا تھا۔"

"آہا شیلے؟ اس کا Prometheus unbound پڑھا؟" گوپال نے کھڑکی کے سامنے میز کے پاس پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ کر کہا۔ "واہ! کیا خوب لکھا ہے۔ اس کو پڑھتے پڑھتے معلوم ہوتا ہے گویا ہزار ہا لطیف رنگوں کا ایک دریا ہے۔ جو معلوم ہوتا ہے افق کو چیر کر پار نکل جائیگا جس کے کناروں پر جھکے ہوئے نازک پودوں کی، کل کھلنے والی کلیاں، اپنا عکس اس کی امنڈتی ہوئی لہروں کے سینہ میں چھپائے ہوئے ہیں۔ پرانے اور بوسیدہ پتے اس کی بلا خیز لہروں کے تھپیڑے کھا کھا کر ساحل کی ریت پر اُس بزدل کپتان کی طرح پڑے ہیں، جو طوفان کی آمد محسوس کرتے ہی اپنا چارج کسی دوسرے کو سپرد کر کے خود نزدیک کے جزیرے میں اتر گیا ہو۔ جہاز نہ جانے کہاں گیا اور کس طرف گیا؟ سوائے اس کے اب کپتان کے لئے کوئی چارہ نہیں کہ وہ کنارے کی ریت میں ذروں کی بے رحم چمک دیکھا کرے۔ جوار بھاٹے کا دلدوز شور سنا کرے اور اس خوف کو سختی کی ساتھ امیدوں کے قریب سے دبایا کرے کہ ایک روز اس کا جسم بھی اس خشک اور بے جان ریت میں چند اور بے جان اور خشک ذروں کا اضافہ کر دیگا۔

"کبھی کبھی معلوم ہوتا ہے کہ ترنم کا ایک جھونکا آیا جس کے تعاقب میں خوشبو، تتلیوں کی ایک رنگ برنگی قطار بن کر ہوا میں اپنے چمکیلے بازو بغیر ہلائے ہی آہستہ آہستہ تیرتی ہوئی آرہی ہے۔

کبھی معلوم ہوتا ہے ایک باغی دن بھر لڑنے کے بعد طوفان سے تھکی ہوئی لہروں کی طرح۔ کہیں بے سدھ پڑا ہے۔ پاس ہی ایک درخت ہے جس کا آدھے سے زیادہ حصہ سوکھ چکا ہے جس کے نیچے کی گھاس کسی دیہاتی نے کہیں کہیں سے چھیل کر۔ زمین کو تازہ زخم کی طرح۔ دھوپ میں جلنے کے لئے برہنہ چھوڑ دیا ہے۔ درخت کے موٹے تنے میں جو ایک طرف سے کھوکھلا ہے۔ باغی کی مڑی ہوئی شکستہ تلوار رکھی ہے۔ ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ جس نے اس کے کھردرے بال اس کی پیشانی پر بکھیر دئے۔ اس نے اپنے پھٹے ہوئے کپڑوں کی دھجیوں کو سنوارا۔ آہستگی سے اٹھا۔ بازو اوپر کو کر کے ایک انگڑائی لی۔ اور پھر اٹھتے ہوئے بازوؤں کو ایک طرف کو جھکا کر اس کھوکھل میں سے اپنی تلوار نکالی۔ اسے غور سے دیکھا۔ اور پھر پاگلوں کی طرح جھوم جھوم کر مستی میں لڑائی کا گیت چلا چلا کر گانے لگا۔

"کبھی اس کو پڑھتے پڑھتے ایک دردناک چیخ سی کانوں میں گونجنے لگتی ہے جو کروڑہا غریبوں، مظلوموں اور بیکسوں کے دلوں سے نکلی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

"کبھی ایک دبی ہوئی آہ سی ہوتی ہے جو اس عیش و آرام۔ اس لہو و لعب۔ اس ریل اور موٹر۔ اس سینما اور تھیئٹر۔ اس محلات اور باغات کی دنیا سے دور۔ بہت دور۔ کہیں پیچھے سے آتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔"

"کبھی کبھی بین السطور چھپی ہوئی "کیوں" اور "کیوں" بھی وہ جو غم اور غصہ۔ یاس اور حسرت۔ درد اور غم۔ بھوک اور پیاس سے آلودہ ہے۔ جواب کے لئے خاموش سپہر کے سامنے پھینکی جاتی ہے۔ وہ "کیوں"، دل میں ایک چبھن۔ ایک کسک۔ ایک تڑپ سی پیدا

کر دیتی ہے۔ لیکن نیچے۔ خاموش۔ بے خبر۔ قبر کا سکون لئے ہوئے۔ غم آگیں چشمہ کا نیاست زا طلسم چھپائے ہوئے بے پرواہی کے ساتھ توڑتی پھوڑتی، بناتی بگاڑتی، ضدی بچہ کی طرح مچلتی ہوئی آگے ہی آگے چلی جاتی ہے۔"

یہ کہہ کر گوپال کرسی کے تکیہ کے ساتھ لگ گیا۔ اپنا سر پیچھے کی طرف پھینک دیا۔ اور اپنی اداس اور کھوئی کھوئی سی آنکھیں آدھی گھما کر رمیش کے چہرہ پر جما دیں۔ لیکن نظریں خالی خالی سی تھیں۔ جو دیکھتے ہوئے بھی نہیں دیکھ رہی تھیں۔ سمندر کے بیچ میں ابھری ہوئی لہر کی طرح جو کسی بھی کنارے تک پہونچے بغیر غائب ہو جاتی ہے۔ اسکی نگاہیں بھی اٹھ کر۔ اچٹ کر۔ پھر اپنے اندر ہی غائب ہو گئیں۔

"گوپال تم تو آندھی کے ساتھ کے بادلوں کی طرح لوٹے۔ چھاتی پھاڑ کر دم بھر برسے۔ اور پھر اٹھے ہوئے بادلوں کی طرح افق کے پیچھے غائب ہو گئے" رمیش کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد بولا "چائے تو پیو گے نا۔ کیوں؟" "ہاں ہاں۔ کیوں نہیں۔ چائے کا وقت ہے۔ ضرور پیوں گا"

رمیش چائے کے لئے برابر کے کمرے میں سے اندر کی طرف چلا گیا۔ گوپال اکیلا بیٹھا ہوا گنگنانے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد رمیش چائے لیے ہوئے آ پہنچا۔ گوپال نے میز کے ایک کونے کو کتابیں سرکا کر خالی کیا۔ چائے وہاں رکھی گئی۔ دونوں دوستوں نے اپنی اپنی کرسیاں اسکے نزدیک کر لیں اور چائے پینے لگے۔

شام کا وقت تھا سورج کھڑکی میں سے جھک جھک کر جو گوپال کی کرسی کے عین پیچھے تھی کمرے کے اندر جھانک رہا تھا اس کی ترچھی ترچھی کرنیں چینی کے چکنے برتنوں پر سے پھسل کر سامنے کی دیوار پر آویزاں ایک تصویر کے شیشے پر گہرے زرد رنگ کی ایک ہلکی سی لکیر میں مرکوز ہو گئی تھیں۔

"گوپال تم ابھی ابھی کیا گنگنا رہے تھے۔ بہت دنوں سے تم نے کچھ سنایا نہیں۔ لاؤ آج تو کچھ سنا ہی دو۔"

گوپال مسکرایا۔ اپنی چائے کو چمچی سے ہلایا۔ اور پیالی اٹھاتے ہوئے کہا۔ "کیا سنو گے؟ میں تو ابھی ابھی سورداس کا ایک پد گنگنا رہا تھا۔ ہے تو وہ ملہار کی چیز۔ لیکن میں اسے کلیان میں گا رہا تھا۔"

"ہاں ہاں؟ ہم بھی تو سنیں وہ کیا ہے؟" رمیش نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

گوپال نے اپنی پیالی میز پر رکھ دی جس میں صرف دو ایک گھونٹ ہی باقی ہونگے۔ ایک مچھر گھو۔ و۔ وں کرتا ہوا کان کے پاس سے گذر گیا۔ ایک چڑیا کھڑکی تک اڑتی ہوئی آئی۔ اور فوراً ہی پھڑ پھڑا کر بولتی ہوئی ایک طرف کو مڑ گئی۔ گوپال نے شروع کیا۔

بھور بن بولن لاگے مور
کر سنبھاد نند نندن کی سن بادر کو گھور
جن کو پیا پردیس سدھارے سوتیا پری نچوڑ
چانک، چک، چکور، پپیہا۔ لے سب ہی مل جوڑ
ہو ہیں بہت دکھ برہ بچھڑے کو رہت برہ کو جوڑ
سورداس پربھو دیکھ نہ بھو جنم پرت ہے بور

راگ آہستہ آہستہ گھٹنوں کے بل چلتے ہوئے بچہ کی طرح الھڑ الھڑ ہما بے پرواہی اور بے خوفی کے ساتھ۔ خدا کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ کبھی کبھی معلوم ہوتا تھا گویا کوئی بے خوفی سے چرتا ہوا ہرن آہٹ پا کر یکبارگی ہی چونک گیا ہے۔ اپنی گردن اور اپنی ٹانگیں اکڑا اکڑا کر کانوں کو جلدی جلدی گھما رہا ہے اور ہوا میں ہلتے ہوئے پھول کے پیچھے بیقرار بھنورے کی طرح اپنی مست آنکھوں کو ادھر ادھر پھرا رہا ہے۔ اندھیری رات میں اڑتی ہوئی سارسوں کی قطار کی طرح جن کے

بازوؤں کی پھڑپھڑاہٹ تو کانوں تک پہنچتی ہے۔ لیکن نظر کچھ بھی نہیں آتا۔ تخیلات کا ایک ہجوم ہستی کی فضا میں پھڑپھڑاتا معلوم ہو رہا تھا۔ جو چاروں طرف پھیلے ہوئے دھندلکے کے ساتھ اُس چھوٹی بہن کی طرح جو بڑی بہن کی انگلی پکڑے، اس کی ٹانگوں سے ٹکراتی چلی جاتی ہے۔ یہ بھی کسی نامعلوم اور نہ دیکھی ہوئی سمت کی طرف چلا جا رہا تھا۔

کہیں کہیں راگ میں پرندوں کے گیت۔ اُن کے گھونسلوں کی سرسراہٹ اور ان کے بچوں کی محبت کا ارتسام اس طرح صریح صریح اور صاف نظر آ رہا تھا جیسے کسی شفاف اور غیر متحرک جھیل کی تہ میں ناچتی ہوئی مچھلیاں اور چمکتی ہوئی سیپ۔

کہیں پو پھٹنے سے پیشتر گھنے جنگل میں لمبے لمبے درختوں کی شاندار اور بھاری نیند کا سا سکون راگ کے زیر و بم میں۔ بارش کے بعد نکلی ہوئی دھوپ میں صنوبر کے نوکیلے پتوں سے لٹکتی ہوئی بوندوں کی طرح جھلک رہا تھا۔

راگ ختم ہو گیا۔ ہوا کے لرزاں جھونکے اُسے اڑا کر آسمان کے اُس خزانے میں لے گئے جہاں قوس قزح کے رنگ محفوظ ہیں جہاں کروڑوں کھوئے ہوئے گانے موجود ہیں۔ جہاں شاعروں کے گنگنائے ہوئے آنسوؤں سے بھیگے بےشمار اشعار ہیں۔ جہاں محبوبوں کی بوسوں سے شرمائی لاتعداد مسکراہٹیں ہیں۔ اور جہاں شام کے دھندلکے میں درختوں کے پیچھے کی ان گنت پہلی ملاقاتوں کے بے معنی۔ آدھے آدھے۔ زیر لب ادا کئے ہوئے الفاظ ہیں۔

کمرے میں مکمل خاموشی تھی۔ اس کے کونے کونے میں۔ فرش سے چھت تک خوشبو کی طرح راگ بسا ہوا تھا۔ دل کے تار اسی ترتیب سے بل رہے تھے جس ترتیب سے راگ کے زیر و بم نے ہلا دیا تھا۔ کمرے کی بے جان فضا میں۔ وقت اور مقام Time and space ایک لطیف مگر وسیع زندگی بنے ہوئے آہستہ آہستہ تیرتے ہوئے ناچ رہے تھے۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔ کھڑکی میں سے شبنم آلودہ ٹھنڈی ہوا ایک روشن دھند۔ لکے کو لئے ہوئے کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔

کھڑکی کے سامنے کرسی پر بیٹھا ہوا گوپال جو شام کی دھندلی سی زرد روشنی میں لپٹا ہوا تھا سنہری چوکھٹے میں جڑی ہوئی مدہم اور پیارے Background پس منظر پر ایک نہایت ہی حسین تصویر معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے پیارے ہونٹ اس کا جوانی میں تمتمایا ہوا چہرہ۔ اس کے لمبے لمبے نپولین کی طرح آگے جھکے ہوئے آوارہ بال۔ اس کی آدھی کھلی آنکھیں جن کی چمک ایک نمی سی بن کر دونوں پلکوں کے بیچ میں کچھ نیچے کی طرف۔ ایک پتلی سی لکیر بن کر رہ گئی تھی کسی ماہر فن مصور کے موقلم کی لطیف ترین سحر کاری معلوم ہوتی تھی۔

یکایک سامنے کے مکان کی کھڑکی زور سے بند ہوئی اس نے چونک کر دیکھا۔ گلی کے پرلی طرف۔ اُس شیشوں والی کھڑکی کے پیچھے کوئی سفید سی ساڑھی پہنے ہوئے مڑی جا رہی ہے۔

۳

"یہ آج اس گھڑی کو کیا ہو گیا، کمبخت سات سے آگے ہی نہیں سرکتی" کانتا نے جھلا کر گھڑی پر سے نظریں ہٹائیں" اور بابو جی بھی تو ابھی تک نہیں آئے۔ آج انھیں بھی نہ جانے کیا ہو گیا؟ ارے رامو ذرا معلوم تو کر کیا بج گیا؟"

"بی بی جی۔ یہ گھڑی تو ٹھیک ہے ابھی کل ہی تو بابو جی نے اپنی گھڑی کی ساتھ ملائی تھی۔ اور بابو جی کے آنے کا وقت بھی ابھی کہاں ہوا ہے؟ تھوڑی دیر میں آتے ہی ہوں گے"

لیکن نہ جانے کیوں آج کانتا بابو جی کے گلے لپٹ جانے کیلئے

اپنی بیقرار ہو رہی تھی۔ بار بار دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی
بار بار گھڑی پر نگاہیں ڈال رہی تھی۔ اور پھر اُن منے سے ننّے
اپنی تھکی ہوئی نظروں کو یکجا کرکے زور سے آنکھیں بند کر لیتی تھی۔

اس کی شادی ہوئے دو سال سے اوپر گزر چکے ہیں۔ شادی کا پہلا سال تو انہیں بیقراریوں اور بے خبریوں میں گزرا۔ جہیں ایک دوسرے کے لئے اپنے آپ کو روحانی اور جسمانی طور پر زیادہ سے زیادہ مٹا دینے میں مصروف رہتا ہے۔ اور جس کی شیریں یاد زمانہ کے پاس ایک متبرک اور مقدس امانت کے طور پر ہمیشہ محفوظ رہتی ہے جس کو زمانہ تنہائیوں میں مصیبتوں میں حتیٰ کہ موت کے دروازے پر بھی۔ کبھی اندھیری رات کے آغوش میں چھپا کر۔ کبھی ہنستے ہوئے چاند کے قہقہوں کی ساتھ۔ کبھی خاموشی سے بہتے ہوئے پانی کے خروش میں کبھی کھلے ہوئے پھول کے بجتے ہوئے نغموں کے ذریعے۔ کبھی صبح اور شام کے دھندلکے میں اور کبھی قوسِ قزح کے رنگین دامن میں لپیٹ کر ہمیں واپس کرتا رہتا ہے۔

ان کی زندگی اور زندگی کی تمام لطافتیں۔ اُن کی دنیا اور دنیا کی تمام موسیقی۔ صرف ایک نقطے پر مرکوز سی معلوم ہوتی تھیں۔ اور وہ تھا مسکراہٹوں۔ خوشیوں اور امنگوں کا ایک گہرا گلابی غنچہ۔ لطیف اور نازک ترین۔ ایک جاڑا اور وہ بھی کڑکڑاتا ہوا ایک گرمی اور وہ بھی جھلستی ہوئی اس پر سے گزر چکی تھی اور یہ جہاں کا تہاں۔ ادھ کھلا رہ گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاید یہ کھلنے سے پہلے ہی خواہشات کی آندھیوں اور ہوس کے جھکڑوں میں پھنس کر پتی پتی ہو جائے گا۔ لیکن آج پھر امرت کی دو بوندیں۔ صرف دو۔ جن میں اس کی سرسبزی کا راز اور زندگی کا اعجاز ہے۔ کانتا کی آنکھوں میں۔ نیم شب کی طرح گہری اور الاپے ہوئے راگ کی طرح وسیع آنکھوں میں۔ ہل رہی ہیں۔ اس کا دل اچھل کر گلے میں اٹکتا ہوا سا معلوم ہوتا تھا اس کی چھاتی بیٹھتی ہوئی سی معلوم ہو رہی تھی۔ یکایک اس کے خون میں کچھ ہیجان سا ہوا۔ اس کے رخساروں پر ایک سایہ سا جھوم گیا۔ تیز تیز سانسوں نے اس کے ہونٹوں کی پنکھڑیاں علیحدہ کر دیں۔ جذبات کی متلاطم لہروں پر سے۔۔۔۔۔۔۔ بہتا ہوا ایک ٹھنڈا سا جھونکا اُسے سہلا گیا۔ اس کے ہونٹوں پر کچھ لفظ کانپے جس طرح گھاس کی پتی پر شبنم کے قطرے۔

"میں بابو۔۔۔۔۔۔ جی۔۔۔۔ کی۔۔۔۔۔ بابوجی۔۔۔ میرے" یہ لفظ کہتے اُس نے ایک بار کھڑکی کی طرف دیکھا جو بند تھی اور دوسرے سیکنڈ میں دروازے کی طرف جھانکا۔ دیوار پر لٹکی ہوئی گھڑی دیکھی لیکن دیکھا کچھ بھی نہیں۔ آنکھیں بند کر لیں۔ اور ایک بار پھر دل ہی دل میں کہا "میں۔۔۔ بابو۔۔۔ جی کی۔۔۔۔ اور بابوجی۔۔۔۔۔" پہاڑ چڑھ ہوا تکان سے چور مسافر جیسے سہارے کے لئے کسی درخت کو پکڑنے کے لئے بڑھتا ہے۔ کانتا بھی سہارے کے لئے ان لفظوں کو بار بار کی کوشش کر رہی تھی۔

وہ مسافر جو گرمی میں ٹھیک دوپہر کے وقت۔ اس تنہا اور ... کی طرح بل کھاتے ہوئے راستے پر جس کے دونوں کناروں پر ... سے اُڑی ہوئی باریک اور پیاسی دھول ڈھیر کی ڈھیر پڑی ہوئی ... ہوا جس طرح کسی دور نظر آتے ہوئے درخت پر۔ آرام کے لئے ... جمائے ہو ٹھیک اسی طرح کانتا بھی ان الفاظ پر زندگی کے آرا... کے لئے۔ اپنی تمام قوت یکجا کئے ہوئے تھی۔ ان کے نہ ہونے سے ... خوف تھا کہ شاید یہ زندگی جو اس بوڑھے اور دقیانوسی آسما... نیچے بیسیوں برس میں پل پل کراتی ہوئی ہے۔ ایک منٹ میں ... کی چٹان سے ٹکرائی ہوئی لہر کی طرح ٹوٹ پھوٹ کر قطرہ قطرہ ہو...

لیکن وہ چٹان کیا تھی ؟ دو برس سے بہتی ہوئی اس رَو کے سامنے آج ۔ ہاں آج ۔ یہ کہاں سے آگئی : یہ سوال کانتا کے دماغ میں تھا ہی نہیں اگر تھا بھی تو وہ اسے اپنانے کے لئے تیار نہیں تھی۔

۳

" نہ معلوم آپ لوگ باہر جاکر گھر لوٹنا کیوں بھول جاتے ہیں" کانتا نے اپنے بابوجی کا استقبال آج پھر ان الفاظ کی ساتھ کیا۔ کم و بیش سال بھر کے بعد" کیوں : میں تو ٹھیک ہی وقت پر آیا ہوں۔ دیکھو نا ابھی آٹھ ہی تو بجے ہیں" ہری نے کانتا کی ٹھوڑی پکڑ کر اسکا منہ گھڑی کی طرف پھیرتے ہوئے کہا۔

" نہیں آج تو بہت دیر میں آئے۔ اتنی دیر نہ کیا کرو۔ گھڑی کا کیا ؟" کانتا نے اسی طرح بے حس و حرکت کھڑے رہ کر کہا۔

گھڑی

کا کیا ۔ کانتا کے ان بے جوڑ ۔ بے معنی الفاظ کی تہ میں نہ جانے کتنے برانگیختہ ۔ بے معنی اور کتنے متلاطم جذبات کے سمندر خفتہ تھے۔ لاچار اور بیکس اسیر بلبل کے بے ربط چہچہوں کی طرح نہ معلوم کیا قیامت ان میں مخفی تھی۔

ہری نے کانتا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا جن کے پیچھے بیقراری ۔ اضطراب اور ہراس کی ایک دنیا مچل رہی تھی۔ لیکن وہ ان میں سوائے آنسو کی دو بوندوں کے اور کچھ بھی نہ دیکھ پایا۔ اور بوندیں بھی وہ جو ابھی تک ٹپکی بھی نہ تھیں ۔ بلکہ کونوں میں ہی پڑی تڑپ رہی تھیں " کانتا یہ آج تمہیں کیا ہو گیا ؟ یہ کہتے کہتے ہری نے کانتا کو گلے سے چمٹا لیا۔ کانتا جو ابھی تک خزاں کے پارہ ابر کی طرح اپنے دل کی سنسان فضا میں آوارہ پھر رہی تھی۔ ہری کے اس سوال سے جو پہاڑ بن کر سامنے آگیا تھا۔ ٹکرا گئی اور اس کے دامن میں ہی پھوٹ کر برس پڑی جتنا اسے خاموش کرنیکی کوشش کر رہا تھا۔ یہ امنڈتے ہوئے سیلاب کی طرح بند توڑ کر گزرتی جا رہی تھی۔ ہری کے سینہ سے پوری قوت کی ساتھ چمٹی ہوئی تھی۔ گویا اسے خوف تھا کہ کہیں آنسوؤں کے سیلاب میں ہی نہ بہہ جاؤں۔ اس نے ہچکیاں لیتے لیتے آنسوؤں سے بھیگی ہوئی دزدیدہ نگاہوں سے ایک با۔ کھڑکی کی طرف دیکھا اور پھر جلدی سے ہری کے سینہ میں اپنا منہ چھپا کر اور بھی بے خودی سے رونے لگی۔

ہری کھانا کھانے کے بعد چارپائی پر لیٹا ایک ناول دیکھ رہا تھا۔ حقیقت میں دیکھ ہی رہا تھا پڑھ نہیں رہا تھا۔ دماغ آنکھوں کی ساتھ ساتھ کام نہیں کر رہا تھا۔ گویا کسی جانے ہوئے رسم الخط میں کوئی نہ جانی ہوئی زبان پڑھ رہا تھا۔ ورق پہ ورق پلٹ گیا مگر ایک لفظ بھی سمجھ میں نہ آیا۔ آخر جھنجھلا کر اس نے کتاب رکھدی۔ گھڑی کی طرف دیکھا۔ گیارہ بج چکے تھے۔ نیند کا کہیں پتہ بھی نہ تھا۔ ' کانتا کے بے وجہ رونے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے '

یہ خیال بہت پریشان کن اور اندوہگیں تھا۔ لیکن یہ اُسے اپنی پوری قوت کی ساتھ دبائے ہوئے تھا۔ اُس مسکراہٹ کی طرح جو اپنے نیچے کرورڑں سسکیوں ۔ بے شمار آنسوؤں اور غم و الم کی ایک دنیا کو دبائے ہوئے رہتی ہے۔ لیکن جس طرح ضرب خوردہ عضو ہر طرح سے محفوظ رکھنے پر بھی ہر تازہ ضرب کے سامنے بے اختیاری سے آجاتا ہے۔ یہ خیال بھی بار بار مچل مچل کر سامنے آ رہا تھا۔ آخر ہری مغلوب ہو کر اس پر ہر پہلو سے غور کرنے لگا۔ نزدیک گزرے ہوئے دنوں پر ایک جھانکی لگا کر واقعات کا اچھی طرح جائزہ لینے لگا۔ لیکن اس کی سمجھ میں خاک بھی نہ آیا۔

یکایک چند سسکیوں کی دبی ہوئی آواز نے اسے چونکا دیا جو کسی ٹوٹے ہوئے دل سے موت کے فیصلہ کن صدمے کی طرح صاف صاف الگ الگ دیوار والے کمرے سے آ رہی تھیں۔ ہری نہایت آہستگی سے اٹھا اور دبے پاؤں برابر والے کمرے میں گیا۔ کانتا سو رہی تھی۔ اس کا منہ دیوار کی طرف تھا۔ وہ بے حس و حرکت تھی۔ خاموش تھی۔ اس کے شبیہ سانس ناہموار زمین پر بہتی ہوئی ندی کی طرح جھٹکے کھاتے ہوئے غیر ہموار انداز پر کمرے کی سنسان فضا کو ٹکراتے پھر رہے تھے۔ "کانتا!" ہری نے دبی ہوئی آواز میں پکارا۔ لفظ کمرے کی خاموش تاریکی میں کسی چشمے کے کنارے لڑائی سے تھک کر بے سدھ پڑے ہوئے پرندے کی طرح ہانپتا ہوا سا معلوم ہوا۔ آواز رات کی خاموشیوں میں تیرتی ہوئی کمرے میں چھت تک بکھر گئی۔ کانتا بدستور خاموش تھی۔ ہری اسے سوتی ہوئی سمجھ کر پھر اپنے کمرے میں واپس آ کر لیٹ گیا۔

ب

کانتا ہری کے گلے سے لپٹ کر دل کھول کے رو رہی تھی۔ لیکن آنسوؤں کا سارا چشمہ بہ جانے پر بھی آج اس کے دل کا بوجھ ہلکا نہیں ہوا تھا آنسو سوکھ جانے پر تھوڑی دیر کے لئے وہ سمجھ بیٹھی تھی کہ اس کے سینے کا دھواں آنسو بن کر آنکھوں کی راہ بہ گیا ہے۔ لیکن بات ایسی نہیں تھی۔ وہ تو اور بھی تاریک اور گھنا سا ہو گیا تھا۔ اس کے دل کی دنیا میں ایک زبردست زلزلہ آیا تھا جس میں عقائد و رسوم کے صدہا سال پرانے پہاڑ ٹوٹ پھوٹ کر ریت میں ملے جا رہے تھے۔ مذہب اور محبت کے قدیم کھارے سمندر سوکھ کر صحرا بنے جا رہے تھے۔ اور کچھ نئے چشمے نئے پہاڑ اور نئی بستیاں بسے ہوئے شگافوں کے پرے۔ بہت پرے وہاں جہاں آسمان اور زمین ملے ہوئے ایک دوسرے کی آغوش میں معلوم ہوتے ہیں۔ کچھ دھندلے سے۔ شاعر کے ذہن میں سوئے ہوئے اشعار کی طرح۔ دھندلے سے نظر آ رہے تھے۔

روتے ہوئے جتنا وہ اپنے آپ کو ہری کے نزدیک سمجھتی تھی خاموش ہونے پر وہ اتنی نزدیک نہیں رہی تھی۔ جتنا وہ زبردستی ان سے چمٹنا چاہتی تھی اتنی ہی اُسے خود سے نفرت ہوتی جا رہی تھی اور ایک ایسی نفرت جس کو وہ زبردستی اپنے اوپر اوڑھنا چاہتی تھی یعنی اس نفرت سے نفرت۔ یہ اوڑھنی اس کے لئے سوہان روح ہوتی جا رہی تھی۔ اُسے محسوس ہو رہا تھا گویا وہ کسی اونچے مقام سے انتہائی گہرائی کی طرف آہستہ آہستہ پھسلتی جا رہی ہے۔ راستے میں کوئی ایسا مقام نہیں جہاں ٹھہر سکے۔ اس پاس کوئی ایسا سہارا نہیں جسے پکڑ کر رک سکے۔

اس کے کانوں میں کہیں دور۔ خواب کی دنیا سے۔ آتی ہوئی کنہیا کی یہ دھن بچپن کی یاد کی طرح۔ گونج رہی تھی۔

سور داس پربھو دیکھ نہلو چھم برست ہے بور

کانتا نے اپنے دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ کر زور سے دبا لئے۔ گہرے دھویں میں شوخ زرد ستارے سے آنکھوں کے آگے اڑتے ہوئے معلوم ہونے لگے۔ اندھیری رات میں جگنوؤں کی طرح نظروں کے سامنے کچھ اڑنے لگا۔ اسے معلوم ہونے لگا گویا یہ راگ ایک بہت وسیع جھیل ہے جو آسمان کی نیلاہٹ اور شفق کی سرخی سے پگھل کر بنی ہے اور جو وہاں جہاں سے آگے کچھ نظر نہیں آتا بھورے رنگ کے گھنے کہرے میں غائب ہو گئی ہے۔

کانتا نے اس جلن اور تڑپ کے بعد خود کو اس جھیل کے کنارے بیٹھا ہوا پایا۔ اس کی ٹانگیں پانی میں ڈوبی ہوئی تھیں اس کے بال۔ صبح کی ابتدائی گھڑیوں میں چراگاہ میں ہلکے نیلے مکڑی کے جالوں کی طرح۔ جو شبنم کے بوجھ سے دبے ہوئے ہوں

لطیف ہوا میں اُڑ رہے تھے۔ سامنے ایک کشتی نظر آئی۔ کانتا اس میں اچک کر بیٹھ گئی کشتی ایک طرف جھکی۔ پھر سیدھی ہوگئی۔ پانی ہلا اور اس کی موجیں بڑے بڑے حلقے بنا کر۔ ایک سامنے سے آتی ہوئی لہر میں غائب ہوگئیں۔ کانتا نے اپنی ٹھوڑی کشتی کے کنارے پر رکھ دی کشتی آہستہ رو ہوا کے ساتھ جھکولے کھاتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ پانی اس کی آنکھوں کے نیچے بچوں کے قہقہوں کی طرح اچھل رہا تھا۔ اس کا جسم سورج کی کرنوں کی ننگی روشنی میں نہا رہا تھا۔ اس کا ایک بازو ناؤ کے کنارے کے اوپر سے پانی میں لٹک رہا تھا۔ بہتے ہوئے پانی میں ہاتھ کا ڈوبا ہوا حصہ کچھ ٹیڑھا سا معلوم ہوا۔ کانتا نے اپنا ہاتھ باہر نکالا۔ اس کی طرف غور سے دیکھا اور پھر خود ہی مسکرا کر اُسے پھر پانی میں لٹکا دیا۔ ...... جھیل کے پرلے کنارے پر افق کے پار۔ اس دھند میں کوئی گا رہا تھا۔

سو رہا اس پربت پہ دیکھ، نیلو چیمز پربت ہے لوہہ

پتھر کے پیچھے چھپے ہوئے بنفشہ کے پھول کی طرح۔ یہ الاپ۔ آہستہ آہستہ جھیل کی سطح پر تیرتی ہوئی۔ کنارے پر کھڑے نیستان کی طرف بڑھ رہی تھی۔ نیستان کی ہر ایک نے میں یہی تان گونج اٹھی۔ پانی کی لہریں تالیاں بجا بجا کر۔ تال دے دے کر ناچنے لگیں۔ کنارے کے پہاڑ پر دیودار اور صنوبر کے درخت مستی سے جھومنے لگے۔ آسمان پر سکتہ کا عالم تھا۔ وہ اس طرح ساکت اور صامت تھا جیسے کوئی دیراگی راگ کے نشے میں اپنے اکتارے پر انگلی تک چلانی بھول گیا ہو۔ ایک بڑی سی لہر جو دور سے مٹکتی اور ناچتی ہوئی آ رہی تھی۔ اس کی کشتی سے ٹکرائی۔ پانی اوپر کو زور سے اُچھلا اور کشتی کے اندر بکھر گیا۔ کچھ چھینٹے اس کے چہرے پر پڑے۔ اس کے کپڑوں پر پڑے۔ اور اس کے بالوں پر پڑے۔ کانتا چونک کر اٹھی۔ اس کی نیند ٹوٹ گئی۔ آنکھ کھلی۔ اس نے دیکھا اس کا منہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا ہے۔ اس کا تکیہ آنسوؤں سے تربتر ہے۔ اس کے بعد صبح تک وہ ایک سکنڈ کے لئے بھی نہیں سو سکی۔

کون کہہ سکتا ہے کہ وہ کیا سوچتی رہی۔؟ اس کے دل میں کیا بات تھی ـــــ؟ اور بات بھی وہ جسے وہ خود ہی تسلیم نہیں کیا چاہتی!!

گندھک کے پہاڑ کے اندر کیا ہو رہا ہے؟ یہ کون جان سکتا ہے؟ تا وقتیکہ وہ خود پھٹ کر آتش فشاں نہ ہو جائے!!!

۴

"کانتا یہ کھڑکی کے شیشوں پر تم نے کاغذ کیوں چڑھا دئے؟" ایک دن ہری نے کمرے میں بیٹھے ہوئے کانتا سے پوچھا۔

"یوں ہی! میں چاہتی ہوں اس کھڑکی کو آپ بالکل بند کرا دیں" کانتا نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا "اور ہاں۔ یہ تم دن بدن کمزور کیوں ہوتی جا رہی ہو؟"

نہیں تو! یوں ہی آپکا خیال ہے" یہ کہتے کہتے کانتا کسی کام کے بہانے سے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

کانتا کچھ دنوں سے گھر کے کام کاج میں بہت دلچسپی لینے لگی ہے۔ کھانا اپنے ہاتھوں سے پکاتی ہے۔ دن بھر سینے پرونے میں مصروف رہتی ہے۔ تمام پرانے کپڑوں کو ادھیڑ ادھیڑ کر الٹ دیا ہے۔ پرانی دھوتیاں جو بیچ میں سے پھٹ گئی تھیں انھیں بیچ میں سے کاٹ کاٹ کر کناروں کی طرف سے سی دیا ہے۔ گھر میں لٹکی ہوئی تمام تصویروں کے فریم اکھیڑ اکھیڑ کر انھیں صاف کرکے دوبارہ فریم کرایا ہے۔ اپنے اور ہری کے کپڑوں کے تمام بٹن توڑ توڑ کر از سر نو ٹانکے ہیں۔ پرانی جرابوں کو جو ایک کونے میں ڈھیر کی ڈھیر پڑی تھیں رفو کیا ہے۔ کمروں کے فرش اور تمام فرنیچر ہفتہ میں دو دو تین تین بار۔ باہر نکلواتی۔ صاف کراتی اور دھوپ دکھاتی ہے۔ غرض کوئی گھڑی ایسی نہیں جب کانتا کسی نہ کسی کام میں نہایت تندھی سے مصروف نہ ہو۔

وہ آج بھی خالی بیٹھنے اور تنہا رہنے کے علاوہ سب ہی کچھ کیا کرتی تھی۔
وہ محض اپنے سے بھاگتی ہے۔ اپنے سے دور رہتی ہے۔

"بابو جی کے گھر میں رہتے ہوئے وہ ان کے گلے کا ہار بنی رہتی۔ اس پرندے کی طرح جو سمندر کے اوپر اڑتا اڑتا تھک گیا ہو جس طرح وہ دور سے کسی جہاز کو دیکھ کر اسکی طرف لپکتا ہے اسی طرح یہ بھی بڑی کو دیکھتے ہی اس کی طرف لپکتی ہے۔ ان کے سینہ میں اپنا منہ چھپا لیتی ہے اور بچوں کی طرح ان کے کوٹ کے بٹنوں سے کھیلنے لگتی ہے۔ بڑی کی چھاتی غرور اور محبت سے پھول جاتی ہے۔ وہ اس کے بالوں کو تھپک کر پوچھنے لگتا ہے۔" کانتا۔ تم میری ہو؟ اور کانتا ایک ایسی آواز میں جو پہاڑ کے دوسری جانب کسی غار میں سے آتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ جواب دیتی ہے۔ "آپ کی۔"

گانا۔ اور گانے کے تعلق کی جتنی چیزیں ہو سکتی ہیں ان سب سے کانتا کو کچھ دنوں سے سخت نفرت ہے۔ یا کبھی وہ دن تھے جب یہ دن دن بھر جنگلی بلبل کی طرح چہچہایا کرتی تھی۔ ستار کا اُسے بہت شوق تھا۔ ایک نہایت خوبصورت ستار خاص طور پر بنوایا تھا۔ جسے اسکی سبھی سہیلیاں للچاتی ہوئی نگاہوں سے دیکھا کرتی تھیں۔ آجکل وہ بھی اسکے کمرے میں کہیں نظر نہیں آتا۔

کمرے کی تمام کھڑکیاں اس خوف سے ہمیشہ بند رہتی ہیں کہ کہیں کوئی گانے کی آواز اس کے کانوں میں نہ پہونچ جائے۔ گانے کی آواز سے اسکی حالت ہی متغیر ہو جاتی ہے۔ تمام بدن کانپنے لگتا ہے۔ چہرے کی رنگت بدل جاتی ہے۔ نتھنے پھول جاتے ہیں۔ ہاتھ پاؤں بے جان سے ہو جاتے ہیں اور دماغ تیزی سے گھومنے لگتا ہے۔ اس کی آنکھیں۔ غروب آفتاب کے وقت افق کے نزدیک بادلوں کی طرح سینکڑوں رنگ تبدیل کرنے لگتی ہیں۔ مزاج میں چڑچڑاپن اور گفتگو میں تلخی آجاتی ہے۔

ادھر اس کی صحت دن بدن خراب ہوتی جا رہی تھی۔ مزاج بہت ہی چڑچڑا ہو گیا تھا۔ ایک دن اس نے ایک فقیر کو جو گاتا ہوا ان کے دروازے پر آیا تھا رامو سے دھکے دلوا کر نکلوا دیا تھا — فقیر کو — جن کی کسی زمانہ میں یہ بہت عقیدت مند تھی۔ جن کے پاؤں پوجتی تھی۔ اور جن کو کبھی بھی اس نے خالی ہاتھ اپنے دروازے پر سے نہیں لوٹایا تھا۔ صبح کے وقت عموماً اس کی آنکھوں کے گرد کالے کالے حلقے نظر آنے لگے۔ پلکیں سوجی ہوئی اور نگاہیں بے چمک رہنے لگیں۔

اس کا دل ہمیشہ طوفان سے پیشتر کے ساکت اور خاموش آسمان کی طرح بے رنگ سا رہا کرتا تھا۔ نہ افق کے نزدیک کبھی رنگین شفق۔ نہ وسط میں قہقہوں کی طرح بکھرے ہوئے بھورے بادل۔ نہ کناروں پر قوس قزح کا کوئی رنگ — ہاں! اس کی آنکھوں میں جو پہاڑی جھیل کی ہلی ہوئی سطح کی طرح مضطرب تھیں۔ نگاہوں سے اوجھل کسی سیاہ بادل کا عکس ہمیشہ ہی پریشان رہتا تھا — اس کا سینہ رات کے سناٹے میں سوئے ہوئے خزاں زدہ جنگل کی طرح۔ وحشت خیز اور ویران تھا —
اس جنگل کی طرح جس میں ہوا ہر ایک جوان درخت سے لپٹ لپٹ کر ٹھنڈی سانسیں بھر رہی ہو۔ بوڑھے درختوں کے کھوکھلے سینوں میں منہ چھپا کر ہو ہو کر رہی ہو — درختوں کی ننگی شاخیں خاموشی سے، جھکا جھکا کر ٹپ ٹپ آنسو ٹپکا رہی ہوں جنگل کے ایک کنارے خشک چشمہ کے نزدیک ایک پرانا، جڑ سے اکھڑ کر گرا ہوا بے جان درخت، زمین کی چھاتی پر لڑائی کے میدان میں زخمی سپاہی کی ٹوٹی ہوئی تلوار کی طرح بیکار پڑا ہو۔

کانتا کی حالت دن بدن بگڑتی جا رہی تھی۔ ڈاکٹروں کا مشورہ تھا کہ اسے پہاڑی مقام پر تبدیلی آب و ہوا کے لئے لے جانا چاہیئے۔

کانتا اس بیل کی مانند ہو گئی تھی جو بغیر کسی سہارے کے کھڑی ہو ہی نہیں سکتی۔ بڑی اس کی آنکھوں سے تھوڑی دیر کے لئے اوجھل ہوئے کہ اس کی دنیا۔ اس کی آنکھوں میں تاریک ہو گئی۔ اس کی زندگی خزاں کے آخری گلاب کی آخری پتی کی طرح ہوا کے ہر جھونکے سے "اب گری

اور اب گری" کی مخدوش رہتی تھی۔

اس کا سنسار ایک اندھیرے مندر کی طرح ہو گیا تھا جس میں اس کا زمانۂ ماضی۔ دیوتا کی طرح رہتا تھا —— تاریکی اس قدر گھنی تھی کہ دیوتا کے درشن قریب قریب ناممکن تھے۔ لیکن کانتا اس ماضی پر ہی زندہ تھی۔ وہ اندھیرے میں زندہ رہنے والا دیوتا ہی اس کی زندگی کا سہارا سا تھا —— اندھیرے مندر میں دیوتا کے چرنوں پر پڑے ہوئے سوکھے پھولوں کی خوشبو ہی —— جو زمانۂ حال کے خشک ریگستان کو پار کر کے آ رہی تھی اسکا سب کچھ تھی۔

۵

"میں! تم کہاں؟" Snow View Hotel کے سامنے سڑک کے ایک موڑ پر رومیش نے گوپال کا ہاتھ بڑی گرمجوشی سے پکڑ کر ہلاتے ہوئے پوچھا۔ "اور تم؟" گوپال نے ہاتھ زور سے دباتے ہوئے کہا۔

"بھائی میں تو یوں ہی سیر کرنے کی غرض سے آ گیا ہوں۔ پہاڑی مقاموں میں چکر دیتے ہی ایک ایسی جگہ تھی جو ابھی تک میں نے نہیں دیکھی تھی۔ میں نے سوچا اب کی بار اسے بھی دیکھ لوں۔"

"اور میں دہرہ دون ایک کام سے آیا تھا۔ بیچ میں دو دن کا وقفہ مل گیا تھا۔ چنانچہ کل بندہ یہاں وارد ہوا۔ آج تمام دن سیر گشت کی۔ دو کل بیرنگ واپس ہو جائے گا۔"

"کیوں۔ کہیں چائے والے بھی پی یا نہیں؟" رومیش نے پوچھا۔

"نہیں ابھی تو نہیں پی۔" "آؤ! تو چلو اس ہوٹل میں ہی چلتے ہیں" رومیش یہ کہتے کہتے ہوٹل کی طرف گھوم گیا۔

سورج ابھی تک غروب تو نہیں ہوا تھا۔ لیکن مغرب کی طرف پہاڑ کے پیچھے کہیں بہت نیچے پہنچ گیا تھا۔ آسمان کا دھندلا سایہ پہاڑوں اور جنگلوں پر خاموشی کی طرح دور و نزدیک چھایا ہوا تھا۔ سامنے درخت پر ایک کوا اپنی چونچ۔ بائیں بازو کے نیچے کئے ہوئے اپنے پر نوچ رہا تھا۔

دونوں دوست ہوٹل میں چائے پینے لگے۔ چائے پیتے پیتے رومیش نے کہا۔ "گوپال بہت دنوں سے تم نے کچھ سنایا نہیں، بتلیں یاد ہے تم نے ایک بار کوئی تین چار سال کا عرصہ گزرا میرے کمرے میں شام کے وقت —— بس یہی وقت تو تھا۔ سورداس کا ایک پد سنایا تھا۔ اس کی لے آج تک میرے دل سے نہیں نکلی۔ جی چاہتا ہے آج پھر وہی سنوں۔"

"ہاں وہ —— لیکن آج کیسے گاؤں؟" گوپال نے اپنی چائے چمچے ہلا کر کہا۔ "دن بھر تو آوارہ گردی کرتا رہا ہوں گلے میں ایک ایک لنج گڑائی ہوئی ہے۔ سانس ٹھیک طرح آتی نہیں۔ بھلا گایا کیسے جائیگا؟"

"کیوں صاحب! کیا آرٹ کے ساتھ یہ نخرا بھی ضرور سیکھا جاتا ہے۔ یا یہ خود ہی آ جاتا ہے! کسی بھی آرٹسٹ سے کبھی کوئی فرمائش کرو۔ وہ پہلے ضرور یہی معذرت کی شکل میں نخرہ پیش کریگا۔" رومیش نے کہا "اب یہ نخرہ چھوڑو۔ سیدھے سیدھے کچھ سنا ڈالو۔"

"اچھا بابا" گوپال نے جلدی سے گھونٹ بھر کے کہا "لیکن بہتر ہوگا اگر ہم سامنے والی چوٹی پر چلے چلیں۔ چائے تو پی ہی چکے۔ وہاں گانے کا لطف آ جائے گا۔"

گوپال نے شروع کیا۔

بھور بن بولن لاگے مور ——

سامنے سورج آدھے کے قریب غروب ہو چکا تھا۔ پیچھے کی طرف چاند آہستہ آہستہ اوپر کو سرک رہا تھا۔ کرشن ہار نند نندن کی سن بادر گھور چاروں طرف پھیلی ہوئی خاموشی میں ایک خفیف سا لرزہ آیا۔ پہاڑ کے نیچے دامن کے لمبے لمبے غیر ہموار سر سبز ٹکڑے۔ کچھ سرگوشیاں سی کرتے معلوم ہونے لگے۔

جن کے پیا پردیس سدھارے سوتیا پری نہور
موہیں بہت دکھ بری بچھڑے کو ریت بدہ کرجو
چانک پاپ چکور پپہیا لے سب ہی مل چور
سورداس پربھو دیاّ نہ ملہو جنم پرت ہے بور

دیودار کے کالے جنگل کے اوپر سے چاند۔ محبت میں نو گرفتار نوجوان کی طرح سستی سے لڑکھڑاتا ہوا۔ خود فراموشی کے عالم میں۔ سامنے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی دھیمی دھیمی۔ ہلکی ہوئی سی روشنی میں —— کالے جنگل، اداس کھا بڑ۔ پہاڑ کے دامن سے سانپ کی طرح لپٹی ہوئی پتلی سی پگڈنڈی۔ اور پگڈنڈی کے اس کنارے پر جہاں یہ صنوبر کے درختوں میں غائب ہو گئی ہے۔ وہ گھنے بادل جیسی ننگی چٹان۔ یہ سب کے سب اپنے خاموش سروں میں گوپال کی تان میں تان ملا کر گا رہے تھے۔

Snow View ہوٹل کی تیسری منزل پر ایک کمرے میں لیٹی ہوئی ایک مریض عورت بیقراری سے کروٹیں لے رہی تھی گیت کی تانوں نے اس پر جادو کا سا اثر کیا۔ وہ سانس روک کر بت کی طرح بے حس و حرکت گیت سننے لگی۔ پھر اٹھی۔ بغیر سمجھے سوچے سامنے کی کھڑکی کی طرف اس طرح جلدی جیسے کوئی سوتے سوتے اچانک خواب میں اٹھ کر چل پڑے —— آواز کی لوچ آشنا سی معلوم ہوئی۔ اس کے دل میں ایک گدگدی سی اٹھی۔ ٹھیک ایسی جیسی اس جوان ہرن کے دل میں اس وقت اٹھ سکتی ہے۔ جب وہ اتفاقاً پہاڑ کے اس چھوٹے سے چشمے کے کنارے آ گیا ہو

جو اس نے بچپن میں جب وہ پیاس کی شدت سے جاں بلب تھا اور ایک گھونٹ پانی کے لئے اپنی ننھی ننھی ٹانگوں پر لڑکھڑاتا ہوا سسکتا پھر رہا تھا۔ بغیر کسی کی مدد کے خود ہی دریافت کیا ہو۔

آواز زمانے کو پیٹ رہیں پیچھے ماضی کے کسی تاریک گوشے میں سے آتی معلوم ہو رہی تھی ــــــ آوارہ سی، جیسے خواب میں اڑتا ہوا گیت ــــــ مدھم سی جیسے آندھی اور طوفان کی رات میں کسی ندی کا شور ــــــ بے جان سی، جیسے بادلوں بھری اندھیری ہولی رات کے آسمان کا سایہ۔ ہوا آس پاس کے درختوں اور جھاڑیوں میں سرگوشیاں کرتی پھر رہی تھی۔ آسمان کی صاف اور شفاف جھیل پر چاندنی کا چمکدار کہرا ہر طرف تیرتا پھر رہا تھا۔ مغرب کی سمت میں کہکشاں کے پاس سے ایک ستارہ ٹوٹا۔ تیزی سے نیچے کی طرف آیا۔ سونے کا ایک باریک تار سا اس کے پیچھے تھوڑی دور کھنچتا ہوا چلا آیا۔ اور پھر ستارے بہت پھیکے ہوئے آنسو کی طرح کہیں غایب ہو گیا۔ سامنے سڑک پر تھوڑے تھوڑے غیر مسلسل وقفے کے بعد کوئی سایہ خاموشی سے گزر جاتا تھا۔

مریضہ اپنی کھڑکی میں آدھی کے قریب باہر جھکی ہوئی آنکھیں بند کئے کھڑی تھی۔ گیت آس پاس کی فضا میں بادلی اور شبنم سے بھیگا ہوا۔ نہایت بے پرواہی اور مستی سے ناچتا پھر رہا تھا۔ مریضہ کو معلوم ہونے لگا کہ اس کی عمر کے پچھلے دس سال جنھیں وہ ٹھکرائی تھی اب پھر تیزی سے ان کی طرف لوٹی جا رہی ہے۔ زمانہ اور وقت Time and space کے اوپر۔ بہت اوپر۔ راگ کے آسمان میں ایک لطیف قوس قزح کا نہایت خوبصورت رنگین پل پھیلا ہوا ہے جس کے اوپر سے یہ ناچتی گاتی۔ تالیاں بجاتی واپس جا رہی ہے۔ پل کے دونوں طرف سبزے کے ریشمی لچکدار خطے لہلہا رہے تھے۔ ان کے کناروں پر اونچے اونچے درخت۔ گزرے ہوئے زمانے کے بھولے ہوئے گیت۔ خاموش نغموں میں تانیں ملا ملا کر۔ سر ہلا ہلا کر گا رہے تھے۔ اور ان کے اوپر سے بچپن کا پرسکون۔ پرامن اور سنہری افق۔ معصوم مسکراہٹ کی طرح ــــــ اس مسکراہٹ کی طرح جو ماں کے آغوش میں سویا ہوا بچہ۔ آدھی رات کے وقت اٹھکر اپنی متوالی آنکھیں اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے ملتا ہوا۔ خاموشی سے اپنی سوئی ہوئی ماں کی طرف دیکھکر، بلا کسی وجہ کے مسکرا دیتا ہے اور پھر اس مسکراہٹ کو ہونٹوں پر لئے ہوئے ہی آنکھیں بند کر کے پھر سو جاتا ہے۔ پھیلا ہوا تھا۔ پل کے بائیں جانب جنگل کا ایک چھوٹا سا گھنا ٹکڑا نظر آیا جس کے ایک کنارے پر ایک نہایت پتلا سا پیچیدہ راستہ تھا جو سامنے سوکھے ہوئے نالے میں غائب ہو گیا۔

نالے کے سرے پر دو بڑی بڑی اونچی چٹانیں تھیں۔ ان میں سے ایک کے نیچے ایک بہت بڑا غار تھا۔ غار کے اوپر غار کے سامنے بیشمار رنگ برنگی تتلیاں اڑ رہی تھیں۔ اندر اندھیرا تھا۔ کچھ صاف تو نظر نہیں آتا تھا۔ لیکن پھر بھی ایک انسانی جسم دھندلا سا نظر آ رہا تھا۔ اپنے دونوں بازو اوپر کئے ہوئے۔ چٹان میں سے ٹپکتی ہوئی پانی کی بوندوں کو۔ اپنے ملے ہوئے ہاتھوں میں اکٹھا کر رہا تھا۔ مریضہ ایک لمحہ کے لئے ٹھٹھکی۔ اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی اور پھر اسی طرح گاتی۔ ناچتی تالیاں بجاتی آگے کی طرف بڑھ گئی۔

یکایک راگ ختم ہو گیا۔ قوس قزح کا پل ٹھیک وہاں سے جہاں مریضہ ناچ رہی تھی ٹوٹ گیا۔ اور ــــــ اور...... اور Sapphire ہوٹل کے تیسرے balcony کی کھلی کھڑکی میں سے ایک آدھی جھکی ہوئی کمزور سی بیمار عورت زمین پر گر پڑی۔ سر کٹ گیا۔ ہڈیاں ٹوٹ گئیں اور بے جان ہو گئی۔

مریضہ سوکھے ہوئے پھول کی۔ بکھری ہوئی پتیوں کی طرح جو کسی تھپیڑے سے بگولے نے پھر یکجا کر دی ہوں۔ خاک پر بے حس و حرکت۔ دھول میں سنی ہوئی پڑی تھی۔

بجھتے ہوئے چراغ کی طرح یہ آخری بار بھڑ بھڑائی۔ مرتے ہوئے زخمی پرندے کی طرح یہ مایوسی سے تڑپی اور ٹوٹتے ہوئے ستارے کی طرح یہ آخری بار پوری تیزی سے چمکی ــــــ ایک مٹتے ہوئے گیت کی طرح ــــــ جاتی ہوئی خوشبو کی طرح امن اور خاموشی سے ہمیشہ کے لئے پھر دوبارہ نہ کھولنے کے لئے آنکھ موند گئی۔

ہری کے والد کو ہری کا ایک تار موصول ہوا۔

گزشتہ رات تقریباً ساڑھے آٹھ بجے کانتا کو یکایک دورہ پڑا کافٹ آیا۔ اور وہ ہوٹل کی کھڑکی میں سے۔ جہاں ہم ٹھہرے ہوئے تھے گر کر مر گئی۔ میں پرسوں واپس آ رہا ہوں۔

ہری سعو : [illegible] ہوٹل [illegible]

ــــــ محبت ایک جلتی ہوئی مشعل ہے۔ جو کسی گہرے اندھیرے غار میں پھینکی گئی ہو اور غار کی تاریکی، غار کی گہرائی بتلا کر اس کی تہ میں جل جانے کے بعد خاک ہو گئی ہو۔



نقد الشعر

معائبِ سخن

(از جناب پرویز بٹالوی سکرٹری بزمِ ادب ہوم ڈیپارٹمنٹ)
(اسلسلہ گذشتہ)

ہوا حمدِ خدا میں دل جو مصروفِ رقم میرا
الف الحمد کا سا بن گیا گویا قلم میرا

کیوں صاحب! خدا جیسی بزرگ اور برتر ہستی کے لئے کس قدر تعظیم و تکریم اس جیسی محبت کل "ذات کے لئے کس قدر پیار اور کشش آپ کے دل میں پیدا ہوئی۔ کس قدر جذبات کی بیساختگی اور صداقت۔ کس قدر دل کی تڑپ اور خون کی حرارت آپ کو محسوس ہوئی۔ اگر عربی مقولہ کے مطابق شعر وہ ہے جس سے انبساط یا انقباض پیدا ہو تو کس قدر آپ کا دل اس شعر سے خوش ہوا۔ سبحان اللہ۔ قلم کے الف نا سیدھا ہونے نے شرم رکھ لی۔ جو وہ الحمد کا سا الف ہو گیا۔ اور پھر دل کا مصروف رقم ہونا بھی ملاحظہ فرمایا جناب نے۔ اِس مقالہ میں ذوق کے کلام سے کسی اور کے کلام کا موازانہ مقصود نہیں کیونکہ اس طرح خواہ مخواہ تعصب کا الزام لگا دیا جائے گا۔ ہمارا اصل مقصود اس کے نیچے دبکر رہ جائے گا۔ ورنہ جی چاہتا تھا کہ معائب سخن کے تمثیلی اشعار کے مقابلہ میں محاسن سخن کے تمثیلی اشعار بھی ساتھ ساتھ پیش کرتے جائیں۔ لیکن مصلحتاً محاسن سخن کو دوسری صحبت پر اٹھا رکھتے ہیں۔

خشک اشعارِ تغزل

اب ذیل کے اشعار ملاحظہ فرمائیے کس قدر خشک ہیں۔ حالانکہ تغزل میں یہ وہ مقام ہیں جہاں لکھنے والے ایسا لکھیں کہ نقش شوخیٔ تحریر کا فریادی بن جائے۔

ہوا یہ سینہ یکسر خارزارِ دشتِ غم میرا
کہ آیا پائے خوں آغشتہ ہو کر لب پہ دم میرا

اے صنم کیا پوچھتا ہے حال اس رنجور کا
دل نہ اٹکائے کہیں اللہ بے مقدور کا

کیا عشق کی بے بسی ہے؛ سچ ہے صاحبِ مقدرت تو پھر لاکھوں

دماغ پیدا کر سکتا ہے جب مقدور کا اللہ بیلی۔

۳۔ عشق کے کتب میں ہو فرہاد سب سے تیز ذہن
تین دن جائے اگر تعویذ میری گور کا

بیان کس قدر مضحک ہے۔ اول تو فرہاد۔ پھر تین دن کی تخصیص کیا معنے۔ تعویذ کا ایہام کس قدر رنگا رنگ ہے۔

۴۔ عشق نے ڈالی تھی جب قصر محبت کی بنا
لکھ دیا تھا کوہکن بھی نام ایک مزدور کا

عشق نے قصر محبت کی بنا ڈالی تھی" ملاحظہ فرمایا۔ پھر پتہ نہیں اور کون کون سے معمار و راج وغیرہ تھے۔

۵۔ اسے جیتا ہوں کیوں اس سے کیا میں نے بگاڑ
کر جواب بیچتا ہوں اس طرح سے میں تاب بنا

چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی اور میں تاب بنا بھی در خود ملاحظہ ہے۔

۶۔ جب کیا عشق کے دریا نے تلاطم اے ذوق
تو کہیں موج بنی اور کہیں گرداب بنا

عشق کے دریا کی خصوصیت قابل ملاحظہ ہے جس کے تلاطم کا یہ اثر ہے کہ کہیں موج بنی اور کہیں گرداب بنا۔

۷۔ ایک دم بھی ہم کو جینا ہجر میں تھا ناگوار
پر امید وصل میں برسوں گزارا ہو گیا

بس کا روگ تھوڑا ہی ہے۔ شاید باید زیستن نا شاید باید زیستن

۸۔ نالہ اس زور سے کیوں میرا دہائی دیتا
اے فلک گر تجھے اونچا نہ سنائی دیتا

۹۔ خوگر ناز ہوں کس کا کہ مجھے ساغر مے
بوسۂ لب نہیں بے چشم نمائی دیتا

اشعار جن جذبات عالیہ کے حامل ہیں محتاج تشریح نہیں۔

۱۰۔ جگر دل دونوں پہلو میں ہیں زخمی اس نے کیا جانیں
ادھر مارا تو کیا مارا ادھر مارا تو کیا مارا

سبحان اللہ کیا اضطراب ہے اور پھر جگر دل میں موسیقی وہ بھی ملاحظہ فرمایا۔ کیا جلترنگ کی آوازیں پیدا ہو رہی ہیں

۱۱۔ میں کہاں سنگ دیار سے ٹل جاؤں گا
نہ وہ پتھر ہے پھسلنا کہ پھسل جاؤں گا

ذرا دیکھکر کوئی کیلے کا چھلکا نہ پڑا ہو۔

۱۲ دل یہ کہتا ہے کہ تو ساتھ نہ لے چل مجھکو
ورنہ میں جاکے وہاں دیکھ مچل جاؤں گا

۱۳۔ ذال رخ شگفتگی سے گل وردین گیا
یاں غم سے روئے زرد گل زرد بن گیا

یقیناً مقام حیرت ہے۔ لیکن قسمت کیا ہر ایک کو قسام ازل نے جو شخص کہ جس چیز کے قابل نظر آیا

۱۴۔ کیا تماشا ہے کہ دیوانہ بنا کر اپنا
نام مجنوں میرا اس ہوش ربا نے رکھا

واقعی کس قدر ستم ظریفی ہے بھلا پوچھئے کوئی اور نام ہی نہ تھا۔

۱۵۔ دیکھئے ملت و دیں کتنے کرے گا برباد
باد کے گھوڑے پہ وہ دشمن ایمان چڑھا

ملت و دین کی جگہ اگر سبز گیہوں کے کھیت برباد کرنا لکھتے تو گھوڑے کی رعایت سے زیادہ موزوں تھا۔ دشمن ایمان میں اعلان نون بعد اضافت پختہ کاری کا پتہ دے رہا ہے۔

۱۶۔ رات کو اے ذوق اس کی تیغ مژگاں کا خیال
تن پہ ہر موسے میرے کار فساں لینے لگا

کس قدر بلیغ مقطع ہے "تیغ مژگاں" میں بھی جدت قابل ملاحظہ ہے اور پھر رات کی تخصیص نے کیا لطف پیدا کر دیا ہے۔

۱۷۔ خلافِ وعدہ سے تیرے میں کل تو جاں بلب آیا
نہ آیا آج بھی گر تو تو ہے ظالم غضب آیا

صدمۂ ہجر سے جانگدازی کا نقشہ اس سے ابتر اور کیا ہو سکتا ہے۔

۱۸۔ آئی بھی دردِ دل کی نہ ہرگز سمجھ میں بات
آوازہ گو بلند مثالِ دہل ہوا

درد کی آواز بھی خوب کہی۔ واہ واہ۔ جدت ہے جدت۔ اور پھر درد اور دہل کی مناسبت بھی چہ خوش۔

۱۹۔ اس نے جب ہاتھ بہت رد و بدل میں مارا
ہم نے دل اپنا اٹھا اپنی بغل میں مارا

اور کہا۔ چل بے بڑا آگیا کہیں کا سوداگر بچہ (جامع مسجد کی سیڑھیوں کا واقعہ ہے اور ہمارا چشم دید)

۲۰۔ مسجد میں اس نے ہم کو آنکھیں دکھاکے مارا
کافر کی دیکھو شوخی گھر میں خدا کے مارا

بھئی! حق تو یوں ہے کہ ان معشوقوں کو بھی بہت داؤ پیچ آتے ہیں اب فرمایئے ان سے بچ کر اور کہاں چلے جایئے "جوتی چور" کی طرح مسجدیں بھی تو نہ چھوڑا۔

۲۱۔ وصل میں گر ہو وے مجھکو رویتِ ماہِ رجب
روئے جاناں ہی کو دیکھوں میں تو قرآں چھوڑکر

شبِ وصل سنا کرتے تھے یہ "شامِ وصل" کی بھی ایک ہی ٹھہری مضمون اپنا آپ جواب ہے۔

۲۲۔ چشم کہتی ہے تری جنبشِ مژگاں سے کہ دیکھ
سر پہ بیمار کے یہ سینہ زنی خوب نہیں

جنبشِ مژگاں کو سینہ زنی سے تشبیہہ دینا کس قدر استعاری جدت ہے۔ پھر بیمار کے سر پر سینہ زنی قبل از مرگ واویلا ہے۔

۲۳۔ خط کو ہم لکھنے جو بیٹھے آنکھ سے امڈے یہ اشک
بہ گیا خط لکھتے لکھتے مشفق من آب میں

ہائے وفورِ گریہ کا برا ہو۔ علاوہ ازیں خط کو لکھنا بھی ملاحظہ فرمایا اگر کوئی پنجابی کہتا تو وہ بھائی کہلاتا۔ پھر معشوق کا خطاب "مشفق من" کس قدر برمحل ہے۔ اللہ بخشے ان کے دل پر بہت شفقت فرماتے۔

۲۴۔ میں وہ ہوں جگر خوں کہ مسامات بدن سے
گر خوں بھی نکالوں شفقی رنگ نکالوں

معجزہ ہے معجزہ۔ ورنہ خون ہمیشہ سفید رنگ کا نکلا کرتا ہے۔ یہ بھی کہتا ہے کہ اس شعر میں کاتب کی غلطی ہے۔ مصرعہ ثانی میں خون کی جگہ شاید "جون" ہو اور مصرعہ اولیٰ میں بہ تصرف موئے بدن ہو تو کچھ معنی بن جائیں۔ جگر خون کی ترکیب بھی عالم بالا کی سی باتیں ہیں۔

۲۵۔ غصہ ہے ترا قہر۔ تری قہر قیامت
رنجش تری بیداد ہے۔ بیداد غضب ہے

۲۶۔ دیں ہوش بھلا مردمِ ہشیار کے پل میں
آنکھوں کو تمہاری یہ فسوں یاد غضب ہے

۲۷۔ اس سنگِ آستاں پہ جبیں نیاز ہے

اللہ جانے یہ مصرع پڑھ کر جی راضی ہو گیا کہ چلو ایک شعر ہی لیکن مصرعہ ثانیہ .... لے کاش! شاعر نے اگر نہ لکھا تھا تو کاتب کو کیا ہوا تھا۔ وہی بھول جاتا۔ لیکن وہاں تو جی جلانا مقصود تھا۔ یوں لکھا ہے

وہ اپنی جانماز ہے اور یہ نماز ہے

ایک مشاعرہ میں داغ کا مشہور مصرعہ "جو عاشقی میں خاک ہوا کیمیا ہوا" طرح تھا۔ بڑے بڑے پختہ کار شعرا نے طبع آزمائی کی لیکن جس انداز سے گرہ اس شعر میں لگائی گئی تھی کسی سے نہ لگ سکی۔ ملاحظہ فرمایئے اور داد دیجئے۔

رہ عاشقی میں خاک ہوا کیسا ہوا
گلزار داغ میں ہے یہ مصرع لکھا ہوا

اب لطف لیجیے اس مصرعہ کا "وہ اپنی جانماز ہے اور یہ نمازؔ دو شعر ہا آ گئے۔ واہ دیکھیے مصرعہ اولیٰ اور مصرعہ ثانی کا انطباق قابل ملاحظہ ہے۔

۲۷۔ واہ کیا بات ہے ساقی تیرے میخانے کی
ایک چھو میں پلا دی مجھے تین آنے کی
کیا خبر نیرنگی قسمت سے کب ہوجائے گا
آج جو بیا تو ہے کل کو مو چنا ہوجائے گا

۲۸۔ ہوتا نہ اگر دل تو محبت بھی نہ ہوتی
ہوتی نہ محبت تو کچھ آفت بھی نہ ہوتی

(الفیل۔ والفیل۔ وما ادراک ما الفیل)

۲۹۔ تم بیٹھے بغل میں جو رقیب دغلی کی
کی گرم بغل ہم نے بھی گور بغلی کی

آپ ہی فرمایئے۔ شعر کس داد کا محتاج ہے۔

۳۰۔ اگر پوچھے کوئی مجھ سے کہ کیوں نالاں ہے یہ کہدوں
محبت سے محبت سے محبت سے محبت سے

لاکھ بار کہا ہے پھر بھی نہیں سمجھتے۔ پڑیں پتھر سمجھ پر ایسی۔ غرضیکہ کہاں تک لکھتے چلے جایئے۔ سفینہ چاہیئے اس بحر بیکراں کے لئے۔ اشعار مذکورسے جس قدر گرمی۔ سرشاری۔ سوزوگداز۔ جذب و کیفیت ٹپک رہی ہے۔ عیاں ہے اور اس پر دعوےٰ یہ

ہر ایک شعر میں مضمون گرم ہے میرے
میری طرح سے کوئی ذوق شعر تر تو کہے

اور امیر مینائی ہیں کہ مصرعہ تر کی صورت دیکھنے کے لئے

سیروں لہو خشک کرتے پھرتے ہیں
ایں سعادت بزور بازو نیست

مراعات النظیر

یہ صنعت اس لئے ایجاد ہوئی تھی کہ شعر میں اگر ایسے الفاظ جمع ہوجائیں جو کچھ باہمی مناسبت رکھتے ہوں تو اچھا ہے۔ اس سے مناسبت کا سلسلہ قایم رہتا ہے۔ لیکن قربان جایئے چابکدست استادوں کے کہ انھوں نے شعر کا مفہوم ہی یہ قرار دیدیا کہ موزوں کرکے چند ایسے الفاظ جمع کر دئے جائیں جن میں صوری (یا کبھی معنوی) مناسبت پائی جائے اور اس مجموعہ کے الفاظ، خیر قافیہ ردیف ملاکر شعر گھڑ دیا جائے۔ اس قسم کے شعر شاعری کی جس صنف میں آسکتے ہیں وہ مذاق سلیم رکھنے والوں سے پوشیدہ نہیں۔ ذیل میں ہم مثال کے طور پر چند اشعار ایسے درج کرتے ہیں اور بخوف طوالت ان کی صراحت نہیں کرتے بلکہ ایسے الفاظ پر جو کھینچ تان کر شعر میں لائے گئے ہیں یا جن کی خاطر شعر کہہ دیا گیا ہے خط کشیدہ کر دیتے ہیں۔

۱۔ باندھوں جو مضموں میں اپنی شوربختی کا کوئی
ہو زمین شعر میں عالم زمین شور کا

۲۔ لطف جاتا ہے سرود نالۂ پرشور کا
خون دل پیتا ہے یہ کھانا مجھے سیندور کا
تیرے قامت سے جو ہو برپا قیامت سرو پر
کام لے منقار سے فریاد قمری طور کا
دفن ہے جس جا پہ کشتہ سرو دھیری کا تیری
بیشتر ہوتا ہے واں پیدا شجر کافور کا

۵۔ واہ کیا مرہم زخمِ دلِ بیتاب بنا
آب سے نیشترِ تیز سے تیزاب بنا

آب اور تیز کے مرکب سے تیزاب بنا دیا۔ فقط۔ والسلام

۶۔ آیتِ سجدہ ہے حق میں میرے یہ جوہرِ تیغ
ہے خمِ تیغ فقط کیا خمِ محراب بنا

۷۔ یوں تنِ خاکی میں روشن دل ہمارا ہو گیا
جس طرح پانی کنوئیں کی تہ میں تارا ہو گیا

۸۔ بے سیاہی نہ چلا کام قلم کا اے ذوق
اور سیاہی سر و ساماں ہے سیہ کاروں کا

مقصد یہ تھا کہ سیاہی کے التزام سے سیاہ کار باندھ دیا جائے۔ خواہ ایہام سے مضمون کسی قدر مضحک اور ناروا کیوں نہ ہو جائے۔

۹۔ دیکھنا اے ذوق ہوں گے آج پھر لاکھوں کے خون
پھر جمایا اس نے لعلِ لب پہ لاکھا پان کا

۱۰۔ بجھنے کی دل کی آگ نہیں زیرِ خاک بھی
ہو گا درخت گور پہ میری چنار کا

محض قافیہ کے لئے شعر کہہ دیا گیا، ورنہ چنار بھی شل اور درختوں کے سبز گھنی چھاؤں کا درخت ہوتا ہے۔ البتہ موسم سرما کے کچھ حصہ میں اس کے پتے ضرور سرخ ہو جاتے ہیں۔ ایسا تو شگوفے پھوٹتے وقت کم و بیش ہر درخت کا حال ہوتا ہے۔

۱۱۔ طاس قلیاں میں رکھا ہے اس نے ابر مردہ کو
ڈوب مر رو رو کے تو اے ابر بہمن آب میں

۱۲۔ دردِ دل سے لوٹتا ہوں میرا کس کو درد ہے
میں ہوں لفظ درد جس پہلو سے الٹو درد ہے

دوسری جگہ اس طرح لفظ قلب سے مضمون پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

۱۳۔ سگِ دنیا پس از مردن بھی دامنگیر دنیا ہو
کہ اس کتے کی مٹی سے بھی کتا گھاس پیدا ہو

محض کتا گھاس باندھنے کے لئے اس قدر تکلف برتا گیا ہے حالانکہ صفتِ مراعاتِ لفظی کی اولین شرط یہ تھی کہ اس میں بے تکلفی ہو۔ شعر پڑھئے کس قدر گھن آتی ہے۔ پھر ثبوت کس قدر لاطائل ہے۔ دیکھئے سراج دکنی نے اس مضمون کو کس اچھوتے پن سے باندھا ہے اور وہی کتا گھاس کس قدر دلکش پیرائے میں دامنگیر ہو رہی ہے۔ حالانکہ یہ اردو شاعری کے عہدِ طفولیت کا واقعہ ہے۔

رہ گئی ہے دل میں دامنگیریوں کی آرزو
سبزۂ تربت مرا ہے پنجۂ گیرا ہنوز

اس مثال سے احترازِ موازنہ کا وہ اصول ٹوٹ رہا ہے جو ہم نے اس مقالہ میں اپنے اوپر عاید کر رکھا ہے۔ لیکن یہ شعر محض اس لئے لکھا گیا ہے کہ ایک صاحب فرماتے تھے کہ سبزۂ تربت کی دامنگیری کا مضمون صرف ذوق ہی کے ہاں ہے اور کہیں نہیں۔ دوسرے مثال بہت دور دراز دقتوں کی ہے۔ قارئین اس عبارت سے درگذر فرمائیں۔

۱۴۔ سو بار مر کے عاشقِ جاں باختہ تیرا
مرنے کو پھر کھڑا روشِ نزد ہو گیا

علاوہ مراعاتِ مہمل کے تشبیہہ کس قدر مضحک ہے۔

۱۵۔ نہچہ وہ موذی جب بانکا جواں لینے لگا
موت کے جی میں مزے یہ نیم جاں لینے لگا

۱۶۔ ڈھلکتا ہے مثالِ دانۂ تسبیح کیوں منکا
کہ جب ٹھہرا سفر دنیا سے کیا کام استعارے کا

۱۷۔ میں ہمیشہ عاشقِ پیچیدہ مویاں ہی رہا
خاک پر روئیدہ میرے عشق پیچاں ہی رہا

۱۸۔ نہ جھاڑا غیر کو ہرگز کہ ہو کر جھاڑ لپٹا تھا
کبھی پر گالیوں کا جھاڑ تو نے بر زباں باندھا

۱۹۔ اس بتِ نا مہرباں کو ہے پسند اپنا رقیب
وہ واسطہ اپنا ہی ہیں بھی ہے تو یار رقیب

۲۰۔ غزال رم دیدہ بن گیا ہے جو خواب آنکھوں میں تو جاگ
کر جھاڑ کر کیا انکو دوڑتا ہے پلنگ تجھ بن پلنگ ہو کر

دیکھئے علاوہ ذم لفظی مضمون کس قدر رکیک و مضحک ہو گیا ہے۔

۲۱۔ کس نزاکت سے ہے دیکھو اتحاد حسن و عشق
زلف والاں شانے میں کھنچی ورو ہے یاں شانے میں

مصرعہ اولیٰ کس قدر فکر بلیغ کا آئینہ دار معلوم ہوتا ہے۔ لیکن مقصود اس سے محض لفظ شانہ سے صنعت تجنیس کا اظہار ہے۔ شانہ میں درد ہونے سے اتحاد حسن و عشق ثابت کرنا کس قدر بیجا ہے کیونکہ زلف کی مشاطگی تو تحسین و تزئین کی خاطر ہے۔ درد شانہ سے اسے کیا مناسبت۔

۲۲۔ جبیں تو نے انشاں جو اے مہ جبیں ہے
ستاروں میں کیا کیا چناں و چنیں ہے

محض رعایت لفظی دکھانے کے لئے شعر کو لفظی گھر وندا بنا دیا ہے۔

۲۳۔ ہائے اے حسرت دیدار مری ہائے کہ بھی
لکھتے ہیں ہائے دو چشمی سے کتابت والے

وقس علیٰ ھذا۔ سارا دیوان اسی صنعت بے معنی کی نذر ہے۔

رکیک جذبات ابتذال

ابتذال کے لئے کسی خاص مضمون کی قید نہیں۔ کبھی بدنما تشبیہوں اور ترکیبوں سے۔ کہیں بازاری اور سوقیانہ محاوروں سے۔ کہیں رکیک جذبات اور کہیں مضحک خیالات سے پیدا ہوتا ہے بعض صورتوں میں تو یہ ذم اور تنافر کا پہلو ہی لئے ہوئے ہوتا ہے اور بعض اوقات اس قدر عریاں اور بدلگام ہو جاتا ہے کہ شاعری ایک طرف سماجی قوانین کی رو سے بھی وہ اس قابل ہوتا ہے کہ کم از کم عبور دریائے شور کر دیا جائے۔

مبتذل کلام ہر حالت میں مستقل عیب ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ کسی کے ہاں اس میں زبان کی شوخی پائی جاتی ہے۔ جیسے داغ کا بازاری پن اور بعض جگہ محض گناہ بے لذت ہو کے رہ جاتا ہے جیسے

صورت پذیر ہو حرکت بے خبر کی کیا
پتلا بنا سکی نہ ۔۔۔۔ تلام کی
آتش

(باقی آئندہ)

لہ حضرت ریاض خیرآبادی نے داغ کے اس شعر
حوروں کا انتظار کرے کون حشر تک
ملتی ہی بھی ملے تو روا ہے شباب میں
کے ابتذال کے جواز میں تحریر فرمایا ہے کہ اگر یہ شعر نہ کہا جاتا تو ایک بازاری محاورہ تشنہ سند رہ جاتا۔

جناب ممدوح کی خدمت میں ہم بہ ادب گذارش کرنے کی جرأت کرتے ہیں کہ ابتذال ہر حالت میں ابتذال ہے۔ خواہ وہ محاورہ کی سند کے لئے لکھا جائے یا روزمرہ کی بندش کے لئے ورنہ اگر یہی وجہ جواز قرار دے دی جائے تو ہر شعر کے لئے کوئی نہ کوئی وجہ تلاش کر لی جائے گی اور یہ عیب بھی داخل حسنات ہو جائے گا۔ یہ طومار بدتمیزی جو ہماری شاعری میں بھرا پڑا ہے اس کی وجہ ہی یہ ہے کہ شروع میں اس وقت کی سوسائٹی نے اسے معیوب قرار نہ دیا۔ ورنہ آج ہمیں شرمانے کی ضرورت نہ پڑتی۔

سوز و ساز

(از جناب محمد کامل صاحب کامل صدیقی بریلوی)

آہ جگر خراش ہوں، نالۂ دل گداز ہوں
درد ہے میرے سوز میں، درد بھرا میں ساز ہوں

عشقِ کرشمہ ساز کا، ایک عجیب راز ہوں
آپ ہی غزنوی ہوں میں، آپ ہی میں ایاز ہوں

عیش سے واسطہ نہیں، عیش کہاں نصیب میں
غم سے مجھے نیاز ہے، غم سے میں بے نیاز ہوں

دیتا ہوں میں فریب خود، دل کو شبِ فراق میں
دکھنا اپنے درد کا آپ ہی چارہ ساز ہوں

میرے وجود میں نہاں رازِ عدم وجود ہے
چشمِ حقیقت آشنا دیکھ میں وہ مجاز ہوں

تم نے یہ کیا کیا کہ پھر رُخ سے نقاب دی الٹ
میں نے یہ کب کہا تھا میں ہوش سے بے نیاز ہوں

پردۂ آہ میں مرے ہوگی صدائے ارغنوں
چھیڑ کے دیکھ لیجئے سوز نہیں ہوں ساز ہوں

دیکھ صبا نہ یوں اُڑا ہوش میں اپنے آ ذرا
یہ بھی تجھے خبر ہے کچھ خاک رہِ حجاز ہوں

کاملِ خوش نوا مری کیف سے پُر ہے زندگی
زمزمہ سنجِ عشق ہوں نغمہ طرازِ ساز ہوں

نورِ حق

(از جناب پنڈت امر جیت صاحب شرما)

(۱)

شبِ دیجور میں پنہاں ہے نورِ حق کی تابانی
پریشاں ہیں ستارے آسماں پر خوف کے مارے   چھپے جاتے ہیں ظلمت میں لرز کر نور کے پارے
خموشی کا عمل ہے چھائی ہے دنیا پہ ویرانی

(۲)

قضا کا حکم ہے ذرّے نہ ہوں بیدار عالم کے
زباں خاموش پتوں کی، رہیں منہ بند کلیوں کے   شگفتہ ہو نہیں سکتے خوشی سے چہرے پھولوں کے
سراپا اشک بن جائیں یہ گوہر ہیں جو شبنم کے

(۳)

مگر ظلمات کے پردوں سے چھن کر نور آتا ہے
جگانے کے لئے خوابِ گراں سے سارے عالم کو   دکھانے کے لئے اپنا کرشمہ چشمِ پُر نم کو
طلسمِ خامشی پر ایک جادو سا چلاتا ہے

(۴)

چمک کر پھر ہمالہ پر دلوں کو جگمگا دے گا
تغافل کو مٹا دے گا زمانے کو جگا دے گا

تختِ سلیمانؑ

(از جناب منشی محمد فضل الدین صاحب جہبر)

اس سے پیشتر کہ تختِ سلیمانؑ کی حقیقت بیان کی جائے میں سعید کے قارئین کرام کا تعارف بلوچستان کے اُس بڑے حصہ سے کرانا چاہتا ہوں جس کی سرحد پر یہ تخت واقعہ ہے۔ یہ حصہ بہمہ اعتبار سرزمینِ عرب اور اُس کے قبل از اسلام کے باشندوں سے بالکل ملتا جلتا ہے۔ یہاں کے باشندے یوں تو بفضلِ خداوندکریم تمام کے تمام غیور مسلمان ہیں اور پابندِ صوم وصلوٰۃ۔ مگر حقیقت اور مقاصدِ اسلام سے بالکل بے خبر۔ ایامِ جاہلیت کی تمام روایات وعادات ان میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔ اُسی طرح سینکڑوں قبائل میں منقسم ہیں۔ وہی بربریت ہے۔ تہذیب وتمدن کا گذر اب تک یہاں بھی نہیں ہوا۔ اُن کا شیوہ اگر دختر کشی تھا تو ان کا دختر فروشی ہے۔ اگر اُن میں اصنام پرستی تھی تو اِن میں پیرپرستی۔ قبر پرستی۔ ملا پرستی اور اسلاف پرستی وغیرہ وغیرہ موجود ہے۔ اگر وہ مردار کھاتے تھے۔ تو یہ سود کھاتے ہیں۔ باہم فساد، قتل وغارت اِن کا بھی روزمرہ کا مشغلہ ہے۔ عورتیں ان کی ایک معمولی ادنیٰ زرخرید غلام ہیں۔ اور وہ خاوند کے بعد ورثا کی اُسی طرح ملکیت ہیں جس طرح باقی جائداد واملاک۔ ان کا سارا وقت باہم ایک دوسرے کی تخریب اور تلاش خیرات وانعام میں گذرتا ہے اور اُن کے غصہ وعداوت کی کوئی انتہا نہیں۔ قبائل کی عداوت پشت بہ پشت جاری رہتی ہے۔ اپنی فلاح وبہبود کا ان کو کوئی خیال نہیں۔ کاہل بعقل اور تعلیم سے بالکل بے بہرہ ہیں جس کے ذمہ دار ان کے عالم نما جاہل مسلا اور جا بجا فرضی مقابر کے مجاورین ہیں۔

غرضیکہ جس طرح مذہب کی تذلیل اور تہذیب وتمدن کا خون یہاں ہو رہا ہے اُسے اسلام اور انسانیت ہرگز گوارا نہیں کرسکتی۔ اس لئے ضرورت ہے کہ بحکم قرآن کریم تعالوا الی کلمۃ سواءٌ بیننا وبینکم ولا نعبد الا اللہ۔ فروعات شرک وبدعات کو مٹا کر ان سب کو ایک ذاتِ وحدہٗ لاشریک اور اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مذہب کی صحیح تعلیم دے کر ایک ہی مرکز پر لاکر جمع کر دیا جاوے۔

یہاں کی قبرپرستی اور پیرپرستی کا تو یہ حال ہے کہ آپ جہاں کہیں جاکر دیکھیں گے وہیں آپ کو سرخ وسپید اور نیلے پیلے جھنڈوں والی کوئی نہ کوئی زیارت ضرور دکھائی دے گی۔ بعض زیارت گاہوں نے تو خانہ کعبہ کا درجہ حاصل کر لیا ہے اور مرجع خلائق بنی ہوئی ہیں۔ باقاعدہ ہر سال وہاں جاکر منتیں مانی جاتی ہیں اور قربانیاں کی جاتی ہیں۔ ان میں سے ایک "تختِ سلیمان" بھی ہے۔ جس کی نسبت طرح طرح کی باتیں بیان کی جاتی ہیں۔ جو اساطیر الاولین سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔ مثلاً اس کے متعلق انکے عقائد ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا تخت مشرق سے مغرب کی طرف اُڑ کر جا رہا تھا کہ یہاں اس پہاڑ کی چوٹی پر پہنچکر ٹھہر گیا۔ اور آنحضرتؑ نے اس چوٹی پر چند ساعت قیام فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا کہ "جو شخص یہاں آکر زیارت کرے گا جو چاہے گا سو پائے گا۔ اور اس کے تمام گناہ معاف ہوں گے"۔

اس چوٹی کے اوپر والے چیڑ کے درختوں کی شاخوں کا قدرتاً مغرب کی طرف رُخ ہے مگر یہ کہتے ہیں کہ جس وقت تخت جانے لگا ہے تو یہ سب درخت جھک کر آداب بجا لائے ہیں اور اب تک اسی رُخ جھکے ہوئے کھڑے ہیں۔ چوٹی کے ذرا نیچے ایک چھوٹا سا غار ہے جو دونوں طرف سے کھلا ہوا ہے اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہاں سے منسوب عفریت عرف کالا دیو بھاگ کر نکلا تھا۔ اس لئے یہاں پتھر اور کنکر پھینکنا کار ثواب ہے اور اس چوٹی پر ہر جمعرات کو دیو پریاں اکٹھے ہو کر خیرات اور ختم کرتے ہیں۔ اب میں ناظرین کی تفنن طبع اور آگاہی کے لئے تخت سلیمان کی حقیقت بیان کرتا ہوں۔ وھوھٰذا۔

تخت سلیمان سلسلہ کوہ سلیمان کی سب سے اونچی چوٹی ۱۱۰۰۰ فٹ بلند ۳۰۰۱۳ درجہ عرض البلد شمالاً اور ۷۰۰۲ درجہ طول البلد شرقاً شمال مغربی سرحدی صوبہ میں ڈیرہ اسمٰعیل خاں کے مغرب کی طرف واقع ہے۔ یہ خط استوا سے نزدیک اور حد الثلج سے تقریباً آٹھ نو ہزار فیٹ نیچے کو ہے۔ اس لئے اس پر سال بھر تو برف ہی نہیں رہتی۔ مگر تاہم موسم سرما میں یہ چوٹی کچھ عرصہ برف سے ڈھکی رہتی ہے جس کے اسباب و علل جغرافیائی اصول کے مطابق یہ ہیں۔

کسی جگہ کی انسانی اور حیوانی آبادی کا انحصار وہاں کی نباتات پر ہوتا ہے اور نباتات کا آب و ہوا پر اور آب و ہوا کا انحصار اس جگہ کے محل وقوع اور بارش پر ہوا کرتا ہے۔ اس لئے کسی جگہ کی آب و ہوا اور محل وقوع کا بیان کر دینا گویا اس جگہ کے حالات بیان کر دینا ہے۔ چونکہ تخت سلیمان خط استوا سے صرف ۳۱ درجہ عرض البلد شمال کو واقع ہے اس لئے یہاں تقریباً تمام سال سورج کی شعاعیں عموداً پڑتی ہیں مگر ساتھ ہی یہ سطح سمندر سے ۱۱۰۰۰ فٹ کی بلندی پر ہے اور تقریباً ۳۰۰ فٹ کی بلندی پر ۱ درجہ حرارت کی کمی ہو جاتی ہے اور بہ نسبت میدان کے پہاڑوں پر کم گرمی پڑتی ہے۔ اس لئے اس کی آب و ہوا گرمیوں میں گرم معتدل ہے۔

سطح سمندر سے یہ جگہ بہت دُور ہے۔ اس لئے نمی سے لدی ہوئی ہوائیں یہاں تک نہیں پہنچتیں۔ اس لئے بارش کم ہوتی ہے اور نباتات کم ہے۔ پہاڑی درخت دیودار اور چیڑ کے ہیں جو اکثر بلند پہاڑوں پر ہوتے ہیں مگر جاڑے میں جو سطح مرتفع افغانستان کے سرد علاقہ سے شمال مغربی ہوائیں پنجاب کو چلتی ہیں۔ وہ یہاں کی آب و ہوا کو سردیوں میں نہایت سرد بنا کر بارش کو برف میں تبدیل کر دیتی ہیں۔ اس لئے دسمبر، جنوری اور فروری میں یہ چوٹی برف سے مستور رہتی ہے۔

جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ حیوانات کا دارومدار نباتات پر ہے بدیں لحاظ یہاں کے حیوانات مارخور۔ ہڑیال (اُڑیال) ہرن اور ریچھ وغیرہ ہیں۔ تمام پہاڑ کا نشیب چیل اور دیودار کے درختوں اور جنگلی خاردار جھاڑیوں سے پٹا پڑا ہے۔ کہیں کہیں جنگلی بادام اور انار کے درخت بھی پائے جاتے ہیں۔ بہت سی عجیب و غریب جنگلی بوٹیاں ہیں۔ جن میں جنگلی پیاز کی کثرت ہے۔ گھنے جنگل کی وجہ سے تمام راستہ دشوار گذار ہے۔ پانی کی سخت قلت ہے۔ واقف کار آدمی کے سوا پانی کا ملنا ناممکنات سے ہے۔ کچھ راستہ چوٹی کے نزدیک پلصراط کی مانند ہے اور وہاں سے گذرتے ہوئے بلاشک انسان کو خدائے عزوجل کی شان کبریائی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے اور روز محشر والے پلصراط کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ یہاں پہنچکر ہمارے بدرقہ نے ایک عجیب غریب بات بتلائی کہ اس جگہ سے مارخور اس تیز رفتاری سے بلا دھڑک گذرتا ہے جس طرح سمند شوخ پٹڑی پر دوڑتا ہوا جاتا ہے۔ پہاڑ کی چوٹی کسی قدر ہموار ہے اور پہاڑ مغرب کی طرف سے سلامی رکھتا ہے لیکن مشرق کی طرف بالکل عموداً واقع ہے۔ نیچے نگاہ ڈالتے ہوئے آنکھوں کے آگے اندھیرا آ جاتا ہے۔ اس چوٹی کے سرے تقریباً بارہ چودہ فیٹ نیچے نہایت خطرناک اُترائی پر چھجے کی طرح جس پر چار آدمی باہم مل کر بیٹھ سکتے ہیں ایک پتھر ہے اور یہی تخت سلیمان ہے۔



توسیع مطالبات آزاد

(از جناب پنڈت پربھو دیال صاحب مصر عاشق لکھنوی)

جہاں تک ہو دلِ آمادۂ ایثار پیدا کر جہاں تک ہو نگاہِ شاہدِ اسرار پیدا کر
جہاں تک ہو تمیزِ نیک و بد اطوار پیدا کر جہاں تک ہو مذاقِ آرزوئے یار پیدا کر
جہاں تک ہو خیالِ ماسوا سے عار پیدا کر

سبیلِ اتحادِ سبحہ و زنار پیدا کر مساواتِ نظر کے آنکھ میں آثار پیدا کر
مٹا دے امتیازِ ما و تو وہ پیار پیدا کر نظر کیفی، طبیعت مست، دل سرشار پیدا کر
جو پیدا کر سکے یہ حالِ صہبا بار پیدا کر

یہ مانا نفرتِ اغیار کے جذبات سب صادق یہ مانا لذتِ افکار کے جذبات سب صادق
یہ مانا حسرتِ دیدار کے جذبات سب صادق یہ مانا الفتِ دلدار کے جذبات سب صادق
مگر پہلو میں دل تو قابلِ دلدار پیدا کر

لبوں پر خامشی چھائیگی اس کی فکر لاحاصل تلاش اپنی تُو آپ ہی پائے گی اس کی فکر لاحاصل
وہ صورت خواب میں آئیگی اس کی فکر لاحاصل نگاہِ لطف ہو جائے گی اس کی فکر لاحاصل
مگر حالت نگاہِ لطف کی حقدار پیدا کر

کبھی تو خواب میں ہی صورتِ زیبا دکھانا تھا تصور میں کبھی تصویر کا نقشہ جمانا تھا
بھلا یوں طالبِ دیدار سے کیا منہ چھپانا تھا زباں تک شکوۂ محرومیٔ دیدار آنا تھا
خطاب آیا کہ جا اور طاقتِ دیدار پیدا کر

ہیں قبل از وقت اے دل گریۂ خونبار کے دعوے نہیں زیبا ابھی سے حسرتِ دیدار کے دعوے
ابھی سے چاہ پر غزہ ابھی سے پیار کے دعوے ابھی سے غائت فدویت و ایثار کے دعوے
ابھی تو عادتِ فدویت و ایثار پیدا کر

اگر اہلِ جفا نے بات مانی بھی تو کیا حاصل بغل میں ہے عروسِ کامرانی بھی تو کیا حاصل
اگر کوئے صنم کی راہ جانی بھی تو کیا حاصل اگر دیر و حرم کی خاک چھانی بھی تو کیا حاصل
جہاں تک ہو خراباتِ مغاں میں بار پیدا کر

شجاعت کا اگر اغیار سے لوہا منانا ہے شرافت کا اگر سکّا ہر اک پر سکّہ جمانا ہے
اگر تہذیب دیرینہ زمانہ کو جتانا ہے اگر دنیا میں خود کو زندہ ثابت کر دکھانا ہے
تو اٹھ اور زیست کے کامل ترین آثار پیدا کر

مثالِ اشکِ غلطاں زندگی کاٹی تو کیا کاٹی مثالِ شمعِ لرزاں زندگی کاٹی تو کیا کاٹی
جمود آگیں اگر یاں زندگی کاٹی تو کیا کاٹی مثالِ جسمِ بےجاں زندگی کاٹی تو کیا کاٹی
ثبوتِ زندگی ناقابلِ انکار پیدا کر

کبھی ہو حق بجانب تجھکو عاشق نے نہیں دیکھا نہیں ہے یاد لٹکا بھی کوئی تعویذ گنڈے کا
نہیں آرائشِ ظاہر کا بھی دل کو ترے لپکا سمجھتے آزاد یوں درویش کامل کون مانے گا
جہاں سے ہو جریب و جبہ و دستار پیدا کر

پختگی جنون

(از سعید بریلوی)

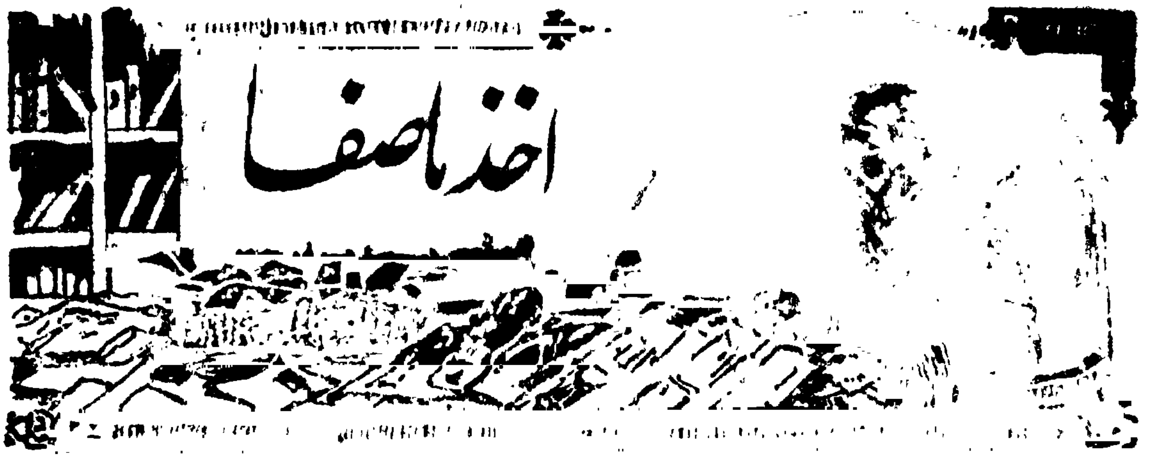
غنیمت تھا لڑکپن ہی تمہارا اس جوانی سے
ہزار افسوس یوں ہی چلدیا اچھا زمانہ تھا
ادھر میں سیدھا سادا تھا ادھر تم بھولی بھالی تھیں
اکٹھے بیٹھتے تھے باغ میں گھر چھوڑ کر پہروں
خیال عشق سے ناآشنا تھا گو دماغ اپنا
محبت کی مگر ریشہ دوانی ہوتی رہتی تھی
نہ تھا احساس لیکن دل نہ خالی تھا محبت سے
برا معلوم ہوتا تھا تمہارا کھیل اوروں سے
تمہارے روئے زیبا کا تماشا دل کو بھاتا تھا
تمہارے سامنے اکثر میں کچھ کھویا سا رہتا تھا
تمہاری یاد تنہائی میں شب بھر پاس رہتی تھی
کہا کرتی تھیں مجھ سے والدہ وقت سحر اکثر
خموشی کے سوا اس کا جواب اوراں کو کیا دیتا

مبارک تھا تمہارا دور اول دور ثانی سے
بہت کم عمر تھیں تم میں ذرا تم سے سیانا تھا
جھجک تھی کچھ مرے دل میں نہ تم شرمانے والی تھیں
ہوا کرتی تھیں باتیں لطف سے سر جوڑ کر پہروں
نہ پروانہ دل تم کو کہتا تھا چراغ اپنا
غم الفت کی مجھ پر مہربانی ہوتی رہتی تھی
سلگنے کچھ جبھی سے یہ لگا تھا سوز الفت سے
گزرتا تھا گراں دل پر تمہارا میل اوروں سے
تمہاری گفتگو سننے میں دل کو لطف آتا تھا
جدا رہتا اگر تم سے تو کچھ سویا سا رہتا تھا
سحر کو تم سے پھر ملنے کی دل کو آس رہتی تھی
لیا کرتا ہے یہ اک نام کیوں تو رات بھر اکثر
سبب خود جانتا ہوتا تو ان کو بھی بتا دیتا

مجھے جب مدرسہ میں کچھ تمہارا دھیان آتا تھا
دیا کرتے ریاضی کے سوال استاد کرنے کو
بسا اوقات میں پیاری تمہارا نام لکھ جاتا
مجھے اسکول میں جب اک ذرا صورت کشی آئی
بس اک تصویر تم سے ملتی جلتی سی بنا ڈالی
بڑا ہی لطف آیا تھا مجھے اس کے بنانے میں
یوں ہی الفت تمہاری رفتہ رفتہ بڑھتی جاتی تھی
ہزار افسوس طرز زندگی میں انقلاب آیا
جھجک آتی ہے اب مجھ کو تمہارے پاس جانے میں
تمہارے اقربا رکھنے لگے تم کو نگاہوں میں
بٹھائے رکھتی ہے گھر میں تمہیں رسموں کی مجبوری
کبھی دیوار پر سے اور گاہے چھت کی موری سے
مگر یوں دیکھنے سے اور بڑھ جاتی ہے بے تابی
بسا ہے درد الفت میرے دل میں نوجواں ہو کر
قیامت ہے تمہارا گھر میں یوں محبوس ہو جانا
نہ رو سکتا ہوں جی بھر کر نہ چپ رہنے کا یارا ہے

کچھ ایسا محو ہوتا تھا کہ پڑھنا بھول جاتا تھا
لکھاتے یا عبارت بر زباں کچھ یاد کرنے کو
جب اس پر کچھ سزا ملتی تو دل ہی دل میں جھنجلاتا
خوشی کی مسکراہٹ پھرتی تھی ہونٹوں پہ اترائی
پھر اس ڈر سے کہ کوئی دیکھ لے گا جھٹ مٹا ڈالی
قلق سا بھی ہوا تھا دل کو پھر اس کے مٹانے میں
محبت کا سبق میری طبیعت پڑھتی جاتی تھی
مجھے جب کچھ سمجھ آئی تمہارا بھی شباب آیا
تمہیں بھی شرم سی آنے لگی ہے منھ دکھانے میں
نہ اب آتی ہو کوٹھوں پر نہ اب ملتی ہو راہوں میں
کئے دیتی ہے دیوانہ مجھے یہ جاں گسل دوری
تمہیں گو اب بھی اکثر جھانک ہی لیتا ہوں چوری سے
مجھے ڈر ہے کہ دیوانہ نہ کر دے مجھکو بے خوابی
جنوں میں پختگی سی آگئی پیاری جواں ہو کر
ضرورت ضبط الفت کی تجھے محسوس ہو جانا
نہ دل لگتا ہے کھیلوں میں نہ پڑھنا ہی گوارا ہے

جہاں میں ہے تمہارے اب بھلوں گا میں نہ بھولوں گا
تمہیں میں زندگی بھر اب نہ بھولوں گا نہ بھولوں گا



چھوت چھات اور مسلمان

(از جناب مولانا طفیل احمد صاحب)

مندرجہ بالا مضمون پر کانفرنس گزٹ میں گذشتہ چند ماہ کے اندر مختلف عنوانات کے تحت میں ایڈیٹر صاحب کے قلم سے تقریباً نو نمبر شائع ہوئے ہیں جن میں نہایت قابلیت کے ساتھ اس مسئلہ کے ہر پہلو پر نظر ڈالی گئی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میں بھی اس باب میں کچھ اظہار خیال کروں اور امید کرتا ہوں کہ دیگر ناظرین بھی اس بحث میں کچھ حصہ لیں گے۔

بعض اصحاب کا خیال یہ ہے کہ کانفرنس گزٹ نے جو ایک تعلیمی پرچہ ہے اس بحث میں کیوں حصہ لیا ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ جب مہاتما گاندھی نے فاقہ کشی کا اعلان کیا ہے تو اس نے تمام ملک میں ایک ہیجان پیدا کر دیا۔ اس وقت کوئی محفل اور کوئی مجلس کوئی رسالہ اور کوئی اخبار چھوت کے تذکرہ سے خالی نہ ہوتا تھا اور ہر شخص اپنے اپنے نقطۂ نظر سے اس مسئلہ سے متاثر تھا اور اس کا اظہار تحریر اور تقریر کے ذریعہ سے کرتا تھا چنانچہ کانفرنس گزٹ کے اس سلسلہ کے پہلے مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ ایڈیٹر صاحب نے خالص مذہبی جذبات کے تحت میں اُسے تحریر فرمایا ہے۔ موصوف کو یہ اندیشہ ہوا کہ مسلمان مذہبی اعتبار سے مہاتما گاندھی کی طرف جھکنے نہ لگیں اور انھیں خدا کا قاصد سمجھکر گمراہ نہ ہوں۔ اس مقصد اور غرض سے جو کچھ لکھا گیا وہ پہلے مضمون میں کافی تھا اور غالباً اس سے زیادہ ضرورت نہ تھی۔ اب رہا یہ امر کہ یہ تحریک کامیاب ہوئی یا نہیں ہوئی۔ اس تحریک میں ہندوں نے صرف نیچ قوموں سے پرہیز توڑا ہے اور مسلمانوں کو اس میں شامل کیوں نہیں کیا۔ اس میں مسلمانوں کی توہین ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب وہ ہیں جو بالعموم اخبارات میں زیر بحث رہے ہیں۔ انکے متعلق راقم کو بھی عرض کرنا ہے۔

میرے نزدیک ہندوؤں کو اچھوت اقوام سے جس قسم کا پرہیز ہے وہ اس سے مختلف ہے جو انھیں مسلمانوں سے ہے۔ عام طور پر ہندو مسلمانوں کے پاس اُٹھتے بیٹھتے ہیں۔ ایک دوسرے سے مصافحہ کرتے ہیں۔ تیوہاروں میں اور خاص تعلقات کی صورت میں بغل گیر بھی ہوتے ہیں۔ البتہ ساتھ کھانے پینے میں پرہیز کرتے ہیں۔ مگر پست اقوام کے ساتھ ان کا یہ برتاؤ ہے کہ اُن کے ساتھ کھانا کھانا تو درکنار اُن کا بدن یا کپڑا تک چھو جانا گوارا نہیں کرتے۔

اسی امتیاز کی وجہ سے پست اقوام کو ہندوؤں سے شکایت ہے کہ باوجودیکہ وہ اُنہی کے طریقہ کی عبادت کرتے ہیں، اُن جیسی صورتیں رکھتے ہیں۔ اُن جیسا لباس پہنتے ہیں۔ انہی کے طریقہ پر کھاتے پیتے ہیں اور اُنھیں کے جزو سمجھے جاتے ہیں۔ مگر اُن کے ساتھ کھانا کھانا تو درکنار اُن سے اس قسم کا خلا ملا بھی نہیں رکھتے۔ جیسا کہ گائے کا گوشت کھانے والے مسلمانوں سے رکھتے ہیں۔ پست اقوام کی اس شکایت کا جواب پچھلے دنوں بنارس کے بعض پنڈتوں نے یہ دیا تھا کہ مسلمان یون ہیں اور وہ اچھوت میں داخل نہیں ہیں۔ یون سے مراد اُن شریف اقوام سے ہے جو ہندوؤں کے علاوہ ہیں۔ وہ چھونے میں ناپاک نہیں سمجھے جاتے۔ اگرچہ وہ گائے کا گوشت کھاتے ہوں۔ شودر از روئے شاستر کے بمنزلہ ہندو سوسائٹی کے پاؤں کے ہیں۔ اور اگرچہ وہ گوشت چھوڑ دیں تب بھی وہ یون کے برابر نہیں ہو سکتے۔ پس جبکہ مسلمانوں کے چھونے سے ہندو ناپاک نہیں ہوتا تو ظاہر ہے کہ ہندوؤں کے نزدیک نہ مذہباً اور نہ رسماً مسلمان اچھوت ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہندو اُن کے ساتھ نہ کھا سکتے ہوں۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ مسلمان اس بات سے بُرا مانیں کہ ہندو اُن کے ساتھ نہیں کھاتے اور ہمارے نزدیک تو مسلمانوں کی خودداری سے یہ بعید ہے کہ وہ ہندوؤں کے ساتھ کھانے پینے کے متمنی ہوں۔

دیگر امر یہ کہ اس امر سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اچھوت یا پست اقوام ہندو سوسائٹی کے جزو ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ برہمن اپنے کو سر اور شودروں کو پاؤں سمجھتے ہوں۔ یہ اُن کا اندرونی تنازعہ ہے اب اگر وہ اپنی قومی ضروریات کو محسوس کر کے اپنے پاؤں کو سر کی برابر سمجھنے لگیں تو اس میں ہمیں بُرا ماننے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے بلکہ مسلمانوں کو تو اس سے خوش ہونا چاہیئے کہ مسلمانوں کے اصول مساوات کو دیگر اقوام بھی اختیار کر رہی ہیں۔ اس میں تو عین اسلام کی کامیابی ہے کہ ایک طرف تو بت پرست قومیں توحید اختیار کر رہی ہیں دوسری طرف چھوت چھات کو چھوڑ کر پست اقوام کو اُبھار رہی ہیں۔ اچھا تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو تھوڑی بہت کامیابی ہندوؤں کو چھوت چھات دور کرنے میں ہو رہی ہے اُس پر ہم ہندوؤں کو مبارکباد دیں۔ اگر اتنی فراخ دلی ہم میں نہیں رہی تو کم سے کم اُن کی ناکامیوں کو دکھا کر اپنی تنگ دلی کا ثبوت تو نہ دیں۔

اب رہا یہ امر کہ ہندو مسلمانوں کے ساتھ کھانے پینے سے دونوں میں اتحاد ہو جائے گا اس لئے صحیح نہیں ہے کہ اس وقت سب سے زیادہ مخاصمت اُنہی ہندو مسلمانوں کے درمیان ہے جن میں کھانے پینے کا پرہیز نہیں ہے۔ اُس کی وجہ یہ ہے کہ آج کل کے تنازعات دراصل تقسیم حقوق اور عہدوں پر مبنی ہیں نہ کہ مذہبی تعصبات پر یہ کشمکش تو صرف اس وقت دور ہوں گی جبکہ فریقین میں سیاسی مفاہمت ہو جائیگی اور مخصوص کاغذی مفاہمت نہیں بلکہ عملی مفاہمت جس کی تکمیل کے لئے ابھی بہت زمانہ درکار ہے۔ اُس سے قبل ایک ساتھ کھانے پینے سے فائدہ ہوگا اور نہ باہمی مناکحت سے یہ سب سطحی چیزیں ہیں۔

اس مسئلہ میں یہ میرے ناچیز خیالات ہیں اگر میں نے کچھ غلطی کی ہے تو امید ہے کہ ناظرین میں سے کوئی صاحب اس کی تصحیح کر کے ممنون فرمائیں گے۔ (کانفرنس گزٹ)

بیکاری کا علاج

اگر ہندوستان سے بیکاری کو دور کرنا ہے تو اُس کا بہترین علاج گورنمنٹ کی موجودہ تعلیمی پالیسی سررشتہ تعلیم کا موجودہ نظام اور موجودہ غیر ضروری مضامین کی کثرت۔ نصاب تعلیم اور طریقہ امتحان

کی تبدیلی سے ہو سکتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ بہت سے غیر ضروری مضامین کو کم کیا جاوے نصاب تعلیم بنانے کے وقت یہ خیال رکھا جاوے کہ وہی کتابیں اور وہی علوم پڑھائے جاویں جن سے طلبار کے اخلاق درست ہوں اور وہ اپنے بل بوتے پر روزی پیدا کر سکیں طریقہ امتحانات کو انگلستان اور یورپ کی دوسری یونیورسٹیوں کی طرح تبدیل کیا جاوے۔ فزیکل ٹریننگ ہاکی وغیرہ تفریحی کھیلوں میں وقت صرف کرنے کے بجائے طلبہ علم ہل پکڑنا وغیرہ لینے کے زمانہ طالب علمی میں عادی بنیں اور تعلیم اس طریقہ سے دی جائے کہ اسکول کے تعلیمی گھنٹوں کے علاوہ طالب علموں کو کتاب کے سبق یا کاپیوں کے لکھنے کا کام نہ کرنا پڑے۔ نصاب تعلیم میں کچھ طالب علموں کو کھیتی باڑی کا کام سکھایا جاوے اور کچھ ترکاریاں بونے اور باغبانی کے کام کی تعلیم دی جائے۔ کچھ طالب علموں کو گائے بھینس۔ بھیڑ۔ بکری اور مرغیوں کی نسلیں بڑھانے کی تعلیم دی جائے۔ ایسی چھوٹی چھوٹی کلوں کے ذریعہ مختلف قسم کے کام سکھائے جاویں تاکہ وہ قلیل سرمایہ سے معاش پیدا کر سکیں۔ اور یہ تمام تعلیم اسکول کے چھوٹی عمر کے بچوں سے شروع کرائی جائے۔ (البشیر)

ماں کی طرح

ڈاکٹر رابندرا ناتھ ٹیگور

ماں ——— ممتا کی ماری ماں کہتی ہے ——— تمہارے جی میں جو آئے کہو ——— میں بخوشی سننے کے لئے تیار ہوں۔ لیکن میں اپنے بچے کو تم سے زیادہ جانتی ہوں ——— میرے دل میں اس کا درد تم سے زیادہ ہے ——— میں اپنے بچے کی کمزوریوں کا حال خوب جانتی ہوں ——— لیکن ——— میں اُس سے محبت کرتی ہوں ——— اس لئے نہیں کہ وہ فرشتہ سیرت ہے۔ اس لئے نہیں کہ اُس میں کوئی برائی نہیں۔ اس لئے نہیں کہ وہ تمام صفات حسنہ سے متصف ہے بلکہ اس لئے کہ ———

وہ میرا بچہ ہے۔ اُسے میں نے اپنی آغوش میں پالا ہے۔ جب میں اپنے بچے کو سزا دیتی ہوں تو ——— وہ مجھے اپنے ہی جسم کا ایک حصہ معلوم ہوتا ہے۔ ہاں ہاں میں اُس کو سزا دیتی ہوں لیکن ——— جب وہ سزا ملنے پر روتا ہے تو ——— میرا دل بھی اُس کے ساتھ رونے لگتا ہے۔ اگر تم اُس کو برا میرے سامنے برا کہو تو میری آنکھوں میں خون اُتر آئے گا ——— میں تمہاری دشمن ہو جاؤں گی۔ اپنے پیارے بچے کو صرف میں ہی ——— بُرا بھلا کہہ سکتی ہوں ——— سزا دے سکتی ہوں ——— ملامت کر سکتی ہوں ——— کیونکہ ——— زجر و توبیخ کا حق صرف محبت کرنے والے کو ہی حاصل ہے اور میں اُس سے محبت کرتی ہوں۔

اس دنیائے پُر خار میں۔ جب میرے تلوے فگار ہو جائیں۔ جب کوئی راہنما نہ ہو اور میں مصیبت کی تاریکی میں راستہ بھول کر خراب و خستہ ہو رہا ہوں۔

جب میری ناکام زندگی کی جھلملاتی شمع بجھ رہی ہو۔

جب نامرادی کی بجلیاں میری تمناؤں کے خرمن پھونک رہی ہوں جب آنکھیں خون کے آنسو بہا رہی ہوں۔ جب دنیا میری دشمن ہو اور مجھے کوئی رفیق دلسوز نظر نہ آتا ہو۔

تو ——— اے خدائے رحیم ———

تو مجھکو ماں کی طرح اپنے دامن عاطفت میں چھپا لے

(امہات)

صاحب کے کارنامے صاحب کی زبان سے

لٹریری ڈائجسٹ نیویارک (امریکہ) کا نامور ہفتہ وار اخبار ہے ایک پرچہ میں اُس نے ایک مضمون "سفید فاموں کا جرم" کے عنوان سے شائع کیا ہے اس میں "صاحب" کے کارنامے آسٹریلیا میں بیان کئے ہیں۔ مضمون مذکور کے بعض اعداد و اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

آج سے ڈیڑھ سو سال قبل آسٹریلیا کے قدیم دیسیوں کی آبادی ۱۰ لاکھ تھی۔ جب سے گوری نوآبادی قایم ہوئی ان کی تعداد گھٹتے گھٹتے کل ایک لاکھ رہ گئی ہے۔ پادری لی فرائے جو مغربی آسٹریلیا میں اسّی پادری رہ چکے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ علاوہ دوسرے اسباب کے یہ صریح مظالم کا بھی نتیجہ ہے۔ آج کہا جاتا ہے کہ تسمانیہ کے دیسی باشندے از خود ناپید ہو گئے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ سنہ ۱۸۳۰ء میں مارشل لا (فوجی قانون) اُن پر جاری کر دیا گیا تھا اور تین چار ہزار سپاہی مع دوسروں کی امداد کے پورے چند ہفتہ تک ان کا تعاقب کر کر کے انھیں ایک تنگ جزیرہ نما کے اندر بند کرنے میں لگے رہے۔ سنہ ۱۸۴۹ء میں سر جارج گبسن گورنر صوبہ نیو۔ اوتھ ویلز نے فرمان شائع کیا کہ اب دیسیوں کا قتل عام رکنا چاہیئے لیکن اس کے بہت عرصہ بعد ایک گورنر کی بابت منقول ہے کہ اُس نے اپنے ایک ہمقوم سے کہا کہ دیسی اگر قتل ہو جایا کریں تو پولیس میں رپورٹ کرنے کی ضرورت نہیں۔ ایک مشہور سیاح نے کوئی ساٹھ سال ہوئے یہ لکھا ہے کہ میں ایک چوبیس سال کے نوجوان سے ملا جو فخر سے کہہ رہا تھا کہ میری دو بندوقوں پر ۷۵ نشان موجود ہیں اور ہر نشان ایک ایک دیسی کے قتل کی علامت ہے۔ وسطی آسٹریلیا میں بھی کل کی بات ہے کہ سنہ ۱۹۲۸ء میں پولیس نے ایک گورے کے انتقام میں ۳۱ دیسیوں کو جن میں عورتیں بھی تھیں گولیاں مار مار کر ٹھنڈا کر دیا۔

یہ صاحب کے کارنامے خود صاحب ہی کی زبان سے سنئے میں آ رہے ہیں۔ پھر بھی معزز و نیکنام صاحب ہی ہیں اور انکی صاحبیت ان کی تہذیب ان کی معاشرت ان کے اخلاق۔ ان کا نظام حکومت، اور ذلیل و بدنام ہم ہیں۔ (سچ)

اردو رسم الخط

اردو حروف تہجی ناقص ہیں یہ کوئی نئی بات نہیں ہے مثلاً کئی حروف کی ایک ہی آواز ہے۔ جیسے ت اور ط کی ا اور ع کی۔ س۔ ص اور ث کی۔ ذ۔ ز۔ ض۔ ظ کی۔ ہ و ح اور ہ کی۔ یہ خرابی حروف صحیح میں ہے۔ حرف علت کا نقش اور بھی عجیب ہے۔ ایک حرف علت سے کئی آوازوں کا کام لیا جاتا ہے۔ اس پر بھی زبر، زیر، و پیش لگا کر کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان دونوں قسم کی خرابیوں کا نتیجہ یہ ہے کہ اردو پڑھنے والے مبتدی کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا ہوتا ہے اور منتہی بھی اپنے انداز میں غلطیاں کر جاتا ہے اور کچھ کا کچھ پڑھ جاتا ہے۔ بالخصوص جبکہ اردو میں انگریزی الفاظ بجنسہ استعمال کئے جاتے ہیں اور پڑھنے والا انگریزی نہیں جانتا ہے۔ جیسے امپرومنٹ انسٹرکشن وغیرہ لیکن مشکل یہ ہے کہ ناقص الف بے ہونے پر لکھنے والے کسی خاص اصول اور قاعدے کے پابند نہیں، اس لئے نقص چند در چند بڑھ جاتا ہے۔

یہ خرابی مرکبات میں بہت زیادہ پیدا ہو گئی ہے ایک تو جنابکی۔ خدمتیں۔ تعلیمیافتہ۔ ضلعمرزاپور۔ شاہجہانپور۔ سبھی النعلی۔ نکیجیگا وغیرہ دو الفاظ یا تین الفاظ کو ملانے میں لوگ نہیں چوکتے۔ دوسری طرف بُل بُل۔ عقل مند۔ زمین دار لکھکر

پڑھنے والوں کو اٹک اٹک کر پڑھنا سکھاتے اور اردو فارسی زبانوں کے جاننے والوں کو بیساختہ ہنساتے ہیں۔ اسی طرح علامت فاعل و مفعول کو ملا کر لکھ مارتے ہیں جیسے آپنے۔ تینے۔ آپکو۔ تمکو ہمکو وغیرہ یا مجھسے۔ تمسے۔ ہمسے لکھتے ہیں۔ حالانکہ ان کو آپ نے تم نے۔ ہم نے۔ آپ کو۔ تم کو۔ ہم کو۔ یا مجھ سے۔ تم سے اور ہم سے لکھا جاتا ہے تو پڑھنے والے کو آسانی ہو جاتی ہے۔

آگے چل کر اور مرکبات میں زبردستیاں ہوتی ہیں اور یائے معروف اور یائے مجہول میں کوئی امتیاز نہیں رکھتے۔ میرے کتاب ہماری بچے لکھنے میں دریغ نہیں کرتے۔ انھیں وجوہات سے اردو زبان کے لکھنے کے قاعدے بنا دئے جانے ضروری ہیں تاکہ لکھنے والے ان کے پابند رہیں۔ یہی نہیں ان قاعدوں کی مدد سے آئندہ اردو ٹائپ بنانے میں بھی سہولت ہو سکے گی۔

لہٰذا چند قاعدے جو عام طور پر مانے گئے ہیں ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

(۱) اعراب لگانے میں اس بات کا خیال رکھا جائے کہ شروع میں اگر زیر یا پیش ہو تو اُس کو لگا دینا چاہئے ورنہ اُس کو زبر سمجھا جائے گا جیسے ان۔ اِس۔ اُن۔ اُس۔ اگر وغیرہ۔

(۲) و مجہول اور و معروف میں فرق رکھا جائے اور علامت و معروف کی دیدی جائے۔ جیسے دوُر۔ پھوُل وغیرہ۔

(۳) یائے مجہول کو ے اور معروف کو ی صورت میں لکھنا چاہئے۔

(۴) الف اور الف ممدودہ میں مد لگا کر صاف کر دیا جائے۔

(۵) ہائے مخلوط ہندی حرف کے لئے خاصکر استعمال کی جائے۔ جیسے بھاؤ۔ کھاؤ۔ پھیری۔ تھالی وغیرہ۔

(۶) ہائے مختفی کو لفظ کے آخر میں صاف لکھا جائے جیسے زردہ بلدہ وغیرہ۔

(۷) نون غنہ جہاں لکھنا ہو وہاں نون ساکن نہ لکھنا چاہئے۔ جیسے کہاں۔ ماں۔ یہاں وغیرہ۔

(۸) دو الفاظ کے مابین کافی فاصلہ دیا جائے۔ تاکہ وہ الگ الگ پڑھے جا سکیں اور اگر ایک مرکب لفظ کے کئی جزو ہیں تو ان کو متصل تحریر کیا جائے۔

(۹) واو معدولہ کے نیچے ایک خط کر دینا مناسب ہے تاکہ فوراً پہچان لیا جائے۔ جیسے خود۔ خویش۔ (اودھ اخبار)

اسیر وطن کی رہائی

(لارڈ بائرن کی ایک نظم کا ترجمہ)

میرے بال سفید ہو گئے ——— لیکن تقاضائے عمر سے نہیں ——— بلکہ صرف ایک ہی شب میں۔ غم و افکار کی وجہ سے
میرے اعضائے جسم بیکار ہو گئے ہیں۔
ضعیفی سے نہیں ——— بلکہ سالہا سال تک قیدخانہ میں بیکار پڑے رہنے سے۔

میں ان لوگوں میں ہوں۔
جنھیں آزادی کی فضا میں سانس لینے کی ممانعت ہے جو اپنے دل کے جذبات دل ہی میں رکھنے پر مجبور کئے جاتے ہیں۔
جن کی عرض مدعا پر زبان کٹ جاتی ہے۔
میں محض اپنے عقاید کی وجہ سے۔
قید خانہ کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہوں۔

میرے بھائیوں اور عزیزوں نے اپنے پاک مقاصد کیلئے

جان دیدی۔ گردش تقدیر سے میں قیدی زنداں ہوں۔
قلعہ کی یہ چار دیواریں کب سے میری دنیا بنی ہوئی ہے؟
مجھے نہیں معلوم۔
عالم تنہائی میں تاریخوں کا شمار کس طرح کروں؟
لو ——— قیدخانہ کا دروازہ کھل گیا۔
چند آدمی مجھے آزادی کا پیغام سنانے آئے ہیں۔
مجھے ان کے آنے کی ذرہ برابر خوشی نہیں ہوئی۔
کیونکہ میرے لئے آزادی اور اسیری دونوں یکساں ہیں۔
مجھے ایوسی و ناکامی سے محبت ہوگئی ہے۔

میری زنجیریں ایک ایک کرکے کاٹ دی گئیں۔
اب میں آزاد ہوں۔
لیکن زنداں سے رخصت ہوتے وقت۔
میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔
دل سے آہ سرد نکلی۔
مجھے اپنی زنجیروں سے اب محبت ہوگئی تھی۔
قید خانہ کی دیواریں میرے لئے مقدس بن گئی تھیں۔
مجھے ایسا معلوم ہوا کہ گویا میں اپنے گھر سے نکالا جارہا ہوں۔

(ریاست)

کرشنا مورتی اور اس کی تعلیم

(از جناب اینٹ ایلگزینڈر صاحب)

ایسی نادر ہستیوں کو جو اپنے تئیں بنی نوع انسان کے لئے روحانی اور ربانی پیغام کا حامل تصور کرتی ہیں پرجوش حامیوں اور مشتبہ نگاہ سے دیکھنے والے منکروں۔ دونوں نوع کے انسانوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ بہت سے ایسے افراد ہیں جو اس قسم کی گفتگو یا ایسی گفتگو میں دلچسپی کو اختلال دماغ سے زیادہ وقعت نہیں دیتے اور بسا اوقات یہ رائے صحت پر مبنی ہوتی ہے۔

کرشنا مورتی کا مسئلہ مختلف ہے وہ ایک تیز فہم انسان ہے اور اس نے ایک نہایت دلچسپ زندگی بسر کی ہے اس لئے وہ قابل شنید ہے۔

کرشنا مورتی اور اس کا چھوٹا بھائی (جو بعد میں امریکہ میں تپ دق سے فوت ہوگیا) ایک ہندو تھیوسوفسٹ کے لڑکے تھے۔ ان بچوں کو مسز اینی بیسنٹ نے اپنا متبنیٰ بنالیا تھا کیونکہ مسز موصوفہ کا یہ خیال تھا کہ یہ بچے مسیح ہیں اور ان کے ذریعے سے ایک مرتبہ پھر بنی نوع انسان میں علم و عقل کی اشاعت ہوگی۔

یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ مسز بیسنٹ نے کرشنا مورتی میں ایسی کیا خاص بات دیکھی کہ اس کے مسیح ہونے کی پیشین گوئی کردی۔ کیونکہ وہ ایک مقناطیسی اور دلکش شخصیت کا مالک ہے۔

ان دونوں بچوں کو مسز بیسنٹ اس مقصد سے انگلینڈ لے گئیں کہ انھیں اسکول کی تعلیم دلاکر آکسفورڈ کالج میں داخل کردیا۔ خود کرشنا مورتی بیان کرتا ہے کہ مجھے اسکول میں داخل کیا گیا۔ لیکن میں کوئی امتیازی شان پیدا نہ کرسکا۔ مجھے نصابی تعلیم سے ذرا بھی دلچسپی نہ تھی۔ اور میں نے امتحانات پاس کرنے میں سخت نالائقی کا ثبوت دیا۔"

آکسفورڈ یونیورسٹی کے حکام نے صاف جواب دے دیا کہ وہ طلباء کے زمرے میں مسیحوں کو شامل کرنا پسند نہیں کرتے اس سے کرشنا مورتی کو یونیورسٹی کی فائدہ بخش یا مضر تعلیم سے بے بہرہ رہنا پڑا۔ اس لئے اسکولوں یا کالجوں میں داخل ہونے کی بجائے اس نے ایک مشہور ہندوستانی مصور کی رہنمائی میں یورپ

کی سیاحی کی۔ گرجاؤں کی زیارت کی۔ مصوری کے اعلیٰ نمونے ملاحظہ کئے۔ موسیقی سے حظ اٹھایا اور بہت سی دلچسپ شخصیتوں اور بعض مذہبی خطیبوں سے ملاقات کی۔

ابھی وہ نوعمر ہی تھا کہ مسز بیسنٹ نے اُسے آرڈر آف اسٹار کا سردار بنا دیا۔ اس انجمن سے اپنے طویل تعلقات کے دوران میں اُس نے یورپ اور امریکہ کا سفر کیا۔ اور ان ہزاروں آدمیوں سے گفتگو کی۔ جو کہ اُس کی باتیں سننے کے آرزومند تھے۔

آرڈر آف اسٹار ایک متمول انجمن تھی۔ اور بہت سی قیمتی جائداد کی مالک۔ لیکن کرشنا مورتی ذاتی منفعت سے گریز کرتا رہا۔ ہالینڈ کے ایک مالدار بزرگ نے ایک محل اُسے بطور نذر پیش کیا کرشنا مورتی نے اُسے اپنی ذات کے لئے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ مگر انجمن کے لئے قبول کر لیا۔ ہالی وڈ میں اُسے Film star بننے اور ایک بہت بڑی آمدنی قبول کرنے کی ترغیب دی گئی۔ لیکن اُس نے انکار کر دیا۔ آرڈر آف اسٹار کا توڑنا۔ اس کی سچائی کا ایک اور بیّن ثبوت ہے۔ کرشنا مورتی پر رفتہ رفتہ یہ سچائی منکشف ہونے لگی کہ ایک ایسی انجمن۔ ہر ایسے مذہب۔ فرقے اور ان کے مبلغوں۔ مندر اور معابد کی مانند جن میں آدمی کسی خوف کے ماتحت عبادت کرنے کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ ایک غلط چیز ہے۔

ممکن ہے کہ اُس کے معتقد اُن دیوتاؤں سے جن کی وہ پہلے پرستش کرتے رہے ہیں۔ منحرف ہو رہے ہوں۔ لیکن اُنھوں نے کرشنا مورتی کی شکل میں ایک اور دیوتا بنا لیا۔ اور اس کی تصویر کی دیوتاؤں کی مانند عبادت اور تعظیم کی جانے لگی۔ "میرا کوئی مرید نہیں ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ تم اپنے آپ کو میرا پیرو خیال نہیں کرتے۔ کیونکہ اگر تم ایسا کرو گے تو صداقت سے انحراف اور ریاکاری کے مرتکب ہوں گے" یہ اُس اعلان کے الفاظ ہیں۔ جو ایک مرتبہ کرشنا مورتی نے کیا۔ اور منطقی اصول پر اس اعلان کی پابندی کرنے سے تمام مخالف دلائل اور بے حد مشکلات کے باوجود اُس نے آرڈر آف اسٹار کو توڑ دیا۔

کرشنا مورتی کہتا ہے کہ میں اپنے مقصد اعلیٰ کو پہنچ چکا ہوں۔ اور بالکل ہم آہنگی اور سلامت روی سے زندگی گزار رہا ہوں۔ انجمن اور اس کے لوازمات ایک غلط اور غیر ضروری چیز تھی۔ کرشنا مورتی اپنا مسیح ہونا قبول نہیں کرتا۔ لیکن اُس نے کبھی اس حقیقت سے انکار بھی نہیں کیا۔ جو لوگ اُس سے اس کے متعلق دریافت کرتے ہیں اُن سے وہ کہتا ہے کہ اس جھگڑے میں نہ پڑو۔ اس کا کچھ مضائقہ نہیں۔ ایک شخص نے اُس سے یہ کھلا ہوا سوال کیا کہ کیا تم مسیح موعود ہو۔ اُس نے جواب دیا کہ اگر میں یہ کہوں کہ میں عیسیٰ ہوں تو میرا قول تمہارے لئے ایک سند ہو جائیگی۔ اور اگر میں انکار کروں تو بھی ایسا ہی ہوگا۔ اس لیبل کو دور کر دو کیونکہ اس کی کوئی قیمت نہیں۔ اگر پانی صاف ہے تو اُسے پی لو۔ میں کہتا ہوں کہ میرے پاس صاف پانی ہے۔ میرے پاس وہ مرہم ہے جو پاک کرنے اور مندمل کرنے کی خاصیت رکھتا ہے تم مجھ سے پوچھتے ہو کہ میں کون ہوں؟ میں سب کچھ ہوں کیونکہ میں زندگی ہوں۔

کرشنا مورتی کی تعلیم

مجملاً کرشنا مورتی کی تعلیم یہ ہے اس کا عقیدہ ہے کہ دنیا کی موجودہ ہیبتناک بدنظمی کا باعث بنی نوع انسان کی گمراہ کن ذہنیت ہے کیونکہ صدیوں کے رسم و رواج اور فرقوں کی جکڑ بندی کے باعث صحیح الخیالی مفقود ہو گئی ہے اور انسان اپنی انفرادی

حیثیت کو گم کرچکا ہے۔ رنج یا خوشی کا استقبال تعصب سے کیا جاتا ہے۔ نبی نوع انسان میں کسی صورت حالات کا مقابلہ کرنے کی قوت باقی نہیں رہی۔ اُس پر خوف اور لالچ مسلط ہیں۔ رنج کے مواقع پر وہ اُس سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ بلکہ احساس کی آڑ میں پناہ لیتا ہے۔ اور ہمیشہ خود اپنی ذات سے راہ فرار اختیار کرتا ہے۔ وہ یہ محسوس نہیں کرسکتا کہ دُکھ اور تنہائی کے عذاب کو فنا کرنے کی کوشش سے وہ اپنی ذاتی بے مائیگی کا ثبوت دیتا ہے اس کے علاوہ وہ ہمیشہ ماضی اور مستقبل کے خیالات میں محو رہتا ہے اور خیالی ترقی کے مدارج طے کرتا رہتا ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ اپنے حال پر مطمئن نہیں۔

حال ہی میں کرشنا مورتی سے سوال کیا گیا کہ کیا تم اچھوتوں کے مندروں میں داخلے کے معتقد ہو۔ اس کا جواب انتہا زی شان رکھتا ہے۔ اس نے کہا کہ میں تو مندروں ہی کا معتقد نہیں ہوں۔ اس جگہ کرشنا مورتی کی تحریروں میں سے ایک اقتباس درج کرنا برمحل ہوگا۔

میرے نزدیک گمراہ وہ شخص ہے جو بزدل ہو۔ زندگی کی مشقتوں سے پہلو تہی کرتا ہو۔ ترکِ دنیا اختیار کرتا ہو کسی خانقاہ یا معبد میں عزلت نشین ہوتا ہو۔ عبادت گزار ہو۔ یا دریا کے کنارے بیٹھ کر خود فراموشی کا سبق حاصل کرنا چاہتا ہو۔ یا وہ شخص جسے دوسرے انسان کا ذرا بھی پاس نہ ہو۔ جو بے رحم ہو۔ اور اپنی بے انتہا آرزوؤں مثلاً حصول قوت۔ شان وشوکت۔ دولت۔ خواہشات نفسانی لالچ وغیرہ میں منہمک رہتا ہو میں اس طرح کے انسانوں کو غلط رو کہتا ہوں۔

ابتدا سے ہی سچائی کی تکمیل میرا نصب العین رہا ہے اور میں اس نصب العین کا سخت اور متواتر آرزومند رہا ہوں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں انسانیت کا مخالف بنوں۔ بلکہ اپنے مانند انسانوں کو اور خود اپنی طبیعت کے تضاد۔ اپنی خواہشات۔ جذبات۔ خودنمائی۔ ضبط۔ خوف۔ لگاؤ۔ اور احساس کو سمجھنے کے ذریعے سے سچائی کی تکمیل کروں جس وقت میں نے اپنی ان اندرونی کیفیتوں کو سمجھ لیا۔ میں نے خودشناسی کے مدارج کو طے کرلیا اور میری قوتیں گہرے غور وفکر میں مرکوز ہوگئیں۔ اس درجہ کا حصول وہ سچائی ہے۔ جو ہمارا مقصود ہے۔ لیکن اگر تم تنہا روی کے عادی نہیں ہو اور خوف تم پر غالب ہے یا کسی قسم کے رشتۂ محبت میں جکڑے ہوئے ہو تو تم یہ مقصد حاصل نہیں کرسکتے۔

ایسا معلم اخلاق جو عقائد منضبط فرقوں۔ مذہبوں اور موجودہ طرزِ زندگی کی مخالفت کرے۔ لازمی طور پر اس کے بہت سے جانی دشمن ہوں گے۔

روما نیا میں فی الواقع اُس کی جان لینے کی کوشش کی گئی۔ اور وہ لوگ جو یہ اطمینان اور یقین رکھتے ہیں کہ سب ممکن دنیاؤں میں سے اس بہترین دنیا میں سب کچھ ہی نوع انسان کی بہتری کے لئے ہے ایسے معلم کا ہرگز خوشی سے استقبال نہیں کرسکتے کرشنا مورتی کو متہم کیا جاتا ہے کہ وہ کیمونسٹ عقائد سے ہمدردی رکھتا ہے حالانکہ وہ عملی طور پر سیاست سے قطعی علیحدہ ہے۔ ہندوستانی نیشنلسٹ پارٹی کے بعض ممبروں نے بھی جو اُس سے ملنے گئے تھے یہ حقیقت معلوم کرلی ہے۔ کرشنا مورتی کی ہمدردیاں عالمگیر ہیں اور چاہے کوئی اُس کے متعلق کچھ ہی خیال کیوں نہ کرے۔ وہ سیاسی جماعت بندیوں سے بالاتر ہے۔ وہ جو کچھ بھی ہے یا نہیں ہے۔ شاید بہترین طرز عمل یہ ہوگا کہ اُسے اس دنیا میں جو توہمات۔ رسومات اور بے رحمیوں سے اس طرح پُر ہے کہ انسان صحیح طرز معاشرت کو فراموش کرچکا ہے۔ بہتری کے لئے ایک مسلمہ طاقت تسلیم کرلیا



مذہب کی ابتدا

(از جناب مرزا محمد سعید صاحب ایم اے دہلوی)

انیسویں صدی کے آغاز تک یورپ کے محققین کا عام طور پر یہ خیال تھا کہ مذہب بشریت کا فطری تقاضہ ہے اور وحشی سے وحشی انسان بھی روحانیات سے کچھ نہ کچھ بہرہ رکھتا ہے۔ اقل درجہ وہ یہ تصور کرتا ہے کہ چونکہ متواتر تجربہ اس امر پر شاہد ہے کہ ہر ایک عمل کا کوئی عامل ہوتا ہے۔ کائنات کی کل اشیا اجرام فلکی سے لیکر حشرات الارض تک ہر ایک کے اندر کوئی پر اسرار عامل ہے جو اس شے کو قائم رکھتا ہے یا اس میں حرکت پیدا کرتا ہے۔ اسی طرح کل کائنات کیلئے بھی کوئی عامل ہے جو اس تمام کارخانہ کو چلاتا ہے۔

اس عقیدہ کی رو سے روح اور خدا کی ہستی کا اعتقاد نوع بشر کا فطری میلان اور مذہب کا آغازی و بنیادی اصول قرار پاتا ہے۔ بیسویں صدی میں یہ خیال کسی قدر ضعیف ہو گیا ہے اور بہت سے محققین اس سے قطعاً انکار کرتے ہیں۔ ان کی رائے میں مذہب کا آغاز بھی شل اور انسانی کوائف کے مادی ضروریات سے ہوا۔ جب انسان نے متمدن زندگی اختیار کر لی اور اپنی مصلحت اس میں دیکھی کہ اپنے میں سے کسی ایک شخص کو بادشاہ تسلیم کر لے تو یہ شخص جو دراصل معاشیات اور خصوصاً فن زراعت میں ان کا معلم اول تھا ایک ممتاز اور محترم ہستی تصور کیا جانے لگا اور مرنے کے بعد اپنی رعیت کی نگاہ میں حیات ابدی کا مستحق قرار پایا اس کی شخصیت معمولی انسانوں سے بالاتر تسلیم کر لی گئی اور اس میں معبودیت کی شان پیدا ہو گئی۔ اس نظریہ کی رو سے الوہیت بادشاہت کی انتہائی شکل ہے اور الوہیت کا عقیدہ بادشاہت کے تخیل کا ارتقائی نتیجہ ہے۔ یہاں اس امر کا اعادہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ تمام مظاہر انسانی کو مادیات کی عینک سے دیکھتے ہیں اور تمدن کے آغاز کو بعض معاشی حوادث یعنی زراعت اور اس کے لوازمات سے منسوب کرتے ہیں وہ عموماً یہ بھی باور کرتے ہیں کہ متمدن زندگی کا آغاز پہلے کسی محدود قطعہ ارض مثلاً وادی نیل میں ہوا۔ اور وہاں سے تہذیب و تمدن کے مبادیات دنیا کے دیگر حصص میں انسانوں کی نقل و حرکت کی بدولت رائج ہو گئے۔ مذہب کے مبادیات بھی اسی طرح پہلے کسی ایک ملک میں وضع ہوئے اور اس کے بعد اور ممالک

میں منتقل ہو گئے ۔ مصر قدیم کے پرانے کتبے اور نوشتے جس مذہبی نظام کی شہادت دیتے ہیں اس میں اول معبود اوزائرس ہے جس کی نسبت قیاس کیا جاتا ہے کہ وہ مصر کا پہلا بادشاہ اور فن زراعت کا موجد تھا ۔ چونکہ یہ ایجاد اپنی اہمیت کے لحاظ سے ایک ایسا کارنامہ تصور کی گئی جو انسانی طاقت سے بالاتر تھا ۔ اس لئے بادشاہ میں ایسے قویٰ کی موجودگی کا اعتقاد جو بشریت سے ارفع ہوں قابل قبول سمجھا جا سکتا ہے ۔ بادشاہ کو صرف ان داتا ہی نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ جیو داتا یا بخشندہ حیات بھی خیال کیا جاتا تھا ۔ کیونکہ اناج زندگی کا سرمایہ ہے اور فصلوں کی زرادانی اس کے فوق البشر قویٰ پر محمول کی جاتی تھی ۔ مطالعہ فطرت نے ابھی اس حد تک ترقی نہ کی تھی کہ اس زرادانی کے صحیح فطری اسباب کو معلوم کیا جا سکے ۔ جب بادشاہ مر گیا تو اس کی لاش کو محفوظ رکھنے کا خیال پیدا ہوا ۔ تاکہ اس جسد بے جان سے وہی فوائد حاصل کئے جا سکیں ۔ جو زندگی میں اس کی ذات سے حاصل کئے جاتے تھے ۔ اور اس مقصد کے لئے قدیم مصریوں کی وہ عجیب وغریب صنعت وجود میں آئی جس کے نمونے آج تک موجود ہیں ۔ اور جس کی بدولت ہم ان انسانوں کے جسم کا عینی مشاہدہ کر سکتے ہیں جو آج سے ہزارہا سال قبل مصر میں حکمرانی کرتے تھے ۔ اجسام کی حفاظت کا یہ اہتمام بجائے خود اس امر کا ثبوت ہے کہ ایک غیر فانی روح کا عقیدہ ابھی تک پیدا نہیں ہوا تھا اور موت کے بعد بقا کی صرف یہی صورت قدیم مصریوں کے ذہن میں تھی کہ جسم کو فنا ہونے سے محفوظ رکھا جائے ۔ جب تک بادشاہ کا جسم موجود تھا اس کی برکات بھی اس کی رعیت کے لئے موجود تھیں بلکہ رفتہ رفتہ متوفی بادشاہ کو ایسی صفات سے متصف کر دیا گیا جو زندہ بادشاہوں سے منسوب نہیں کی جا سکتیں اور اس نے ایک معبود یا دیوتا کا مرتبہ حاصل کر لیا ۔ یہاں جو بات سب سے زیادہ قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ اگر متوفی بادشاہ (اوزائرس) کی پرستش کو مذہب کا نقطۂ آغاز تصور کر لیا جائے تو اس کو اُن تصورات سے بہت کم علاقہ ہے جس کو ہم روحانیات سے تعبیر کرتے ہیں یہ عقیدہ تو بعض فطری اعمال یعنی غلہ کی روئیدگی اور دریائے نیل کی طغیانی اور ان کے صحیح فطری اسباب کے متعلق لاعلمی اور جہالت کا نتیجہ ہے اور ان باتوں کا تعلق مادیات سے ہے ۔ نہ کہ روحانیات سے ۔ اس روشن خیال کی جانب ہم پھر رجوع کریں گے ۔ فی الحال قدیم مصری عقائد کی کچھ مزید تشریح مقصود ہے ۔ چونکہ مصری تمدن کا انحصار دریائے نیل کے مد و جزر پر تھا اور اس مد و جزر کے صحیح اوقات کا اندازہ چاند کے بڑھنے اور گھٹنے سے ہو سکتا تھا ۔ لہٰذا مصریوں کو اجرام فلکی خصوصاً چاند کی حرکات کی جانب بھی متوجہ ہونا پڑا ۔ چاند کو ایک اور وجہ امتیاز بھی حاصل تھی ۔ فطری طور پر قدیم انسان کو دو باتوں میں سب سے زیادہ انہماک ہو سکتا تھا ایک بقائے نفس اور دوسری بقائے نوع ۔ موخر الذکر عورتوں کی قوت تولید پر منحصر ہے اور اس قوت کو چاند کے ساتھ جو علاقہ ہے وہ جاہل سے جاہل انسان کی بھی سمجھ میں آ سکتا تھا ۔ ان تصریحات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ امر تعجب خیز نہیں کہ مصریوں کی نظر انتخاب اجرام فلکی میں سب سے پہلے چاند پر پڑی ۔ سورج کو الوہیت کا مرتبہ اُس وقت نصیب ہوا جب مصر قدیم کے پروہتوں نے یہ دریافت کیا کہ مہینوں اور فصلوں کا حساب رکھنے کے لئے چاند سے سورج زیادہ کارآمد ہے ۔ اب تک مصری عقیدہ میں متوفی بادشاہ (اوزائرس)

کائنات کا متصرف دیوتا خیال کیا جاتا تھا۔ لیکن اب اُس کے اقتدار میں سورج کو بھی شریک کرلیا گیا بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ سورج اور اوزائرس دونوں کو ذاتِ واحد تسلیم کرلیا گیا۔ اور تمام کائنات ان کی ملکیت قرار پائی۔ اسی کے ضمن میں یہ عقیدہ بھی قایم ہوگیا کہ آسمان کے پردے میں کوئی اور دنیا موجود ہے۔ جہاں مرنے کے بعد پہونچ کر بادشاہ سورج سے واصل ہوجاتا ہے۔ اور جہاں وہ معاملاتِ ارضی کا اہتمام کرتا رہتا ہے۔ سفرِ آخرت کو اس زمانے کے مصری بالکل جسمانی اور طبعی سفر کی مانند خیال کرتے تھے۔ اس دنیا کی طرح اس دنیا کے بھی نقشے بنالئے گئے تھے جو مردے کی راہنمائی کے لئے اُس کے ساتھ کردئے جاتے تھے۔ اور پرانے مصری نوشتوں میں اُن تمام مقامات کا مفصل تذکرہ ہے جن میں سے مردے کو اپنے مستقر تک پہونچنے کے لئے گذرنا پڑتا تھا۔ ان نوشتوں سے اُن صفات کا بھی پتہ چلتا ہے جو مصری اوزائرس سے منسوب کرتے تھے اور یہ صفات وہی ہیں جو ہم عموماً ذاتِ باری کے ساتھ منسوب کرتے ہیں۔ روح کا تخیل اُن میں موجود نہ تھا وہ ابدی بقا کو جسم کی بقا تصور کرتے تھے۔ اور اُس کا یقین حاصل کرنے کے لئے نہ صرف مردہ لاشوں کو مصنوعی ذرائع سے محفوظ رکھتے تھے بلکہ متوفی بادشاہ کی تصویریں بنا کر مخصوص منتروں اور رسومات سے بزعم خود اُس کو ایک نئی زندگی بخشتے تھے۔ اور اُس زندگی کو قایم رکھنے کے لئے اُن تصویروں کے سامنے ماکولات و مشروبات بطور نذر کے پیش کرتے تھے۔ یہ رسم غالباً اصنام پرستی کی ابتدائی شکل تھی اگرچہ اس میں پرستش یا حصول شفاعت کا خیال صاف طور پر موجود نہ تھا اور دنیا کا سب سے پہلا مندر غالباً کوئی مقبرہ تھا جو اس مقصد سے تعمیر کیا گیا تھا کہ اس میں متوفی بادشاہ کا مجسمہ یا تصویر سکونت پذیر ہوسکے اور اس کے سامنے مذکورہ بالا رسومات ادا کی جاسکیں۔ چونکہ مصریوں کے اسباب حیات کا مدار دریائے نیل کی آب رسانی پر تھا ان میں یہ خیال بھی عام طور پر رائج تھا کہ بحرِ قدیم سرچشمۂ حیات ہے۔ اور بحرِ قدیم سے ان کی مراد دریائے نیل تھی۔ بعد میں یہی خیال اور قوموں میں بھی رائج ہوگیا اور پانی کو ذی حیات اشیا کی تخلیق کا سبب قرار دیا گیا۔ اکثر قدیم معبدوں میں جو حوض اور تالاب پائے جاتے ہیں وہ غالباً اس غرض کے لئے بنائے گئے تھے کہ ان میں بعض مراسم ادا کئے جاسکیں جن میں تخلیق حیات کی اس روایت کو ایک تمثیل یا نقل کے پیرایہ میں دوہرایا جاتا تھا تاکہ انسانوں کی زندگی کے لئے فلاح اور تازگی کا موجب ہو اور چونکہ بادشاہ کو اپنے ملک یا قوم کا خالق تصور کیا جاتا تھا اس لئے اس کی تاجپوشی کے وقت بھی اس قسم کے مراسم ادا کئے جاتے تھے۔ جن کا کچھ اثر اب بھی بعض اقوام کی رسومات تاجپوشی میں پایا جاتا ہے۔ بعض دریاؤں اور چشموں کی تقدیس و احترام بھی غالباً اسی عقیدہ سے ماخوذ ہے۔

مصریوں کے عقائد کا یہ مختصر خاکہ ان انکشافات پر مبنی ہے جو یورپ کے محققین نے مصرِ قدیم کے رسم و رواج کے متعلق اب تک کئے ہیں اور ان کا یہ گمان ہے کہ یہ عقائد مصریوں تک محدود نہیں رہے بلکہ دنیا کے اکثر ممالک و اقوام میں پھیل گئے۔ اور مذہب کے ارتقا کو سمجھنے کے لئے ان عقاید کو بنیادی اصول تسلیم کرلینا ضروری ہے۔ ان عقائد کے مطالعہ سے جو نتائج اخذ کئے جاسکتے ہیں ان میں سب سے زیادہ اہم یہ ہے کہ دنیا کا قدیم ترین مذہب ایک معبود کی پرستش پر مبنی تھا۔ اور بہت سی دیوتاؤں کا عقیدہ اس طرح ظہور میں آیا کہ اُس ایک معبود قدیم

کی مختلف صفات کو علیحدہ علیحدہ دیوتاؤں کی شکل میں متشکل کرلیا گیا۔ نیز اگرچہ مصریوں کا مذہب روحانیت کے صحیح تخیل سے بالکل معرا نظر آتا ہے۔ لیکن اس میں وہ تمام معتقدات موجود ہیں جو بعد میں آنے والے مذاہب میں پائے جاتے ہیں۔ صرف فرق یہ ہے کہ مصری ان کو ایک مادی شکل میں تصور کرتے تھے اور بعد میں ان کو روحانی پیرایہ میں تصور کیا گیا۔ گویا دنیا میں جو مذہبی عقائد اس وقت رائج ہیں وہ مصریوں کے بعض تفکرات اور تخیلات کی بدلی ہوئی شکل ہیں جن کو ایک نیا مفہوم دیدیا گیا ہے۔ محققین یورپ کے یہ نظریات اگرچہ ایک حد تک ثبوت و شہادت پر مبنی ہیں۔ لیکن عقل سلیم ان کو قبول نہیں کرسکتی۔ یہ کیوں کر ممکن ہے کہ مذہب کو جو انسانوں کی بیشتر تعداد کے لئے سرمایۂ حیات اور سرچشمہ ہدایت رہا ہے۔ مصر قدیم کے نیم وحشی باشندوں کی بعض ناقص تاویلات فطرت کا نتیجہ قرار دیا جائے۔ ارتقائے مذہب کے متعلق یہ قیاس بہت ہی بودا اور یک طرفہ ہے اور دراصل اس مخاصمت کا نتیجہ ہے جو مادہ پرست محققین کو مذہب اور اس کے فروعات سے ہے۔ اول تو یہ خیال محتاج ثبوت ہے کہ مصری تمدن دنیا کا قدیم ترین تمدن تھا۔ اور اگر بعض اعتبار سے اس کی قدامت کو تسلیم بھی کرلیا جائے تو اس کا کیا ثبوت ہے کہ مصریوں کے عقائد مذہبی معتقدات کی سب سے قدیم واحد شکل ہیں۔ بعد کی تاریخ سے اس بات کی کافی شہادت ملتی ہے کہ کوئی نظام تمدن ہر حیثیت سے مکمل نہیں ہوتا۔ رومی قوم یونانی اور یہودی معاصر اقوام سے فنون جنگ اور ملک داری میں سبقت رکھتی تھی۔ لیکن یہودیوں کے مذہبی عقائد اور یونانیوں کے علمی کمالات کے مقابلہ میں انکا عقیدہ اور علم یقیناً پست تھا۔ علاوہ بریں ایسی صورت میں کہ دنیا اور نسل انسانی کی قدامت کے متعلق ہمارے خیالات روز بروز زیادہ وسیع ہوتے جاتے ہیں۔ کسی نظام تمدن کو جو مسلمہ طور پر چھ سات ہزار سال سے زیادہ پرانا نہیں۔ ہر لحاظ سے انسانی تمدن کی قدیم ترین تصویر مان لینا نہایت جرأت کا کام ہے اور صرف ان اشخاص کے لئے ممکن ہے جن کو اپنی ناک سے آگے اور کوئی چیز نہیں سوجھتی۔ اور جو نفس پروری اور افزائش نسل کو انسانی جدوجہد کا مآل کار سمجھتے ہیں۔ ان کی تنگ نظری کا مقابلہ بعض اور منکرین کی بلند پروازی سے کیا جاسکتا ہے۔ جو مذہب اور معاشیات کے باہمی تعلق سے بالکل انکار کرتے ہیں اور جو اس کو بھی نہیں مانتے کہ انسان نے ایک وحشیانہ اور غیر متمدن حالت سے ترقی کرکے موجودہ تہذیب و تمدن تک رسائی حاصل کی ہے ان کا یہ خیال ہے کہ کسی ایسے تاریک زمانہ میں جس کا تصور بھی ہمارے لئے دشوار ہے انسان کو اب سے بہت بہتر ذہنی قوی نصیب تھے اور وہ کائنات کی حقیقت و اسرار کا ہمارے مقابلہ میں بہت زیادہ علم رکھتا تھا۔ کسی طبعی حادثہ یا فطری انحطاط کے سبب سے یہ علم رفتہ رفتہ محو ہوتا گیا۔ اور جن مذاہب کو ہم دنیا کے قدیم ترین مذاہب تصور کرتے ہیں وہ اس علم کا ایک مسخ شدہ عکس ہیں۔ ان دو انتہائی قیاسات کے درمیان ایک معتدل اور صحیح رائے یہ ہوسکتی ہے کہ جہاں تک ہماری موجودہ معلومات کا تعلق ہے ہر زمانہ اور ہر ملک میں بعض ایسے عقائد اور رسومات کا پتہ چلتا ہے جو تقریباً تمام مذاہب میں مشترک ہیں اور جن کی اصل کو دریافت کرنا فی الحال ناممکن معلوم ہوتا ہے ان میں سے کچھ عقائد و رسومات ایسے ہیں جن کا تعلق انسانوں کی معیشت اور معاشرت سے ہے اور جن کی بابت غالب گمان یہی ہوسکتا ہے کہ وہ کسی معاشی یا معاشرتی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے وجود میں آئے ہوں گے لیکن کچھ ایسے بھی ہیں جن کی مادی توجیہات قرین عقل نہیں

معلوم ہوتیں۔ جدید نفسیاتی تحقیق سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا ہے کہ آدمیوں کے افعال کلیتہً مادی محرکات کے عمل کا نتیجہ نہیں ہوتے بلکہ اور حیوانات کی مانند انسان بھی بعض ایسے محرکات کا تابع ہے جن کی غرض و غایت سے وہ خود پورے طور پر آشنا نہیں۔ انسانی حواس اور محسوسات دوسرے حیوانات کی بہ نسبت زیادہ تیز اور لطیف واقع ہوئے ہیں۔ یہ کیوں کر ممکن ہے کہ جب اس کی آنکھ کائنات کے گوناگوں مناظر پر پڑی تو اس کو سوائے پیٹ بھرنے اور تن ڈھانکنے کی فکر کے اور کوئی خیال پیدا نہ ہوا ہو۔ مرغزاروں اور چراگاہوں کی کثرت و شادابی۔ پہاڑوں کی رفعت و عظمت۔ دریاؤں اور سمندروں کی طوفت رفتار۔ اجرام فلکی کا جدا گانہ رقص ایسے نظارے نہ تھے جو اس کے ذہن کو تاثرات سے خالی رکھتے۔ زندگی اور موت کے پراسرار وقوعات ایسے حقیر واقعات نہ تھے کہ اس کو کبھی اس پر غور کرنے کا موقع نہ ملا ہوگا اس کی فطری روح بھی ان تجربات سے ضرور برانگیختہ ہوئی ہوگی اور ان کی حقیقت کو معلوم کرنے کا شوق اُسے ضرور پیدا ہوا ہوگا۔ اور چیزوں کو جانے دیجئے صرف موت کے طبعی واقعہ پر غور کیجئے۔ موت اور زیست سے بڑھکر دنیا میں کوئی چیز عام نہیں۔ ایک شخص اس لمحہ میں چلتا پھرتا کھاتا پیتا ہنستا بولتا دکھائی دیتا ہے دوسرے لمحہ میں بے حس و حرکت نظر آتا ہے گمان ہے کہ جب اول مرتبہ انسان کو کسی مردہ جسم سے سابقہ پڑا ہو تو اس کا پہلا خیال یہ ہو کہ اس کا جمود عارضی ہے کیونکہ موت کسی حد تک نیند سے مشابہ ہے۔ لیکن اس خیال کو بہت جلد اُن تغیرات نے دور کر دیا ہوگا جو مردہ اجساد میں پیدا ہو جاتے ہیں اور اس کو کم و بیش احساس اس بات کا پیدا ہو گیا ہوگا کہ اب اس جسم کے لئے اپنے سابقہ افعال کی جانب رجوع کرنا ممکن نہیں اور یہ وہ نیند ہے جس سے کوئی بیدار نہیں ہوتا۔ اب اس سے آگے کیا قیاس کیا جائے؟ کیا یہ سمجھا جائے کہ یہ انسان جو ابھی موجود تھا بالکل معدوم ہو گیا۔ اس کی یاد اب تک دل میں محفوظ ہے۔ اس کی صورت آنکھوں میں پھر رہی ہے۔ حالت خواب میں اس سے ملاقات بھی ہو جاتی ہے اور اگر وہ کوئی عزیز یا محترم شخص تھا تو اس کے افعال و اقوال کا اثر بھی اب تک باقی ہے۔ کسی غیر متمدن انسان کے دل میں ان تمام سوالات اور خیالات کا پیدا ہونا چنداں بعید از قیاس نہیں۔ اور ان کے نتیجہ کے طور پر اس عقیدہ کا ظہور کہ مرنے کے بعد بھی آدمی کی کوئی چیز باقی رہ جاتی ہے سراسر قرین عقل معلوم ہوتا ہے۔ غرضکہ انسان کی حیوانی ضروریات کے علاوہ اس کے تجربہ اور مشاہدہ میں بیسیوں ایسے عناصر موجود تھے جن سے وہ اپنے عقائد کو اخذ کر سکتا تھا۔ حیوانات میں صرف انسان ہی ایک ایسا جانور ہے جو ہمارے علم و یقین کے مطابق غور و فکر پیش بینی اور عاقبت اندیشی کی اہلیت رکھتا ہے اور جانداروں کی طرح وہ بھی موت سے ڈرتا ہے لیکن ان کی طرح وہ اپنے انجام سے غافل و بے خبر نہیں رہ سکتا۔ اس کو قدم قدم پر اس بات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اپنی زندگی کے مفہوم کو معلوم کرنے کی کوشش کرے۔ اور اپنی روش کو کائنات کی رفتار کے مطابق بنائے۔ پھر یہ کیوں سمجھ لیا جائے کہ جو قانون فطرت اس کی ادنیٰ ضروریات کی کفالت کرتا ہے اس کو ان اعلیٰ مسائل میں رہنمائی و ہدایت سے محروم اور سرگشتہ و حیران چھوڑ دے گا۔ کیوں نہ مان لیا جائے کہ جس طرح انسان کو اپنے گرد و پیش کے حالات معلوم کرنے کے لئے حواس اور عقل دی گئی اُسی طرح اس کو کوئی ایسی حس بھی عطا

ہوئی جس کی مدد سے وہ کائنات کی حقیقت کو بقدر ضرورت سمجھ سکے۔ لیکن جس طرح عقل وحواس کے باوجود انسان کو اپنے احول کو سمجھنے اور اس پر تصرف حاصل کرنے کی سعی میں ہزارہا سال گذرگئے اور ہنوز روز اول است کا مضمون ہے۔ اسی طرح اس حس باطنی کے باوجود بھی حقیقت کا علم ایک تدریجی مکاشفہ ہے جس کو کمال تک پہونچانے کے لئے نسل انسانی کے بہترین افراد کئی ہزار سال سے کوشش کرتے چلے آئے ہیں ان کی کوشش کا حاصل عقائد اور رسومات کا وہ ارتقا اور ارتفاع ہے جس کی انسانی تاریخ شہادت دیتی ہے۔

ڈاڑھی

(از جناب مرزا محمد عظیم بیگ صاحب چغتائی بی اے ایل ایل بی وکیل)

وضع مغرب سیکھ کر دیکھا تو یہ کافور تھی
مجھکو کیا معلوم تھا ڈاڑھی خدا کا نور تھی

ڈاڑھی رکھنا چاہئے یا منڈانا چاہیے۔ اس سلسلہ میں سعید میں ایک دلچسپ مضمون دیکھا قبل اس کے کہ ہم اس بارہ میں کچھ کہہ سکیں ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ آخر یہ ڈاڑھیاں منڈنے کیوں لگیں کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ ذرا غور کیجے۔ لارڈ کرزن جن کے نام سے کرزن فیشن موسوم ہے کسی زمانہ میں ڈاڑھی والے تھے۔ یعنی ڈاڑھی جو نکلی تو بڑھنے دی۔ کنوارے ہی تھے اور بیس ایک برس کی عمر تھی مگر بڑی سی ڈاڑھی بھی تھی۔ ان کی شادی کچھ کچھ مشرقی قواعد کے مطابق لیڈی کرزن سے طے ہوئی یعنی بغیر کورٹ شپ کے نسبت قرار پاگئی۔ لیڈی کرزن نہایت ہی خوبصورت لڑکی تھیں۔ ایسے عالی خاندان نوجوان سے شادی طے ہونے پر خوش تھیں اور اپنے شوہر مجوزہ کے دیکھنے کی مشتاق بھی۔ پوچھ گچھ جو کی تو معلوم ہوا کہ کرزن کے تو زبردست ڈاڑھی ہے۔ سنتے ہی انھوں نے نہایت ہی لاجواب الفاظ میں شادی سے انکار کردیا۔ یہ کہہ کر کہ بخدا اگر کرزن کے ڈاڑھی ہے تو کیا کرزن سے شادی کرنے سے یہ بہتر نہ ہوگا کہ میں خود اپنے والد سے شادی کرلوں نتیجہ اس کا ظاہر ہے۔ کرزن نے بھووں اور کھوپری پر کرم کیا اور بقیہ صفایا بولدیا۔ جب جاکر لیڈی کرزن ایسی حسینہ کو پایا۔ اب بتائیے ان ڈاڑھیوں کی صفائی کا کون ذمہ دار ہوا۔

پھر بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شیخ کے کہنے سے ڈاڑھی غائب ہوئی۔ آپ نے ہزاروں ڈاڑھیاں دیکھی ہوں گی۔ ڈاڑھیوں کے بھی کٹ ہیں۔ فرنچ کٹ جیسی ہمارے سعید یعنی سعید کے اڈیٹر صاحب کی ہے۔ کوئی ایڈورڈ کٹ رکھتا ہے۔ کوئی پیغمبر کٹ رکھتا ہے۔ لیکن بخدا مولوی صاحبان کو دیکھنے سے نئے نئے کٹ بھی نظر آتے ہیں۔ کوئی مولوی صاحب جھالر بنا ڈالتے ہیں۔ کوئی مولوی صاحب رخساروں کو صاف رکھنے کے ارادہ سے ڈاڑھی کے ساتھ باغبانی کرتے ہیں۔ یعنی روشیں اور کیاریاں سی بناتے ہیں۔ بڑے اہتمام کے ساتھ گولائی نکالتے ہیں اور محرابیں سی قایم کرتے ہیں کوئی صاحب خضاب کے بہانہ سے قوس قزح کے رنگ چہرہ پر قایم کرتے ہیں۔ اور طرح طرح ڈاڑھی کا ستیاناس کرکے لوگوں کو ڈاڑھی سے متنفر کرتے ہیں۔

پھر ایک اور سوال اُٹھتا ہے۔ آخر یہ ڈاڑھی ہے کیا؟ غایت اس کی کیا ہے اور قدرت نے یہ مصیبت مردوں کے چہروں پر

کیوں برپا کی ہے۔ اس کے ڈاکٹری فوائد تو اڈیٹر صاحب ہی خوب جانتے ہیں (واللہ اعلم ڈاکٹر صاحب کو کسی باربر یا کے دوا کے کارخانہ سے بغض ہے یا انھوں نے جلٹ استرے بنانے کے کارخانہ کو توڑنے کا ارادہ کیا ہے اس کا علم تو خدا کو ہے) اس سوال کو حل کرنے سے پیشتر ہم ایک دوسرا سوال ناظرین سے کرتے ہیں۔ وہ یہ کہ جناب بتائیے تو کہ قدرت نے حسن عورت کو دیا ہے یا مرد کو؟ خوبصورت نر ہے یا مادہ؟ اڈیٹر صاحب اور ہم سب آپ یعنی مرد یہی کہیں گے کہ حسن تو عورت کا حصہ ہے اور خدا نے حسن و نزاکت مادہ کو دی ہے۔ لیکن ہم اس اصول کو مدنظر رکھکر دنیا کی بقیہ مخلوق پر غور کرتے ہیں تو معاملہ ہی دوسرا نظر آتا ہے۔ مرغ کو دیکھئے اور مرغی کو۔ مور کو دیکھئے اور مورنی کو۔ چیتے کو دیکھئے اور چڑیا کو جنگلی بطخوں میں نر کو دیکھئے اور مادہ کو۔ ان سب میں خوبصورت نر ہے اور وہ بھی بالوں کی وجہ سے۔ نر کو خدا نے زرین پر و بال سے کس قدر آراستہ کیا ہے۔ مور کے آگے مورنی کا حسن کوئی چیز نہیں۔ پھر یہی قانون قدرت قریب قریب چرندوں پر صحیح لگتا ہے۔ جیسے کہ گائے۔ بیل۔ بکری۔ اونٹ وغیرہ تک کو آپ دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ قدرت نے بالوں کے ذریعہ سے نر کو بہ نسبت مادہ کے آراستہ اور خوبصورت بنانے میں تھوڑی یا بہت ضرور کوشش کی ہے۔ اور کچھ نہیں تو گلے کے آس پاس بالوں کا کچھ رنگ ہی سیاہ کر دیا جس کے خطوط خوبصورتی پیدا کر دیتے ہیں۔ سانپ اور ناگن کو دیکھئے شیر اور شیرنی کو دیکھئے۔ قصہ مختصر دنیا کی تمام مخلوق کو دیکھئے کہ قدرت کاملہ نے کس طرح زیادہ تر بال و پر ہی کی امداد سے نر کو بہ نسبت مادہ کے زیادہ دل کش اور خوبصورت بنانے کی کوشش کی ہے۔ بوجہ بال و پر کے نر بہ نسبت مادہ کے ہر طرح خوبصورت ہے۔ اور بال و پر کا یہ ہجوم گردن اور چہرہ ہی پر ہوتا ہے۔ چنانچہ اس لحاظ قدرت کے منشا کے مطابق تسلیم کرنا پڑے گا کہ بال و پر ہی تمام انسانی حسن کی بنیاد ہیں۔ اور چہرہ پر جو ڈاڑھی اور مونچھیں ہیں تو ڈاکٹری منشا قدرت کی کچھ ہی سہی لیکن ہم تو یہی کہیں گے کہ وہ جو کسی نے ڈاڑھی کو خدا کا نور کہا ہے تو مذاق میں نہیں بلکہ سچ سچ ایسا کہا ہے اور ٹھیک کہا ہے۔ اب یہ انسان کی غیر فطری کارروائی ہے جو اس منشا حسن کے خلاف جاری رکھا ہے۔ کیوں صاحب اگر مور صاحب بھی اپنی چوٹی کٹوا کر اور گردن کے بالوں کو مونڈ مانڈ کر زن فیشن ہو جائیں تو مورنی کمبخت کا تو سوال جانے دیجے کیا آپ اس مور کو کوے سے بہتر سمجھیں گے؟ یہ ایک سوال ہے جو جواب کا محتاج ہی نہیں۔ یا بالفرض ایک مرغے کی چوٹی وغیرہ کاٹ کر مرغی بنا کر دیا جائے تب مرغی صاحبہ اپنے شوہر صاحب کے بارہ میں کیا رائے قائم کریں گی؟ اور آپ کیا سوچیں گے؟

مندرجہ بالا امور پر غور کرنے کے بعد ہم فیصلہ قطعی دیتے ہیں کہ حسن مردانہ ڈاڑھی ہی میں ہے۔ کم از کم جہاں تک منشائے فطرت کو تسلیم کر سکتے ہیں یہ ماننا پڑے گا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر پھر اس حسن اصلی کو چھوڑ کر جلٹ استروں کا کارخانہ قائم کرنے کا مطلب؟ حماقت ہی تو ہوئی! کیا نظر کا دھوکہ ہے؟ ہرگز نہیں۔ راجپوتانہ کے بارہ میں کہہ سکتا ہوں اور بالخصوص مارواڑ کے بارہ میں۔ عموماً دیہاتی ڈاڑھی رکھتے ہیں۔ راجپوت لوگ خاص شوق سے۔ اگر آپ کو راجپوت نظر پڑیں گے۔ بڑی آن بان کے۔ تیکھی چتون والے۔ جوان رعنا۔ ایسے حسین کہ دیکھا ہی کیجے۔ وہ بانکے اور سجیلے جوان کہ ان کے چہرہ پر ڈاڑھی ہی جوانی اور رعنائی معلوم دیتی ہے ایک عجیب جاذبیت اور خوبصورتی ان کے چہرہ پر محض ڈاڑھی کی وجہ سے ہوتی ہے۔

اور مذاق برطرف۔ بازاروں میں تو نوجوانوں کی ڈاڑھیاں ہی خوبصورت لڑکیوں کا دل چھین لیا کرتی ہیں۔ آپ خود بھی دیکھیں تو قایل ہو جائیں۔ ایک ستم رسیدہ جوان کو جیل ہو گئی وہ بھی میری دکانت میں جیل میں پہونچتے ہی ڈاڑھی پر ٹین پھیر دی گئی۔ اب جب اس غریب کی عورت نے جو دیکھا تو قریب قریب غش ہی ہوئی۔ شوہر کی داڑھی جانے پر! دراصل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غیر فطری معاشرت نے کسی طرح ہم سب کی آنکھوں میں کچھ خرابی پیدا کر دی ہے جو ڈاڑھی کی خوبصورتی کو نہیں دیکھا۔ کیا اس کا کوئی علاج ہے؟ ڈاکٹر صاحب بتائیں گے اور ہم فی الحال ڈاڑھی مونڈے جائیں گے۔ تاوقتیکہ ڈاکٹر صاحب گھر والی کے لئے کوئی سرمہ تجویز نہ کر دیں جو وہ قدرت کی خوبی دیکھنے لگے۔



استبداد اور علم

(ترجمہ از جناب مولوی عبید الرحمٰن خاں صاحب شاہجہانپوری)

مستبد کو اپنی رعایا کے ساتھ وہی نسبت ہے جو ایک خائن ولی کو مال دار یتیموں کے ساتھ ہے۔ جب تک وہ یتیم خود تصرف کرنے سے قاصر ہیں ولی جیسا چاہتا ہے ان کی ذات اور ان کے مال پر تصرف کرتا ہے اور جس طرح ایسے خائن ولی کا فائدہ اسی میں ہے کہ یتیم کبھی خود تصرف کرنے کے قابل نہ ہو سکیں اسی طرح مستبد بھی کسی طرح نہیں چاہتا کہ اس کی رعایا علم کی روشنی سے مستفید ہو۔

مستبد اس سے ناواقف نہیں ہوتا کہ ان کا تحکمانہ برتاؤ اور جبر و ظلم اس کے بغیر کسی طرح قایم نہیں رہ سکتا کہ رعایا جاہل اور بے وقوف ہو۔ دنیا کی اُسے مطلق خبر نہ ہو۔ اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ مستبد اگر کوئی پرندہ ہوتا تو وہ چمگادڑ ہوتا کہ جہالت کی تاریکی میں عوام حشرات الارض کو مارتا کھاتا رہے اور اگر کوئی چوپایہ ہوتا تو بھیڑیا ہوتا کہ رات کی تاریکی میں بھیڑ رعایا کو چیرتا پھاڑتا۔

علم اللہ تعالیٰ کے نور کی ایک چنگاری ہے اور نور کو اللہ تعالیٰ نے چھپی ہوئی چیزوں کو ظاہر کر دینے والا۔ نامعلوم کو معلوم کر دینے والا، حرارت اور قوت کا پیدا کرنے والا بنایا ہے۔ اسیطرح علم کو اچھائی کو واضح کرنے والا، برائی کو بدنام و رسوا کرنے والا بنایا ہے۔ علم سے دلوں میں حرارت اور سروں میں دلیری و جرأت کا خیال پیدا ہوتا ہے۔

مستبد اُن علوم لغت سے جنکی غرض صرف زبان کی اصلاح ہے۔ اسوقت تک نہیں ڈرتا جبتک زبان کے ساتھ وہ جادو بیانی شریک نہ ہو۔ جو لڑنے مرنے پر آمادہ نہ کر دے۔ کیونکہ مستبد کو معلوم ہے کہ زمانہ اس سے زیادہ بخیل ہے کہ مائیں کمیت اور حسان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے بچے بہت زیادہ پیدا کریں۔

مستبد ان مذہبی علوم سے بھی نہیں ڈرتا۔ جن کا تعلق صرف امور آخرت سے ہے کیونکہ ان علوم سے رعایا کی جہالت دور نہیں ہوتی نہ ان کے دماغوں میں روشنی پیدا ہوتی ہو۔ ان علوم سے صرف علم کے بوالہوس شغل کرتے ہیں۔ لیکن اگر اسی جماعت میں سے کوئی کام کا آدمی نکل آتا ہے اور عوام میں شہرت حاصل کر لیتا ہے۔ تو پھر ایسے لوگوں کو

اپنے استبداد کی خدمت میں رہنے کے ذرائع موجود ہیں
استبداد کے دسترخوان کی بچی کھچی ہڈیوں سے انکا منہ تو آ
بند کر دیتا ہے۔

ہاں مستبد حیات کے نام سے لرزہ براندام ہوتا ہے
حکمت نظری، فلسفہ عقلی، قانون، سیاست مدنی، تاریخ
اور خطابت ادبی وغیرہ علوم سے اس کو ڈر لگتا ہے کہ
انہیں علوم کے ذریعہ جہالت کے بادل چھٹ جاتے ہیں
اور سروں میں سودائے حریت سما جاتا ہے۔

غرضکہ مستبد تمام علوم سے خوف زدہ نہیں ہوتا بلکہ
صرف ان علوم سے ڈرتا ہے۔ جن سے عقل بڑھتی ہے اور
جنکے ذریعہ انسان کو معلوم ہوتا ہے۔ کہ انسان کیا شے
ہے؟ اس کے حقوق کیا ہیں؟ وہ انکے حصول تو نہیں اٹھا رہا
ہے؟ وہ حقوق کیونکر طلب کیے جائیں؟ کس طرح مل سکتے
ہیں؟ اور ان کو محفوظ کس طرح رکھا جا سکتا ہے۔ مستبد
خیانت پر عاشق ہے۔ اور علماء اسکو اس خیانت پر ملامت
کرتے ہیں۔ مستبد چور اور دھوکے باز ہے۔ اور علماء اس کو
تنبیہ کرتے ہیں۔ اور انجام سے ڈراتے ہیں۔ مستبد کی بہت
سی حرکتیں اور مصلحتیں ہیں جنہیں صرف علماء تباہ و برباد
کرتے ہیں۔

مستبد علم کو نتائج کے اعتبار سے بھی برا سمجھتا ہے۔
اور علم کو علم کی وجہ سے بھی برا سمجھتا ہے۔ کیونکہ علم
کا تسلط ہر تسلط سے زیادہ قوی ہے۔ اس لئے یہ ضروری
ہے کہ جب کبھی اسکی نظر اپنے سے زیادہ عالم پر پڑے
اپنے آپکو حقیر سمجھے۔ اسی لئے مستبد اس کو بالکل پسند
نہیں کرتا کہ وہ کسی سمجھدار عالم کا منہ بھی دیکھے۔ اور اگر کسی
وقت ضرورت سے مجبور ہو کر کسی طبیب یا حکیم
کی ضرورت لاحق ہو جاتی ہے تو پھر خوشامدی اور چاپلوس
کو پسند کرتا ہے۔ مورخ ابن خلدون رح کا یہ قول۔ کہ خوشامدی
کامیاب ہوتا ہے۔ اسی قاعدہ پر مبنی ہے۔ اور یہ تمام
متکبرین کی فطرت ہے۔ اسی لئے وہ سرگنام اور خاموش
شخص کی تعریف کرتے ہیں جو برے بھلے کسی کام نہ آئے۔

بیان مذکورہ بالا سے یہ بات واضح طور پر سمجھ میں آجاتی
ہے کہ علم اور استبداد کے درمیان ایک دائمی جنگ اور
مستقل مخالفت ہے۔ علماء چاہتے ہیں کہ علم پھیلے اور مستبد
کی کوشش ہوتی ہے۔ کہ نور علم بجھ جائے۔ اور فریقین عوام
کو اپنی اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ عوام کون لوگ ہیں؟ وہ
لوگ ہیں۔ جب وہ جاہل ہوتے ہیں۔ تو ڈرتے ہیں اور
جب ڈرتے ہیں تو تسلیم و رضا پر اتر آتے ہیں۔ اور وہ
لوگ ہیں۔ کہ اگر انکو علم ہوتا ہے تو کہتے ہیں۔ اور کہتے ہیں
تو کرتے بھی ہیں۔ عوام مستبد کی قوت ہیں۔ اور انہیں سے
اسکو قوت حاصل ہوتی ہے۔ انہیں پر وہ دست تعدی
دراز کرتا ہے۔ اور انہیں کے ذریعہ دوسروں پر ظلم و
جبر کرتا ہے۔ مستبد انکو قیدی بناتا ہے۔ مگر وہ اسے
اس کی شوکت سمجھ کر خوش ہوتے ہیں۔ انکے مال غصب
کر لیتا ہے۔ مگر وہ اسکی تعریف کرتے ہیں۔ کہ انکی جان
محفوظ ہے۔ وہ ان کو ذلیل کرتا ہے۔ مگر وہ اس کی
بڑائی اور برتری کی تعریف کرتے ہیں۔ ایک کو دوسرے
سے لڑاتا ہے۔ مگر عوام اسکی سیاست پر فخر کرتے ہیں۔ اور
اگر انکے مال میں اسراف کرتا ہے تو اسکو سخی کہتے ہیں
اور اگر کسی کو قتل کر دے اور نعش کی توہین نہ کرے تو اس کو

بڑا رحیم وکریم سمجھتے ہیں۔ خطرات موت میں سے جاتا ہو تو سنداکے خوف سے تعمیل حکم کرتے ہیں۔ اور اگر کوئی غیرت حمیت والا ان خوبیات پر نکتہ چینی کرے اور تعمیل احکام سے انکار کردے تو پھر اس سے اس طرح دست و گریباں ہوجاتے ہیں۔ جیسے وہ کوئی باغی ہے۔

غرضکہ عوام اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں اسلئے ذبح کرکرا دیتے ہیں کہ جہالت کیوجہ سے ان کو خوف ہوتا ہے۔ اور جب یہ جہالت دور ہوجاتی ہے تو خوف دور ہوجاتا ہے اور معاملہ دگرگوں ہوجاتا ہے۔ لیعنی مستبد تقاضائے طبیعت کے خلاف ایک امانت دار وکیل بن جاتا ہے جس کو باز پرس کا خوف ہے ایک انصاف پرست حاکم ہوجاتا ہے جس کو مواخذہ کا خطرہ ہے اور ایک بردبار والد بن جاتا ہے جس کو اولاد کی آپس کی محبت سے لذت حاصل ہوتی ہے۔ قوم کو اگر یہ حالت حاصل ہوجائے تو پھر اس کی زندگی رفاہیت و فلاحیت، ترقی و کمال، عزت وسعادت کی زندگی ہوجاتی ہے۔ رئیس وحاکم کو بھی ایسے وقت میں سب سے زیادہ لطف آتا ہے جبکہ دور استبداد میں وہ دنیا کا بدنصیب ترین انسان تھا۔ دشمنوں میں ہر وقت گھرا ہوا تھا۔ لوگوں کی نظر میں ذلیل وخوار تھا۔ اور ایک لمحہ کے لئے جان کے خطرے سے مطمئن نہ تھا اور اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ مستبد کو اپنی رعایا سے جو خوف ہوتا ہے وہ رعایا کے خوف سے زیادہ ہوتا ہے کیونکہ رعایا اگر مستبد سے ڈرتی ہے تو جہالت اور ناواقفیت کی وجہ سے مستبد حقیقت حال کو سمجھکر خوف کرتا ہے۔ مستبد کو خوف ہوتا ہے کہ اگر اُس سے انتقام لیا جائے تو وہ بالکل جائز اور حق ہوگا اور رعایا محض وہمی ذلت سے خوفزدہ ہوتی ہے۔ مستبد کو اپنی حکومت اور اپنی جان کا خوف ہوتا ہے اور رعایا کو چند سکوں کا خوف ہوتا ہے۔ یا جلاوطنی کا خوف ہوتا ہے۔ اور جوں جوں مستبد کا ظلم وستم بڑھتا جاتا ہے اسی قدر اس کا خوف زیادہ ہوتا جاتا ہے اور اس کا یہ خوف اس حد تک بڑھ جاتا ہے کہ رعایا سے ڈرتے ڈرتے نوکروں چاکروں سے ڈرنے لگتا ہے۔ خود اپنے خیالات و توہمات سے ڈرنے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ ضعیف القلب پاگل ہوجاتے ہیں۔ اور اس طرح ان کی زندگی ختم ہوجاتی ہے۔

اسی لئے محققین مورخین کا ایک متفق علیہ طریقہ یہ ہے کہ جب وہ کسی دو مستبد اور ظالم بادشاہوں میں مقابلہ کرتے ہیں تو دونوں کے جبر وزیادتیاں شمار کرانے کے بجائے صرف اس کو اجاگر کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ دونوں میں سے کون رعایا سے زیادہ چوکنا اور ہوشیار رہتا ہے۔ علی ہذا القیاس اگر دو انصاف پرست اور عادل سلاطین کا مقابلہ کرتے ہیں تو یہ نمایاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ دونوں میں سے کس کو زیادہ امن واطمینان حاصل ہے۔

اور چونکہ اکثر قدیم مذاہب عقیدہ خیر وشر پر مبنی ہیں۔ جیسے عقیدہ روشنی وتاریکی، سورج وزحل، عقل وشیطان اس لئے بعض قدیم اقوام نے خیال کیا کہ انسان کے لئے سب سے زیادہ مضر شے جہالت ہے اور جہالت کا بدترین اثر خوف ہے اس لئے ان لوگوں نے خوف کا ایک بت تراش لیا اور اس کے شر سے محفوظ رہنے کے لئے اس کی عبادت کرنے لگی۔ مگر کسی سیاسی مصنف کا خیال ہے کہ کسی زمانہ میں کسی قوم نے خوف کا بت بنایا ہو تو بنایا ہو مگر میرے نزدیک

خود مستبد ہر وقت ہیکل خوف ہے۔ مستبد معبود ہے۔ اس کے اعوان و انصار کا قائم مقام ہیں۔ دیوان خانہ قربان گاہ۔ قلم چھریاں ہیں تعظیمی الفاظ عبادات و دعائیں اور لوگ وہ قیدی ہیں جو قربانی پیش کرتے ہیں۔"

سیاسیین کا یہ بھی خیال ہے کہ کسی زمانہ اور کسی قوم کے متعلق یہ معلوم کرنے کا کہ ان کی حکومت کس قسم کی ہے۔ مستبد ہے یا عادل۔ سب سے اچھی صورت یہ ہے کہ دیکھا جائے۔ آیا بادشاہ کے متعلق لوگوں کے جذبات کیسے ہیں؟ شعارات حکومت معمولی و مختصر ہیں یا عالی شان، محافل و مجالس دربار۔ اور دیوان سادہ ہوتے ہیں۔ یا نمائش و تصنع کا زیادہ دخل ہوتا ہے۔ اس صورت سے بھی حکومت کی حالت دریافت کی جا سکتی ہے کہ زبان میں الفاظ تعظیمیہ کی فارسی کی طرح کثرت ہے یا عربی کی طرح قلت۔ غرضیکہ استبداد اور علم ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ جن کے درمیان ایک مسلسل حالت جنگ قائم ہے۔ ہر مستبد ادارہ کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ نور علم پھیلنے نہ پائے اور عوام جہالت کی تاریکی میں ٹاپک ٹوئیاں مارتے رہیں۔ اس کے برخلاف علماء کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ لوگوں کے دماغ نور علم سے روشن اور ان کی عقول معلومات کی روشنی سے مجلا و مصفا ہو جائیں مستبد کو ان کی یہ کوشش ایک آنکھ نہیں بھاتی اور اس لئے وہ علماء کی آواز کو خاموش کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے اور قید و بند کی پابندیوں سے ان کی کوششوں کو مفلوج اور بیکار کر دیتا ہے۔ وہ علماء ایک حد تک کامیاب کہے جا سکتے ہیں۔ جو مستبد کے دست تطاول سے بچ کر وطن سے ہجرت کر جائیں اور یہی سبب ہے کہ تمام انبیاء عظام اور علماء کرام مختلف ممالک میں مارے مارے پھرتے رہے اور غریب الوطنی میں داعی اجل کو لبیک کہتے ہوئے دنیا سے سدھارے۔

محققین اہل سیاست کا خیال ہے کہ مغربی مستبد سب سے زیادہ اس علم سے ڈرتے ہیں کہ لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ آزادی زندگی سے زیادہ بیش قیمت چیز ہے۔ نفس کیا ہے اور عزت نفس کسے کہتے ہیں۔ عزت و عظمت کس چیز کا نام ہے؟ حقوق کیا چیز ہیں۔ ان کی حفاظت کس طرح ہو سکتی ہے؟ ظلم کیا چیز ہوتی ہے؟ اور اسے کس طرح دور کیا جا سکتا ہے؟ انسانیت کیا چیز ہے اور اس کے اعمال و وظائف کیا ہیں؟ رحمت کس کو کہتے ہیں۔ اور اس میں کیا لذت ہے؟

رہے مشرقی مستبد سو وہ علم سے اس طرح لرزہ براندام ہوتے ہیں۔ کہ وہ گویا تودۂ بارود ہیں اور علم آگ کی چنگاری ہے۔ علم کی چنگاری ان کے پاس آئی اور وہ بھک سے اڑے۔ علم سے ان کو یہاں تک خوف معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کو لا الٰہ الا اللہ کے معنی کا معلوم ہونا بھی ان کو گوارا نہیں ہوتا۔ نہ ان کو یہ پسند ہے کہ لوگ اس کے افضل الذکر ہونے کی وجہ معلوم کر سکیں۔ یا یہ جانیں کہ لا الٰہ الا اللہ پر اسلام کی بنیاد کیوں کر قائم ہے۔ حالانکہ اسلام ہی نہیں بلکہ تمام مذاہب کی بنا اور مدار لا الٰہ الا اللہ ہے [illegible] سوا کسی اور کی عبادت اور پرستش نہ ہو [illegible] عبادت کے معنی ہیں اظہار عجز و انکسار۔ اس طرح لا الٰہ الا اللہ کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ کے سوا کوئی اور اس کا مستحق نہیں [illegible] عبودیت کا اظہار کیا جائے اور اسی کو مستبد کسی [illegible] کہ اس کے غلام اس حقیقت سے آشنا ہو جائیں اور [illegible] حقیقت کے مطابق عمل پیرا ہوں کہ اس میں تو اس کی موت [illegible] اس حقیقت کا علم تو چھوٹے چھوٹے مستبدین کو بھی گوارا نہیں ہوتا [illegible] قوی یا بیوقوف خادموں کو، جاہل مولوی کو، نادان شوہر ماں اور [illegible] کمزور مجالس کے رؤسا کو کسی طرح گوارا نہیں ہوتا کہ ان کے متعلقین اس حقیقت سے آشنا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ جب کبھی جس کسی قوم میں توحید راسخ ہوئی تو غلامی کی زنجیریں کٹ کر الگ جا پڑیں۔ مگر انسان خدا کی نعمتوں کا سخت ناشکر گزار اور اپنے نفس اور اپنے ابنائے جنس پر ظلم

(سعید احمد پرنٹر و پبلشر نے محبوب المطابع برقی پریس دہلی میں چھپوا کر کوچہ چیلاں دہلی سے شائع کیا)